No.
Date
WEST WHARF
GH/147

واجد علی شاہ

اور

اُن کا عہد

ناشرین
شیخ غلام علی اینڈ سنز، پبلشرز
لاہور — پشاور — حیدرآباد — کراچی

۱۸۵۷ء کو اس وقت ماڑے خاں نے چودھری پرتاب سنگھ کو خط لکھا کہ میرا لشکر عنقریب تاجپور میں چودھری پرتاب سنگھ کو پہنچے گا انہوں نے جانا کہ میرا بھی یہی حال ہونے والا ہے اس لئے تدبیر روانگی کی کر کے ۵ نومبر ۱۸۵۷ء کو تاجپور سے روانہ ہوئے اور ۷ تاریخ گڑھ مکتیسر میں پہنچے۔

عہد محمود خاں کا امن و امان ”اس ہنگامے کے بعد نامحمود خاں اور اس کے ہمراہی سب طرف سے بے فکر ہو گئے اور چودھریوں میں سے کسی کا اندیشہ ان کے دل میں نہ رہا اور عیش عشرت میں مشغول ہو گئے۔ گنگا پار کے جو باغی تھے انہوں نے بھی اپنے لئے بجنور سے زیادہ کوئی امن نہ دیکھا چنانچہ دلیل سنگھ اور قدم سنگھ گوجر اور رضا حسن عرف چھٹن اور عنایت علی خاں قاضی تھانہ بھون مع اپنے رفیقوں اور ساتھیوں کے اس ضلع میں آئے اس ضلع کے باغیوں نے ان کو امن دیا ان کے سوا مرزا الطاف اور مرزا حاجی اور مرزا مبارک شاہ شاہزادگان مفرور دہلی اس ضلع میں آئے اور نامحمود خاں اور ماڑے نے بہت عزت اور توقیر کی۔

....اور تلوار ٹوٹ گئی!

حالات نامساعد تھے، فضا مخالف تھی، منزل ناپید تھی، لیکن کچھ صاحبانِ عزم و ہمت ایسے تھے جو اقبال کی زبان میں نعرہ لگا رہے تھے

ترا بحر پرسکوں ہے، یہ سکوں ہے یا کہ فسوں ہے؟
نہ نہنگ ہے، نہ طوفاں، نہ خرابیٔ کنارہ،

انھوں نے پرسکون سمندر میں تلاطم پیدا کر دیا، انہوں نے نہنگوں سے مقابلہ کیا۔ طوفانوں سے ٹکر لی اور خرابیٔ کنارہ سے ہمت نہ ہارے، ان کے دست و بازو شل ہو چکے تھے تلوار ٹوٹ چکی تھی، رفیقان راہ یا تو جوار رحمت میں پہنچ چکے تھے، یا گوشۂ عافیت

کمپنی کے فرزندوں سے

کیا اودھ کی بیگموں کا بھی ستانا یاد ہے ؟
یاد ہے جھانسی کی رانی کا زمانہ یاد ہے ؟
یاد تو ہوگی وہ مٹیا برج کی بھی داستاں ! (کلکتہ جہاں وفات پائی)
اب بھی جس کی خاک سے اٹھتا ہے رہ رہ کر دھواں

•

تم نے قیصر باغ کو دیکھا تو ہوگا بار ہا ؟
آج بھی آتی ہے جس سے ہائے اختر کی صدا ؟

(جوشؔ)

ہیں، یا دشمن کے کیمپ میں، لیکن ان کے تیور میں فرق آیا، نہ حوصلہ اور ہمت میں۔ یہ لڑتے رہے ـــــــــ اس وقت تک لڑتے رہے جب تک خون کا آخری قطرہ بھی اپنے مقصد عظیم و جلیل پر نچھاور نہ کر دیا۔

یہ داستان خاصی طویل ہے لیکن اسے مختصر کر کے آئندہ صفحات میں پیش کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے، یہ وہ داستان ہے جو مختصر ہونے کے باوجود، ناقابل فراموش ہے آج کی قوم کے لئے بھی اور کل آنے والی نسلوں کے لئے بھی،

(۱)

مولانا احمد اللہ شاہ

مولانا احمد اللہ مدراس کے رہنے والے تھے، اونچے گھرانے میں پیدا ہوئے، سن تمیز کو پہنچے تو علم سینہ اور علم سفینہ کے ماہر ہو چکے تھے، معقول اور منقول پر گہری نظر رکھتے تھے چاہتے تو عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے لیکن قدرت نے انھیں چشم حیران اور دل بے تاب کی دولت سے نوازا تھا وہ غیور اور حساس طبیعت کے مالک تھے مسلمانوں کے ادبار و زوال نے ان کی روح میں ہلچل برپا کر دی تھی ان کا سینہ محشرستان جذبات بنا ہوا تھا مسلمان تباہ ہو چکے تھے، مسلمان امراء اور جاگیردار خواب خرگوش میں مست تھے نہ فکر امروز نہ فکر فردا، مسلمان حکومتیں ایک ایک کر کے مٹ رہی تھیں، میسور اور سرنگاپٹم کی اسلامی حکومت ختم ہو چکی تھی، حیدر آباد اپنی غداری کے باعث سلامت تھا، لیکن شکنجہ میں جکڑا ہوا دلی میں مغلیہ خاندان کا چراغ بہادر شاہ ظفر کی صورت میں ٹمٹما رہا تھا، باد تند کے جھونکے اسے بجھانے کی کوشش کر رہے تھے، اودھ میں واجد علی شاہ کا آفتاب حکومت گہن میں آچکا تھا انگریزوں کا تسلط مستحکم سے مستحکم تر ہوتا چلا جا رہا تھا، ان کے ایک ہاتھ میں تلوار تھی اور دوسرے میں انجیل۔ تلوار اس لئے تھی کہ جس آدمی میں خودی، خودداری، سرکشی، بغاوت آزادی اور حریت کے جراثیم پائے جائیں اس کی گردن تراش دی جائے، انجیل اس لئے تھی کہ مرعوب و دہشت زدہ، آشفتہ روزگار، پریشان حال، مفلس اور قلاش لوگوں کو مسیح کے گلے میں شریک کر لیا جائے، مولانا احمد اللہ شاہ کے جذبہ جہاد، جوش پیکار

انتساب

مسٹر جسٹس الٰہی بخش خمیسانی جج ہائیکورٹ مغربی پاکستان

کے نام

جن کے کردار اور سیرت سے میں بہت متاثر ہوں

(یکم اکتوبر ۱۹۵۸ء)

•

دیواروں کے نیچے آ آ کر یوں جمع ہوئے ہیں زندانی
سینوں میں تلاطم بجلی کا آنکھوں میں جھلکتی شمشیریں
آنکھوں میں گدا کی سرخی ہے بے نور ہے چہرہ سلطاں کا
تخریب نے پرچم کھولا ہے سنسان میں پڑی ہیں تعمیریں
کیا اُن کو خبر تھی زیر و زبر رکھتے تھے جو روحِ ملّت کو
اُبلیں گے زمیں سے مارِ سیہ برسیں گی فلک سے شمشیریں
کیا ان کو خبر تھی ہونٹوں پر جو قفل لگایا کرتے ہیں
اک روز اسی خاموشی سے ٹپکیں گی دہکتی تقریریں

•

سنبھلو کہ وہ زنداں گونج اٹھا، جھپٹو کہ وہ قیدی چھوٹ گئے
اُٹھو کہ وہ بیٹھیں دیواریں، دوڑو کہ وہ ٹوٹی زنجیریں

•

(جوشؔ)

گورے رتھوں پر بیٹھے گولیاں برساتے جاتے تھے
عبادت خانہ کو آگ لگا دی راستہ میں جو سامنے آیا شکار کیا
مسجد فدا حسین میں کھانا کھایا، (پھر)، توشہ خانہ مسلطانی میں
گئے جتنے شیر جانور وغیرہ تھے سب کو مار ڈالا، نبی بخش
داروغہ کو گولی مار دی، پھر آگ لگائی، پھر جو پڑے کے اصطبل
میں آئے جتنی چھاؤنی تھی سب کو جلا دیا، بہت سے
تلنگے گھبرا کر دریا میں ڈوبے، ایک کشتی پر اس کثرت
سے چڑھے کہ اپنے ساتھ سب کو لے ڈوبے۔"

(قیصر التواریخ جلد دوم صفحہ ۳۶۸)

(انگریزوں نے) جب دل کشا محل کو مرمت طلب دیکھا مسمار
کر دیا، بادشاہ باغ ۵۵ لاکھ میں تیار ہوا تھا، ۲۵ ہزار میں راجہ
کپور تھلہ نے مول لے لیا، دل آرام کی کوٹھی بھی ایک راجہ
نے خرید لی، جو لکھی حضرت سلطانِ عالم (واجد علی شاہ) نے
اعظم الدولہ سے چار لاکھ کو لی تھی، جب نیلام ہوا، بارہ ہزار
کو سا ہنجی نے لے لی، جتنے خام مکان تھے سب مسمار کر دیئے
موتی محل کے پاس مرزا کی کوٹھی تھی، اسے مسمار کر دیا،
امام باڑے کے گرد جتنے مکانات عالی شان اور محلے تھے
تا حسین آباد، داخل حصار قلعہ ہوئے، امام باڑہ مرزا حسن خاں
دمنبر جس میں جمعہ کی جماعت ۷۰-۸۰ برس تک ہوئی، ہموار
زمین ہو گئی۔ امام باڑہ آغا باقر خاں کھد کر برابر ہو گیا!

(قیصر التواریخ جلد دوم صفحہ ۵۵-۲۵۴)

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضامین	صفحہ نمبر
۱	باب ۱ ۔ تزک واجد علی شاہ	۱۵
۲	باب ۲ واجد علی شاہ کی بزم سخن	۳۸
۳	فتح الدولہ برق	۴۰
۴	مہتاب الدولہ درخشاں	۴۱
۵	مرزا مسیتا عیش	۶۰
۶	آغا حجو شرف	۶۱
۷	مرزا امداد علی یاور	۶۲
۸	مظفر علی ہنر	۶۳
۹	گلشن الدولہ مرزا علی بہار	۶۵
۱۰	مالک الدولہ صولت	۶۶
۱۱	شیخ صادق علی مائل	۷۹
۱۲	مرزا جہاں قدر نیر	۸۱
۱۳	مرزا آسمان جاہ انجم	۸۳
۱۴	عابد علی مرزا کوکب ولی عہد اودھ	۸۴
۱۵	باب ۳ واجد علی شاہ اختر کی شاعری	۸۶
۱۶	آخری کلام	۹۷
۱۷	باب ۴ واجد علی شاہ کا ایک نایاب دیوان "گلدستۂ عاشقاں"	۹۸
۱۸	باب ۵ دور واجدی کی نثر و زبان اودھ	۱۰۷
۱۹	(۱) بانکے	۱۰۸
۲۰	(۲) شہ زور	۱۱۰

نمبر شمار	مضامین	نمبر شمار
۲۲	(۴) پیراک اور غواص	۱۱۵
۲۳	(۵) موسیقار	۱۱۷
۲۴	(۶) رقاص	۱۲۰
۲۵	(۷) مصور	۱۲۱
۲۶	(۸) خوش نویس اور خطاط	۱۲۲
۲۷	(۹) فن کار	۱۲۳
۲۸	(۱۰) حکیم اور جراح	۱۳۲
۲۹	(۱۱) خیاط، درزی اور رنگریز	۱۳۵
۳۰	(۱۲) باورچی اور رکاب دار	۱۳۷
۳۱	(۱۳) لکھنؤ کی صنعتیں	۱۴۰
۳۲	(۱۴) مطابع	۱۴۲
۳۳	باب ۶ عہد واجد علی شاہ کی شاعری اور شعراء	۱۴۴
۳۴	(۱) آتش	۱۴۶
۳۵	(۲) انیس	۱۵۰
۳۶	(۳) اسیر	۱۵۹
۳۷	(۴) امیر مینائی	۱۶۴
۳۸	(۵) امانت	۱۶۸
۳۹	باب ۷ عہد واجد علی کی صحافت	۱۷۲
۴۰	باب ۸ عہد واجدی کے مطبوعات و کتب	۱۸۶

نمبر شمار	مضامین	صفحہ نمبر
۴۲	باب ۱۱ تاریخ اودھ کا ایک سیاہ باب	۲۴۴
۴۳	باب ۱۱ زوالِ اودھ کی کہانی	۲۶۲
۴۴	باب ۱۲ واجد علی شاہ کا دورِ جلاوطنی	۲۸۶
۴۵	غدر: ظالم اور مظلوم کی کش مکش	۲۹۶
۴۶	باب ۱۳ واجد علی شاہ قیدِ فرنگ میں	۳۱۴
۴۷	باب ۱۴ فعل محمود: تاریخ انقلاب کا ایک گم شدہ ورق	۳۴۳
۴۸	باب ۱۵ اور تلوار ٹوٹ گئی	۳۷۸
۴۹	(۱) مولانا احمد اللہ شاہ	۳۵۴
۵۰	(۲) برجیس قدر	۳۸۹
۵۱	(۳) نواب بہادر خاں	۴۰۱
۵۲	(۴) تانتیا ٹوپے	۴۱۰
۵۳	(۵) حضرت محل	۴۲۳
۵۴	(۶) منشی رسول بخش کاکوروی	۴۳۱
۵۵	(۷) امیر المجاہدین مولوی سرفراز علی شاہجہاں پوری	۴۳۳
۵۶	(۸) عظیم اللہ خاں	۴۳۴
۵۷	(۹) فیروز شاہ	۴۴۰

نمبر شمار	مضامین	صفحہ نمبر
۵۸	(۱۰) مولانا کفایت علی کافی	۴۵۲
۵۹	(۱۱) لکشمی بائی رانی جھانسی	۴۵۶
۶۰	(۱۲) محمود خاں	۴۶۵
۶۱	(۱۳) ناناصاحب	۴۷۳
۶۲	باب ۱۶ ناقابلِ فراموش	۴۷۸
۶۳	باب ۱۷ تصویر کے دو رخ	۴۸۹
۶۴	باب ۱۸ اسباب بغاوت ہند	۵۰۶
۶۵	باب ۱۹ واجد علی شاہ مر گئے ہم تو زمانے نے بہت یاد کیا	۵۴۵
۶۶	باب ۲۰ لکھنؤ کا مرثیہ	۵۷۱
۶۷	غمِ ملت	۵۷۲
۶۸	فریاد	۵۷۳
۶۹	داستان انقلاب	۵۷۴
۷۰	داغِ غم	۵۷۶
۷۱	شہر بے چراغ	۵۷۷
۷۲	شکرۂ صیاد	۵۷۸
۷۳	سفر آشوب	۵۷۹
۷۴	باب ۲۱ حرفِ آخر	۵۸۰

پیش لفظ

یہ کتاب شاید اب سے بہت پہلے قارئین کے ہاتھوں میں ہوتی، اس کا بڑا حصہ لکھا جاچکا تھا، کچھ باقی تھا کہ ۴ مارچ ۱۹۵۷ء کو، مجھ پر قلبی حملہ (کارونری تھرامبوسس) ہوا، کرنل ضیاء اللہ نے مجھے فوراً گنگارام ہسپتال میں داخل کرلیا، ۱۵-۲۰ روز بعد وہاں سے گھر آگیا، ابھی چلنے پھرنے کی اجازت نہیں ملی تھی، لیکن بظاہر صحت کی طرف عود کر رہا تھا کہ یکایک ۴ مئی ۱۹۵۷ء کو دوبارہ نہایت شدت کے ساتھ یہ حملہ ہوا، کرنل ضیاء اللہ اطلاع ملتے ہی تشریف لائے اور جو کچھ ایک ڈاکٹر اور ایک انسان کے بس میں ہے وہ سب کچھ کیا، بظاہر بچنے کی کوئی امید نہ تھی، لیکن خدا کو شاید میری رفیقۂ حیات کی چشم خوں فشاں اور چھوٹی چھوٹی بچیوں کے گریۂ بے اختیار پر رحم آگیا۔ اس روز مجھے اندازہ ہوا کہ ہوش و حواس کے عالم میں آدمی جب اپنے بیوی بچوں کے سامنے دنیا سے گزرتا ہوگا، تو اس پر کیا گزرتی ہوگی؟ بہر حال خدا کا شکر ہے کہ کرنل ضیاء اللہ کی مسیحا نفسی سے میں بچ گیا، لیکن تقریباً چار ماہ تک بستر سے ہل نہ سکا۔ ڈاکٹر اسلم پیرزادہ صاحب (پروفیسر معالجات، ایڈورڈ میڈیکل کالج) بھی دو مرتبہ تشریف لائے اور برابر اُن کی توجہ، عنایت، اور طبّی مشورے، مجھ نیم جان میں ایک نئی زندگی پیدا کرنے کے موجب ہوئے، جناب حکیم محمد سعید صاحب (مالک ہمدرد دواخانہ) بھی از راہِ کرم عیادت کے لئے تشریف لائے، ان کے قیمتی مشوروں اور قیمتی دواؤں کے تحفہ نے بھی مجھے بڑا سہارا دیا، سمجھ میں نہیں آتا، ان حضرات کا شکریہ کس زبان سے ادا کروں۔

خاموشی از ثنائے تو حدِ ثنائے تست

اس کتاب کا پورا معاوضہ اسے لکھنے سے پہلے میں وصول کرچکا تھا، پھر بیماری کے سبب ایک عرصہ تک کام رکا رہا، لیکن شیخ نیاز احمد صاحب (پروپرائٹر میسرز غلام علی اینڈ سنز) نے ایک مرتبہ بھی مجھ سے تقاضا نہیں کیا، بلکہ جب ملاقات ہوئی، آرام کی ہدایت کرتے رہے، اُن کی اس کرم فرمائی کا بھی دل سے سپاس گزار ہوں اور خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ آج اس

بوجھ سے سبکدوش ہو رہا ہوں۔

بیماری کے یہ سات آٹھ مہینے بڑے صبر آزما گذرے، اس مدت میں، یگانوں اور بیگانوں کا، دوستوں اور عزیزوں کا، واقف کاروں اور شناساؤں کا، قدر دانوں اور جاں نثاروں کا، نیاز مندوں اور کرم فرماؤں کا، سب کا تجربہ ہو گیا اور خدا سے دعا کرتا ہوں کہ اب مجھے اس تجربہ سے کبھی دوچار نہ ہونا پڑے۔

جفائیں دیکھ لیاں، کج ادائیاں دیکھیں
بھلا ہوا کہ تری سب برائیاں دیکھیں

۱۲ ستمبر ۱۹۵۷ء

رئیس احمد جعفری
۸۹۔ ٹیگور پارک۔ لاہور

...جب آتش جواں تھا!

واجد علی شاہ نے اپنی ایک کتاب "پری خانہ" میں خود اپنا سراپا بیان کیا ہے۔

بیان خواب کی طرح جو کر رہا ہے
یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جوان تھا،

ملاحظہ ہو فرماتے ہیں:-

"...... اور میرے دل کی سرزمین پر محبت کے بادل برس رہے تھے۔ اس میں شک نہیں اس زمانہ میں خود مجھ میں بھی تبان شوخ و شنگ کے سے آثار موجود تھے، میری طلسم آفریں آنکھوں کے آگے، سامری کو بھی سبقت لے جانا محال تھا، یوسف کو میرے حضور میں بار پانا مشکل تھا۔ میری زلف پر پیچ مشکِ تاتار کو شرمندہ کرتی تھی۔ میری نازک مژہ اغیار کے سینوں میں کانٹے کی طرح چبھتی تھی۔ حسن و جمال۔ لطافت و ملاحت میرے آگے سر بسجود تھے اداؤ ناز میری ادنیٰ سی کنیزیں تھیں۔ آہوانِ رم خوردہ میری چشم پر فریب سے رُک جاتے تھے۔ سُنبل پیچاں میری کاکلوں کی اسیر تھی۔ میرے رخسار مثل آئینۂ حلب۔ میری زنخدان سیب سُرخ تھی۔ میری آنکھیں ناتوانوں کے لئے مایۂ قوت تھیں۔ میرے ہونٹ معشوقوں کے لئے جاں نواز تھے۔ میری بھنویں کمان کیانی، میری پیشانی چاند کی طرح چمکتی، میرے حلقۂ گیسو کمندِ بلا تھے جس میں بے شمار دل اسیر ہو کر تڑپتے تھے۔ میرے مژگاں کے نیزوں سے عاشقوں کے دل زخمی تھے، میرے آبرو کی تیغ معشوقوں کی جان کی دشمن تھی۔ زلفیں شب تیرہ و تار کی مانند اور عارض صبح وصال کے مثال تھے۔ قد و قامت سرو مراد کی طرح جو معشوقوں کے دل کو ہزار فریب سے قابو کر لیتا تھا۔"

باب (۱)

تزک واجد علی شاہ

واجد علی شاہ قدرت کی طرف سے غیر معمولی دل و دماغ لے کر آئے تھے، وہ بیک وقت صاحب تخت و تاج بھی تھے، اور اقلیم سخن کے شہر یار بھی، وہ آرٹسٹ اور فن کار بھی تھے، اور مصنف و مؤلف بھی، وہ شگفتہ طبع، اور بذلہ سنج بھی تھے، اور جودت فکر و نظر کے سرمایہ دار بھی، وہ ستار بھی تھے۔ اور شاعر بھی، وہ ماہر موسیقی بھی تھے، اور رقص کے اقدام و پیپائی، حرکت و جنبش، اور اعضا کے توڑ موڑ کے فن پر بھی ماہرانہ نگاہ رکھتے تھے، وہ عاشق صادق بھی تھے، اور رند لاابالی بھی، وہ نکتہ سنج بھی تھے، اور ادا آموز بھی، وہ حسن کے قدر دان بھی تھے، اور پرستار بھی، وہ بلا کے ذہین تھے، ان کی بارگاہ سے جو القاب و خطابات، عطا کئے جاتے تھے، وہ ان کی ذہانت اور جودت طبع کے آئینہ دار تھے، بڑے صاف گو بھی تھے، جو دل میں وہ زبان پر، لگی لپٹی رکھنے کے قائل نہیں تھے، انہوں نے اپنی زندگی کا کوئی گوشہ نہیں چھپایا، اچھا یا بُرا، سیاہ یا سفید، روشن یا تاریک، جو کچھ کیا، جو کچھ دیکھا، جو کچھ کہا، جو دل میں خیال آیا۔ اس تک کو، بغیر کسی جھجک اور تامل کے، بیان کر دیا۔

پہنچا تو ہوگا سمع مبارک میں حال میرؔ
اس پر بھی جی میں آئے تو دل کو لگائیے

واجد علی شاہ کے خامۂ بہار آفریں سے بہت سی کتابیں نکلی ہیں، لیکن ان میں "بنی" کو اختصاص و امتیاز خاص ہے، یہ کتاب ایک کشکول کی حیثیت رکھتی ہے، کئی سو صفحات پر حاوی ہے، اس میں انھوں نے اپنے آپ کو، بے نقاب کر دیا ہے، یہ ایک صاف اور روشن آئینہ ہے جس کے سامنے وہ آ کر بیٹھ گئے ہیں، اس میں انھوں نے فن کی باتیں بھی کی ہیں، اشخاص و افراد کے بارے میں اظہار خیال بھی کیا ہے، اپنے تاثرات و واردات بھی بیان کئے ہیں، آپ بیتی کے نقوش بھی کہیں کہیں ملتے ہیں، جگ بیتی کی جھلک بھی ہے، غیر محسوس طور پر، لیکن وضاحت کے ساتھ، انھوں نے، اپنے نفسیات پر سے

بھی پردہ اٹھایا ہے، جہاں وہ محل کی رہنے والیوں کو، آداب حیات بتاتے ہیں۔ وہ ان کی نفسیات داتی کا بہترین نمونہ ہے اس کتاب میں نقلیں بھی ہیں حکایتیں بھی، داستانیں بھی، واقعات وحقائق بھی، کئی سو صفحوں میں پھیلی ہوئی اس کتاب کے بعض حصوں کو اختصار کے ساتھ میں ذیل میں درج کرتا ہوں: تاکہ واجد علی شاہ کے کردار و گفتار کا ایک دل چسپ اور دل نشین و دل آویز مرقع خود انہی کے ہاتھوں کا لکھا ہوا نظر کے سامنے آجائے۔

"رہس" کو واجد علی شاہ کے فنکارانہ اوّلیات میں شمار کرنا چاہیئے۔ اس سلسلہ میں ان کی "ہدایت کاری" دیکھئے:۔

(۱) رہس کی ہدایت کاری سکھیاں پیش واز وغیرہ سے آراستہ ہو کر آئیں اور خاموش بیٹھ جائیں سازندے ان کے ہمراہ تصنیف راقم گائیں۔

استائی

چلو چلو سکھی اب رہس کریں
اکھتر[۱] پیا کے من کو رجھائیں

جس وقت راقم کا تخلص لب پر آئے فوراً سب سکھیاں کھڑی ہو جائیں اور جس مقام پر رہس کے واسطے صف باندھ کے کھڑا ہونا مقرر ہو چکا ہو وہاں پر صف بستہ ہموار ہوں اور رہس کے وقت اکل و شرب شور و غل سے محفوظ رہیں، ہر رہس کے ماقبل ضرور ہے کہ راقم کی تصنیفات گائیں۔ بعد پکھاوجی کے ٹکڑے کے ہمراہ وہ نغمہ سم پر تمام کیا کریں اور ہر رہس کے ختم کے بعد چرنجی رہو جان عالم کہا کریں (ص ۶۹)

اداکاروں کی پوشاک (۲۳) داں راس ہمراز نام ہے اس میں ایک جوگن ہے جس کا نام غربت، شہزادہ کہتا ہے کہ رادھا کنہیا کا ناچ دیکھنے کی ہوس ہے اُس رہس میں بہت سے کردار ہیں ان کے مکالمے خاصے دل چسپ ہیں یہ صفحہ ۸۴ سے شروع ہو کر ص ۱۰۹ پر ختم ہوتا ہے اس میں واجد علی شاہ نے بہ حیثیت ہدایت کار کے رہس کے کرداروں کے لئے جو پوشاکیں تجویز کی ہیں صرف ان کے ذکر پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

---

[۱] یعنی اختر۔ دیہاتی میں "اکھتر" لکھتے ہیں۔ یہ واجد علی شاہ کا تخلص تھا۔

تفصیل پوشاک کنہیا جی

ع۱ انگرکھا معہ جانگیہ
ع۲ گھاگرہ
ع۲ گلوبند کارچوبی
ع۱ مکٹ کارچوبی

تفصیل پوشاک کی اور رادھا جی کے زیوروں کی

ع۱ نتھ
ع۱ بینہ
ع۲ تمام ہندوانی زیور
ع۲ پہریہ
ع۵ لہنگا
ع۶ پیشواز
ع۷ بندے یعنی سراسری نقرۂ
ع۸ نقرۂ بانسری معہ مرلی

سکھیوں کی پوشاک

ع۱ جیغہ
ع۲ کلغی
ع۳ سلطان بند
ع۴ مُجلہ
ع۵ زیور پشواز
ع۶ ڈوپٹہ
ع۷ [illegible]

پریوں کی پوشاک

عـ۱ کارچوبی دوپٹہ
عـ۲ جامۂ حسن پُرزر
عـ۳ پاجامۂ پرزر
عـ۴ جملہ زیور مطابق لیاقت

دیو کی پوشاک

عـ۱ جاکٹ سیاہ
عـ۲ پتلون سیاہ
عـ۳ دستانہ سیاہ
عـ۴ موزہ یعنی جرّاب سیاہ
عـ۵ چہرہ مقوّہ کریہہ منظر
عـ۶ گرز چوبی سیاہ پر
عـ۷ کلاہ کاغذی

جوگن کی پوشاک

عـ۱ تہمد پارچہ شنجرفی
عـ۲ کفنی
عـ۳ جٹا کلاں مصنوعی
عـ۴ سانپ کپڑے کا کلاں
عـ۵ جھولی پارچہ
عـ۶ تونبہ
عـ۷ بیراگی چوبی
عـ۸ بھبوت

آلات و پوشاک مالکن والیوں کی

ع۱ ساڑھی
ع۲ شکلی برنجی گلٹ نقرہ
ع۳ سینی برنجی نقرہ
ع۴ متھائی چوبی
ع۵ کٹریہ گلٹ نقرہ
ع۶ کلیہ گلٹ نقرہ
ع۷ زیور ہندوانہ حسب لیاقت صاحب قصہ

پوشاک اور زیور پنہارنوں کا

ع۱ ساڑھی
ع۲ گھڑہ مسی
ع۳ ڈول
ع۴ ریسماں
ع۵ چاہ مصنوعی مع گرادی
ع۶ زیور حسب لیاقت

پوشاک مسافر کی

ع۱ انگرکھا
ع۲ پاجامہ
ع۳ پگڑی
ع۴ گٹھری
ع۵ لاٹھی

ع ۷ توشہ بستہ
ع ۸ دری خورد

پوشاک غربت

ع ۱ انگرکھا
ع ۲ پاجامہ
ع ۳ چکن سفید
ع ۴ کمر بند
ع ۵ دستار سفید

پوشاک رام چیرا

ع ۱ دھوتی
ع ۲ مرزائی
ع ۳ پہنیٹھ
ع ۴ جینو
ع ۵ کڑہ دست نقرہ
ع ۶ انگوچھا

رہس والیوں کی پوشاک

ع ۱ پاجامہ پرزر
ع ۲ پشواز مصالہ دار
ع ۳ دوپٹہ پرزر
ع ۴ زیور حسب لیاقت (از صـ۱۰۶ تا صـ۱۰۹)

(۳) بھانڈ (طرو اں) ور نقالوں کا ذکر | بھانڈ اور نقال لکھنؤ کے لیے نکروں کی محفل عیش د

ایک طبقہ بن گیا، جو موروثی طور پر، اپنے آبائی فن کا مظاہرہ کرتے اور انعام و کرام سے، بادشاہوں کے دربارہ اور رؤسا کی محفل میں شادکام ہوتے تھے،

اس کتاب میں واجد علی شاہ نے اس طبقہ کا ذکرِ خیر کیا ہے، نمونتہً:۔

"۔۔۔ اس فرقے کو راقم نے بچشم خود دیکھا کہ ایسے پابندِ صوم صلوٰۃ ہوتے ہیں کہ سُبحان اللہ ہزار روپے کی تھیلی سامنے دھر دو اور فرمائش کرو کہ نماز فوت ہونے دو اگر نقل کئے جاؤ گے ہزار روپیہ تمہارا ہے کبھی قبول نہ کریں گے پر نماز وقت پر بجا لاویں گے پس دل لگی کے واسطے میں نے بھی دو بھنڈ بیستان اور چند نقلیں ان لوگوں کی درج کتاب کیں بموجب اس کے کہ علم الشئ بالز جہل شی مشہور ہے (ص ۱۲۶ تا ص ۱۲۷)

نقلیں رئیسوں اور امیروں کی محفلوں میں، یا کھیل تماشے میں فن کار، طرح طرح کی نقلیں کرکے خراج تحسین اور مال و دولت حاصل کیا کرتے تھے، رفتہ رفتہ یہ بھی ایک فن بن گیا، واجد علی شاہ نے بھی اس موضوع پر طبع آزمائی کرکے خوب خوب گلکاریاں دکھائی ہیں نمونہ حاضر ہے :۔

نقل لونڈی بی بی کی اصل کی نقل بیان کرتا ہوں کان لگا کر سنو، ایک میاں بی بی تھے، ایک لونڈی تھی میاں بی بی کا پیار اخلاص دیکھ کر لونڈی کا بھی جی چاہا کرتا تھا، ایک روز میاں بی بی دونوں کسی کی شادی میں مہمان گئے گھر خالی رہا لونڈی کو اور کوئی تو نہ ملا اپنی چدر یہ بیری کے پیڑ پر ڈال کے اور اس کے کانٹوں میں اولجھا کے یہ گاتی اور یوں اپنے دل کا حوصلہ نکالتی تھی،

آستائی

واہ جی واہ یہ ٹھٹھا نہیں[1] اچھا راہ چلتوں کا دامن پکڑ لیتے ہو۔

انترا

جانے نہیں دیتے ہو مجھ کو باہر ہاتھوں سے ناحق جکڑتے ہو۔ (ص ۱۴۲)

واجد علی شاہ کی شگفتہ طبعی، اور بدیہہ گوئی ہر قید، اور پابندی سے آزاد تھی، یہ نقل جو سبق آموز بھی ہے ملاحظہ ہو:۔

---

[1] دل لگی۔

قدم باہر نہیں نکالا بخشی مذکور میرے والد کے عہد سلطنت میں تمام فوج کے بخشی رہے اور میرے عہد میں استاد عاشق رہے اور بعد انتزاع سلطنت ہمراہ آئے اور زندان قلعہ ولیم فورڈ کلکتہ میں بھی میرے ساتھ قید ہوئے اور اُسی زنداں میں جاں بحق ہوئے اور وقت دم واپسیں یہ بیت اور یہ مطلع پڑھ کر روانہ فردوس ہوئے انا للہ و انا الیہ راجعون -

مطلع

برقؔ جو منہ سے کہا تھا وہی کر کے اٹھے
جان دی آپکے دروازہ پہ اور مر کے اٹھے

بیت

سانس سینے میں ہر اک جا سے مسک جاتا ہے تن
برقؔ بدلو جامۂ ہستی پرانا ہو گیا - ! (ص۲۳۸ و ص۲۳۹)

اس کے مقابلہ میں، برقؔ کا کردار کتنا روشن، کتنا تابناک اور کتنا سبق آموز ہے !

مقبول الدولہ مرزا محمد مہدی قبول

ہم مشورۂ راقم اٹھارہ انیس برس کا میرا سن تھا جو میرا اُن کا ساتھ ہوا میرے ملازم رہے میرے والد کے بھی ملازم تھے میرے عہد میں خدمت چوکی پلنگ خاص و مصاحبت اور چھاپہ خانہ اور کتب خانہ اور کرنیل رائن کا توپ خانہ یہ سب ان کے پلٹے نام رہا اور بعد انتزاع سلطنت اودھ جب راقم قلعہ ولیم فورڈ کلکتہ میں مقید تھا یہ حاضر کلکتہ ہوئے اور جب راقم نے رہائی پائی میرے پاس موجود تھے حسرت زیارات عتبات عالیات میں انتقال کیا یہ مطلع ان کا ہے -

مطلع

چھلّے کو تیری آگ سے جلوا نہیں سکتا
اے گلبدن اس واسطے گل کھا نہیں سکتا (ص۲۳۹ و ص۲۴۰)

خود اپنا تذکرہ

اس کتاب میں واجد علی شاہ نے اپنا تذکرہ بھی کیا ہے، ایک حصّہ ملاحظہ ہو:-

یہ فقیر حقیر راقم و مصنّف و مؤلف سراپا تقصیر پندرہ برس کے سن میں والد جنت مکان نے ولی عہد اور وزیر کیا۔ بیس برس کے سن میں، بلا صدور ظلم و ناانصافی و بے آزاری رعیّت بے سبب تخت سے

میںنے قلعہ ولیم فورڈ کلکتہ میں ناحق قید رہا ساٹھ سے اوپر ماشاءاللہ چشم بددور اولاد کو روانا شدمیں سنہ ۱۲۹۱ھ سے باعانت گورنمنٹ بیس ہزار روپوں میں دو دختروں کا عقد کر دیا سُنا جاتا ہے کہ اسی حساب سے بارہ دختریں سن آئندہ میں باعانت گورنمنٹ معتمد ہوں گی پچاس برس کے سن میں اتنی جلدیں کتابوں کی تصنیف کیں۔

ع۱ اختر ملک
ع۲ افسانہ عشق
ع۳ ارشاد خاقانی
ع۴ ایمان
ع۵ بحر الہدایت
ع۶ بحر الفت
ع۷ بحر مختلف
ع۸ کتاب بینی
ع۹ تاریخ مذہب
ع۱۰ تاریخ ممتاز
ع۱۱ تاریخ خلوص
ع۱۲ تاریخ فراق
ع۱۳ تاریخ مشغلہ
ع۱۴ تاریخ غزالہ
ع۱۵ تاریخ نور
ع۱۶ تاریخ جمشیدی
ع۱۷ تاریخ دہر
ع۱۸ تجلی عشق
ع۱۹ جوہر عروض
ع۲۰ حزن اختری
ع۲۱ [illegible]

۲۲۔ دستور واجدیہ

۲۳۔ دفتر ہمایوں

۲۴۔ دیوان مبارک

۲۵۔ دفتر پریشان

۲۶۔ دُلہن

۲۷۔ سُخن اشرف

۲۸۔ شیوع فیض

۲۹۔ صحیفۂ سلطانی

۳۰۔ صوت المبارک

۳۱۔ عشق نامہ

۳۲۔ قمر مضمون

۳۳۔ کلیات اختری

۳۴۔ کلیات سوم

۳۵۔ گلدستۂ عاشقان

۳۶۔ سودات حرثیہ

۳۷۔ ماہی نامہ

۳۸۔ مرقع فرخ

۳۹۔ مباحثہ بین النفس والعقل

۴۰۔ ناجو

۴۱۔ نظم امور

۴۲۔ نصائح اختری

۴۳۔ ہیبت حیدری

۴۴۔ لغت ہفت زبان کہ وہ ابھی ناتمام ہے۔

۴۵۔ پانچ چار کتابیں مراثی اور مصائب منظوم شہدائے کربلا ہیں کہ ان مرثیوں کا حساب نہیں کیا۔

بدمعاشوں میں تاراج ہوئیں وہ خارج از حساب ہیں۔

راقمہ

ایک حسرت طور پر بھی بہر یوسف رہ گئی
ایسا کچھ دیکھا کہ آنکھوں کو تمنّا رہ گئی (صنہ ۲۴۰ و صہ ۲۴۱)

(۵) خاندان اہل وعیال کا ذکر

واجد علی شاہ نے اس کتاب میں اپنی بیویوں اور اولاد کا ذکر بھی کیا ہے، خاص کر ان کا جنھیں شعر و شاعری سے مس تھا، کچھ حصّہ نمونتہً ملاحظہ ہو:۔

صدر محل صدؔر

جو بشمول محلات ہمراہ راقم ہیں بمشورۂ گلشن الدولہ مرزا علی بہار

بڑھے رتبہ شہ واجد علی کا
بجے ڈنکا شہ واجد علی کا (صہ ۲۴۴)

ملکہ مخدرۂ عظمیٰ عالم آرا بیگم عالؔم منکوحہ کلاں (والدہ ولیعہد مرحوم)

محو نظارۂ نگار ہوئا
تیر مژگاں جگر کے پار ہوئا

فارسی

اے یار رحیم تو نزدیک و دور را
لطف تو شامل است شکور و غفور را (صہ ۲۴۴)

ولی عہد مرحوم کی یاد

کوکب ولی عہد جنت نشین فرزند راقم منکوحۂ مرقومۂ بالا کے بطن سے جو سن بارہ سو اکانویں میں فوت ہو کر سبطین آباد امام باڑہ تعمیر کردہ راقم میں دفن ہوا۔

بے مثل و بے مانند و یکتا اے خدا پایا؟
کیئے طے شش جہت لیکن نہ ایسا دوسرا پایا (صہ ۲۴۴، صہ ۲۴۵)

ماہتاب الدولہ درخشاں

تیس برس سے تا ایندم میرا ملازم ہے۔

مطلع

اہلِ حیرت سے نہ بزمِ عیش خالی ہو سکے
صید کیوں کر طائرِ تصویر قالی ہو سکے

تعیش الدولہ عیش

سات شخص ایک مرتبہ میرے شاگرد ہوئے ساتوں کا سبع سیارہ لقب ہوا ان میں سے ایک یہ بھی ہے استعداد بہت اچھا عروض لاجواب میرا ملازم بھی ہے۔

مطلع

پہلے صفتِ پاک میں کھول اپنے دہن کو
کر صاحبِ نشیں سے طلب تاجِ سخن کو (ص ۲۴۶)

شاذ داخل سبع سیارہ

بہار باغِ جنت ہو نہ کیوں کر پاؤں کے نیچے
کہ رہتی ہے زمینِ کوئے دل بر پاؤں کے نیچے (ص ۲۴۶، ص ۲۴۷)

لطیفہ

دو فاضلوں کا مزاج

ایک فاضل کا نام ملا باقر تھا اور دوسرے کا ملا طاہر دونوں راہ میں ملے طاہر نے کہا سلام علیکم باقر بقر سے مشتق ہے ملا باقر نے جواب سلام دے کر کہا فی الواقع وہی بقر کہ فضلہ جس کا طاہر ہے وہ اپنی راہ پر چلے گئے وہ اپنی راہ پر۔ (ص ۲۶۷، ص ۲۶۸)

واجد علی شاہ کے مشاغل

"جاننا چاہیئے کہ زیرِ تعلیم راقم تا تحریر ہذا تینتالیس اسم ہیں اور سب جلسے ملا کر دو سو سولہ اسم گانے ناچنے والے اللھم زد ماشاءاللہ چشم بدکور تاخیر کتاب ہذا راقم کے پاس ہر وقت و ہر ساعت و ہر لمحہ موجود ہیں مگر ملاقات اور صحبت اور حکایات ہر روز انہی سے ہوتی ہے جو تینتالیس اسم زیرِ تعلیم حقیر ہیں۔

جملہ آٹھ ہزار پانچسو اٹھانوے روپیہ مشاہرہ ہوئے پندرہ کلاونت مغنی ایک کٹھنی والا اور

دو پکھاوجی تیئیس طبلہ نواز چھیالیس سارنگی نواز بائیس منجیرہ نواز ایک نے نواز چھ رقاص ایک شعبدہ باز دو ڈھولک نواز ایک سرسنگھار نواز اور اتیس نقر نقارخانے میں اور چھ محفل ملازم ہیں چشم بد دور تنخواہ دار تین ہزار دو سو اکسٹھ روپیہ ماہانہ کی اور رقم کہ سرکار میں جو ڈومنیاں عورتیں ہیں ان کو "زمرۂ محفل" اور جو ان کے مرد ہیں ان کو "بہار محفل" کہتے ہیں (ص ۳۳۲، ص ۳۳۳)

(۶) القاب وخطابات

واجد علی شاہ نے جو القاب وخطابات عطا کئے تھے، کہیں کہیں سے ان کا ذکر بھی غیر مناسب نہ ہوگا:-

خطاب صاحبان عالم پسند جو لفظ دولائی سے ممتاز ہیں

ع۱ وزیر السلطان محمد امیر علی خان بہادر کار وزارت سے ان کے تعلق ہے۔

ع۲ برادر السلطان منتظم السلطنت ذوالفقار الدولہ شمشیر الملک سید سجاد علی خان بہادر تیغ جنگ تقاریب مکتب نشینی شاہزادگان ان کے تعلق ہے۔

ع۳ ارسطو خصلت افلاطون طینت سردار الحکما طبیب الدولہ حکیم سید آقا علی خان بہادر محکم جنگ یہ حکیم حاذق ہیں اور شفاخانہ سرکاری اور افسری کل اطباء ملازمین،

ع۴ مونس الدولہ رفیق الملک سید علی حسین خان بہادر رفیع جنگ تعمیر و ترمیم کل عمارت شاہی اور جمیع فرقاشات سلطان، اور کل تقریبات سالانہ اور پوشاک بیگمات اور امام باڑہ سبطین آباد مبارک اور کوٹھیات مثل سلطان مبارک وغیرہ اور باغات شاہی اور خبر گیری ایوانات ازواج شاہی اور خاکروب متعلق ہیں۔

ع۵ ریحان الدولہ سید شجاع حسین خان بہادر کوٹھیات سہ گانہ کوٹھی تفریح بخش عالی وغیرہ اور رسالہ باڈی گارڈ اور ماہی پرداز اور سقہ متعلق ہیں۔

ع۶ منشی السلطان رمضان علی خان بہادر افسر اہل قلم اور کچہری بیت الاجرا سے سلطانی اور داغ خوری جانوران اور رسالہ خسروی اور کوٹھی تہنیت منزل ہمایوں متعلق ہے۔

ع۷ معصوم الدولہ مختار الملک منشی محمد حسین خان بہادر جلادت جنگ مختار عام شاہی ہیں اور کوتوالی شاہی اور رواروغگی کوٹھیات شہنشاہ منزل مبارک اور اسد منزل سعد اور زرمیوہ خوری لانا اور چلنے خانہ متعلق ہے۔

ع۸ بخشی الملک امانت الدولہ سید عبد العلی خان بہادر کچہری بخشی گیری اور تقسیم تنخواہ کل تنخواہ داران متعلق ہیں۔

۹ء رفیق و یرینہ الک الدولہ کاظم علی خان بہادر افسری کل پیادگان اور حراست کُل ڈھیوڑیات ازواج شاہی اور چاء خانہ متعلق ہے۔

۱۰ء خلاصۃ الدولہ منشی علی نقی خان بہادر لفافہ ملاحظہ کرانا اور مہر خاص ثبت کرنا اور زرمیوہ خوری لانا اور دارو غگی ارباب نشاط اور دفتر متعلق ہے۔

۱۱ء جلیس الدولہ مصاحب الملک سید علی جان شیرازی لطافت رقم بہادر مصاحب خاص حضرت سلطان عالم خلد اللہ ملکہ پوشاک خانہ شاہی اور کوٹھی سید سلطانی اور رسالہ بادشاہی متعلق ہے۔

۱۲ء رفعت الدولہ رفیع الملک کاتب الملوک سید محمد شفیع الرضوی دفتر معتمد اثر شاہی متعلق ہے کاغذات اصلی دستخطی خاص اس دفتر میں داخل ہوتے ہیں اور خدمت تحریر پرچہ و پیام اور شقہ جات بھی سپرد ہے۔

۱۳ء سفیر الدولہ مولوی دین محمد خان بہادر دفتر انگریزی متعلق ہے۔

۱۴ء ضرغام الدولہ مہدی حسن خان بہادر

۱۵ء ترصیع الدولہ زمرد رقم محمد امیر خاں بہادر ابن علی رضا جواہر رقم خان بہادر

۱۶ء رئیس الدولہ علی حسن بہادر مطبع سلطانی اور کچہری و ساعت اور افسری خوشنویسان متعلق ہے۔

۱۷ء زین المدققین ہاتف الدولہ عابد حسین خان بہادر کوکب الملک انجم جنگ یہ منجم ہیں۔

۱۸ء ماہتاب الدولہ کوکب الملک سید علی جان خان بہادر درخشان ستارہ جنگ۔

۱۹ء تعیش الدولہ بہادر

۲۰ء گلشن الدولہ مرزا علی خان بہادر یہ شاعر ہیں ان لوگوں کے ذمہ خدمت سرکاری بھی تفویض ہے۔ اور مصاحب بھی ہیں۔

۲۱ء منتظم الدولہ مدارک الملک محمد جعفر علی خان بہادر اہتمام جنگ۔

۲۲ء انیس الدولہ مونس الملک خانہ زاد خان بہادر دلاور جنگ مصاحب خاص حضرت سلطان عالم۔

۲۳ء مصاحب الدولہ بہادر ہمنشین الدولہ محمد عابد خان بہادر ان کے سپرد کوئی خدمت نہیں مگر مصاحب ہیں۔

۲۴ء مخلص الدولہ سرفراز حسین خان بہادر کچہری اخبار معہ ہرکارگان متعلق ہے۔

۲۵ء مرحمت الدولہ کلب حسین بہادر کوٹھی قیصر البیضا اور فلک باغ اور رسالہ ہندوستانی متعلق ہے۔

۲۶ء تصدیق الدولہ تصدق حسین خان بہادر داروغگی کوٹھی شمس منزل معلی متعلق ہے۔

متعلق ہے۔

۲۸۔ خازن الدولہ بہادر تحویل جیب خاص شاہی اور خزانہ شاہی متعلق ہے۔

۲۹۔ الطاف الدولہ حیدر علی خان بہادر داروغگی کوٹھی گوشہ سلطانی متعلق ہے۔

۳۰۔ منظور الدولہ نواب ناظر علی خان بہادر بگھی خانہ شاہی اور کوٹھی حشمت منزل متعلق ہے۔ اور ان کے خدمت سرکاری سپرد ہے اور متوقع المصاحبت ہیں۔

۳۱۔ لائق الدولہ محمد جان عالم خان بہادر یہ شاعر ہیں۔

۳۲۔ شرافت الدولہ اشرف الدین احمد خان بہادر

۳۳۔ تفضیل الدولہ افضل الدین احمد خان بہادر

۳۴۔ حمید الدولہ سید حامد علی خان بہادر

۳۵۔ حامد الدولہ سید محمود علی خان بہادر

۳۶۔ مالک الدولہ جعفر حسین خان بہادر

۳۷۔ شرف الدولہ سید محمد شریف علی خان بہادر

۳۸۔ ندرت الدولہ بہادر

۳۹۔ اخلاص الدولہ احمد علی خان بہادر

۴۰۔ عزت الدولہ محتشم الملک روشن علی خان بہادر معتبر جنگ

۴۱۔ خالص الدولہ نادر علی خان بہادر

۴۲۔ لطیعت الدولہ بہادر عطاء الدولہ بہادر داعی الدولہ بہادر ان لوگوں کے متعلق کوئی خدمت نہیں اور متوقع المصاحبت ہیں۔ (ص۳۲۹ تا ص۳۴۴)

(۷) جانوروں کے خطابات

واجد علی شاہ نے جو پرندے اور جانور پالے تھے انھیں بھی دلچسپ خطابات سے نوازا تھا۔ صرف بلبل کو جو خطابات دیئے ہیں تینتالیس سے زیادہ ہیں، انہی سے دوسروں کا اندازہ کیجئے۔

۱۔ زیور گل

۲۔ آشنائے چمن

۳۔ عاشق گل

۴۔ گلاب رنگ

۹ء رفیق دیرینہ الک الدولہ کاظم علی خان بہادر افسری کل پیادگان اور حراست کل ڈھیوڑیات ازواج شاہی اور چا خانہ متعلق ہے۔

۱۰ء خلاصۃ الدولہ منشی علی نقی خان بہادر لفافہ ملاحظہ کرانا اور مہر خاص ثبت کرنا اور زرمیوہ خوری لانا اور داروغگی ارباب نشاط اور دفتر متعلق ہے۔

۱۱ء جلیس الدولہ مصاحب الملک سید علی جان شیرازی لطافت رقم بہادر مصاحب خاص حضرت سلطان عالم خلد اللہ ملکہ پوشاک خانہ شاہی اور کوٹھی سید سلطانی اور رسالہ بادشاہی متعلق ہے۔

۱۲ء رفعت الدولہ رفیع الملک کاتب الملوک سید محمد شفیع الرضوی دفتر معتمد اثر شاہی متعلق ہے کاغذات اصلی دستخطی خاص اس دفتر میں داخل ہوتے ہیں اور خدمت تحریر پرچہ و پیام اور شقہ جات بھی سپرد ہے۔

۱۳ء سفیر الدولہ مولوی دین محمد خان بہادر دفتر انگریزی متعلق ہے۔

۱۴ء ضرغام الدولہ مہدی حسن خان بہادر

۱۵ء ترصیع الدولہ زمرد رقم محمد امیر خاں بہادر ابن علی رضا جواہر رقم خان بہادر

۱۶ء رئیس الدولہ علی حسن بہادر مطبع سلطانی اور کچہری وساعت اور افسری خوشنویساں متعلق ہے۔

۱۷ء زین المدققین ہاتف الدولہ عابد حسین خان بہادر کوکب الملک انجم جنگ یہ منجم ہیں۔

۱۸ء ماہتاب الدولہ کوکب الملک سید علی جان خان بہادر درخشان ستارہ جنگ۔

۱۹ء تعیش الدولہ بہادر

۲۰ء گلشن الدولہ مرزا علی خان بہادر یہ شاعر ہیں ان لوگوں کے ذمہ خدمت سرکاری بھی تفویض ہے اور مصاحب بھی ہیں۔

۲۱ء مہتمم الدولہ مدارک الملک محمد جعفر علی خان بہادر اہتمام جنگ۔

۲۲ء انیس الدولہ مونس الملک خانہ زاد خان بہادر دلاور جنگ مصاحب خاص حضرت سلطان عالم۔

۲۳ء مصاحب الدولہ بہادر ہمنشین الدولہ محمد عابد خان بہادر ان کے سپرد کوئی خدمت نہیں مگر مصاحب ہیں۔

۲۴ء مخلص الدولہ سرفراز حسین خان بہادر کچہری اخبار معہ ہرکارگان متعلق ہے۔

۲۵ء مرحمت الدولہ کلب حسین بہادر کوٹھی قیصر البیضا اور فلک باغ اور رسالہ ہندوستانی متعلق ہے۔

۲۶ء تصدیق الدولہ تصدق حسین خان بہادر داروغگی کوٹھی شمس منزل معلی متعلق ہے۔

متعلق ہے۔

۲۸ء خازن الدولہ بہادر تحویل جیب خاص شاہی اور خزانہ شاہی متعلق ہے۔

۲۹ء الطاف الدولہ حیدر علی خان بہادر داروغگی کوٹھی گوشہ سلطانی متعلق ہے۔

۳۰ء منظور الدولہ نواب ناظر علی خان بہادر بگھی خانہ شاہی اور کوٹھی حشمت منزل متعلق ہے۔ اوران کے خدمت سرکاری سپرد ہے اور متوقع المصاحبت ہیں۔

۳۱ء لائق الدولہ محمد جان عالم خان بہادر یہ شاعر ہیں۔

۳۲ء شرافت الدولہ اشرف الدین احمد خان بہادر

۳۳ء تفضیل الدولہ افضل الدین احمد خان بہادر

۳۴ء حمید الدولہ سید حامد علی خان بہادر

۳۵ء حامد الدولہ سید محمود علی خان بہادر

۳۶ء مالک الدولہ جعفر حسین خان بہادر

۳۷ء شرف الدولہ سید محمد شریف علی خان بہادر

۳۸ء ندرت الدولہ بہادر

۳۹ء اخلاص الدولہ احمد علی خان بہادر

۴۰ء عزت الدولہ محتشم الملک روشن علی خان بہادر معتبر جنگ

۴۱ء خالص الدولہ نادر علی خان بہادر

۴۲ء لطیفت الدولہ بہادر عطاء الدولہ بہادر داعی الدولہ بہادر ان لوگوں کے متعلق کوئی خدمت نہیں اور متوقع المصاحبت ہیں۔ (صہ ۲۲۹ تا صہ ۲۴۴)

(۷) جانوروں کے خطابات

واجد علی شاہ نے جو پرندے اور جانور پالے تھے انھیں بھی دلچسپ خطابات سے نوازا تھا۔ صرف بلبل کو جو خطابات دیئے ہیں تینتالیس سے زیادہ ہیں، انہی سے دوسروں کا اندازہ کیجئے۔

۱ء زیور گل

۲ء آشنائے چمن

۳ء عاشق گل

۴ء گلاب رنگ

۹ء رفیق ویربنۃ الملک الدولہ کاظم علی خان بہادر افسری کل پیادگان اور حراست کل ڈیوڑیات ازواج شاہی اور چار خانہ متعلق ہے۔

۱۰ء خلاصۃ الدولہ خشی علی نقی خان بہادر لفافہ ملاحظہ کرانا اور مہر خاص ثبت کرنا اور زر میوہ خوری لانا اور داروغگی ارباب نشاط اور دفتر متعلق ہے۔

۱۱ء جلیس الدولہ مصاحب الملک سید علی جان شیرازی لطافت رقم بہادر مصاحب خاص حضرت سلطان عالم خلد اللہ ملکہ پوشاک خانہ شاہی اور کوٹھی سید سلطانی اور رسالہ پادشاہی متعلق ہے۔

۱۲ء رفعت الدولہ رفیع الملک کاتب الملوک سید محمد شفیع الرضوی دفتر معتمد اثر شاہی متعلق ہے کاغذات اصلی دستخطی خاص اس دفتر میں داخل ہوتے ہیں اور خدمت تحریر پرچہ و پیام اور شقہ جات بھی سپرد ہے۔

۱۳ء سفیر الدولہ مولوی دین محمد خان بہادر دفتر انگریزی متعلق ہے۔

۱۴ء ضرغام الدولہ مہدی حسن خان بہادر

۱۵ء ترصیع الدولہ زمرد رقم محمد امیر خان بہادر ابن علی رضا جواہر رقم خان بہادر

۱۶ء رئیس الدولہ علی حسن بہادر مطبع سلطانی اور کچہری وساعت اور افسری خوشنویسیان متعلق ہے۔

۱۷ء زین المدققین ہاتف الدولہ عابد حسین خان بہادر کوکب الملک انجم جنگ یہ منجم ہیں۔

۱۸ء ماہتاب الدولہ کوکب الملک سید علی جان خان بہادر درخشان ستارہ جنگ۔

۱۹ء تعیش الدولہ بہادر

۲۰ء گلشن الدولہ مرزا علی خان بہادر یہ شاعر ہیں ان لوگوں کے ذمہ خدمت سرکاری بھی تفویض ہے اور مصاحب بھی ہیں۔

۲۱ء مہتمم الدولہ مدارک الملک محمد جعفر علی خان بہادر اہتمام جنگ۔

۲۲ء انیس الدولہ مونس الملک خانہ زاد خان بہادر دلاور جنگ مصاحب خاص حضرت سلطان عالم۔

۲۳ء مصاحب الدولہ بہادر ہمنشین الدولہ محمد عابد خان بہادر ان کے سپرد کوئی خدمت نہیں مگر مصاحب ہیں۔

۲۴ء مخلص الدولہ سرفراز حسین خان بہادر کچہری اخبار معہ ہرکارگان متعلق ہے۔

۲۵ء مرحمت الدولہ کلب حسین بہادر کوٹھی قیصر البیضا اور فلک باغ اور رسالہ ہندوستانی متعلق ہے۔

۲۶ء تصدیق الدولہ تصدق حسین خان بہادر داروغگی کوٹھی شمس منزل معلی متعلق ہے۔

متعلق ہے۔

۲۸ء خازن الدولہ بہادر تحویل جیب خاص شاہی اور خزانہ شاہی متعلق ہے۔

۲۹ء الطاف الدولہ حیدر علی خان بہادر داروغگی کوٹھی گوشہ سلطانی متعلق ہے۔

۳۰ء منظور الدولہ نواب ناظر علی خان بہادر بگھی خانہ شاہی اور کوٹھی حشمت منزل متعلق ہے۔ اوران کے خدمت سرکاری سپرد ہے اور متوقع المصاحبت ہیں۔

۳۱ء لائق الدولہ محمد جان عالم خان بہادر یہ شاعر ہیں۔

۳۲ء شرافت الدولہ اشرف الدین احمد خان بہادر

۳۳ء تفضیل الدولہ افضل الدین احمد خان بہادر

۳۴ء حمید الدولہ سید عابد علی خان بہادر

۳۵ء حامد الدولہ سید محمود علی خان بہادر

۳۶ء مالک الدولہ جعفر حسین خان بہادر

۳۷ء شرف الدولہ سید محمد شریف علی خان بہادر

۳۸ء ندرت الدولہ بہادر

۳۹ء اخلاص الدولہ احمد علی خان بہادر

۴۰ء عزت الدولہ محتشم الملک روشن علی خان بہادر معتبر جنگ

۴۱ء خالص الدولہ نادر علی خان بہادر

۴۲ء لطیعت الدولہ بہادر عطاء الدولہ بہادر داعی الدولہ بہادر ان لوگوں کے متعلق کوئی خدمت نہیں اور متوقع المصاحبت ہیں۔ (ص ۲۲۹ تا ص ۲۴۴)

(۷) جانوروں کے خطابات

واجد علی شاہ نے جو پرندے اور جانور پالے تھے انھیں بھی دلچسپ خطابات سے نوازا تھا۔ صرف بلبل کو جو خطابات دیئے ہیں تینتالیس سے زیادہ ہیں، انہی سے دوسروں کا اندازہ کیجئے۔

۱ء زیور گل

۲ء آشنائے چمن

۳ء عاشق گل

۴ء گلاب رنگ

۹ء رفیق دیرینہ الک الدولہ کاظم علی خان بہادر افسری کل پیادگان اور حراست کُل ڈھیوڑیات ازواج شاہی اور چاء خانہ متعلق ہے۔

۱۰ء خلاصۃ الدولہ منشی علی نقی خان بہادر لفافہ ملاحظہ کرانا اور مہر خاص ثبت کرنا اور زر میوہ خوری لانا اور داروغگی ارباب نشاط اور دفتر متعلق ہے۔

۱۱ء جلیس الدولہ مصاحب الملک سید علی جان شیرازی لطافت رقم بہادر مصاحب خاص حضرت سلطان عالم خلد اللہ ملکہ پوشاک خانہ شاہی اور کوٹھی سید سلطانی اور رسالہ یادشاہی متعلق ہے۔

۱۲ء رفعت الدولہ رفیع الملک کاتب الملوک سید محمد شفیع الرضوی دفتر معتمد اثر شاہی متعلق ہے کاغذات اصلی دستخطی خاص اس دفتر میں داخل ہوتے ہیں اور خدمت تحریر پرچہ و پیام اور شقہ جات بھی سپرد ہے۔

۱۳ء سفیر الدولہ مولوی دین محمد خان بہادر دفتر انگریزی متعلق ہے۔

۱۴ء ضرغام الدولہ مہدی حسن خان بہادر

۱۵ء ترصیع الدولہ زمرد رقم محمد امیر خاں بہادر ابن علی رضا جواہر رقم خان بہادر

۱۶ء رئیس الدولہ علی حسن بہادر مطبع سلطانی اور کچہری و ساعت اور افسری خوشنویسیاں متعلق ہے۔

۱۷ء زین المدققین ہاتف الدولہ عابد حسین خان بہادر کوکب الملک انجم جنگ یہ منجم ہیں۔

۱۸ء ماہتاب الدولہ کوکب الملک سید علی جان خان بہادر درخشان ستارہ جنگ۔

۱۹ء تعیش الدولہ بہادر

۲۰ء گلشن الدولہ مرزا علی خان بہادر یہ شاعر ہیں ان لوگوں کے ذمہ خدمت سرکاری بھی تفویض ہے۔ اور مصاحب بھی ہیں۔

۲۱ء منتظم الدولہ مدارک الملک محمد جعفر علی خان بہادر اہتمام جنگ۔

۲۲ء انیس الدولہ مونس الملک خانہ زاد خان بہادر دلاور جنگ مصاحب خاص حضرت سلطان عالم۔

۲۳ء مصاحب الدولہ بہادر ہمنشین الدولہ محمد عابد خان بہادر ان کے سپرد کوئی خدمت نہیں مگر مصاحب ہیں۔

۲۴ء مخلص الدولہ سرفراز حسین خان بہادر کچہری اخبار معہ ہرکارگان متعلق ہے۔

۲۵ء مرحمت الدولہ کلب حسین بہادر کوٹھی قیصر البیضا اور فلک باغ اور رسالہ ہندوستانی متعلق ہے۔

۲۶ء تصدیق الدولہ تصدق حسین خان بہادر داروغگی کوٹھی شمس منزل معلیٰ متعلق ہے۔

متعلق ہے۔

۲۸ء خازن الدولہ بہادر تحویل جیب خاص شاہی اور خزانہ شاہی متعلق ہے۔

۲۹ء الطاف الدولہ حیدر علی خان بہادر داروغگی کوٹھی گوشہ سلطانی متعلق ہے۔

۳۰ء منظور الدولہ نواب ناظر علی خان بہادر بگھی خانہ شاہی اور کوٹھی حشمت منزل متعلق ہے۔ اور ان کے خدمت سرکاری سپرد ہے اور متوقع المصاحبت ہیں۔

۳۱ء لائق الدولہ محمد جان عالم خان بہادر یہ شاعر ہیں۔

۳۲ء شرافت الدولہ اشرف الدین احمد خان بہادر

۳۳ء تفضیل الدولہ افضل الدین احمد خان بہادر

۳۴ء حمید الدولہ سید حامد علی خان بہادر

۳۵ء حامد الدولہ سید محمود علی خان بہادر

۳۶ء مالک الدولہ جعفر حسین خان بہادر

۳۷ء شرف الدولہ سید محمد شریف علی خان بہادر

۳۸ء ندرت الدولہ بہادر

۳۹ء اخلاص الدولہ احمد علی خان بہادر

۴۰ء عزت الدولہ محتشم الملک روشن علی خان بہادر معتبر جنگ

۴۱ء خالص الدولہ نادر علی خان بہادر

۴۲ء لطیف الدولہ بہادر، عطاء الدولہ بہادر، داعی الدولہ بہادر ان لوگوں کے متعلق کوئی خدمت نہیں اور متوقع المصاحبت ہیں۔ (ص ۳۲۹ تا ص ۳۴۴)

(۷) جانوروں کے خطابات

واجد علی شاہ نے جو پرندے اور جانور پالے تھے انھیں بھی دلچسپ خطابات سے نوازا تھا۔ صرف بلبل کو جو خطابات دیئے ہیں تینتالیس سے زیادہ ہیں، انہی سے دوسروں کا اندازہ کیجئے۔

۱ء زیور گل

۲ء آشنائے چمن

۳ء عاشق گل

۴ء گلاب رنگ

ع۵ شب گو
ع۶ شب نوا
ع۷ شب بیدار
ع۸ شب دوست
ع۹ خوش گو
ع۱۰ شب صدا
ع۱۱ خوش صدا
ع۱۲ خوش نوا
ع۱۳ شب صوت
ع۱۴ زاہد نما
ع۱۵ پارسا
ع۱۶ تسبیح گو
ع۱۷ شب گلو
ع۱۸ شب آواز
ع۱۹ یل بیدار
ع۲۰ شاہد چمن
ع۲۱ آرام دل
ع۲۲ پر صد
ع۲۳ راحت دل
ع۲۴ درد جگر
ع۲۵ راحت گوش
ع۲۶ خوش داستان
ع۲۷ بے خواب
ع۲۸ صدائے ملک

۳۰ء شب زندہ دار
۳۱ء مخزن الاصوات
۳۲ء فلک آشیان
۳۳ء لیل گو
۳۴ء ضوفشاں
۳۵ء ساطع
۳۶ء سُردار
۳۷ء سوزجگر
۳۸ء جواہر سیاب
۳۹ء جیفہ آدم
۴۰ء خاتم آرام
۴۱ء قلب خوش (ص ۳۴۵)

(۸)

محلات وکوٹھیات کے خطابات

دیگر خطابات بعد ترتیب کتاب راقم نے دیئے ہیں۔

متعلق کوٹھی جواہر منزل خاص کوٹھی

برآمدہ شمالی :۔ برآمدہ جنوبی۔ برآمدہ مغربی۔ برآمدہ شرقی راست منزل۔ چپ منزل۔ مشرق منزل۔ مغرب منزل رقص منزل۔ روح افزا خطاب سقفِ کوٹھی چشمہ حیوان واقع کمرہ رقص منزل (ص ۳۶۲)

متعلقہ محلسرائے نواب یادگار محل صاحبہ

خورد منزل بیت الحزن چشمہ مشترک

اطلاع کوٹھی سلطان خانہ مبارک

بادشاہ منزل' بالامنزل'۔ جہاں نما' سڑک سطح ۔

مرصع منزل

چشمہ مرصع مرصّع باغ پسند باغ باغ گرو بنگلہ فرحت منزل

خطاب بنگلہ نصرت منزل

مرغزار سلطانی' رمنہ' مرتفع منزل' مورج' نام چبوترہ کہ زیر شجرۂ بادام است رمنۂ راحت افزا
در عدالت منزل است چشمۂ دشت' (صفحہ ۳۶۴ (۹))

قانون اختری

حفظ عصمت مرد و زن اور ہدایت بیگمات کے واسطے مشتمل اوپر آٹھ دفعہ کے

دفعہ پہلی

کسی غیر مرد نامحرم کے مونھہ پر نظریں نہ چھوئیں خواہ پیش مالک خواہ پیٹھ پیچھے

دفعہ دوسری

غیر مرد نامحرم سے بات کرتے وقت اپنی نظریں نیچی رکھیں خواہ مالک کے آگے خواہ غیبت میں۔

دفعہ تیسری

جو شخص مالک کے رُوبرُو بیٹھتا ہو کسی ضرورت کے وقت اگر ان کے سامنے بھی بیٹھ جائے مضائقہ نہیں سوائے ویسے شخص لائق کے اور کسی نامحرم مرد کو قریب بٹھلانے کی اجازت نہیں۔

دفعہ چوتھی

کسی غیر نامحرم مرد کو گلوری پان کی دینے کی اجازت نہیں۔

دفعہ پانچویں

کسی نامحرم غیر مرد کو حُقّہ پلوانے کی اجازت نہیں۔

دفعہ چھٹی

کسی غیر مرد نامحرم کا نام نہ لو خواہ پیش مالک خواہ پس مالک بلکہ اس فرقے کے نام سے اسے پکارو یعنی کوئی آدمی ہے یا کوئی کبوتر باز یا جانور باز یا داروغہ یا باغبان یا مکان دار یا ماہی پرید وغیرہ یہ نہ کہو کہ نام تو نواب علی ہے پیارے کہو نبّو یا فلان یا بیگ یا خان ادھر آؤ یا میر صاحب یا مرزا صاحب یا شخصیات۔

دفعہ ساتویں

کسی نامحرم غیر مرد کے دست بدست کوئی چیز نہ لو بلکہ لانے والا زمین یا اس جگہ پر باآرام وحفاظت دھر دے بعد اُس کے اپنے ہاتھ سے اٹھا کر لینے والے اپنے مصرف میں لائیں۔

دفعہ آٹھویں

غیر مرد نامحرم جو رومال سے فرش کو صاف کریں تو نامحرم عورتیں ان کو صفائی کی جگہ دے دیا کریں ایسا نہ ہو کہ کسی کا ہاتھ ان کے اجسام سے صفائی کے وقت مس ہو تو باعث ناخوشی مالک اور غضب خدا ہو۔ چاہیئے کہ ان آٹھوں ہدایات کو ہمہ وقت مدنظر رکھیں تا خاوند اور خداوند دونوں خوشنود ہوں اور دنیا کا کار بھی بند نہ رہے اگر تم کو پردے میں بٹھا دیا جائے تو کسی قدر تمھارے خاوند کو البتہ بے چینی ہوگی اور عجب نہیں کہ اس بے چینی کی جہت سے تم لوگ اپنے خاوند کے ملاقات سے معذور ہو جاؤ اگر اس ہدایت پر چلو گی اپنے خاوند کے پہلو میں رہو گی بلکہ ہمہ وقت دل میں گھر ہوگا خدا تم عورتوں کا ہادی ہے بس۔ (ص ۳۶۵ و ص ۳۶۶)

(۱۰) احکامات واسطے بیگمات سلطان خشا | مبارک اور جواہر منزل اور خاص منزل شامل

میں دفعہ پر۔

دفعہ پہلی

ہمیشہ اپنے کو خوشبو میں رکھیں۔

دفعہ دوسری

دھویا ہوا اور اُجلا کپڑا جو کچھ سرکار سے ملتا ہے یا اپنی لیاقت کے موافق جیسا بنایا ہو پہنا کریں زنہار زنہار میلی اور دھبے دار اور پھٹی پوشاک خواہ پائجامہ خواہ دوپٹہ خواہ چھوٹے کپڑے نہ پہنا کریں ورنہ جن کے سپرد ہیں اور جو ان کے اہتمام والے ہیں ان سے مواخذہ ہوگا اور وہی داروغہ لوگ اس کے جواب دہ ہوں گے۔

دفعہ تیسری

پوشاک میں اور ہاتھوں میں اور مُنہ ہرگز ہرگز کسی طرح کی بدبو نہ آنے پائے۔

دفعہ چوتھی

پاؤں اور تلوے ہمیشہ آئینے کی طرح صاف اور چکتے رہیں اور کسی طرح کا میل اور آخور نہ ہوا کرے۔

دفعہ پانچویں

بالوں میں خوشبو روغن اور آنکھوں میں کاجل یا سرمہ ہاتھوں میں مہندی پہنچوں تک ہمیشہ رہا کرے۔

دفعہ چھٹی

جو کنواریاں ہیں وہ بغیر حکم از خود مسّی نہ لیں اور جو مل چکیں ہیں ان کا مضائقہ نہیں۔

دفعہ ساتویں

کوئی بلاق چھیدنے کا قصد نہ کرے ممانعت قطعی ہے۔

دفعہ آٹھویں

کوئی تمباکو کھانے اور حقہ پینے کا قصد نہ کرے ممانعت دائمی ہے۔

دفعہ نویں

کوئی پیر دل پر انگلیوں کے یا پاؤں کے ناخنوں پر یا ہتھیلی یا تلووں میں کسی طرح مہندی کا نقش و نگار جسے فندق کہتے ہیں نہ بنائے ممانعت قطعی ہے۔

دفعہ دسویں

بلانے کے وقت حتی الوسع جلد حاضر ہوا کریں۔

دفعہ گیارہ

بے باک و بے حجاب حاضر ہوا کریں۔

دفعہ بارہ

مزاج پرسی میں ایک جواب دس کو اور سو کو اور ایک کو کافی ہے البتہ جو بعد جواب دینے کے نئی آئیگی اور مزاج کا حال پوچھے گی اسے دوسرا جواب دیا جائے گا۔

دفعہ تیرہ

میں تمہاری آمد و رفت کے ملاحظہ کو فقط جواہر منزل اور خاص منزل میں آکر بیٹھا کرتا ہوں اور اب تم صاحبوں نے یہ رویہ اور شیوہ اختیار کیا ہے کہ اکثر میرے سامنے کا چلنا پھرنا بچا جاتی ہو بلکہ اکثر بنظر ضرورت کوئی ضرورت کو جاتا بھی ہے تو وہاں سے پھر پلٹ کر میری دہشت سے اپنے مکان پر نہیں آتا ہے بلکہ و اللہ اعلم اور کدھر چلا جاتا ہے جیسا کہ ایک دن نواب صبیحہ بیگم صاحبہ اور نواب اللہ جلائی بیگم صاحبہ میرے سامنے سے مزاج پوچھ کر بیت الخلا گئیں شاید ایک بجا ہو دن کا

پس سبھوں کو لازم ہے کہ اپنی آمد و رفت ضروری سے ہماری آنکھوں کو محروم نہ رکھا کریں کہ ہم کو موجب خوشنودی ہے نہ باعث ناراضی البتہ دوسرے کے مکان میں رہ جانیکی ممانعت ہے سیدھے جاؤ اپنے گھر کو پلٹ کر آؤ۔

دفعہ چودہ

جب خلوت میں ہمارے پاس آؤ چپ نہ بیٹھو کسی نہ کسی طرح کی باتیں ضرور ہم سے کئے جاؤ ورنہ باعث ہمارے نہایت ناراضی کا ہوگا اور اس وقت اپنے دل پر جبر نہ کرو۔ دل چاہے بیٹھو دل چاہے لیٹو۔

دفعہ پندرہ

خاصہ پکانے کے وقت کا غل ہمارے دماغ کو اس مرتبہ بے چین کرتا ہے۔

(ص ۲۶۹، صفحہ ۲۷۲)

بڑی مشکل سے یہ کتاب دہلی سے مجھے دستیاب ہوسکی، اب یہ چیزیں کہاں ملتی ہیں، لیکن جو نسخہ ہاتھ لگا وہ نامکمل تھا، پھر بھی اس سے کام کی سب چیزیں میں نے اخذ کر لیں!!

باب (۲)

واجد علی شاہ کی بزم سخن

واجد علی شاہ خود بھی، بہت بڑے اور بہت اچھے شاعر تھے، اور انھوں نے اپنے دربار میں چھانٹ چھانٹ کر ایسے نغز گو اور غزل سرا جمع کئے تھے، جو اپنی مثال آپ تھے جن کا رنگِ سخن اپنے اندر انفرادیت کی خاص شان رکھتا تھا، جن کی شاعرانہ سیرت اور کردار میں بھی ایک خاص رنگ جھلکتا تھا،

عہدِ واجد علی شاہ کے اساتذہ سخن، اور ماہرین فن کا ذکر نسبتًا تفصیل سے آپ کسی دُوسرے باب میں ملاحظہ کریں گے جس دربار میں انیسؔ و دبیرؔ جیسے یگانۂ فن موجود ہوں، جس عہد میں آتشؔ اور ناسخؔ کا ڈنکا بج رہا ہو، جس دور میں میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ جیسے یکتائے روزگار موجود ہوں، جس زمانہ میں نواب مرزا شوقؔ کی بے مثل مثنویاں، الفاظ کا پیکر بن رہی ہوں، اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، اس عہد کا سرسری جائزہ لینے پر امؤرخ مجبور ہے۔

لیکن اس باب میں ہم صرف واجد علی شاہ کی بزم سخن کے ان غزل سراؤں کا ذکر کرینگے جو ذاتی طور پر واجد علی شاہ سے، اپنے غیر معمولی ربط و تعلق کی بنا پر والہانہ وابستگی رکھتے تھے، یہ لوگ جس طرح، واجد علی شاہ کے عروج اور فروغ کے زمانہ میں فدوی خاص اور جان نثار با اختصاص بنے ہوئے تھے اسی طرح، اس وقت بھی اپنے آقا کے وفادار رہے، جب اودھ کی سلطنت چھینی جا چکی تھی، قیصر باغ کے فلک شکوہ محلات ویران ہو چکے تھے، اور واجد علی شاہ "نظر" بند اور" پابند کر کے کلکتہ کے ایک مضافاتی علاقہ "مٹیا برج" میں بھیج دیئے گئے تھے، اور ادبار و فلاکت کے عالم میں زندگی کے دن گذار رہے تھے،

نواب حیدر علی خان نظمؔ طباطبائی، واجد علی شاہ کے معتمد اور مخصوصین میں تھے، علوم عقلی و نقلی کے ماہر، منطق اور فلسفہ کے امام دریائے فصاحت و بلاغت کے شناور فن عروض و قوافی کے استاد، سخن ور سخن دان، نغز گو، غزل سرا، شاعر، انشا پرداز، غرض غیر معمولی خصوصیات کے حامل،

رہے، ان کی وفات کے بعد، اپنے وطن لکھنؤ میں واپس آگئے، لیکن اب دیس پردیس بن چکا تھا جی نہ لگا، دکن کے شہریار نے قدر افزائی کی، وہاں چلے گئے، اور پھر ساری زندگی ادھر میں گذار دی، تاریخ کا یہ بھی کتنا عبرت ناک باب ہے، ایک زمانہ تھا کہ دربار دہلی کے فن کار اور ہنر در حالات سے مجبور ہوکر، لکھنؤ کا رُخ کرتے تھے، اور ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے تھے، یا اب لکھنؤ کے باکمال آشفتہ حال ابن کر دکن کا رُخ کر رہے تھے، اور وہاں سر آنکھوں پر بٹھائے جا رہے تھے، طباطبائی عمر بھی بڑی طویل لے کر آئے تھے، انھوں نے عہد واجد علی شاہ کی رعنائیاں دیکھیں، فرنگی دور کی ہلاکتیں، اور بربادیاں دیکھیں، پھر دربار دکن کی قدردانیاں اور حوصلہ افزائیاں دیکھیں، اور آخر ایک روز ہمیشہ ہمیشہ کے لئے، آنکھیں موندلیں،

یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا،

طباطبائی نے حیدر آباد کے دوران قیام میں، عہد واجد علی شاہ پر کئی تحریریں لکھیں، متعدد مضامین سپرد قلم کئے، اپنی دیکھی ہوئی اور پرکھی ہوئی شخصیتوں کا تذکرہ کیا، جو نظارے خود کر چکے تھے، انھیں اس طرح بیان کیا کہ دُوسرے بھی یہ محسوس کرنے لگے، گویا، وہ طباطبائی کی زبان سے کوئی داستان نہیں سُن رہے ہیں بلکہ اپنی آنکھوں سے واقعات و حالات کا نظارہ کر رہے ہیں طباطبائی نے، مٹیابرج کے واجد علی کے شاہی شعرا کا تذکرہ بھی اپنے مخصوص اور منفرد انداز میں لکھا ہے۔ ذیل میں جن شعرا کا ذکر کیا جاتا ہے، وہ اسی سے ماخوذ ہے:

اشعار

ہر مصرع ہو جو حاصل مصرع تر دوسرا
مرغ معنی کے لئے پیدا ہو شہپر دوسرا

حالِ ابنائے زماں ہے مثلِ سنگِ آسیا
ایک ہے آرام میں کھاتا ہے چکر دوسرا

نیک پر ہے فوق بد کو بحرِ عالم میں تو کیا
خس نظر آتا ہے مجھ کو ایک۔ گوہر دوسرا

گلشن عالم میں کی اک وضع پر ہم نے بسر
پیرہن بدلا نہ مانند صنوبر دوسرا

کیوں پٹے روزی کہ ناکس سے کرتا ہے رجوع
بند کر سکتا نہیں رزقِ مقدر دوسرا

دستِ رس میرا جو ہو پتھر سے توڑوں آئینہ
دیکھنے پائے نہ تیرا روئے انور دوسرا

کام وہ کر جس سے راحت گور کی منزل میں ہو
تا قیامت تو رہے جس میں نہیں گھر دوسرا

ذبح کیا کرتے ہو چھوڑو باندھ کر پر بام پر
ایک کو دیکھے تو آ بیٹھے کبوتر دوسرا

اے درخشاں جس کے مضموں سے ہے روشن اک جہاں
شاہ اختر سا نہیں دیکھا سخن در دوسرا

اس غزل میں حسن بندش لطف تغزل شانِ عشق دیکھنے کی چیزیں ہیں۔ غزل میں زبان کا مزہ ردیف کے چمکنے سے پیدا ہوتا ہے اس کے ہر شعر میں ردیف ایسا مزہ دے رہی ہے جیسے ترانہ میں سم۔ ہر شعر کے حاصل معنی کو دیکھئے کیسے پُر مغز مضامین ہیں۔ مطلع میں شہرت کا استعارہ شہپر ہے بنگِ آسیا کی تشبیہ۔ خس کا پانی کے اوپر بہنا اور گوہر کا تہہ نشین ہونا۔ صنوبر اور مقدر کے قافیہ میں قناعت کا اور آئینہ والے شعر میں غیرت کا مضمون داد طلب ہے گھر کا قافیہ بھی ردیف سے خوب لپٹا ہے اور مضمون بھی عبرت خیز ہے۔ ایک کبوتر کو دیکھ کر دوسرے کا آ بیٹھنا کیا اچھی تخییل ہے شعر کی جان ہے ورنہ شاعر کوئی واعظ نہیں ہے کہ سارا کلام اُس کا پند ناصح ہو۔ مقطع میں بادشاہ کی مدح ہے۔ ذوالفقار الدولہ بادشاہ کے مقرب و رفیق خاص تھے۔ ان کے یہاں مشاعرہ تھا اور سب کو معلوم تھا کہ جہاں پناہ بھی رونق افروز ہوں گے۔ غزلیں بھی شعرا نے فکر سے کہیں اور ایک آدھ شعر میں انکی مدح بھی کی ہے۔ بادشاہ کہتے تو بہت تھے مگر مشاعرہ میں آنے کا ذوق نہ تھا اسی سبب سے مشاعرہ ٹوٹ گیا۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا تھا کہ ہوادار پر سوار چلے جا رہے ہیں۔ شعرا کو باریابی کا موقع مل گیا باتوں باتوں میں کوئی مصرع حضرت کی زبان سے نکل گیا سب نے مل کر اسے طرح قرار دے لیا۔ پھر جو سواری ہوئی تو اپنی اپنی غزلیں سناتے ہوئے ہوادار یا بوچے کے ساتھ ساتھ چلے۔ بوچے کے کہار مزاج

گزرے۔ شعرا جب پڑھ چکے اور داد دے چکے تو رئیس الدولہ جو خوشنویسوں کے افسر اور مطبع سلطانی مہتمم تھے بوچے کے قریب آئے اور بادشاہ کی غزل صاف کی ہوئی گزران دی۔ اُن سے غزل لے کر حضرت نے پڑھنا شروع کی۔ کلام الملوک ملوک الکلام کا شور بلند ہوا جیسے مشاعرہ ہوگیا جہاں پناہ رہن منزل میں داخل ہوگئے۔ رئیس الدولہ بھی شعر کہتے تھے۔ اور مہتاب الدولہ سے مشورہ تھا۔

ولہ

کیا نام خدا قبلہ نما دل نظر آیا | محراب سا ابرو کے مقابل نظر آیا
دریائے محبت کا نہ پوچھو حد و پایاں | جی ڈوب گیا جب مجھے ساحل نظر آیا
مرجانے سے بدتر ہے غمِ دوری احباب | دیدار فقط زیست کا حاصل نظر آیا
نالاں ہے جراحت سے نہیں طالبِ مرہم | دل صورتِ منقارِ عنادل نظر آیا

نازک ہے فنِ شعر نہایت ہی درخشاں
کہنے سے سمجھنا مجھے مشکل نظر آیا

محراب ابرو کی گنجائش وزن میں نہ تھی۔ محراب سا ابرو باندھ دیا۔ نام خدا کا لفظ محض قبلہ و محراب کی رعایت سے رکھا ہے اور بھرتی کا لفظ معلوم ہوتا ہے۔ دوسرے شعر میں جی ڈوب جانا بھی دریا کی رعایت سے لائے ہیں مگر وہ بُرا نہیں معلوم ہوتا۔ رعایت لفظی کرنے میں اتنا سلیقہ شاعر کو ضرور ہونا چاہیئے کہ رعایت متبذل و متبکر میں تمیز کرے۔ یورپ کے شاعروں کی تقلید میں جو لوگ رعایت سے مطلقاً نفرت ظاہر کرتے ہیں ان کی رائے یہ ہے کہ کسی محل پر رعایت اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ مگر تجربہ اس کے خلاف ہے۔ میں اس کو ویسی ہی بات سمجھتا ہوں کہ کسی کو اُبلا ہوا گوشت پسند ہے۔ کسی کو بُھنا ہوا۔ حد و پایاں میں ایک لفظ مؤنث ایک لفظ مذکر ہے۔ مگر دونوں مل کر مذکر ہی بولے جائیں گے۔ دل دو نیم کی تشبیہ منقارِ عنادل سے اور مقطع میں بندش کی صفائی و طرزِ بیان نہایت پُرلطف ہے۔

ولہ

کبھی تم نے بھی گُل کھایا تو ہوتا | جلانے کا مزہ پایا تو ہوتا
کوئی میرے لئے ہے بے خور و خواب | تمھیں اتنا خیال آیا تو ہوتا
کہیں سکتہ نہ عاشق کو ہوا ہو | اُسے آئینہ دکھلایا تو ہوتا
پلائی گر نہ ساقی نے مجھے مے | دکھا کر جام ڈمکایا تو ہوتا

اشعار

ہر مصرع ہو جو حاصل مصرع تر دوسرا — مرغ معنی کے لئے پیدا ہو شہپر دوسرا

حال ابنائے زماں ہے مثل سنگ آسیا — ایک ہے آرام میں کھاتا ہے چکر دوسرا

نیک پر ہے فوق بدکو بحرِ عالم ہیں تو کیا — خس نظر آتا ہے مجھ کو ایک۔ گوہر دوسرا

گلشن عالم میں کی اک وضع پر ہم نے بسر — پیرہن بدلا نہ مانند صنوبر دوسرا

کیوں پئے روزی کسی ناکس سے کرتا ہے رجوع — بند کر سکتا نہیں رزق مقدر دوسرا

دستِ رس میرا جو ہو پتھر سے توڑوں آئینہ — دیکھنے پائے نہ تیرا روئے انور دوسرا

کام وہ کر جس سے راحت گور کی منزل میں ہو — تا قیامت تو رہے جس میں نہیں گھر دوسرا

ذبح کیا کرتے ہو چھوڑ و باندھ کر پر بام پر — ایک کو دیکھے تو آبیٹھے کبوتر دوسرا

اے درخشاں جس کے مضمون سے ہے روشن اک جہاں
شاہ اختر سا نہیں دیکھا سخن در دوسرا

اس غزل میں حسن بندش لطف تغزل شان مشق دیکھنے کی چیزیں ہیں۔ غزل میں زبان کا مزہ ردیف کے چکنے سے پیدا ہوتا ہے اس کے ہر شعر میں ردیف ایسا مزہ دے رہی ہے جیسے ترانہ میں سم۔ ہر شعر کے حاصل معنی کو دیکھئے کیسے پُر مغز مضامین ہیں۔ مطلع میں شہرت کا استعارہ شہپر ہے بسنگ آسیا کی تشبیہ۔ خس کا پانی کے اوپر بہنا اور گوہر کا تہہ نشین ہونا۔ صنوبر اور مقدر کے قافیہ میں قناعت کا اور آئینہ والے شعر میں غیرت کا مضمون داد طلب ہے گھر کا قافیہ بھی ردیف سے خوب لپٹا ہے اور مضمون بھی عبرت خیز ہے۔ ایک کبوتر کو دیکھ کر دوسرے کا آبیٹھنا کیا اچھی تخیئل ہے شعر کی جان ہے ورنہ شاعر کوئی واعظ نہیں ہے کہ سارا کلام اُس کا پند ناصح ہو۔ مقطع میں بادشاہ کی مدح ہے۔ ذوالفقار الدولہ بادشاہ کے مقرب و رفیق خاص تھے۔ ان کے یہاں مشاعرہ تھا اور سب کو معلوم تھا کہ جہاں پناہ بھی رونق افروز ہوں گے۔ غزلیں بھی شعرا نے فکر سے کہیں اور ایک آدھ شعر میں انکی مدح بھی کی ہے۔ بادشاہ کہتے تو بہت تھے مگر مشاعرہ میں آنے کا ذوق نہ تھا اسی سبب سے مشاعرہ ٹوٹ گیا۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا تھا کہ ہوا دار پر سوار چلے جا رہے ہیں۔ شعرا کو باریابی کا موقع مل گیا باتوں باتوں میں کوئی مصرع حضرت کی زبان سے نکل گیا سب نے مل کر اسے طرح قرار دے لیا۔ پھر جو سواری ہوئی تو اپنی اپنی غزلیں سناتے ہوئے ہوا دار یا بوچے کے ساتھ ساتھ چلے۔ بوچے کے کہار مزاج

گزرے۔ شعرا جب پڑھ چکے اور داد دے چکے تو رئیس الدولہ جو خوشنویسوں کے افسر اور مطبع سلطانی مہتمم تھے بوچے کے قریب آئے اور بادشاہ کی غزل صاف کی ہوئی گزران دی۔ اُن سے غزل لے کر حضرت نے پڑھنا شروع کی۔ کلام الملوک ملوک الکلام کا شور بلند ہوا جیسے مشاعرہ ہوگیا جہاں پناہ رہن منزل میں داخل ہوگئے۔ رئیس الدولہ بھی شعر کہتے تھے۔ اور مہتاب الدولہ سے مشورہ تھا۔

ولہ

کیا نام خدا قبلہ نما دل نظر آیا　　محراب سا ابرو کے مقابل نظر آیا
دریائے محبت کا نہ پوچھو حد و پایاں　　جی ڈوب گیا جب مجھے ساحل نظر آیا
مرجانے سے بدتر ہے غمِ دوریِ احباب　　دیدار فقط زیست کا حاصل نظر آیا
نالاں ہے جراحت سے نہیں طالبِ مرہم　　دل صورتِ منقارِ عنادل نظر آیا

نازک ہے فنِ شعر نہایت ہی درخشاں
کہنے سے سمجھنا مجھے مشکل نظر آیا

محراب ابرو کی گنجائش وزن میں نہ تھی۔ محراب سا ابرو باندھ دیا۔ نام خدا کا لفظ محض قبلہ و محراب کی رعایت سے رکھا ہے اور بھرتی کا لفظ معلوم ہوتا ہے۔ دوسرے شعر میں جی ڈوب جانا بھی دریا کی رعایت سے لائے ہیں مگر وہ بُرا نہیں معلوم ہوتا۔ رعایت لفظی کرنے میں اتنا سلیقہ شاعر کو ضرور ہونا چاہیئے کہ رعایت متبذل و متبکر میں تمیز کرے۔ یورپ کے شاعروں کی تقلید میں جو لوگ رعایت سے مطلقاً نفرت ظاہر کرتے ہیں ان کی رائے یہ ہے کہ کسی محل پر رعایت اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ مگر تجربہ اس کے خلاف ہے۔ میں اس کو ویسی ہی بات سمجھتا ہوں کہ کسی کو اُبلا ہوا گوشت پسند ہے۔ کسی کو بُھنا ہوا۔ حد و پایاں میں ایک لفظ مؤنث ایک لفظ مذکر ہے۔ مگر دونوں مل کر مذکر ہی بولے جائیں گے۔ دل دونیم کی تشبیہ منقار عنادل سے اور مقطع میں بندش کی صفائی و طرز بیان نہایت پُرلطف ہے۔

ولہ

کبھی تم نے بھی گُل کھایا تو ہوتا　　جلانے کا مزہ پایا تو ہوتا
کوئی میرے لئے ہے بے خور و خواب　　تمھیں اتنا خیال آیا تو ہوتا
کہیں سکتہ نہ عاشق کو ہوا ہو　　اُسے آئینہ دکھلایا تو ہوتا
پلائی گر نہ ساقی نے مجھے مَے　　دکھا کر جام ڈسکایا تو ہوتا

سبب سے کہہ گئے ہیں۔ خواب وخیال میں مراعات النظیر پھر موجود ہے اور بے شک بُری معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اُس کے بُرا معلوم ہونے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ رعایت لفظی اصل میں بڑی چیز ہے بلکہ مبتذل ہونے کی وجہ سے بُری معلوم ہو رہی ہے یعنی خواب کے ساتھ خیال کا لفظ دو لاکھ دفعہ کہا گیا ہے اب سنتے سنتے جی اُکتا گیا۔ تیسرے شعر میں عاشق کا لفظ مبتذل ہے۔ ان کا شعر مجھے یاد آیا اسی مضمون کو کیا اچھی طرح کہا ہے ؎

سکتہ میں وہ آئینہ دکھا کر مجھے بولے — پتھر پڑیں اے شخص تری بے خبری پر

ڈہکانے کا شعر بہت صاف ہے مگر ایک پرہیزگار کہہ رہا ہے کہ مجھے مے نہ پلائی بھتی توڑ مکایا ہی ہوتا اس کے معنی کیا۔ معنی اس کے یہ ہیں کہ شراب کا مضمون فارسی و اُردو کی شاعری میں معرکہ شعرا ہے خواہ کوئی شراب پئے یا نہ پئے ان مضامین کا کہنا ضرور ہے۔ ایسے ہی اور بھی امرار ہیں جو ہر زبان کی شاعری میں پائے جاتے ہیں۔ یورپ کی شاعری بھی اس رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ لیکن انصاف یہ ہے کہ ایسے مضامین کہنا ضروری ہی کیا ہے۔ آغا جو شرف مرحوم نے شراب، ساقی، پیر مغاں، مے خانہ، واعظ، زاہد، سبحہ، زنار، مسجد، بت خانہ، وغیرہ کا ذکر غزل میں ترک کر دیا تھا۔ کہتے تھے آخر اس کے معنے کیا کہ شراب سے نفرت واعظ سے عقیدت اور پھر اُس کی تعریف کریں اور اس کی مذمت۔ اس قسم کے شعر سراسر غیر واقعی ہوا کرتے ہیں مجھے اُس سے کچھ لطف نہیں ملتا۔ اُسی زمانہ میں مرزا غالب کا دیوان پہلی دفعہ لکھنؤ سے چھپ کر نکلا۔ ایک دن کیا دیکھتا ہوں کہ شرف تڑپ رہے ہیں اور بے چین ہوئے جاتے ہیں۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگے بھئی مرزا نوشہ نے ایک شعر کہا ہے کہ میں نے کلیجہ پکڑ لیا ہے۔ ؎

نظر لگے نہ کہیں اُس کے دست و بازو کو — یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

یہ غزل بھی اسی طرح کے مشاعرہ کی ہے جو سواری کے ساتھ ساتھ ہوا کرتا تھا۔ بادشاہ کی غزل بھی اسی طرح میں ہے۔ مجھ سے رئیس الدولہ نے ذکر کیا کہ اپنی غزل پڑھ کر حضرت نے خواجہ حیدر علی آتش کا مطلع پڑھا ؎

کبھی وہ سرو قد آیا تو ہوتا — کوئی دم گور پر سایہ تو ہوتا

اور مہتاب الدولہ سے فرمایا کہ دیکھو بظاہر یہ مطلع دو لخت معلوم ہوتا ہے۔ انھوں نے عرض کیا بجا ارشاد ہوتا ہے۔ کہنے لگے نہیں۔ سرو کو گور سے اک مناسبت ہے۔ یہ درخت قبرستان میں اکثر لگاتے ہیں۔ یہ ایران کی رسم ہے۔ مہتاب الدولہ نے کہا کہ کوئی دم کا لفظ بھی سرو کے مناسب حال ہے

... اساتذہ سایہ اور آیا کبھی قافیہ نہ کریں گے۔

اُردو میں کوئی اس کا خیال نہیں کرتا۔ میں نے بھی یہی اختیار کر لیا۔ جناب الدولہ نے ناسخ کا مطلع پڑھا کہ ؎

گھر غم فرقت میں سُونا ہو گیا ❊ کنج مرقد کا نمونہ ہو گیا

اور عرض کیا کہ دیکھئے شیخ نے بھی ہائے مختفی کو روی قرار دیا ہے۔ جناب مُفتی میر عباس صاحب کے پاس یہ ذکر پہنچا۔ اُنھوں نے اس مسئلہ میں یہ اجتہاد فرمایا کہ دیکھا اور نمونہ اور اچھا قافیہ نہ کرنا چاہیئے۔ لیکن سایہ اور آیا اور نمونہ اور سونا میں کچھ قباحت نہیں۔ ایک بادشاہ کے دم سے قیاباً میں عجب دلچسپ مجمع رہا۔ کیسے کیسے دقائق چھن گئے اور کتنے لوگ شاعر و طبیب و علّامہ بن گئے رئیس الدولہ نے مجھ سے پوچھا کہ جناب مفتی صاحب نے یہ تفصیل جو کی میری سمجھ میں اس کی وجہ نہ آئی دیکھا اور سایہ قافیہ غلط اور آیا اور سایہ صحیح۔ میں نے کہا کہ دیکھا اور سایہ میں ہائے مختفی کو سوا روی قرار دینے کے اور کوئی صورت نہیں اور فارسی والے کبھی ہائے مختفی کو روی نہیں قرار دیتے۔ کہنے لگے ہمیں فارسی والوں سے کیا غرض۔ میر انیس اور مرزا دبیر ہمارے زمانہ کے بڑے شاعر ہیں یہ لوگ تو ہائے مختفی اور الف کو ایک چیز سمجھتے ہیں اور بے تکلف دریا کے ساتھ چشمہ باندھا کرتے ہیں اور صحرا کا قافیہ سبزہ کر دیا کرتے ہیں اور کچھ بُرا بھی نہیں معلوم ہوتا۔ میں نے کہا اگر چشمہ کا قافیہ مجمع یا کون و مکاں کا قافیہ ارض و سما کر دیجئے تو بُرا تو جب بھی نہ معلوم ہو گا۔ کہنے لگے تو پھر سُونا اور نمونہ بھی غلط ہے۔ الف ہو تو سب جگہ الف ہی ہو۔ ہ ہو تو سب جگہ بس ہ ہو۔ میں نے انھیں سمجھایا کہ حسب قاعدہ کہیں ہ ہونا ہی نہ چاہئے۔ خصوصاً ترکیب فارسی میں ہو تو نہایت مہمل بن معلوم ہوتا ہے اور جناب مفتی صاحب قبلہ کا مقصود یہی ہے کہ فقط اُردو کے واسطے اجازت ہے کہ سُونا اور نمونہ قافیہ کر لیں ورنہ فارسی میں ایسا نہیں ہو سکتا جیسا کہ بادشاہ نے ارشاد فرمایا۔

ولہ

کیا شرف ذات کا گر فیض کا جوہر نہ ہُوا ❊ آب گوہر سے لب خشک کبھی تر نہ ہُوا
جامۂ سلطنت و فقر برابر نہ ہُوا ❊ شکل آئینہ نمد پوش سکندر نہ ہُوا
بحر ہستی میں ہے دن رات رواں کشتی عمر ❊ خواب سنگیں بھی اس کے لئے لنگر نہ ہُوا
بخیہ درکار نہیں چشم مروت کے لئے ❊ آشنا باز کی وحشت سے کبوتر نہ ہُوا
بیشتر حال جہاں ہم نے پریشاں دیکھا ❊ گھر ہُوا در نہ ہوا زور ہوا زر نہ ہوا
دیکھئے کب نظر آتا ہے یہ قامت یار ❊ وقت فردائے قیامت کا مقرر نہ ہوا

طالبِ بوسۂ ابرو کو دُ اُس نے جواب | کیا کہوں ہاتھ میں اسدم مرے خنجر نہ ہوا
ساده رویوں سے نہیں چشم وفا دنیا میں | آئینہ مرگ سکندر سے مکدّر نہ ہوا

آب گوہر والا مطلع - انصاف یہ ہے کہ خوب کہا ہے۔ لیکن اس کی رائے کے موافق یہ صنعت بھی قابل ترک ہے - اس سبب سے کہ محض فارسی میں یہ ایک لفظ دو معنوں میں مشترک پایا جاتا ہے کہ آب چمک کو بھی کہتے ہیں اور پانی کو بھی کہتے ہیں۔ اشتراک معنی کے سبب سے یہ صنعت پیدا ہو گئی ہے۔ اس کی خوبی محض دھوکا ہی دھوکا ہے۔ اصل میں کچھ بھی نہیں۔ اس آب میں تمائش سُراب ہے اڈیسن کی اس نکتہ سنجی کے آگے صائب کا بھی یہ مشہور شعر

دستِ طمع چو پیش کساں کردہ دراز | پل بستۂ کہ بگزری از آب روئے خویش

خاک میں مل گیا یہاں بھی لفظ آب کے مشترک ہونے سے یہ حیرت انگیز صنعت پیدا ہوئی ہے مگر اس کی کیا وجہ کہ ہم اڈیسن کا تتبع کریں اور شیکسپیئر کی تقلید نہ کریں وہ توان کی زبان کا فردوسی ہے اور اس صنعت کا دلدادہ ہے اور اڈیسن کا مرتبہ شعر میں اُس سے بہت ہی پست ہے۔ اس کی فلسفیانہ نثریں البتہ مقبول ہیں۔

آئینہ نمد پوش کو درویش صاف باطن خیال کرنا اور سکندر پر اُس کا تفوق ثابت کرنا نہایت بلند مضمون ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ خواب سنگیں یعنی غفلت کا بے سود ہونا بھی اچھی طرح نظم کیا۔ کبوتر کی آنکھ سے مروّت کے معنی نکالنا کیا اچھی تخیل ہے۔ ایسی تخیلیں پیدا ہو سکیں تو زبانِ اُردو میں جان پڑ جائے۔ حالِ جہان کی پریشانی کس تفصیل سے دوسرے مصرع میں بیان کی ہے یہ صنعت معنوی اور بندش کی برجستگی داد خوش بیانی کی طالب و سزاوار ہے۔ فروائے قیامت والا شعر بھی مشتاقانہ ہے لیکن قامت کے ساتھ قیامت کا ذکر اس کثرت سے کیا گیا ہے کہ اب سننے کو جی نہیں چاہتا۔ بوسۂ ابرو میں نہایت تصنع کو دخل دیا ہے۔ بوسہ لینے کے مقامات جو ہیں اُن میں ابرو نہیں داخل۔ شمشیر و خنجر کے ساتھ دم کا لفظ مبتذل ہو چکا ہے اس سبب سے بُرا معلوم ہوتا ہے سادہ رویوں کا ذکر ایک ثقہ شاعر کے قلم سے نکلنا اور اُن کی بیوفائی کا گلہ کرنا البتہ گرفت کے قابل ہے لیکن لکھنؤ میں زیادہ اور دہلی میں بھی مہذّب شاعروں کا رنگِ سخن صاف دلالت کرتا ہے کہ قصد شاعر کا کیا ہے۔ بقول غالب ایک سخن گسترانہ بات ہے یہ غزل ان مرحوم کو کئی مرتبہ پڑھتے میں نے سُنا ہے ہمیشہ مشاعرہ میں رنگ دیتی تھی

ولہ

قلم خطِ شعاعِ مہر کا ہو دستِ مانی میں | کھِچے تصویرِ جاناں میں سپیدہ روزِ روشن کا

یہ طاقت جوشِ وحشت نے دکھائی ناتوانی پر	گریباں سے مرے کرتا ہے باتیں چاک دامن کا
طریقِ عشق میں ہرگز نہیں چلتی ہے طراری	یہ وہ منزل ہے لُٹ جائے جہاں اسباب رہزن کا
دلِ بے رحم سے اعجاز داؤدی بھی عاجز ہو	بہت مشکل ہے کرنا موم ایسے سخت آہن کا
بزنگِ بوئے گل پہنچے سبک روحی سے اس جا ہم	دکھائے برچھیاں سبزہ جہاں دیوار گلشن کا
ہمیشہ رنج میں رکھتی ہے اپنی ہمت عالی	ہمیں ہے دوست کا احسان گویا ظلم دشمن کا
فرومایہ کو ہو بر عکس فیض صحبت عُمدہ	عفونت بیشتر لاتا ہے پانی چاہ گلشن کا
نہیں چھپتا تراچوری سے جانا غیر کے گھر میں	بڑھایا جب قدم دروازہ سے ماتھا مرا ٹھنکا
بسر کرتا ہے تنگی سے کوئی اکوئی فراغت سے	ہوا ہے ساتھ یاران جہاں میں چولی دامن کا
مسی آلودہ لب سے اس پری کے شرم یاد آئی	اُڑا تخت سلیماں کی طرح ہر تختہ سوسن کا

خط شعاعی کا قلم روز روشن کا سپیدہ اُس کی تصویر کے لئے چاہیئے۔ صد ہا رنگ سے یہ مضمون کہا جا چکا ہے اس کے تبذل ہونے میں شک نہیں چاک دامن کا گریبان سے باتیں کرنا ایک بات ہے مگر مصرع بالکل پیش افتادہ اٹھا کر چپکا دیا ہے۔ رہزن والا شعر بے عیب ہے۔ بے رحم کی مذمت لطف سے کی ہے۔ سبزہ کا برچھیاں دکھانا اچھی تخیل ہے خصوصًا وہ سبزہ جو دیوار پر اگا ہو۔ دیوار و در پر حفاظت کیے لئے سنانوں کی شکل کی آہنی سلاخیں لگا دیا کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ سبک روحی حاصل ہو تو گلشن عرفان تک رسائی ممکن ہے۔ مجھے یہ شعر لپسند ہے خصوصًا اس کی تشبیہ۔ دشمن کا قافیہ بھی خوب کہا۔ اخلاقی مضمون ہے۔ چاہ گلشن کا بیشتر متعفن ہو جانا مسلم امر ہے۔ ایسا معشوق جو غیر کے گھر چوری سے جائے قابل نفرت ہے۔ اس قسم کے مضامین کچھ بازاری لوگوں کو اچھے معلوم ہوتے ہوں گے مگر اس شعر سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کو محض یہ محاورہ صرف کرنا تھا کہ ماتھا مرا ٹھنکا اور اس کا محل استعمال دکھانا تھا ورنہ لکھنؤ کے شعراء رشک کے مضامین جس میں معشوق کا شاہد بازاری ہونا نکلے بہت کم کہتے ہیں مرزا داغ نے قیامت کی کہتے ہیں ؎

تم کو ہے وصل غیر کا انکار	اور اگر ہم نے آکے دیکھ لیا

آتش نے بھی ایک جگہ رشک کا مضمون غضب کا کہا ہے مگر اس کے برعکس ہے۔ ؎

مرتے ہیں رشک کے مارے پس دیوار رقیب	شور کرتا ہے جو پازیب کا دانہ شب وصل

چولی کی تنگی اور دامن کی فراخی اچھی تخیل ہے چولی دامن کا ساتھ فقیر و تونگر کا خوب کہا کئی شعر اس میں مثالی ہیں آخری شعر میں مطلب مبہم رہ گیا اور اغراق بھی ہے۔ شرم سے رنگ اڑنا کہنا چاہیے

طلبتہم علی الامواہ حتے   تخوف ان نقشہ السحاب

اس نے اپنی زبان میں پہلے عامل کو عمل دیا ہے اگرچہ وہ بعید ہے۔ غرض تنازع کا واقع ہونا بھی شعر میں گنجلک پیدا کرتا ہے۔ مجنون والا شعر بہت بیدھا سادہ ہے۔ ایسے شعر کے لئے ضرور ہے کہ بندش برجستہ ہو نہیں تو کہنے سے فائدہ؟ نگاہ سے مارنا اور لب سے جلانا مضمون تبذل اور پامال ہے مگر دوسرے مصرع نے کچھ بنا لیا۔ شعر سے تبادر معنی کی یہ تشبیہ کہ گہر افشاں ہے خود دامن مرے دریائے مضموں کا" نہایت پُرلطف ہے مضمون کا سرقہ طبع موزون کا صدقہ ہے۔ شوخی سے خالی نہیں۔

ولہ

پیرہن ہے تن عریاں میرا   زخم گردن ہے گریباں میرا
ظلم کرتا ہے کتابی چہرہ   خط کوفی میں ہے قرآں میرا
خود پرستی ہے پرستش بت کی   کم نہیں کفر سے ایماں میرا
کیوں نہیں برق کرم کرتی ہے   وقفِ غارت ہے گلستاں میرا
کیوں ہوں انگشت نمائے وحشت   کیا رفو ہے گریباں میرا
لے کے دل مجھ سے نہ ہو چیں بجبیں   فائدہ تیرا ہے نقصاں میرا

زخم گردن کی وجہ ظاہر نہ ہوئی شعر سُست ہو گیا۔ اس کو یوں سمجھنا چاہیئے کہ گریباں سے ایسی نفرت ہے کہ زخم گردن اُسے تصور کرتا ہوں۔ کوفی کے نفظ سے معنی ظلم کا تبادر ہونا جسے اصطلاح میں لزوم ذہنی کہتے ہیں۔ اپنے اوپر خود پرستی کا الزام رکھ کر دوسروں کو نصیحت مقصود ہے۔ برق والا شعر نہایت پُردرد ہے۔ وحشت کو مخاطب بنا کر انگشت نما ہونے کی وجہ ظاہر کر دی اس طرح سے مطلب کو ادا کر دینا شاعری کو آتا ہے۔ چیں بجبیں ہونے سے یہ مطلب نکالا ہے کہ وہ دل کو جنس ناروا سمجھا۔ ناپسند کیا۔

ولہ

حالِ کم فرصتی عمر گریزاں جانا   عیسیٰ و خضر کو دو روز کا مہماں جانا
آدمیت کو فقط جوہر انساں جانا   جس میں اخلاق نہ پائے اسے حیواں جانا
نہ فراغت کی خوشی ہے نہ مصیبت کا قلق   راحت و رنج کو جیب و دست و گریباں جانا

شر سے نفرت ہے ہیں خیر سے رغبت مدام — کفر سمجھائے ہم نے اسے ایماں جانا
حسن معنی سے جو واقف نہ ہوا صورتِ دوست — پڑھ کے قرآن کو نہ کچھ رتبہ قرآں جانا
خشک ٹکڑوں پہ کرے شکر جو ہو اہل زبان — ہم نے یہ مطلب آواز لب ناں جانا
جب تلک ضعف نہ تھا بادیہ پیمائی کی — اب تو دشوار ہے تاکوچۂ جاناں جانا

دونوں مطلع اس غزل کے خوب کہے ہیں۔ کم فرصتی کے لفظ میں یائے مصدری دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ اسی قیاس پر لوگ فطرتی اور قدرتی بھی لکھنے لگے ہیں۔ اس میں مصدری تے موجود ہے۔ پھر مصدری تی کیونکر آسکتی ہے۔ لامحالہ اس تی کو یائے نسبت کہیئے گا اور یائے نسبت جب لگاتے ہیں تو ت کو گرا دیتے ہیں۔ پس فطرتی کہنا یقیناً غلط ہے۔ صحیح لفظ فطری ہے ہاں بلند ہمتی و پست فطری کہنے میں قباحت نہیں ہے کہ اب ہمت اور فطرت ترکیب فارسی کا جزو ہو گئی ہے۔ اس میں فارسی کی یائے مصدری لگا سکتے ہیں اور خود اہل فارس اس طرح استعمال کیا کرتے ہیں۔ لیکن فطرتی و قدرتی وہ بھی نہیں کہتے غرض کہ یہ لفظ نہ عربی میں صحیح ہیں نہ فارسی میں۔ یہاں مجھے خود خلجان ہوتا ہے کہ اُردو زبان کیا اس قدر مشکل ہے کہ جتنک عربی و فارسی کے قواعد پر عبور نہ ہو کوئی شخص صحیح عبارت لکھ نہیں سکتا۔ بلکہ میں تو یہ دیکھتا ہوں کہ اکثر عربی خواں و فارسی داں بھی ناواقفوں کی طرح غلط الفاظ گڑھ لیا کرتے ہیں۔ مثلاً وقعت کا لفظ عربی ہے جنگ و جدل و فتنہ و فساد کے معنی پر آتا ہے اُردو زبان کے مضمون نگار اور اہل قلم اس لفظ کو توقیر و اعتبار کے معنی پر لکھنے لگے۔ ایک کے قلم سے نکلا اور دوسرے نے فوراً اُڑا لیا اس پر طرہ یہ کہ اسم صفت بھی اُس سے بنا لیا یعنی وقیع بھی ایک مہمل لفظ اب اردو میں داخل ہوا چاہتا ہے۔ انداز اور نمونہ خوب جانتے ہیں کہ دونوں لفظ فارسی ہیں اُس میں عربی کی تنوین لگا کر اندازاً لکھا اور اس میں تنوین کے ساتھ تاے مصدری بھی لے آئے نمونتہً کہنے لگے۔ مگر اصل بات یہ ہے کہ اس طرح کے خرف الفاظ پہلے وہی لوگ بناتے ہیں جنھیں کچھ شُد بُد عربی فارسی آتی ہے اور مقصود اُن کا یہ ہوتا ہے کہ تحریر میں اظہار علم کریں اور الفاظ کے تراشنے پر اپنی قدرت دکھائیں اگر یہ کہیئے کہ یہ الفاظ بوضع ثانوی اُردو ہو جانے کے معنی یہ ہیں کہ عام و خاص کی زبان پر چڑھ گئے ہوں۔ ایسا ہرگز نہیں ہے اور اس سے اُردو کی زبان پوچ ہوتی جاتی ہے جو عربی فارسی نہ جانے اسے اظہار علم کرنا کیا ضرور ہے۔ اُردو کے زبان زد الفاظ محاورہ کے بچے ہوئے کلمات استعمال کئے جائیں تو اُردو لکھنا کچھ مشکل نہیں ہے۔ اس سے تحریریں زبان کا لفظ بھی آئے گا۔ اسی طرح ترکیب الفاظ میں بھی احتیاط چاہیئے۔ اُردو میں جس طرح [illegible]

صندوق کہنا اور لکھنا شان کے خلاف سمجھتے ہیں پس ذراسی فارسی دانی قیامت ہوگئی صندوق خطوط اندازی ایک مہمل ترکیب بنالی اور اُسے جزو زبان بنادیا۔ اسی طرح تخت نشینی کے لئے تاجپوشی کا لفظ حال میں وضع کیا گیا ہے۔ دیکھئے تعلیم کا نہونا تعلیم ناقص اور بقول ابو الفضل علم ناقص سے ہزار درجے بہتر ہے انگریزی کے الفاظ مانوس اگر اُردو میں شریک کرلئے جائیں تو کہیں بہتر ہے اس سے کہ ایسے فارسی وعربی کے الفاظ بڑھائے جائیں۔ کم فرصتی وبے عزتی وخوش قسمتی وغیرہ صحیح ترکیبیں ہیں۔ زیادتی کا لفظ غلط العام کے درجہ میں ہے اور اُسی کے مقابلہ میں کتنی بھی صحیح وفصیح اُردو کے الفاظ ہیں۔ فوراً دفعتہً شکایتہً رعایتہً وغیرہ صحیح الفاظ ہیں۔ انداز اً امونتہً غلط وتمسخر آمیز۔ جیسے نعمت خاں عالی نے دل لگی کی ہے ؎

للہ الحمد کہ تجدیدیم مرقد ختم رسل طوفیدیم

اُردو کی شاعری فارسی سے ماخوذ ہے فارسی الفاظ اور فارسی ترکیبیں اسی وجہ سے اُردو کے اشعار میں مزہ دیتی ہیں۔ مگر صحیح ترکیب پیدا کرنے کے لئے بہت کچھ فارسی جاننے کی ضرورت ہے۔ اگر اچھی طرح فارسی نہ آتی ہو تو فارسی ترکیبیں تراشنے سے کنارہ کرنا چاہیئے۔ سیدھی سادی اُردو لکھنے میں کبھی غلطی نہیں ہوسکتی۔ غلطی تو اس سبب سے ہوتی ہے کہ اُردو لکھنے میں عربی یا فارسی بولنے کا قصد کیا جاتا ہے۔

اس غزل میں راحت ورنج والا شعر خلاصۂ تہذیب اخلاق ہے۔ گبر ومسلمان کا مضمون مبتذل ہے۔ خیر وشر کی خوبی وبدی کس لطف سے بیان کی ہے اور کس طرز سے ادا کی ہے کہ وجد کرنے کے قابل ہے۔ صورت دوست کی ترکیب صحیح ہے مگر مانوس نہیں صورت پرست اس سے بہتر ہے لیکن وزن مساعد نہ تھا۔ سوکھے ٹکڑوں کے توڑنے میں جو آواز پیدا ہوتی ہے کیا اچھا مطلب اُس سے نکالا ہے۔ اس صنعت کو حسن توجیہ کہتے ہیں۔ یہ بھی تخئیل کی ایک صورت ہے۔ لکھنؤ میں چند لوگوں نے اتفاق کرکے فلک کے لفظ کو غیر فصیح قرار دیا ہے۔ درخشاں مرحوم اس سے ناواقف رہے ورنہ ضرور اتباع کرتے لیکن اس قسم کے متروکات کو کوئی غلط نہیں کہہ سکتا۔ بڑی چیز تو کلام کو غلطی سے پاک کرنا ہے۔ یوسف حسین کوئی شخص شیخ علی حزیں کی ملاقات کو گئے شیخ اس وقت پاؤں پھیلائے ہوئے بے تکلف بیٹھا ہوا تھا۔ ان کو دیکھ کر پاؤں سمیٹ لئے سیدھا ہو بیٹھا۔ پوچھا کہ اسم شریف۔ انھوں نے کہا الیسف حسین۔ یہ سن کر نازک دماغی سے اُس سے منہ پھیر لیا اور پھر پاؤں پھیلا دیئے۔ اسی کے قریب قریب ایک نقل اصمعی بیان کرتا ہے کہ زمانۂ حج میں ایک شخص کو زتی علٰے ایں میں نے دیکھا کہ لوگ اُسے گھیرے ہوئے ہیں۔ میں سمجھا کہ کسی ملک کا عالم متبحر ہے۔ ملاقات کا مشتاق ہوکر اس کے خیمہ میں

گیا۔ پہلے میں نے نام دریافت کیا تو اُس نے کہا ابوعبدالرحمٰن الرحیم مالک یوم الدین۔ اس جواب سے علم و تبحر کی ساری حقیقت کھُل گئی۔

زبان کا پاک ہونا بڑے امتیاز کی بات ہے۔ لفظ تو لفظ ہے کسی حرف کا مخرج اگر صحیح نہ ادا ہو تو زبان کا بڑا نقص سمجھا جاتا ہے۔ شریف و رذیل ذرا سے میں پہچان لیا جاتا ہے۔ آبِ حیات میں آزاد اس نکتہ کو سمجھ کر بہت تہذیب سے لکھنؤ کی زبان پر حملہ کرتے ہیں پہلے ناسخ کے کچھ اشعار نقل کرتے ہیں ؎

شہسواری کا جو اُس چاند کے ٹکڑے کو ہے شوق　　چاندنی نام ہے شبدیز کی اندھیاری کا
نام سُنتا ہوں جو میں گور کی اندھیاری کا　　دل دھڑکتا ہے جدائی کی شبِ تار نہ ہو
آتش اس کے گورے گالوں پر یہ تو نے کیا کیا　　چاندنی راتیں یکایک ہوگئیں اندھیاریاں

پھر لکھتے ہیں کس کا مُنہ ہے کہ لکھنؤ کی زبان پر حرف رکھ سکے۔ دلّی کا بچّہ بچّہ جانتا ہے کہ اندھیاری گھوڑے کی ہوتی ہے اور رات اندھیری کہی جاتی ہے۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ لکھنؤ کے اساتذہ بھی لفظ کے محل استعمال سے ناواقف ہیں۔ مگر تعجب ہے کہ ایک تذکرہ نگارِ زبان اُردو کی تاریخ کا مصنف اس بات سے ناواقف رہا کہ یہ خاص دلّی کا محاورہ ہے۔ جو ناسخ و آتش کے قلم سے نکلا ہے۔

سودا۔ ؎

ہوگی کب تک بجا خبرداری　　چور جاتے رہے کہ اندھیاری

درخشاں کے کلام کے جو لوگ مشتاق ہیں اُنھیں میرا دو سرے وادی میں نکل جانا اور اس قدر سامعہ خراشی کرنا ضرور شاق ہُوا ہوگا مگر میں دیکھتا ہوں کہ کچھ اُردو کے دن بھلے آئے ہیں ساری قوم اُس کی طرف دفعتہً متوجہ ہوگئی ہے جب گوش شنوا ہو تو کیونکر دردِ دل نہ کہوں۔؟

ولہ

کروں کیا لطف پر تکیہ۔ رہوں کیا قہر سے غافل　　امید و بیم میں عالم نظر آیا ترازو کا
دلِ نالاں کی ہکو مرثیہ خوانی پسند آئی　　جوانی کا نہ یہ محتاج رہتا ہے نہ بازو کا

دونوں شعر مشاقانہ ہیں۔ بندش میں ذرا جھول نہیں آنے پایا یہ مشاعرہ کی غزل ہے میں نے سُنا کہ بادشاہ نے مائل[1] کے مطلع کو بہت پسند کیا کئی دفعہ پڑھوایا وہ مطلع یہ ہے۔

---

[1] مولوی صادق علی خاں مائل مرحوم جو بادشاہ کی حیات تک کلکتہ میں رہے اور ان کی وفات پر لکھنؤ میں آکر دادِ سخن گستری

تصور تھا جو رونے میں گلوے یار مہ رو کا　　صراحی دار موتی بن گیا ہر قطرہ آنسو کا

ولہ

کل وہ جو مجھ کو دیکھ کے بیگانہ بن گیا　　میں بھی تو ہوشیار ہوں دیوانہ بن گیا
غفلت پہ اپنی کیوں نہ پیوں خون دل مدام　　جام شراب عمر کا پیمانہ بن گیا
دیکھی نہ بخت بدلنے مری شکل انقلاب　　گو آشنا بگڑ گئے بیگانہ بن گیا

رونق فزا ہوا جو درخشاں وہ بت کبھی
آئینہ خانہ رشک صنم خانہ بن گیا

اس عاشقانہ مطلع میں بیان کا طرز دیکھنے کے قابل ہے۔ یہ باتیں وہ ہیں جن سے شعر میں جان پڑجاتی ہے۔ اس کے آگے صنائع و بدائع کی کچھ حقیقت نہیں جو لوگ عاشقانہ اشعار سن کر زہد خشک سے کام لیتے ہیں اس شعر کی ادا ان کو لبھانہ سے ممکن نہیں۔ شعر کی ماہیت کو نظر دقیق سے دیکھئے۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ عشق بازی بت پرستی بادخواری کے مضامین ہوں یا معارف و مکارم کا بیان ہو یا عبرت و حسرت کا مضمون ہو جب تک کہ شاعر کے طرز بیان نے اس میں جان نہ ڈال دی ہو وہ کلام موزوں ہے۔ شعر نہیں ہے اور جہاں شعر میں اس طرح کا سحر پیدا ہوا پھر معانی اس کے کیسے ہی رکیک و سقیم ہوں وہ شعر ضرور دلنشیں ہوتا ہے۔ فن شعر و فن خطابت میں یہی بڑا فرق ہے کہ شاعر کے بیان میں شوخی اور خطیب کے بیان میں سستی ہوتی ہے۔ شاعر کو معانی سے چنداں غرض نہیں وہ طرز بیان کے کوچوں میں دوڑتا پھرتا ہے اور اسی دھن میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اس کا کلام بے معنی ہو جاتا ہے خطیب کا موضوع بحث فقط معانی ہوتے ہیں اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اس کے بیان میں طرز دلکش نہیں پیدا ہوتا۔ شاعر اس بات کی مشق کرتا ہے کہ تادیۂ معانی بطریق متعددہ ہونا چاہیئے اس کی تصریح کتب بلاغت میں موجود ہے پھر اس کے ضمن میں پند و حکمت آجائے تو آجائے اور خطیب کا مقصود اصلی یہی ہوتا ہے کہ پند و حکمت کا افادہ استفادہ ہو۔ بیان میں لذت ہو یا نہ ہو جیسے کوئی شخص فن موسیقی کا ماہر ہو وہ ایک ہی مصرع کو بار بار نئی نئی ترکیبوں سے پڑھ رہا ہے اور اپنا کمال دکھا رہا ہے۔ اہل مجلس میں جن کو ذوق نہیں وہ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ مرثیہ کا لطف جاتا ہے۔ رقت سلب ہوئی جاتی ہے۔ بول سجھائی نہیں دیتے۔ انکی خاطر سے چند بند سیدھے سیدھے سروں میں وہ پڑھ دیتا ہے اور لوگ خوش ہو جاتے ہیں اس وقت اردو کی مجلس ادب میں ایسے ہی لوگوں کا مجمع نظر آرہا ہے۔ جو چاہتے ہیں کہ شعر کو خطابت اور شاعر کو خطیب بنا دیں

اُردو کی شاعری کا رنگ بدل جائے۔ سامعین شاعر کو اپنے رنگ پر کھینچ لیتے ہیں مگر پھر شعر بھی حیرت انگیز وطرب خیز نہیں رہتا۔ کہنا کیا تھا اور کہنے لگا کیا۔

حافظ

بنفشہ طرۂ مفتول خود گرہ می زد صبا حکایت زلف تو در میان انداخت

مصحفی

تھمتے تھمتے تھمیں گے آنسو رونا ہے یہ کچھ ہنسی نہیں ہے

طرز بیان ہی میں جدّت مقصود ہوتی ہے کہ شاعر تصنع سے کام لیتا ہے اس مضمون کو کہ ممدوح کی درگاہ کو وہ شرف حاصل ہے کہ کوئی قسم کھاتا ہے اسی کے در کی قسم کھاتا ہے عرفی اس طرح ادا کرتا ہے ؎

چرخ از شرف خاک درش ساخت طلسمے کز دور گمش آن سو نبود راہ قسم را

طرز بیان میں شکوہ پیدا کرنے کے لئے شاعر تشبیہ وغیرہ سے کام لیتا ہے۔ یہ مضمون کہ جب فضل خدا ہوتا ہے تو سب کام بن پڑتے ہیں۔ حافظ اس طرح ادا کرتا ہے ؎

کاروانیکہ بود بدرقہ اش لطف خدائے بتجمل بنشیند بجلالت برود

غرض مختلف کوچے ہیں جن میں شاعر اسی چیز کو ڈھونڈتا ہے۔ مجھے اس دُر مکنون کی جھلک کبھی برجستگی ردیف میں دکھائی دیتی ہے کبھی باب الانشا میں۔ شراب کے ذکر میں مدام کا لفظ ایہام تناسب کے لئے لانا ایسا ہی بیہودہ معلوم ہوتا ہے جیسے زبان کے ساتھ گویا کا لفظ صرف کرنا۔ ایہام تناسب مزے کی چیز ہے لیکن جب تازگی پائی جائے۔ جہاں اس قدر کہنگی و ابتذال پیدا ہو گیا ہو وہاں احتراز واجب ہے۔ مگر مضمون بہت اچھا ہے جب حاصل عمر غفلت و بے خبری ہو تو پیمانۂ عمر و جام شراب میں فرق کیا رہا۔ شکایت بخت کی بندش میں شان مشق پیدا ہے۔ مقطع بھی خوب کہا ہے۔

یہ زمین بھی استاد کی نکالی ہوئی ہے اُن کی عادت تھی جہاں دیکھا کہ شعرائے سبعہ سیارہ میں سے کچھ لوگ سلام کو حاضر ہوئے ہیں باتوں باتوں میں کوئی مصرع نظم کر دیا۔ یہ لوگ اکثر کوئی قطعہ یا رباعی جس میں اعادہ سلطنت کی دعا ہوتی تھی پڑھ دیا کرتے تھے جس سے اُن کا زخم کہن تازہ ہو جاتا تھا اور اپنا درد دل کسی مصرع میں ظاہر کرتے تھے۔ ایک دفعہ یہ زبان سے نکلا۔

ع۔ رہے گا نجم اختر تا کجا لے چرخ گردش میں۔

بادشاہ ابھی ہوادار سے اُتر کر سلطان خانہ میں داخل نہ ہوئے تھے کہ مہتاب الدولہ نے یہ مصرعے پڑھے۔ ؎

نہ ہے اس طرح سنگ آسیا اے چرخ گردش میں ۔۔۔ نہ ہے یوں ساغر بادہ سدا اے چرخ گردش میں
نہ یوں تسبیح دست پارسا اے چرخ گردش میں ۔۔۔ رہے گا انجم اختر تا کجا اے چرخ گردش میں

ان مصرعوں کو بہت پسند کیا فرمایا کہ قافیے بدل بدل کر اور مصرعے لگاؤ اور میرے مصرع کو مصرع ترجیح قرار دو۔ پھر جو ملاقات و حضوری حاصل ہوئی تو مہتاب الدولہ نے ایک خمسہ پڑھا جس میں بہت سے بند تھے ہر بند میں چوتھا مصرع خمسہ کا گردہ کا مصرع تھا صلہ بھی ملا اور خمسہ مطبع سلطانی میں چھاپا گیا۔ میں نے بھی دیکھا تھا۔ مطلع کے یہ تین مصرعے مجھے یاد رہ گئے۔

ایک صحبت میں میں بھی موجود تھا اور تمام شعراء و ندمائے شاہی کا مجمع تھا۔ اعادۂ ملک کی دعائیں لوگ دے رہے تھے کہ حضرت نے دست دعا بلند کئے اور مصرع پڑھا۔ ع

بازآ تقصیر سے بس گوشمالی ہوچکی

شگفتہ ایک شاعر حامد علی مرزا کوکب ولی عہد بہادر کے مصاحبوں میں تھے انھوں نے عرض کیا کہ خانہ زاد نے مصرع لگایا ہے حکم ہوا کہ پڑھو۔ ؎

شانِ تُؤتِی المُلک دکھلا۔ دیکھی شانِ تنزِع ۔۔۔ بازآ تقصیر سے بس گوشمالی ہوچکی

اس صحبت میں بادشاہ نے کچھ اپنا کلام بھی سنایا تھا۔ دو شعر مجھے یاد رہ گئے۔ ایک مطلع

ایک حسرت طور پر بھی بھر مونے رہ گئی ۔۔۔ ایسا کچھ دیکھا کہ آنکھوں کو تمنا رہ گئی

اور ایک غزل کا یہ شعر

جوانی میں سیہ مو تھے سفیدی ہے یہ دنداں کی ۔۔۔ ضعیفی ہنس رہی ہے مجھ سے کیوں اندوہ گیں ہونا

یہ شعر پڑھ مہتاب الدولہ سے مخاطب ہوئے کہ معنی بیان کرو انھوں نے عرض کیا کہ بالوں کی سفیدی نہیں ہے بلکہ ضعیفی کا خندۂ دنداں نما ہے۔ فرمایا وہ تو خندۂ دنداں نما کر رہی ہے مگر سمجھ رہا ہوں کہ مجھ سے ہنس رہی ہے۔ اب اندوہ گیں ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ اس نکتہ کے ارشاد فرمانے پر مہتاب الدولہ فوراً اٹھے اور آداب بجا لائے گویا حضرت نے اُن کی شرح پر اصلاح دی اور اُنھوں نے اصلاح کا سلام کیا۔

ولہ

مشکِ شبرنگ کی چوٹی ہے گیسو حور کا ۔۔۔ یار کی گردِ مزاری میں ہے عالم نور کا

دیکھئے گر چشمِ عبرت سے بڑی تنبیہ ہے — نیند کی شدت نہ جھکا دیتی ہے سر مغرور کا
جب نگاہِ مست اُس کی غیر پر پڑنے لگی — ہوگیا ثابت بہکنا نرگسِ مخمور کا
خوانِ نعمت دیکھ کر فاقہ کشوں کی یاد کی — کاسۂ چینی سے دھیان آیا سرِ فغفور کا
چارہ سازی خلق کی کرتا ہوں گو درماندہ ہوں — بے مرمت بیشتر رہتا ہے گھر مزدور کا

مطلع میں "چوٹی" کا لفظ چوٹی کا لفظ ہے لیکن گردجولان کو تتق نور کہنا مضمون تبدل ہے معجزۂ یدبیضا طور پر عنایت ہوا ہے اس سبب سے اُسے شمع طور کا گل کہنا لطف سے خالی نہیں یہاں ہاتھ آجانے کی اصطلاح میں ایہام تناسب ہے اور اچھا معلوم ہوتا ہے تنبیہ کے معنی جگا دینے کے ہیں یہاں یہ رعایت کوئی کہہ سکتا ہے کہ لطف نہیں دیتی۔ بہکنے کے ثبوت میں تازگی نمایاں ہے محض اس واسطے غیر پر آنکھ پڑنے کا مضمون ناپسندیدہ گوارہ کر لیا ورنہ مقصود بالذات یہ مضمون نہیں ہے مزدور و فغفور کے دونوں شعروں میں اخلاقی مضمون ہے اور شاعرانہ لہجے میں ہے غزل میں اخلاقی مضامین اگر واعظانہ طرز کے ہوں تو وہ غزل غزل نہیں ہے موعظہ ہے۔

ولہ

مطلب کے آشنا ہیں فقط یار آشنا — معدوم ہیں جہاں میں وفادار آشنا
کہنے کے واسطے ہیں بہت یار آشنا — لاکھوں میں یاں نکلتے ہیں دو چار آشنا
ناحق تمہیں سمجھتے ہیں اغیار آشنا — ہوتے نہیں کسی کے طرحدار آشنا
رکھیں نہ بعد مرگ سر دار آشنا — کب ہو سر بُریدہ سے دستار آشنا
قاتل سے ہے اشارۂ ابروئے ماہِ نو — دو دن تو ہو نیام سے تلوار آشنا
کب ہے برادرانِ حقیقی کا اعتماد — بے فائدہ بدلتے ہیں دستار آشنا
تکیہ نہ اتفاقِ عناصر پہ آج کر — کل چار سمت جائینگے یہ چار آشنا
ہے دشمنِ وصال فلک پھینک دیگا دُور — کیا چلّہ کمان سے ہو سوفار آشنا
پوچھوں میں لطفِ بوسۂ دُرِ گوش یار سے — کانوں سے ہو اگر لبِ گفتار آشنا

مجھے لفظ فقط اردو میں بہت ثقیل معلوم ہوتا ہے لیکن محاورہ میں داخل ہے میں خود بھی اُس کو ترک نہ کر سکا۔ طرحدار اور صورت دار اور سمجھ دار اور تابعدار یہ سب ترکیبیں غلط ہیں مگر زبان اُردو کا جزو ہو گئی ہیں۔ پھر بھی اہلِ قلم ان لفظوں کے استعمال سے احتراز کرتے ہیں خصوصاً فارسی کی اضافت

دستار والا مطلع ثانی شعر ہے اور خوب کہا ہے۔ تلوار کے قافیہ میں چاند کے دو دن چھپنے کا اشارہ لطف دیتا ہے۔ دستار والا شعر بھی اخلاقی مضمون سے خالی نہیں۔ عناصر کے جُدا ہونے کی صورت دکھادی ہے یہ بندش بھی داد طلب ہے۔ سوفار کا قافیہ بھی خوب کہا ماحصل زمین ہے شعر آخر میں دُر گوش سے باتیں کرنے کی تمنا کیا اچھی تخئیل ہے۔

ولہ

ہے جائے گریہ حال جہان خراب کا
ہو چشم مہر و ماہ پہ دامن سحاب کا

تکیہ پہ لطف عارض رنگیں کو دیکھنا
گویا روِش پہ پھول پڑا ہے گلاب کا

کب تک پیوں میں ظلمتِ شب سے لہو کے گھونٹ
چھلکائے شیر صبح قدح آفتاب کا

مسجد سے میکدہ کو بہک کر چلا ہوں رات
گویا چراغ غول ہے ساغر شراب کا

کیا آئینہ میں عارض رنگیں کی ہے بہار
پانی میں پھول تیر رہا ہے گلاب کا

ہم حلۂ بہشت پہن کر چلے گئے
ڈھونڈھا کیا کفن میں فرشتہ عذاب کا

تزئین حسن میں ہے سر دست نقص عیب
انگلی پہ رنگ آتا ہے پہلے خضاب کا

روز سیہ دکھائے نہ لیل و نہار دہر
اک صفحہ تو سفید رہے اس کتاب کا

رخسار آتشیں نے ترے شب کو اے پری
دکھلا دیا چراغ سے اُڑنا شراب کا

تجنیس خط ہے لفظ شباب و شتاب میں
کس طرح جلد جائے نہ موسم شباب کا

مجھے اس غزل کا مطلع عبرت انگیز معلوم ہوتا ہے نہایت خوب کہا ہے۔ ہو کا لفظ ہونا چاہئیے کے محل میں لکھ گئے ہیں اس پر بھی مطلع کی خوبی میں فرق نہیں آیا۔ دُوسرے شعر میں عارض کو گلاب کا پھول کہنا تشبیہ متبذل ہے مگر مشبہ میں یہ قید لگانا کہ جب تکیہ پر رخسار رکھا ہو تخئیل تازہ ہے۔ قدح آفتاب سے شیر صبح کا چھلکنا نہایت دلکش تخئیل ہے۔ ساغر شراب کو چراغ غول بھی خوب کہا رات کا لفظ بغیر کو کے استعمال کرنا اگلے زمانہ کی روش تقریر ہے۔ ناسخ ؎

رات اہل بزم کی کثرت کا احسان ہو گیا
تنگیِ محفل کے باعث بھڑ کے بیٹھا مجھ سے یار

مہتاب الدولہ مسن شخص تھے ناسخ و آتش کے مشاعروں کا ذکر کیا کرتے تھے۔ شاید یہ غزل ان کی انھیں مشاعروں کی ہے۔ اس زمانہ میں رات کوئی اس طرح نہ باندھے گا۔ آئینہ والے شعر میں عارض کو بھی گلاب کے پھول سے تشبیہ دی۔ لیکن یہاں بھی تشبیہ مرکب ہے۔ اور وجہ شبہ میں حرکت بھی داخل ہے

بھی پیدا کرلی۔ گہری تخییل ہے بسروت کی رعایت متبذل ہے اور قابل ترک۔ آرزو کی ہے کہ فلک روز سیہ نہ دکھائے تو اس کتاب لیل و نہار کا ایک صفحہ سفید رہے اور ایک سادہ چراغ سے شراب کا اڑاان کے حصے کا مضمون تھا اے پری، اے صنم، اے جان، اے مہرو، اے گلرو، اے گلبدن بھرتی کے الفاظ سمجھے جاتے ہیں اور بھرتی کا لفظ شعر میں ہونا شاعر کے عجز طبع پر دلالت کرتا ہے۔ تجنیس لفظی البتہ اگر ناز ہو۔ ہو تو چھوڑنے کی چیز نہیں ہے۔ گو یورپ کی تقلید قطعاً مانع ہے مگر تجنیس خطی کے مہمل ہونے میں شک نہیں۔

ولہ

داغ سودائے محبت سکۂ زر ہو گیا
عشق کی دولت سے مفلس بھی تونگر ہو گیا

شکوۂ پست و بلندِ دہر تھا وردِ زباں
اشک کے طوفاں میں اک عالم برابر ہو گیا

رتبۂ اعلیٰ نہ پائے لاکھ گرادنے بڑھے
قد آدم آئینہ کس دن سکندر ہو گیا

خانۂ تحریر نے اگلا شکایت کا یہ زہر
لے کے خط جس دم اُڑا نیلا کبوتر ہو گیا

مثل دشمن دوستوں کو ہے مٹانے کا خیال
کیا مرا جوہر بھی آئینے کا جوہر ہو گیا

زخمیٔ تیغ ادا شب بھر تڑپ کر رہ گئے
چاندنی کا کھیت وہ پھولوں کا زیور ہو گیا

برابر اور سکندر اور زیور کے قافیوں میں اچھے شعر نکالے ہیں۔

مرزا مستیا عشق

ناسخ والوں میں ہیں معیار و حدائق البلاغہ ہمیشہ پڑھتے پڑھاتے رہتے تھے۔ نازک خیالی کے مدعی اور بنوٹ کے اُستاد ہیں۔

طرح تھی "نظر" "وصل کی رات" اس میں دیکھئے وصل کی رات کیا بنائی ہے۔ ؎

وہ گلے مل کے دکھانے لگے زلف مشکیں　　　آگئی آئینہ میں تابہ کمر وصل کی رات

بس یہی رنگ ان کا غزل میں تھا۔

آخر میں غزل کہنا چھوڑ کر نعت و منقبت میں شعر کہا کرتے تھے مطلع ہے۔

سر کے بل چلنا ہے لازم شاہراہ طوس کا　　　گوکھرو کو سوں بچھا ہے تاج کیکاؤس کا

گوکھرو کے لفظ میں جو ایہام ہے اس پردہ ناز کرتے تھے۔

سلام کے اس مطلع میں بنوٹ کی ہے ملاحظہ ہو۔

سلامی حال عابد جس جگہ میں نے لکھا دیکھا　　　مرے ہائے نگہ نے بن کے چشم آبلہ دیکھا

میں نے کہا کہ یہاں "چشم آبلہ" کو قافیہ کرنا غلط ہے۔ انہوں نے میرا یہ مصرع پڑھا۔

ع۔ دوانہ جادۂ شمشیر پر یہ تسا فلہ دیکھا یعنی" میں نے آبلہ کی (ہ) کو الف بنالیا تو آپ نے بھی تو قافلہ کی (ہ)، کو الف بنالیا" میں نے جواب دیا کہ چشم آبلہ فارسی ترکیب ہے فارسی لہجہ میں آبلہ کو (آبلے) کہیں گے نہ کہ (آبلہ) اسی سبب سے شعرائے فارس کے کلام میں کہیں (ہ) کو الف کر کے قافیہ بنایا ہو آپ نہ دیکھیں گے ہاں تنوین کو نون کر کے حافظ نے قافیہ کیا ہے۔

گر وقت عطا پرور دن آمد
کہ ظالم لاتذرنی فرداً آمد

اس سبب سے اُن کا لہجہ اس کے موافق ہے۔

آغا جو شرف

آتش کے شاگرد تھے، عالی خاندان شخص تھے۔ نہ لکھے نہ پڑھے مگر بہت اچھے شاعر تھے۔ ان کا دیوان چھپ گیا ہے۔ اس مطلع کو سنئے اور اس کی زبان دیکھیئے۔

جھٹ پٹا وقت ہے بہتا ہوا دریا ٹھہرا ۔۔۔ صبح سے شام ہوئی دل نہ ہمارا ٹھہرا

ان کے کلام میں ذرا بھی تصنع اور تکلف نہیں ہوتا۔

منزل عشق کا حال۔ آپ میں آلوں تو کہوں ۔۔۔ دم ذرا لینے دو میں دل کو سنبھالوں تو کہوں

کون ہے جس سے فسانہ کہوں لے دل تیرا ۔۔۔ سُننے والا کوئی پہلو میں بٹھا لوں تو کہوں

ان کے کلام کی خصوصیت یہ ہے کہ دیر و بت کدہ صنم و برہمن ناقوس و قشقہ و زنار تسبیح و مصلیٰ زاہد و موذن واعظ و شیخ خانقاہ و میخانہ و شیشہ و ساغر و ساقی و پیر مغاں جام و صراحی و مینا کا ذکر کہیں نہیں آنے پایا۔ کہتے تھے جس شعر میں ایسے الفاظ ہوتے ہیں مجھے اس شعر سے نفرت ہوتی ہے۔

مرزا داغ جن دنوں کلکتہ آئے ہوئے تھے مجھ سے بیان کیا کہ ایک محفل رقص و نشاط میں میری دعوت تھی وہاں مغنی نے شرف کی یہ غزل گائی۔

منزل عشق کا حال آپ میں آلوں الخ

مجھے زمین اچھی معلوم ہوئی میں نے بھی غزل کہی۔ پھر غزل نکال کر مجھے سُنائی۔ ایک مصرع اس مضمون کا کہ "جو میرا مطلب ہے کہ نہیں سکتا مگر۔ ع

گدگدا لوں تو کہو پاؤں دبا لوں تو کہوں

مجھے یاد رہ گیا انصاف یہ ہے کہ شرف کی غزل کا جواب نہ ہو سکا۔

مرزا امداد علی باور

تھے تو برق کے شاگرد مگر اُستاد کے رنگ سے الگ، کلام بہت شوخ اور بلا تصنع ہوتا تھا بہت کم کہتے تھے اور مشاعروں میں کم شریک ہوتے تھے۔

مرزا داغ جن دنوں کلکتہ آئے ہیں اور اس تقریب میں مشاعرے ہو رہے ہیں ایک مشاعرہ میں باور بھی آ گئے ان کے سامنے جب کنول آیا تو اپنی مشہور غزل کے شعر پڑھنے لگے۔

دوڑ ساقی کہ مجھے لغزش مستانہ ہے — پاؤں قابو میں نہیں ہاتھ میں پیمانہ ہے
آج تک بانگ اناالحق کے گڑے ہیں جھنڈے — سر اُٹھائے ہوئے منصور کا افسانہ ہے

ابھی دو ہی شعر پڑھے تھے کہ سارا مشاعرہ مٹھی میں آگیا۔ داغ نے پکار کر کہا حضرت طرح میں کچھ کہا ہو تو پڑھئے۔ طرح تو انھوں نے کہی نہ تھی خاموش ہو گئے۔

ان کے دو شعر مجھے اور یاد آئے۔

رہ گئی بات۔ کٹ گئی شب ہجر — تم نہ آئے تو کیا سحر نہ ہوئی

آنکھوں آنکھوں میں یوں وہ لے گئے دل — کانوں کان ایک کو خبر نہ ہوئی

ان کا خاص رنگ :-

بند قبا کو کھینچ کے اتنا نہ باندھئے
رکھئے نہ گھوٹ گھوٹ کے حُسن شباب کو

مظفّر علی ہنر

بڑے بذلہ سنج اور خُوش طبع شخص تھے۔ مرزا ولی عہد اور خاص محل اور محبوب محل کے اُستاد تھے۔

ایک مشاعرہ ہوا "اثر پیدا ہوا ثمر پیدا ہوا" دوسری طرح یہ ہوئی "جدا ہونے کو ہے ادا ہونے کو ہے" کسی نے ہنر سے پوچھا کہ دہاں کیا طرح اب کی ہوئی؟ کہنے لگے۔ ع "اک پسر پیدا ہُوا اب دُوسرا ہونے کو ہے"

کلام ان کا بہت صاف اور بلا تصنع ہوتا تھا بڑے پرگو تھے اور ضخیم کلام تھا۔

رائگاں ہوگا نہ ہرگز خاکساروں کا غبار کچھ زمیں لے جائیگی کچھ آسماں لے جائیگا

مجھ سے الگ مرے دل مردہ کو گاڑنا دہرا جنازہ ایک کفن میں نہ چاہیئے

میری ایک غزل میں یہ مصرع تھا۔ ع بسان نگہت گل ساتھ ہم صبا کے ساتھ چلے
میں غزل پڑھ چکا تو منشی ہنر صاحب نے آہستہ سے مجھ سے کہا کہ معاف کیجئے گا۔ (بسان نگہت گل) کی جگہ برنگ گل آپ کہتے تو ایہام تناسب کا حسن پیدا ہو جاتا۔ میں نے کہا برنگ گل اس قدر لوگوں نے کہا ہے کہ میں نے عمداً اس لفظ کو ترک کر دیا ہے۔ اگر اس میں کچھ حُسن تھا بھی تو وہ متبذل ہو گیا اب حُسن کہاں رہا اس کے علاوہ آپ نے یہ نہ خیال فرمایا کہ بسان کے لفظ میں بھی تو بوئے گل کے ساتھ ایہام تناسب موجود ہے جو کسی نے نہیں کہا۔ ہنر اس جواب کو سن کر پھڑک گئے جیسے ایک پردہ پڑا ہوا تھا وہ اُٹھ گیا۔ اس کے دوسرے دن کا ذکر ہے کہ ایک مجلس میں ہنر نے اپنا سلام اور مرثیہ پڑھا۔ سلام میں یہ مصرع تھا۔

ع سزاوارِ خلافت اور امامت ایسے ہوتے ہیں

جب وہ پڑھ کے اُترے اور مجلس برخاست ہو گئی تو میں نے ان سے پوچھا کہ سزاوارِ خلافت فارسی ترکیب ہے خلافت پر امامت کا عطف (اور) کے ساتھ کیا درست ہو گا فوراً سمجھ گئے کہا کہ اس شعر کو مَیں سلام میں سے نکال ڈالوں گا۔

یہاں یہ مصرع "عیاں ہے ابروئے جاناں ہلال کی صورت" طرح ہوا تھا۔ ہنر کے ایک شاگرد تھے آغا حسن مذہب انھوں نے اپنا مطلع میرے سامنے پڑھا۔

غزل پڑھوں میں دعائے ہلال کی صورت عیاں ہے ابروئے جاناں ہلال کی صورت

میں نے کہا قافیہ مکروہ ہوگیا اس مطلع میں ایطا ہے انھوں نے مرزا مستیا عیش کو یہ مطلع سُنایا انھوں نے بھی کہا ایطا ہے منشی ہنر نے کہا تکرار قافیہ ہرگز نہیں ایک مصرع میں دعائے ہلال قافیہ ہے دوسرے میں ہلال ہے۔ فارسی کا شعر۔

اے دل اوّل بگو تو بسم اللہ کن اداشکر نعمت اللہ

بطور شاہد کے پیش کیا۔ یہ جھگڑا دور تک پہنچا۔ لکھنؤ کے شعراء و علماء کے پاس استفتے بھیجے گئے۔ کہ اس کی کیا وجہ کہ بسم اللہ اور اللہ کے قافیہ میں ایطا نہو۔ دعائے ہلال اور ہلال کے قافیہ میں ایطا ہو جائے۔

میں نے اس شبہ کو اس طرح دفع کیا کہ بسم اللہ نام ہے ساری آیت کا اور تسمیۃ الکل باسم الجزو سے علمیۃ پیدا ہو جاتی ہے یعنی بسم اللہ عَلَم ہے اور عَلَم کے اجزا میں ہر جزو لاینفک ہو جاتا ہے۔ اس سبب سے اللہ اور بسم اللہ میں ایطا نہو گا اور دعائے ہلال عَلَم نہیں ہے عبادت ہے۔ اس سبب سے ہلال اور دعائے ہلال میں ایطا ہو گا۔

گلشن الدولہ مرزا علی بہار

ناسخ والوں میں کہنہ مشق شاعر اور خوش فکر و خوش طبع سخن سنج تھے۔ غزل کی طرف توجہ کم تھی ان کا یہ مطلع یاد ہے۔

نہ دل ہے مرا اور نہ وہ نازنیں ہے　　　کئی دن سے پہلو میں کوئی نہیں ہے

مرثیہ کہنے میں مشّاق تھے۔ کہتے بھی خوب تھے، پڑھتے بھی اچھّا تھے۔ ان کے سلام کا یہ مطلع مجھے پسند ہے۔

باغ میں مدح کی بیتیں جو مزا دیتی ہیں
ڈالیاں جھوم کے پھولوں کو گرا دیتی ہیں

ان کے مرثیوں کا سلاموں کا غزلوں کا سارا ذخیرہ تلف ہو گیا۔ ان کے شاگردوں میں مانوس الدولہ بھی مرثیہ کہتے تھے۔ مٹیا برج سے لکھنؤ جا کر مجلسیں پڑھتے تھے اور حسن سخن کی داد لے کر آتے تھے۔

مالک الدولہ صولت

فتح الدولہ برق کے بھتیجے تھے۔ شعر میں انہماک و استغراق کا یہ حال تھا کہ جانتے تھے شعر سے بہتر کوئی فن دُنیا میں نہیں۔ ناسخ کے دیوان کو ایمان سمجھتے تھے بار بار اوّل سے آخر تک دونوں دیوانوں کا مطالعہ کیا چوٹی کے شعر زبان پر تھے۔ عروض کی زحافات و علل کو ہمیشہ رٹا کرتے تھے۔ جوان مرگئے اور مرتے مرتے مشاعرہ کرکے مرے۔ دق میں مبتلا تھے مگر صحبت احباب و محفل شعر و سخن میں آکر جان آجاتی تھی۔ صاحب فراش ہوگئے تو کئی مہینہ تک گھر سے نہ نکلے۔ ایک دن میرے پاس رقعہ آیا کہ میرے یہاں مشاعرہ ہے احباب کے دیکھنے کو جی ترس گیا ایک طرح بھی کردی ہے،
ع۔ اے آمدنت باعث آبادیٔ ما۔

میں اس مشاعرہ میں گیا تھا ہم سب لوگ تختوں کے چوکے پر بیٹھے تھے مالک الدولہ اپنے پلنگ پر گاؤ تکیہ کے سہارے سے کچھ بیٹھے تھے کچھ لیٹے تھے۔ لوگ اپنی اپنی غزل طرح میں پڑھ رہے تھے ہر شخص کے آگے نفیس حقہ اور خاص دانوں میں پان رکھے ہوئے تھے۔ چائے تقسیم ہو رہی تھی۔ جب صاحب خانہ کے پڑھنے کی باری آئی یعنی سب لوگ پڑھ چکے تو مالک الدولہ سیدھے ہوکر بیٹھے اور طرح کی غزل نکال کر اس طرز سے پڑھی کہ معلوم ہوتا تھا یہ بیمار ہی نہیں ہے یہ شعر مجھے یاد رہ گیا اور آپ سب صاحبوں کے سننے کے قابل ہے۔

ماتم میں میرے غم سے نہ کرنا تباہ حال　　　تم شعبدے سمجھنا یہ لیل و نہار کے

اوپر کا مصرع مجھے اچھی طرح سے یاد نہیں ہے مگر اس مصرع نے ع
تم شعبدے سمجھنا یہ لیل و نہار کے، ایک نشتر کا کام کیا اور پس پردہ کسی کے رونے کی آواز سُنائی دی۔ لوگ اُٹھ کھڑے ہوئے محفل برہم ہوگئی۔

مٹیا برج کے شعرا میں ان کا دیوان مجھے ملا تھا میں نے سارے دیوان کا انتخاب کرکے رسالہ ادیب[۵] (الہ آباد) میں کئی قسطوں میں اپنے نقد و تبصرہ کے ساتھ شائع کردیا تھا۔

---

[۵] آج سے پچاس برس پہلے ایک عیسائی ادیب پیارے لال شاکر کی ادارت میں اس شان کا رسالہ نکلا کہ پھر کوئی رسالہ اس کا حریف

اس کے دانتوں کے مقابل جو گُہر جاتا ہے — دل سے گِر جاتا ہے آنکھوں سے اُتر جاتا ہے
یوں ہے صحرا میں ہوا پر ترے وحشی کا غبار — جیسے دیوانہ کوئی خاک بسر جاتا ہے
آتشِ حسن کو پانی سے بھڑکتے دیکھا — جب نہاتا ہے تو وہ اور نکھر جاتا ہے
جسم سے جان جُدا ہو کے بھلا خاک آئے — کہ نکل کر نہیں پتھر میں شرر جاتا ہے
آمدِ فصلِ خزاں بھی ہے قیامت سے فزوں — چہرۂ بلبلِ تصویر اُتر جاتا ہے
دستِ صیاد سے بلبل کی رہائی کے لئے — غنچۂ مٹھی میں دُبائے ہوئے زر جاتا ہے
ہر حبابِ لبِ جُو کہتا ہے بہ چشمِ پُر آب — یہ زمانہ فقط آنکھوں میں گزر جاتا ہے

اس زمین میں غبار کے جانے کا انداز اور بلبلِ تصویر کا چہرہ اُتر جانے میں ایہام تناسب مجھے لطف دیتا ہے اور حبابِ لبِ جُو والا شعر تو بے مثل ہے۔ شرر و زر کے قافیہ میں ردیف اچھی نہ رہی اور یہ دیکھنے کی بات ہے کہ ردیف کے نہ چکنے سے شعر کس قدر سست ہو جاتا ہے۔
بہ نسبت اسم و حرف کے فعل میں ایہام زیادہ لطف دیتا ہے۔ صائبؔ

شکار اگرچہ دریں پہن دشت بسیار است — مرا گرفتنِ عبرت زروزگار بس است

عرفیؔ۔ عدل تو بفرزندی برداشت ستم را۔ یہاں گرفتن اور برداشت نے جو لطف دیا ہے اگر ایڈیسن سنتا تو اُسے بھی اپنی رائے سے رجوع کرنا پڑتا۔

حرم میں دیر میں صنم ہے، اِدھر کو اب یا اُدھر کو چلیئے
کہاں یہ کم ہوگی دل کی وحشت، یہ ہے تردد کدھر کو چلیئے
کہیں وہ دیکھیں نہ اس طرف کو، بچا کے اُن کی نظر کو چلیئے
پڑے نہ آکر خدنگِ مژگاں، چھپا کے ان سے جگر کو چلیئے
گزر گئی اب شبِ جوانی، ہے آمدِ مرگ ناگہانی
یہ صبحِ پیری کی ہے زبانی، کمر کو کسیئے سفر کو چلیئے!
میں بھیج کر خط ہوا ہوں مضطر، نہ قاصد آیا نہ وہ ستمگر
تلاش کیجئے نشانِ دلبر، کہ ڈھونڈھنے نامہ بر کو چلیئے
یہ دل میں ٹھانی ہے ہم نے منت، وطن میں کس کو دکھائیں صورت
بغیر شاہِ اودھ کے صولت، کبھی نہ اختر نگر کو چلیئے

بادشاہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ لکھنؤ کا نام اختر نگر بھی رہے۔ اور اسی مناسبت سے میں نے

چاہا کہ اپنا تخلص اختر رکھوں مگر معلوم ہوا کہ اختر کسی کا تخلص ہے تو میں نے اُن سے تخلص مول لے لیا جن سے بادشاہ نے تخلص مول لیا وہ قاضی محمد صادق خاں اختر ہیں یہ بنگالہ سے آ کر لکھنؤ میں ایسا بسے کہ پورے لکھنوی ہو گئے یہیں تحصیل علم کی یہیں فن شعر میں کمال پیدا کیا اور یہیں سے جاگیر و زر وہاں حاصل کیا۔ ان کا اہل زبان میں شمار ہے لکھنؤ کی زبان ان کی انتسابی نہ تھی بلکہ اُن کے گھر کی زبان ہو گئی تھی۔ تعلق ازدواج بھی انھوں نے اہل شہر میں کیا۔ میرے ایک عزیز مرحوم نواب یوسف حسین خاں ان کے نواسے ہیں اور اُن کی جاگیر کے مالک تھے اور یہ تخلص کا بیچنا کچھ بادشاہ کی خاطر سے تھا ورنہ انھوں نے کبھی اپنا تخلص نہیں بدلا۔

وہ پردہ میں ہیں نُور اِدھر بھی ہے اُدھر بھی　　کیا روشنی طور اِدھر بھی ہے اُدھر بھی
ہیں کوہ پہ فرہاد ہوا دشت میں مجنوں　　قصّہ مرا مشہور اِدھر بھی ہے اُدھر بھی
وہ کہتے ہیں بدنام کیا خلق میں تم نے　　سُن لو وہی مذکور اِدھر بھی ہے اُدھر بھی
کس سمت سے قاصد کو ملے جلد گھر اُن کا　　دو راستے ہیں۔ دور اِدھر بھی ہے اُدھر بھی

اتنی بڑی ردیفوں میں کم نے بھی دیکھا ہے کہ کوئی شعر ایسا جو نشتر بدل ہو نہیں نکلتا۔ ایسی ردیفوں میں فقط ردیف کا چمک جانا اور محاورہ میں پُورا اترنا انتہائی خوبی ہے۔

دم ملے تدبیر ایسی چاہیئے　　بس مجھے تقدیر ایسی چاہیئے
تیرے ابرو دیکھ کر بسمل ہے دل　　برق دم شمشیر ایسی چاہیئے
تا قیامت جس میں رہنا ہو تمھیں　　غافلو تعمیر ایسی چاہیئے

غزل کے مضامین میں بے ثباتی دنیا کا مضمون بہت ہی پیش پا افتادہ ہے اہل تہذیب ہمیشہ سے اس کوشش میں ہیں کہ غزل میں اس کے علاوہ بھی اخلاقی مضامین کی گنجائش ہو سکے صائب نے اس کی راہیں بہت اچھی نکالیں کہ اخلاقی مضمون ہے اور پھر بھی غزل کا شعر معلوم ہوتا ہے ؎

تا تراچوں دیگراں دیدن ظاہر کار ست　　چشم بر روئے تو چوں آئینہ بر دیوار ست
زیر شمشیر حوادث پائے بر جا ئیم ما　　رونقی تا ہیم از سیلاب دریا ئیم ما
دل بستگی خلق بہ عمر گزراں چیست　　استادگی عکس دریں آب رواں چیست
گل بے خار اگر بود دریں باغستان　　دامنے بود کہ از صحبت مردم چیدند
نہ ریخت تا گہر عاریت ز دامن خویش　　غبار تیرگی از چہرۂ سحاب نہ رفت

بزرگ اوست کہ برخاک ہمچو سایۂ ابر — چناں رود کہ دل مور را نیازارد

چاہا بہت کہ رازِ محبّت نہاں رہے — کیا کیجئے کہ آنکھ سے آنسو رواں رہے
صیّاد اب تو ہم کو رہا کر پئے خدا — دل میں نہ مرتے دم ہوسِ بوستاں رہے
یوسف کی جستجو نے ہمیں خاک کر دیا — مثلِ غبارِ راہ پسِ کارواں رہے
گو ہم چمن سے دُور رہیں لیکن یہ ہے دُعا — گلشن رہے بہار رہے باغباں رہے
آفت سے دُور رہنا قضا کی دلیل ہے — اُڑ جاؤں میں خدنگ سے زاغ کماں رہے

مطلع میں ایک درد ہے۔ صیّاد والے شعر میں اب تو سے یہ معنی نکلتے ہیں کہ طائر اسیر کو اپنے مرنے کا یقین ہوگیا۔ کارواں کی رعایت سے یوسف کی جست وجو کو باندھا ہے۔ ورنہ یوسف کی جگہ منزل کا لفظ بھی کہہ سکتے تھے۔ جہان کو شعرا ہمیشہ سے طلسم سمجھا کئے اور آج کل کے علوم جدید نے اس کا طلسم ہونا ثابت کر دیا اس سے بڑھ کر طلسم کیا ہوگا کہ عالم میں خاموشی محض ہے اور ہمیں آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ نیوٹن ثابت کر چکا ہے کہ عالم میں اندھیرا ہے آفتاب و کواکب سیاہ ہیں اور ہمیں دُنیا روشن دکھائی دیتی ہے۔ اب ہمیں اس کا انتظار ہے کہ یہ مسئلہ بھی کوئی ثابت کر دے کہ عالم معدوم ہے۔ اور ہم اُسے موجود سمجھ رہے ہیں۔ باغبان والا شعر مجھے بہت پسند ہے۔ آفت سے دور رہنا بھاگنے کے معنی پر ہے۔ ورنہ مضمون میں سُستی پیدا ہو گی۔

خلافِ قاعدہ کیوں ہو خفا کہو تو سہی — قصور، کوئی گنہ، کچھ خطا، کہو تو سہی
ہمیں یہ سخت کلامی کی تاب لاتے ہیں — کسی کو اور ہمارے سوا کہو تو سہی
بیانِ کاوشِ تیرِ مژہ پہ، وہ بولے — کہاں کہاں ہے نشانِ زخم کا کہو تو سہی

یہ زمین مخدرۂ عظمیٰ نواب بادشاہ محل صاحبہ عالم کی نکالی ہوئی ہے ؎

تمہارا دل تو نہ عالمؔ اسیرِ گیسو تھا — یہ کس طرح سے ہوا مبتلا کہو تو سہی
نہ وہ مزاج نہ وہ چہچہے نہ وہ ہنسیاں — اداس رہنے کا باعث ہے کیا کہو تو سہی

بیگم صاحبہ نے یہ غزل کہی اور خود اُس کی دُھن رکھی گائنوں کو حکم ہوا کہ یاد کریں۔ مجھے یاد ہے کہ اس غزل کا ایسا رنگ بندھا کہ اکثر لوگوں نے اس زمین میں طبع آزمائی کی کسی نے ردیف میں تصرف کر کے سنو تو سہی کر دیا ع سنبھالو تیغ ادا کو ذرا سنو تو سہی۔ صورت کے اس شعر میں۔ ع کسی کو اور ہمارے سوا کہو تو سہی ردیف کا لطف اور زبان کی خوبی داد پر ہوتی ہے۔ نواب مخدرۂ عظمیٰ کی اس غزل پر نواب محبوب عالم صاحبہ نے مصرعے لگائے ہیں ان دونوں بیگموں کو منشی مہر صاحب

سے مشورہ تھا دونوں صاحب دیوان ہیں مگر محبوب محل کا دیوان شاید تلف ہو گیا۔

یکایک آئی کہاں سے بلا کہو تو سہی — یہ کیوں اُتر گیا مُنہ چاند سا کہو تو سہی
ہوئی ہے کاہشوں کی وجہ کیا کہو تو سہی — یہ حال عشق میں کس کے ہوا کہو تو سہی
ہلال کیوں ہوئے اے مہ لقا کہو تو سہی

ہیں یاد تجھ کو دغا بازیاں زمانے کی — ہمیشہ سے یونہیں عادت ہے قسمیں کھانے کی
فقط یہ گھات ہے پہلو سے اُٹھ کے جانے کی — عبث عبث نہ قسم کھاؤ کل کے آنے کی
کیا ہے کون سا وعدہ وفا کہو تو سہی

ہمیں کو رنج دم قیل و قال دیتے ہو — رقیب کو نہیں ایسا ملال دیتے ہو
مزا ہے دل کے جلانے میں کیا کہو تو سہی

کہیں کچلیں نہ یہ اولجھے دل آ کر پاؤں کے نیچے
کہ ہیں گیسو تمہارے سر کے اوپر پاؤں کے نیچے

سوم کو بھی نہ آئے فاتحہ کو قبرِ عاشق پر
نہ روندی تم نے یہ پھولوں کی چادر پاؤں کے نیچے

یہ زمین بادشاہ کی طرح کی ہوئی ہے شعرائے سبعہ سیارہ اور تمام سخن سنجان دربار نے ٹوٹ ٹوٹ کر فکر کی تھی۔ میں شریک صحبت نہ تھا مگر غزلیں اکثر لوگوں کی سنیں اگر وہ مشاعرہ چھپتا تو انتخاب میں اچھے اچھے شعر آتے۔ ؎

گرز باں ہو ہر دہاں زخم بسمل کے لیے — مانگے خالق سے دعائے خیر قاتل کے لیے
جان دینا اک نہ اک دن زلف ساقی کا نہاں — بال آجانے کا ڈر ہے شیشۂ دل کے لیے
دو قدم چلنے پہ غش آتا ہے اب یہ حال ہے — پہلے میں عاجز نہ تھا دو چار منزل کے لیے

زلف کی رعایت سے بال آجانے کا لفظ شعر میں لائے ہیں رعایتہً جہاں بھرتی معلوم ہو وہاں بے شک بُری معلوم ہوتی ہے جیسے حافظؔ کے اس شعر میں ؎

یار گندم گون ما گر میل کردے نیم جو — ہر دو عالم پیش چشم ما نمودے یک عدس

اگر رعایتہً بے تکلف آجائے اور مبتذل بھی نہ ہو تو اب بھی لطف دے جاتی ہے۔

لاکھ ہم نیستد کا بہانہ کریں — دخل کیا ہے جو چشم تر سوئے

کبھی چونکے نہ ہوشیار ہوئے   اجل آ پہنچی اس قدر سوئے
جا کے سوئے عدم بنائی کروٹ   واہ صوتکت یہ بے خبر سوئے

پہلے شعر میں اگر چشم تر کی جگہ دیدۂ تر کر دیں تو مصرع جب بھی موزوں رہتا ہے قافیہ جو پہلے تھا وہی اب بھی رہا لیکن ردیف بدل جائے گی یعنی سوئے پہلے فعلن کے وزن پر تھا۔ اب فاع کے وزن پر ہو گیا اس سبب سے یہ مصرع دخل کیا ہے جو دیدہ تر سوئے۔ باوجود اس کے کہ بحر وہی ہے قافیہ وہی ہے ردیف بھی دیکھنے میں وہی ہے مگر دوسری زمین میں ہے اور زمین کے بدل جانے سے اس زمین میں یہ مصرع ہو تو غلط سمجھا جائے گا طالب فن کو اس کا خیال ضرور چاہیئے۔ مثنوی میں ایسی غلطی اکثر میں نے دیکھی ہے مثلاً ؎

جانب پشت تو گدھے کا تھا مُنہ   اس کی دُم کی طرف تھا ان کا مُنہ

دیکھنے میں تھَا کا قافیہ کاَ صحیح معلوم ہوتا تھا لیکن تھَا کا الف گر گیا اور کاَ میں الف باقی ہے اس سبب سے اس شعر میں قافیہ نہیں رہا یا مثلاً یہ شعر ؎

ابر آیا ہے بادہ خوار آئے   بے پئے کس طرح قرار آئے

اس میں بھی پہلے مصرع میں آئے فعلن کے وزن پر ہے اور دوسرے مصرع میں فاع کے وزن پر ہے۔ غرض کہ اس شعر کے غلط ہونے کی وجہ یہ ہے کہ زمین بدل گئی پہلے مصرع کا وزن مفعول مفاعلن فعلولن ہے اور دوسرے مصرع میں فعلولن کی مفاعیل ہو گیا۔ آزادؔ مرحوم اس نکتہ کو نہ سمجھے آبِ حیات میں جرأت کی اس غزل پر ؎

اجل گر اپنی خیال جمال یار میں آئے   تو پھر بجائے فرشتہ پری مزار میں آئے
خراب کیوں کہ نہ ہو شیر دِل کی آبادی   ہمیشہ لوٹنے والے ہی اس دیار میں آئے

اعتراض کرتے ہیں کہ کس دھوم کی غزل تھی مگر آئے کہیں واحد ہے کہیں جمع ہو گیا ہے۔ اگر جرأت نے یوں کہا ہوتا ع پری بجائے فرشتہ مزار میں آئے۔ تو البتہ زمین بدل جاتی واحد و جمع کو کیا دخل ہے جو یہاں تکلیف دے گئی۔

خفا ہو چکے آؤ مل جاؤ اب   چلو بس جبیں پر شکن پڑ چکی
نزاکت اگر ایسی ہی ہے تو پھر   یہ تلوار لے تیغ زن پڑ چکی
جو تقدیر ہی میں ہے فرقت لکھی   تو پھر کوئی تدبیر بن پڑ چکی

کہی حکم اخترؔ سے صوتت غزل — کہ شہ سے بنائے سخن پڑ چکی

ایسی کڈھب زمینیں بادشاہ ہی نکالا کرتے تھے کہ رسن پڑچکی اور شکن پڑچکی کے سوا قافیہ ردیف سے نہیں پٹتا مگر مالک الدولہ نے اچھے شعر نکال بیٹے۔

شکل پیش نظر کسی کی ہے — ایک صورت یہ دل لگی کی ہے
میرا دل تو نہ تھا کسی لائق — نظر لطف آپ ہی کی ہے
اور کچھ تم سے واسطہ نہ سہی — جان پہچان تو کبھی کی ہے
دیں ہمیں دل ابھیں ہوں پھر مجرم — واہ کیا خوب منصفی کی ہے
سوزش قلب زار سن سن کر — اس نے کیسی جلی کٹی کی ہے

ان اشعار میں تغزل کا لطف بھرا ہؤا ہے اور یہی رنگ اُن کے دیوان میں زیادہ تر ہے۔ مگر بادشاہ کی طبیعت تصنع کو بہت پسند کرتی تھی یعنی برقؔ و بحر و خواجہ وزیرؔ جس رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے وہی رنگ بادشاہ کو پسند تھا ان لوگوں کا شمار زبان اُردو کے اساتذہ میں تھا۔ میر انیسؔ سے شاعر معجز بیاں نے بحر کے ایک شعر پر مصرعے لگائے اور سر منبر پڑھے۔ غرض کہ مالک الدولہ میں کچھ خاندانی اثر کچھ بادشاہ کی پسند کا خیال ضرور تھا اس رنگ کے شعر بھی ان کے دیوان میں موجود ہیں مثلاً کہتے ہیں

چاہے قیدی جو ترا رزق بلا منت غیر — ہے یقیں دامن زنجیر ے خرمن ہو جائے
کمر ماہ کی ہے چاہ میں رشتہ کا مرض — کافی اب ڈوبنے کو چشمۂ سوزن ہو جائے

مگر یہ رنگ غیر طبعی ہونے کے بوجب سے کبھی عام پسند نہیں ہؤا لکھنؤ میں ہمیشہ آتشؔ و انیسؔ و نسیمؔ دہلوی کے جرگہ والے اس کا مضحکہ کیا کرتے تھے۔ رشکؔ کے اکثر اشعار نقل محفل تھے لیکن یہ خیال لوگوں کا کہ یہ رنگ لکھنؤ کے ساتھ مخصوص ہے نفس الامر سے مطابقت نہیں رکھتا شاہ نصیرؔ کا دیوان اُٹھاکر دیکھیں کہ اوّل سے آخر تک اسی تصنع سے بھرا ہوا ہے۔ ذوقؔ کا کلام بھی اس سے خالی نہیں ہے مومنؔ کا اور غالبؔ کا اُردو دیوان بھی جادۂ مستقیم سے الگ ہے انھوں نے اس قسم کے تصنع کو چھوڑا دوسری قسم کا تصنع اختیار کیا اس سبب سے کہ جو غزل میں جدّت نہ کرے وہ شاعر ہی نہیں۔ لکھنؤ کے امرا میں نواب غضنفر الدولہ بہادر مرحوم شعر تو نہیں کہتے تھے مگر بڑے سخن فہم تھے اور شوق کا یہ حال تھا کہ شہر کا کوئی مشاعرہ ان سے نہ چھوٹتا تھا مجھ سے کہنے لگے کہ بھئی شعر کا شوق کیا ہے تو ایک بات ہماری یاد رکھنا خدا کے لئے جدّت پیدا کرنے کا زیادہ خیال نہ کرنا۔ رباعی

ہے ماہِ صیام دل سے کر یاد الٰہ — لا دھیان میں ایام جوانی کے گناہ

آئینہ میں دیکھ صبح پیری کا طلوع　　　خیط ابیض ہے تیرا اب موئے سیاہ

پیری کے حال کی یہ رباعی بیاض انتخاب میں لکھنے کے قابل ہے۔ موئے سیاہ کا خیط ابیض ہوجانا لطف سے خالی نہیں۔ رباعی کے اوزان میں ایک مغالطہ عامۃ الورود ہوا کرتا ہے کہ مفعولن مستفعلن مفاعیل فع کے وزن پر بعض مصرع کہہ جایا کرتے ہیں اور یہ کوئی وزن رباعی کا نہیں اس سے احتراز واجب ہے اور طالب فن کو یہ نکتہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ رباعی کا وزن حقیقی مفعول مفاعلن مفاعیل فعل ہے اور وزن الحاقی مفعول مفاعیل فعل ہے۔ یہ دونوں وزن مطبوع ہیں۔ الحاق کا سبب یہ ہے کہ دونوں وزنوں میں نہایت مشابہت ہے ایک میں مفاعلن ہے اور ایک میں مفاعیل ہے مفاعلن میں پانچواں حرف متحرک اور چھٹا ساکن ہے اور مفاعیل میں پانچواں ساکن اور چھٹا متحرک ہے اس کے سوا اور کسی طرح کا فرق نہیں ہے۔ وزن حقیقی میں بعمل تحقیق تین صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔ مفعولن فاعلن مفاعیل فعل۔ مفعول مفاعلن مفاعیلن فع۔ مفعولن فاعلن مفاعیلن فع۔ وزن الحاقی میں بعمل تخنیق سات صورتیں پیدا ہوتی ہیں مفعولن مفاعیل فعل۔ مفعول مفاعیل مفاعیل مفاعیلن فع۔ مفعول مفاعیلن مفعول فعل۔ مفعولن مفعول مفاعیلن فع۔ مفعول مفاعیلن مفعولن فع۔ مفعولن مفعولن مفعول فعل۔ مفعولن مفعولن مفعولن فع۔ دو وزن دہ اور دس تخنیق سے پیدا ہوئے۔ یہ سب بارہ وزن ہوئے۔ اب بموجب اس قاعدہ کلیہ کے کہ چاہیں مصرع کو ایک ہی ساکن پر ختم کردیں چاہیں آخر میں ایک ساکن اور بڑھا دیں ان بارہ وزنوں کے آخر میں جہاں جہاں فعل ہے اُسے فعول کرسکتے ہیں جہاں جہاں فع ہے اُسے فاع کرسکتے ہیں۔ یہ چوبیس وزن رباعی کہلاتے ہیں۔ ان سب اوزان کے پرکھنے کی ایک سہل سی صورت ہے کہ مفاعلن اور فاعلن کے سوا جہاں جہاں نون ہوئے متحرک کرکے پڑھو وزن مطبوع پیدا ہوجائیگا برخلاف مفعولن مستفعلن مفاعیلن فع کے کہ نون متحرک کرکے پڑھو تو اور بھی ناموزوں ہوجاتے بہت عرصہ ہوا کہ وزن رباعی پر میں ایک مفصل مضمون شائع کرچکا ہوں اسے دیکھنا چاہیئے اس وزن میں ہزار برس سے گتھی پڑی ہوئی تھی جسے اس ہیچمداں نے سلجھایا ہے۔

تاریخ وفات نواب مصلح السلطان بہادر

انجم الدولہ مصلح السلطان　　　پیش بگرفت راہ از ہستی
گفت صولت پئے سنہ رحلت　　　بہ عدم رفت آہ از ہستی
۱۲۹۰

نواب انجم الدولہ بہادر مصلح السلطان پشتہا پشت کے امیر تھے دربار اودھ میں ان کا مرتبہ وزارت کے قریب قریب تھا صورت پر امارت برستی تھی شاعر تو نہ تھے مگر فارسی و اُردو کے صدہا شعر چوٹی کے یاد تھے کہ جس صحبت میں شعر پڑھنا شروع کرتے تھے لوگ محو ہوجاتے تھے۔ پوشاک

کی نفاست اور عطر کا شوق ان کے مزاج سے مخصوص تھا۔ بادشاہ نے بنارس سے دخانی کشتیوں پر سفر کیا تو یہ بھی ساتھ تھے۔ خلیج بنگال کے طوفان میں کئی کشتیاں ڈوب گئیں ان میں نواب صاحب کا پوشاک خانہ تلف ہوگیا مگر اس پر بھی پشمینہ اور جامدانی کی قبائیں ایسی ایسی باقی رہ گئی تھیں کہ نمائش میں رکھی جاتی تھیں اور ان کا مثل اب کشمیر یا ڈھاکہ میں دستیاب نہ تھا۔ رفعتہ الدولہ مرحوم ایک دفعہ کہنے لگے کہ میں جب عطر لگاتا تھا بیسن سے ہاتھ دھوتا تھا آج نواب انجم الدولہ کو میں نے دیکھا کہ عطر لگا کر انہوں نے ہاتھ نہیں دھوئے ذرا سا کیوڑا یا گلاب ہاتھ پر چھڑکا اور دستی رومال سے رگڑ کر دونوں ہاتھ پوچھ ڈالے عطر کی چکنائی بھی چھوٹ گئی اور خوشبو بھی ہاتھوں میں رہ گئی مجھے یہ بات نہایت پسند آئی۔

نواب سید امیر علی خاں باڑھ کے رہنے والے ہائیکورٹ کے وکیل تھے مٹیا برج میں بادشاہ کے ملازم ہوئے بتدریج ایسی ترقی کی اور اس قدر تقرب حاصل کیا کہ وزیر السلطان خطاب ہوا اور تمام اہل دربار ان سے رشک کرنے لگے ہر ایک کو فکر ہوئی کہ انھیں بادشاہ کی نظر سے گرائیں۔ غدر کے زمانہ میں انھوں میجر کونیا قلعہ دار ولیم فورٹ کو ایک جھوٹی خبر پہنچائی تھی کہ راجہ بن سنگھ لکھنؤ سے چھپ کر آئے اور بادشاہ سے ملے اور ایک فرمان مزین بمہر شاہی لکھوا کر لے گئے ہیں کہ اہل اودھ غدر کر کے انگریزی تسلط کو اٹھا دیں میجر کونیا نے فوراً یہ واقعہ نواب گورنر جنرل کے حضور میں عرض کیا وہاں سے بادشاہ کو قید کر لینے کا حکم صادر ہوا۔

۲۳ رشوال ۱۲۷۳ھ صبح کا وقت تھا بادشاہ وظیفہ میں مشغول تھے کہ داہنی طرف مڑ کر دیکھا۔ کہ دریائے بھاگا رتی میں تین جنگی جہازوں نے ایوان شاہی کے محاذی لنگر ڈال دیا گورے وردیاں پہنے مسلح منتظر حکم کھڑے ہیں توپوں کا منہ سلطان خانہ کی طرف ہے۔ بائیں جانب مڑ کر دیکھا تو کئی پلٹنیں گوردن کی کوٹھی کو محاصرہ کئے ہوئے ہیں اور سب پھاٹکوں پر کئی گھڑ چڑھی توپیں لگی ہوئی ہیں۔ اسی اثناء میں مصلح السلطان انجم الدولہ بہادر زرہ بکتر لگائے حضور میں حاضر ہوئے عرض کی کہ میجر کونیا کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں حکم ہوا کہ بلالو میجر کونیا نے نواب گورنر جنرل بہادر کا پیغام پہنچایا کہ جب تک ہندوستان میں غدر ہے آپ کا ولیم فورٹ میں رہنا مناسب ہے جہاز اسی واسطے حاضر ہوئے ہیں کہ آپ سوار ہو کر قلعہ میں رونق افروز ہوں۔ بادشاہ نے جہاز میں سوار ہونے سے انکار کیا اس پر ... بادشاہ ایک تلوار ہاتھ میں لئے ہوئے سوار ہوئے

اسے روک دیا اور خود حسب قاعدہ پہلو میں بیٹھ گئے میجر کوتیا سامنے بیٹھے شاگرد پیشہ والوں میں سے ایک شخص گاڑی کے پیچھے کھڑا ہونے لگا کہ نواب دیانتہ الدولہ بہادر نے اسے ہٹا کر کہا کہ آج یہ مقام ہم غلاموں کا ہے ان کے ساتھ عشرۃ الدولہ رفیق مجاہدالدولہ بھی گاڑی کے پیچھے کھڑے ہوگئے چوکڑی ٹیا برج سے چلی اور ولیم فورٹ میں داخل ہوگئی۔ میجر کوتیا نے اپنے روزنامچے میں اس طرح یہ سارا واقعہ لکھا ہے کہ میرے گوئندہ امیر علی نے مجھے خبر دی کہ کل راجہ مان سنگھ چھپ کر آئے اور بادشاہ سے غدر کے لئے فرمان لے گئے لیکن بعدہٗ معلوم ہوگیا کہ وہ خبر جھوٹی تھی اس روز تو راجہ مان سنگھ لکھنؤ میں موجود تھے۔ حریفوں نے میجر کوتیا کا روزنامچہ منگایا اور شاہزادہ مرزا جہاں قدر بہادر کی وساطت سے بادشاہ تک پہنچا دیا مگر بادشاہ عجب نفس رکھتے تھے فرمایا کہ اس زمانہ میں امیر علی میرے ملازم نہ تھے۔

ردّ نساخ و جواب انتخاب نقص کی تاریخ

۶۔ کامل کو جو ناقص کہے خود ہوگا وہ ناقص ۱۲۹۲ ہجری

نساخ نے میر انیس و مرزا دبیر کے کلام پر اعتراضات شائع کئے ہیں منشی مظفر علی ہنر شعرائے سبعہ میں سے تھے اور مرثیہ بھی کہتے تھے مرزا صاحب کے پرانے شاگردوں میں تھے انھوں نے ردّ نساخ میں ایک کتاب لکھی صوتحت نے اس کی تاریخ میں یہ مادّہ بہت بے تکلّف نکالا ہے، منشی ہنر صاحب نے وہ ساری کتاب اوّل سے آخر تک مجھے بھی سنائی تھی بہت ہی دنداں شکن جواب تھے افسوس ہے کہ چھپی نہیں اُس کے تھوڑے دنوں بعد ان کے مکان میں آگ لگ گئی اور ساری محنت ان کی تلف ہوگئی دو ایک باتیں مجھے یاد رہ گئیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ نشتر کی طرح چیر گئی ہر رگ و پے میں۔ اس پر یہ اعتراض تھا کہ تلوار کو نشتر کہا اور پھر نشتر ہر رگ و پے میں پیرتا کب ہے یوں کہنا چاہیئے تھا کہ ع سوزن کی طرح پیر گئی ہر رگ و پے میں ہنر نے جواب دیا کہ نشتر کے لفظ میں کاتب اور معترض دونوں نے دھوکا کھایا میرے پاس وہی مرثیہ قلمی موجود ہے اس میں نشتر کی نشتر کا لفظ ہے۔ ایک اور بات پر مجھے ہنسی آئی تھی وہ یہ ہے کہ ع گل تھا چراغ چشم ثریا مثال کا۔ اعتراض یہ تھا کہ ثریا میں بہت کم روشنی ہوتی ہے اور اُسے چشم سے تشبیہ دی تو کیا دی۔ ہنر نے جواب دیا کہ معترض کو یہ نہ سوجھا کہ چشم نابینا کی مدح میں یہ مصرع ہے اور نابینا ہونا اس لفظ سے بخوبی ظاہر ہے کہ مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ گل تھا چراغ غرض ہنر کا جواب بہت پُر لطف و پرمغز تھا وہ تو آتش زدگی میں رائگاں ہوا مگر راجہ امیر حسن خاں مرحوم نے ان ہفوات کا ایک جواب

تھا۔ نساخ کی اس حرکت سے مجھے بھی ملال ہوا تھا ٹیابرج میں وہ آئے اور انسخ ان کے شاگرد بھی ساتھ تھے میں نے کہا آپ نے ناسخ سے انسخ و نساخ دو لفظ جو بنائے اس کی کہیں سند بھی ہے کہنے لگے انسخ باب التفضیل ہے میں نے کہا افعل بمعنی مفعول بھی تو ہوا کرتا ہے جیسے اشہر بمعنی مشہور ہے تو اس قیاس پر انسخ بمعنی منسوخ ہو سکتا ہے اور نساخ کا لفظ آپ نے کہیں دیکھا ہو تو اس کی سند چاہیئے کہنے لگے مبالغہ ہے میں نے کہا ذلیل پیشوں کے لئے بھی یہی وزن آتا ہے جیسے حجام قصاب بقول بزاز صرف نجار خیاط اس کی سند کا بھی وعدہ کیا پھر مرزا جہاں قدر نے کچھ پڑھنے کی فرمائش کی غزل انھوں نے شروع کی اس میں بھی کئی غلطیاں تھیں ایک کا جواب نہ دے سکے ہر شعر پر یہی کہتے تھے کہ اس کی سند لکھ کر بھیج دوں گا۔ تحریر سرمہ کا لفظ بھی تھا۔

سید صالح خادم کربلا سے حضرت کے لئے عبا لے کر آئے تھے مالک الدولہ نے تاریخ کہی مادہ کا مصرع یہ ہے۔ ع پاک حلہ پئے اختر آیا۔ ۱۲۹۱ سنہ ہجری

ان سید صاحب نے خوب ہی دام فریب پھیلایا تھا بادشاہ سے کہا کہ امام حسینؑ نے حکم دیا کہ عبا لے جاکر واجد علی شاہ کو ہماری طرف سے دو بادشاہ نے وہ عبائے سیاہ سر پر رکھ لی سب شاہزدوں کے پاس بھیجی کہ سر و چشم پر اُسے رکھیں سید صاحب کو بہت کچھ اس کا صلہ مل چکا تھا مگر چلتے چلتے انھوں نے اور چونکا کیا عرض کی کہ ناصر الدین شاہ ایران کی طرف سے ایک جھاڑ کربلا میں روشن کرتا ہے میں چاہتا ہوں کہ حضرت کی طرف سے بھی جھاڑ روشن ہوا کرے فوراً یہ استدعا مقبول ہوگئی جھاڑ کی قیمت اور بتیوں کے ماہانہ مخارج کے لئے حکم ہوگیا۔

تاریخ امام باڑہ جلیس الدولہ۔ ع

مظلوم کی ہے بارگاہ ۱۲۹۰ سنہ ہجری

یہ مصرع بحز و رجز میں ہے۔ جلیس الدولہ میرزایان شیراز میں سے تھے عہد سلطنت میں آکر بادشاہ کے ملازم ہوئے اور مرتے دم تک ان کی رفاقت میں رہے ان کے فرزند اکبر حامد الدولہ بر ترآن کی خدمت عنایت ہوئی یہ شخص فارسی و اُردو دونوں میں اہل زبان بھی تھے اور دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے کلکتہ سے ٹیابرج جہاز پر آرہے تھے کنارہ کے قریب پہنچ کر ایک دوسرے جہاز سے ٹکر ہوئی غریق رحمت ہوگئے۔ مرحوم بڑے پیراک تھے مگر انجن کے پھٹ جانے سے کچھ صدمہ پہنچا کہ اُبھر نہ سکے۔

تاریخ انتقال صاحب عالم مرزا ولیعہد ع

کوکب شد زیر خاک نائم ۔ ۱۲۹۱ سنہ ہجری

خلیج بنگال کے طوفان کی زحمتیں اُٹھاکر بادشاہ جب کلکتہ پہنچے تو فسخ عزم کیا اور انگلینڈ کا جانا موقوف رہا اُس وقت مرزا ولیعہد آمادہ ہوئے کہ آپ نہیں جاتے تو مجھے بھیجئے ان کے اس ارادہ سے بادشاہ بہت خوش ہوئے مرزا سکندر حشمت اور جناب عالیہ بھی ساتھ چلنے پر آمادہ ہوئیں گو والدہ ولی عہد نواب مخدرہ عظمیٰ ناراض ہوئیں اور انھوں نے فہمائش کی کہ بادشاہ نہیں جاتے تو تمہارے جانے سے کیا فائدہ ہوگا مگر انھوں نے ایک نہ سنی انگلینڈ میں ان لوگوں کا پہنچنا ایک نیا واقعہ تھا اہل شہر نے ہجوم کیا اور دیکھنے کے مشتاق ہوئے ان کو سرکاری لوگوں کے سوا اور کسی سے ملنا منظور نہ تھا مگر مسٹر برڈ اور مسٹر برنڈن کی سفارش سے کہ یہ دونوں انگریز متوسلین دولت اودھ میں سے تھے انگلینڈ میں دونوں شاہزادوں نے دربار عام کیا حبشی خواجہ سرا صف بستہ پس پشت کھڑے ہوئے تھے اور مسٹر برڈ ہر ایک کے بروقت تعارف خدمت ترجمانی ادا کرتے تھے اس دربار میں بڑے بڑے رئیس و عہدہ دار انگلینڈ کے آئے تھے جنابہ عالیہ سے ملنے کو بہت سی معزز انگریز نیں آئی تھیں اور مس برنڈن ترجمان تھیں۔ ملکہ معظمہ سے ایک ملاقات ہوئی تھی جس میں زحمت سفر کے سوا کچھ ذکر نہیں آنے پایا تھا کہ ہندوستان کے غدر کی خبریں آنے لگیں اور انگلینڈ کی ساری خلقت اس قدر ان لوگوں سے بیزار ہوگئی کہ وہاں ٹھہرنا مشکل ہوگیا۔ حکیم احسن الزمان نگینہ کے ایک طبیب اس قافلہ کے ساتھ تھے بیان کرتے تھے کہ ہم لوگ مکان کے دروازے بند کئے بیٹھے تھے کہ ایسا نہ ہو کہ ہندوستان کے غدر کا قصاص ہم سے لیں مایوس ہو کر یہ لوگ پیرس میں چلے آئے دس پندرہ دن کے عرصہ میں جناب عالیہ اور مرزا سکندر حشمت کا انتقال ہوگیا امپراطور فرانس نے مرزا ولی عہد سے ملنا چاہا کہ تعزیت ادا کریں اور ملکہ معظمہ سے ان کی سفارش کریں مگر ولی عہد نے یہ عذر کیا کہ دونوں سلطنتوں میں صفائی نہیں ہے اور ہم کو انگلینڈ کی سرکار سے توسل ہے آپ سے ملنا مناسب نہیں معلوم ہوتا اور یہ ذکر میں نے سنا کہ جب یہ قافلہ لکھنؤ سے کلکتہ آرہا تھا تو رانی گنج سے ریل پر سوار ہوئے راہ میں فرانس ڈانگہ ملا وہاں جب ریل ٹھہری تو ایک ہندو مہر نے مرزا ولی عہد کو یہ صلاح دی کہ یہیں اُتر پڑیئے اور اپنے معاملات کو دولت فرانس کی وساطت سے طے کیجئے اس بہتر ذریعہ آپ کو نہیں ملے گا۔ مگر انھوں نے یہی کہا کہ دولت فرانس سے پناہ لے کر انگریزوں کے قدیمی تعلقات کو قطع کرنا مناسب

حال یہ ہے کہ خبر کو انشا بنا لے۔ علما نے خبر کے اقسام، انشا کی صورتیں بہت تفصیل و توضیع سے بیان کی ہیں لیکن یہ تصریح کسی نے نہیں کی تھی کہ "خبر کو انشا بنا لینے میں کلام کی بلاغت بہت بڑھ جاتی ہے۔" اس نکتہ پر بس ایک ہی نظر پڑی اور اسی نے اس مسئلہ کو ادب الکاتب والشاعر میں داخل کیا۔

اے شاعر نو سخن خدارا　　اندازِ سخن نے تیرے مارا

بادشاہ کے اس شعر میں فنِ بلاغت کا ایک نکتہ اور بھی ہے جسے علاوہ جرجانی نے اسرار البلاغۃ میں ذکر فرمایا ہے۔ اور غالباً ان کے سوا کسی کی نظر نہیں پڑی تھی وہ نکتہ یہ ہے کہ حذف سے کلام کی بلاغت بڑھ جاتی ہے۔ بادشاہ نے اس شعر میں "خدارا" کہہ کر کلام کو ختم کر دیا اور مقصود یہ ہے کہ "اے شاعر نو سخن خدارا ایسی شوخیاں نہ کر" مقصود میں سے آخر کا فقرہ حذف کر دیا اور اس حذف کو دینے سے کلام کی بلاغت حدِّ اعجاز تک پہنچ گئی۔ اسی قسم کی مثالیں دے کر صاحب اسرار البلاغۃ فرماتے ہیں کہ الفاظ تو کہے نہیں، اور معنی اس کے سننے والوں کے دلوں میں اتار دیئے یہ سحر نہیں تو کیا ہے۔

مائلؔ کا یہ اعتقاد تھا کہ دنیا میں شعر سے بڑھ کر کوئی شرف نہیں یہ شعر کی فکر میں فنا ہو گئے تھے۔ شاعر خوش فکر و صاحب دیوان تھے۔

بادشاہ کے مرنے کے بعد ایک مائلؔ تھے جو لکھنؤ میں زندہ پہنچے ایک میں ہوں جو حیدر آباد چلا آیا اور ابھی تک زندہ ہوں۔

ان کے کلام میں تصنع بالکل نہیں۔ ؎

عہدِ پیری میں عیاں داغ جگر ہونے کو ہے
گرمیٔ ہنگامۂ شمع سحر ہونے کو ہے

یہ مطلع مائل کا ہے لیکن ایک بوڑھے شاگرد اُن کے اپنے نام سے پڑھا کرتے تھے بعض لوگوں نے گرفت کی اور کہا یہ مطلع تو مائلؔ کا ہے انھوں نے کہا اکثر لوگوں کا قاعدہ ہے کہ پیش خوانی میں استاد کا کلام پڑھا کرتے ہیں کوئی پسند کر کے داد دیتا ہے تو اُستاد کی طرف سے میں سلام بھی کر لیتا ہوں۔

یہ تین شعر مائلؔ کے اور مجھے یاد آ گئے ہیں۔ مرزا ولی عہد کے مشاعرہ میں انھوں نے پڑھے تھے۔

؎ طریق گریہ تجھے چشم تر نہیں آتا　　کہ ساتھ اشک کے خونِ جگر نہیں آتا
خدا دکھائے نہ تاریکیٔ شبِ فرقت　　کہ آسمان و زمیں کچھ نظر نہیں آتا
نہ جانے کس کا یہ تیرِ نظر تھا آفت کا　　کہ التیام پہ زخمِ جگر نہیں آتا

ہوئے کی آنکھ اور ہے میری نگاہ اور   اور جلوہ گاہ یار میں بے کار آئے ہیں

ایک دفعہ ان شعراء میں سے جو لوگ مشّاق اور استاد تھے انہوں نے آپس میں اتفاق کیا کہ عہد رسالت کے واقعات و غزوات کو سب مل کر اردو میں شاہنامہ کے وزن پر نظم کریں۔ درخشاں نے عقد امیر المومنین وجناب سیدہ کو نظم کیا اور جشن کے جلسہ میں پڑھا۔ سائل نے فتح مکہ کے واقعہ کو نظم کرکے ایک محفل میں پڑھا۔ ان دونوں مثنویوں کو میں نے بھی سنا تھا۔ بہت خوبی سے نظم ہوئی تھیں۔ ہنرادر عیش اور بہادر نے بھی اسی قسم کی مثنویاں لکھی تھیں اور جشن میں پڑھی گئی تھیں یہ سب مثنویاں جمع ہو کر ترتیب واقعات کے ساتھ چھپ جاتیں تو اردو میں ایک نادر کتاب ہوتی۔

مٹیا برج جب تباہ ہوا تو ایک سال کے اندر اندر یہ سب لوگ مر گئے اور سارا کلام ان کا تلف ہو گیا ان مثنویوں کا بھی پتہ نہیں۔ گمان تھا کہ سائل کا کلام محفوظ ہوگا ان کے انتقال کے بعد میں نے شرر مرحوم کو خط لکھا کہ سائل کے فرزند سے مل کر ان کے دیوان و قصائد و مثنویات کے حفاظت سے دیکھنے کی تاکید کریں۔ شرر کثرت سے امین آباد گئے۔ سائل کے دیوان کو پوچھا تو صاحبزادہ نے کہا خدا جانے کیا ہو گیا۔

مرزا جہاں قدر نیّر

بادشاہ کے داماد اور بھتیجے جنہیں بادشاہ نے خود پرورش کیا ان کے والد مرزا سکندر حشمت ان کو بادشاہ کے ظل عاطفت میں چھوڑ کر مرزا ولی عہد اور اپنی والدہ ملکہ کشور کو لے کر انتزاع سلطنت کے معاملہ میں ملکہ وکٹوریا کے حضور میں ایسٹ انڈیا کمپنی پر نالش کرنے گئے تھے۔

مسٹر برڈ اور مسٹر برنٹن یہ دو انگریز ملازمان سلطنت اودھ میں سے تھے۔ ان دونوں انگریزوں کو بھی ایسٹ انڈیا کمپنی کی یہ بے وفائی سخت ناگوار ہوئی۔ انہوں نے یہ مشورہ دیا کہ انگلینڈ کے محکمہ شاہی میں کمپنی پر نالش کرنا چاہیے۔ لیکن ابھی نالش کرنے کی نوبت نہ آئی تھی کہ ہندوستان میں انگریزی فوج نے غدر کر دیا اور انگریزوں کو بہت ہی بے رحمی سے قتل کرنے لگے۔ یہ خبریں انگلینڈ میں پہنچیں وہاں ایک قیامت برپا ہو گئی۔ کشتیوں کے عزیز و اقربا ان لوگوں پر پل پڑے گالیاں اور غیظ و غضب کی چنگاریاں

سب دشتم کی بوچھاڑ ہر طرف سے ہونے لگی ان کا بس چلتا تو لکھنؤ کے ان مسافروں کو کچا کھا جاتے۔ اپنی جان بچانے کے لئے یہ قافلہ انگلینڈ سے روانہ ہو کر پیرس میں آ بسا غدر کے زمانہ کو طول ہوا بادشاہ کے بھائی اور والدہ دونوں آدمی پیرس کی خاک میں مل گئے۔

خلاصہ یہ کہ مرزا جہاں قدر کو خود بادشاہ نے پرورش کیا اور یہ سب شہزادوں میں بڑے لائق اور ذی علم بھی تھے ویسرائے کے یہاں ان کو بامرزا ولی عہد کو کب کو پریویٹ انڈی حاصل تھی یہ ٹالی گنج کے تمام میسوری شاہزادوں سے کلکتہ کے تمام حکام و شرفاء سے بے انتہا ربط رکھتے تھے۔ اس باب میں ان کو ایسا ملکہ حاصل تھا کہ لوگوں کو حیرت ہوتی تھی کبھی کبھی مشاعرہ بھی کرتے تھے۔ اپنا کلام مجھی کو دکھاتے تھے غزل بہت کم کہتے تھے۔ یہ مقطع ان کی ایک غزل کا مجھے یاد ہے۔

بہت دنوں بعد ہم کو نیّرؔ پتہ ملا ہے۔ دل و جگر کا
وہ نکلا پتھر سے آگ بن کر یہ ٹپکا مہندی سے رنگ ہو کر

آغا حجو شرف کا یہ شعر ان کو بہت پسند تھا۔

چمن میں جا کے جو دل کی تلاش کی میں نے
چھدا ہوا اسے اک نوک خار میں دیکھا

طبیعت کا رنگ اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے۔ شرف کے اس شعر کو اس قدر رٹا کہ ایک مدت کے بعد اسی کے پرتو سے یہ مقطع پیدا ہوا جو اصل سے بھی بڑھ گیا۔

انہوں نے مجھ سے سبعہ معلقہ پڑھی امرؤ القیس اور طرفہ کے قصیدوں کا اردو میں ترجمہ بھی کیا۔ ایک شعر کا ترجمہ نمونہ کے طور پر سننے کے قابل ہے۔ طرفہ کا یہ شعر کہ وہ ایک نصیحت گو عورت سے خطاب کر کے کہتا ہے۔

عرب کے علوی ہمت و حوصلہ بلند کی بولتی تصویر ہے اور اہل ادب کی زبانوں پر ہے۔ اس کا جو ترجمہ شاہزادہ صاحب نے کیا ہے داد کے قابل ہے۔

ڈرا طول شب غم سے نہ ہیں روز مصیبت سے
ترے سر کی قسم۔ مشکل کو مشکل میں نہیں سمجھا

میرے حیدرآباد میں آنے کے بعد لکھنؤ کے ایک فاضل ادیب سید محمد مہدی صاحب مٹیا برج میں وارد ہوئے یہ، نواب اختر محل کی جاگیر کے ناظم تھے جاگیر اودھ میں تھی اس سلسلہ سے ان کو اکثر مٹیا برج آنے کا اتفاق ہوتا تھا اور جناب قائمۃ الدین کے درس میں وہ اودھ میں ہم سبق بھی رہ چکے تھے غرض کہ میری غیبت

نتیجہ تھا کہ ساری نحو میر فارسی سے عربی میں ترجمہ ہو گئی میرے پاس بھیجی تھی کہ میں بھی اس پر ایک نظر ڈال دوں میں نے ایک تقریظ لکھ کر کتاب واپس کی۔ شاہزادہ صاحب نے یہ کتاب چھپوا کر جب مشتہر کی ہے تو اس پر میری تقریظ بھی عربی میں چھپی ہے

مرزا جہاں قدر بہادر کو مرثیہ کہنے کا بہت شوق تھا شاہی امام باڑہ میں نہایت اہتمام سے مجلسیں کرتے تھے اور خود منبر پر پڑھتے تھے۔ شاہزادہ علی اکبر نیزہ لے کر طارق سے آمادہ قتال ہوئے ہیں۔

بجلی کا چلن پھل کے چمکنے نے دکھایا　　گردوں پہ کمند اپنی لگا پھینکنے سایہ

یہاں سے نیزہ کی تعریف میں اتنے بند لکھے کہ رفعت الدولہ بادشاہ کے میر منشی پکار کر کہنے لگے کہ صاحب عالم میں نے اٹھارہ بند گنے کہ نیزہ کی تعریف میں آپ نے پڑھے تعالی اللہ جزاک اللہ۔

ان کے انتقال کے دس بارہ برس بعد کا ذکر ہے کہ پرنس مرزا مقیم نے مجھے لکھا کہ حضور مرحوم کا کچھ کلام میں نے فراہم کیا ہے آپ اپنی تصحیح سے اسے حیدر آباد میں ہی چھپوا دیجئے۔ چار مرثیے چند اسلام نوحے غزلیں سبعہ معلقہ کے دو قصیدوں کا اردو ترجمہ میں نے یہاں مطبع شمسی میں چھپوا کر پانسو نسخے کلکتہ روانہ کر دیئے۔

مرزا آسمان جاہ انجم

یہ شاہزادہ عہد سلطنت میں پیدا ہوئے تھے۔ بادشاہ کے ساتھ مٹیا برج میں آئے۔ یہیں ہوش سنبھالا۔ طبیعت میں انتہا کی موزونیت زبان و محاورہ گھٹی میں پڑا ہوا تھا۔ کلام اپنا مجھے دکھاتے تھے۔ میرے حیدر آباد آنے کے بعد **دفتر حسرت** اپنا دیوان چھپوایا اسی زمانہ میں انتقال کیا۔

بڑی بحروں میں اور چھوٹی بحروں میں ان کے اکثر اشعار برجستہ نکلتے ہیں۔

کھیل گئے کیوں جان پہ انجم تم نے ابھی کیا دنیا دیکھی
مرنے لگے خوبان جہاں پہ تیری میری دیکھا دیکھی
درد جگر کم تھا کہ نہیں بتا یہ تو بتا دم تھا کہ نہیں تھا۔
کہ تو مریض میں کچھ بھی دیکھا نبض جو تو نے مسیحا دیکھی

سب و شتم کی بوچھاڑ ہر طرف سے ہونے لگی ان کا بس چلتا تو لکھنؤ کے ان مسافروں کو کچا کھا جاتے۔ اپنی جان بچانے کے لئے یہ قافلہ انگلینڈ سے روانہ ہو کر پیرس میں آ بسا غدر کے زمانہ کو طول ہوا بادشاہ کے بھائی اور والدہ دونوں آدمی پیرس کی خاک میں مل گئے۔

خلاصہ یہ کہ مرزا جہاں قدر کو خود بادشاہ نے پرورش کیا اور یہ سب شہزادوں میں بڑے لائق اور ذی علم بھی تھے ویسرائے کے یہاں ان کو یا مرزا ولی عہد کو کب کو پرائیویٹ اڈی حاصل تھی یہ ٹالی گنج کے تمام میسوری شاہزادوں سے کلکتہ کے تمام حکام و شرفاء سے بے انتہا ربط رکھتے تھے۔ اس باب میں ان کو ایسا ملکہ حاصل تھا کہ لوگوں کو حیرت ہوتی تھی کبھی کبھی مشاعرہ بھی کرتے تھے۔ اپنا کلام مجھی کو دکھاتے تھے غزل بہت کم کہتے تھے۔ یہ مقطع ان کی ایک غزل کا مجھے یاد ہے۔

بہت دنوں بعد ہم کو نیرؔ پتہ ملا ہے۔ دل و جگر کا

وہ نکلا پتھر سے آگ بن کر یہ ٹپکا مہندی سے رنگ ہو کر

آغا حجو شرف کا یہ شعر ان کو بہت پسند تھا۔

چمن میں جا کے جو دل کی تلاش کی میں نے چھدا ہوا اسے اک نوک خار میں دیکھا

طبیعت کا رنگ اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے۔ شرف کے اس شعر کو اس قدر رٹا کہ ایک مدت کے بعد اسی کے پرتو سے یہ مقطع پیدا ہوا جو اصل سے بھی بڑھ گیا۔

انہوں نے مجھ سے سبعہ معلقہ پڑھی امرؤ القیس اور طرفہ کے قصیدوں کا اردو میں ترجمہ بھی کیا ایک شعر کا ترجمہ نمونہ کے طور پر سننے کے قابل ہے۔ طرفہ کا یہ شعر کہ وہ ایک نصیحت گو عورت سے خطاب کر کے کہتا ہے۔

عرب کے علوی ہمت و حوصلۂ بلند کی بولتی تصویر ہے اور اہل ادب کی زبانوں پر ہے۔ اس کا جو ترجمہ شاہزادہ صاحب نے کیا ہے داد کے قابل ہے۔

ڈرا طول شب غم سے نہ میں روز مصیبت سے

ترے سر کی قسم۔ مشکل کو مشکل میں نہیں سمجھا

میرے حیدرآباد میں آنے کے بعد لکھنؤ کے ایک فاضل ادیب سید محمد مہدی صاحب مٹیا برج میں وارد ہوئے یہ، نواب اختر محل کی جاگیر کے ناظم تھے جاگیر اودھ میں تھی اس سلسلہ سے ان کو اکثر مٹیا برج آنے کا اتفاق ہوتا تھا اور جناب قائمۃ الدین کے درس میں وہ اور میں ہم سبق بھی رہ چکے تھے غرض کہ میری غیبت میں جب وہ مٹیا برج وارد ہوئے تو مرزا جہاں قدر نے ان سے عربی لکھنے کی مشق کی۔ اسی مشق کا

نتیجہ تھا کہ ساری نحو میر فارسی سے عربی میں ترجمہ ہو گئی میرے پاس بھیجی تھی کہ میں بھی اس پر ایک نظر ڈالوں میں نے ایک تقریظ لکھ کر کتاب واپس کی۔ شاہزادہ صاحب نے یہ کتاب چھپوا کر جب مشتہر کی ہے تو اس پر میری تقریظ بھی عربی میں چھپی ہے

مرزا جہاں قدر بہادر کو مرثیہ کہنے کا بہت شوق تھا شاہی امام باڑہ میں نہایت اہتمام سے مجلسیں کرتے تھے اور خود منبر پر پڑھتے تھے، شاہزادہ علی اکبر نیزہ لے کر طارق سے آمادہ قتال ہوئے ہیں۔

بجلی کا چلن پھل کے چمکنے نے دکھایا   گردوں پہ کمند اپنی لگا پھینکنے سایہ

یہاں سے نیزہ کی تعریف میں اتنے بند لکھے کہ رفعت الدولہ بادشاہ کے میر منشی پکار کر کہنے لگے کہ صاحب عالم میں نے اٹھارہ بند گنے کہ نیزہ کی تعریف میں آپ نے پڑھے تعالی اللہ دجزاک اللہ۔

ان کے انتقال کے دس بارہ برس بعد کا ذکر ہے کہ پرنس مرزا مقیم نے مجھے لکھا کہ حضور مرحوم کا کچھ کلام میں نے فراہم کیا ہے آپ اپنی تصحیح سے اسے حیدر آباد میں ہی چھپوا دیجئے، چار مرثیے چند اسلام نوحے غزلیں سبعہ معلقہ کے دو قصیدوں کا اردو ترجمہ میں نے یہاں مطبع شمسی میں چھپوا کر پان سو نسخے کلکتہ روانہ کر دیئے۔

مرزا آسماں جاہ انجم

یہ شاہزادہ عہد سلطنت میں پیدا ہوئے تھے، بادشاہ کے ساتھ مٹیا برج میں آئے، یہیں ہوش سنبھالا۔ طبیعت میں انتہا کی موزونیت زبان و محاورہ گھٹی میں پڑا ہوا تھا۔ کلام اپنا مجھے دکھاتے تھے۔ میرے حیدر آباد آنے کے بعد **دفتر حسرت** اپنا دیوان چھپوایا اسی زمانہ میں انتقال کیا۔

بڑی بحروں میں اور چھوٹی بحروں میں ان کے اکثر اشعار برجستہ نکلتے ہیں۔

کھیل گئے کیوں جان پہ انجم تم نے ابھی کیا دنیا دیکھی

مرنے لگے خوبان جہاں پہ تیری میری دیکھا دیکھی

درد جگر کم تھا کہ نہیں تھا یہ تو بتا دم تھا کہ نہیں تھا۔

کہ تو مریض میں کچھ بھی دیکھا نبض جو تو نے مسیحا دیکھی

ایک ذرا سے حشر پہ واعظ۔ اس کو ڈراتا اللہ اللہ

جس نے بتوں کی گلی میں برسوں روز قیامت برپا دیکھی
واہ ری قسمت اب تک اس کو مرنا مرا باور ہی نہیں۔

ساری جہاں نے کشتۂ حسرت نام ہمارا رکھا ہے
دیکھ نہ جانا اس طرف انجمؔ دشت بلا ہے کوچۂ یار
کہنا مان ہمارا ورنہ مفت میں مارا رکھا ہے

زبان اردو کا یہ محاورہ (مفت میں مارا رکھا ہے) ان کے سوا شاید کسی نے نظم نہ کیا ہوگا ایسے محاوروں سے زبان اردو کی شان بڑھتی ہے۔

یا میری کوئی خطا بتا دے ۔ یا رسم وفا و وفا اٹھا دے۔
اے اشک تو فرش کو ڈبو دے ۔ اے آہ تو عرش کو ہلا دے۔
مانے کہ نہ مانے یار انجمؔ
اپنی سی تو کر کے تو دکھا دے

نہیں اچھا دکھانا دل کسی کا ۔ کہا بھی مان او قاتل کسی کا
سرک جاتے ہیں اک جھلکی دکھا کر ۔ کہ رہ جائے پھڑک کر دل کسی کا
لگا کر تیغ اب کیا سوچتا ہے ۔ لگا دے نام اے قاتل کسی کا

حامد علی مرزا کوکب ولی عہد اودھ

مظفر علی ہنر کے شاگرد تھے دو دیوان ان کے ۱۲۹۰ھ کے پیشتر چھپ چکے تھے اور ہم سب لوگوں کو تقسیم ہوئے تھے، اب شاید ایک شعر بھی کسی کے پاس نہ ہوگا مرزا ولی عہد افیون بہت پیتے تھے، ایک بوڑھا خواجہ سرا جس نے شاید بچپن میں ان کو پرورش کیا تھا، اس کے حوالے یہ خدمت تھی، ابھی آپ سے باتیں کر رہے ہیں، نشہ ختم ہوا، اٹھے اور سیدھے خواجہ سرا کے حجرہ میں پہنچے، سب سے چھپ کر چکے سے یہ گھلی ہوئی افیم کا قدح چڑھایا، اور پھر آ کر بیٹھ گئے، ایک دن میں اتنی افیم پی جاتے تھے کہ میں سمجھتا ہوں اگر سو آدمیوں کو دی جائے تو مر جائیں جب تک ہر وقت نشہ کڑھا نہ رہے چین نہ آتا تھا ہیضہ کی فصل تھی۔ کہ انہوں نے انتقال کیا، دس گیارہ بجے رات کو مٹیا برج کی گلیوں میں رہا سے مرزا ولی عہد کی آواز سنائی

دی مشہور تو یہی ہے کہ ہیضہ میں مر گئے۔ مگر آغا حجو شرف نے ان کے مرنے کی جو تاریخ کہی ہے اس میں یہ داستان نظم کی ہے کہ دشمنوں نے زہر پلا دیا چند دقیقہ گزرے تھے کہ روح مفارقت کر گئی۔ کلام میں تصنع اور بناوٹ نام کو نہیں۔ سیدھا سیدھا کہتے ہیں۔ اور اکثر غربت و بے وطنی کا رونا روتے ہیں۔

مجھے ان کا کوئی شعر یاد نہیں ان کی دو غزلوں پر شرف نے مصرعے لگائے ہیں ہیں انھیں کے دیوان میں سے کوکب کے کلام کا نمونہ پیش کرتا ہوں۔

کس طرح آہ بھلا خاک فراہم ہوگی   کس طرح اڑ کے غبار اپنا گیا کیا جانے
صورت سبزۂ بیگانہ ہوا ہوں پامال   نخل امید مرا نشو و نما کیا جانے
کوئی تو ایسی خطا اس سے ہوئی ہے ورنہ   سر جھکانا یہ گنہگار ترا کیا جانے

چھٹا ہے جس دن سے میرا مسکن
ملول ہیں دوست خوش ہیں دشمن۔
ملا نہ بعد فنا بھی مدفن   گواہ غربت مری قضا ہے
رکھوں جہاں میں امید کس سے   ہزاروں ہیں میرے دل کو شکوے
خبر بھی اب تک نہ لی کسی نے   چراغِ تربت بجھا پڑا ہے۔
نشاں بھی اب نہیں چمن کا !   نہ ذکر باقی ہے انجمن کا !
ہم ایسے آوارۂ وطن کا   نہ کچھ نشاں ہے نہ کچھ پتا ہے۔

باب (۱۳)

واجد علی شاہ اختر کی شاعری

واجد علی شاہ اختر متنوع خصوصیات کے حامل تھے، وہ ایک بلند پایہ شاعر بھی تھے جملہ اصناف سخن پر طبع آزمائی کرتے تھے، غزل بھی، مثنوی بھی، مخمس بھی، مسدس بھی، رباعی بھی، سلام اور مرثیہ بھی اور ہر رنگ میں ان کی انفرادیت قائم ہے۔ زبان پر انہیں غیر معمولی دسترس حاصل تھی۔ خیالات پرا باندھے ہر وقت حاضر رہتے تھے ان کے منہ سے نکلا ہوا ہر بول سند تھا۔ بدیہہ گوئی اُن کی خصوصیت تھی، ان کی شاعری میں وہ رفعت اور سوز و گداز نہیں ہے۔ جو زمانہ کے ستائے، دکھوں کے مارے، پریشان حال اور آشفتہ روزگار، ناکام و نامراد شاعروں کی خصوصیت ہے۔ ان کی زندگی یکسر عیش و نشاط تھی۔ ان کی شاعری بھی زندگی کے اسی رخ کی ترجمان ہے۔ لیکن زبان کی صفائی اور صحت، بندش کی چستی، خیالات کی روانی، ترکیب کی تراش خراش میں، وہ خود اپنی مثال تھے۔ اس نقطہ نظر سے بجا طور پر ان کے کلام کو "ملک الکلام" کہا جا سکتا ہے۔

اب ہم واجد علی شاہ کی غزل گوئی اور غزل سرائی پر مختصر سی گفتگو کریں گے۔

مولانا عبدالرزاق مصنف البرامکہ اپنے مشاہدۂ میٹیا برج کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"میرے ایک خاص عزیز تھے۔ جن کا میں مہمان تھا۔ اور میٹیا برج کے اندر چھوٹے پیمانے پر گویا تمام لکھنؤ آباد تھا۔ کون سا محکمہ اور صیغہ تھا جو میٹیا برج کے اندر نہ تھا۔ جملہ آبادی ۴۰ ہزار تھی اور ایک لاکھ ماہوار پنشن میں ایک ٹکہ باقی نہ رہتا تھا۔ تفریحی سامان کے علاوہ علماء، شعراء اور مستند اور متعدد ادیب بھی موجود تھے۔ مولانا نظم طباطبائی مرحوم (پروفیسر نظام کالج) بھی شاہ کے تربیت کردہ تھے۔ واجد علی شاہ خود بھی شاعر تھے لیکن بقول ہارون الرشید بادشاہوں کے لئے شاعری سرمایہ فخر نہیں ہے"۔ بادشاہ درجہ دوم کے شاعر تھے لیکن ان کے اشعار محاورات کی سند میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔ کیونکہ زبان سند تھی۔ ہر دوکاندار لکھنؤ کا تھا لہٰذا جس بازار میں گذر ہوتا تھا یہی معلوم ہوتا تھا کہ ہم لکھنؤ کے کسی بازار کی سیر کر رہے ہیں اعلیٰ عہدہ دار

اکثر سنی تھے اور بادشاہ کی بے تعصبی کی دلیل تھی۔

۱۸۸۱ء میں شاہ کا انتقال ہو گیا اور چند ہی سال کے بعد مٹیا برج فسانہ بن کر رہ گیا ؎

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

جس کی حالات ویرانی لکھنے سے قلم کا جگر شق ہوتا ہے۔ اب بھی سیاحوں کے لیے مٹیا برج عبرت کدہ ہے[1]
خواجہ عبدالرؤف عشرت عہد واجدی کے مشاعروں کی تصویر یوں کھینچتے ہیں[2]

محل شاہی میں مشاعرہ نہایت شان و شوکت اور دھوم دھام سے ہوتے تھے۔ لال بارہ دری میں سہ پہر کو چمن بندی گل و فوارہ کی ہوتی تھی۔ کمرے میں تمام سامان عیش تیار ہوتا تھا اور بچھایاں سبز، سرخ کاشانی مخمل کی مسند میں گز گز بھر کی جھالر تقرئی طلائی ٹنکی ہوئی چاروں طرف گلدستے قرینے سے رکھے ہوئے اچھار حجاب، کنول فانوس شام سے روشن ہو گئے، پردوں میں نبت، گوکھرو، بچکا ٹنکا ہوا۔ چاروں طرف قدم قدم آدم آئینہ بندی۔ مشاعرے عام نہ ہوتے تھے۔ مشاعرے میں ہمیشہ اہل دربار شریک ہوتے تھے اور کبھی خاص اعزائے بادشاہ مدعو ہوتے تھے۔

شام سے مرزا خورم بخت بہادر نواب یحییٰ علی خاں، مرزا عظیم الشان نواب محمد تقی علی بہادر، مرزا رفیع الشان بہادر نواب مجید الدولہ عظمت الدولہ مرزا سلیمان قدر بہادر، دارسطوت، مرزا احمد نیشاپوری تشریف فرما ہوئے، اپنے اپنے مراتب کے موافق دہنے بائیں بیچ میں پہنچے، مسند پر بادشاہ جلوہ افروز ہیں۔ خواجہ سرا گنگا جمنی کشتیاں جن میں بھاری بھاری لچکے گوٹے کے الائچیاں چکنی ڈلیاں عطر کے کنٹر رکھے ہوئے، مخملی کشتی پوش پڑے ہوئے سب کے سامنے ایک ایک کشتی لگا گئے۔ ملازمین اٹھا لے گئے۔

اس کے بعد مشاعرہ شروع ہوا۔ ہر ایک نے غزل پڑھی اور یہ پر لطف صحبت بارہ بجے شب تک ختم ہو گئی۔ اہل دربار کا مشاعرہ ہر مہینہ میں ہوا کرتا تھا اور یہ صحبت بہت ہی پاکیزہ اور پر لطف ہوتی تھی۔ گرمی کے دنوں میں شام سے لال بارہ دری کی چھت پر چھڑکاؤ ہو رہا ہے۔ قناتیں لگائی جاتی ہیں، پھولوں کے گلدستے منڈیروں پر رکھے جاتے ہیں، مکلّف فرش بچھایا جاتا ہے۔ قناتوں میں بیلے کے ہار پھیلے ہیں، اہل دربار اپنے قرینے سے مؤدب بیٹھے ہوتے ہیں۔ یہ کون ہیں؟ علاء الدولہ علی نقی خاں بہادر وزیر۔ یہ کون ہیں؟ فتح الدولہ بخش الملک مرزا محمد رضا خاں برق۔ یہ کون ہیں؟ آفتاب الدولہ قلق۔ یہ کون ہیں؟ تدبیر الدولہ دبیر الملک منشی مظفر علی خاں بہادر جنگ اسیر۔ یہ کون ہیں؟ مقبول الدولہ احسان الملک کپتان

---

[1] یادِ ایام (عبدالرزاق)، صفحہ ۲۲۹
[2] تذکرہ آب بقا

مرزا مہدی علی خاں ثابت جنگ کنول۔ اسی طرح تمام درباری تشریف لائے۔ اور اپنی اپنی جگہ پر فروکش ہوئے۔ اتنے میں حضور جان عالم برآمد ہوئے۔ تمام اراکین سرو قد کھڑے ہوئے اور بسم اللہ کی صدا چاروں طرف سے آنے لگی۔ حضور مسند زر نگار پر باجاہ و جلال جلوہ افروز ہوئے۔ مشاعرہ دہنی طرف سے شروع ہوا اور مختصر غزلیں پڑھی گئیں۔ علی قدر مراتب ہر ایک کی تعریف ہوئی۔ سب کے بعد حضور نے اپنا کلام پڑھا اور مشاعرہ برخاست ہوا۔ اسی سال اور اکثر شہر کے بہت سے مشاعرے ہوتے تھے مگر حضور کبھی کسی مشاعرے میں تشریف نہیں لے گئے۔ فتح الدولہ برق اور منشی امیر نے بادشاہوں کی اکثر غزلوں پر مصرعے لگائے ہیں جو مشہور عام ہیں"[1]

واجد علی شاہ اختر کی شاعری اور اس کے مختلف پہلوؤں پر خواجہ عبد الرؤف عشرت نے بڑی خوبی سے تنقید کی ہے:-

"حضرت قدر قدرت ابو منصور سکندر جاہ ناصر الدین قیصر زمان سلطان عالم محمد واجد علی شاہ جان عالم علاوہ اور تمام فنون کے گلشن شاعری کی بھی گلگشت کیا کرتے تھے انہوں نے اس میں بہت کچھ گلکاری کی ہے نظم کے ہر صیغے میں داد سخن دی ہے۔

تمام ہندوستان کے مشہور شاعروں سے صحبت گرم رہتی تھی۔ خاص مصاحبین اچھے اچھے نامی شاعر تھے۔ خواجہ آفتاب الدولہ ارشد علی خاں قلق عرف خواجہ اسد قلق۔ فتح الدولہ بخشی الملک میرزا محمد رضا برق۔ تدبیر الدولہ مدبر الملک مظفر علی خان بہادر اسیر گلشن الدولہ بہار۔

اس کے علاوہ صحبت مشاعرہ میں منتخب شعرا شریک ہوتے تھے۔ وہ زمانہ اردو شاعری کے شباب کا تھا۔ زبان کے قواعد۔ محاورات کی پابندی۔ متروکات کا لحاظ ثقیل اور غلط الفاظ کی بندش سے پرہیز کا دور دورہ تھا۔ پھر ہم عصر شعرا میں شیخ امام بخش ناسخ۔ خواجہ حیدر علی آتش۔ خواجہ وزیر۔ شیخ مستیا علیش۔ کپتان مقبول الدولہ قبول۔ آغا حجو شرف۔ اللہ یار خاں سحاب۔ میر جان خان یکتا۔ میر مہدی سپر۔ میر امداد علی بحر۔ اصغر علی خان نسیم۔ میر علی اوسط رشک۔ امیر علی خان ہلال۔ نواب حسین علی خاں اثر۔ مہدی حسن خان آباد۔ میر وزیر صبا۔ میر دوست علی خلیل۔ میر کلو عرش۔ شیخ محمد جان شاد۔ شیخ امان علی خان سحر۔ ایسے ایسے باکمال استاد فن موجود تھے۔ شاعر تو شاعر امرا میں بھی اس فن کی طرف کمال رغبت پائی جاتی تھی۔ اس لحاظ سے کہہ سکتے ہیں کہ کوئی امیر اس فن کے اکتساب سے خالی نہ تھا۔ اور تمام شہزادگان والا تبار اسی رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ مرزا ہزبر علی خان

---

[1] تذکرۂ آب بقا (خواجہ عشرت)

ہز بر۔ کیعوان ہمایوں جاہ قیصر حشم ولی عہد مرزا حامد علی خاں بہادر کوکب۔ نواب سید محمد خاں رند۔ راجہ جواہر سنگھ جوہر۔ نواب طالب علی خاں عیشی۔ مہاراجہ چے گوپال سنگھ ثاقب۔ نواب عاشور علی خاں عاشور۔ غرض لکھنؤ میں شاعری کا اچھا خاصا باغ لگا ہوا تھا جس میں طرح طرح کے گل بوٹے کھلے۔ اور عجیب عجیب بلبل چہکتے ہوئے نظر آتے تھے۔ بادشاہ کی قدردانی کے لحاظ سے خاص و عام میں یہ اسپرٹ بھری ہوئی تھی جس کو دیکھئے۔ شاعر۔ جس کو سنئے شاعر۔ جائے سلطنت ہونے کی وجہ سے لکھنؤ کی زبان مستند اور مقبول عام تھی اور دہلی کا لوٹا ہوا مجمع بھی اسی دربار میں فروغ حاصل کر رہا تھا۔

محلات میں تمام بیگمات کو اگرچہ فیاض ازل سے سخن فہمی اور سخن گوئی کا حصہ ملا تھا۔ لیکن بعض بعض بیگمیں زبان اور محاورہ کے لحاظ سے نظم کی لڑیوں میں موتی پرو رہی تھیں۔ ان میں ملکہ مخدرہ عظمیٰ نواب بادشاہ محل صاحبہ عرف نواب خاص محل صاحبہ عالم کا نمبر سب سے اول تھا۔ ان کی تصنیف سے ایک دیوان بیاض عشاق اور ایک مثنوی بہت پیاری زبان میں مطبوعہ موجود ہے

اس کے علاوہ حضور عالیہ ملکہ اودھ اختر محل نواب رونق آرا بیگم بنت نواب علی نقی خاں تاج النساء نواب معشوق محل صاحبہ، ملکہ جہزتون افسر النساء نواب نشاط محل صاحبہ نواب زیب محل صاحبہ وغیرہ وغیرہ اسی رنگ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

شاہ اختر کا شاعری میں معجز نمائی کرنا ایک لازمی فعل تھا۔ بادشاہ کا مذاق شاعری ایک نفیس اور اچھوتا پہلو لئے ہوئے تھا۔

تحصیل فن کے اعتبار سے عروض میں اردو کی کتاب جواہر العروض "شعاع" کی تصنیف کی ہوئی اور دوسری کتاب "ارشاد خاقانی" "شاہد بن علاوین" ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ کم سے کم علمی مذاق کے ہر شعبہ میں ایک نہ ایک تصنیف بادشاہ کی موجود ہے۔ پند و نصائح میں "نصائح اختری" اخلاق میں "مناظرہ بین النفس والعقل" مراثی میں "دفتر غم" "بحریات خاص" یا "مجموعہ واجدیہ" علم موسیقی میں "ناجو" "سولھن" اور "بنی" مثنویات میں "سرور خاقانی" "مخزن اختری" "دریائے تعشق" "بحر الفت"

نامہ جات و شقہ جات میں "ملک اختر" خطبات میں "مثنوی بحر مختلف" عروض میں "جواہر العروض" "ارشاد خاقانی" غزلیات میں چھ دیوان ضخیم اس کے علاوہ اور بہت سے مختلف فنون کی کتابیں ہیں۔ طرز کلام زیادہ تر میر و مرزا کے طرز شاعری سے ملتا جلتا تھا۔ شاعری میں بڑے بڑے سخن فہم شاعر پکار اٹھتے تھے "خداوند یہ شاعری نہیں سحر ہے اعجاز ہے"

فارسی ترکیبوں کے جملے ایک جدید شان سے جھلکتے تھے۔ اصناف سخن میں صرف قصیدے ایک ایسی چیز ایسی جن کے لکھنے کی بادشاہ کو احتیاج نہ تھی، آخرِ وہ بھی ائمہ معصومین علیہم السلام کی شان میں لکھے۔

مرثیوں میں اگرچہ نازک خیالی اور شاعرانہ تخیلات نہیں، لیکن احادیث کا ہو بہو ترجمہ اور ساری عبارت کچھ عجیب مزا دیتی ہے۔

زمانہ ولی عہدی سے غزل گوئی کا شوق ہوا عروض و قافیے کے رسالے ساز ہو کئے مشکل سے مشکل بحروں میں بغیر کسی کی اصلاح کے موتی پروئے اور مشاعرے میں غزل پڑھی، بہت سے سخن فہم شاگرد ہوگئے، مہتاب الدولہ درخشاں، تعیش الدولہ عیش، منشی مظفر علی ہنر، مرزا محمد عباس شاد، لائق الدولہ شاہد اور بشیر وغیرہ وغیرہ کو برسوں اصلاح دی، غزل میں جو لفظ بنایا پتھر کی لکیر ہو گیا تھا۔ جب زمام سلطنت ہاتھ میں لی شعر و سخن کا چرچا بہت کم ہو گیا تھا، مگر باوجود اس کے وہ منشی تصنیفات کی تحریر پر ملازم تھے، عہد سلطنت کا ذکر ہے منشی امیر اللہ تسلیم نے جو علاوہ شاعر ہونے کے خوش نویس بے بدل تھے، ایک عریضہ حضرت ابو المنصور کی خدمت میں نظم میں نہایت خوش خط پیش کیا۔ اتفاق وقت سے حضور کی نظر اس عرضداشت پر پڑ گئی، دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور بعد ملاحظہ شرح دستخط نظم لکھوائی وہ اشعار یہ ہیں:۔

بشنو اے خوشنویس اے خوشگو
ہر دو فن مے کنی و ہر دو نکو
اسم تو مندرج بہ دفتر شد
بست دو روپیہ مقرر شد

اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح حضور اردو نظم میں قادر الکلام تھے۔ اسی طرح فارسی میں بھی برجستہ فی البدیہہ کہتے تھے۔

بادشاہوں کا کلام اس سبب سے لوگ کم دیکھتے ہیں کہ ان کی شاعری تعریف کی بوچھاڑ سے کمال کی حد تک نہیں پہنچنے پاتی اور مصاحبین کی بے جا خوشامد سے پختہ کلامی اور کہنہ مشقی نہیں آنے پاتی۔ مگر شاہ اختر کا کلام اس عیب سے بری تھا، وہ اپنے کلام کو ہمیشہ نکتہ چینی کی نگاہ سے دیکھتے تھے، ان کو ہر شک ہمیشہ دامنگیر رہتا تھا کہ ایسا نہ ہو کہ کوئی نقص شاعری کلام میں رہ جائے اور چونکہ خود سخن فہم تھے اسی سبب سے ایسے ویسے شاعر کی غزل ان کے مشاعرے میں مشکل سے مدح کی مستحق ہوتی تھی دوسرے اہل کمال کا کثیر مجمع آپس کی چشمک سے ہر ایک محک امتحان بنا ہوا تھا۔ کوئی لفظ بے محل صرف کیا اور شاعر نظر سے گر گیا۔ ایسا ویسا شاعر تو سامنے منہ نہیں کھول سکتا تھا۔ آتش و ناسخ کی چوٹیں، برق اور رشک کی نوک جھونک، اکتساب فن کے واسطے کیا کم تھیں؟

ایک مرتبہ ایک شاعر نے ایک شعر مثالیہ پڑھا۔

اہل جو ہر نہیں جھکتے ہیں کسی کے آگے
ٹوٹتی ہے وہی تلوار جو فولادی ہے

حضرت نے بہت پسند فرمایا اور تمام مشاعرے نے داد دی دوسرے مشاعرے میں ان کے حریف نے اسی کے جواب میں ایک شعر کہا جو عام پسند ہوا۔

نیک و بد سب سے جھک کے ملتے ہیں
دونوں ناکوں پہ تیغ کٹتے ہے

اسی طرح ہر مشاعرے میں نوک جھونک اشارتاً و کنایتاً چوٹیں فی البدیہ اشعار ہوا کرتے تھے اور داد سخن ملتی تھی لیکن جان عالم نے تو باوجود مشاغل امور سلطنت کے جو کچھ فرمایا آویزۂ گوش خلائق ہوا ہر غزل مقبول خاص و عام تھی۔

خشک سے خشک اور سنگلاخ زمین آپ کے دریائے فکر کے آگے پانی تھی ہر پہلو پر جزئیات بلاغت کا خیال رہتا تھا، پھر تشبیہات و استعارات کی طبع کاری نورٌ علیٰ نور۔

ان سب باتوں سے قطع نظر کر کے تمام کلام پر اجمالی نظر ڈالی جائے تو معنوی خوبیاں اور عمدہ تخیل کے سمندر موجزن نظر آئیں گے۔

جزئیات پر خیال کیجئے تو قلیل الاستعمال قافیے اس شائستہ پہلو سے نظم کئے ہیں جن سے بہتر کہنا غیر ممکن ہے۔

بندے کو اس کے عشق ہے ذات و صفات کا
مبدع حقیقتاً ہے وہ کل کائنات کا!

حمد میں صفات و کائنات کے قلیل الاستعمال قافیے کس عمدہ تخیل کے ساتھ ادا کیے ہیں۔

ناقوس برہمن نے صدائے اذان سنی
مسجد سے میں نے قصد کیا سومنات کا

توحید پرستی کا ثبوت اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتا تھا۔

جا سے بیجا ہو گئے کس کا رہا مسکن بچا
عشق کی منزل سے کب ہیں دوست اور دشمن بچا
رشک پائے یار سے پامال ہیں اہل فرنگ

ٹھوکروں سے اس بت خود کام کی ارگن بجا
رہرو ملک عدم کا حال کچھ کھلتا نہیں
اسے جرس اس قافلے پر ہے ترا شیون بجا

مذکورہ بالا اشعار میں خوبی معانی اور شوکت کے علاوہ ایک خاص بات ہے کہ اس کی ہر ردیف کے جدا جدا معانی پیدا ہوتے ہیں۔ مطلع میں "بجا" کے معنی ٹھکانے کے لیے گئے ہیں یعنی "بر جائے خود" دوسرے شعر میں "بجا" نواختن کے معنی پر نظم ہوا ہے۔ تیسرے شعر میں "بجا" درست اور صحیح کے معنی دیتا ہے۔

ابرو کا کوئی مجھ پر اب وار نہ ٹھہرے گا
وہ ترک بھی عاری ہے زنہار نہ ٹھہرے گا
کانٹا ترے تلوؤں کا آنکھوں سے نکالیں گے
کھٹکا ہے نگاہوں میں یہ خار نہ ٹھہرے گا

بعض بعض مقام پر رعایت لفظی کو آپ نے صرف کیا ہے۔ لیکن اس میں رعایت معنوی کا خوب صورت پہلو مستتر ہے۔

ساون کی طرح ہجر میں مینہ آنکھ سے برسا
بجلی کا بڑھا وصل میں کچھ نور نظر کا
کس کی نظر صاف کی تاثیر ہوئی ہے
اختر کو نہ دیکھا تھا کبھی ہم نے قمر سا

———— ✣ ————

ابلق شب کو اگر یار نے موڑا ہوتا
توسن عمر رواں پر مرا کوڑا ہوتا

خاص لکھنؤ کی زبان اور محاورات جو بادشاہ کے کلام میں پائے جاتے ہیں وہ بہت معتبر اور مستند ہیں جس موقع پر جو جملہ استعمال کیا جاتا ہے اسی پہلو سے نظم کیا ہے۔ مثلاً

ترانہ گل کا جو پیک صبا نے سکھلایا
چمن میں نغمۂ بلبل کو میں اڑا لایا
زندگی تخت پہ کٹی مر کے گئے قبر میں شاہ

فکر آغاز میں ہوتا ہے یہ انجام نصیب

روتا ہوں مرا اشک ہے قلزم کے برابر
خاموش ہوں لیکن ہے تکلم کے برابر

(نوشتۂ تقدیر)

یہ عشق ترے حسن سے قسمت میں لکھا ہے
افسوس نہیں چاہیئے ہم کو شدنی پر
نکالوں کس طرح دل سے تری مژگان کے تیروں کو
مٹا سکتا نہیں انسان ہاتھوں کی لکیروں کو

(غم پیری)

دل بھی کملاتے ہیں جوں جوں بال ہوتے ہیں سفید
بلبلیں بھی سرد ہوں موسم ہے پت جھڑ کا اگر

(مذمت دنیا)

عیش دنیا بزم غم اندوز ہو!
رنج و غم توام مجھے ہر روز ہو

(عشق حقیقی)

کچھ نہیں اختر مجھے عشق مجازی سے حصول
اب تو معشوق حقیقی سے ہے اپنا اختلاط
جو معشوق حقیقی ہے مجھے اس کی غلامی ہے
وہ آتا ہے۔ کہ سرنامہ پہ جس کا نام نامی ہے

(خضوع و خشوع)

ہم نمازوں میں جو بے آس کھڑے رہتے ہیں
سامنے چشم کے وسواس کھڑے رہتے ہیں۔

(توحید)

چشم وحدت میں وہ معشوق جو لاثانی ہے
حلقۂ چشم بھی اک خانۂ سلطانی ہے

شاہد اصلی مجھے مقصود ہے
کعبۂ دل میں وہی معبود ہے
دونوں صفحے ہیں تری وحدت پہ دال
جب دوئی سے ان کو دیکھا فرد ہے
وہ جو معشوق حقیقی حسن میں موصوف ہے
عشق میں عاشق بھی اس کا شہر میں معروف ہے

(تجرد)

دفتر عالم میں بس وہ فرد ہے
جو مجرد اس چمن میں مرد ہے

(مختلف مضامین)

مے رنگین پہ لاکھوں کا سہ سر جو رہتے ہیں
رخ ساقی سے یہ مے نوش سب مخمور ہوتے ہیں
پردہ نشین سمائے دل ناشناس میں
آتی نہیں یہ بات ہمارے قیاس میں
اگر حباب ابدیت کی ہے، تو آنکھ ساحر ہے
مسلمانی نظاہر ہے مگر باطن میں کافر ہے
کھلے گی تختۂ کاغذ پہ سرخی خون شاعر کی
قلم تیغ مضامین سے یہ سر ہو جائے حاضر ہے

زیادہ تر افسوس کی بات یہ ہے کہ اکثر تصانیف کا قلمی ذخیرہ جس کو سلطان عالم خزینۂ زر و جواہر سے زیادہ عزیز دیکھتے تھے، زوال سلطنت کے ساتھ ساتھ سفر میں گم ہو گیا۔

مثنویوں میں "سرور خاقانی" ایک ایسی مثنوی ہے جس میں بادشاہ نے اپنی عاشقی کی سرگذشت لکھی ہے اور واقعات کے لحاظ سے بہت دلچسپ ہے، ممتوعہ بیگمات کے ابتدائی تعلقات اور متعہ کے قصۂ طلب واقعات کو بالتصریح نظم فرمایا ہے۔

انتخاب کلام

اختر کے کلام کا نمونہ ذیل میں درج کرتا ہوں:-

لگی ہو چوٹ جس کو عشق کی باتوں میں اچھلا ہے
زباں نے خاصہ پیدا کیا ہے مومیائی کا

پابند دل ہوا جو تمہارے خیال کا!
ہر دم ہے پیش چشم تصور جمال کا!

ہر عاشق دل سوختہ دیوانہ ہے اس کا
وہ شمع تجلّی ہے کہ پروانہ ہے اس کا

عارض صاف ترا رشک قمر دیکھ لیا
جان سی آگئی جب ایک نظر دیکھ لیا

جو شب کو کوٹھے پہ وہ چاند بے نقاب آیا
چھپا ہلال فلک اس قدر حجاب آیا

رخ اپنا ہم کو دکھلایا تو ہوتا
ذرا سورج کو شرمایا تو ہوتا

گالوں پہ جدا اس یار کے ہالا نہیں رہتا
شب کو کبھی مہتاب پہ ہالا نہیں رہتا

الفت نے تری ہم کو تو رکھا نہ کہیں کا
دریا کا نہ جنگل کا ہوا کا نہ زمیں کا

میری زباں سے پوچھو مزا محبت کا
یہ خوب جانتی ہے ذائقہ محبت کا

نصیب فتح ہو یا ہو مجھے شکست اختر
خدا بچائے ہوا سامنا محبت کا!

[illegible]

یاد غیروں کی ہوئی مجکو فراموش کیا
محبت کا بندہ بنا لیجیے گا
مرا دل بھی نام خدا لیجیے گا
ابھی امتحان محبت نہ کیجیے
کبھی تیغ سے آزما لیجیے گا
عجب کو بھی سہاپنے جی کا کہ پاؤں ٹکتا نہیں خوشی کا
پتا نہیں ان کی دل لگی کا یہ دل بھی معشوق ہے کسی کا

(دنیا کی ہوس)

ہوس بڑھتی ہے اتنی جس قدر یہ عمر گھٹتی ہے
ضعیفی کہہ رہی ہے کوئی کمسن ہو تو میں آدل
گئی بہار نہ کرا لفت زن و فرزند
خزاں چمن میں ہوئی موسم خضاب آیا
اندھیرا بزم میں تھا تو جو انجمن میں نہ تھا
چمن اداس تھا اسے گل جو تو چمن میں نہ تھا
غرور کا جو کیا احتمال اختر پر
کلام کبر زباں پہ نہ تھا دہن میں نہ تھا
اختر اس بے مہر سے ناحق وفا کا دھیان ہے
تو نے یہ کیسا خیال خام اے نادان کیا

مجھی کو واعظا پند و نصیحت

ذرا اس کو بھی سمجھایا تو ہوتا
کچھ لطف خوشی ہے، نہ مجھے خوف الم کا
حسرت ہے نہ راحت کی نہ دھڑکا ہے ستم کا
حیراں ہوں میں ان دونوں میں ترجیح کسے دوں
ہستی کی تمنا ہے نہ کچھ خوف عدم کا

حیف ہے شہر خموشاں کا نہ کچھ حال کھلا
نہ وہ صورت نہ وہ سیرت نہ وہ احوال کھلا

آخری کلام

اودھ کے ایک اور داستان گو واجد علی شاہ کی شاعری کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"واجد علی شاہ کا کلام ہر صنف میں موجود ہے۔ غزل، سلام، مرثیہ، مثنوی، قصیدہ وغیرہ کے علاوہ نثر کی کتابیں بھی ہیں۔ علاوہ ازیں ٹھمری بھی کہتے تھے اور خوب کہتے تھے۔ شاید ہی کوئی بادشاہ اتنی تصنیفات چھوڑ گیا ہو۔ پورا کلام اب ملتا کہاں ہے۔ جس قدر اب بھی واجد علی شاہ کی تصنیف زمانہ کے ہاتھوں سے محفوظ رہ گئی ہیں۔ وہ بھی بہت ہیں بادشاہ نے ہندی الفاظ و محاورات کے مستند طور پر طریق استعمال ہیں اور زبان اُردو کی وسعت کو ترقی دینے میں بڑا حصہ لیا۔ بادشاہ کا کلام صفائی، اثر اور درد کا مجموعہ ہوتا تھا۔ جب بادشاہ کلکتہ جا رہے تھے تو سفر کے درمیان میں انہیں تکلیفیں پہنچیں۔ اس سفر میں انہوں نے یہ بے مثل شعر کہا تھا ؎

زمانہ تھا ایسا کرتے تھے گوہر پاؤں کے نیچے
پر اب ہے دھوپ سر پر اور کنکر پاؤں کے نیچے
یہی تشویش شب و روز ہے بنگالہ میں
لکھنؤ پھر بھی دکھائے گا مقدر میرا
آہ کرتا ہوں تو سب لوگ خفا ہوتے ہیں
اے نسیم سحری ہم تو ہوا ہوتے ہیں
یوں تو شاہان جہاں پر ہے پڑا وقت مگر
ختم ہے اختر بے کس پہ جفائے غربت
قید ہونے سے کہیں بوئے ریاست جائے گی
لاکھ گردش آسمان کو ہو زمیں ہوتا نہیں[1]

---

[1] لکھنؤ کا دبستان شاعری، صفحہ ۔۔۔

کوچہ میں کب ہے سایۂ دیوار بار یاب
رخ انور سے نظر آئی سحر آخر شب (۱۷)
چھپ گیا عارض روشن سے قمر آخر شب
چودھویں رات میں ہوتی ہے سحر آخر شب (۱۸)
ماہرو آج ارادہ ہے کدھر آخر شب
شمع عریاں کی طرح دل نہ جلاؤ صاحب (۱۹)
اپنے جامہ سے نہ باہر ہوئے جاؤ صاحب
طور کیا یار کا سیکھا جو گئے پھر نہ پھرے (۲۰)
جسم کو عمر رواں ہے یہ تیری چال عذاب
پلکوں سے پھوٹ جائے گی بوتل شراب کی (۲۱)
گردش بھی چشم مست کی دکھلائیے جناب
رہے نہ حشر میں مٹی خراب اختر کی (۲۲)
پلائیں ہاتھ سے بھر بھر کے بوتراب شراب
چمن سے پھینک دیا میرا آشیاں کیا خوب (۲۳)
نہال مجھ کو کیا آکے باغباں کیا خوب
ہمارا یار تو ہے لامکاں مکاں کیا خوب (۲۴)
خدا کے نام سے افزوں ہے یہ نشاں کیا خوب
شباب میں کسے معلوم یہ ضعیفی تھی (۲۵)
عجب بہار میں آئی ہے یہ خزاں کیا خوب
یہ اشتیاق تھا قاتل کا ہم کو قتل کے وقت (۲۶)
کہ چشم زخم کھلی ہے کہاں کہاں کیا خوب
پسند آگیا اس بادہ خوار کا اسلوب (۲۷)
وہ اس کی نشہ کی آنکھیں خمار کا اسلوب
کہاں بڑ مارتا پھرتا ہے اختر (۲۸)
صدائے شعر ہے آواز مجذوب

(۲۹) زلفیں بنائیں رخ پہ بکڑ کر تمام رات
لتا ہے چاند آج بچھڑ کر تمام رات
(۳۰) رند یاد کوچۂ جاناں میں جنت کو گئے
زاہدوں کو لے گیا دوزخ میں سودائے بہشت
(۳۱) میرا مالک رکھے دوزخ میں تو جنت ہے وہی
مجھ کو اختر اب نہیں زنہار پروائے بہشت
(۳۲) وصل کی صبح سے ملی شب ہجر
ہجر کی نذر ہیں یہ گذری رات
(۳۳) سحر وصل ہو گئی کافور
شمع کرتی ہے آہ و زاری رات
(۳۴) شب گیسو کا یہ پہلا ہے اثر آج کی رات
نظر آتا نہیں جو نور سحر آج کی رات
(۳۵) اے ترک ابروؤں سے رخ مہر و ماہ کاٹ
پہنے اڑا گلوں کے سر کجکلاہ کاٹ
(۳۶) دم میں پاتے ہیں شفا دیکھ کے برسوں کے مریض
عاشقوں کے لئے اے جان مسیحا ہے یہ رخ
(۳۷) مثل کندن کے چمکتا ہے ترا چہرۂ صاف
ہم فقیروں کے لئے دولت دنیا ہے یہ رخ
(۳۸) دنداں و چشم و لب کا اثر اس قدر ہوا
دل سے اٹھے شرار سفید و سیاہ و سرخ
(۳۹) اڑ جائے ابھی طائر جاں ہو جو قفس بند
صیاد سے تن میں نہ ہوا ایک نفس بند
(۴۰) سوتا ہوں مرا اشک ہے قلزم کے برابر
خاموش ہوں لیکن ہے تکلم کے برابر
(۴۱) بلبل بھی اڑی قافلہ گلچیں کا ہے خاموش

ہو گا نہ جرس میرے تکلم کے برابر

(۴۲) سب اہل جہاں آنکھ میں ہیں پھر بھی ہے خالی
تشبیہ کہاں ہے اسے قلزم کے برابر

(۴۳) کرتا ہے کیوں تو اپنے نمک خوار سے بگاڑ
میں نے تو کچھ کیا نہیں سرکار سے بگاڑ

(۴۴) اچھا بھرے سے لڑ کے نہیں ہوتا فتح یاب
گل کی شکست ہو جو کرے خار سے بگاڑ

(۴۵) اب کوئی لینے والا بھی اس جنس دل کا ہے
مدت سے ہو گیا ہے خریدار سے بگاڑ

(۴۶) پوشیدہ ہے نگاہ سے جیسے مرا مسیح
صحت سے اور ہے دل بیمار سے بگاڑ

(۴۷) قاصد و ساتھ مرا چھوڑ دو اس منزل میں
راہ الفت میں چلے گا دل ناکام فقط

(۴۸) آہوں کی بھی آواز ہے نو طرز مرصّع
نالہ کا بھی اک ساز ہے نو طرز مرصّع

(۴۹) اندھوں کو نہ خلخال کی آواز ستاؤ
ہے نار کا انداز بھی نو طرز مرصّع

(۵۰) چشم تر میری اشک باری تک
برق ہے میری بے قراری تک

(۵۱) فتنے جو چمکا کرتے ہیں خورشید کی طرح
صدہا ہوئے ہیں صاحب حسن وجمال خاک

(۵۲) آئینہ سان چلے ہیں مکدر جہان سے
چمکائے گی غریبوں کا حسن وجمال خاک

(۵۳) پختہ ہوں خیال خام میں میں
ناصح نہ کرے گا مجھ سے بک بک

(۵۴) ہم نمازوں میں جو بیباک کھڑے رہتے ہیں
سامنے یہ بت سفاک کھڑے رہتے ہیں

(۵۵) بے قراری کو مری دیکھ کے اے شاہ سوار
باادب توسن چالاک کھڑے رہتے ہیں

(۵۶) شوق وصل زنداں میں ہجر سے بڑھا اتنا
ہر کڑی کو آہن کی چشم مار ٹھیراؤں

(۵۷) مے کدے میں عالم کے عین بے خودی دیکھو
لے اگر وہ خمیازہ میں خمار ٹھیراؤں

(۵۸) تیغ ابروے جاناں آنکھ میں لگی کاری
ہوں وہ دوست، دشمن کو اپنا یار ٹھیراؤں

(۵۹) اب اس گلی میں اپنا گذر ہے بھی اور نہیں
ریگ رواں کی طرح سفر ہے بھی اور نہیں

(۶۰) شاعر ترے دہن کے معما میں رہ گئے
یہ طرفہ وصف ہے کہ کمر ہے بھی اور نہیں

(۶۱) تری خوش چشمی بنا دیتی ہے پرکار شرہ
اس قلم پر ختم ہے جادو نگاری اندنوں

(۶۲) ہے دُر مضموں کا پایا عرش و کرسی سے بلند
کیوں نہ شاہان جہاں ٹانکیں لے کے ہیں

(۶۳) نرخ جنس حسن کا اے عشق دکاں میں نہ کر
ایک بازار شکستہ دل بھی ہے اس شہر میں

(۶۴) بلبلو باغ میں نالوں کا اثر ہو کہ نہ ہو
آتش گل سے فزدل درد جگر ہو کہ نہ ہو

(۶۵) ایسے نالہ میں خدا جانے اثر ہو کہ نہ ہو
زلف شبگوں میں ہم الجھے ہیں سحر ہو کہ نہ ہو

(۶۶) عیش دنیا بزم غم اندوز ہو

رنج و غم توام مجھے ہر روز ہو!
تاب نظارہ نہ ہو اے شمع رو (٦
شاہد اصلی جو بزم افروز ہو
جگر عاشق دل سوز جلاتے نہ چلو (٦
شمع کو محفل عشرت میں رلاتے نہ چلو
دفتر جہاں سے لو ہم تو ہیں اٹھے جاتے (٦
آؤ اب دکھا جاؤ کھلکھل گر دکھانی ہو
بازی جو کبھی حسن کے دم باز نے کھیلی (٧
باقی نہ رہا نقد تو ہارے مرے دل کو
ڈھپ نہیں سکتا بدن آرزو (٧
تنگ ہوا پیرہن آرزو
معاً قصر دل ہو جائے اس کی آمد آمد ہے (٧
شہ کون و مکاں سمجھا ہوں جس کو وہ محمد ہے
رسالت کا بھی ہے اقرار برحق ہے نبوت ہے (٧
محمد کا کرے انکار جو دنیا میں مرتد ہے
تری کرسی کا کیوں پایہ نہ برتر ہو دو عالم سے (٧٤
جسے ہم عرش سمجھے ہیں محمد کی وہ مسند ہے
دم ساز باغ دل میں جناب امیر ہے۔ (٧
پیرو اسی کا ہوں جو مرا ہم صفیر ہے۔
کب چشم مست ساغر صہبا سے چھٹ سکے (٧
کوثر کی موج موج میں یہ دل اسیر ہے
دار فانی میں عشق حق باقی (٧٧
اس کے ناموں کا ہے سبق باقی
دار فانی میں کسے اہل بقا سمجھیں ہم (٧٨
دل بھی قابو میں نہیں روح بھی پردیس میں ہے

سکۂ داغ جنوں وحشت میں مجنوں کو ملیں (۷۹)
کہہ دیا ہے اس شہ خوباں نے یہ تاکید سے

روشنیٔ رخ پہ ابرو کی سیاہی کھل گئی (۸۰)
ربط افزوں ہو گیا پھر ماہ اور خورشید سے

غیر کی آنکھ میں کھٹکتا ہے (۸۱)
آج تنکا جو اس کی ناک میں ہے

ذرّے خورشید سے چمکتے ہیں (۸۲)
مہ رخو سب کا حسن خاک میں ہے

عدم کا کارواں آگے سے پیچھے منہ نہیں کرتا (۸۳)
جرس کے ساتھ مل مل کر مرا دل بھی پکارا ہے

عروس حسن سے دھبا پڑا ہے تیرے سینہ پہ (۸۴)
اگر تو ماہ پارہ ہے تو یہ اختر بھی تارا ہے

ہستی کی قید سے بہت اب دل یہ تنگ ہے (۸۵)
فانی ہوں مجھ کو نام سے ہستی کے ننگ ہے

عجب نقشہ ہے اس دنیا میں انسانوں کا اے اختر (۸۶)
نہ پایا بے وفائی سے کوئی ہم نے بشر خالی

میرے دل میں ناوک کھٹکنے لگے تھے (۸۷)
جو پلکوں سے دیدے اٹکنے لگے تھے

پڑا جس گلستاں میں وہ پائے نازک (۸۸)
وہ گلشن سراسر مہکنے لگے تھے

شاہد اصلی مجھے مقصود ہے (۸۹)
کعبۂ دل میں وہی معبود ہے

کیا ہوا میں آپ میں آتا نہیں (۹۰)
میں اگر غائب ہوں وہ موجود ہے

کون باقی ہے کہ جس کے حکم سے (۹۱)

اخترو ماہ فلک نابود ہے
(۹۲) سوزِ دل جب گداز کرتا ہے
برق کو بے قرار کرتا ہے۔
(۹۳) تازگی گل کی خار میں کب ہے۔
سختیِ دل ہزار کرتا ہے
(۹۴) چشم بینا ہوا ہے ہر اک داغ۔
ہمہ تن انتظار کرتا ہے۔
(۹۵) بحر خوبی ہوا ہے عکس فگن سا
موج کو بے قرار کرتا ہے
(۹۶) ذرۂ خاک سے بھی کمتر ہوں
کون اختر شکار کرتا ہے
(۹۷) ہوائے سلطنت ہے اس گدا کو
ادھر شاہی ادھر ہے بادشاہی
(۹۸) بتوں کا عشق چھوڑو آئی پیری
کرو اختر بس اب یادِ الٰہی
(۹۹) عارض طفل حسین رشکِ گلستاں ہو گئے۔
آتشیں نالے مرے خورشید تاباں ہو گئے
(۱۰۰) وہ ترک الٹ دیتا ہے دم میں صفِ مژگاں
آنکھوں سے مری آج لڑائی ہے کسی کی

(گلدستۂ عاشقاں۔ مطبوعہ ۱۲۵۹ھ مطبع محمدی)

باب (۵)

دورِ واجدی کے ہنروران اودھ

لکھنؤ اور دلّی میں وہی فرق تھا، جو واہ اور آہ میں ہوتا ہے، دلی ایک عرصہ سے، ستم کش معذگار تھا آئے دن وہاں طوفان آتے رہتے تھے، کشت وخون کا بازار گرم ہوتا رہتا تھا، لوٹ مار، اور قتل و غارت کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ قائم تھا۔ کبھی جاٹوں کی یورش۔ کبھی سکھوں کی شورش۔ کبھی روہیلوں کی یلغار، کبھی مرہٹوں کے حملے، کبھی انگریزوں کی ترک تازیاں نہ دلی کے رہنے والوں کو امن وعافیت کی نعمت حاصل تھی۔ نہ شہنشاہ گردوں پناہ کو چین کی ایک گھڑی میسر آتی تھی۔ پھر درباری سازشیں مستزاد یہ سازشیں بھی اتنی ہولناک ہوتی تھیں کہ کبھی بادشاہ اندھا کر دیا گیا، کبھی انتہائی شقاوت اور بے دردی کے ساتھ، اپنے نمک خواروں اور ملازموں کے ہاتھوں قتل کر دیا گیا، ایک زمانہ تو ایسا بھی گزرا، جب، خاندان شاہی کے لوگ کسی بادشاہ کے قتل یا ہلاکت کے بعد تخت حکومت پر قدم رکھتے گھبراتے تھے

اس کے برعکس لکھنؤ کی زندگی، یکسر امن وعافیت، آرام وآسائش، اطمینان وفراغ خاطر، عیش وطرب، نشاط وانبساط، اور سرور وسکون کی زندگی تھی، شجاع الدولہ کے وقت سے لے کر، واجد علی شاہ کے دور تک۔ لکھنؤ کے عوام کو کسی طرح کی مصیبت اور ہلاکت سے دوچار نہیں ہونا پڑا، نہ اندرونی سازشوں نے، دربار شاہی کی شان وشوکت، آن بان، اور سطوت ورفعت میں فرق ڈالا، نہ انگریزوں کی عیاریوں، اور چال بازیوں نے حکومت کی بنیادیں متزلزل کیں، مرہٹوں اور انگریزوں سے اگر کبھی کوئی آویزش ہوئی بھی۔ تو ایسے دور دراز کے علاقوں میں کہ اس کا کوئی اثر، لکھنؤ کی پرسکون زندگی پر نہیں پڑا، شجاع الدولہ کو بکسر میں شکست ہوئی، لیکن اس شکست سے لکھنؤ کا کاروبار مملکت بالکل غیر متاثر رہا، مرہٹوں کی چیرہ دستیوں، اور سفاکیوں سے، روہیل کھنڈ کے بعض علاقے متاثر ہوئے، لیکن نہ اتنے کہ انھوں نے لکھنؤ کے سکون وعافیت پر غارت گری کی ہوتی۔

یہ وجہ تھی کہ لکھنؤ اور اطراف جوانب میں صنعتیں پروان چڑھتی رہیں، اور شاعری کا بازار گرم رہا۔ ہنرور پشتینی طور پر اپنے کام میں مشغول رہے، دلّی اور دوسرے مقامات کے اصحاب فضل وکمال، بھاگ بھاگ کر، لکھنؤ پہنچے اور یہاں آرام وآسائش کی زندگی

ترقی کرتا رہا، یہاں کی زندگی میں رعنائی، اور رنگا رنگی پیدا ہوتی، اور ابھرتی رہی، یہاں کی سوسائٹیوں اور مجلسوں کی رونق کبھی کم نہیں ہوئی بلکہ برابر بڑھتی رہی، لکھنؤ کے عہد فراغ و تنعم کو ہم عہد عباسیہ کے ابتدائی دور سے تشبیہ دے سکتے ہیں، سوسائٹی کا کوئی طبقہ بھی پریشان روزگار اور آشفتہ حال نہیں تھا، مِن برس رہا تھا۔ اور ہر شخص اپنا حصہ پا رہا تھا، نہ کہیں فاقہ کشی تھی نہ گرسنگی، نہ بیکاری - نہ بے روزگاری نہ فقر نہ فلاکت نہ عسرت نہ غربت، ہر گھر عیش و نشاط کا مرکز تھا۔ ہر مجلس لطف و سرور سے بھرپور تھی۔ بادشاہ کا قصر زرنگار ہو۔ یا مزدور کی جھونپڑی، رئیس کا کاشانہ ہو۔ یا دہقان کی کٹیا، سرمایہ دار کی محلسرا ہو۔ یا فن کاروں اور صنعت کاروں کا غریب خانہ۔ کہیں بھی بے اطمینانی نہیں تھی۔ زندگی سے فرار کا جذبہ نہیں تھا۔ زندگی کو برتنے اور اس سے پورے طور پر بہرہ ور ہونے کی ہر شخص میں امنگ تھی سب اپنے اپنے حال میں مگن اور مست تھے۔ نہ فکر امروز، نہ غم فردا، نے غم دزد۔ نے غم کالا۔

عہد واجد علی شاہ کے مختلف اور رنگا رنگ پہلوؤں میں سے ایک پہلو ہنروران اودھ کا بھی ہے اس باب میں ہم اس گراں مایہ عہد کے ہنروروں اور فن کاروں کا اختصار کے ساتھ ذکر کریں گے۔ تاکہ قارئین ایک ہلکا سا اندازہ اس عہد کی ترقی اور فارغ البالی کا کر سکیں۔

کسی بادشاہ یا فرماں روا کے عہد حکومت کا جب جائزہ لیا جاتا ہے۔ تو اس کے ہنروروں اور فن کاروں کے تجسس احوال پر خاص توجہ کی جاتی ہے کہ بغیر اس کے صحیح نقشہ نظر کے سامنے نہیں آتا۔

(۱)

بانکے

اس باب میں ان بانکوں، بنوٹ بازوں، اور، اسی طرح کے دوسرے فنون کے ماہرین کا تذکرہ ہے، جنھوں نے لکھنؤ کی ناموری اور شہرت میں چار چاند لگا دیئے تھے، خود بھی زندہ جاوید رہے اور وطن کا نام بھی اچھالا۔

میر جعفر علی | بانک کے فن کے آخری استاد تھے۔ واجد علی شاہ کے ساتھ مٹیا برج چلے گئے تھے۔

محمد علی خاں | کرہ بزن بیگ کے رہنے والے اور علی مد کے موجد مانے جاتے ہیں۔

محمد مہدی | عہدِ واجدی میں بنوٹ کے استاد تھے۔ نواب معشوق محل کے یہاں داروغہ تھے

مہاراجہ ڈگبنج سنگھ عہد شاہی کے تھے۔ بندوق لگانے میں ایسے کامل تھے، کہ ایک بار اندھیرے میں شیرنی کی سانس کی آواز پر گولی چلائی اور ٹھیک نشانہ پڑا۔

حکیم محمد رشید فتح پوری بندوق میں ان کا نشانہ کلمی ہوتا تھا۔ اکثر ڈوری کو معلق کر کے پہلی ہی گولی سے کاٹ دیتے تھے۔ شیشہ پر پھول رکھ کر اس خوبی سے گولی لگاتے تھے کہ پھول اڑ جاتا تھا اور شیشہ کو حرکت نہ ہوتی تھی (۱)

نواب جہاں پناہ محل بادشاہ کی ایک ممتوعہ بیگم تھی۔ جو بادشاہ کے بعد مٹیابرج میں انتقال کر گئیں۔ بندوق بے خلل لگاتی تھیں۔ بندوق میں گولی بھر کر کسی کوٹھے پر کھڑی ہوئیں اور آدمی کو بوتلیں دے کر ان کے منہ کس کے ڈاٹ لگا کر بہا گا رتی ہیں پھینک دو آدمی نے تعمیل حکم کی۔ جب بوتلیں سامنے آئیں۔ بیگم صاحبہ نے نشانے لگانے شروع کئے۔ سب بوتلیں توڑ دیں۔ جب بوتل غوطہ کھا کے ابھرتی تھی۔ فوراً نشانہ لگاتی تھیں، یہ دونوں بیگمیں فن شہسواری سے بھی خوب واقف تھیں۔

میرن صاحب پیچ کھٹیے عہد شاہی کے تھے، سعادت گنج میں رہتے تھے اور مرتے دم تک نوابان شیش محل کے ملازم رہے بندوق لگانے میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے، عورت نتھ پہنے کھڑی ہے اور انہوں نے تاک کر گولی لگائی، نتھ کے اندر سے نکل گئی، ایک انگریزان کے کمال کی تعریف سن کر یورپ سے لکھنؤ آیا۔ اس نے کہا شمع کی لو کو جس طرح میں کہوں یہ اڑا دیں تو میں ان کی استادی کا قائل ہو جاؤں۔ میرن صاحب نے کہا میں تیار ہوں۔ اس انگریز نے شیشہ کے کنول میں موی شمع لگائی شمع کو جلایا۔ اس نے چالاکی یہ کی تھی کہ شمع کی لو کی نوک کو کنول کے کنارے کے سر سے ملا دیا تھا میرن صاحب نے گولی چلائی، شمع بجھ گئی اور کنول کو ضرر نہ پہنچا۔ وہ انگریزان کی استادی کا قائل ہو گیا۔

ایک دفعہ میرن صاحب نے اپنا یہ کمال دکھایا۔ کہ نیم کی پتی کو مٹکے کو لٹا کے اس کے اوپر چپکا دیا۔ اور گولی سے ساری پتی کو بیچ سے دو کر دیا۔ اور مٹکے کو ضرر نہ پہنچا یہ کمال لاٹ صاحب کے سامنے رکھ دیا تھا میرن صاحب کے شاگرد امراؤ مرزا صاحب ابھی زندہ ہیں (۲)

مرزا احمد بیگ کیٹا کیٹا عہد و بصراے کے بانکوں میں تھے۔ ایک مرتبہ محلہ شیو تیری متصل حسین آباد میں ایک دوسرے تلور ئیے سے اور ان سے تلوار چلی انھوں نے تلوار ماری

---

(۱) حیات ابدی صـ۲۳۳

(۲) قدیم ہنروران اودھ صـ۱۲۵

اس نے سینہ پر روکی اور تعریف کی کہ سبحان اللہ بے شک ہاتھ پڑا ہے، اب اس نے بھر پور ہاتھ مارا۔ انہوں نے سینہ پر روکا اور اس کے بھی ہاتھ کی تعریف کی کہ نہایت کاری ہاتھ پڑا ہے اس طرح سے ان کے دونوں کے درمیان دیر تک تلوار میں لڑائی رہی۔

میر ولایت علی یہ عہد شاہی میں گزرے ہیں یہ پٹے کے استاد تھے اور میر ولایت علی ڈنڈا توڑ کے نام سے مشہور تھے۔ حریف کے ہاتھ میں کتنا ہی زبردست ڈنڈا ہو توڑ ڈالتے تھے (۱)

(۲)

شہ زور

عہد واجد علی شاہ کے شہ زوروں پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے۔

مرتضیٰ خان لکھنوی مصاحب گنج میں رہتے تھے۔ عہد واجدی کے تھے۔ اس قدر قوت تھی کہ بھینسے کی دم پکڑی اور اندارے میں لٹکا دیا۔ اور پھر کھینچ لیا۔ ایک پر جس کو دو بیل کھینچتے تھے انہوں نے تنہا کنوئیں سے کھینچ لیا (۲)

مرزا امداد حسین لکھنوی عہد واجدی میں کپتان (رکمیدان) تھے۔ ان کی لبغیہ آج تک مفتی گنج میں مشہور رہے۔ امیر امراؤ مرزا کے داداجان تھے۔ ایک دن ایک مرکھنا بیل چھوٹ گیا۔ اتفاقاً یہ ادھر سے آرہے تھے لوگوں نے منع کیا کہ حضرت ادھر نہ جائیے، مرکھنا بیل چھوٹ گیا ہے۔ انہوں نے سماعت نہ کی، بیل ان کی طرف جھپٹ کر چلا۔ انہوں نے بائیں ہاتھ میں پھرے کر اس کے سینگوں کو پسر پکا۔ لاکھ لاکھ بیل نے زور کیا۔ مگر ان کے ہاتھ کو جنبش نہ ہوئی۔ داہنے ہاتھ سے تلوار کھینچی اور گھٹنے کو زمین پر ٹیک کر ایک ہاتھ بیل کی گردن پر مارا کہ سر الگ ہو گیا اور دھڑ الگ، غدر کے کئی برس بعد مرے، بنوٹ بھی خوب جانتے تھے۔

مرزا قدرت اللہ بیگ لکھنوی عہد واجدی کے مشہور شہ زور اور مفتی گنج کے رہنے والے تھے۔ قوت کا یہ حال تھا کہ بانس کے پوروں کو

دونوں مٹھیوں سے پکڑ کر اور زور کر کے اس کے اندر کے ریشے کھینچ لئے۔ ایک دہلیز کے لوہے کے کنڈے کو اس زور سے مڑوڑا تھا۔ کہ دہلیز چرچرا گئی تھی۔

رشیدہ خانم

لکھنوی عہد واجدی کی تھیں۔ نواب ہادی علی خان ساکن مفتی گنج کی والدہ تھیں۔ برسات کا زمانہ تھا۔ سب مکان کے صحن میں اپنے اپنے پلنگ پر سو رہے تھے۔ کہ شب کو ایک چور گھر میں آیا۔ کھٹ پٹ سے سب کی آنکھ کھل گئی۔ چور بھاگا اور چاہا کہ جست کر کے دیوار کے اوپر چلا جاؤں۔ خانم موصوف نے ایک ہاتھ سے اس کا موزہ پکڑ کر اس زور سے جھٹکا دیا کہ چور کا گٹہ اکھڑ گیا لاکھ لاکھ چور نے جھٹکا دیا مگر نہ چھوڑا۔ جب بہت توبہ تلا کی چھوڑ دیا۔ (۱)

ساٹھکا

قوم کا مغل تھا۔ دربار شاہی میں اس کے کچھ اعزہ ملازم تھے۔ یہ ساٹھ کوس یعنی ایک سو بیس میل ایک دن میں جاتا تھا۔ اور پلٹ آتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ صبا رفتار پیک۔ اس قدر مضبوط تھا اور اس کی ٹانگیں ایسی قوی تھیں کہ لکھنؤ سے ساٹھ کوس دریا آباد جا کر ایک ہی دن میں پلٹتا تھا۔ اسی وجہ سے اس کا نام ساٹھکا ہوا۔

مرزا احمد حسین

عہد واجدی میں بڑے طاقتور اور قوی مشہور تھے۔ یہ دوسرے درجہ کے رسالدار تھے۔ مرزا علی رضا کوتوال کے بھانجے تھے۔ نواب حضور عالم کی کوٹھی کے سب لٹھے انہی کے چڑھائے ہوئے ہیں۔ یہ ہاتھی کے پاٹھے پر بیٹھتے تھے۔ اس قدر گراں ڈیل تھے کہ گھوڑا بوجھ نہ اٹھا سکتا تھا۔ ہاتھی کی دم پکڑ لیتے تھے اور آگے نہ بڑھنے دیتے تھے۔ جب ہاتھی کی مستک پر گھونسا مارتے وہ چیخ آتا تھا۔ (۲)

نواب شہنشاہ دولہ

مرزا صادق علی خاں بہادر۔ لکھنوی عہد شاہی کے تھے۔ اور اولاد نواب شجاع الدولہ بہادر سے تھے۔ مصاحب گنج کے رہنے والے تھے۔ ان کا معمول تھا کہ ایک ہی جھکاؤ میں ایک ہزار ڈنڈ پیلتے تھے۔ چھٹانک بھر سنکھیا برفی میں ملا کر ڈنڈ کے بعد ناشتہ کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ ایک بار عیش باغ کے میلہ کی سیر دیکھنے گئے۔ خان بہادر جناب مرزا علی سجاد حسین صاحب ڈپٹی کمشنر ساتھ تھے۔ وہ اپنا چشم دید واقعہ بیان کرتے ہیں کہ چار پہیہ کی گاڑی تھی اس میں کوچ باکس بھی لگا ہوا تھا کوچ مین گاڑی ہانک رہا تھا۔ اس کے پہلو میں نواب صاحب کا ٹیر باز بیٹھا تھا اور رفقا سامنے کی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ موتی جھیل کے کنارے میلہ کے شور و غل سے گھوڑے نے بدلگامی کی اور گاڑی جھیل کے اندر

---

(۱) تقدیم بحرِ ... اودھ ص۱۱۲
(۲) [illegible] اودھ ص۱۱۲

مہاراجہ دگبنیجے سنگھ کی شہ سواری کا ذکر سن کر جمعہ کے دن جو نواب صاحب کی سواری کا دن تھا مہاراجہ کو بلایا مہاراجہ گنٹو گھاٹ آئے حضور عالم برآمد ہو کر تحسین گنج کے اصطبل میں آئے اور مہاراجہ کو ساتھ آنے کا حکم دیا۔ اصطبل کے میدان میں پہنچ کر تین چار شخصوں سے نیزہ بازی میں ان کا مقابلہ کرایا۔ مہاراجہ نے سب کو مغلوب کیا۔ پھر خود حضور عالم گھوڑے پر سوار ہوئے اور مہاراجہ کے مقابلہ کو آئے۔ تھوڑی دیر تک مہاراجہ نواب صاحب کی چوٹوں کو روکتے رہے۔ آخر کار کہا کہ میں حضور کا مقابلہ نہیں کر سکتا اور میرا گھوڑا اب تھک گیا ہے۔ حضور عالم نے مہاراجہ کی سواری کی تعریف کی، اور فرمایا کہ انگریزی کاٹھی پر کیوں نہیں سوار ہوتے؟ مہاراجہ نے کہا کہ میں اس پر نہیں بیٹھ سکتا۔ حضور عالم نے اسی دن مہاراجہ کو شاگرد کیا اور انگریزی کاٹھی کی سواری سکھائی (۱)

نواب حیدر خان بنگش

لفظ بنگش کے لغوی معنی ہیں پہاڑی ملک۔ کچھ عرصے کے بعد اس کے معنی ہو گئے۔ باشندے پہاڑی ملک کے۔ جو لوگ بلند پہاڑیوں پر رہتے تھے۔ بالا بنگش کہلاتے تھے اور جو پہاڑی کے ملک میں سکونت گزین تھے۔ یعنی کوہاٹ میں پائین بنگش مشہور تھے۔

قائم جنگ ضلع فرخ آباد میں پیدا ہوئے اور اپنے والد ولی محمد بنگش کے ساتھ لکھنؤ آئے۔ نواب یمین الدولہ بہادر نے نواب حیدر خاں کی عزت افزائی اور قدردانی فرمائی۔ ایک دفعہ یمین الدولہ نے حیدر خان کی قوت اور شہ سواری کا نہایت سخت امتحان لیا۔ اور خان موصوف امتحان میں پورے اترے۔ نواب صاحب نے اسی وقت خاص اپنی سواری کا عربی گھوڑا معہ زین اور چار جامہ عنایت کیا۔ اور ساتھ ہی اس خلعت میں سرپیچ انگرکھا، رومال پیش قبض، ستف اور جوڑی بختہ کی عنایت کی اور بہت سی اشرفیاں بھی عنایت کیں۔ اور بعد اس کے خاص اپنے درباری مصور سے حیدر خاں کی تصویر کھنچوائی۔ یہ تصویر اب تک موجود ہے۔ مصور نے تصویر بنائی اور خوب اپنا کمال دکھایا۔ (۲)

حیدر خاں بنگش محلہ محمود نگر میں رہتے تھے۔ ایسے شہ سوار تھے کہ کیسا ہی گھوڑا کیوں نہ ہو۔ مگر یہ ہر حال میں بغیر رکابوں کے سوار ہوتے تھے۔ ان کی قوت کا یہ عالم تھا کہ دو زبردست جوانوں کے سر ٹکرا کر مار ڈالتے تھے۔ اس طرح سے کہ ایک شخص کی گردن ایک ہاتھ سے پکڑی۔ اور دوسرے کی دوسرے ہاتھ سے ان دونوں کے سر اس زور سے ٹکرا دیئے۔ کہ سر چور چور ہو جاتا تھا۔ حیدر خاں کا معمول تھا کہ روز ورزش کے بعد لوٹا بھر دودھ ایک ہی سانس میں پی لیتے تھے۔ وہ تانبے کا لوٹا ابھی موجود ہے اور اس پر لکھا ہے۔

---

(۱) تاریخ برام پور ص۲۷

(۲) تاریخ فرخ آباد نوابان بنگش حصہ اول ص۲۱۔

"حیدر خاں ۱۲۶۱ھ" اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ لوٹا عہد امجدی کا ہے۔ لوٹے کا وزن ڈھائی سیر ہے۔ اور چھ سیر تین پاؤ آدھ چھٹانک پانی اس میں آتا ہے۔ حیدر خاں بنگش غدر ۱۸۵۷ء میں مع اپنے نوجوان اکلوتے فرزند محمد غضنفر خاں بنگش کے موضع ماہ پت مٹور (کاکوری روڈ) پر واقع ہے مارے گئے۔

لہٰذا اولاد مذکور میں اب کوئی نہیں ہے (۱)

بندہ علی خان واجد علی شاہ کا کوچوان تھا۔ گاڑی بے مثل ہنکاتا تھا۔ اس کا کمال یہ تھا کہ سڑک پر دور تک روپیوں کی قطار لگائی۔ بادشاہ چوکڑی میں بیٹھے، اور بندہ علی نے راس لی۔ ایک پہیہ روپیوں کی قطار کے اوپر ہے، اور ایک زمین پر جس رفتار سے کہیئے، گاڑی لے جائیے۔ کیا مجال جو پہیہ روپیہ کی قطار سے ادھر ادھر ہو جائے۔ بندہ علی گاڑی ہانک رہے ہیں، اور بادشاہ بیٹھے ہیں۔ قیصر باغ کے پھاٹکوں سے سواری نکلے یا جائیے۔ جب پھاٹکوں سے گاڑی مڑی پرکار سے ناپ لیجئے۔ دونوں طرف کے پہیے کے نشان پھاٹک کے دونوں طرف کی چول سے برابر برابر ہوتے تھے۔ بادشاہ گاڑی میں بیٹھے ہیں، بندہ علی ایک گھوڑے کو سرپٹ لئے جاتا ہے اور دوسرے کو پوئی۔ اور تیسرے کو دھمکی، اور چوتھے کو قدم قدم اور چاروں گھوڑے ایک ہی گاڑی میں جتے ہیں۔ مگر کیا مجال کہ سواری کو نکان ہو جائے۔ بندہ علی خان انتزاع سلطنت کے بعد ریاست رام پور چلا گیا تھا۔ اور اس نے نواب کلب علی خاں کو اپنا کمال دکھایا تھا۔ مشہور ہے کہ تبیس گھوڑے گاڑی میں جوت کر نواب صاحب نے ہنکوائے تھے اور بندہ علی نے ہانک دیئے پھر مہاراجہ دگبجے سنگھ نے بندہ علی کو اپنے ہاں ملازم رکھ لیا تھا۔ اور وہیں مر گیا۔ (۲)

(۴)

پیراک و غوّاص

تندو تیز دریا کی پرشور موجوں میں لکھنؤ کے پیراکوں اور غواصوں کی روانی دیکھیئے۔

مولوی مرزا مہدی عہد شاہی کے تھے۔ پیراکی میں ان کا کمال یہ تھا کہ دریا میں اترے۔ اور ایک تیز دوڑنے والے آدمی کو دریا کے کنارے اپنے برابر کھڑا کیا اور اس سے کہا کہ جب تک تیز دوڑ سکتے ہو دوڑو وہ سر پر پیر رکھ کر بھاگا۔ اور انہوں نے ملاحی کاٹنا شروع کی اتنی تیز

---

(۱) قدیم ہنروران اودھ ص۱۷۱

(۲) قدیم ہنروران اودھ ص۱۷۲۔

ملاحی کاٹتے تھے کہ وہ بانسوں پیچھے رہ جاتا تھا اور یہ آگے نکل جاتے تھے۔عین غدر ۱۸۵۷ء میں بمقام مفتی گنج گولی سے مارے گئے۔بانک اور لکڑی سے بھی بخوبی واقف تھے۔ان کے بیٹے حسین مرزا صاحب جو شاہی کے پیدا تھے وہ بھی پیراکی اور بانک میں استاد گزرے ہیں۔پرنس سلیمان قدر اور نواب سیف الدولہ بہادر کو پیرنا سکھا رہا تھا۔حسین مرزا کے بیٹے سلطان مرزا جب جو مٹیا برج میں واجد علی شاہ کے ملازم تھے۔فن شناوری اور بانک جانتے تھے۔دریا میں اس طرح غوطہ لگاتے تھے۔کہ انہیں کوئی چھو نہیں سکتا تھا۔ستر سال کی عمر ہے۔ضعف بصارت ہے۔مفتی گنج میں رہتے ہیں۔

میر صفدر علی

عہد شاہی کے تھے۔احاطہ مرزا علی خاں میں رہتے تھے۔مشکل پیراکی کے استاد تھے۔لکڑی ایسی لگاتے تھے۔معلوم ہوتا تھا کہ پانی میں میخ گڑی ہے۔کیا مجال کہ ذرا تو جسم میں لغزش ہو جائے۔ایک وقت چھ سات آدمی ان کو پانی میں دباتے تھے۔مگر یہ ناف تک کھلے ہی رہتے تھے۔پانی سے بھرا ہوا گھڑا ہاتھ میں لیا اور اپنے سر پر ڈالنا شروع کیا۔پورا گھڑا خالی ہو گیا۔مگر نیچے نہ دبے۔جتنا کھلے تھے اتنا ہی کھلے رہے۔جل بانک میں بھی بڑے استاد تھے۔سات آٹھ آدمی دریا میں ایک طرف اور یہ اکیلے ایک طرف مگر وہ ان کا کچھ نہ کر سکتے تھے۔واجد علی شاہ کو انہیں نے پیرنا سکھایا تھا۔میر صفدر علی کلھا گھاٹ پر نہایا کرتے تھے۔غدر کے کئی برس بعد لکھنؤ میں انتقال کیا۔ان کے بڑے بیٹے میر فضل حسین تھے۔جنھوں نے ہز ہائینس نواب حامد علی خاں صاحب مرحوم والئ رامپور کو پیرنا سکھایا تھا۔اور وہاں ملازم تھے۔یہ بھی لکھنؤ میں مر گئے (۱)

شیخ بدلو لکھنوی

قوم کا حجام تھا۔عہد واجدی کا تھا۔ہلکی اور سبک پیرائیوں کا استاد تھا۔پالتھی کی پیرائی خوب پیرتا تھا۔صرف پیر کے دونوں انگوٹھوں سے پانی کو حرکت دیتا تھا۔ایک ہاتھ میں گڑگڑی ہے۔اور پیرتا چلا جاتا ہے۔اور کسی بچہ کو گود میں اٹھا لیا جاتا ہے۔ڈوبوٹ کی پیرائی بہت اچھی پیرتا تھا۔یعنی سر سے کمر تک جسم کا حصہ پانی کے اوپر ہے اور باقی حصہ پانی کے اندر ہے۔اور پیرتا چلا جاتا ہے۔بدلو پانی میں ریل گاڑی بناتا ہے۔اس طرح سے کہ پچیس تیس آدمی ایک کے پیچھے دوسرا لگا ہوا ہے اور سب کے آگے خود ہے۔کبھی ملاحی سے سب کو کھینچے لے جاتا ہے۔کبھی کھڑکی سے کبھی کسی اور پیرائی سے۔غدر کے بعد حسین آباد کے تالاب میں ہزاروں آدمیوں کے مجمع میں یہ کرتب دکھائے جاتے تھے۔بدلو کھڑی بھی اچھی لگاتا تھا۔ایسی مشق بہم پہنچائی تھی۔کہ موضع کانکر آباد سے پکے پل تک رکئی کوس، کھڑی لگاتا ہوا آتا تھا۔جمعہ چھ بجے کانکر آباد سے چلا۔اور چار بجے پکے پل پر آگیا (۲)

---

(۱) قدیم ہنروران اودھ صفحہ ۱۳۵

(۲) قدیم ہنروران اودھ صفحہ ۱۳۶۔

شیخ عابد علی لکھنوی

عہد شاہی کے تھے اور حاجی احمد علی عرف تھمے مرزا کے شاگرد تھے۔ حاجی صاحب ان کو ایسا باکمال سمجھتے تھے، کہ اپنے بیٹوں کی موجودگی میں شیخ کو اپنا جانشین بنایا۔ سچ یہ ہے کہ زمانہ شاہی کے پیراکوں کا خاتمہ شیخ عابد پر ہوا۔ شیخ مذکور ۱۷ اکتوبر ۱۹۲۷ء کو مر گئے اور موضع بڑی براؤن کے باغ میں دفن کئے گئے۔ سو برس کے قریب عمر پائی، عابد علی شر کی پرائی بے مثل پیرتے تھے اور ڈبوٹ کی پیرائی بھی نہایت اچھی پیرتے تھے۔ صفت یہ تھی، کہ پانی سے بھرا ہوا کٹورا پیروں کے تلووں پر رکھ دیا۔ اور یہ پیرتے چلے جاتے ہیں۔ مجال کیا ہے۔ کہ پانی کٹورے سے چھلک جائے۔ اپنے جسم کو بے حد قائم رکھتے تھے ایک خاص صفت عابد علی میں یہ تھی، کہ کنارے پر بیٹھے ہیں، اور کسی کو ڈوبتے دیکھا، بس پلک جھپکتے اس کے پاس پہنچ گئے۔ اور پھول کی طرح اٹھا لیا۔ عابد علی دریائی کشتی یعنی جل بانک بھی خوب جانتے تھے۔ بہت سے پیچ در پیچ جانتے تھے۔ عابد علی کھڑی لگانے کے بھی استاد تھے۔

برسات کے موسم میں جب کہ دریا خوب طغیانی پر ہوتا تھا۔ یہ موضع کانکا آباد سے دریا میں اترے اور اپنے سینہ پر ایک لکیر بنائی اور کھڑی لگاتے چلے۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ پانی پر کھڑے ہوتے ہیں۔ مطلق جسم کو حرکت نہ ہوتی تھی اور نہ وہ لکیر بھیگنے پاتی تھی۔ غرض اسی طرح کا گھاٹ تک آتے تھے۔

ایک مرتبہ مولوی سجاد حسین صاحب نے شیخ عابد علی سے کہا، کہ آج کل دریا طغیانی پر ہے۔ دل چاہتا ہے کہ سیر کریں۔ شیخ نے کہا، گئو گھاٹ چلئے۔ چنانچہ مولوی صاحب گئو گھاٹ آئے۔ عابد علی نے چار گھڑوں کی ایک گھڑنی بنائی۔ اور ایک گھڑے کے پیندے پر مولوی صاحب کو بٹھایا۔ اور دوسرے پر خورشید حسین کو اور تیسرے پر ابوالحسن کو (مذکورہ تینوں حضرات فن شناوری سے ناواقف تھے) اور چوتھے پر اپنے بیٹے شیخ محمد اسماعیل کو اور خود گھڑنی کو گھسیٹتے ہوئے چلے، کہ ٹوٹ گھاٹ پر دفعتہً گھڑنی غڑپ سے بیٹھ گئی اور چاروں آدمی آپس میں غٹ پٹ ہو گئے۔ عابد علی نے ایک ہاتھ سے مولوی صاحب کو اور دوسرے ہاتھ سے خورشید حسین کو سنبھالا۔ اور ٹانگ سے ابوالحسن کو ابھارا اور ایک ٹانگ سے تیرتے ہوئے کنارے پر آ گئے۔ شیخ محمد اسماعیل تیرنا جانتے تھے، اس لئے خود باہر نکل آئے (۱)

(۵)

موسیقار

اب موسیقاروں کی محفل جمتی ہے :-

---

(۱) قدیم ہنرمندان اودھ صفحہ ۱۳۹ ۔

خاندان تان سین | عہد واجدی میں خاندان تان سین کے باکمالوں میں پیار خان، جعفر خان، حیدر خان، باسط خان، محمد علی خان تھے (۱)

نعمت اللہ خان | باسط خان کے شاگرد علم موسیقی کے باکمال گیارہ سال تک مٹیا برج میں واجد علی کے ساتھ رہے۔

نظام الدین احمد خان و محمد احمد خان | عہد واجدی میں تھے، علم موسیقی میں مقتدائے جہان تھے۔

نواب گیتی آرا بیگم | نواب حضور عالم وزیر اعظم کی صاحبزادی تھیں، عہد واجدی میں تھیں جل ترنگ بے مثل بجاتی تھیں۔

محمد حسین خان لکھنوی عرف محمد | عہد شاہی کی یادگار تھا، طبلہ بجانے میں استاد مانا جاتا تھا، یہ شعر صاف اس کے طبلہ میں دکھا ئی دیتا تھا۔

تیرے پرتے جھڑنے لگے شررنہ تڑپ تو بلبل زار بس
جلے گا قفس جلے گا قفس جلے گا قفس جلے گا قفس

جناب مرزا محمد عسکری صاحب ساکن عبد العزیز روڈ لکھنؤ نے محمد کا مذکورہ کمال دیکھا ہے۔ (۲)

پنڈت بھیرون دت دریا آبادی | پنڈت جیو نرائن کی نسل سے تھے، پنڈت گوری شنکر کے بیٹے تھے۔ فن موسیقی کے بڑے ماہر تھے، مردنگ، ڈھول بہت مشہور تھی، لکھنؤ میں اچھے اچھے طبلہ نواز ان کی ڈھول سننے آتے تھے، پنڈت جی ڈھول سے ہر ساز کی آواز پیدا کر کے سامعین کو وجد میں لاتے تھے، عہد واجدی میں تھے (۳)

مہدی حسن خاں لکھنوی | محلہ تحسین گنج کے رہنے والے تھے اور واجد علی شاہ کے ملازم تھے۔ بین بجانے میں ان کا جواب ہندوستان میں نہ تھا، غدر کے بعد ریاست دتیا میں کدتی سنگھ پکھاوجی سے ان کا مقابلہ ہوا، اور مہدی حسن خاں نے اس کو شکست دی، ایسی بین بجائی کہ پکھاوجی ساتھ نہ دے سکا، مہاراجہ صاحب دتیانے ان کو بہت انعام دیا، دوے خاں اور مہدی حسن خاں اور غلام حسین خاں

---

(۱) قدیم ہنرمندان اودھ صلا (۲) قدیم ہنرمندان اودھ صہ
(۳) تاریخ دریا باد۔

کے بیٹے تھے۔ مہدی حسن حسن عظیم اللہ خاں کی کربلا میں دفن ہیں۔

غلام محمد خاں | عہد واجدی میں ستار بجانے میں کامل تھے۔ ہاتھ میں گلے کا انداز رکھتے تھے۔ بڑے دیندار تھے (۱)

مسماۃ شرعی دریا آبادی | موسیقی دانی کے ساتھ سارنگی بجانے میں استاد تھی حسین بخش لکھنوی کی شاگرد تھی۔

سورج دین کتھک دریا آبادی عرف سرجو | طبلہ نوازی میں کامل تھا۔ یہ بھی پرنس برجیس قدر بہادر کی والدہ کے یہاں ملازم تھے۔ (۲)

قطب الدولہ | ریاست رام پور یا بریلی کے رہنے والے تھے، ستار خوب بجاتے تھے۔ اور عہد واجدی کے باکمالوں میں تھے۔

بینی پرشاد کتھک دریا آبادی | موسیقی کا استاد تھا۔ خوش گلو مغنی تھا۔ ناچنے میں کامل تھا۔ عہد واجدی میں پرنس برجیس قدر بہادر کی والدہ کا خاص مہمنٹی اور شاہی کلاونتیوں میں تھا۔ (۳)

چھوٹے خاں دہلوی | یہ امجدی عہد میں لکھنؤ آیا۔ اور ولی عہد سلطنت واجد علی شاہ نے اسے رئیس الدولہ کا خطاب دیا تھا۔ مٹیا برج میں مر گیا۔ اور وہیں دفن ہوا۔ ان کے استاد پیار خان تھے، جو تان سین کے خاندان سے تھے (۴)

دولے خاں | لکھنوی محلہ تحسین گنج کے رہنے والے تھے۔ عہد واجدی میں ہوری اور دھرپد گانے کے استاد تھے۔ تال کٹورہ کی کربلا میں دفن ہیں۔ دولے خاں کا مکان محلہ تحسین گنج میں وہاں تھا، جہاں حامد علی خاں صاحب مرحوم بیرسٹر کی کوٹھی ہے۔

حیدر علی خاں و چھجو خان | ان دونوں نے دھرپد اور خیال ایسا گایا۔ کہ مدعی تک وجد میں آیا عہد واجدی میں تھے۔

---

(۱) سوانح عمری مہاراجہ ٹکیت رائے سنگھ
(۲) تاریخ دریاباد
(۳) تاریخ دریاباد
(۴) قدیم ہنرور اں اودھ صفحہ

(۶)

رقاص

نغمہ و موسیقی کی بساط الٹی، اب رقص بے حجاب کا ایک جلوہ ملاحظہ فرمائیے

درگاہ پرشاد و ٹھاکر پرشاد عہد محمد علی شاہ سے واجدی عہد تک یہ دونوں فن رقاصی کے کامل استاد گزرے ہیں (۱)

نیومان پرشاد کتھک دریاآبادی فن موسیقی میں کامل تھا۔ شیر الدولہ مہاراجہ بالکرشن بہادر (دیوان سلطنت اودھ) کی سرکار میں نوکر تھا۔ ناچنے اور گانے میں کامل تھا۔ (۲)

مغل جان رانی مئو مضافات دریاآباد ضلع بارہ بنکی کی رہنے والی تھی۔ عہد واجدی تک زندہ تھی۔ اور گنگے کے ہاتھ دکھاتی تھی۔ ناچنے میں دور دور تک مشہور تھی۔ فن موسیقی میں بھی کمال تھا۔

خدا بخش کسبی اس کی ایک بیٹی مانی جان بے انتہا خوبصورت تھی۔ خدا بخش مانی جان کو لے کر لکھنؤ سے ریاست بلرام پور آئی۔ الغرض مانی جان مہاراجہ ڈگ بجے سنگھ کی خدمت میں آئی۔ اور بڑی آفت اٹھوائی۔ آخر زبردستی لکھنؤ بھیجی گئی۔ مانی جان نے راجہ مذکور سے جدا ہوتے ہی اپنی ماں کو چھوڑ دیا اور بیت اللہ کی راہ لی صبح سے شام تک عبادت کرتی تھی، وہیں دنیا سے چل بسی (۳)

بندہ دین و کالکا یہ دونوں کتھک درگا پرشاد کے لڑکے تھے۔ اور آخر عہد میں باکمال گزرے کہ روئے زمین پران کا ہمسر نہ تھا۔ ان دونوں بھائیوں نے خصوصاً بندہ دین نے ناچ کے تمام فنون میں کمال دکھا کے اپنے آپ کو بہ حیثیت سے استاد بے بدل ثابت کر دیا۔ بندہ کا گت ناچنا رقص کے استادانہ توڑے اور ٹکڑے اصلی صورت میں دکھانا۔ گھونگھرو بجانے میں یہ اختیار اور قدرت ظاہر کرنا کہ جتنے گھونگھرو چاہے بجائے اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس کو پیر کی رگوں پر کس قدر قدرت اور قبضہ تھا۔ یہ بات مشہور معروف ہے کہ بندہ دین ایک سو چوراسی گھونگھرو پاؤں میں باندھ کر رقص کرتا تھا اور اس کا ہر ہر لفظ اور ہر ہر چیز کو بتانا ایسی چیزیں تھیں جن کا بندہ ہی پر خاتمہ ہوا۔ وہ ایک ایک

---

(۱) قدیم ہنروران اودھ صفحہ
(۲) تاریخ دریاآباد۔
(۳) قدیم ہنروران اودھ صفحہ

چیز کو سو سو اداؤں وضعوں نزاکتوں اور دل فریب اشاروں سے بتاتا تھا اور اس میں ایسی نازک خیالی اور جدت طرازی ہوتی تھی کہ دیکھنے والا جانتا نہ ہو، تو خاک سمجھ نہیں ہو سکتا۔ ایسا رقص کرتا تھا کہ لوگ ششدر رہ جاتے تھے۔ ایک سناٹے کا عالم طاری ہو جاتا تھا۔ دیکھنے والوں کے دل میں گداز پیدا ہو جاتا تھا۔ ایسے ایسے ناز نخرے عشوے اور اشارے رقص میں کرتا تھا کہ طبیعت بے چین ہو جاتی تھی۔ یہ معمول تھا کہ بندہ دین بتاتا۔ اور کالکا پاس کھڑا ہو کے۔ اس کی تشریح کرتا جاتا تھا۔ ناچ میں اس کے پاؤں اس نزاکت سے زمین پر پڑتے تھے کہ مشہور ہے یہ بعض اوقات تلوار کی باڑھ پر ناچا اور کمال کیا جو تلوے میں ذرا خراش آیا ہو۔ (۱)

(۷)

مصوّر

کانوں نے نغمہ و موسیقی کے ترانے سن لئے۔ آنکھوں نے رقص بے محابا کا جلوہ دیکھ لیا۔ اب مصوروں کے موقلم کا کمال ملاحظہ ہو:۔

کاشی رام | عہد واجدی کا یکتائے روزگار مصوّر تھا۔ (۲)

میر محمد علی لکھنوی | عہد واجدی کے کاملین سے تھا۔ میر انیسؔ کے مجلس پڑھنے کا ایک مرقع اسی محمد علی جیسے باکمال مصور سے داروغہ محمد خان نے تیار کرایا تھا۔ یہ مرقع میر محمد علی نے بڑی جانکاہی سے کھینچا تھا۔ منبر کے داہنی جانب جناب احسن لکھنوی کے والد کھڑے ہیں۔ اور میر صاحب کے ہاتھ میں جو مرثیہ ہے اس پر یہ مصرع لکھا ہے۔ ع

برہم ہے مرقع چمنستانِ جہان کا (۳)

مصور الدولہ | لکھنوی مٹیا برج میں واجد علی شاہ کے دامن دولت سے وابستہ تھے۔ بادشاہ نے مصور الدولہ بہادر خطاب دیا تھا۔ ہر قسم کی تصویر کشی میں ایسی اعلیٰ درجے کی مہارت رکھتے تھے کہ آج کل کے دستکاروں میں بھی وہ کمال نہیں پایا جاتا۔ اس وقت بھی حسین آباد کی تصویر وا لی

(۱) قدیم ہنروران اودھ صـ۲۲

(۲) قدیم ہنروران اودھ صـ۲۴

(۳) واقعات انیس صـ۲۹

بارہ دری اور دیگر مقامات پر شاہی مصوروں کی اعلیٰ صناعی کے نمونے موجود ہیں۔

نوابِ کاظم حسین خان | لکھنوی اولاد نواب شجاع الدولہ سے تھے۔ عہد واجدی کے مصور تھے شوقیہ تصاویر کھینچا کرتے تھے جانوروں کی تصویریں نہایت عمدہ بناتے تھے۔ اور یکمی کبوتر کی تصویر بھی اب لوگوں کے پاس موجود ہیں اور نخاس میں بکنے آجاتی ہیں۔ نواب موصوف سرائے معالی خان میں رہتے تھے۔ اب سے دس سال پہلے مرگئے۔ خوب صورت آدمی تھے (۱)

---

(۸)

خوش نویس اور خطّاط

خوش نویسی اور خطاطی بھی درحقیقت مصوری ہی کی ایک قسم ہے۔ یہ نمونہ بھی پیش نظر رہے۔ تو اچھا ہے۔

میر احمد حسین | حسن الحسینی ولد سید علی لکھنوی نیشاپوری ایسے کامل خوش نویس تھے۔ کہ میر عماد کے کتبوں میں خط ملا دیا۔ لارڈ منٹو بہادر وائسرائے نے اُن کے ہاتھ کی جلی تحریر رام پور میں دیکھا کہا کہ یہ قلم کی تحریر نہیں ہے۔ انہوں نے موصوف کے سامنے لکھ کر مطمئن کر دیا۔ (۲)

رونق علی خان | عہد نواب عین الدولہ میں ان کے سر دفتر تھے۔ حاجی حیات علی دہلوی کے شاگرد تھے۔ جو خط شکست کے کامل تھے۔ گلستان خط شکست میں ان کی لکھی ہوئی قابل دید تھی۔ غدر میں تلف ہو گئی تھی۔ (۳)

شیخ رحیم الدین | خط نستعلیق میں کامل تھے۔ گلستان ایک رات دن میں لکھی وہ کتاب محررہ ۱۲۱۶ھ موجود ہے (۴)

حاجی حافظ ہادی علی | بنارسی نے تحصیل علم لکھنؤ میں کیا۔ قصبہ کاکوری میں دفن ہیں۔ ہفت قلم تھے ۱۲۳۴ھ سے مستقل قیام لکھنؤ میں تھا۔ آخر میں نابینا ہو گئے تھے۔ انہوں نے مولانا شاہ تراب علی قلندر کی مسہری کے لئے ایک چھت کپڑے کی بنوائی۔ اور اس پر نجات

---

(۱) قدیم ہنروران اودھ ص۳۲

(۲) سوانح اسلاف ص۱۴

(۳) تذکرہ کاملان رامپور ص۵۳

(۴) شمس التواریخ جلد دوم ص۱۷

داخل کے سورہ آیۃ الکرسی بخط نسخ لکھی، اور اس کے درمیان میں سورۃ اخلاص کا طغرا لکھا۔ نابینائی کے عالم میں یہ کمال تھا، کہ اس چادر کے لکھتے وقت حافظ عزیز حسن صاحب موجود تھے جن کا یہ قول ہے، کہ حاجی صاحب نے ان سے کہہ دیا تھا کہ جہاں سے حرف لکھوانا ہو، وہاں میرا ہاتھ رکھ دو، چنانچہ حافظ موصوف ہاتھ رکھ دیتے تھے، اور یہ لکھے جاتے تھے، وہ چھت اب تک کاکوری میں موجود ہے۔ (۱)

حسام الدولہ فقیر محمد خاں عہد شاہی میں گذرے، دستخطی صاد ایسے بناتے تھے کہ دس ہزار روپیہ کے انعام پر بھی ان کی طرح کوئی نہ بنا سکا (۲)

منشی عبد الحی سندیلوی یہ یکتائے روزگار خوش نویس عہد واجدی میں گزرے ہیں، یہ منشی عبد الستار سندیلوی خوش نویس کے بیٹے تھے، یہ واجدی دربار میں ملازم تھے، بعد انتزاع سلطنت مٹیابرج میں جا کر رہے، اور وہیں عمر ختم کی ان کے بیٹے منشی عبد العلی اپنے والد کی جگہ مقرر ہوئے، جن کے صاحب زادے منشی عبد الحق صاحب جج اور منشی عبد السمیع صاحب کلکٹر پنشنر ابھی زندہ ہیں۔ (۳)

میر بندہ علی مرتعش شاہی زمانہ کے خوش نویس تھے، ان کے ہاتھ میں رعشہ تھا، خط نسخ کے بڑے کامل استاد تھے، جب قلم ہاتھ میں لیتے تھے، تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ لوہے کی طرح ہاتھ سختی سے جم گیا ہے ان کی نظر خط کے پہچاننے میں ایسا کمال رکھتی تھی، کہ بڑے بڑے ان کا لوہا مانتے تھے (۴)

سید احمد طبا طبائی خط نسخ کے نہایت لاجواب خوش نویس تھے، قرآن شریف لکھا کرتے تھے، سید صاحب نے لکھنؤ میں انتقال کیا، اور مقبرہ ان کا راج گھاٹ میں دریائے گومتی پر تعمیر ہوا، چنانچہ وہ مزار پاکستان کا مرجع ارباب حاجت کا تھا، پھول اور چراغ اہل غرض لا کر روشن کرتے تھے۔ (۵)

نواب ضیغم الدولہ سید زین العابدین خاں انگریزی فارسی اردو اس قدر تیز لکھتے تھے کہ پندرہ منٹ میں سولہ صفحے لکھ سکتے تھے، کسی قدر فرانسیسی، جرمنی، ترکی اور روسی زبان بھی جانتے تھے، اور علم جفر نوازش علی خاں اور امام علی خاں سے سیکھا تھا، نواب صاحب اردو زبان کے شاعر بھی تھے، اور بہت سے نوحے تصنیف کئے تھے

---

(۱) مشاہیر کاکوری ص۱۸۹

(۲) نامہ مظفری ص۲۷

(۳) تاریخ سندیلہ ص۳۵۳

فن شہ سواری اور نیزہ بازی سے خوب واقف تھے۔ اور بنوٹ میں تو فرد تھے۔ علم موسیقی میں تو نواب صاحب سمندر تھے۔ نور کا گلا پایا تھا۔ اگر تان پلٹا مارتے تھے۔ تو ایک ہزار قدم پر آواز پہنچتی تھی۔ ایسی ترکیب اور قطع منڈی [illegible] توحے پڑتے تھے۔ کہ باکمال ڈھاڑی بھی نہ پڑھ سکتے تھے۔ یہ راگ اور راگنی سے واقف تھے جس چیز کی فرمائش ہوتی فوراً سنا دیتے۔ دھرپد۔ آستائیاں۔ خیال اور دیگر چیزیں کثیر تعداد میں جانتے تھے۔ بلکہ خود تصنیف کرتے تھے۔ سچی بات یہ ہے کہ بارہ سو دھرپد اور دھمال کی تال کی، اٹھارہ سو بولیاں معلوم تھیں۔ فارسی، پنجابی، بنگلہ زبان کے گیت اچھی طرح جانتے تھے۔ انگریزی راگ راگنیوں اور دھنوں میں ایسی نفاست سے گاتے تھے۔ کہ سننے والے پھڑک جاتے تھے۔ علاوہ اس کے ستار، سرنگھار، سارنگی، طبلہ، پکھاوج۔ بانسری، ڈھول، پیانو ہارمونیم وغیرہ خوب بجاتے تھے۔ اور بین ایسی بجاتے کہ انسان سن کر غش غش کر جاتے (۱)

---

(۹)

فنکار

مختلف قسم کے فنکاروں کا ایک گلدستہ:۔

اکلیل العلما مولوی سید محمد محسن

کشمیری مشہور قاری تھے۔ مٹیا برج میں سرکار واجد علی شاہ سے وابستہ تھے (۲)

ایک باکمال قاری

یہ باکمال قاری شاہد سرائے معالی خاں کے رہنے والے تھے۔ ایک بار وہ عرب لکھنؤ آئے۔ اور ان کو تمام قاریوں کا امتحان منظور ہوا چنانچہ ہر ایک سے قرأت سنی۔ لیکن کسی کے کمال کے قائل نہ ہوئے۔ ان قاری کے کمال کی بڑی شہرت تھی۔ یہ بہت معمر ہو چکے تھے۔ دانت گر گئے تھے۔ قوت باقی نہ تھی۔ لیکن انہوں نے قرأت سنائی۔ ایک جگہ پر جہاں ص کو ع سے کسی لفظ میں ملایا گیا تھا۔ انہوں نے اس خوبی اور کمال سے قرأت میں ظاہر کیا کہ عرب وجد میں آگئے اور کھڑے ہو گئے اس کے بعد انہوں نے ستر طریقہ پر اس ص اور ع کے ملانے کو قرأت میں ظاہر کر کے اپنے کمال سے مبہوت کر دیا۔ (۳)

---

(۱) تاریخ قیصری ص۱۲۰ تا ۱۲۱

(۲) قدیم ہندوستان اودھ ص۹۰

(۳) قدیم ہندوستان اودھ ص۹۱

قرأت وتجوید کے فن کاروں کا تذکرہ بہت مختصر تھا۔ اب اس کے بعد دوسرے قسم کے فن کاروں کا کمال دیکھئے اور حیرت کیجئے کہ لکھنؤ کے باکمال کہاں سے کہاں تک پہنچ گئے تھے

منشی لطف علی لکھنوی

داروغہ امام بخش غازی الدین حیدر کے باورچی خانہ کے داروغہ تھے۔ ان کا سب سے چھوٹا بیٹا منشی لطف علی لکھنؤ میں موم کے کام کا پہلا شخص گزرا ہے۔ محمد علی شاہ کے عہد میں مومی ضریح اسی نے پہلے پہل بنا کر پیش کی۔ عہد حکومت واجد علی شاہ میں لطف علی نلیشوں میں نوکر تھے۔ بعد انتزاع سلطنت پھر کسی کی نوکری نہیں کی ۱۹۵۶ء میں منشی لطف علی مر گئے (۱)

کلّن خان لکھنوی

محمود نگر میں رہتے تھے۔ واجدی عہد کے تھے۔ غدر کے بعد مرے۔ معمولی پتھر کے دانے کو صاف کر سودانہ کا کنٹھا بنایا تھا۔ اسے اپنے ہاتھ میں رکھا کرتے تھے۔ جس نے دیکھا اس نے یہی سمجھا کہ سلیمانی پتھر ہے۔ بڑے بڑے جوہری نہ پہچان سکے۔ کلن خان دو پلکا ایسا بناتے تھے۔ کہ بڑے بڑے مبصر دھوکا کھا گئے۔ اور بمبئی والوں کا تو منہ ٹپوا دیا بیسنکڑوں دو پلکے سچے کہہ کر بیچ دیئے۔ بے مثل کاریگر تھے۔ دو رتی کے نگینہ کو کئی رتی کا بنا کر بیچ لیتے تھے۔ (۲)

دُلّی لکھنوی

واجدی عہد کا تھا مشہور ہے کہ ایک انگریزی برسٹر قیمتی جوتا لندن سے لے کر لکھنؤ تشریف لائے معلوم نہیں کیا اتفاق ہوا کہ صاحب کے ایک پیر کا جوتا کھو گیا۔ لکھنؤ بھر میں ایسا جوتا نہ بن سکا۔ آخر دلی کو بلوایا اور کہا کہ ایسا ہی جوتا ایک پیر کا بنوا دو۔ جو مانگو گے دیا جائے گا۔ دلی نے کہا اسی روپے لوں گا۔ اور اسی میں ملا دونگا۔ اور آج کے آٹھویں دن جوتا دے دوں گا۔ بیرسٹر صاحب نے اسے منظور کر لیا۔ اس نے آٹھویں دن جوتا سامنے لے جا کر رکھ دیا۔ بیرسٹر پہچان نہ سکے کہ کون سا جوتا بنا کر لایا ہے صاحب نے اسی روپے کے علاوہ اور زیادہ انعام دیا۔ ایک دن بیرسٹر مذکور اسی جوتا کو کہیں پہن کر تشریف لے گئے۔ جب گھر آئے تو خدمت گار نے جوتا پیر سے اتارا۔ تو تلی الگ ہو گئی۔ اوپر کا حصہ الگ ہو گیا۔ صاحب بہت جھنجھلائے۔ اور دوسرے دن دلی کو بلایا اور کہا کیسا جوتا تم بنا کر لائے۔ کہ ایک ہی دن میں نکل گیا۔ دلی نے کہا کہ حضور کو کمال دکھایا ہے۔ جوتا تو سب کاغذ کی دفتی کا بنا ہے۔ بیرسٹر صاحب بہت خوش ہوئے اور دوسرا جوتا ویسا ہی بنوا کر اپنے یہاں رکھ لیا۔ (۳)

---

(۱) قدیم ہنروران اودھ ص ۱۹۲

(۲) قدیم ہنروران اودھ ص ۱۹۱

(۳) قدیم ہنروران اودھ ص ۱۹۳

جنرل سکندر حشمت

پرنس جواد علی خان واجد علی شاہ کے چھوٹے بھائی تھے۔ ان کے پاس سبز مخمل کا ایک تاج تھا جس پر سنہری ستاروں کا کام بنا تھا۔ وہ ذرا میلا ہو گیا جب یہ لندن میں تھے۔ تو انہوں نے لندن کے ایک بڑے کاریگر کو بلا کر کہا کہ ایسا تاج ہم کو بنا دو۔ اس نے کہا ایسا کام لندن میں نہیں بن سکے گا۔ یہ کام لکھنؤ کا تھا۔ اور تاج میں ستارے اس خوبی سے ٹانکے تھے، کہ تھوڑی دور سے ایک سفید کا ڈلا نظر آتا تھا۔ یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ ستاروں کا کام ہے۔(۱)

لکھنوی کاریگر کا کمال

نواب ملکہ جہان زوجہ ثانی محمد علی شاہ کے پاس ایک پازیب نہایت عمدہ صراحی دار موتیوں کی تھی۔ اور اس میں نگینے جڑے تھے۔ اس کو خاص لکھنؤ کے کاریگر نے نہایت صناعی سے بنایا تھا۔ صفت یہ تھی کہ جب پازیب کے پھول کو کھول دیجئے اور لچھے کو اوپر کھینچئے تو گٹے سے گھٹنے تک جالی دار جراب کی طرح پنڈلی کے چاروں طرف لپٹ جاتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا، کہ جیسے اس میں کوئی لچک دار سی شے لگی ہے اور جب بیچ کی کیل نکال لیجئے تو خود بخود پھسل کر گٹے پر آ کر لچھے کی طرح بن جاتی تھی۔ یہ پازیب شہزادی نواب امیر جہان بیگم کو ملکہ جہاں کے بعد ترکہ میں ملی تھی۔ جب شہزادی صاحبہ کابل کی لڑائی دیکھنے تشریف لے گئیں تو مکان میں چوری ہوئی اور مذکورہ پازیب چوری ہو گئی

نواب ملکہ جہان کے پاس ایک نہایت نفیس اور خوش نما حقہ لکھنؤ کے دستکار کا بنایا ہوا تھا۔ اس کا وزن سترہ سو روپیہ بھر تھا۔ یہ کل حقہ چاندی کا بنا ہوا تھا۔ جب حقہ پیا جاتا تھا۔ تو چڑیا یکے بعد دیگرے اپنے پیر اٹھاتی تھی اور چڑیا اپنی گردن ادھر ادھر پھیرا کر چوں چوں بولتی تھی اور اپنے بازوؤں کو کھول کر پر ہلاتی تھی۔ یہ چڑیا آم کے درخت پر بیٹھی تھی۔ جو چاندی کا بنا تھا۔ درخت میں کڑیاں بنائی تھیں۔ جن پر مینا کیا ہوا تھا۔ چوکی چاندی کی تھی۔ اس سے بیچوں بیچ نکلا تھا۔ چوکی کے چاروں کونوں پر چاندی کی ایک ایک پتلی تھی، اور بیچ میں چاندی کی ایک بڑی پتلی تھی۔ جس کے ہاتھ میں ایک حقہ تھا۔ اس پتلی سے کاریگر نے آم کا درخت نکالا تھا۔ پتلی کے ہاتھ میں جب نے دی جاتی تھی۔ اور اس میں مہنال لگائی جاتی تھی تو معلوم ہوتا تھا کہ پتلی حقہ پلا رہی ہے۔ ملکہ جہان نے اس حقہ کو حضرت مسٹر فلنڈل کیری MR. FUNDAL CAARRY ڈپٹی کمشنر لکھنؤ لندن کی نمائش میں بھیجا تھا۔ لندن سے ایک سارٹیفکیٹ آیا تھا۔ کہ ہندوستان سے اس بہتر نادر چیز نمائش میں نہیں آئی۔ یہ حقہ پرنس حیدر مرزا بہادر نے سترہ سو یا سترہ ہزار روپیہ کو جوالا پرشاد کے ہاتھ فروخت کیا۔ عدالتی

---

(۱) چمنستان مظفر ص۹۰

کا غفات میں حقہ کا ذکر موجود ہے اور داروغہ میر سید محمد مرحوم ساکن گھڑیال نے اسے دیکھا تھا، جو ملکہ جہان کی حقیقی بہن کے نواسے تھے۔ (۱)

رام دیال گھڑی ساز ولد میرم سنگھ لکھنوی سخن تخلص تھا۔ آتش کا شاگرد تھا۔

نگاہ یار سے بچنا ہے اسے سخن دشوار
پڑا ہے دشمن جان سے مقابلہ دل کا (۲)

مرزا عبد العزیز لکھنوی چوب داری محلہ یا محمود نگر میں رہتا تھا۔ واجدی عہد کا تھا۔ کوئی دس سال ہوئے مرگیا۔ نظیر آباد میں اس کی دوکان بندوق بنانے کی تھی۔ ایک مرتبہ اس نے دونالی بنوائی۔ کل پرزے کندہ اور نال اپنے ہاتھ سے تیار کی۔ اور نواب مرزا جعفر علی خاں صاحب رئیس شیش محل کے روبرو پیش کی۔ نواب مرحوم خود بڑے شوقین اور مبصر تھے، یہ بندوق بالکل ولایتی اور مشین میں ڈھلی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ نواب مرحوم نے مرزا مذکور کو کافی انعام دیا تھا۔ اس کا لڑکا بھی آبائی کام سے واقف ہے۔ عہد واجد علی میں ایسی توپیں بنتی تھیں جن کا گولہ بارہ کوس جاتا تھا (۲)

ملی لکھنوی واجدی عہد کا تھا، سعادت گنج میں رہتا تھا، غدر کے بعد مرا ہے، مشہور ہے کہ یہ اپنا کمال آٹھوں کے میلہ میں دکھاتا تھا۔ اس کا کمال یہ تھا۔ کہ جوتا پیر میں پہنے کوئی ٹکیس جار ہا ہے، ادھر اس نے زمین سے پیر اٹھایا، اس نے ایک پیر کا جوتا لے لیا، جب بغیر جوتے والا پیر زمین پر ٹکا اور دوسرا پیر اٹھایا۔ دوسرا جوتا بھی نکال لیا اس سہولت سے جوتا نکال لیتا تھا کہ مطلق خبر نہ ہوتی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد جوتا لا کر پیش کر دیتا اور لوگ خوشی سے انعام دیتے تھے (۳)

داروغہ غلام عباس واجدی عہد میں داستان گوئی کے ماہر تھے، داستان گوئی میں فن حسن عیاری کو ایسا بیان کرتے کہ شاید باید حسن کا نقشہ کھینچتے تو معلوم ہوتا کہ انہیں کا چہرہ حسن کی تصویر ہے اور بہت خوبصورت نظر آنے لگتے (۴)

رمضان علی واجدی کا عہد تھا، فواز گنج میں رہتا تھا۔ سانپ پکڑنے میں اپنا جواب نہ رکھتا تھا ہزاروں سانپ پکڑ ڈالے، ہمیشہ بائیں ہاتھ سے سانپ پکڑتا تھا اور کہتا تھا جو لوگ داہنے ہاتھ سے سانپ پکڑیں گے زک اٹھائیں گے۔ کیونکہ سانپ داہنے طرف سے منہ مارتا ہے اس کے

---

(۱) سراپا سخن ص۲۰۰
(۲) قدیم ہنروران اودھ ص۱۹۹
(۳) قدیم ہنروران اودھ ص۲۱۰
(۴) قدیم ہنروران اودھ ص۲۲۲

بہت سے شاگرد لکھنؤ میں موجود ہیں۔ بہت سے سانپ کاٹے ہوئے لوگوں کو اس نے اچھا کیا۔ جھاڑنے کا طریقہ یہ تھا کہ جس کو سانپ نے کاٹا۔ اس کا کوئی عزیز پکارا ہوا چلا۔ کہ اٹھو ڈنگ جاگو جب رمضان سنتا اس آدمی کو اپنے پاس بلاتا اور کچھ پڑھ کر ایک طمانچہ یا چپت اسی کو مارتا۔ وہ غش کھا کر گر پڑتا۔ اور جس کو سانپ نے کاٹا تھا۔ وہ جہاں ہوتا، اٹھ بیٹھتا تھا۔ بعد کو جیسے غش آگیا تھا۔ وہ اپنی اصلی حالت پر آجاتا تھا۔ میرے سامنے کتنی بار ایسا اتفاق ہوا۔ ایک بار اخبار ہمدم میں سید جالب صاحب مرحوم ایڈیٹر کے زمانہ میں میں نے اس کے کمال کو چھپوا دیا تھا۔

ایک بار رمضان علی ایک سیاہ اور پتلا سانپ اچاری میں بند کر کے دکھانے لایا۔ بالشت بھر کا سانپ تھا۔ جو نہایت زہریلا تھا۔ اس سانپ کو پھن کو چھوڑ کر باقی سارا حصہ عباسی رنگ کا رنگ دیا۔ اور افریقہ سے ایک انگریز سانپ خریدنے لکھنؤ آیا تھا۔ اس سانپ کو سو روپیہ میں مول لیا۔ وہ انگریز یہ نہ سمجھ سکا۔ کہ یہ رنگا ہوا سانپ ہے پانچ سال کے قریب عرصہ ہوا کہ رمضان علی نواز گنج میں بخار سے مر گیا (۱)

آغائی مرزا لکھنوی عہد شاہی کے تھے۔ محلہ ناگاؤں میں رہتے تھے۔ چھڑ اٹھانے میں تمام ہندوستان میں ان کی شہرت تھی۔ جسم کے تمام حصوں پر چھڑ رکھا کرتے تھے کہ ناخنوں اور گھاٹیوں پر بہت لمبی چھڑ کو اٹھانے اور سنبھالنے کے علاوہ تلوار دانتوں میں پکڑ کر اس کی دھار پر چھڑ کو اٹھاتے اور سنبھالتے تھے، ۸ اور ۹ اکتوبر ۱۹۲۹ء کی درمیانی شب میں فالج سے انتقال کیا (۲)

محمدو گل باز واجدی عہد کے تھے۔ ان کے دونوں رخساروں پر شاہی میں چوری کرنے کی سزا میں گل دیئے گئے تھے۔ اسی وجہ سے مشہور ہو گئے تھے۔ ایک دن محمدو اپنے لڑکے کو گود میں لے کر گزر رہے تھے ایک مہاجن کی دوکان پر جڑاؤ پنکھیا رکھی تھی۔ ان کا بیٹا پنکھیا کو دیکھ کر رونے لگا کہ میں لوں گا۔ محمدو نے مہاجن سے کہا کہ بھائی پنکھیا دے دو میں لڑکے کو بہلا کر ابھی دے دوں گا۔ مہاجن نے کہا ہم نہیں دیں گے۔ محمدو نے کہا۔ بہت اچھا اس کو ہوشیاری سے رکھئے گا۔ یہ کہہ کر چلے آئے۔ اور رات کو جا کر پنکھیا چرا لائے۔ اور تیسرے پہر کو چوک آکر پنکھیا مہاجن کے سامنے رکھ دی (۳)

---

(۱) قدیم ہنرروان اودھ ص۲۱۹

(۲) روزنامہ لکھنؤ جمعہ ۱۱ اکتوبر ۱۹۲۹ء جلد ۱۳ نمبر ۲۳۶ صفحہ ۵ کالم

(۳) قدیم ہنرروان اودھ ص۲۱۷

میر محمد علی لکھنوی محمد علی شاہ کے عہد میں تھے۔ انہوں نے طوطوں سے کبوتروں کا کام لیا۔ اور بڑا کمال حاصل کیا۔ طوطا فطرتاً بے وفا جانور ہوتا ہے، وہ پنجرے سے نکلتے ہی اڑ جاتا ہے، لیکن خدا جانے میر صاحب نے کونسا افسوں دم کر دیا تھا کہ طوطے کی فطرت بدل دی تھی۔ یہ دس بارہ طوطوں کی ٹکڑی اڑاتے تھے اور کیا مجال کہ وہ اتر کر پنجرے میں نہ جائیں۔ میر صاحب روز حسین آباد میں آکر طوطوں کی ٹکڑی اڑاتے تھے۔(۱)

مرزا قین واجدی عہد کے تھے، مفتی گنج میں رہتے تھے۔ اور مرزا قین کے نام سے مشہور تھے۔ یہ زیادہ تر کبوتر بازی پالا کرتے تھے۔ ایک دن گنگنی شوکل کے تالاب سے ایک کبوتر باز ان کے پاس آئے اور کہا حضور جانوں کہ آپ کے کبوتر میرے کبوتروں سے گنگنی شوکل کے تالاب پر لڑیں۔ انہوں نے کہا آج کے تیسرے دن اڑاؤں گا اور اپنے ٹھاٹھر سے دو کبوتر نکال کے آنجناب کو دیئے۔ کہ ان کو لے جا کر تھوڑی دیر کے لئے ٹھاٹھر میں چھوڑ دیجئے اور اس کے بعد اڑا دیجئے گا۔ وہ کبوتروں کو لے گئے۔ اور حسب ہدایت عمل کیا۔ دونوں کبوتر اڑتے مفتی گنج چلے آئے۔ مرزا قین نے تیسرے دن ان دونوں کبوتروں کو اپنے دیگر کبوتروں کے ساتھ اڑایا۔ اور گنگنی شوکل کے تالاب کی طرف ہانکا۔ پہلے والے دونوں کبوتر آگے آگے باقی کبوتر پیچھے پیچھے اڑتے ہوئے گنگنی شوکل کے تالاب پر پہنچے اور ان کے کبوتروں سے لڑے اور ان کے دو کبوتر لے ہوئے مفتی گنج آئے۔ مرزا قین نے ان دونوں کبوتروں کو مار لیا۔ دوسرے دن وہ آکر وہ اپنے دونوں کبوتروں کو لے گئے اور ان کی استادی کے قائل ہو گئے۔(۲)

مرزا علی عباس نواز گنج میں رہتے تھے اور واجدی عہد کے تھے۔ ان کا کمال یہ تھا کہ اپنے گھر کے پالو کبوتروں میں سے کوئی ایک لے لیا اور گھر میں کسی سے کہہ دیا کہ جب یہ کبوتر کوٹھے پر آکر بیٹھے تو اور کبوتر جو ٹھاٹھر میں بند ہیں انہیں کھول دینا یہ کہہ کر کبوتر ہاتھ میں لے کر چلے اور کسی رئیس کے یہاں آئے اور ان کے کوٹھے پر گئے اور اس کبوتر کو ان کے ٹھاٹھر میں بند کر دیا اور پھر کھولا۔ کبوتر نکل کے ٹھاٹھر پر بیٹھا۔ انہوں نے اسے اڑا دیا۔ وہ اپنے گھر پر آکے ٹھاٹھر پر بیٹھ گیا۔ جب حسب ہدایت گھر میں کسی نے ان کے ٹھاٹھر کی کھڑکی کھول دی سب کبوتر نکل کر بیٹھے، وہ پہلے والا کبوتر اڑا آگے آگے اور وہ پیچھے بقیہ سب کبوتر اڑتے ہوئے وہاں پہنچے جہاں سے مرزا صاحب نے اسے اڑا تھا۔ انہوں نے دانہ ڈال دیا۔ سب کبوتروں نے کھایا۔ مرزا صاحب کوٹھے سے اتر کر نیچے آئے کبوتر سب کے سب اپنے گھر چلے گئے۔ دوسرا کمال

---

(۱) گذشتہ لکھنؤ ص ۱۵۸

(۲) قدیم ہنروران اودھ ص ۲۱۰

ان کا یہ تھا کہ اپنے سب کبوتر شہر بھر میں جہاں چاہتے لے جاتے اور کسی نواب یا رئیس کے کوٹھے پر انہیں لے جا کر اڑاتے یا اڑاتے۔ جب نواب صاحب تماشا دیکھ چکتے۔ تو وہی دانہ جو یہ اپنے کبوتروں کو دیا کرتے تھے نواب صاحب کے کوٹھے پر ڈال دیتے اور اپنے گھر چلے آتے۔ جب کبوتر دانہ کھا چکتے۔ پھر کسی کے اڑائے نہ اڑتے اور سیدھے اپنے گھر پلٹ آتے۔

تقیہ اکمال ان کا یہ تھا کہ لکھنؤ سے بمبئی گئے اور وہاں کبوتر خریدے اور پنجرے میں سب کو بند کیا۔ اور جہاز پر کربلائے معلےٰ روانہ ہوئے۔ جہاز چھوٹا انہوں نے پنجرہ کبوتروں کا کھول دیا۔ کبوتر اڑ رہے ہیں۔ جہاز چلا جاتا ہے۔ جب سیٹی دی اور کہا کبوترا اپنے پنجرے میں آ کر بیٹھ گئے۔ پورے سفر میں یہی تماشا کرتے گئے معلوم نہیں کونسی گولی کبوتر کو کھلا دیتے تھے اور دانے میں کونسی دوا ملا دیتے تھے۔ کسی کو بتایا نہیں اپنا کمال اپنے ساتھ قبر میں لے گئے (۱)

مختلف قسم کی بازیاں

شاہان اودھ کے زمانہ میں مختلف درندوں اور پرندوں کو خاص عنوان سے تعلیم دے کر لڑاتے ہیں صدہا کاملین گزرے۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ اس فن میں جیسے کرشمے اور تماشے سواد لکھنؤ میں دیکھے گئے، ہندوستان کیا ساری دنیا میں نہ دیکھے گئے ہوں گے۔ یہ سوق تین طرح پورا کیا گیا۔

(الف)

قسم اول جانوروں کو لڑانا

(۱) شیر
(۲) چیتے
(۳) تیندوے
(۴) ہاتھی
(۵) اونٹ
(۶) گینڈے
(۷) بارہ سنگھے
(۸) مینڈھے

---

(۱) قدیم ہندوستان اودھ صفحہ ۲۱

(ب)

طیور کو لڑانا اور اڑانا یا ان سے تماشے کا ظہور میں آنا۔ لڑانے والے طیور ہیں۔

(۱) مرغ

(۲) تیتر

(۳) بٹیر

(۴) لووں کی لڑائی

(۵) گلدم لڑانا۔

(۶) لال لڑانا۔

اڑنے والے طیور ہیں

(۱) کبوتر

(۲) طوطے

تماشا کرنے والے طیور ہیں

"بیا"

(ج)

(۱) تکل اڑانا۔

کنکوے اڑانا

چاند گنج کے راستے میں ایک عظیم الشان وحشی خانہ جسے آج کل کے زمانہ کی اصطلاح میں زندہ جانوروں کا عجائب خانہ کہنا چاہئے۔ نصیر الدین حیدر نے آراستہ کرایا تھا۔ اس میں اس قدر کثیر اور عجیب اور مختلف اقسام کے جانور تھے جس کا اندازہ کرنا غیر ممکن تھا۔ بادشاہ کے پاس ایک شیر تھا جس کا نام "بھوریا" تھا یہ شیر کوہ ہمالیہ کے دامن میں واقع ایک موضع بھوریا سے پکڑ کر آیا تھا۔ اور اس وجہ سے اس کا یہ نام ہوا۔ بادشاہ کے یہاں ایک چیتا "لگرا" نامی بڑا گراں ڈیل تھا۔ بہت سی لڑائیاں جیتے ہوئے تھا۔ اس کی کھال پر دھاریاں نہایت خوشنما تھیں۔ ایک ہاتھی صرف ایک دانت کا ایسا زبردست اور کوہ پیکر تھا کہ تنہا اس نے سو مرتبہ لڑائی میں فتح حاصل کی تھی۔ اس کا نام "ملیر" تھا۔ ایک گھوڑا "مردم خور" کے نام سے مشہور تھا۔ کیونکہ وہ بہت سے لوگوں کو ہلاک کر چکا تھا۔ ایک کیت رنگ کا نڈر گھوڑا تھا جس کو شہسوار نے بھینسے تک نہ لا سکے۔ بلکہ خود زخمی ہو گئے ہاتھی کی لڑائی، مینڈھے کی لڑائی، مرغ کی لڑائی۔ اور دیگر جانوروں کی بازی کا رواج تھا۔ بٹیر بازی کی ابتدا لکھنؤ

ہیں نواب یمین الدولہ کے وقت سے ہوئی پہلے یہاں پنجابی بٹیرا لڑانے آئے تھے، پھر جب لکھنؤ والوں نے دلچسپی لی تو اس کو ایک مستقل فن بنا کے چھوڑا جانوروں کے علاج کے ہزارہا نسخے، لڑانے کے طریق اور جانوروں کو طرح طرح سکھا کر بازیوں میں شامل کرنا ایک شیوہ ہو گیا۔ ہزاروں آدمیوں کے لئے یہ روزی کا ذریعہ نکل آیا۔ آصفی عہد میں مینڈھے لڑانے کا فن بھی بہت زوروں پر تھا۔ ہندوستان میں اس کا آغاز بلوچیوں سے ہوا اور رفتہ رفتہ یہ لکھنؤ میں بھی پھیل گیا۔ مرغ کی لڑائی کی ایجاد نواب شجاع الدولہ کے عہد میں ہوئی۔ نواب آصف الدولہ کو بھی مرغوں کی لڑائی کا شوق تھا۔ آصفی عہد میں ہاتھیوں کی لڑائی کا بھی چرچا تھا۔ دولت کی فراوانی تھی۔ امراء کے لئے یہ تفریح کا ذریعہ تھا اور بہت سے غرباء اس میں پلتے تھے اور جانوروں کے سکھانے اور ان کو بنانے میں طرح طرح کی حکمتوں اور ریاضتوں کی نمائش ہوتی تھی (۱)

قائم علی نقال عہد واجدی کا بہت باکمال نقال تھا۔ جو محلہ محمود نگر میں رہتا تھا۔ نواب حضور عالم معہ اپنی زوجہ نواب محل گوہر آرا بیگم کے قائم کی سبیل دیکھنے آئے۔ ان معززین کو دیکھتے ہی قائم سامنے آیا اور ہاتھ جوڑ کر کہا کہ خدا نواب صاحب کو سلامت اور بیگم صاحبہ کو تا زیست رکھے اتنا سخت فقرہ تھا مگر انعام دینے کے سوا چارہ نہ تھا۔ قائم کا کمال یہ تھا۔ کہ ایک مرتبہ ساڑھے تین گھنٹے تک طرح طرح کے منہ بناتا رہا (۲)

---

(۱۰)

حکیم اور جرّاح

بڑے بڑے حکیم اور جراح بھی اس عہد گرامی میں اپنا کمال دکھا کر زندہ جاوید ہو گئے۔

حکیم سید ہاشم علی خان موہانی حکیم سید کاظم علی کے بیٹے تھے، عہد شاہی کے تھے مولوی سید آغا علی صاحب رئیس جلالی ضلع علی گڑھ نے امتحاناً اپنی نبض حکیم صاحب کو دکھائی۔ حکیم صاحب نے گذشتہ آٹھ سال کے کل حالات نبض دیکھ کر بتا دیے انہوں نے سب کی تصدیق کی۔ حکیم صاحب شرط کر کے دن اور ساعت اور مقرر کر کے مریض کا علاج کرتے تھے (۳)

---

(۱) قدیم ہنروران اودھ صفحہ ۲۰۹ (۲) گذشتہ لکھنؤ صفحہ ۱۸۱

(۳) سوانح عمری علامہ کنتوری جلد اول و یادگار محسن

حکیم پناہ علی عہدِ واجدی کے تھے۔ نواب حضورِ عالم کے باغ کی پشت پر ان کا مکان تھا۔ نبض دیکھ کر بتا دیتے تھے کہ کیا مرض ہے۔ قیافہ شناسی میں ایسا کمال تھا کہ ایک دن اپنے مکان کے آگے کھڑے تھے کہ ایک نوجوان لڑکا ادھر سے جا رہا تھا۔ اس کو بلایا اور کہا کہ تم کبوتر اڑاتے ہو۔ اس نے کہا کہ جی ہاں۔ حکیم صاحب نے کہا کہ خبردار اب تو زور سے نہ کرنا۔ ورنہ مر جاؤ گے۔ لڑکے نے نہ مانا حسبِ معمول کوٹھے پر چڑھ کر کبوتر اڑائے اور زور سے قوکی، فوراً دم نکل گیا (۱)

حکیم غلام محمد خان یہ محمد علی خاں کے بیٹے تھے۔ ایک شخص وجع المفاصل میں مبتلا تھا۔ انہوں نے اس کے پیر کے انگشت کی فصد سے کر صرف دو قطرے خون کے نکالے۔ ورم اور درد جاتا رہا۔ اور پھر تمام عمر یہ مرض نہیں ہوا۔ یہ ضرور ہوا کہ اس طرف کا خصیہ آدھا رہ گیا۔ لیکن اس سے کوئی نقصان نہیں ہوا۔ حکیم صاحب نے کہا کہ اگر دو قطرے خون کے اور لئے جاتے۔ تو سارا خصیہ غائب ہو گیا مگر رجولیت کو کوئی صدمہ نہ پہنچتا۔ (۲)

شاہ محمد حسین صابری یہ فنِ جراحی میں اپنا مثل نہ رکھتے تھے۔ رام پور میں ان کا مقابلہ کبھی بار ڈاکٹروں سے اس طرح ہوا کہ پھوڑے میں ریم (ریپ) کا ہونا۔ ڈاکٹروں نے تسلیم نہیں کیا صابری نے آنکھوں پہ پٹی باندھ کر ریم کی جگہ انگلی رکھ دی اور شگاف دینے کے بعد سے ریم نکلی (۳)

مولوی اس نام کا ایک جراح تھا۔ جو عہدِ واجدی کا تھا مفتی گنج میں رہتا تھا۔ امراؤ مرزا صاحب کی داہنی آنکھ میں ناسور ہو گیا تھا۔ ڈاکٹروں اور حکیموں کا علاج کر کے ان کے والد تھک گئے۔ ایک دن مولوی نے ان کے والد سے کہا کہ اپنی بقیہ میں میری قبر کا وعدہ کیجئے۔ تو چند دن میں آپ کے لڑکے کو اچھا کر دوں گا۔ انھوں نے وعدہ کیا اور تیرھویں دن بالکل اچھا کر دیا۔ (۴)

کالے بھگت شاہجہان پوری قوم کے بنئے تھے۔ جڑی بوٹیوں سے علاج کرتے تھے تمام عمر مجرد رہے۔ مہاراجہ گوالیار کو موٹاپے کی بیماری تھی کسی سے فائدہ نہ ہوا۔ کالے بھگت کے علاج سے دو دن میں موٹاپا دور ہو گیا۔ انھوں نے دس ہزار روپیہ اور تحائف پیش کئے مگر آپ نے انکار کر دیا۔ (۵)

---

(۱) قدیم ہنروران اردو ص ۹۵

(۲) تاریخ شاہجہانپور ص ۲۰۳

(۳) تذکرہ کاملان رام پور

(۴) قدیم ہنروران اردو ص ۹۵

(۵) تاریخ شاہجہان پور ص ۲۵۳

پیربخش دریاآبادی رمضانی کے خاندان سے تھا۔ حجامت ایسی بناتا تھا۔ کہ تین چار دن تک کھونٹی نظر نہیں آتی تھی۔ علاوہ اس کے یہ استرے کی باڑھ سے کپڑے پر چکن کا کام ایسا بناتا تھا کہ بیل بوٹے ابھر آتے تھے، جو ایک ہفتہ سے زائد رہتے تھے۔ لیکن اگر کپڑا مہینوں نہ دھویا جائے تو نشان برابر رہتا تھا۔ شروع انگریزی عہد تک زندہ تھا۔(۱)

شیخ عابد حسین عرف عمدو لکھنوی واجدی عہد کا تھا، اور مفتی گنج میں رہتا تھا۔ اس کا کمال یہ تھا۔ کہ ناخن گری ہاتھ میں لی، اور دریا میں اتر گیا، اور غوطہ لگایا، اور دونوں ہاتھ پانی کی سطح کے اوپر نکالے، اور کسی دوسرے شخص کی انگلیوں کے ناخن کاٹ دیئے اور مجال کیا کہ چرکا لگ جائے، یا کوئی ناخن کٹ جائے (۲)

شیخ عابد حسین عرف عمدو لکھنوی عہد واجدی کا تھا، مفتی گنج میں رہتا تھا۔ اس نے جراحی اور حجامی دونوں میں کمال حاصل کیا تھا۔ جراحی کا کمال یہ ہے کہ ایک مرتبہ باہر سے ایک ہندو زمیندار لکھنؤ آئے۔ ان کی ران میں زخم پڑ گیا تھا، جو کسی طرح اچھا نہ ہوتا تھا۔ ڈاکٹروں نے کہا کہ ٹانگ کاٹی جائے گی، زخم کے اندر کیڑے پڑ گئے ہیں اور اگر ٹانگ نہ کاٹی گئی تو مر جائیے گا۔ زمیندار ٹانگ کٹوانے پر راضی نہ ہوا اور عمدو کو بلوایا۔ عمدو نے کہا کہ ٹانگ کاٹنے کی ضرورت نہیں۔ ڈاکٹر کی عمدو سے بحث ہو گئی ڈاکٹر نے کہا تم نہیں اچھا کر سکتے۔ عمدو نے شریفہ کی سوکھی پتیاں جلائیں اور اس کا دھواں زمیندار کے زخم کے اندر پہنچایا۔ ادھر دھواں اندر گیا، ادھر کیڑے بچ بچا کر باہر نکلنا شروع ہوئے۔ ڈھیروں کیڑے نکلے، اس کے بعد ہری شریفہ کی پتیاں ہتھیلی پر ملیں اور ان کا عرق زخم پر ٹپکا دیا۔ باقی سب کیڑے نکل گئے۔ چند دن میں مرہم لگا کر زخم بھر دیا۔ زمیندار کی ٹانگ اچھی ہو گئی۔ زمیندار نے عمدو کو بہت انعام دیا، اور ڈاکٹر صاحب جراح کے کمال کے قائل ہو گئے (۳)

لطفی مسلمان تیلی تھا۔ عہد واجدی کا تھا۔ مفتی گنج میں رہتا تھا۔ کولھا کر ہاتھ کسی کا ٹوٹ گیا۔ اس نے فوراً بٹھا دیا۔ عہد انگریزی میں ایک انگریز کے کتے کا کولھا اکھڑ گیا۔ وہ انگریز کتے کو لطفی کے یہاں لایا کہ اس کا کولھا بٹھا دو۔ لطفی کتے کو اپنے گھر کے اندر لے گیا اور اس کے پیٹ کے نیچے ایک لکڑی ڈالی اور اس طرح کتے کو اچھالا کہ کولھا بیٹھ گیا۔ اور انگریز سے کہا۔ کہ کتے کو بلائیے۔ صاحب نے آواز دی۔ کتا

---

(۱) تاریخ دریاباد

(۲) قدیم ہنرمندان اودھ صفحہ ۱۹۴!

(۳) قدیم ہنرمندان اودھ صفحہ ۹۹

اچھا خاصا چلا آیا۔ (۱)

(۱۱)

خیاط۔ درزی اور رنگریز

جامہ زیبی اگر ایک فن ہے تو جامہ تراشی اس سے بڑا فن ہے

عہد واجدی کا رنگ ریز

فتح گنج میں رہتا تھا۔ ایک دفعہ اس نے نفیس کپڑوں کا ایک گرڈل (پٹی) بنایا اور ایک طرف اسے سرخ رنگا اور دوسری طرف سے سبز رنگ کر میٹکاف صاحب ڈپٹی کمشنر کے بنگلہ پر بھیجا۔ اور گرڈل پیش کیا۔ ڈپٹی کمشنر گرڈل دیکھ کر نہایت خوش ہوئے۔ اور کہا کہ ہم نے ایسا کاری گر کہیں نہیں دیکھا۔ کہ ایک ہی کپڑے کو ایک طرف سے سرخ رنگے اور دوسری طرف سے سبز۔ زبانی خان بہادر مرزا علی سجاد حسین صاحب لکھنوی کلکٹر علی گڑھ (۲)

شیخ الٰہی بخش و شیخ محمد علی

یہ دو سگے بھائی سعادت گنج میں رہا کرتے تھے۔ الٰہی بخش عہد نصیری کا باکمال خیاط تھا۔ اگلے زمانہ کا انگریزی وضع کا کلی دار کوٹ بے مثل سیتا تھا۔ عہد نصیر الدین حیدر میں لارڈ کامبر میر کمانڈر انچیف لکھنؤ تشریف لائے تھے اور ان کی پیشوائی بادشاہ نے بطریق شاہی کی تھی۔ جب کمانڈر انچیف بادشاہ سے ملنے تشریف لائے تو اس وقت بادشاہ شیخ الٰہی بخش کے ہاتھ کا سبز مخمل کا سیا ہوا کوٹ پہنے تھے۔ الٰہی بخش نے کوٹ کی کلیاں اس طرح سے ٹانکی تھیں کہ جب بادشاہ کوٹ پہن کر کمانڈر انچیف کے سامنے ہوا کے رخ پر کرسی پر بیٹھے اور ہوا کوٹ میں لگی تو معلوم ہوا کہ انار چھوٹ کے رہ گیا۔ کمانڈر انچیف نے بادشاہ سے پوچھا۔ کہ یہ کیا چیز ہے۔ جو بار بار اپنی چمک سے دکھاتی ہے۔ بادشاہ نے جواب دیا کہ میرے درزی نے کوٹ کی کلیاں اور سیون کچھ اس ترکیب سے رکھی ہے کہ جب ہوا لگتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ گلدستہ ایسا کھل گیا۔ کمانڈر انچیف نے درزی کے کمال کی تعریف کی۔ یہی الٰہی بخش واجد علی شاہ کی دو پلڑی ٹوپی سیا کرتا تھا۔ اور فی ٹوپی بادشاہ ایک اشرفی دیتے تھے۔ اس ٹوپی میں صنعت یہ تھی کہ جہاں پر سیون کے دونوں پلے ایک دوسرے سے

(۱) قدیم ہنر مندان اودھ صفحہ ۹
(۲) قدیم ہنر مندان اودھ صفحہ ۹۴

(۱۲)

باورچی اور رکاب دار

بادشاہ کا محل ہو، یا رئیس کی محلسرا، یا سرمایہ دار کی حویلی، یا متوسط طبقہ کے کسی آدمی کا گھر، سب کے ہاں دسترخوان پر جو کھانے چنے جاتے تھے، یا جو مٹھائیاں رکھی جاتی تھیں، ان میں جدت، لذت اور تنوع کا پہلو ہمیشہ غالب رہتا تھا۔

کلّو | عہد واجدی میں ریوڑیاں بنانے میں مشہور تھے۔ (۱)

مسمّاۃ امیرن | عہد واجدی میں بے مثل حلوہ بنانے والی گندری ہے (۲)

نواب سید محمود حسین خان بہادر طباطبائی | عہد واجدی میں ناصری پلٹن کے کیمدان تھے۔ آم کی گری ایسی چھیلتے تھے کہ اگر مرغی کے انڈوں میں ملا کر رکھ دی جاتی تھی، تو کوئی پہچان نہ سکتا تھا۔ انہوں نے اپنے چھوٹے بیٹے نواب سید سجاد حسین خان کو گری کا چھیلنا سکھایا تھا۔ اور ان میں بھی یہی کمال تھا۔ نواب محمود خاں صاحب خوش خط تھے۔ اور تربوز کی قندیل بناتے تھے۔ اس طرح سے کہ تربوز کو کھوکھلی کر کے اس کے چھلکے کے اوپر چاقو کے مہین پھل کی نوک سے طغرے بناتے اور جانور مثل گھوڑا ہاتھی وغیرہ بناتے، دیوالی میں تیل بھر کر منبج میں رکھتے۔ اور جلا دیتے، روشنی میں جانور اور لکھائی صاف نظر آتی تھی (۳)

شیخ فدا علی لکھنوی | عہد واجدی کا رکاب دار تھا۔ سرائے معالی خان میں اس کا مکان تھا عہد انگریزی میں اس نے اپنا کمال دکھایا تھا۔ مشہور ہے کہ فدا علی نے شیشہ کا ایک کنول بنا کر میز پر رکھا۔ اور لاٹ صاحب کو دکھایا۔ لاٹ صاحب نے فرمایا کہ تم نے شیشہ کو نہایت صفائی سے ڈھال کر بنایا ہے۔ اور کوئی بات اس میں قابل تعریف نہیں۔ فدا علی نے

---

(۱) قدیم ہنرمندان اودھ ص ۱۵۶
(۲) ظفر نامہ ص ۱۳
(۳) قدیم ہنرمندان اودھ ص ۱۵۵

ملا کے سیئے جاتے ہیں۔ سیون کے بیچ میں ایک مہین سا تار دید یا تھا۔ جو کمان کی طرح دونوں نکوں تک
جب بانکی ٹوپی بادشاہ سر پر لگاتے تو ایک طرف کی بھوں خفیف سے چڑھی رہتی تھی اس ٹوپی کی کاریگری لکھنؤ
کی تصویر والی بارہ دری میں واجد علی شاہ کی تصویر میں دیکھ لی جئے۔ اس تار کا نتیجہ تھا کہ دونوں نکے کھسکتے نہ تھے
بلکہ جمے رہتے تھے۔ محمد علی نے بھی اس ٹوپی کو سیا تھا۔

شیخ محمد علی کا کمال یہ تھا کہ پورے ایک تھان کا انگرکھا ایک ہی تاگے سے سیتا تھا۔ اگر تاگے کو پکڑ کر کھینچ لیجئے تو پورا انگرکھا کھل جاتا تھا۔ محمد علی ایسا بھی انگرکھا سیتا تھا کہ کاندھوں یا چو بغلوں میں جوڑ نہیں ہوتا تھا۔ آغا سید مجتبیٰ حسین خاں صاحب مرحوم نے اس کے ہاتھ کے بنے ہوئے انگرکھے پہنے تھے۔ محمد علی کے مقابلہ کے لئے ایک درزی فیض آباد سے آیا اور چار طرح سے برکا پائجامہ سی کر دکھایا۔ محمد علی نے سات طرح سے سی کر دکھایا وہ ان کی استادی کا قائل ہو گیا۔ محمد علی رضائی میں ایسی گوٹ لگاتا تھا کہ کسی کونے پر جوڑ نہیں ہوتا تھا۔ اس کے ہاتھ کی سی ہوئی رضائی ابھی تک نواب سجاد علی خاں صاحب عرف نواب صاحب ساکن تحسین گنج کے پاس موجود ہے۔ محمد علی سرصدری بھی بے مثل سیتا تھا۔ اس کے ہاتھ کی سی ہوئی سرصدریاں مجتبیٰ حسین خاں صاحب رئیس لکھنؤ پہنا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ نواب سجاد علی خان صاحب نے امداد علی خیاط سے زنانہ پائجامہ کو گوٹ کٹوائی۔ مگر گوٹ کہیں سے کم کہیں سے زیادہ کٹی۔ محمد علی نے اپنی آنکھوں پر پٹی بندھوائی اور قینچی ہاتھ میں کر گوٹ برابر سے کاٹ کے رکھ دی۔ امداد علی ان کی استادی کا قائل ہو گیا۔ محمد علی کا مذاق اور کمال بھی ملاحظہ ہو ایک مسماۃ نے محمد علی سے گرنٹ کا پائنچوں دار پاجامہ سلوایا۔ انہوں نے سی کر دے دیا۔ اب جو وہ پہنتی ہیں تو کولھوں کے اوپر پائجامہ نہیں چڑھتا عاجز ہو کر ان کو واپس کر دیا کہ یہ تنگ ہو گیا ہے اسے ڈھیلا کر دو محمد علی نے چور کلی میں خوب کلپ رکلف لگا دیا تھا اور بعض کلیوں میں چند ٹانکے اس طرح سے دیئے تھے کہ پائجامہ تنگ ہو گیا تھا۔ انہوں نے اسی وقت رومال کو ہاتھوں سے خوب مل دیا اور بعض کلیوں کے ٹانکے کھینچ لئے۔ اور توڑ دیئے۔ اب جو پائجامہ پہنا گیا۔ تو بالکل ٹھیک خوب ہنسی ہوئی۔ اور کمال کی تعریف کی گئی حقیقت امر یہ ہے کہ محمد علی کپڑا سینے میں اپنا جواب ہندوستان میں نہ رکھتا تھا۔ یہ زمانہ شاہی کا آخری باکمال خیاط تھا۔ تین سال کا عرصہ ہوا کہ محمد علی بعمر قریب سو برس کی عمر میں لاولد فوت ہوا۔ آخر میں سماعت اور بینائی میں فرق آ گیا تھا۔ عہد واجدی میں محمد علی کا اسم شاہی سحارعل میں تھا۔ (۱)

---

(۱) قدیم ہنرمندان اودھ ص ۱۶۳

مومی شمع کنول میں لگا کر دیا سلائی سے جلائی، روشنی نہایت صاف تھی، پندرہ منٹ کے بعد بجھا دیا۔ اس کے بعد کنول کا کسکاٹ چمچی سے توڑا۔ اور لاٹ صاحب سے کہا کہ حضور اسے نوش فرمائیے۔ لاٹ صاحب نے کہا کہ ہم شیشہ نہیں کھاتے۔ خود فدا علی نے لاٹ صاحب کے سامنے چبا کر کھایا۔ اور دیگر حضرات کو کھلایا۔ اور لاٹ صاحب سے کہا کہ کنول حضور کی نذر ہے۔ یہ پورا کنول مصری کا بنایا تھا۔ لاٹ صاحب نے فرمایا۔ کہ کمال کی حد کر دی۔ اور انعام مرحمت فرمایا (۱)

واجد علی شاہ کے آخری عہد کا رکابدار

جب بادشاہ مٹیا برج میں رونق افروز تھے، تو ایک باورچی نے باغ میں نارنگی کے درخت میں چند نارنگیاں میں اس کمال کے ساتھ شیرہ اتار دیا تھا۔ کہ معلوم نہ ہوتا تھا جب بادشاہ نے نارنگی توڑی۔ اور رکابدار نے چھیل کر قاش پیش کی اور بادشاہ نے نوش کی۔ تو لب بندھے لگے۔ سونگھنے میں اس نارنگی سے بھینی بھینی تازگی کی خوشبو آتی تھی۔ نارنگیاں ذائقہ میں اصلی نارنگیوں کی طرح تھیں۔ اور رنگ و روپ میں اور ساس کی بات میں مطلق فرق نہ تھا (۲)

شیخ حیدر بخش

عہد واجدی کا باورچی تھا۔ جو تین سال ہوئے لکھنؤ میں مر گیا۔ پچانوے سال کے قریب اس کی عمر تھی۔ نواب مرزا محمد باقر علی خاں بہادر مرحوم رئیس شیش محل کا ملازم تھا۔ ایک بار نواب مرحوم نے نواب سید بنیاد حسین خاں صاحب جاہ مرحوم کو کھانے کے خوان بھیجے تھے جس میں کل کھانا مونگ کی دال کا تھا۔ روٹیاں سالن پراٹھے کباب پلاؤ وغیرہ یہ سب حیدر بخش نے مونگ کا بنایا تھا حیدر بخش انار پلاؤ اور قسر لیفہ پلاؤ پکاتا تھا۔ اگر اصلی اناروں اور شریفوں میں ملا کر اس کے ہاتھ کا بنا ہوا شریفہ اور انار رکھ دیجئے تو کوئی پہچان نہ سکتا تھا کئی بار اس کا امتحان ہو چکا تھا۔ حیدر بخش تین سو ساٹھ قسم کی روٹیاں پکانا جانتا تھا۔ ہاتھی کان روٹی ایسی پکاتا تھا۔ کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہاتھی کا کان کاٹ رکھا ہے۔ اور کھائیے تو کسی قسم کی گرانی نہیں حیدر بخش نکی بے شل لگاتا تھا۔ کہ ذرا سی ٹھیس میں ٹوٹ جاتی تھی (۳)

شیخ حسین علی دہلوی

پرنس مرزا آسماں قدر بہادر تیموری کا باورچی تھا شہزادہ موصوف واجدی میں بنارس سے لکھنؤ آئے۔ واجد علی شاہ نے ان کی دعوت کی

---

(۱) قدیم ہنر وران اودھ ص۱۵۵

(۲) قدیم ہنر وران اودھ ص۱۵۲

(۳) قدیم ہنر وران اودھ ص۱۴۸

تو دسترخوان پر ایک مربہ لا کے رکھا گیا، جو صورت میں نہایت نفیس اور مرغوب معلوم ہوتا تھا، یہ مربہ واجد علی شاہ کے باورچی کا تیار کیا ہوا تھا، جب مرزا آسمان قدر نے اس کا لقمہ کھایا، تو چکرائے، اس لئے کہ وہ مربہ نہ تھا، بلکہ گوشت کا نمکین قورمہ تھا، آسمان قدر کو ندامت ہوئی اور بادشاہ خوش ہوئے، چند دن کے بعد شہزادہ صاحب نے واجد علی شاہ کی دعوت کی، بادشاہ یہ خیال کر کے آئے تھے، کہ مجھے بھی ضرور دھوکا دیا جائے گا۔ مگر ہوشیاری پر بھی دھوکا کھا گئے، اس لئے کہ شیخ حسین علی نے یہ کمال کیا تھا۔ کہ دسترخوان پر صدہا الوان نعمت اور قسم قسم کے کھانے چنے ہوئے تھے، پلاؤ، بریانی، قورمہ، زردہ، کباب، ترکاریاں چٹنی، اچار، روٹیاں، پراٹھے، شیرمالیں وغیرہ مگر واجد علی نے جس چیز کو چکھا، شکر کی بنی ہوئی تھی، سالن تھا تو شکر کا، چاول تھے تو شکر کے، اچار تھا تو شکر کا، اور روٹیاں تھیں تو شکر کی، یہاں تک کہ برتن دسترخوان سلفچی آفتابہ تک شکر کے تھے، بادشاہ گھبرا گھبرا کر ایک ایک چیز پر ہاتھ ڈالتے تھے، اور دھوکے پر دھوکا کھاتے تھے۔ حسین علی لکھنؤ میں دفن ہوئے (۱)

شیخ فرحت علی

عہد واجدی کا باورچی تھا، حسین آباد میں رہتا تھا، کوئی تیرہ سال کا عرصہ ہوا کہ مر گیا۔ نقلیاں بے مثل بناتا تھا۔ روئے کی نقلی اس طرح کی بناتا تھا کہ جیسے چوسر کی گوٹ ہوتی ہے، نقلی کے اندر باریک کٹا ہوا بکری کے گوشت کا قیمہ تلا ہوا بھرتا ہے۔ اور نقلی کے اوپر زعفران لگاتا تھا، ایک روپیہ کی ڈھیر بھر دیتا تھا، ادھر نقلی منہ میں رکھی اور ادھر حلق سے اندر گئی۔ فرحت اللہ آم کے پراٹھے دودھ کی روٹی خوب پکاتا تھا، عم معظم نواب سید احمد حسین خان کے لئے اکثر پکا کر لایا کرتا تھا ایک بار لکھنؤ کے کسی معزز شخص سے لاٹ صاحب نے فرمائش کی کہ ہم نے لکھنؤ کے باورچیوں کی بہت تعریف سنی ہے۔ مگر ان کے ہاتھ کی تیار کی ہوئی کوئی چیز نہیں کھائی، آنحضرت نے فرحت اللہ سے کہا کہ کوئی چیز لاٹ صاحب بہادر کے لئے تیار کرو۔ فرحت اللہ نے کہا کہ ایک پوڑی پکاؤں گا، کہ لاٹ صاحب بہادر بہت محظوظ ہوں گے، فرحت اللہ بندر کا ایک بچہ لایا، اور اس کو افیون پلانا شروع کی، اور گھنٹہ دو گھنٹہ اس کو بالکل خاموش بیٹھنے کی عادت ڈال، جب وہ اس کا عادی ہو گیا۔ تو فرحت نے ایک بڑی سی پوری پکائی، جو ایک بڑی قاب میں رکھی تھی، اور پوری کا چھلکا خوب پھولا ہوا تھا، پوری کے ضلع میں بندر کے بچہ کو افیون پلا کر بٹھا دیا، قاب لاٹ صاحب کے سامنے میز پر رکھی گئی، لاٹ صاحب نے چھری اٹھا کر جوں ہی پھیری کی لاگ بچہ کے سر پر لگی، تیں تیں کرتا ہوا بھاگا۔ لاٹ صاحب بہت محظوظ ہوتے

---

(۱) قدیم ہنرمندان اودھ ص۱۷۲۔

فرحت اللہ نے دوسری قاب میم صاحبہ کے سامنے پیش کی میم صاحبہ نے چھری سے پوری کو تراشا تو اس میں لال نکل کر چوں چوں کرتے اڑ گئے۔ لاٹ صاحب نے سو روپیہ اور ایک شالی رومال فرحت اللہ کو انعام دیا (۱)

شیخ اکرم علی یہ شیخ محمد واصل سہارن پوری کے بیٹے تھے۔ اکرام علی اشرفی اور روپوں کا مربہ بناتا تھا تیار ہونے پر نقش و حروف مٹتے نہ تھے بلکہ جس عہد اور سن کا جو سکہ ہوتا تھا۔ وہ پڑھ لیا جاتا تھا۔ کھانے میں کسی قسم کی گرانی معلوم نہ ہوتی تھی۔ وہ کشتہ کا کام دیتا تھا، کلکتہ کی نمائش جو ۱۸۸۱ء میں ہوئی تھی اور نمائش لکھنؤ میں تمغے اور سارٹیفکیٹ ملے، جو اکرام علی کے پوتے شیخ اعظم علی رکاب دار کے پاس اب تک موجود ہیں۔ شیخ اکرام علی ایک ایسی روٹی پکاتا تھا کہ جس میں کئی مزے ہوتے تھے یعنی ایک طرف سے روٹی کو کھائیے میٹھی، دوسری طرف سے کھائیے تو نمکین تیسری طرف سے روکھی روٹی کا ذائقہ چوتھی طرف سے سلونی۔ یہ بالائی کی گلوری ایسی بناتا تھا کہ اصل اور نقل میں مطلق فرق نہ ہوتا تھا۔ اس کے اندر میوہ بھرتا تھا۔ اور بالائی کے اوپر کی پرت کی گلوری بناتا تھا۔ اور پستہ کے کیل لگاتا تھا۔ سبز رنگ ایسا رہتا تھا کہ پان معلوم ہوتا تھا۔ (۲)

(۱۴۳)

لکھنؤ کی صنعتیں

شاہان اودھ کی سرپرستی میں بالعموم، اور واجد علی شاہ کی سرپرستی میں بالخصوص لکھنؤ کی مخصوص اور منفرد صنعتیں خوب پھلیں پھولیں:۔

لکھنؤ گائڈ کے مؤرخ کا بیان ہے، کہ ۱۸۵۷ء سے پہلے تک لکھنؤ تجارت کا سب سے بڑا مرکز تھا خصوصاً شمالی ہندوستان میں تجارتی منڈی اتنی بڑی کہیں نہ تھی۔ لکھنؤ کے دستکار ہر قسم کے اشیاء نہایت صفائی اور نفاست سے تیار کرتے تھے، یہاں علم و ہنر کے صیغہ کو کمال کی حد تک پہنچا دینے میں کوئی دقیقہ فرد گزاشت نہیں کیا گیا، صنعت عامہ کی حالت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ چکن کاداری کا دچوب نہایت عمدگی سے بنایا جاتا تھا۔ اور اس کام کے لئے لکڑی کے چھاپے لوگ

---

(۱) قدیم ہنروران اودھ صنہ ۱۵۰ — (۲) قدیم ہنروران اودھ صفحہ ۱۵۲

بناتے تھے اور باہر کے لوگ خریدتے تھے۔ مٹی کے کھلونے ترکاریاں پھل وغیرہ تلتے تھے۔ اونی اور ریشمی کپڑے کا گہنا اور گوڈر کی گڑیاں خاص لکھنؤ کی عورتیں ایسی نفیس بناتی تھیں، کہ منہ سے بولنے کی کسر رہتی تھی جن کو لوگ بڑی خوشی سے مول لیتے تھے۔ یہاں شال میں رفوگری کا پتہ اور رنگ سازی ہوتی تھی۔ ہار سنگھار کی ڈنڈیوں سے رنگ تیار کیا جاتا تھا۔ سونے چاندی پیتل اور رانگے وغیرہ کا گہنا بنایا جاتا تھا۔ لکھنؤ کے بنے ہوئے تعزیے کثیر تعداد میں باہر جاتے تھے۔ دستی کپڑے کپڑے کے گہنے، چھاپے، ٹھپے۔ ٹوکریاں۔ ادھر کی لکڑیوں کے نرکل، اور بیت کے پٹارے۔ بیلن پیڑے۔ لکڑی کی کھڑاویں، کپھچیاں، باندھو، ستلی۔ مونڈھے، مٹی کے برتن وغیرہ اودھ میں بنتے تھے۔ فیض آبادی صندوقچے تمام ہندوستان میں مشہور تھے۔ لکھنؤ کے کارِ گرمخملی چوگہ، شبیہ ٹوپی، جوتے جوتیاں، مغرق گرگابیاں، کمخاب، کے جوتے، اوگھی، چمڑے کے ڈول مشک گنج مشکیں، پر۔ توئی، لچکا، کڑوا تیل، سرسوں کا تیل، گوڈر کی مشعلیں، گوڈر کے گیند، آتشبازی۔ تارکشی کا کام، روشنائی سازی، جھنوائی ٹولہ کے جھانوے، جہرکنی، کپڑے پر چھاپنے کا کام، موم کا کام چربی کی شمعیں، طوغلین لال سبز تبیاں، کاٹھ کی ڈبیاں، کلھیاں، دستے، سونڈھے، نواب یمین الدولہ کے عہد میں کپڑے کے گہنے، لکڑی کی تختیاں، کٹھرے کونڈے۔ لاکھ کی چوڑیاں، گڑگڑے، اچار، چٹنی، مربے مختلف پھلوں کے شربت، مداریہ حقہ جو خاص لکھنؤ کی ایجاد ہے، مشک عطر تیل، پھولوں کے گہنے، اٹاٹ کے بورے، کھجور کی چٹائیاں، سونے چاندی کے کٹے ہوئے ورق، بھاٹھ کی سینکوں کی خوشنما اور مضبوط کابکیں، بانس کی تیلیوں کے پنجرے، دھومی خاں کے بنائے ہوئے نیچہ، غلیل، کمان، دیسی بارود، ہاتھی دانت کا کام، نواڑ، پیچ، بند وغیرہ خالص لکھنؤ کی دستکاریاں تھیں۔ ان میں سے ہر ایک دستکاری اہلِ فن نے ہنرمندی کے دریا بہادیئے، جس کا اب نشان صرف تاریخ کے صفحوں پر ڈھونڈھنے سے ملتا ہے۔ اس طرح گھر کی بیٹھنے والی شریف مستورات، لچکا، ٹھپا، ٹھپکی، نبت ریز، بیلن وغیرہ بناتی تھیں، اور خاطر خواہ پیسے پیدا کرتی تھیں، چرخہ سے سوت کاتتی تھیں کھادی کے پلنگ پوش، سوسی کے تھان، بیجک کا تاگا سینے پرونے کے لئے، چھپائی ہر سال ٹھپے چھاپے جاتے تھے۔ کندلہ یعنی تارکشی یہاں کی صنعت عام تھی نصیر الدین حیدر کے زمانہ میں رنگ ریز ایسے صناع تھے، کہ جو پھول کہیے، کپڑے پر ہر رنگ کی تیار کردیں۔ لکھنؤ میں خصوصیت سے کلابتوں کا کام نہایت نفیس بنایا جاتا تھا...... نواب غازی الدین حیدر کی اختراع کی ہوئی کئی چیزیں ہیں، مثلاً کشتیاں کوئی مچھلی کی صورت کی اور کسی گھوڑے وغیرہ کی صورت بنی ہوئی تھی شکار کھیلنے کے ہاتھیوں کے حوضے اس طرح کے بنوائے، کہ شکاری جس طرف متوجہ ہو، اسی طرف حوضے کا رخ پھر جائے۔ بغیر طنابوں اور میخوں کے خیمے جو نصب کر دیئے جاتے اور ہوا سے بھی نہ گرتے

ہوا۔ شیخ احمد عرب یمنی مقرب بادشاہ تھے۔ انہوں نے مطبع سلطانی کھولا۔ اکثر کتابیں طبع ہوئیں۔ خاص کر بادشاہ نے اسے شاہ نامہ فردوسی کو چھاپنے کے لئے پچاس ہزار روپیہ عطا کیا۔ جس کو کپتان مکان نے بعد از اخراج اشعار اسدی وغیرہ انتخاب کیا تھا۔ واجد علی شاہ کے عہد تک فن طباعت کو اودھ میں بہت ترقی ہوئی۔ سلطانی مطبع میں ہزارہا کتابیں چھپ کر شائع ہوئیں۔ شیخ ممتاز حسین صاحب جونپوری سے معلوم ہوا کہ انہوں نے نستعلیق ٹائپ کی چھپی ہوئی کتاب عہد واجدی کی اردو نمائش واقع لکھنؤ میں دیکھی تھی۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے، کہ عہد شاہی میں اس فن میں، کتنی ترقی ہو چکی تھی جس کا اب پتہ نہیں۔ عہد امجد علی شاہ میں ہزاروں روپے خزانہ شاہی سے کتابوں کے چھاپنے کے لئے ملتے تھے۔ غازی الدین حیدر کے زمانہ میں ارسل نامی ایک یورپین نے پہلا مطبع لکھنؤ میں کھولا، اور پریس تیار کر کے چھاپنا شروع کیا۔ چنانچہ کتاب ہفت قلزم جو خود غازی الدین حیدر کی تصنیف ہے، شرح منازل، محامد حیدری وغیرہ اسی زمانہ میں تصنیف ہو کر طبع ہوئیں۔ ۱۲۶۳ھ میں خاص لکھنؤ میں بارہ چھاپے خانے لیتھو گرافی کے موجود تھے جس میں مطبع میر حسن اور مطبع مصطفائی بہت مشہور ہے۔

مطبع علوی:۔ یہ مطبع علی بخش خان نے عہد شاہی میں کھولا تھا۔

مطبع حاجی حرمین:۔ یہ مطبع عہد شاہی میں ایک حاجی حرمین شریفین نے کھولا تھا۔ اور اس میں دینی اور مذہبی کتابیں، ایسی چھپیں کہ اہل بصیرت کے نزدیک کہیں اور نہ چھپ سکیں۔

مطبع مصطفائی:۔ عہد شاہی کے آخری دور میں خیشہ آلات کے ایک دولت مند تاجر مصطفیٰ خان نے اس مطبع کو کھولا تھا۔ مصطفیٰ خان کچھ چھاپنے کے لئے حاجی حرمین کے پاس سے گئے، اور حاجی صاحب کی زبان سے کوئی ایسا سخت کلمہ نکل گیا، کہ مصطفیٰ خان نے اپنا مطبع جاری کر دیا، جسے غیر معمولی فروغ ہوا[1]

---

[1] ہنر زبان اردو صفحہ ۲۰

عہد شاہی لکھنؤ میں ایک نئی قطع کا جوتا ایجاد ہوا جس کو یہاں کے وضع داروں نے بہت پسند کیا۔ اس جوتے کو خوردنوکا کہتے تھے، یہ جوتے لال نری کے نہایت سبک اور صاف بنائے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ بعض موچیوں کے ہاتھ کا جوڑا چار پانچ پیسوں سے زیادہ نہ ہوتا۔ گرمیوں کے خشک موسم کے لئے کاشانی مخمل کے برسات کے لئے کم بچت کے بننا شروع ہوئے گیت بنانے کے بہت سے کارخانے جاری ہو گئے۔ چند دن کے بعد جوتوں کی آرائش میں اور ترقی ہو گئی۔ اور سلمہ ستارہ کے کارچوبی کام کے جوتے بننے شروع ہوئے جن میں منقیش کے پھندے لگا کے عجب چمک دمک اور آب و تاب پیدا کر دی جاتی۔ اس کے بعد جب چھوٹا سلمہ اور کلابتوں آیا تو چھوٹے کام کے چڑھویں جوتے بننے لگے۔ جو بہت سستے داموں کے آتے تھے۔ گھتیلا جوتی اور ادگھان یہاں کی ایسی کہیں نہ بن سکیں۔ ان کی مانگ اس قدر بڑھی کہ آبادی کا ایک معتد بہ حصہ انہی کی تیاری پر زندگی بسر کر رہا تھا۔ قبا۔ شال۔ دو شالے۔ رومال پہننے کا یہاں اتنا رواج ہوا کہ ہزاروں شال بننے والے رفوگر اور شال کے دھونے والے کشمیر چھوڑ کر یہاں آباد ہو گئے۔ لکھنؤ کے تمدن کے بدل جانے کا یہ اثر ہوا کہ صنعت عامہ کی اکثر چیزیں جو معاشرتی زندگی کے لئے ضروری تھیں۔ ان کا بننا اور بازار میں آنا اور فروخت ہونا بند ہو گیا۔ مثلاً دسترخوان پر ایک ظرف تانبے کا ایسا رکھا جاتا تھا جو آج کل چلمچی سے مشابہ ہوتا تھا اور اس میں دسترخوان کے کھانے والے ہڈیاں رکھتے تھے۔ اسے سلفدان کہتے تھے۔ اسی طرح پشت کھجلانے کے لئے ایک چیز پنجہ انسان کی شکل کی بنی ہوئی تھی اور جب پیٹھ کھجانے کی ضرورت ہوتی تھی، تو اس سے کام لیا جاتا تھا۔ اس کو پشت خار کہتے تھے۔ اب یہ چیزیں معدوم ہو گئیں۔ کہیں کہیں باوضع رئیسوں کے ہاں نظر آجاتی ہیں۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ محمد علی شاہ کے عہد میں لکھنؤ میں پن چکی بنائی گئی تھی۔ (۱)

(۱۴)

مطابع

پریس اور مطبع کی طرف بھی لکھنؤ نے بہت پہلے اور بہت زیادہ توجہ کی:۔

نصیر الدین حیدر کے عہد میں لکھنؤ میں لتھوگراف کا ایک چھاپہ خانہ اشاعت کتب کے لئے قائم

(۱) قدیم ہنرمندان اودھ ص۱۹

باب (۶)

عہد واجد علی شاہ کی شاعری

اور

شعراء

دلی کا زوال اور لکھنؤ کا عروج، ساتھ ساتھ ہوا۔ قانونِ قدرت بھی کچھ یہی ہے، ایک مٹتا ہے دوسرا بنتا ہے۔ ایک کی موت دوسرے کی زندگی کا سبب بن جاتی ہے۔

دریں حدیقہ بہار و خزاں ہم آغوش است
زمانہ جام بدست و جنازہ بردوش است

دلی کے زوال سے بہت زیادہ جو لوگ متاثر ہوئے، وہ فن کار تھے۔ ویسے ہی وہ کون سے فارغ البال اور خوش حال تھے۔ اس ادبار و انحطاط نے اور زیادہ انھیں تہی مایہ کر دیا۔ میر جیسا خوددار بلکہ متکبر شاعر، در در کی خاک چھانتا، لکھنؤ پہنچا۔ انشا جیسا نابغۂ وقت رنگین، دلی چھوڑنے کے بعد لکھنؤ جانے پر مجبور ہوا۔ سودا جیسا، شاعر باکمال و بے مثال اپنے وطن میں ڈنک سکا، لکھنؤ آیا، اور یہیں کا ہو رہا۔ اسی طرح اور بھی بہت سے ہنرور اور فن کار دلی سے اپنی لبا طا ٹھا کر چلے، اور لکھنؤ میں آکر سکون و اطمینان کی زندگی بسر کرنے لگے۔

اس صورت حالات کا نتیجہ یہ ہوا کہ لکھنؤ بہت جلد شعر و شاعری کا مرکز بن گیا۔ چنانچہ قدرتی طور پر اس کی کارگاہ ادب نے ٹکسال کی صورت اختیار کر لی۔ اس ٹکسال میں، الفاظ اور محاورے ڈھلنے لگے اور سکۂ رائج الوقت کی طرح بازارِ سخن میں رائج ہو گئے۔

واجد علی شاہ کا زمانہ اس اعتبار سے خاص طور پر یگانہ اور ممتاز ہے۔ اسی دور میں آتش اور ناسخ نے اصلاحِ زبان پر توجہ کی، نئی وضع قطع اور تراش خراش سے، زمینِ سخن کو آسمان بنا دیا۔ اس دور میں نہ صرف غزل گو اور غزل سرا استادانِ فن نظر آتے ہیں، بلکہ شعر و شاعری میں رنگا رنگی، تنوع اور ترقی پسندی کے جلوے بھی نظر آتے ہیں۔ نواب مرزا شوق نے، اپنی یگانۂ روزگار، نفسیاتی اور جذباتی مثنویاں اسی دور میں لکھیں۔ امانت نے اپنی اندر سبھا، اسی عہد میں سجائی اور واسوخت کی دوکان جمائی۔ انیس اور

دبیرؔ نے مرثیہ کو، شاعری کا سب سے اہم، اثر انگیز اور روح پرور شعبہ بنا دیا۔ ورنہ اس سے پہلے مشہور ہو گیا تھا، بگڑا شاعر مرثیہ گو"۔ حضور جان عالم واجد علی شاہ اخترؔ نے اپنی بے تکلف، بے ساختہ، اور بعد ان شاعری سے، دنیا ئے سخن میں کئی خوش نما اور دل آویز افسانے کئے۔ انہوں نے ہر صنف شاعری میں قدم رکھا، اور اپنی انفرادیت کبھی بھی ہاتھ سے نہیں جانے دی۔ غرض اس دور میں شعر و شاعری کا اگر جائزہ لیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ اس سے پہلے دلی و لکھنؤ کے کسی دور کے بھی شعر و ادب کی رنگا رنگی اور تنوع میں وہ بانکپن، وہ طرفگی اور رعنائی وہ ہمہ گیر نہیں آتی، جو عہد واجد ی کی بزم سخن میں دکھائی دیتی ہے۔ مرثیہ ہے وہ نصف النہار پر، غزل سرائی ہے وہ عروج پر مثنوی ہے، وہ کمال پر۔ غرض جس صنف پر نظر ڈالیئے یکتائی اور انفرادیت نمایاں سے نمایاں تر نظر آئے گی۔

قبل اس کے کہ میں عہد واجد علی شاہ کے شعراء پر گفتگو کروں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختصر طور پر دلی اور لکھنؤ کے فرق پر بھی ایک نگاہ ڈال لی جائے

یہ سچ ہے، دلی کی شاعری زیادہ تر سوز ہے، اور لکھنؤ کی شاعری بڑی حد تک ساز۔ وہاں درد و الم ہے، آہ و فغاں ہے، فریاد و شیون ہے، یہاں لطف و نشاط ہے، عیش و سرور ہے، تبسم ہے قہقہے ہیں، وہاں زندگی مری ہوئی، گھٹی ہوئی، سسکتی ہوئی نظر آئے گی، یہاں زندگی میں ہلچل ہے طوفان ہے، جوش ہے۔ وہاں ناکام حسرتیں ہیں، اور ان کا ماتم۔ یہاں لذت معصیت ہے اور سرور آفریں یاد۔

لیکن یہ فرق فن اور شاعری کا نہیں ہے، زندگی اور طرز زندگی کا ہے۔ فن تو ہر حالت میں یکساں رہتا ہے، خواہ اس کا تعلق موت کی ٹریجڈی سے ہو یا زندگی کی کامیڈی سے۔ شاعری بہر حال جذبات کی ترجمان ہے، خواہ وہ جذبات درد و الم کے ہوں، یا نشاط و طرب کے۔ فن کار کا کوئی مذہب و مسلک نہیں ہوتا، وہ تو ایک آئینہ ہوتا ہے، جو دیکھتا اور محسوس کرتا ہے، فاش و برملا بیان کر دیتا ہے۔ خواہ کسی بیوہ کا سوگوار چہرہ ہو یا کسی نئی نویلی دلہن کا مسرور و مخمور رخ روشن۔ بقول آسکر وائلڈ کے یہ دیکھنا بیکار ہے کہ چیز کیسی ہے، دیکھنا یہ چاہیئے، پیش کس طرح کی گئی ہے؟ شاعری خواہ الم کی ہو یا مسرت کی، فن ہے اور فن ہر حالت میں نکھرتا اور ابھرتا ہے۔ پھول اچھا ہے یا کانٹا اسے اس سے بحث نہیں۔ پھول کیسا ہوتا ہے اور کانٹا کیسا وہ صرف یہ دکھاتا ہے، اور اس طرح دکھاتا ہے کہ اصل اور نقل میں فرق نہیں رہ جاتا۔ لہذا فن کا جہاں تک تعلق ہے، وہ دلی اور لکھنؤ کی شاعری میں یکساں ہے۔ مختلف اس لئے ہے کہ دلی کی زندگی اور ہے لکھنؤ کی اور۔

فریادِ جنوں اور ہے بلبل کی فغاں اور
صحرا کی زباں اور ہے گلشن کی زباں اور

میں نے ابھی عرض کیا تھا دلی اور لکھنؤ میں فرق فن اور شاعری کا نہیں۔ زندگی اور طرزِ زندگی کا ہے۔ دلی ایک عرصہ دراز تک، یورشوں، یلغاروں، تباہیوں، آفتوں، مصیبتوں، خون ریزیوں اور سفاکیوں کا آماجگاہ رہا۔ لہٰذا وہاں کی زندگی سوز سے زیادہ قریب ہو گئی۔ لکھنؤ ایک عرصہ دراز تک ہر طرح کی تاخت و تاراج، یورش و یلغار، خون ریزی اور غارت گری سے محفوظ رہا۔ لہٰذا یہاں کی زندگی میں ساز ہے، نشاط ہے، لطف ہے۔ دلی اور لکھنؤ کی یہی کیفیتیں حدِ فاصل بن گئیں۔ لکھنؤ کی شاعری اپنے آب و رنگ کے اعتبار سے الگ ہو گئی۔ اور دلی کی جدا۔ لیکن اپنے اپنے حدود میں، یکسر آزاد اور مستقل!

دلی کی شاعری اور شعراء پر میں اپنی کتاب "بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد" میں گفتگو کر چکا ہوں، لہٰذا اس امر کی ضرورت نہیں۔ البتہ لکھنؤ کی شاعری اور شعراء کا ایک جائزہ لینا ضروری ہے۔ کیونکہ بغیر اس کے یہ کتاب، نامکمل رہ جائے گی۔

قبل اس کے عہدِ واجدی کے شعراء کا تذکرہ شروع ہو۔ دو باتیں اور سن لیجیے۔

(۱) شعراء کا ذکر میں نے حروفِ تہجی کی ترتیب سے کیا ہے۔

(۲) جن شعراء کا ذکر کیا ہے، وہ عہدِ واجد علی شاہ کے ہیں اور یہ عہد تختِ نشینی سے پہلے اور انتزاعِ سلطنت کے بعد تک پورا اپنے اثرات و موثرات کے لحاظ سے حاوی ہے۔

---

(۱)

آتش

پورا نام خواجہ حیدر علی، خاندانِ مشائخ سے تعلق رکھتے تھے۔ ابھی تعلیم مکمل نہیں ہوئی تھی کہ شعر و شاعری کا چسکا پڑ گیا۔ اور ذہن و دماغ کی ساری صلاحیتیں اس پر صرف ہونے لگیں۔ ذہانت و جودت کی نعمت، قدرت نے فیاضی سے عطا فرمائی تھی، استاذ..... مصحفی ..... کے فیضِ صحبت اور دامنِ تربیت نے اس جوہر کو اور زیادہ نکھارا، دیکھتے ہی دیکھتے، آتش، شاعرِ یگانہ بن گئے۔ حریف سنبھل بیٹھے کہ عرصۂ سخن میں جو شہسوار آیا ہے، وہ کسی سے ہار ماننے والا نہیں۔ طبیعت وارفتہ، مزاج بے پروا غیور و خود دار اپنے گوشۂ عزلت میں بیٹھے، فکرِ سخن کیا کرتے تھے، ناسخ کے ہمعصر تھے، دونوں میں خوب

خوب معرکے رہے، لیکن ان کی سپاہیانہ وضع اور قلندرانہ سج دھج نے ہمیشہ انہیں معاصرین میں ممتاز و یگانہ رکھا، خود ہی تو اپنے بارے میں کہہ گئے ہیں :-

طبل و علم ہے پاس ہمارے نہ ملک و مال
ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا؟

زمانہ کئی مرتبہ خلاف ہوا، لیکن واقعی ان کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔

واجد علی شاہ اختر، آتش ہی سے مشورہ سخن لیا کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ سنئے :-

ولی عہد کے زمانہ میں حضرت محمد واجد علی شاہ آخری شاہ اودھ، آتش کے شاگرد ہوئے، سو روپیہ ماہوار دیتے رہے، غزل اصلاح کو بھیج دیا کرتے تھے، آتش نابینا تھے، سن کر شاگرد سے اصلاح لکھوا دیا کرتے تھے ایک شعر پر بادشاہ کو کچھ شک ہوا، رفقا نے بیان کیا، خداوند آپ کا شعر بے شک ہے آتش نابینا ہیں، شاگرد جو چاہتا ہے شعر کاٹ دیتا ہے

یہ خبر آتش کو معلوم ہوئی، دوبارہ غزل آئی۔ اس پر لکھ دیا "ماشاء اللہ" خوب غزل کہی ہے، اس سہ ماہی میں جتنی غزلیں آئیں سب پر یہی لکھ دیا۔

جب سہ ماہی تنخواہ آئی تو واپس کردی اور کہا کہ میں حرام کی تنخواہ نہیں لیتا، جب غزل بناتا تھا، تنخواہ لیتا تھا۔ اب اصلاح ہوتی نہیں، تنخواہ کس بات کی لوں؟ بادشاہ نے علی نقی خان وزیر اعظم کو بھیجا۔ آتش نے یہی جواب دیا۔ علی نقی خان نے شاگردوں سے ناراضی کا سبب دریافت کرکے بادشاہ سے بیان کیا، بادشاہ خود معذرت کے لئے آتش کے مکان پر آئے[1]

آتش کا ذریعہ معاش دوسرے فن کاروں کی طرح آتش کی زندگی بھی، عسرت و افلاس میں گزری، لیکن وہ کبھی حرف شکایت زبان پر نہ لائے، سو سوا سو روپیہ مہینہ کی آمدنی تھی، محمد حسین آزاد کے بقول اسی، اور خواجہ عشرت کے بقول سو روپے ماہوار واجد علی شاہ کی سرکار سے ملتے تھے، قابل ترجیح قول خواجہ عشرت کا ہے، کچھ شاگرد خدمت کر دیتے تھے، اس رقم میں وہ نہایت ٹھاٹھ سے قلندرانہ زندگی بسر کرتے تھے۔

خودداری خواجہ آتش بلا کے خوددار تھے، وہ اگر قصیدہ گوئی، اور دربارداری کو اپنا شعار

[1] تنکوا لہب لقار خواجہ عبدالرؤف عشرت)

بلاتے تو مالا مال ہو جاتے، لیکن اپنے کنج عزلت سے نکلنا وہ اپنی توہین سمجھتے تھے۔ نہ کسی کی شان میں قصیدہ کہا۔ نہ کسی بادشاہ وامیر کے دربار میں حاضری دی۔ مل گیا تو کھا لیا نہ ملا تو فاقہ سہی

وفات

خواجہ آتش کی وفات اچانک ہوئی بھلے چنگے بیٹھے تھے یکایک ایسا موت کا جھونکا آیا کہ شعلہ کی طرح بجھ کر رہ گئے۔

یوں تو خواجہ کی تاریخ وفات بہت سے دوستوں اور شاگردوں نے کہی (۱) لیکن منشی اشرف علی اشرف کی جو تاریخ خواجہ عشرت نے تذکرہ آب بقا میں درج کی ہے، خوب ہے

"بمرد شاہ سخن!"
۱۲۶۳ھ

آتش کا دیوان ان کی زندگی میں مرتب ہو کر شائع ہو چکا ہے۔ بقیہ حصہ وفات کے بعد شائع ہوا۔

رنگِ سخن

آتش اپنے رنگ کے موجد اور خاتم تھے۔ زبان کی صفائی اور روزمرہ کا استعمال ان کی خصوصیت تھی، جب وہ حلقہ گیسو سے نکل کر جذبات کی دنیا میں قدم رکھتے ہیں، تو ان کی شاعری عشق و محبت کے رموز و اسرار کا آئینہ بن جاتی ہے (۲) تصنع اور تکلف مطلق نہیں۔ ترشے ہوئے الفاظ آبدار موتیوں کی طرح لڑی میں پروئے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ محاورے ایسے برمحل استعمال کئے ہیں کہ شاعری مرصع سازی معلوم ہوتی ہے۔ ان کے بعض اشعار پوری اردو شاعری میں اپنا جواب نہیں رکھتے، میر و غالب کے بعد اگر کسی کا مرتبہ ہے تو وہ آتش ہیں (۳) ان کی عاشقانہ غزلیں موسیقی کی تاثیر کو چمکا کر محفلوں کو گرماتی ہیں (۴) آتش جب داخلی رنگ اختیار کرتے ہیں تو غضب کی طبیعت داری دکھا جاتے ہیں۔ لطف زبان ایسا ہے کہ کس منہ سے کوئی اس کی تعریف کرے۔ محاورہ بندی ایسی ہے کہ جواب نہیں رکھتے (۵)

نمونہ کلام

ذیل میں آتش کے چند اشعار درج کئے جاتے ہیں:۔

---

(۱) آب حیات (محمد حسین آزاد) صفحہ ۳۸۱

(۲) شعر الہند (عبدالسلام ندوی)

(۳) تاریخ ادب اردو (رام بابو سکسینہ) صفحہ ۲۴۴

(۴) آب حیات صفحہ ۳۸۱

(۵) کاشف الحقائق، امداد امام (اثر) حصہ دوم صفحہ ۱۶۶

ظہور آدم خاکی سے یہ مجھ کو یقین آیا
تماشا انجمن کا دیکھنے خلوت نشین آیا
محبت مے و معشوق ترک کر آتش
سفید بال ہوئے موسم خضاب آیا

امانت کی طرح رکھا لحد میں روز محشر تک
نہ اک مو کم ہوا اپنا نہ اک تار کفن بگڑا
لگے منہ بھی چڑانے دیتے دیتے گالیاں صاحب
زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجے دہن بگڑا

پیامبر نہ میسّر ہوا تو خوب ہوا۔
زبان غیر سے کیا شرح آرزو کرتے؟

باغ جہاں میں گل کی قناعت ہے جائے رشک
عمر دو روزہ ایک قبا میں تمام کی!

خدا جانے یہ آرائش کرے گی قتل کس کس کو
طلب ہوتا ہے شانہ، آئینہ کو یاد کرتے ہیں

شیشے شراب کے رہیں آٹھوں پہر کھلے
ایسا گھرے کہ پھر نہ کبھی ابر تر کھلے

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزارہا شجر سایہ دار راہ میں ہے
آئے بھی لوگ، بیٹھے بھی، اٹھ بھی کھڑے ہوئے

میں جا ہی ڈھونڈھتا تیری محفل میں رہ گیا۔

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اک قطرہ خوں نہ نکلا

اس بلائے جان سے آتش دیکھئے کیونکر نبھے
دل سوا شیشہ سے نازک دل سے نازک خو ست

پر کترتا ہے مرے صیاد تو کر اس طرح
حسرت پرواز بھی اڑ جائے بال و پر کے ساتھ

---

(۲)

انیسؔ

مرثیہ کی تاریخ اور اس کے عہد بہ عہد کے ارتقار پر بحث و گفتگو ہمارے موضوع سے خارج ہے، البتہ یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ نہ صرف اردو میں، بلکہ فارسی اور عربی میں بھی مرثیہ کو ایک مستقل فن کی حیثیت دینے والا، اس فن کی عظمت لوگوں کے دلوں میں بٹھانے والا اور اس فن کو بلندی میں ہمرتبۂ عرش پہنچانے والا انیس کا خاندان ہے اور اس خاندان کی سربلندی اور عظمت تمام تر انیس کی فن کاری کی رہین منت ہے، انیس صحیح معنوں میں اقلیم سخن کا شہریار ہے۔ وہ صنف کو بھی اپنا تا۔ یگانہ اور بے ہمتا رہتا۔ اس نے اپنے لئے اور راہ منتخب کی، جسے لوگ حقیر نظروں سے دیکھتے تھے، اور جس پر رہروی کرتے شرماتے تھے، لیکن انیس کے یمن قدم نے اس زمین کو بلندی میں آسمان کا ہمسر بنا دیا۔

ابتدائی حالات انیس فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ سن ولادت ۱۲۱۷ھ[۱] ہے، لیکن انیس کے سوانح نگار کو اس سے اختلاف ہے وہ ۱۲۱۹ھ بتاتے ہیں[۲] علوم

---

[۱] تاریخ ادب اردو (سکسینہ) صفحہ ۔ ۲۷

[۲] حیات انیس (امجد علی شاہ شہری)

متداولہ کی تعلیم حاصل کی، مطالعہ کا بہت شوق تھا، ہر علم و فن کی کتابیں پیشِ نظر رکھتے، علم کے ساتھ ساتھ ورزش کا بھی شوق تھا اور فنونِ سپہ گری سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔(۱)

انیس کی شاعری

انیس نے کم سنی ہی سے شاعری شروع کر دی تھی، فصاحت و بلاغت اس گھر کی باندی تھی، حسنِ بیان اور عمدہ کلام اس خاندان کا چاکر۔

میر انیس کا کلام اپنی فصاحت اور تازگی کے لئے مشہورِ عالم ہے۔ وہ صحتِ محاورہ کا بہت خیال رکھتے تھے۔ لغات کی معلومات ان کی بہت وسیع تھی، الفاظ کی بناوٹ میں انہیں کمال حاصل تھا۔ بہت سے نئے نئے محاورے ان کی وجہ سے داخلِ زبان ہوئے اور قدیم محاورات کا صحیح استعمال بھی انہوں نے بتایا۔ میر صاحب کی زبان دلی اور لکھنؤ دونوں جگہ مستند مانی جاتی ہے۔ انیس کو مناظرِ قدرت کی ہو بہو تصویر کھینچنے میں کمال حاصل تھا۔ جذبات کے اظہار پر بھی میر صاحب کو بڑی قدرت حاصل ہے اور کمال یہ ہے کہ کہنے والے کی عمر، جنس، حالت وغیرہ کا پوری طرح خیال رکھا جاتا ہے، مثلاً اگر کسی بچہ کی زبان سے کچھ الفاظ کہے گئے ہیں تو خیالات اور زبان دونوں بچوں ہی کے ادا کئے جاتے ہیں۔[۲] البتہ شاعری جن زبانوں میں ہے، تمام دنیا میں انہیں بلند پائگی حاصل ہے۔ ہومر اہلِ یونان سے تھا، اس کی شاعری کی زبان یونانی کی ہے۔ ورجل اہلِ انطاکیہ سے تھا، اس کی شاعری کی زبان لاطینی کی ہے۔ ملٹن اہلِ انگلستان سے تھا، اس کی شاعری زبان انگریزی ہے۔ فردوسی اہلِ عجم سے تھا، اس کی شاعری کی زبان فارسی ہے والمیکی اہلِ ہند سے تھا، اس کی شاعری کی زبان سنسکرت ہے۔ ظاہر ہے یہ سب زبانیں پایۂ امتیاز رکھتی ہیں، ان زبان کے بولنے والے بھی قومی اعتبار سے بھی اہلِ ثروت میں سے شمار کئے جاتے ہیں۔ مگر میر انیس نے اپنی شاعری کا جلوہ ایک ایسی زبان میں دکھلایا ہے کہ نہ وہ زبان ابھی تک اعلےٰ درجہ کی سمجھی جاتی ہے نہ اس کے بولنے والے کسی طرح کا دنیاوی امتیاز رکھتے ہیں۔[۳] میر انیس نے ہر مقام پر جزئیات بلاغت کا خیال رکھا ہے بچے، جوان، بوڑھے، بی بی، باندی، امام، اعزا، انصار اور فرقۂ مخالف کے مبارز اور پہلوان کے متعلق ہر درجہ اور ہر شخص کے مناسبِ حال داد دی ہے۔ پھر تشبیہات و استعارات کی خوبیاں بجائے خود قابلِ دید ہیں۔ جذباتِ فطرت اور مناظرِ قدرت کی بے مثل تصویریں کھینچی ہیں، واقعہ نگاری کی ترتیب اور سلسلہ بندی میں وہ قابلِ قدر کمال صرف کیا ہے، کہ اس سے بہتر اور کہیں نہیں ملتی کا یہ بڑا کمال خیال کیا

---

(۱) تاریخ ادب اردو (سکینہ) صفحہ
[۲] تاریخ ادب اردو (سکینہ) صفحہ ۷۵ - ۲۷۴
[۳] کاشف الحقائق (امداد امام اثر) صفحہ ۴۸۶

جاتا ہے کہ وہ لڑائی کے تمام جزئیات اور فنون جنگ کا نقشہ کھینچتا ہے۔ لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ وہ سرسری اور معمولی باتوں کے سوا لڑائی کے ہر قسم کے کرتب نہیں دکھاتا۔ لیکن میر انیس لڑائی کے ہر قسم کے کرتب اور ہنر اس تفصیل سے بیان کرتے ہیں کہ عربی اور فارسی میں اس کی نظیر نہیں ملتی[1] حقیقت یہ ہے کہ انیس کا جواب اب تک پیدا نہیں ہوا ...... اس سو برس کے عرصہ میں زبان بہت منجھ گئی ہے، برابر اس کی صفائی اور سادگی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ مگر مستقبل قریب میں بھی امید نہیں کہ انیس کا جواب پیدا ہو سکے۔

میر انیس مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی دونوں میں فرد تھے۔ ایک بار واجد علی شاہ نے ایک مجلس میں میر صاحب کی زبان سے یہ شعر سنا کر ؎

زلف اکبر کو جو دیکھا سر نیزہ پر خون
موئے سر کھول دیئے ماں نے پریشاں ہوکر

اور اپنے استاد فتح الدولہ برق سے فرمایا کہ میں نہ کہتا تھا کہ انیس لکھنؤ میں ایک ہی شاعر ہیں۔ یہ زبان انھیں کے لئے ہے[2]

میر انیس دربار شاہی میں

انیس کو دربار شاہی سے، یا شاہ و امیر کی توصیف و تعریف سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ وہ اپنے کنج عافیت میں مگن تھے اور اہل بیت اطہار کی مدح و توصیف کو اپنی زندگی کا ماحصل سمجھتے تھے۔ لیکن ایک مرتبہ وہ واجد علی شاہ کے دربار میں پہنچے، وہاں کیا گزری یہ ایک تاریخی واقعہ ہے۔

"تمام شہر لکھنؤ میں میر انیس اور میرزا دبیر کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ نقادان سخن کے جتھے دونوں کی طرفداری میں علیحدہ علیحدہ بٹے ہوئے تھے۔ ہر گروہ اپنے مقتدار کی طرفداری پر زور دیتا تھا۔ کسی ایک مجلس میں دونوں صاحبوں کا جمع ہونا مشکل تھا۔ لیکن لکھنؤ کے حضرات دونوں کو جمع کئے بغیر کب ماننے والے تھے چنانچہ نواب مفتاح الدولہ بہادر نے حضرت جہان عالم محمد واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کے سامنے دونوں صاحبوں کی تعریف کر کے ایسی تقریر کی کہ جس سے بادشاہ دونوں کو ایک مجلس میں پڑھنے کا ارشاد فرمائیں اور بادشاہ نے ایسا ہی کیا۔ اس پر مفتاح الدولہ خود دونوں صاحبوں کی خدمت میں حاضر ہوئے اور شاہی

---

[1] موازنہ انیس و دبیر (شبلی)
[2] تذکرہ آب بقا۔

پیغام پہنچایا۔ دونوں نے قبول کر لیا۔ وقت معینہ سے پہلے میرزا دبیر پہنچے اور باریاب حضوری ہو کر ایک جانب بیٹھ گئے۔ میر انیس نے ہر بات کی خبر پہنچنے کا انتظام کر رکھا تھا، جب یہ حال معلوم ہوا کہ میرزا دبیر پہنچ گئے تو آپ نے جانے میں دیر لگانا شروع کی یہاں تک کہ تمام مجلس حاضرین سے بھر گئی اور وقت زیادہ آگیا، تب شاہی چوب دار حاضر ہوا اور عرض کی کہ مجلس تیار ہے، صرف آپ کا انتظار ہے۔ میر صاحب تیار تو تھے ہی اور تام جھام سامنے حاضر تھی اس پر بیٹھ کر روانہ ہوئے۔ مجلس میں فرش پر پاؤں رکھتے ہی تمام ارباب مجلس تعظیماً اٹھ کھڑے ہوئے۔ میر صاحب نہایت تمکنت اور وقار سے سیدھے ممبر کی طرف گئے اور اپنے قاعدہ مقررہ کے موافق ممبر کے پاس بیٹھ گئے۔ نواب مفتاح الدولہ سامنے آئے تو ان سے کہا کہ آپ حضرت جان عالم سے عرض کر دیں کہ انیسؔ حاضر ہے۔ اور آپ کو دعا عرض کرتا ہے۔ مفتاح الدولہ نے بادشاہ سے اطلاع کی بادشاہ نے اپنی خوشنودی مزاج کا اظہار کیا۔ دیکھنے والے حیران رہ گئے کہ میر انیس نے اس موقع پر بھی اپنی خودداری کا کیسا خیال رکھا ہے۔ ماحضر کار مجلس شروع ہوئی۔ پہلے میرزا دبیر کو پڑھنے کا حکم دیا گیا، انہوں نے پڑھا بادشاہ کی تعریف میں بھی ایک رباعی پڑھی۔ سامعین نے بڑی دلچسپی سے سنا اور سبحان اللہ کی آوازوں سے عالی شان ہال گونجنے لگا۔ ان کے بعد میر انیس کو پڑھنے کا ارشاد ہوا۔ میر صاحب کچھ سے کر نہ گئے تھے۔ فی البدیہہ ایک مطلع تصنیف کیا اور ممبر پر تشریف لے گئے۔

ممبر پر جا کر اپنی عادت کے موافق تھوڑی دیر چپ بیٹھے رہے۔ جب تمام مجلس ان کی طرف متوجہ ہو گئی، تو جناب امیر کی مدح میں ایک رباعی پڑھی چاروں طرف سے آفریں و مرحبا کا شور بلند ہوا۔ ازاں بعد سلام شروع کیا جس کا فی البدیہہ مطلع یہ ہے :-

غیر کی مدح کروں شہ کا ثنا خواں ہو کر؛
مجرئی اپنی ہوا کھوؤں سلیماں ہو کر؛

اس مطلع کا سننا تھا کہ معنی فہم طبیعتیں اعائے کلام کے مزے لینے لگیں، اور میر انیس کے انداز بیان نے تمام درباری لوگوں کو سمجھا دیا کہ ہم اس موقع پر بھی اپنے درجہ کمال سے نیچے اترنے والے نہیں سلام ختم کر کے میر صاحب نے مرثیہ کے چند بند پڑھے جس سے اہل مجلس پر وجد کی کیفیت طاری ہوئی اور رزم و بزم دونوں کا حق ادا کر کے ممبر سے اتر گئے۔

میر صاحب کے اشارات کو بادشاہ بھی سمجھ گئے۔ جو ممبر کے عقب میں شہ نشین پر تشریف رکھتے تھے میر انیس کو سامنے یاد فرما کر تعریف کی۔ میر صاحب آداب بجا لا کر رخصت ہوئے۔ تمام شہر میں اس مجلس

کا شہرہ ہو گیا اور مہینوں اس کا ذکر ہوتا رہا۔ میں نے یہ حال نواب بڈھن صاحب کی زبان سے سن کر قلم بند کیا[1]

وفات میر صاحب تپ دق کے مرض میں مبتلا ہوئے۔ کم و بیش ایک مہینہ تک صاحب فراش رہے۔ ۲۹ شوال ۱۲۹۱ھ (مطابق ۱۸۷۴ء) کو دو شنبہ کے دن اپنے مکان واقع چوبداری محلہ میں وفات پائی[2]

میرزا دبیر، میر صاحب کے حریف تھے لیکن کتنی شاندار تاریخ وفات کہی ہے۔

طور سینا بے کلیم اور منبر بے انیس

۱۲۹۱ھ

انتخاب کلام انیس کے کلام کا انتخاب کوئی آسان کام نہیں، لیکن بعد انتخاب ان کے کلام کا کچھ حصہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:۔

رُباعیات

(۱) معرفت الٰہی

پتلی کی طرح نظر سے مستور ہے تو — آنکھیں جسے ڈھونڈھتی ہیں وہ نور ہے تو
نزدیک رگ جاں سے ہے اس پر یہ بعد — اللہ اللہ کس قدر دور ہے تو!

(۲) قبر

مر مر کے مسافر نے بسایا ہے تجھے — رخ سب سے پھرا کے منہ دکھایا ہے تجھے
کیوں کر نہ لپٹ کے تجھ سے سوؤں اے قبر — میں نے بھی تو جان کھو کے پایا ہے تجھے

(۳) قبر کی تنہائی

خاموشی میں یاں لذت گویائی ہے — آنکھیں جو ہیں بند عین بینائی ہے
نہ دوست کا جھگڑا ہے نہ دشمن کا فساد — مرقد بھی عجب گوشۂ تنہائی ہے

(۴) بڑھاپا

ہشیار کہ وقت ساز و برگ آیا ہے — ہنگام یخ و برف و تگرگ آیا ہے
محتاج عصا ہوئے تو پیری نے کہا
چلئے اب چوب دار مرگ آیا ہے

(۵) خودداری

عزت رہے یار و آشنا کے آگے   محجوب نہ ہوں شاہ و گدا کے آگے
یہ پاؤں چلیں تو راہ مولا میں انیسؔ   یہ ہاتھ جب اٹھیں تو خدا کے آگے

(۶) معرفت

گلشن میں صبا کو جستجو تیری ہے   بلبل کی زبان پہ گفتگو تیری ہے
ہر رنگ میں جلوہ ہے تری قدرت کا   جس پھول کو سونگھتا ہوں بو تیری ہے

(۷) روداد قبر

راحت میں بسر ہوئی کہ ایذا گزری   کیوں کر تاریک گھر میں تنہا گزری
اے کنج لحد کے سونے والو افسوس   کس سے پوچھیں کہ تم پہ کیا کیا گزری

(۸) اعمال حسنہ

کیا کیا دنیا سے صاحب مال گئے   دولت نہ گئی ساتھ نہ اطفال گئے
پہنچا کے لحد تلک پھر آئے سب لوگ   ہمراہ اگر گئے تو اعمال گئے

(۹) جوانی و پیری

یہ عمر یوں ہی تمام ہو جائے گی   مرنے کی خبر بھی عام ہو جائے گی
روتے ہو انیسؔ کیا جوانی کے لئے   پیری کی سحر بھی شام ہو جائے گی

اب کچھ نمونہ مرثیوں کا دیکھ لیجئے۔

(۱) امام حسین کا رجز

ہم وہ ہیں کہ اللہ نے کوثر ہمیں بخشا   سرداریٔ فردوس کا افسر ہمیں بخشا
اقبال علیؑ خلق پیمبر ہمیں بخشا   قدرت ہمیں دی زور ہمیں زر ہمیں بخشا
ہم نور ہیں گھر طور تجلا ہے ہمارا
تخت بن داؤد مصلا ہے ہمارا

کس جنگ میں سینہ کو سپر کر کے نہ آئے   کس مرحلہ صعب کو سر کر کے نہ آئے
کس فوج کی صف زیر و زبر کر کے نہ آئے   تھی کون سی شب جس کو سحر کر کے نہ آئے
تھا کون جو ایمان تہہ صمصام نہ لایا
اس شخص کا سر لائے جو اسلام نہ لایا

گرفیض ظہور شہ لولاک نہ ہوتا   بالائے زمیں گنبد افلاک نہ ہوتا
کچھ خاک کے طبقے میں بجز خاک نہ ہوتا   ہم پاک نہ کرتے تو جہاں پاک نہ ہوتا
یہ شور اذاں کا سحر و شام کہاں تھا   ہم عرش پہ جب تھے تو یہ اسلام کہاں تھا

(۲) عباس کا رجز

روکے ہمیں نکل کے جو طاقت کسی میں ہو   لے تیغ میاں سے جو شجاعت کسی میں ہو
گرمائے رخش کو جو حرارت کسی میں ہو   آئے جو حرب و ضرب کی قدرت کسی میں ہو

دو ہاتھ میں علی کے پسر دل پار ہیں !
دریا نہیں کہ رک گیا ہم ذوالفقار ہیں

سرکش ہیں سب ہماری زبردستیوں سے ریز   دادا شجاع باپ جوانمرد ہم دلیر
جس دن لڑا ہے کر دیے ہیں زخمیوں کے ڈھیر   لائے ہیں جا کے آگ سے پانی خدا کے شیر

عفرت بھاگتے ہیں وہ چوٹیں ہماری ہیں
بیر العلم میں کود کے تلواریں ماری ہیں

جرأت جلو میں رہتی ہے نصرت رکاب میں   سر کاٹتے ہیں پر کے تیغوں کے آب میں
لکھے ہوئے ہیں شیروں کے حملے کتاب میں   فصلیں ہیں اپنے زور کی خیبر کے باب میں

ناصر ہیں بارگاہ فلک بارگاہ کے
دفتر الٹ دیئے ہیں عرب کی سپاہ کے

(۳) علی اکبرؓ کا رجز

اللہ نے سب طرح کی دولت ہمیں دی ہے   عزت ہمیں بخشی ہے شرافت ہمیں دی ہے
کونین کو بخشی وہ شرافت ہمیں دی ہے   قائل ہیں عرب جس کے وہ جرأت ہمیں دی ہے

رد باہوں کے حیلوں سے ترود ہمیں کیا ہے
ہم شیر ہیں اس شیر کے جو شیر خدا ہے

(۴) عون و محمد کا رجز

تلوار جنہیں حق نے عطا کی ہے وہ ہم ہیں   جن غازیوں نے دین کی بنا کی ہے وہ ہم ہیں
خوش جن میں شاہ عقدہ کشا کی ہے وہ ہم ہیں   دولت جو رسولؐ دوسرا کی ہے وہ ہم ہیں

کیا عرش آلہی پہ جگہ آج لی ہے۔

کاندھے پہ نبی کے ہمیں معراج ملی ہے

بت توڑ کے کعبہ کو صفا کر دیا کس نے   دم میں حق و باطل کو جدا کر دیا کس نے
عالم کو طلب گار خدا کر دیا کس نے   اسلام کی قوت کو سوا کر دیا کس نے
در کفر کا خالق کی عنایات سے توڑا
عزیٰ کا سر نحس و نجس لات سے توڑا

تقسیم ہوئی دولت دیں گھر سے ہمارے   شاہوں کو ملے تاج و نگیں گھر سے ہمارے
ہے پیش نظر خلد بریں گھر سے ہمارے   تعلیم ہوا روح امیں گھر سے ہمارے
دیر آئے کہ مسکن تھا بہت دور ہمارا
آدم سے جو پہلے تھا وہ ہے نور ہمارا

(۵) علی اکبرؓ کی جنگ

تھم تھم کے یوں گیا صف اعدا پہ وہ دلیر   جاتا ہے داؤں کر کے غزالوں پہ جیسے شیر
غازی جو بھوک و پیاس میں تھا زندگی سے سیر   کشتوں کے پشتے ہو گئے دم میں سروں کے ڈھیر
اک سیل زور و شور سے آئی گذر گئی۔
ثابت نہ یہ ہوا صف اول کدھر گئی

بڑھ کر کسی نے وار جو رد کا سپر کٹی   چار آئینہ کٹا زرہ خیمہ و سر کٹی
نیزے کی ہر گرہ صفت نیشکر کٹی   سینہ کٹا جگر ہوا زخمی کمر کٹی
رہوار بھی وہ نیم میان مصاف تھا
ان سب کے بعد منہ کو جو دیکھا تو صاف تھا

ملتا تھا نہ صفوں میں علم کا نشاں کہیں   چلّے کہیں تھے شست کہیں اور کماں کہیں
نیزے کہیں تھے ڈانڈ کہیں اور سناں کہیں   جمدھر کہیں کمند کہیں برچھیاں کہیں
اک اک سیاہ رو کا جگر داغ داغ تھا
جنگل تمام ڈھالوں کے پھولوں سے باغ تھا

چمکی گری اٹھی ادھر آئی ادھر گئی   خالی کئے پرے تو صفیں خوں میں بھر گئی
کاٹے کبھی قدم کبھی بالائے سر گئی   ندی غضب کی تھی کہ چڑھی اور اتر گئی
اک شور تھا یہ کیا ہے جو قہر صمد نہیں

آگاہ ہو کس طرح کہو عمر کو مارا — صمصام کا اک وار ہوا کس کو گوارا
واللہ گر اک دم کو وہ صمصام علم ہو
ہر روح کو اس دم ہوس ملک عدم ہو

سردار اہم محرم اسرار محمدؐ — مہر اسداللہ کا دلدار محمدؐ
دلدار و دل آرام و مددگار محمدؐ — ممدوح ملک مالک سرکار محمدؐ
سرور کہو اسلام کا اس مالک کل کو
آرام دہ اک دم دل سردار رسل کو

---

(۳)

اسیرؔ

اسیر اپنے علم، ہمہ دانی اور وسعت نظر کے اعتبار سے ایک مرتبۂ خاص پر فائز تھے شاعر تھے اور بلا کے۔ ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے اور ہر رنگ میں اپنی انفرادیت قائم رکھی ہے۔ مرثیہ اور سلام تک میں بند نہیں ہیں۔ کلام غضب کی روانی اور شگفتگی ہے۔ رنگ شاعری وہی ہے، جو ان کے عہد میں عام طور پر پھل پھول رہا تھا۔ یعنی الفاظ سے کھیلنا، جذبات کی عکاسی کرتے ہوئے، خیال و زبان میں مبالغہ کی انتہا۔

اسیر اور واجد علی شاہ اسیر واجد علی شاہ کے عہد ولی عہدی میں مصاحب خاص اور ندیم باختصاص تھے۔ پھر جب واجد علی شاہ سریرآئے سلطنت ہوئے، تو ان کی بن آئی خطابات سے نوازے گئے، مال و دولت کی ریل پیل ہوئی۔ مگر جب انتزاع سلطنت ہوا، اور واجد علی شاہ کلکتہ سدھارے تو یہ روپوش ہو گئے، نہ صرف یہ کہ ساتھ نہیں گئے۔ بلکہ ملے تک نہیں۔ واجد علی شاہ نے ان کی بے وفائی پر بڑے سخت اور درشت الفاظ میں طنز کیا ہے[1]۔ اور دل کے جلے پھپھولے پھوڑے ہیں۔ انتزاع سلطنت کے بعد یہ دربار رام پور سے وابستہ ہو گئے۔ واجد علی شاہ کو یہ بات بھی بہت بری لگی کہ کل تک جو شخص دربار اودھ سے وابستہ، شاہ اودھ کا دعاگو اور ثناخوان تھا۔ آج وہ

---

[1] ملاحظہ ہو واجد علی شاہ کی کتاب "بنی"

ایسا تو رود نیل میں بھی جزر و مد نہیں

آئی جدھر پلٹ کے صفوں کو بچھا گئی   تن سے اڑا دیا وہیں سر جس کو پا گئی
ہر اک کڑی کو نرم سمجھ کر چبا گئی   فولاد کی زرہ کو اشارہ میں کھا گئی
چار آئینہ کا کاٹ اسی پر حوالہ تھا
ذکر اس کا کیا ہے خود تو منہ کا نوالہ تھا

(۶) گھوڑے کی تعریف

صرصر سے تیز تر تھا وہ اسپ خجستہ سر   یکساں تھا اس کو صورت خورشید دشت و در
پانی پہ تھا جو موج تو آتش میں تھا شرر   گیتی نورد برق تگ آسماں سفر
ٹاپوں سے سرکشوں کی صفیں پائمال تھیں
زیں آفتاب تھا تو رکابیں ہلال تھیں

طے کی جو راہ بحر تو بیہ سے نکل گیا   مانند تیر لشکر شر سے نکل گیا
آیا ادھر سے گر تو ادھر سے نکل گیا   پتلی کے گرد پھر کے نظر سے نکل گیا
سرعت میں تھا ہرن تو وغا میں ہژبر تھا
پستی میں سیل تھا تو بلندی میں ابر تھا

(۷) دشت کربلا کی صبح

گرمی کی سحر اور وہ پھولوں کا مہکنا   مرغان چمن کا وہ درختوں پہ چہکنا
انجم کا وہ چھپنا کبھی اور گاہ چمکنا   وہ سرد ہوا اور وہ سبزے کا لہکنا
اس دشت میں رونق تھی جو شبنم سے دنیا پر
تھا موتیوں کا فرش زمرد کی زمیں پر

جلوہ وہ دم صبح کا وہ نور کا عالم   دلچسپ صدا نوبت و شہنا کی وہ باہم
سرخی وہ شفق کی افق چرخ پہ کم کم   وہ گل کے کٹوروں پہ درافشانی شبنم
خشکی میں بھی سردی سے ترائی کا سماں تھا
پر مالک گلزار جناں تشنہ دہاں تھا

(۸) بے نقط بند

وہ طاہر و اطہر ہوا اگر معرکہ آرا   معلوم ہو حملہ اسد اللہ کا سارا

ایک معمولی سی ریاست کے تاجدار کو رستم و افراسیاب اور بہرام و خاقان سے بھڑا رہا ہے۔

عام رنگِ سخن

یوں تو امیر کا رنگ سخن خالص لکھنوی ہے لیکن بعض شعر بڑے غضب کے کہہ جاتے ہیں، مثلاً

شباب تھا کہ آئی نسیم کا جھونکا
کہ دفعتہً ادھر آیا، ادھر روانہ ہوا

کہنے کو یوں جہاں میں ہزاروں ہیں یار دوست
مشکل کے وقت ایک ہے پروردگار دوست

ضد سے جتنا ہے یہاں کافر و دیندار میں فرق
زاہد اتنا تو نہیں سبحہ و زنار میں فرق

اسیر پر ایک طائرانہ نظر

اسیر کا نام سید مظفر علی، والد کا نام سید مدد علی، وطن قصبہ امیٹھی تھا۔

"شیخ غلام ہمدانی مصحفی کے شاگردوں میں بعد آتش کے انھیں کا مرتبہ تھا۔ ہزار ہا مستفید ہوئے ایک دیوان فارسی گلشن نقش ہار چھ دیوان اردو میں ہیں۔ ریاض سخن، گلستان سخن، دیوان اسیر، عاشقانہ دیوان ہیں۔ ایک دیوانہ غیر مطبوعہ ہے۔ ایک دیوان منقبت موسوم بہ گلدستہ امانت ہے۔ ایک کلیات قصائد کا اور ایک مثنوی درۃ التاج ہے جو بادشاہ کی فرمائش سے نظم کی تھی۔ ایک مثنوی میں نواب امین الدولہ وزیر لکھنؤ کے زخمی ہونے کی کیفیت لکھی ہے۔ ایک مثنوی معارج الفضائل معجزات ائمہ میں ہے۔ ایک کتاب بنذر کامل عیار شرح معیار الاشعار اور بہت سے رسائل علم عروض و قوافی کے فارسی اور اردو میں ہیں۔ رسالہ بیان اضافت رسالہ تشریح الحروف فارسی میں ہے۔ فوائد مظفریہ علم نحو عربی میں ہے۔ ان میں سے بعض کتب طبع ہو چکی ہیں مدت دراز تک مرثیہ اور سلام کہا کئے۔ مگر وہ دفتر غدر میں تلف ہو گیا۔ ۱۲۲۹ھ میں غازی الدین حیدر بادشاہ تخت نشین اودھ ہوئے۔ اسی سال اسیر پیدا ہوئے۔ واجد علی شاہ کے عہد میں علی نقی خاں وزیر کے ہاتھوں امین الدولہ کی دوستی میں اسیر بھی کچھ دن اسیر رہے۔

اسیر نے قدرتاً شاعرانہ طبیعت پائی تھی بہت پر گو تھے، ساٹھ ساٹھ، ستر ستر شعر کی غزل کہا کرتے تھے مصحفی اکثر کہا کرتے تھے، "ایک روز یہ میرا شاگرد استادوں کی صف اول میں جگہ لے گا"

اسیر جب واجد علی شاہ کے عہد میں معزز عہدے پر ممتاز ہوئے خطاب حاصل کیا تنخواہ مقرر ہوئی تو ہم چشموں میں اعزاز بڑھ گیا، شاعری چمک گئی، بہت سے شاگرد ہوئے، اسیر کی غزل گوئی کا رنگ سب سے الگ تھا، بہت پر گو تھے مضامین عالی نظم کرتے تھے، اصلاح بہت جلد دیتے تھے، جب انتزاع سلطنت ہوا اور بادشاہ کلکتہ تشریف لے گئے، تو اسیر لکھنؤ نہ چھوڑ سکے۔ یہاں ان کے قدردان بہت تھے۔ اکثر دو سا امراء شاگرد ان نے ایک محلہ منشی گنج کے نام سے آباد کیا تھا، اس میں رہتے تھے، کشیدہ قامت۔ گورے چٹے۔ کتابی چہرہ، متوسط الجثہ تھے، اکثر ٹخنوں تک کا کرتا پہنتے تھے، رشک اور اسیر میں معاصرانہ چوٹیں چلا کرتی تھیں، باوجود کمال کے اسیر میں خود نمائی نہ تھی [1]

وفات | اسیر نے خاصی طویل عمر پائی ۱۲۹۶ھ / ۱۸۸۱ء میں وفات پائی وفات کے وقت عمر ۸۴ سال کی تھی [2] زندگی کی آخری سانس تک دربار رام پور سے وابستہ رہے۔

نمونہ کلام | نمونہ کلام کے طور پر چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔

تیرے دیوانے کو یوں آرام محفل میں نہیں — جیسے دریا کو قرار آغوش ساحل میں نہیں
ابھی تلک نہیں ٹوٹا کسی کا دل مجھ سے — نہ خلق کا نہ خدا کا گنہگار ہوں میں
اپنا قصور ہے کہ چڑھایا ہے تجھ کو سر — تقصیر تیری چرخ ستم گار کچھ نہیں
کچھ نہ ہو سلوک تجھ سے اے آسماں اتنا تو ہو — پاؤں پھیلیں جس میں تربت کا مکاں اتنا تو ہو
آج ساقی میں نہیں گو کہ مروت باقی — خیر زندہ ہے، اگر یار تو صحبت باقی

اسیر کا عہد رام پور | جس زمانے میں نواب محمد سعید خاں والی رام پور لکھنؤ میں رونق افروز تھے۔ اسیر صاحبزادگان عالی شان کی تعلیم کے لئے مقرر ہوئے۔ پھر نواب یوسف علی خان بہادر فردوس مکان کے عہد میں گھر بیٹھے وظیفہ خوار رہے۔ پھر زمانہ سلیمان مرتبت آصف منشیر حاجی حرمین شریفین بلال رکاب نواب کلب علی خاں بہادر میں صدہا سخن فہموں سے سجایا گیا۔ اور قدردانی کا بازار گرم ہوا اسیر بھی بیش بہا تنخواہ پر بلائے گئے

اسیر کا علمی پایہ | شیخ غلام ہمدانی مصحفی کے شاگردوں میں بعد آتش کے انھیں کا مرتبہ تھا، ہزارہا مستفید ہوئے، ایک دیوان فارسی گلشن نقش اور چھ دیوان اردو میں ہیں، رسالے مصنف

---

[1] تذکرہ آب بقا از خواجہ عبدالرؤف عشرت صفحہ ۲۰-۲۱

[2] تاریخ ادب اردو رام بابو سکسینہ صفحہ ۲۶۱

گلستانِ سخن، دو دیوان اسیر عاشقانہ دیوان ہیں، ایک دیوان غیر مطبوعہ ہے ایک دیوان منقبت موسوم بہ گلدستہ امانت ہے، ایک کلیات قصائد اردو، ایک مثنوی درۃ التاج ہے جو بادشاہ کی فرمائش سے نظم کی تھی، ایک مثنوی میں نواب امین الدولہ وزیر لکھنؤ کے زخمی ہونے کی کیفیت لکھی ہے، ایک مثنوی معارج الفضائل معجزاتِ آئمہ میں ہے، ایک کتاب مذکور کامل عیار شرح معیار الاشعار اور بہت سے رسائل علم عروض و قوافی کے فارسی اور اردو میں ہیں، رسالہ بیان اضافت، رسالہ تشریح الحروف فارسی میں ہے۔ فوائد مظفریہ علم نحو عربی میں ہے ان میں سے بعض کتب طبع ہو چکی ہیں۔

اسیر کی خودنوشت

اسیر نے خود بھی اپنی زندگی کے حالات پر اپنے قلم سے روشنی ڈالی ہے۔ یہ گراں بہا خودنوشت رسالہ ادیب الٰہ آباد (جولائی ۱۹۱۱ء) میں شائع ہوتی تھی جو ذیل میں درج ہے

"قصبہ امیٹھی جو بہت آباد ہے وہی میرا وطن ہے وہی میرا مولد ہے۔ چمن ہے لیکن خزاں دیدہ رفیعان صاحب چشم رئیسان عالی ہمم سب اٹھ گئے۔ جب نو دس برس کا سن ہوا بخت رسا لکھنؤ میں لایا۔ میرے جنت مقام باپ میر مدد علی تھے۔ محب نبی و علی شیعہ پاک صاف اعتقاد عالی وقار پڑھے فارسی داں حضرت عباس علمدار کی اولاد ہیں، کبھی کبھی شعر کہتے تھے، مائل تخلص تھا، میں جب قبلہ گاہی کی خدمت میں حاضر ہوا شفقت سے پڑھانے لگے۔ فارسی میں روشن سواد ہو گیا۔ استاد بن گیا، بہت سے طالب علم آنے لگے۔ آخر فکر روزی سے کدر ہوا۔ رفتہ رفتہ جب شاعروں سے ملاقات ہوئی شعر کہنے کا ڈھب ہو گیا۔ رنگین شاعری کی ہوس ہو گئی۔ مضامین کی تلاش کرنے لگا دیوان جمع کر کے دیکھے۔ پچھلوں کے رنگین کلام یاد کئے بعض بعض پر تعلیں بہ عربی زبان کی ضرورت بڑی فکر ہوئی اس کا بھی کچھ علاج کیجئے چچا میر سید علی جو علم نحو و حلی میں بہت دقاق تھے، صرف و نحو میں منتخب روزگار تھے حکمت منطق میں بے مثل، حدیث و قرآن پر شیفتہ آپ نے جلاء العیون نظم کر کے داد سخن دی تھی، میرے پڑھانے میں کمال محنت کی، چار برس تک ان کے مدرسے میں تعلیم حاصل کی زمانے نے کچھ ایسا انقلاب کیا فکر قوت میں اضطراب ہوا۔ پڑھنے پڑھانے کی صحبت جاتی رہی روزی کی فکر نے پریشان کیا۔ القصہ کچہری میں نوکری کی کچھ انشاگری جانتا تھا۔ عمر کے آٹھ برس اسی شغل میں بسر ہو گئے۔

خدا کی شان رزاقی وہاں ایک عالم مرزا کاظم علی تھے۔ ان کی خدمت میں مشرف رہا۔ حدیقہ حکیم سنائی پڑھا۔ علم حاصل کیا۔ وہ کامل تھے مجھ کو بھی کامل کر دیا۔ کبھی کبھی میر کاظم علی سے پڑھ لیتا تھا۔ وہ ایک منطقی عالم۔ ترک عادت تو بہت مشکل ہے۔ شاعری کا بھی کچھ کچھ خیال رہا۔ جابجا مشاعروں میں

گیا، شاعروں سے صحبتیں رہیں، میں نے کبھی اس بات کا خیال بھی نہیں کیا، کہ مجھ کو شاعری میں کمال ہے، مگر لوگ تو تعریف کرتے ہیں، یہ پرچے ہم کو بھی گزرتے ہیں۔ تواریخ کی صبح شام سیر کی، لغت کی کتابیں پیش نظر رہیں جب حضرت ثریا جاہ خاقان زماں محمد امجد علی شاہ زیب تخت و کلاہ ہوئے۔ بڑے نیک طینت، امین شریعت فرشتہ خصال تھے تو مدار المہام وزیر الممالک امین الدولہ عمدۃ الملک امداد حسین خاں بہادر ذوالفقار جنگ وزیر ہوئے، خدا نے ایسا بلند قدر بنایا، کبھی ایک چیونٹی کو بھی نہ ستایا، صبح سے شام تک وزارت کے کام کرتے اور شام سے صبح تک عبادت میں معروف رہتے۔

ہر گھڑی خاص و عام کی خبر تھی، رونق اسلام کی بڑھایا کیے، روز افزوں تائید خدا رہی، لیکن خاکساری بدستور قائم رہی،، ان کے بزرگ بھی بہت صاحب ثروت تو م بنگش سے فرخ آباد کے رئیس تھے جب یہ پہلے پہل لکھنؤ میں آئے تو محلہ تحسین گنج میں قیام کیا، مکانات خرید کیے، جب وزارت ملی تو ماہ نو سے ماہ کامل ہو گئے، خاندان کا خاندان ساتھ تھا، مرزا سکندر شکوہ کے مکانات ان کے بیٹے عباس شکوہ سے مول لیے۔ از سر نو ان سب کی تعمیر کی، مکانوں کی تقدیر چمک گئی، ساآمین آباد نام رکھا، اس جگہ ایک باغ تھا وہ بھی بادشاہ نے مرحمت فرمایا، اس کو خوب تیار کیا، اور "امداد باغ" نام رکھا، عجب عشرت آباد بن گیا، وہ کاؤں سے بازار شق القمر بن گیا، لوگ نواب کو دعا دیتے ہیں، وہاں رہنے والوں کو آرام ہے، طبیعت میں حق پرستی کا غلبہ ہے، بجز رونق دین اور کچھ ہوس نہیں، ایک مجتہد ملازم ہیں، صبح و شام نمازیں ہوتی ہیں، ہمیشہ نذر تقسیم ہوتی ہے مرزا حاجی کا باغ مول لیا ہے اس کے قریب درگاہ حضرت عباس علم دار بنائی ہے وہاں صبح و شام مجلسیں ہوتی ہیں، زیارت کو خاص و عام آتے ہیں۔

میں بھی ان کے بندوں میں ایک صاحب نیاز بندہ تھا، کچھ ایسا حق نہ تھا جس پر ناز کرتا، مجھ کو محض عنایت سے میر منشی کا محکمہ دیا، بہت عسرت سے تین برس بسر کیے، حسب حال مقدرت حاصل ہوئی جو عزیز قریب میرے ساتھ تھے ان کے بخت و نصیب موافق رہے، خدا کا شکر و سپاس ہے، کہ یہ بھی قیاس وہم سے باہر تھا، یہاں نہ تو حسن صورت ہے نہ حسن خط ہے، املا بھی غلط انشا بھی غلط، شکر کا دم دل بھول گیا نو عمرے، خدا ہمارے محسن پر احسان کرے، بعد ازاں گردش روزگار ہوئی، زمانے کا کچھ اعتبار نہیں ہے آسمان زمین و دوسرے ہو گئے فلک نے ہمیں خانہ نشین کر دیا کیا کیوں جو وہ وزارت نہ ہوئے، تمام اقارب عدم کو روانہ ہوئے، میری زوجہ نے بھی انتقال کیا، دل کو نہایت ملال ہوا، میرے سر پر اس قدر بلا پر بلا پڑی کہ دنیا سے دل اٹھ گیا، زمانے کی سیر بہت کی، الٰہی اب انجام بخیر ہو۔

میں یہاں نیک نام رہا اب علیؑ کی محبت میں تمام ہوں، بخن مختصر دنیا سے بہت برخاستہ تھا، کبھی

بزم آراستہ سے کچھ کام نہ تھا، ناگاہ ایک شاہی خواص آیا، اور مجھے دیوان خاص میں لے گیا۔ وہاں حضرت سلطان عالم محمد واجد علی شاہ اختر صاحب سریر رونق افروز تھے۔ یہ بادشاہ رعایا کا بہت محبوب ہے۔ خدا کو اس کی خوشی منظور ہے اور ایام میں ایسے بادشاہ کہاں، پایہ تخت بلند رہے چشم بد سے گزند نہ پہنچے۔

مجھ جیسے ناچیز شخص سے خلق کیا۔ امتیازی درجے سے پاس بٹھایا۔ ایک ایسی کتاب عنایت فرمائی جو در حقیقت گل انتخاب تھی میں نے حسب حکم اسے نظم کیا سن کے بہت خوش ہوئے۔ مجھے بھی ان کی خوشی سے مطلب تھا۔[1]

(۴۷)

امیر مینائی

منشی امیر احمد امیر مینائی، ایک خانوادہ تصوف سے تعلق رکھتے ہیں، علوم معقول و منقول کے جامع ہمہ صفت موصوف، ولادت ۱۲۴۴ھ (۱۸۲۸ء) میں بمقام لکھنؤ ہوئی۔ درس علمائے فرنگی محل سے حاصل کیا، عربی اور فارسی پر عبور کامل رکھتے تھے۔ زندگی کا بڑا حصہ لکھنؤ اور رام پور میں گزرا، حیدرآباد میں نظام کی دعوت پر گئے وہیں بیمار پڑے اور سفر آخرت اختیار کیا۔ ۱۸ ۱۳۱۸ھ (۱۹۰۰ء)

امیر کا واجد علی شاہ سے تعلق

امیر، اسیر کے شاگرد رشید تھے، اسی توسل سے واجد علی شاہ کی بارگاہ میں باریاب ہوئے، اسی زمانہ میں بادشاہ والا جاہ کی فرمائش سے دو کتابیں لکھیں۔

(۱) ارشاد السلطان

(۲) ہدایت السلطان

لیکن اب یہ کتابیں کہیں نہیں ملتیں۔ کبریت احمر کا درجہ رکھتی ہیں۔ واجد علی شاہ کے دربار میں بہت خوش اور مطمئن تھے، کہتے ہیں

ہے اگر گردوں مخالف غم نہیں مجھ کو امیر
میں ہوں ظل دامن شاہ ابو المنصور میں

---

[1] ادیب الہ آباد (جولائی ۱۹۱۰ء)

مذکورہ کتابوں کے صلہ میں خلعت فاخرہ اور انعام سے سرفراز ہوئے[1]

غدر کے بعد تباہی غدر کے بعد کی تباہیوں اور بربادیوں سے امیر کو بھی دوچار ہونا پڑا ۱۸۵۷ء میں امیر لکھنؤ ہی میں موجود تھے چنانچہ اس زمانہ کے مصائب کا ذکر ایک رباعی میں کیا ہے جس کے دو مصرعے یہ ہیں:۔

گھر کھدنے کی پوچھو نہ مصیبت ہم سے
روتی ہے پٹ پٹ کے حسرت ہم سے[2]

امیر کا بہت بڑا کارنامہ امیر کا بہت بڑا لیکن نامکمل کارنامہ، امیر اللغات کی تدوین و تالیف ہے، یوں تو انہوں نے بہت سی کتابیں علوم و فنون اور اصناف شاعری پر تصنیف و تالیف کیں۔ لیکن جس دقت نظر محنت اور کمال استناد کے ساتھ ترتیب لغت کا کارنامہ انجام دیا۔ یہ ان ہی کا حصہ تھا۔ اور کوئی شبہ نہیں اس میں کوئی ان کا حریف نہیں ۱۸۹۱ء میں امیر اللغات کا پہلا حصہ (جس میں الف ممدودہ تھا) اور ۱۸۹۲ء میں دوسرا حصہ (جس میں الف مقصورہ تھا) شائع ہوا۔ ڈاکٹر سرسید احمد خاں مرحوم ریویو فرماتے ہیں کہ "جو ڈھنگ انہوں نے اس نمونہ میں اختیار کیا ہے۔ اگر اس طرح یہ کتاب انجام کو پہنچی تو کوئی لغت کسی زبان میں باقی نہ رہے گا اگر شرط لگائی جائے جب بھی کوئی ایسا لغت نہیں ملنے کا جو اس کتاب میں نہ ہو۔ بہت سی زبانیں ایسی ہیں جو لغت کی زبانیں ایسی ہیں جو لغت کی کتابوں کی بدولت مہذب اور مستند اور علمی زبانوں میں داخل ہو گئی ہیں اور اب ہمارے مخدوم امیر احمد اور ان کی امیر اللغات کی بدولت اردو بھی اسی درجہ کی زبانوں میں داخل ہو جائے گی۔ بعض نکتہ چینیوں نے اعتراضات کئے۔ لیکن منشی صاحب نے کسی کا جواب دینے کی ضرورت نہ سمجھی، خود خاموشی اختیار کی اور اپنے شاگردوں کو بھی جواب دینے سے منع فرمایا ان کا ہمیشہ یہ مسلک رہا کہ "اخباروں میں جو کچھ میری نسبت کبھی کسی مہربان کی مہربانی سے چھپتا ہے میں نہ خود کبھی اس کا جواب دیتا ہوں نہ کسی دوست اور نہ کسی شاگرد کو اجازت دیتا ہوں، مشرب یہ ہے کہ اگر جو کچھ لکھا گیا ہے۔ وہ سچ اور صحیح ہے۔ تو منفعل ہونا چاہیے اور آئندہ احتراز کرنا چاہیے۔ اور اگر تعصب سے غلط بات لکھی ہو تو صبر کرنا چاہیے۔ رد و قدح میں طول محل ہوگا"[3]

---

[1] تاریخ ادب اردو (سکسینہ) صفحہ ۲۵۸

[2] لکھنؤ کا دبستان شاعری صفحہ ۵۹۲

[3] طرہ امیر (امیر احمد علوی بی۔ اے) صفحہ ۶۶

سیرت و شخصیت منشی صاحب ایک پیکر متانت اور مجسم تہذیب تھے۔ شرم وحیا، دیانت و امانت ان کے اخلاق کا خاص جوہر تھی۔ طبیعت نہایت محبت والی پائی تھی۔ راستبازی اور ہمدردی سے بھرے ہوئے۔ نہایت متقی و پرہیزگار اور سادہ مزاج واقع ہوئے تھے۔ کبھی کسی لفظ فحش سے زبان کو آلودہ نہیں کیا۔ نہ کسی کی ہجو لکھی، سچے، پاکباز، صوفی مشرب، احکام قرآنی کے پورے عامل تھے[1]

رنگ سخن امیر کا رنگ سخن خالص لکھنوی تھا۔ لیکن کلام کا اگر بالاستیعاب مطالعہ کیا جائے تو ماننا پڑے گا، درد والم، اور سوز وحسرت کی بجلیاں بھی بھری ہوئی ہیں، امیر کے بہت سے اشعار زبان زد خاص وعام ہو چکے ہیں جنھیں اب تک مزے لے لے کر لوگ پڑھتے ہیں اور جب تک اردو زبان زندہ ہے پڑھتے رہیں گے اور ان کا یہ شعر۔

قریب ہے یار روز محشر چھپے گا کشتوں کا خون کیونکر
جو چپ رہے گی زبان خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

ہماری زبان اور لٹریچر کا حصہ بن گیا ہے۔ اس کے بارہ میں ایک مورخ ادب کہتا ہے وہ اس شعر کو مسٹر جسٹس محمود نے اپنے ایک فیصلہ میں بطور سند کے لکھا تھا[2]

انتخاب کلام ذیل میں چند اشعار کلام امیر سے منتخب کر کے پیش کئے جاتے ہیں۔

بہ باد قصر تن جو ہوا بن گئی لحد ــــ وہ گھر جو گر پڑا تو یہ تعمیر ہو گیا
تیرے مریض غم کی نہیں آج کچھ خبر ــــ سنتے ہیں حال کل تو نہایت سقیم تھا
سامان عفو کیا میں کہوں مختصر یہ ہے ــــ بندہ گناہ گار تھا خالق کریم تھا

ملا ہے جن کو دل مصفا بُرے کو بھی دیکھتے ہیں اچھا
پڑے گا عکس آئینہ میں سیدھا ہزار الٹا ہو خط نگین گا

کہاں کا کعبہ ہے دیر کیسا بتاؤ کوچے کا اس کے رستہ
میں پوچھتا ہوں پتہ کہیں کا نشان دیتے ہو تم کہیں کا

اگرچہ پیری میں ناتواں ہیں شباب کے کچھ اثر عیاں ہیں
نہیں یہ بازو میں جھریاں ہیں نشاں ہیں چین آستیں کا

---

[1] تاریخ ادب اردو (سکسینہ) صفحہ ۳۶۳
[2] تاریخ ادب اردو (سکسینہ) صفحہ ۳۶۴

رات دن کعبۂ دل میں ہے بتوں کا مجمع
کیا سے کیا ہو گئی اللہ کے گھر کی صورت

اس نزاکت پہ ہیں سو جان سے صدقے قاتل
ہاتھ میں تیغ لچکتی ہے کمر کی صورت

اک جلوے میں غش کر گئے اے حضرت موسیٰ
ہوتے ہیں یہی طالب دیدار کے انداز

ہر موج سے اک لغزش مستانہ ہے پیدا
ہیں آب رواں میں تری رفتار کے انداز

ہجو مے کر رہا تھا منبر پر
ہم جو پہنچے تو پی گیا واعظ

ہے باغ باغ بلبل جس طرح تو چمن میں
پھرتے تھے ہم بھی یونہی خوش خوش کبھی وطن میں

ظالم تجھے دل دیا خطا کی!
بس بس میں پہنچ گیا سزا کو

اے حضرت دل بتوں کو سجدہ
اتنا تو نہ بھولئے خدا کو

رہے وہ جان جہاں یہ جہاں رہے نہ رہے
مکیں کی خیر ہو یا رب مکاں رہے نہ رہے

ابھی مزار پہ احباب فاتحہ پڑھ لیں
پھر اس قدر بھی ہمارا نشاں رہے نہ رہے

ہمارے دل سے ملے گا نہ داغ شوق سجود
جبیں رہے نہ رہے آستاں رہے نہ رہے

چلا تو ہوں پئے اظہار درد دل دیکھوں
حضور یار مجال بیاں رہے نہ رہے

امیر جمع ہیں احباب درد دل کہہ لے
پھر التفات دل دوستاں رہے نہ رہے

مقام وجد ہے اے دل کہ بزم یار میں آئے
ترے دربار میں پہنچے تری سرکار میں گئے

تیر پر تیر چلاؤ تمہیں ڈر کس کا ہے
سینہ کس کا ہے مری جان جگر کس کا ہے

دیر میں کون ہے کعبہ میں گذر کس کا ہے
یار کا گھر ہے اگر یہ تو وہ گھر کس کا ہے

وہ مست ہوں کہ ساغر سے جب میں پا گیا
اک بار یا غفور کہا اور چڑھا گیا

ہاتھ رکھ کر مرے سینہ پہ جگر تھام لیا
تم نے اس وقت تو گرتا ہوا گھر تھام لیا

غم نہیں جی تن سے نکلا دل گیا
مل گئے تم مجھ کو سب کچھ مل گیا

بولے وہ سینہ پہ میرے رکھ کے ہاتھ
کہئے اب تو اضطراب دل گیا؟

اے نگاہ یاس تیرا ہو برا۔
گھر تلک روتا ہوا قاتل گیا۔

تیر کھانے کی ہوس ہے تو جگر پیدا کر
سرفروشی کی تمنا ہے تو سر پیدا کر

اپنی گردش پہ بہت ہے تجھے اے چرخ گھمنڈ
جب میں جانوں کہ شب غم کی سحر پیدا کر

کون مانع ہے کہ در پہ ترے آ بھی نہ سکوں
کیا قدم نقش قدم ہیں کہ اٹھا بھی نہ سکوں

وصل میں چھیڑ نہ اتنا اسے اے شوق وصال
کہ وہ روٹھے تو کسی طرح منا بھی نہ سکوں

شوخی تھی قیامت تری مستانہ ادا میں
انھوں نے قدم چوم لئے لغزش پا میں

آج تو دعوت ہے آپ کو کرنی ہوگی — رند ہوں حضرت واعظ نہیں ہٹنے والے
کی نظر بھی تو نگاہ غلط انداز سے کی — تیر بھی تم نے لگائے تو اچٹنے والے
تھا ابھی وصل کا اقرار ابھی ہے انکار — بارک اللہ زباں دے کے پلٹنے والے

امانتؔ

خدا مغفرت کرے بہت خوب آدمی تھے، اپنے رنگ میں یکتا اور بے ہمتا، شاعر بھی، ڈرامانسٹ بھی، بلا کے ذہین تھے، بات میں بات پیدا کرتے اور بڑی دور کی کوڑی لاتے تھے ہر رنگ میں ہر بات میں اپنی انفرادیت قائم رکھتے تھے، لکھنؤ کے بہت سے شاعروں کے نام مٹ گئے لیکن امانت اس کے باوجود اب تک زندہ ہیں کہ زندگی میں بھی حقیر سمجھے گئے اور اب تک ثقافت کی محفل میں ان کا نام لینا بدتمیزی اور گستاخی ہے

زندگی کے مختلف ادوار

سید آغا حسن نام تھا، مرزا کے صاحب زادے تھے، پہلے مرثیہ کہتے رہے، پھر غزل کی طرف توجہ کی، اس راستے سے واسوخت کے خارزار میں دامن الجھایا، یہاں سے آگے بڑھے تو ناٹک کی سبھا میں ادا آموزی کے جوہر دکھانے لگے گویا مسجد سے نکل کر میخانہ پہنچے، وہاں سے زقند لگائی تو کلوار کی بھٹی پر جا کر دم لیا، زندگی، اگر خوش حالی میں نہیں گزاری تو بدحالی میں بھی نہیں کاٹی، مدد لڑکے یادگار چھوڑے، لطافت اور فصاحت، میں نے بچپن میں فصاحت کو دیکھا ہے، لکھنؤ میں میرے نانا ریاض خیرآبادی سے ملنے آئے تھے، وضع و لباس سے معلوم ہوتا ہے، بہت عسرت سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔
امانت نے انتزاع سلطنت اودھ کے کچھ عرصہ بعد ۱۸۵۹ء میں انتقال کیا۔
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

واسوخت

امانت کی شہرت زیادہ تر واسوخت اور اندر سبھا کی رہین منت ہے۔ ۱۸۴۷ء میں ایک محفل منعقد کی اور تمام امرا و رؤسا اور عمائدین شہر کو جمع کر کے بر سر محفل واسوخت پڑھا اور داد کمال حاصل کی، اب واسوخت کو پڑھیے تو مذاق سلیم مجروح ہوگا۔"

لیکن اردو کے ایک اور مورخ، واسوخت کا ذکر کرتے ہوئے دوسری رائے ظاہر کرتے ہیں فرماتے ہیں

"امانت نے ایک واسوخت بھی لکھا ہے۔ جو نہایت اعلیٰ درجہ رکھتا ہے ان کی تصانیف میں واسوخت، اور اندر سبھا کو خاص شہرت حاصل ہوئی"[1]

اندر سبھا

امانت کی اندر سبھا واقعی ایک خاص چیز ہے۔ جس نے ان کی شہرت کو چار چاند لگا دیئے اردو زبان میں یہ سب سے بڑا ڈراما ہے

"اندر سبھا اردو ڈرامہ کی سب سے بڑی تصنیف ہے"[2]

اردو زبان کا ایک اور مورخ اور نقاد، اندر سبھا کے ذکر میں لکھتا ہے :۔

"امانت نے ۱۸۴۹ء میں اندر سبھا کا ایک قصہ نظم کیا، اندر سبھا کے لئے لکھنؤ میں فضا پہلے سے تیار تھی، اختر نگر کے عیش خانے اندر کی سبھا کا مکمل نمونے تھے۔ امانت نے اندر سبھا لکھی تو اسی سے متاثر ہو کر اس کی ترجمانی کی"[3]

اندر سبھا کی غیر معمولی مقبولیت

مولانا عبدالحلیم شرر مغفور نے اس سلسلہ میں جو کچھ لکھا ہے وہ خاص طور پر دلچسپ ہے :۔

"جب قیصر باغ کے میلوں کا دروازہ عوام الناس کے لئے بھی کھل گیا، تو سارے شہر کے شوقینوں میں ڈرامہ کا فن خود بخود ترقی کرنے لگا اور چند ہی روز میں اس شوق کو اس قدر ترقی ہوئی کہ بعض مشہور شعراء بھی ڈرامہ لکھنے لگے۔ چنانچہ میاں امانت نے جو ایک مشاق شاعر تھے اندر سبھا لکھی اور شہر میں مختلف جماعتیں اندر سبھا کو اسٹیج پر کھیلنے لگیں، جن میں کہیں عورتیں اور کہیں لڑکے ایکٹ کرتے۔ اندر سبھا میں اصولِ موسیقی کے مطابق دل کش دھنیں قائم کی گئیں، سارا شہر اندر سبھا کے جلسے دیکھنے کا مشتاق تھا۔ میاں امانت کی اندر سبھا کی کامیابیاں دیکھ کر اور لوگوں کو بھی شوق ہوا۔ اور اس قسم کے بہت سے ڈرامے ایجاد ہو گئے اور سب کا نام "سبھا" قرار پایا، چنانچہ شہر میں مداری لال وغیرہ کی بہت سی سبھائیں قائم ہو گئیں جن کے پلاٹ بدلے ہوئے تھے"

---

[1] تاریخ ادب اردو رام بابو سکسینہ صفحہ ۲۶۲

[2] تاریخ ادب اردو رام بابو سکسینہ صفحہ ۲۶۲

[3] لکھنؤ کا دبستان شاعری صفحہ ۱۷۴

اندر سبھا اردو کا پہلا ڈرامہ ہے | مولانا شرر فرماتے ہیں:-

"اندر سبھا کے رنگ نے شہر میں ایسی زندہ دلی پیدا کر دی کہ سوا اندر سبھا کے لوگ اور کسی قسم کا ناچ گانا پسند ہی نہ کرتے تھے، ہر طرف سبھاؤں کی دھوم تھی پارسیوں کا پہلا خام کھیل امانت کی اندر سبھا تھا۔ اس میں شک نہیں کیا جا سکتا کہ اردو ڈرامہ کی بنیاد خاص لکھنؤ ہی میں پڑی اور یہیں سے سارے ہندوستان میں اس کا رواج ہوا۔"[1]

اندر سبھا پر تنقید | ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے اندر سبھا پر جچا تلا تبصرہ کیا ہے، وہ کہتے ہیں:-

"فنی نقطہ نظر سے اندر سبھا مشکل سے ڈرامہ کہی جا سکتی ہے اس میں ساری کہانی عمل اور کرداروں سے ادا ہوتی ہے اور یہ کردار بھی کاٹھ کی پتلیاں معلوم ہوتے ہیں، یہ حرکت کرتے ہیں، ان کا لباس الگ الگ ہے، لیکن اس لباس میں کسی کردار کی انفرادیت نظر نہیں آتی اس کا کوئی واضح اور مرتب پلاٹ نہیں، نہ اس میں آغاز انجام اور نقطۂ عروج کی منزلیں آتی ہیں، نہ اس میں SUSPENCE پیدا ہوتا ہے لیکن ان تمام خامیوں کے باوجود، یہی اردو ڈرامے کا نقش اول ہے اور اس کا ماخذ فارسی، یا عربی، یا مغربی زبانوں سے نہیں ہے بلکہ اس کا سلسلہ —— ناٹک —— اور لیلا سے ملتا ہے، اس لئے ملکی عناصر اس میں غالب ہیں، اس میں فنی پہلو کا اتنا لحاظ نہیں رکھا گیا ہے، جتنا عوام کی دلچسپی اور تفریح کا، یہی وجہ ہے کہ مطبوعہ اندر سبھا کے ۴۰ صفحات میں ۳۱ غزلیں اور ۴۳ دوسرے گیت ہیں، جتنا وقت پوری سبھا پر صرف ہوتا ہے، اس کا بڑا حصہ ان گانوں اور رقص کے لئے مخصوص ہو گیا ہے۔"[2]

اندر سبھا کا نمونہ | داسوخت کا کچھ حصہ تو بطور نمونہ پیش کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا، لیکن اندر سبھا کا کچھ نمونہ ہم ذیل پیش کرتے ہیں۔ اس سے امانت کی ذہانت کی طباعی، زبان اور محاورہ پر دسترس، بیان و اسلوب پر ماہرانہ قدرت کا اندازہ ہو جائے گا۔ ہمارے پیش

---

[1] گزشتہ لکھنؤ (شرر) صفحہ ۸۷

[2] لکھنؤ کا دبستان شاعری صفحہ ۵۹۵

نظر ابوالعلائی پریس آگرہ کی چھپی ہوئی با تصویر اندرسبھا ہے۔

راجہ اندر کی آمد - زمدکلام اور حسن بیان دیکھئے

سبھا میں دوستو اندر کی آمد آمد ہے
پری جمالوں کے افسر کی آمد آمد ہے
خوشی سے چہچہے لازم ہے صورت بلبل
کہ اس چمن میں گل تر کی آمد آمد ہے
غضب کا گانا ہے اور ناچ ہے قیامت کا
بپا فتنہ محشر کی آمد آمد ہے

شعر خوانی پکھراج پری کی | پکھراج پری، سبھا میں، پناہ فخریہ، گاتی ہے۔ زبان کی حلاوت اور کلام کی برجستگی دیکھئے:۔

پھندے سے مرے کوئی نکلنے نہیں پاتا
اس گلشن عالم میں بچھادام ہے میرا
میں لاکھ کی دو لاکھ کی پروا نہیں کرتی
قارون کا گنجا نہ اچھی انعام ہے میرا
کہتے ہیں جہاں میں جسے انسان گل و بلبل
یہ رخ ہے وہ گیسوے سیہ فام ہے میرا
بدمست مجھے دیکھ کے ہوتی ہے خدائی
معمور مئے حسن سے کیا جام ہے میرا
کرتی ہوں دل و جاں سے میں راجہ کی پرستش
کہتے ہیں جسے کفر وہ اسلام ہے میرا

غزل | یہ غزل دیکھئے محاکات، معاملہ بندی، رعایت لفظی اور اس عہد کی معاشرتی تاریخ کے کیسے بیباک جلوے نظر آتے ہیں۔ پکھراج پری گاتی ہے، پہلے "چاہِ یوسف" کا منظر دیکھئے:۔

بیداد مجھے یاد ہے واللہ تمہاری
یوسف کی قسم اب نہ کروں چاہ تمہاری
عاشق کی مراد آئے رقیبوں کو الم ہو

جائے جو سواری کبھی درگاہ تمہاری
بت بن گئے محفل میں رقیبوں سے نہ بولے
کیا بات ہے خالق کی قسم واہ تمہاری
بوسہ جو طلب میں نے کیا ہنس کے وہ بولے
سرکار سے موقوف ہے تنخواہ تمہاری

سبز پری کی شعر خوانی

اب ذرا سبز پری کی غزل سرائی بھی سن لیجیے۔ کہتی ہے:۔

معمور ہوں شوخی سے شرارت سے بھری ہوں
دھانی مری پوشاک ہے میں سبز پری ہوں
کیا اصل ہے سبزہ کی مرے حسن کے آگے
فیروزہ سے خوش رنگ، زمرد سے کھری ہوں
شعلہ ہوں، بھبوکا ہوں غضب ہے مرا غصہ
جل جائیں پری زاد جو میں گرم ذری ہوں
وہ شمع میں پروانہ، وہ ہے سرو، میں قمری
وہ گل ہے جہاں میں، میں نسیم سحری ہوں

باب (۷)

عہدِ واجد علی شاہ کی صحافت

عہدِ واجد علی شاہ کی صحافت بھی ایک مخصوص رنگ کی حامل تھی اور شاید سارے ہندوستان میں اپنے تنوع رنگارنگی اور شعلہ بیانی کے اعتبار سے ممتاز تھی۔ آج سے سو برس پہلے کی صحافت کا آج کی صحافت سے موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن جو نمونے ہم نے پیش کئے ہیں ان سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس عہد کی صحافت کا اٹھان کتنا شاندار اور امید افزا تھا۔

اب ہم عہدِ واجدی (انتزاعِ سلطنت سے قبل اور بعد) کی صحافت کی مختصر تاریخ، مع مختصر نمونوں کے پیش کرتے ہیں:۔

"اردو اخبار کا دور اب سے بچانوے برس پہلے شروع ہوتا ہے۔ قیاس چاہتا ہے کہ اس ایک صدی کے تمام سنہ وار نمونے مل سکتے ہیں لیکن اس وقت کی سعی کوشش پوری کامیاب نہیں ہو سکی مجبوراً جس قدر نمونے دستیاب ہوئے انھیں کو زبان کی ارتقائی رفتار کے لحاظ سے ۴ ادوار میں منقسم کر دیا گیا، قبل اس کے کہ ادوار مذکور کی تفصیل لکھی جائے دورِ اول کے متعلق مشہور مستشرق گارساں دتاسی کے ایک لیکچر کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے جس سے اندازہ ہو سکے گا کہ ۱۸۳۶ء کے بعد ۱۸۵۲ء تک کتنے اردو اخبار اشاعت پذیر ہو چکے تھے۔

۱۸۵۰ء سے نئے سنگی مطبع قائم ہوئے ہیں جہاں سے دلچسپ کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ نئے رسالے اور اخبار بھی جاری ہوئے اور پرانے تقریباً سب کے سب زندہ ہیں۔ ان مطبعوں سے مفصلہ ذیل ہندوستانی اخبار شائع ہوتے ہیں۔

آگرے سے مطبع الاخبار جو شہر آگرہ میں خوب بکتا ہے ایک اردو اخبار اسی شہر سے نکلتا ہے جس کا نام قطب الاخبار ہے۔ جس میں مذہب اسلام کے متعلق بحث ہوتی ہے، اخبار النواح (؟) پہلے ایک علمی پرچہ تھا۔ مگر اب معمولی خبروں کا اخبار ہے، آگرہ گورنمنٹ گزٹ سرکاری اخبار ہے اور ہندوستانی اور انگریزی دونوں زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اب اگر ہم دہلی کی طرف رجوع کریں، تو وہاں "سراج الاخبار" ہے جو اس شہر کا سب سے پرانا اخبار ہے "دہلی اردو اخبار" اردو میں چھپتا ہے "مظہر الحق" اس کے ایڈیٹر ایک صاحب محمد علی ہیں جن کی اسی نام کی ایک تالیف ہے "قران السعدین" ایک باتصویر اخبار ہے جس میں سائنس، ادب اور

سیاست سے بحث ہوتی ہے ہفتہ میں ایک بار پیر کے روز شائع ہوتا ہے "رفیق الاخبار" ہندوؤں کا ہے۔ میرٹھ میں ہندوؤں کی اخبار میں ایک "مفتاح الاخبار" جس کے . . . . . ایڈیٹر محبوب علی ہیں۔ انہوں نے "ہندوستانی نعت اللغات" کا بھی خلاصہ لکھا ہے جو لکھنؤ میں ۱۸۴۸ء میں جمع ہوا۔ دوسرا اخبار "جام جہاں نما" ہے اس اخبار میں علاوہ معمولی خبروں کے سرکاری گزٹ اور ممالک مغربی و شمالی کی عدالت العالیہ (سپریم کورٹ) کے فیصلوں کے اقتباسات بھی درج ہوتے ہیں بنارس میں چھ ہندوستانی اخبار ہیں، ان میں سے دو اخباروں کا ایک ہی ایڈیٹر ہے، ایک ہندی یعنی دیوناگری حروف میں، دوسرا یعنی فارسی حروف میں شائع ہوتا ہے پہلے کا نام "بنارس اخبار" ہے۔ بنارس کا تیسرا ہندوستانی اخبار "سدھاکر" ہے پہلے ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں نکلتا تھا، مگر اب صرف ہندی میں شائع ہوتا ہے، چوتھا اخبار "باغ و بہار" ہے جس کا نام اسی نام کی مشہور کتاب پر رکھا گیا ہے۔ پانچواں اخبار "سائرین ہند" (؟) ہے یہ ۲ ہفتے میں ایک بار چھوٹی تقطیع کے آٹھ صفحوں پر چھپتا ہے اور ہر صفحے میں دو کالم ہیں علاوہ معمولی خبروں کے جو کسی قدر تفصیل سے لکھی جاتی ہیں، اس میں مختلف قسم کے مضامین ہوتے ہیں۔ چھٹا اخبار "بنارس ہرکارا" ہے جو ۱۸۵۰ء سے اب تک نکل رہا ہے۔ بریلی سے "عمدۃ الاخبار" شائع ہوتا ہے۔ اس کے ایڈیٹر لکشمی پرشاد ہیں، مرزاپور سے "خیر خواہ ہند" نکلتا ہے، یہ امریکی پروٹسٹنٹ مشن کا اخبار ہے "شملہ اخبار" شملے سے شائع ہوتا ہے جسے آج کل شیخ عبداللہ مرتب کرتے ہیں اور اندور کا اخبار جو مالوے کا دارالحکومت ہے "مالوہ اخبار" ہے، یہ آٹھ صفحوں کا ہفتہ واری ہے اس کے ایک کالم میں اردو اور دوسرے میں ہندی ہوتی ہے۔ اس کے ایڈیٹر دھرم نرائن ہیں۔ بھرت پور صوبہ آگرہ میں ہے وہاں کا اخبار "مظہر السرور" ہے مالوہ اخبار کی طرح اس کے ایک کالم میں اردو اور دوسرے میں ہندی ہوتی ہے اب ہم پنجاب کے اخباروں پر ایک نظر ڈالتے ہیں، ان کے ناموں سے دیکھنے سے خیال ہوتا ہے کہ وہ روشنی علم کی اشاعت میں زیادہ کوشاں ہیں کیوں کہ وہاں کے اخبارات کے ناموں کے ساتھ اکثر نور کا لفظ لگا رہتا ہے، مثلاً دریائے نور جو لاہور کا اخبار ہے، ایک دوسرا جو ہفتے میں دو بار شائع ہوتا ہے "کوہ نور"، لدھیانے کا اخبار "نور علی نور" ہے جسے محمد حسین نے ۱۸۵۱ء میں جاری کیا تھا امرت سر سے "باغ نور" اور ملتان سے جو اسی نام کے صوبے کا دارالحکومت ہے "ریاض نور" نکلتا ہے۔

(ماخوذ از رسالہ اردو جولائی ۱۹۲۳ء)

گارسن تاسی نے اپنی تفصیل میں (۲۸) اخباروں کے نام لکھے ہیں، جن کی ابتداء ۱۸۳۵ء کے بعد ہوئی ہے۔ اردو اخباروں کا انحصار اس تعداد پر نہ سمجھنا چاہیے۔ بلکہ اس عہد میں اور اخبار بھی شائع ہوئے

جو کچھ دنوں رہ کر بند ہو گئے مثلاً — سید الاخبار، اخبار دہلی پہلا اخبار سر سید احمد خاں کے بھائی نے نکالا تھا اور دوسرے کے ایڈیٹر معین الدین تھے۔ یہ دونوں ہفتہ وار اخبار تھے۔ اخبار دہلی جس کا ایک ورق حالات حضور والا کے عنوان سے بادشاہ کے مخصوص حالات کے لئے وقف ہوتا تھا اس کا ایک پرچہ عنبری (۱۵۰) جلد (۳) بابت ۵ جنوری ۱۸۴۰ء یوم یک شنبہ مع دیگر نمبروں کے بھوپال کے حمیدیہ لائبریری میں محفوظ ہے اس اخبار کی حیثیت سرکاری یا نیم سرکاری تھی۔ اس میں شاہی کمپنی کے سفراء کی باریابی کے حالات کمپنی کی درخواستیں موسومہ بادشاہ درج ہوتی تھیں۔ دنیا بھر کی ضروری خبریں خصوصاً افغانستان اور ٹرکی کے انگلستان اور روس سے آویزش کے واقعات بھی چھپتے تھے۔ اخبار کے نمونوں میں جو دور قائم کئے گئے ہیں اگرچہ ان کے اشارات ہر صفحے کے عنوان پر موجود ہیں لیکن یہاں مزید تشریح کر کے ہر دور کی زبان اور اسالیب بیان کی خصوصیات لکھی جاتی ہیں۔

پہلا دور بہ ترتیب اندراج ۱۲۶۳ھ، ۱۸۴۷ء سے شروع ہو کر ۱۲۷۲ھ و ۱۸۵۶ء تک ختم ہوتا ہے لیکن اس کی ابتدا ۱۸۳۵ء ہ ۱۲۵۰ھ سے سمجھنی چاہئیے۔ اگرچہ سنوات گذشتہ (۱۰) سال کے نمونے بوجہ عدم دست یابی درج نہیں ہوسکے ہیں۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جو زبان ۱۸۴۷ء میں بولی جاتی تھی، وہی اندازاً دس بارہ برس پہلے تھا جس کا ثبوت دوسری تصنیفوں سے بآسانی مل رہا ہے۔ بہرحال اس دور کے اخبار دہلی کی حالت بلحاظ نوعیت مضامین عموماً مہتمم اخبار کے مذاق کی تابع پائی جاتی ہے جس ایڈیٹر کو جس فن میں تو غل ہوتا تھا اس مذاق کا عنصر اخبار میں زیادہ پایا جاتا تھا۔ اب رہیں خبریں ان کی حالت ظاہر ہے کہ اس زمانہ میں وسائل مضامین کی جو محدود حالت تھی۔ اس کا اثر خبروں کی صحت و عدم صحت پر پڑتا تھا۔ اکثر خبروں کا اندراج کہانی اور افسانوں کے رنگ میں ہوتا تھا نیز ان کی تصدیق کا کوئی خاص اہتمام نہ تھا۔ مثلاً پاٹن بھالا کی خبر مطبوعہ سعد الاخبار نمبر (۴) ۱۸۴۷ء۔ اسی طرح لکھنؤ کے اخبار طلسم اور ساحر سامری کی مقفی اور مسجع عبارتوں کو دیکھا جائے اور پھر ان خبروں سے اس عہد کے ارتقاء ذہنی پر نظر ڈالی جائے کہ غدر کا پر آشوب زمانہ ہے، سلطنت تباہ ہو رہی ہے، بادشاہ کو نظر بند کر کے کلکتے بھیجا جاتا ہے۔ بادشاہ کی والدہ اسی پریشانی میں ولی عہد کے ساتھ ولایت جاتی ہے یہ واقعات جس انداز سے مشتہر کئے جاتے ہیں ان کا اسلوب بیان فسانۂ عجائب یا طلسم ہوش ربا سے کم نہیں، خصوصاً یہ بیان کہ کوئین وکٹوریہ نے شکارگاہ سے جناب عالیہ والدہ شاہ اودھ کو لکھا کہ "بادشاہی کوٹھی میں اتریئے۔ ہر طرح کا سامان آرام سرکار سے بے خطر لیجئے" ——— اضطراب

له ماخوذ از رسالہ زمانہ کان پور۔

کا مقام نہیں گھبرانے کا ہنگام نہیں ڈیڑھ مہینہ میں ہم آتے ہیں تمھیں مراد کو پہنچاتے ہیں "عجیب مضحکہ آمیز اور تعجب خیز ہے یہ رنگ تحریر زیادہ دیر پا نہ تھا اور عموماً لکھنؤ یا اس کے قرب و جوار پر چھایا ہوا تھا، پنجاب کے اخبار اس زمانے میں بھی سیاسی مذاق اور رجحان کے تابع نظر آتے ہیں۔ ان میں ایسی باتیں ضرور ملتی ہیں جو اخبار کے مقاصد کو کم و بیش پورا کرتی رہتی تھیں

دوسرا دور ۱۸۵۷ء، ۱۲۷۳ھ سے ۱۸۸۲ء، ۱۳۰۰ھ تک قائم کیا گیا ہے۔ اس عہد میں اخباروں کی زبان بھی بدلی ہوئی ہے اور نوعیت مضامین کی فضا بھی معمولی خبروں سے گزر کر علمی اور تاریخی معلومات کے میدانوں میں چھائی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس خصوص میں اودھ اخبار لکھنؤ اور سب سے زیادہ سائنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ کی کوشش اپنے عہد کے تمام اخباروں کی تبدیلی مذاق کا باعث ہیں

تیسرا دور ۱۸۸۲ء، ۱۳۰۰ھ سے ۱۹۰۰ء، ۱۳۱۹ھ تک اور اس کے بعد سے اس وقت تک۔ (یعنی ۱۹۳۰ء، ۱۳۴۹ھ) چوتھا دور شروع کیا گیا ہے۔ اس نصف صدی میں دونوں عہدوں کی زبانوں میں کوئی خاص امتیاز و فرق نہیں۔ البتہ خیالات کا تغیر و تبدل اور جذبات کا جزر و مد ہر دو کی طرز نگارش کو جدا جدا دکھاتا ہے، تیسرے دور تک زیادہ تر تعلیمی، تاریخی، مذہبی وغیرہ مضامین کا عنصر اخباروں میں نظر آتا ہے بیسویں صدی عیسوی کے شروع ہوتے ہی ساری قوت، تمام توجہ سیاسی، ملکی اور قومی ریفارم کی طرف مبذول کر دی گئی۔ انیسویں صدی عیسوی کے آخر تک جو اخبار حکومت کے ہم آواز تھے وہ سودیشی اور بدیشی یا کوآپریشن اور نان کوآپریشن (COOPERATION AND NON COOPERATION) کے میدانوں میں ایسی ایسی بلند پروازیاں دکھانے لگے جن کی مثال کم سے کم ہندوستان میں اب سے پہلے نظر نہیں آتی تھی، اس ہنگامہ و انقلاب سے اردو زبان کو نقصان بھی پہنچا یا اور فائدہ بھی نقصان تو یہ کہ اب تک اردو جس حیثیت سے فطرت کے مطابق فصاحت و سلاست کی روش پر روش ترقی کر رہی تھی اس میں بہت سی الجھنیں پیدا کر دی گئیں اور فائدہ یہ کہ اس طوفان و جوش کی بدولت سیکڑوں الفاظ ایسے فراہم ہو گئے جن سے توسیع زبان کی فہرست میں معتد بہ اضافہ ہو گیا۔ چونکہ یہ سب واقعات زمانہ حال کے ہیں اور عصر حاضر میں اخبار بین نگاہیں عام طور سے کھلی ہوئی ہیں اس لئے ان باتوں کی مزید توضیح تحصیل حاصل ہے۔

اخباروں کے چاروں ادوار میں جتنے نمونے لکھے گئے ہیں۔ وہ بلحاظ تعداد بہت کم ہیں، یہ کمی اس لئے روا رکھی گئی کہ فی زمانہ اخبار پڑھنے کا مذاق عام ہو رہا ہے اور اکثر علم دوست افراد اخباروں کے حالات سے کم و بیش واقفیت رکھتے ہیں۔ لہذا مناسب سمجھا کہ ہر دور کے دو چار اخبار پیش کر کے باقی کا اندازہ ان کے قیاس پر چھوڑ دیا جائے۔ مزید معلومات کے لئے ذیل میں ہر دور کے چند اخباروں کے نام مع مقام اشاعت

درج کیے جاتے ہیں تاکہ ان کے اندراج یکجائی سے تلاش و جستجو کی زحمت کم ہو جائے۔

عام فہرست

نمبر شمار	نام اخبار	مقام اشاعت	زمانہ اشاعت	نمبر شمار	نام اخبار	مقام اشاعت	زمانہ اشاعت
۱	مطبع الاخبار	آگرہ	دور اول ۱۸۳۵ء تا ۱۸۵۷ء	۱۴	سعد اخبار	اندور	دور اول ۱۸۳۵ء تا ۱۸۵۷ء
۲	قطب الاخبار	"	"	۱۵	طلسم	لکھنؤ	"
۳	اخبار النواح	"	"	۱۶	سحر سامری		"
۴	آگرہ گورنمنٹ گزٹ	"	"	۱۷	اودھ اخبار	"	دور دوم ۱۸۵۷ء تا ۱۸۸۲ء
۵	مفتاح الاخبار	میرٹھ	"	۱۸	سائنٹیفک سوسائٹی	علی گڑھ	"
۶	جام جہاں نما	"	"	۱۹	نجم الاخبار	اٹاوہ	"
۷	بنارس اخبار	بنارس	"	۲۰	آگرہ اخبار	آگرہ	"
۸	سدھاکر اخبار	"	"	۲۱	نور الآفاق	کان پور	"
۹	باغ و بہار	"	"	۲۲	نور الانوار	"	"
۱۰	سائرین ہند	"	"	۲۳	تہذیب الاخلاق	علی گڑھ	"
۱۱	بنارس ہرکارا	"	"	۲۴	امداد الاخلاق	کان پور	"
۱۲	عمدۃ الاخبار	بریلی	"	۲۵	اختر شاہنشاہی	لکھنؤ	"
۱۳	خیر خواہ ہند	مرزا پور	"	۲۶	اودھ پنچ	"	"

نمونہ نمبر ۳

اخبار

پہلا دور
۱۲۶۳ھ سے ۱۲۷۲ھ تک
۱۸۴۷ء ۱۸۵۶ء

شمار	اخبار مع مقام	زمانہ اجراء	تاریخ تحریر نمونہ نمبر	نمونہ عبارت
نمبر ۱	سعد الاخبار آگرہ	۱۲۶۳ھ ۱۸۴۶ء	نمبر ۱۸ محرم ۱۲۶۴ھ جلد (۱) [illegible]	عبارت سرورق یہ اخبار ہفتے میں ایک بار دوشنبے کے دن چھپتا ہے قیمت اس کی ۸ ماہینہ اور محصول ڈاک ذمہ خریدار اس اخبار میں جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے

زمانہ متبرکہ کا حال تھوڑا تھوڑا ہر اخبار میں چھاپا جاتا ہے۔ جب بفضلہ یہ سال تمام ہو جائے گا، تو اہل بیت اور خلفاء اربعہ اور معرکہ جگر سوز کربلا اور دوازدہ امام علیہم الصلاۃ والسلام کے حالات بلا کم و کاست تبد ریج و تفریق لکھے جائیں گے تاکہ عوام الناس کو ان حالاتِ فیض سماعات سے بخوبی آگاہی حاصل ہو۔

پاٹن جھالا کی خبر

صاحب زبدۃ الاخبار (لاہور) اپنے ایک دوست کے خط کی رو سے تحریر فرماتے ہیں کہ پاٹن جھالا میں ایک روز عجیب ماجرا ہوا کہ جنگل سے ایک صحرائی خوک شہر میں وارد ہوا اور مہاراجہ مدن سنگھ بہادر کے محل میں وارد ہو گیا ہر چند لوگوں نے روکا مگر نہ رکا۔ حتیٰ کہ اندر جا کے مہاراجہ کی مسند پر بیٹھ گیا سپاہیوں نے خوب تلواریں چلائیں اور اسے مجروح کر کے مسند سے دور ڈال دیا۔ خوک مجروح پھر دوڑ کر مسند پر جا بیٹھا۔ تین بار ایسا ہی اتفاق ہوا۔ آخرالامر اس سور کو مار ڈالا۔ اس ملک کے نجومی اس امر کو ریاست کے حق میں منحوس جانتے ہیں۔

صدرالاخبار (بمبئی) سے معلوم ہوا کہ وہاں کے نجومیوں نے اقرار کیا ہے کہ پندرہ تاریخ کو یہاں بڑی آندھی آوے گی۔ لوگ ان کے کہنے سے خوف زدہ ہو رہے ہیں۔ (۳۹۴، ۳۹۵)

شمار	اخبار و مقام	زمانہ اجراء	زمانہ نمونہ	نمونہ عبارت
نمبر ۵	[illegible] (لکھنؤ)	×	۵ ستمبر ۱۲۷۲ھ ۱۸۵۶ء	اب تازہ سنیئے با صاحب موصوف (لارنس صاحب چیف کمشنر) نے چودھویں تک اس امر کی میعاد ٹھیرائی ہے مگر محلات نے جو حضرت کی طرف سے جواب کے منتظر تھے مکانات خالی کر دینے میں جلدی

نہ فرمائی جب میعاد سے کئی دن زیادہ گزرے تو صاحب چیف کمشنر بہادر نے پھر تاکید کی جب سررشتہ صاحب منتظم کے نام چٹھی لکھی منتظم نے اس پر بھی محلات کو حکومت نہ جتائی۔ سوا افہام تفہیم کے کچھ زبردستی نہ دکھائی یہاں تک کہ تاکید شدید سے مامور ہوئے شدت کرنے میں ناچار ہوئے مجبور ہوگئے آخر عذر محرم وغیرہ محلات شاہی کا مسموع نہ کیا شبا شب مع اسباب سب کو اٹھایا۔ رات کے سبب سے جو کھاٹ کباڑ باقی رہا دن کو چینی بازار کے تھانے دار کی تاکید سے اٹھا غرض بیٹھے بٹھائے کیا پریشانی اٹھائی زمانے کی گردش نے عجب ویرانی دکھائی۔ تمام خلق کو رقت تھی یہ حیرانی دیکھ کر حیرت تھی دیکھنے والوں کا دل کڑھتا تھا۔ مگر کیا ہو سکتا تھا۔ ایک دوسرے کا منہ تکتا تھا۔ روتا تھا۔ بلکتا تھا

۳-اکتوبر

منگل سین والی کوٹھی میں پرسوں نیلام ہوتا رہا ہر روز صبح سے دس بجے تک وہی سودا رہا۔ ۲۲ ستمبر کے نیلام میں ایک سیف گجراتی نکلی جس کا لوہا ایسا اچھا تھا کہ اس پر سرکار ابوالمنصور خاں بہادر صفدر جنگ آب زر سے لکھا تھا ۲۴ تاریخ چھ روپے کو ایک توڑے دار بندوق کا نیلام دیکھا ابوالمنصور خاں بہادر اور محمد یونس کاری گر کا نام منقوش تھا۔ ایک بندوق پر نواب شجاع الدولہ بہادر تحریر تھا۔ دوسری پر وزیر الملک آصف الدولہ بہادر رقم پذیر تھا۔ پانچ پانچ سو سو دو توں چھوٹیں دیکھنے والوں کی کمریں ٹوٹیں ایک بندوق ساڑھے آٹھ روپے کو بکی تھی جس پر سونے سے یہ عبارت لکھی تھی بحسب فرمائش دائم خان بہادر دائم الدولہ تیار شدہ دس بارہ روپے سے اصفہانی تلواروں کا نیلام ہوا کہ ان پر ابوالمنصور خاں سونے کے پانی سے لکھا تھا یکم اکتوبر کے نیلام میں اور دنوں سے بھی سستا سودا کیا سو روپے کا مال ایک روپے کو بکا رے، ۵-۴-۷-۱۰ء

نمونہ عبارت	زمانہ تحریر	زمانہ اجراء	اخبار و مقام	شمار
خبر فرحت اثر جناب عالیہ والدہ واحد علی شاہ) و مرزا ولی عہد بہادر مرزا سکندر حشمت بہادر مرزا باقر صاحب مرزا ولی عہد کے مصاحب سفر ولایت میں ولی نعمت کے ہمراہ تھے۔ اقبال کی طرح قبول بارگاہ تھے وہاں پہنچ کر ولی نعمت نے نامہ بری کا منصب عنایت کیا۔ حضرت سلطان عالم کے پاس رخصت کیا۔ انگریزی ڈاک کے جہاز پر سوار ہوئے۔ ۱۶-اپریل ۱۲۷۳ھ کو دریا سے	نمبر ۲ جلد اول یکم دسمبر ۱۸۵۶ء روز دوشنبہ	نومبر ۱۲۷۳ھ ۱۸۵۶ء	سحر سامری (لکھنؤ) ہفتہ وار ایڈیٹر منشی کنھیا لال عیاش و پنڈت بیج ناتھ حجم ۸ صفحے قیمت ۱۲ ار ماہوار	نمبر ۶

پار ہوئے حضرت کے نام اپنے حضور کی تحریر لائے گھوڑی وغیرہ اور بہت تحائف دل پذیر لائے اُن کی زبانی ہے دلچسپ کہانی ہے کہ ابھی تک ملکہ فرنگ مصروف سیر و شکار ہیں، مسافران لندن محوِ انتظار ہیں مگر تیر بدعا نشانے سے قریب تر ہے ملکہ فرنگ کی شکار سے پلٹنے کی جلد خبر ہے۔ بڑے بڑے انگریزان جلیل الشان اونچی اونچی کچہری پارلی منٹ کے ارکان ہم زبان ہیں کہ داد گستر سے آنے تک تیغ انصاف جوہر نہاں ہیں ادھر ملکہ شکار گاہ سے پھریں ادھر برگشتہ مقدر کے دن پھر جائیں گے جتنے ستارے گردش کئے ہیں اشک ندامت کی طرح چشم فلک سے گر جائیں گے پھر وہی شاہ اودھ کا دور دورہ ہوگا وہی حشمت کا انداز وہی سلطنت کا طور ہوگا شکستہ خاطروں کو تسلی دیتے ہیں ارا کین دولت تشفی دیتے ہیں کہ گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ دنیا کی کسی بات کا ثبات نہیں ہے انہیں حکام پارلیمنٹ نے اپنے اپنے مکان خالی کر دیئے ایک ایک کو آنکھوں میں جگہ دل میں گھر دیئے۔ ملکہ فرنگ نے پرچہ پیام بھیجا جناب عالیہ کے نام بھیجا جواب لکھا کہ ملکہ عالم رونق افروز ہوئیں، داد طلب داد گستر کے جمال باکمال سے بہرہ اندوز ہوئیں پھر جہاں ارشاد ہوگا رہیں گے اور جب تک دامن دولت سے دور ہیں عیش کیسے آرام کہاں کا ہر طرح کے جور سہیں گے ملکہ عالم نے پھر تحریر فرمایا تشفی کا مضمون سنایا کہ اضطراب کا مقام نہیں گھبرانے کا ہنگام نہیں ڈیڑھ مہینے میں ہم آتے ہیں، تمہیں مراد کو پہنچاتے ہیں مرزا صاحب اس تحریر کے آنے سے دس روز بعد گرم سفر ہوئے، ۲۳ دن راہ میں بسر ہوئے اس حساب سے اب ملکہ عالم ولایت میں آگئی ہوں گی، جناب عالیہ منہ مانگی مراد پاگئی ہوں گی۔

(صفحہ ۴۰۷، ۱۸۱ء)

دُوسرا دَور

۱۲۷۳ھ / ۱۸۵۷ء سے ۱۳۰۰ھ / ۱۸۸۲ء تک

شمار	نام اخبار مع مقام	زمانہ اجراء	ایڈیٹر	زمانہ تحریر	مضمون نگار	نمونہ عبارت
نمبر (۱)	اودھ اخبار لکھنؤ	۱۲۷۴ھ / ۱۸۵۸ء	منشی نول کشور مالک و ایڈیٹر الیجنٹ منشی جانا پرشاد وغیرہ	۱۲۹۰ھ / ۱۸۷۳ء	ایڈیٹر یا نامہ نگار	**شاہ فارس کی آمد** اب ہر لمحہ امید داری دیدار فروخت آثار شہریار کامگاری تھی کبھی خبر اڑتی تھی کہ اب شاہی ریل گاڑی قریب آن پہنچی ہر کہ پیدا می شود از دور پندارم توی

باوجود گرمی اور انتظاری کے ایک طرح کی چہل اور زندہ دلی سبھوں کے دلوں پر چھا رہی تھی کہ یکایک شلک سلامی قلعہ لندن سے چھوٹے ناف لندن کے دنادن دغنے لگیں۔ اب کوئی دقیقے کی بات باقی نہ رہی لیڈیاں معزز مہوش رشک حور یک بارگی جیسے کل کھینچتا ہوا اٹھ کھڑی ہوئیں کہ ٹرین شاہی بھی جیسے کہ مہر از مطلع انور برآید، طالع ہوئی روز انتظار آخر اور شام انتظار کو سحر

دو بارہ لب نہ کشاید صدف بہ ابر بہار
کریم سائل خود را غنی کند یک بار

ایک ہل چل سی ہوئی (نارا تنا) کہ گاڑیوں کے گھوڑے بھی ٹاپیں مارنے لگے اور سبھوں کی آنکھیں نرگس وار ایک طرف ترتیب وار جم گئیں۔

اٹالیس اوپرا کے تماشے میں شاہ کا جانا۔

تو کیا دیکھتے ہیں کہ سات سو پری زاد گل اندام مہر چہرہ زہرہ جبین ماہ تاباں و خورشید درخشاں بہ شیلا ہیں ہر ایک پر لباس زمرد اور مروارید اور الماس ٹکے لگائے ہوئی تھی ضیائے گیس ہیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہزاروں ماہتاب نکلے ہیں اور جو جو راگ اور سوانگ اور کرتب اور تماشے دکھلائے کہ بادشاہ اور ہمراہی حیران ہو گئے۔ آلہی یہ خواب ہے یا سچ مچ کے آدم زاد ہیں یا پریوں کا اکھاڑا اترا ہے خصوصاً جب یہ پریاں تار کے زور سے مثل طائروں کے اڑتی تھیں یکایک سب ہمراہی کی زبان سے واہ واہ کی صدا بلند ہوئی۔ اگر شمہ اس کا بیان لکھوں تو قلم شکن سیاہی ریز کا مصداق دم درکش کا عالم ہو۔ ایک دن شاہ خفیہ طور سے شیش محل دیکھنے گئے۔ اور سادی پوشاک میں تھے دربانوں نے ان کو شاہ کا نوکر سمجھا۔ اس واقع کو پامر نے یوں قلم بند کیا۔ بادشاہ سے بذریعہ مترجم جو فرانسیسی زبان جانتا تھا۔ پوچھا کہ تم کو بادشاہ کی سرکار میں کون عہدہ ہے بادشاہ نے فرمایا خدمت گار خاص اور معتمد علیہ اور چند ہمراہیوں نے کہا کہ بادشاہ ان پر بہت اعتقاد رکھتے ہیں۔ صدہا مہ لقا دختران فرنگ نے اشتیاق گرم جوشی اور لمس انامل نیص (ہاتھ چھونا یا چومنا) ظاہر کیا۔ اکثروں کو اعلیٰ حضرت نے سرفراز فرمایا۔

(۴۰۹ ، ۴۱۱)

شمار	اخبار و مقام	زمانہ اجرا	زمانہ تحریر	نمونہ عبارت
نمبر ۳	محب الاخبار دارالمحبہ ہفتہ وار تعداد صفحے ایڈیٹر محمد یار خاں و حافظ ابوالحسن ابو عبداللہ الدین ایڈیٹر و پبلشر	١٢٦٩ھ ١٨٥٢ء	١٦ جنوری ١٨٨٠ء ١٢٩٦ھ و ٢ نومبر ١٨٨٢ء ١٣٠٠ھ	لب لباب افسران انگریزیہ کابل سے عبدالرحمٰن کو ایسے مضمون کے خطوط بھیج رہے ہیں جس سے اس کی بدگمانی دور ہو اور یہ بھی ارادہ کیا گیا ہے کہ کوہستانی ہندوؤں سے ایک لاکھ روپیہ جو عبدالرحمٰن کو قرض دیا ہے وہ سرکار ادا کر کے رسید عبدالرحمٰن کے پاس بھیج کر ان کو خوش کرے اور اخبار دہلی گزٹ کا کرسپانڈنٹ لکھتا ہے کہ عبدالرحمٰن خاں صرف یہ اصرار کر رہا ہے کہ سرکار انگریزی قندھار

کو بھی چھوڑ دے۔ عبدالرحمٰن خاں کی عمر چالیس برس کی ہے۔

(نمونہ مضمون) اسباب ترقی -

لفظ ترقی کے معنی لغت میں بلند ہونا اور چڑھنا ہے اور عرف میں ایک حال پست سے حال بلند کو پہنچنا ہر چند کہ یہ لفظ عام ہے مگر ترقی ظاہری میں بھی یہی ہو گیا ہے۔ اور اس جگہ مقصد بیان سے بھی یہی معنی ہیں اور بعد عود تین امر جن کے بڑھنے کا نام ترقی ہے اصل اصول ہیں باقی توابع اور فروع اول ان دو مرتبہ ایدہ دو مرتبہ سوم حکومت و تزاید حکومت

(صفحہ ٢١٦، ٤٧، ٢٨)

شمار	اخبار و مقام	زمانہ اجرا	زمانہ تحریر	نمونہ عبارت
نمبر ۴	اکمل الاخبار دہلی (ہفتہ وار) تعداد صفحے مالک و ایڈیٹر محمد اکمل	١٢٨٢ھ ١٨٦٣ء	١٣٠٠ھ ١٨٨٢ء	کالے اور گورے میں فرق ہم مدت سے جانتے تھے کہ قیصر ہند کے عہد آسائش و زیبائش میں گوروں اور کالوں میں کچھ تمیز نہیں ہے دونوں کے ساتھ یکساں سلوک کیا جاتا ہے مگر افسوس مفصلہ ذیل خبر نے ہمارے اس اولٰی خیال کو یک لخت منتقل کر دیا نہ

صرف منتقل کر دیا بلکہ آہ سرد بھڑک پڑا اسے ناظرین وہ خبر کیا ہے؟ سن لیجئے! ایک اخبار معزز سے معلوم ہوا ہے کہ گورنمنٹ تجویز کر رہی ہے کہ گورے مجرموں پر گورے سپاہیوں کا پہرہ ہو کسی نے ہنس دیا تھا

ہائے رے قومی تعصب جس نے ہماری دانا بینا گورنمنٹ کے خیالات کو پلٹ دیا۔ گورنمنٹ کو گوروں کی خاطرداری کس قدر منظور ہے گورنمنٹ گوروں کے مزاج سے ہل مل گئی لیکن افسوس بہت سے دیسی گوروں کے ہاتھ سے تباہ ہو گئے۔ اکثروں نے دیسیوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹا مگر کوئی نہیں اکثر عدالت سے بری کئے گئے ہائے رے افسوس ہندوستان کم بخت تو کب اپنی تاریکی جہالت سے سر اٹھائے گا

(۴۱۸۱، ۴۱۷)

نمونہ عبارت	زمانہ تحریر	زمانہ اجرا	اخبار و مقام	شمار
مشکلے نیست کہ آساں نہ شود ہاں صحیح ہے مگر ہندوستان ایسے ملک میں روپے کی مشکل ام المشکلات ہے۔ جو کوئی اس کو حل کرے بس سمجھ لو اس نے سب کچھ کر لیا۔	جلد ۲۱ نمبر (۲۱۱) ۱۸۹۵ء مطابق ۱۳۱۲ھ	۱۲۹۳ھ ۱۸۷۷ء	اودھ پنچ لکھنؤ سید محمد سجاد حسین ایڈیٹر	نمبر

مرحوم سرسید نے محمڈن کالج کو سخت مشکلات میں مبتلا چھوڑا تھا۔ طرح طرح کے اندیشے ہوتے تھے۔ مگر یار ایمان کی تو یہ ہے کہ علی گڑھ والوں نے وہ جی توڑ کوشش کی قدیمی وضع بھی ڈنکے کی چوٹ نباہی اور مخالفتوں کو بھی خس برابر پروا نہ کی صرف پنجاب کے سفر اور لفٹنٹ گورنر بہادر کی دعوت میں اتنا جمع کر لیا اور اس قدر وعدے لے لئے کہ سب دقتیں رفع دفع ہو گئیں بلکہ اور بھی سرسبزی کے سامان ہو گئے سنتے ہیں صرف ایک مسلمان رئیس محمد رئیس خان صاحب بہادر نے علاوہ پانچ ہزار کے بہت کچھ وعدہ کیا ہے لے ادھر او کالج کے منتظمو! نواب محسن الملک حاجی اسمعیل خاں صاحب مسٹر بک مسٹر ماریسن وغیرہ مسٹر پنچ تمارے ڈز توال دریں سند خوشنودی مزاج بوقت مناسب عطا کردہ خواہد شد۔

تبصرہ اور کیفیت

اودھ پنچ کے نام سے جتنے اخبار شائع ہوئے اور ہوتے ہیں ان میں عموماً مزاحیہ اور مزاقیہ مضامین ہوا کرتے ہیں اودھ پنچ خوبی مضامین لطافت بیان اور صحت زبان کے لحاظ سے تمام پنچوں کا سرتاج کہا جا سکتا ہے اس کے ابتدائی دور میں بڑے بڑے نامی اور مستند اہل قلم مضامین نگار ہیں۔ جن کی یاد دیکھنے والوں کو اب تک نہیں بھولی مذاق مذاق میں سیاسی مباحث اکثر ایسے دل کش اور لطیف پیرائے میں لکھے جاتے ہیں جن کی مثال دوسرے معاصرین اخبار میں نہیں ملتی تھی۔ اس کے نامور ایڈیٹر سید سجاد حسین خاں مرحوم ایک پختہ کار مادر باہوش اہل قلم میں تھے اودھ پنچ ان کے بعد بھی جاری ہے اور موجودہ حالات

میں بھی قابل قدر رہے۔ مگر اب وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی۔

چوتھا دور

شمار	مقام و اخبار	زمانہ اجرا	زمانہ تحریر	نمونہ تحریر
نمبر ۲	مفید عام آگرہ ہفتہ وار ایڈیٹر [illegible] علی خاں صاحب	۱۲۸۵ھ ۱۸۶۰ء	۱۳۲۳ھ ۱۹۰۵ء	پہلے یہ اخبار ۲۶ برس سے مہینے میں صرف تین بار شائع ہوتا تھا حجم صرف آٹھ صفحوں کا تھا اور عام سے دس روپیہ سالانہ قیمت مقرر تھی۔ اب ہم نے ساتویں مئی ۱۹۰۴ء سے مہینے میں چار مرتبہ اشاعت کر دی ہے حجم بارہ صفحوں کا کر دیا ہے

اور عام سے سالانہ قیمت صرف چار روپے مع محصول ڈاک تھا مفید عام میں جنگ کے تازہ تازہ تار درج ہوتے ہیں۔ ہندوستان کے مختلف صوبوں کی خبریں اور صحیح صحیح واقعات درج کئے جاتے ہیں۔ ایڈیٹوریل مضامین کے علاوہ مراسلات میں ہندوستان کے قابل قدر نامہ نگاروں کے مضامین ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی شاعری ہوتی ہے۔ غرض ہمارے اخبار میں علمی اخلاق تاریخی مذہبی اور سوشل رفارمر کے متعلق عمدہ مضامین ہوتے ہیں۔

۲۱ جولائی کو نماز جمعہ سے فارغ ہو کر امیر المومنین سلطان عبدالحمید خاں ثانی الغازی جامع حمیدیہ سے باہر نکلتے کو تھے کہ کسی نابکار نے بمب کا گولہ صحن مسجد میں پھینک دیا۔ جو بڑے زور سے جا کر پھٹا مگر خدا کے فضل و کرم سے جلالت مآب کا بال تک نہ بیکا ہوا۔ البتہ سلطان اردلی کے سواروں ہمراہی افسروں وغیرہ میں سے ۲۴ شہید ہوئے اپنے آقائے نعمت پر تصدق ہو گئے اور ۷۰ اشخاص اور ۵۵ گھوڑے زخمی ہوئے، جلالت مآب نے اس موقع پر حسب معمول شاہانہ خرم و استقلال ظاہر فرمایا کسی قسم کا خوف یا اضطراب آپ کے چہرہ مبارک پر ہویدا نہ ہوا۔ اور اسی تمکنت اور جلال کے ساتھ گاڑی پر ہو کر اپنے جمال کے شائقین کو ہزاروں کی تعداد میں جمع ہوتے ہیں شفقت پدرانہ سے سلام کرتے ہوئے محل سرا کو تشریف لے گئے۔

(۴۲۷، ۴۳۶)

نمونہ عبارت	زمانہ تحریر	زمانہ اجرا	اخبار و مقام	شمار
مسلمانوں میں ایک دھوم مچی ہے کہ سلطان کونین رسول ثقلین حضرت سیدنا احمد مجتبیٰ محمد مصطفےٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم کی رونق افروزی دنیا کا یہ مبارک مہینہ ربیع اول شریف ہے گھر گھر جشن میلاد منایا جارہا ہے اور اس کے انوار و برکات سے حاضرین مستفیض ہوتے ہیں لیکن اب یہ بہت اچھا ہونے لگ گیا ہے کہ فلاں جگہ کیا تقسیم ہو	میلاد رسول نمبر ۳۰ اکتوبر ۱۹۲۲ء نمبر (۱۰) جلد (۵۹)	۱۲۸۳ھ / ۱۸۶۶ء	دبدبۂ سکندری ریاست رامپور (یوپی) ہفتہ وار ایڈیٹر حال مولوی فضل حسین صابری	نمبر ۵

گا آیا لڈو یا بالوشاہیاں یہ ہے ہم لوگوں کے صفت ایمان کی دلیل ہے اگر سرکار دو عالم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم سے خلوص ہے تو حضور پر نور کے جشن میلاد میں بصد خلوص حاضر ہو کر مؤدب بیٹھیں اور آہستہ آہستہ درود شریف پڑھتے رہیں اور یہ خیال رکھیں کہ ہمارے شہنشاہ ذی جاہ احمد مختار صلی اللہ تعالےٰ علیہ وعلےٰ آلہ الاصحاب اس مجلس نورانی میں بنفس نفیس تشریف فرما ہیں ادب کا بہت اہتمام رکھیں کہ ادب نے سب کو کامیاب کیا ہے ممکن نہیں کہ تمہارا درود جو تمہید سعادت ہے باریاب نہ ہو اور اصل یہ ہے کہ یہی بدیہہ سعادت تمہاری دین و دنیا کی مشکلات حل کرسکتا ہے۔ حضرت سفیان ثوری اپنے دروازے پر کھڑے ہیں اور دیکھ رہے ہیں کہ ایک نوعمر شخص ہے جو سرراہ چلا جاتا ہے۔ مگر قدم جب زمین پر رکھتا ہے اور جب اٹھاتا ہے تو اول بصدق دل کہتا ہے۔ اللھم صل علی سیدنا محمد و علی آل سیدنا محمد۔ آپ کو حیرت ہوئی دریافت فرمایا۔ جواب ملا کہ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ میری ماں کو حج کا شوق ہوا میں ان کے ہمراہ چلا آخرکار منزل مقصود تک پہنچا وہاں جا کر ایک جگہ قیام کیا میری ماں کو ایک مرض لاحق ہوگیا پیٹ پھول گیا۔ منہ سیاہ پڑ گیا مجھے یقین ہوگیا کہ یہ شامت اعمال کا نتیجہ اور معصیت کا ثمرہ ہے۔ میرے بدن پر لرزہ آگیا کانپ رہا تھا اور رو رو کر ایزدی میں عرض کر رہا تھا کہ الٰہی تیری رحمت بہت وسیع ہے تو غفور وشکور ہے تیرا نام رحمٰن و رحیم ہے اپنے فضل وکرم سے میری ماں کو اچھا کردے۔ اور اس کے گناہ عفو فرما سجدے میں سر تھا تضرع وزاری کر رہا تھا کہ ابر آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس میں ایک شخص نہایت سفید لباس زیب تن فرمائے ظاہر ہوئے۔ انہوں نے میری ماں کے چہرے پر ہاتھ پھیرا بس سے میری ماں کا جسم چودھویں شب رات کے چاند کے چمکنے لگا میں نے اس عجیب وغریب واقعہ کو دیکھ کر عرض کیا کہ آپ کون ہیں آپ کا کیا نام ہے آہستہ سے فرمایا کہ میں تیرا نبی ہوں میرا نام محمد ہے یہ سن کر میں نے بصد شوق عرض کیا کہ یا رسول اللہ مجھے کچھ ہدایت فرمائیے۔

له تاریخ نثر اردو از احسن مارہروی

عہدِ واجدی کے مطبوعات و کُتب

اب ہم ایک مختصر اور سرسری جائزہ عہدِ واجدی کے مطبوعات کا لیں گے اس دور کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی، سرکاری اور قانونی کتابوں کا۔ نیز دوسری فنی اور علمی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کراتی ہے، وہاں دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وقت کے اہل علم وادب، عام اس سے کہ مسلمان ہوں یا ہندو یا انگریز اردو میں کتابیں لکھتے ہیں، یہ کتابیں مذہبی بھی ہیں اور ادبی بھی، افسانہ و قصص بھی ان میں شامل ہیں اور حکایات و خطوط بھی عدالتوں کے فیصلے بھی، استغاثہ کی درخواستیں بھی

اس عنوان کے ماتحت جن مطبوعات وکتب کا ہم نے ذکر کیا ہے وہ زیادہ تر عہدِ واجدی سے یا ان کی معزولی کے بعد ان کے عہد کے لوگوں کے قلم سے نکلے ہیں، اس مواد سے اچھا خاصا اندازہ اس دور کے لٹریچر کا ہو جاتا ہے۔

(۱)

شمار	تصنیف	مصنف	سنہ تصنیف	نمونہ عبارت
۲	مجمع القوانین	عمال سلطنت ایسٹ انڈیا کمپنی	سنہ ۱۲۰۸ھ، ۱۷۹۳ء، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۴۸ء	فہرست بابوں اور فصلوں کی باب اول بیچ ذکر تقرر دیوانی عدالتوں کے اور ان کے حدود و علاقہ اور اختیاروں کے باب دوم در باب مفتی و پنڈت و اہل عملہ و وکلا، عدالت و مقدمات مفلسی و اسٹامپ کے باب سوم در باب تجاویز اور فیصلہ مقدموں کے

دیباچہ

مخفی نہ رہے کہ یہ کتاب موسوم بہ مجمع القوانین دیوانی ترجمہ کی گئی ہے زبان انگریزی سے اردو میں حسب الحکم

گورنمنٹ کے اور باب دیوانی کے جتنے قانون اور قانون گورنمنٹ اور صاحبان صدر دیوانی عدالت ملک غربی اور شرقی کے جتنے احکام سرکیولر (سرکلر) اور کنسٹرکشن یعنی تفاسیر قوانین کہ شروع ۱۷۹۳ء سے آخر ۱۸۴۳ء تک صادر و نافذ ہوئے ہیں اور معرض نسخ میں آئے ہیں۔ وہ سب ان میں مندرج ہیں۔ اور یہ تمام قانون اور احکام منقسم ہیں سات باب پر اور ہر باب مشتمل ہے۔ اوپر چند فصلوں کے اور علاوہ ان کے کچھ اور احکام در باب پٹہ اور پٹنی تعلقوں اور باقیات زر بھیج (ادخال یا ارسال مال گزاری) کے اور در باب ترقی اور نیلام کے بعلت باقیات زر بھیج بلوا کرتے ہیں۔ آخر کتاب میں بطریق ضمیمہ لکھ دیئے گئے ہیں۔ اس واسطے کہ اکثر مقدمات دیوانی میں ان کا کام پڑتا ہے اور جاننا ان کا ضروریات سے ہے اور احکام کے متعلق اسٹامپ اور رجسٹری دستاویزات ہیں وہ بھی انہیں حکموں کے ساتھ ضمیمے میں داخل ہیں اور تمام تفاسیر قوانین اور احکام سرکیولر کہ بالاشترک دونوں صدروں سے تاریخوں مختلف پر صادر ہوئے ہیں ان کے آخر میں دونوں تاریخیں جدی جدی بہ ثبت الفاظ صدر غربی و صدر شرقی لکھ دیئے ہیں۔ لیکن جو حکم دونوں صدر کے کہ تاریخ واحد رکھتے ہیں ان کے آخر میں یہ الفاظ نہیں لکھے ہیں اس لئے کہ ان میں کچھ خصوصیت اس طرح کی نہیں اور حکم کہ خاص ایک ہی صدر سے نافذ ہوئے ہیں ان میں حوالہ خاص اس صدر کا مرقوم ہے اور ایک فہرست تمام قانون کی بقید دفعہ وضمن اور تمام سرکیولروں اور تفسیروں کے بقید تاریخ و نمبر شروع کتاب میں لکھ دیئے گئے ہیں کہ ہر حکم عندالضرورت بآسانی اور جلدی سے نکل آوے اور تلاش کرنے والے کو دقت نہ پڑے اور آخر میں کچھ اصطلاحات انگریزی باب دیوانی کی معہ ترجمہ اردو ملحق ہیں۔ فقط۔

تبصرہ و کیفیت - انگریزی عملداری میں قانون کی یہ پہلی کتاب ہے۔ جو سرکاری حکم سے اردو میں ترجمہ کی گئی۔ اگرچہ اس کے الفاظ کی ترکیب بھی ماقبل تالیفات کی طرح مربوط و پختہ نہیں، تاہم بیان کی صفائی اور عبارت کی سلاست پچھلے نمونوں سے بہتر حالت میں ہے

اس دیباچے کے اندر یہاں سے یہ امر بھی واضح ہوتا ہے۔ کہ اس عہد میں (جہاں صحیح ذکر تقریبا) داخل کتابت تھا وہاں اس کا مترادف (در باب تجاویز) بھی استعمال میں آتا تھا۔ اسی طرح (ادپر) اور (اوپر) بھی بیک وقت شامل روزمرہ تھا۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ترک و اصلاح کا سلسلہ اسی وقت سے جاری ہو گیا تھا۔ اب سے پہلے عموماً اس زبان کو ہندی اور ریختہ کہتے ہیں۔ مگر اس تالیف میں اردو کا لفظ بھی استعمال کیا گیا ہے۔[1]

---

[1] تاریخ نثر اردو (احسن مارہروی) صفحہ ۸۲-۸۵

تبصرہ و کیفیت | اس داستان کا مختصر نمونہ تذکرہ آب حیات میں شائع ہو چکا ہے۔ انجمن ترقی اردو کے فاضل آنریری سکرٹری نے اس کی مکمل نقل حاصل کی۔ جس کو انہوں نے اپریل ۱۹۲۶ء کے رسالہ اردو میں چھاپ دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ سید انشاء اللہ خاں کی وہ داستان جس میں ایک لفظ بھی عربی فارسی کا نہیں آنے دیا مشہور تو بہت ہے مگر ملتی کہیں نہ تھی۔ آخر ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کی پرانی جلدوں میں اس کا پتہ لگا۔ مسٹر کلنٹ پرنسپل لامارٹین کالج لکھنؤ کو اس کا ایک نسخہ موتی محل لائبریری میں دستیاب ہوا تھا جسے انہوں نے سوسائٹی کے رسالے میں طبع کرا دیا۔ ۱۸۵۲ء میں ایک حصہ طبع ہوا اور دوسرا حصہ ۱۸۵۵ء میں۔

اس میں شک نہیں کہ اس میں عربی فارسی کا کوئی لفظ نہیں آتا لیکن اس زمانے کے لحاظ سے زبان ایسی صاف نہیں جیسا کہ دعویٰ کیا گیا ہے۔ بہر حال سید انشاء اللہ مرحوم کی جو اپنی بعض خوبیوں کے لحاظ سے یکتا تھے ایک عجیب یادگار ہے جس کا محفوظ رکھنا ہمارا فرض ہے۔[1]

(۳)

شمار	تصنیف	مصنف	سنہ تالیف	نمونہ عبارت
نمبر ۱۹	فسانۂ عجائب	مرزا رجب علی بیگ سرور لکھنوی	۱۲۴۰ھ ، ۱۸۲۴ء	ناگاہ ایک روز موکب رکیمپ حشمت وجلال بافر وشان وشوکت کمال ایک صحرائے باغ و بہار رشک لالہ زار میں ہوا فضائے صحرا قابل تحریر کیفیت دشت گلشن آسا لائق تحریر بو باس ہر برگ و گل کی رشک مشک اذفر صفحہ بیابان معنبر و معطر چشموں کا پانی صفا میں آب گہر سے آبدار تر و ذائقہ میں بہ از شیر و شکر چلے کے جاڑے کا کمال

کی سردی تھی گویا زمین سے آسمان تک یخ بھر دی تھی۔ پرند اور چرند اپنے اپنے آشیانوں اور کاشانوں میں چھپے ہوئے بیٹھے بھوک اور پیاس کے صدمے اٹھاتے تھے دھوپ کھانے باہر نہ آتے تھے قصداً تھرتھراتے تھے۔ سردی سے سب کا جی جلتا تھا دم تقریر ہر شخص کے منہ سے دھواں دھار دھواں نکلتا تھا۔ آواز کسی کی کسی کے کان تک کم جاتی تھی۔ منہ سے بات باہر آتی اور جم جاتی تھی مار سیاہ اور سی چاٹنے باہر نہ آتا تھا۔ سردی کے باعث دم دبا کے بانبی ہی میں بھاگ جاتا تھا۔ زمانے

---

[1] تاریخ نثر اردو، صفحہ ۹۵-۹۷

شمار	تصنیف	مصنف	تصنیف سنہ	نمونہ عبارت
نمبر ۱۳	داستان رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی	سید انشاء اللہ خاں انشا	۱۲۱۸ھ ۱۸۰۳ء	ایک دن بیٹھے بیٹھے یہ بات آپ کے دھیان میں چڑھ آئی کوئی کہانی ایسی کہیئے جس میں ہندوی (اردو) چھٹ اور کسی بول کی پٹ[1] (آمیزش) نہ ملے تب جاکے میرا جی پھول کی کلی کے روپ سے کھلے باہر کی بولی اور گنواری کچھ اس کے بیچ میں نہ ہو آپ نے ملنے والوں میں سے ایک کوئی بڑے پڑھے لکھے پرانے دھرانے بوڑھے گھاگ یہ کھڑاگ لائے سر ہلا کر منہ تھتھاکر ناک بھوں چڑھا کر گلا پھلاکر لال لال آنکھیں پھرا کر لگے کہنے یہ بات ہوتی دکھائی نہیں دیتی ہندوی پن بھی نہ نکلے اور بھاکا پن بھی نہ ٹھس جائے جیسے بھلے لوگ اچھوں سے اچھے آپس میں بولتے چالتے ہیں۔ جوں کا توں وہی ڈول رہے اور چھاؤں کسی کی نہ پڑے یہ نہیں ہونے

کا میں نے ان کی ٹھنڈی سانس کی پھانس کا ٹھوکا کھا کر جھنجھلا کر کہا میں کچھ ایسا اُلو کھا بڑ بولا نہیں جو رائی کو پربت کر دکھاؤں اور جھوٹ سچ بول کر انگلیاں نچاؤں اور بے سری بے ٹھکانے کی الجھی سلجھی باتیں کئے جاؤں مجھ سے نہ ہو سکتا تو بھلا منہ سے کیوں نکالتا۔ جس ڈھب سے ہوتا اس بکھیڑے کو ٹالتا۔ اب اس کہانی کا کہنے والا یہاں آپ کو جتاتا ہے۔ اور جیسا کچھ لوگ اسے پکارتے ہیں (انشاء اللہ) کہہ سناتا ہے۔ دہنا ہاتھ منہ پر پھیر کر مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوں اور آپ کو جتاتا ہوں جو میرے داتا نے چاہا تو وہ تاؤ بھاؤ اور آؤ جاؤ اور کود پھاند اور لپٹ جھپٹ دکھاؤں جو دیکھتے ہی آپ کے دھیان کا گھوڑا جو بجلی سے بھی بہت چنچل اور اچپلاہٹ میں ہرنوں کے روپ میں ہے اپنی چوکڑی بھول جائے۔

چوتکار (رباعی)

گھوڑے اپنے پہ چڑھ کے آتا ہوں میں
کرتب جو ہیں سو سب دکھاتا ہوں میں
اس چاہنے والے نے جو چاہا تو ابھی
کہتا جو کچھ ہوں کر دکھاتا ہوں میں

---

[1] رسالہ اردو میں پٹ کی جگہ پھٹ ہے۔ اور آب حیات میں پٹ ہے۔ ہمارے خیال میں پُٹ زیادہ موزوں ہے۔

مغربی وشمالی چھاپ کر شائع کی جاتی ہے۔ ان جلدوں میں بعض ایکٹ متعلقہ بنگالہ اور سوپریم کورٹ گو کہ وہ متعلق ممالک مذکور نہیں ہیں مگر بایں نظر کر ترجمہ ان کا کسی خاص وجہ سے اُردو گورنمنٹ گزٹ ممالک مغربی وشمالی میں چھپا تھا داخل کئے گئے ہیں۔ فائدے اس تالیف کے ایسے نہیں ہیں کہ احتیاج ان کے بیان کی ہو۔ فی الواقع یہ جلدیں آئینہ نمائے انتظام جملہ سررشتہ ہائے سلطنت عظیم الشان سرکار دولت مدار انگلشیہ کی ہیں ان کے دیکھنے سے بآسانی معلوم ہو سکتا ہے کہ ہر باب میں کتنے قوانین مجاریہ وقت ہیں اور کتنے منسوخ ہو گئے۔ واضح ہو کہ مصنّف نے ترجمہ اردو میں کہ وہ مسلمہ گورنمنٹ اور مندرجہ گزٹ سرکاری تھا۔ کچھ تصرف نہیں کیا ہے اگر بہ نظر سرسری کسی مضمون میں اصل انگریزی سے اختلاف صریح پایا اس کو اسی اصل کے مطابق بہ ثبت نشان ذیل صفحے میں مرقوم کیا ہے۔ اور جو ایکٹ منسوخہ یا مرمہ یا منقضی المیعاد یا ایکٹ کی دفعات منسوخہ یا مرمہ کہ درمیان اثنا ترتیب داخل ہو گئی تھیں۔ ان کی فہرست بحوالہ احکام ناسخ یا مرمم صفحہ مابعد میں درج کی جاتی ہیں اور جو قوانین متعلقہ دیگر پریسیڈنسی یا سوپریم کورٹ یا خاص بنگالہ ہیں ان کی تاریخ صدور کے بعد صرف حوالہ نام اس پریسیڈنسی یا سوپریم کورٹ یا خاص بنگالے کا لکھ دیا ہے۔ ایکٹ نمبر (۱) ۱۸۴۳ء علاقہ ممالک ہند نواب گورنر جنرل بہادر کے حضور سے کونسل کے اجلاس میں ۲۰ نومبر ۱۸۴۳ء میں صادر ہوا[ل]۔

(۵)

شمار	تصنیف	مصنف	سنہ تصنیف	نمونۂ عبارت
نمبر ۲۲	قصۂ گل با صنوبر	نیم چند کھتری	سنہ ۱۸۳۲ء / سنہ ۱۲۴۸ھ	ٹائیٹل پیج زبان فارسی سے زبان اردو میں ترجمہ کیا ہوا نیم چند کھتری کا نام سے بابو گورچرن کے نواب مستطاب لارڈ جارج آکلنڈ صاحب بہادر دام اقبالہ کے عہد میں، داتارام برہمن کی تصحیح سے چھاپا گیا۔

نمونۂ متن

بعد ازاں فقیر حقیر وضاسئے الٰہی پر خورسند نیم چند یوں لکھتا ہے کہ اس عالم ناپائدار میں کسی چیز کو

ل۔ تاریخ نثر اردو، صفحہ ۱۰۵، ۱۰۶۔

کے کاروبار میں خلل تھا، ہر ایک دست در بغل تھا، شمع انجمن لگن تک گرتے گرتے ادلا تھا، پروانوں نے گرد پھرتے پھرتے ٹٹولا تھا، ہر سنگ کے سینے میں آگ تھی، گواہ شرعی شرر تھا۔ لیکن سردی کو بھی یہ لاگ تھی اور جاڑے کا یہ اثر تھا کہ سلیں کی سلیں جمی پڑی تھیں، فولاد سے زیادہ کڑی تھیں، تنور فلک چارم (سورج) کی چھاتی سرد تھی گل چمن میں بر ودت تھی کہ کشمیر گرد تھی، لنجھل نے بیڑ کڑی۔ لوہے لولوں کے ہاتھ آ گئے لنگڑے ہرن باندھ لائے، سرزمین ہند میں مردے نہ جلتے تھے، زندوں کے ہاتھ پاؤں گلتے تھے، آتش رخسار گل شبنم نے بجھائی تھی، باغ میں بھی جاڑے کی دھائی تھی اوس برگ وبار کی صنعت پرور دگار کی دکھائی تھی مرصع کاری یک لخت نظر آتی تھی، دانہ اشک شبنم خواہ بڑے یا ریزے تھے، ہر شجر کے پتے اور شاخ میں الماس اور موتیوں کے ریزے تھے اس سردی کا کہیں ٹھکانہ نہ تھا، حمام تہ خانہ کا حسن بہانہ تھا۔ آگ پر لوگ جی نثار کرتے ہیں، زردشت کا طریق اختیار کرتے تھے، اس زمانہ میں جاڑے کی یہ ترقی تھی کہ آج تک بتوں کی سرد مہری نہ گئی، جاڑے میں ہر ایک المست تھا، عالم اللہ کا آتش پرست تھا۔ یہاں تک جاڑے کا زور شور عالم گیر ہوا تھا کہ کرہ نار مہر پر ہوا تھا۔ جان عالم نے فرمایا۔ آج خیمہ ہمارا یہیں ہو۔[1]

(۴)

نمونہ عبارت	سنہ تصنیف	مصنف	تصنیف	شمار
مجموعہ قوانین ایکٹ ہائے سوپریم گورنمنٹ ۱۸۳۴ء سے لغایت ۱۸۵۷ء جو آخر ۱۸۶۳ء میں نافذ تھے۔ دیباچہ مجموعہ قوانین کی جلد اول ۱۷۹۳ء سے ۱۸۳۴ء تک مرتب ہو کر ۱۸۶۴ء میں مطبع ہوئی اب یہ جلد ثانی متضمن ایکٹ ہائے غیر منسوخہ کی من ابتدائے ۱۸۳۴ء لغایت ۱۸۵۷ء مع جلد ثالث من ابتدائے ۱۸۵۸ء لغایت ۱۸۶۰ء اور جلد رابع من ابتدائے ۱۸۶۱ء لغایت ۱۸۶۳ء تضمین جملہ ایکٹ ہائے غیر منسوخہ مروجہ ممالک	۱۲۷۹ھ ۱۸۶۲ء	مرتبہ سدا سکھ لال	مجموعۂ قوانین مطبوعہ مطبع نور الابصار آگرہ ۱۸۶۲ء	نمبر ۲۰

[1] تاریخ نثر اردو (صفحہ ۷۰، ۷۱) (صفحہ ۱۰۲، ۱۰۵)

مغربی وشمالی چھاپ کر شائع کی جاتی ہے۔ ان جلدوں میں بعض ایکٹ متعلقہ بنگالہ اور سوپریم کورٹ گو کہ وہ متعلق ممالک مذکور نہیں ہیں مگر بایں نظر کہ ترجمہ ان کا کسی خاص وجہ سے اُردو گورنمنٹ گزٹ ممالک مغربی وشمالی میں چھپا تھا داخل کئے گئے ہیں۔ فائدے اس تالیف کے ایسے نہیں ہیں کہ احتیاج ان کے بیان کی ہو۔ فی الواقع یہ جلدیں آئینہ نمائے انتظام جملہ سررشتہ ہائے سلطنت عظیم الشان سرکار دولت مدار انگلشیہ کی ہیں ان کے دیکھنے سے بآسانی معلوم ہو سکتا ہے کہ ہر باب میں کتنے قوانین مجاریہ وقت ہیں اور کتنے منسوخ ہو گئے۔ واضح ہو کہ مصنف نے ترجمہ اردو میں کہ وہ مسلمہ گورنمنٹ اور مندرجہ گزٹ سرکاری تھا۔ کچھ تصرف نہیں کیا ہے اگر بہ نظر سرسری کسی مضمون میں اصل انگریزی سے اختلاف صریح پایا اس کو اسی اصل کے مطابق بہ ثبت نشان ذیل صفحے میں مرقوم کیا ہے۔ اور جو ایکٹ منسوخہ یا مرممہ یا منقضی المیعاد یا ایکٹ کی دفعات منسوخہ یا مرممہ کردہ اثنائے ترتیب داخل ہو گئی تھیں۔ ان کی فہرست بحوالہ احکام ناسخ یا مرمم صفحہ مابعد میں درج کی جاتی ہیں اور جو قوانین متعلقہ دیگر پریسی ڈنسی یا سوپریم کورٹ یا خاص بنگالہ ہیں ان کی تاریخ صدور کے بعد صرف حوالہ نام اس پریسی ڈنسی یا سوپریم کورٹ یا خاص بنگالے کا لکھ دیا ہے۔ ایکٹ نمبر (۱) ۱۸۳۴ء علایت ہند نواب گورنر جنرل بہادر کے حضور سے کونسل کے اجلاس میں ۲۰ نومبر ۱۸۳۴ء میں صادر ہوا۔[1]

(۵)

شمار	تصنیف	مصنف	سنہ تصنیف	نمونہ عبارت
نمبر ۲۲	قصۂ گل و صنوبر	نیم چند کھتری	۱۸۲۴-۲۵ء / ۱۲۴۰ھ	ٹائیٹل پیج زبان فارسی سے زبان اردو میں ترجمہ کیا ہوا نیم چند کھتری کا نام سے بابو گورچرن کے نواب مستطاب لارڈ جارج اکلنڈ صاحب بہادر دام اقبالہ کے عہد میں، داتارام برہمن کی تصحیح سے چھاپا گیا۔

نمونۂ متن

بعد ازاں فقیر حقیر رضائے الٰہی پر خرسند نیم چند یوں لکھتا ہے کہ اس عالم ناپائدار میں کسی چیز کو

[1] تاریخ نثر اردو، صفحہ ۱۰۵، ۱۰۶۔

قرار نہیں۔ اور نیستی پر سب کا مدار ہے اس کی ذات لازوال کے واسطے بقا اور باقی سب فنا ہے۔ مگر ایک گلستان سخن کہ خزاں جہاں اس کے گلوں پر نہیں آتی چوروں کی چوری اور رہزنوں کی سرزوری یہ دولت کہیں نہیں جاتی چمن اس کا ہمیشہ تازہ و خرم رہتا ہے اور اس کی نہروں میں زلال زندگی بہتا ہے۔ اس کی مکان کی نیو کو حادثے کے بھونچال کا کچھ خطرہ نہیں ہوتا[1]

شمار	تصنیف	مصنف	سنہ تصنیف	نمونہ عبارت
نمبر ۲۳	تاریخ افغانستان	سید فدا حسین عرف نبی بخش	۱۲۵۵ھ، ۱۸۳۹ء	امابعد یہ آوارہ عاجز و ناکارہ درماندہ ودرافتادہ سید فدا حسین عرف نبی بخش بخاری الحیدری نسب علاقہ روزگار سرکار انگریزی میں بعہد جمعداری ترک سواروں میں ملازم ہوا تھا۔ زمانہ ناہنجار کہ ہر روز بازی تازہ بروئے کار لاتا ہے۔ اور شعبدہ نیا اٹھاتا ہے، چنانچہ صاحبان عالی شان کو بہ حمایت شجاع درانی بادشاہ کابل کے

مہم اس ملک کی اور بادشاہ کرنا اس کا مصمم ہوا اور رسالہ ہمارا مقام چھاؤنی میرٹھ سے اس مہم میں مقرر ہوا۔ عاصی بھی چاروناچار بندگی و بے چارگی خلق مشہور ہے، سب دورت و یگانہ سے رخصت ہو کر مستعد و آمادہ سفر ہوا۔ تاریخ ۳ ماہ نومبر ۱۸۳۹ء مطابق ۲۵ شعبان ۱۲۰۰ھ کو شاہ جہان آباد سے دو تین منزل آگے گئے تھے کہ قضائے آلہی سے بیماری ہیضہ وبا کی فوج میں پڑ گئی ۔۔۔۔۔۔ اب پھر آیا میں اوپر مطلب اپنے کے عرض بیچ خدمت سامعان کتاب کے یہ ہے کہ دس ہزار فوج لڑائی پر گئی، سب ماری گئی سات ہزار آدمی وہاں سے ذبح کرائے اور باقی مر میں مدفون ہوئے[2]

(۷)

شمار	تصنیف	مصنف	سنہ تصنیف	نمونہ عبارت
نمبر ۲۴	ترجمہ فقہ اکبر	مفتی سعداللہ مراد آبادی مطبوعہ	۱۲۵۵ھ، ۱۸۴۰ء	یہ کتاب ہے اصل توحید اور اعتقاد صحیح کے بیان میں واجب ہے ہر مسلمان پر کہ کہے صدق دل سے یقین لایا میں اللہ پر اور اس کے سب فرشتوں اور کتابوں اور رسولوں اور قیامت کے دن پر اور جلا اٹھانے پر پیچھے

[1] تاریخ نثر اردو صفحہ ۱۰۸

[2] تاریخ نثر اردو صفحہ ۱۱۰، ۱۱۱

مرنے کے اور خیر و شر کی تقدیر پر کہ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہے اور حساب ہونا تلنا اعمال کا قیامت میں اور بہشت اور دوزخ سب حق ہے اور اللہ تعالیٰ ایک ہے عدد سے نہیں پر اس راہ سے کہ اس کا کوئی ساجھی نہیں

(۸)

شمار	تصنیف	مصنف	سنہ تصنیف	نمونہ عبارت
نمبر ۲۵	عجائب القصص	حکیم احسن اللہ خاں و فخر الدین حسین دیباچہ نویس سید باقر حسین ولد سید علی خاں مترجم	۱۲۵۶ھ ، ۱۸۴۰ء	عبارت دیباچہ بعد حمد ایزد منان اور نعت و منقبت رسول آخر الزمان ابجد خوان دبستان دانش و شعور مقتصم بدل رسول الثقلین محمد فخر الدین حسین نقش پرداز اس دیباچے کا ہیچ بیان سبب تالیف اس کتاب فیض نصاب کے گزارش کرتا ہے اور بر خاطر خطیر ارباب عقل و تمیز کے پوشیدہ نہ رہے کہ تحریک سلسلہ انجام اس کام کی بہ وساطت دست و قلم

سیاست مرتبت نجابت منزلت سید باقر حسین خلف رشید علی نقی خاں کے عمل میں آئی اور اس جدد گوہر شناس کردار نے بشاشگی ذہن سلیم و فکر مستقیم کے عرائض مضامین اس کتاب کو پیرایہ پوش زبان اردو سلیس سے آرائش دی

(۹)

شمار	تصنیف	مصنف	سنہ تصنیف	نمونہ عبارت
نمبر ۲۱	ہدایت نامہ مال گزاری	ولیم میور سکریٹری صدر بورڈ و منشی فیض احمد	۱۲۶۲ھ ، ۱۸۴۵ء	ہدایت نامہ مال گزاری کا حصہ دوم مجاریہ گورنمنٹ ممالک مغربی و شمالی ترجمہ کیا ہوا ولیم میور صاحب سکریٹری صدر بورڈ مغربی و شمالی بہ استعانت فیض احمد منشی اوّل سکندرہ (آگرہ) کے یتیموں کے مطبع میں چھپا۔

فہرست مختصر

ایکٹ بابت ۱۸۵۱ء

اور

احکام ممالک مغربی کے

موضوع واسطے ترمیم قانون ۱۳ ۱۸۱۰ء منجملہ مجموعہ قوانین بنگالہ جو اپیل کے مقدمہ کے باب میں مقرر ہے۔

واضح ہو کہ عدالت دیوانی صدر ممالک مغربی متعلقہ قلمرو فورٹ ولیم بنگالہ جو بطرز حال موضوع ہے اس میں صرف تین حاکم مامور ہیں اور اس باعث سے مجموعہ بنگالہ کے قانون ۱۳ ۱۸۱۰ء اور ایکٹ نمبر ۲ ۱۸۴۳ء کے رو سے اس حالت میں اپیل کی منظوری نہیں ہو سکتی جب کہ فیصلہ جس کی ناراضی سے اپیل ہو محکمہ مذکورہ کے کسی حاکم کی تجویز سے صادر ہوا ہو۔ پس مقتضائے مصلحت ہے کہ قانون مذکور اصلاح پاوے۔ لہٰذا حسب ذیل حکم ہوتا ہے۔ عدالتیں دیوانی صدر متعلقہ قلمرو فورٹ ولیم بنگالہ کی کسی عدالت کے تین حاکموں میں سے کوئی حاکم جو بغرض سماعت اور تجویز کسی مقدمہ اپیل کے جلسہ کرے اس باعث سے اپیل کے سننے اور تجویز کرنے سے ممنوع نہ ہوگا کہ اس نے محکمہ ماتحت میں اس فیصلے کو خود صادر کیا تھا جس سے اپیل ہوئی ہے۔[1]

(۱۰)

شمار	تصنیف	مصنف	سنہ تصنیف	نمونہ عبارت
نمبر ۳۲	تعریفات الشعر	امام الدین طالب	۱۲۶۳ھ، ۱۸۴۷ء	بنا اس اس کے اوپر دو اصل اور چند فرع کے لئے اصل پہلی بیچ بیان علم عروض کے کہ اس میں ایک مقدمہ اور پانچ فروع ہیں۔

مقدمہ

جان تو اے کہ شعر کے مخالفت میں گفتگو بازبان کردن ہیں اور اصطلاح میں اہل بلاغت کی کلام موزوں مقفی کو کہتے ہیں کہ قصداً متکلم سے سرزد ہو ورنہ اس کو شعر نہ کہیں گے جیسے آیتیں قرآن کی کہ موزوں ہیں

---

[1] تاریخ نثر اردو (احسن مارہروی)، ص ۱۱۹

تبصرہ و کیفیت فنون لطیفہ میں شعر و شاعری کے متعلق ابتداً بہت کم کتابیں تالیف ہوئی ہیں اور چونکہ ان سے اکثر اہل مذاق واقف ہیں اس لئے زیادہ نمونوں کے لکھنے کی اس خصوص میں ضرورت نہیں۔ اس کتاب سلطان المطابع (لکھنؤ) میں بہ اہتمام دارو غہ بدہ علی ۱۲۶۶ھ مطابق ۱۸۵۱ء میں چھاپی گئی ہے [1]

(۱۱)

شمارہ	تصنیف	مصنف	سنہ تصنیف	نمونہ عبارت
نمبر ۲۵	محاربات حیدری (تواریخ) کا ترجمہ انگریزی لیفٹیننٹ ماس نواب حیدر علی والی میسور	مترجم شیخ احمد علی گوپاموی	۱۲۷۲ھ و ۱۸۵۶ء	فوج کشی کرنا ہارس کا سر پرنگپٹن پر بموجب حکم لارڈ مارنگٹن بہادر اور مشورے ابوالقاسم خاں شوستری اور شیر الملک بہادر دلیان حیدر آباد کے لڑائیاں واقع ہونی سلطان اور اس سپہ سالار کے درمیان منجر ہوجانا دارالسلطنت کے قلعہ کا شہید ہونا سلطان (حیدر علی) کا جو ۱۲۱۳ھ میں واقع ہوا۔

ان دونوں سلطان عالی مقام نے رجو ملکی کاموں کو بے صلاح و مشورہ انجام کیا کرتا اور اس باب میں خیر خواہوں کا کہنا سننا اس کی جناب میں مقبول ہوتا تھا، دو سفیر تحفے ہدیوں سمیت ایک کو زمان شاہ کے پاس سرخ خط محبت خط بھیج کر آئیں دوستی تازہ کیا اور دوسرے کو سلطان روم کے حضور میں روانہ کیا اس عرصے میں مورس بندر سے کئی فرانسیس جن کا موشیر بوسی سرغنہ تھا حضور میں آن پہنچے، چونکہ انگریز اور فرانسیس کے درمیان سات برس سے ان کی ولایتوں میں جنگ و حرب کا ہنگامہ برپا ہو رہا تھا اس لئے یہاں ان فرانسیسیوں کے وارد ہونے سے انگریزوں کے دل میں دھڑکا پیدا ہوا، چنانچہ ان لوگوں نے ڈر کر سلطنت خداداد کی بیخ کنی کی سے تدبیریں کیں اور فرانسیس کو اپنی چڑھائی کرنے کا بہانہ ٹھہرایا، شیر الملک اور میر عالم کی صلاح سے شرح ولدیہ روداد لارڈ مارنگٹن بہادر کے پاس جو کلکتہ میں تھا لکھ بھیجا۔ لارڈ ممدوح تو ایسی فرصت کے وقت کا طالب ہی تھا جھٹ پٹ گوروں کی چار پلٹنیں ہمراہ لے شعبان کے مہینے میں مدراس میں داخل ہوا اور یہاں سے اس نے فوجیں اکٹھی کر

---

[1] تاریخ نثر اردو صفحہ ۱۲۲

جنرل ہارس کے ساتھ سری نارنگٹن سمیت آکر جنرل مذکور سے ملحق ہو گئے اور میر عالم آٹھ ہزار سوار ساتھ لے اور دوشن رائے مع چھ پلٹن انگریزی کی فوج میں آملے۔ اب لارڈ موصوف نے اتمام حجت کے لئے حضور میں سلطان کے پے در پے کئی مکتوبات اس مضمون کے بھیجے کہ اتفاق اور دوستی کے آئین میں عہد شکنی پر کمر باندھنی جائز نہیں، مقتضائے محبت خلوص کا تو یہ ہے کہ پہلے تو ان کی فرانسیس تازہ واردوں کو اس مخلص کے حوالے فرمائیے اور دوسرا التماس یہ ہے کہ انگریز بہادر کی طرف کا وکیل بارگاہ سلطان میں حاضر رہا ہے اور تیسرا یہ کہ کوڑیال بندر، منگلور، تھانہ وغیرہ قلعے جو جہازوں کے آنے جانے کی جگہ ہیں سرکار انگریز بہادر کو چھوڑ دیجئے۔

(۱۲)

شمار	تصنیف	مصنّف	سنہ تصنیف	نمونہ عبارت
نمبر ۴۳	ترجمہ شمشیر خانی موسوم بہ سرور سلطانی	مرزا رجب علی بیگ سرور لکھنوی	۱۲۶۳ھ ۱۸۴۷ء	راویان اخبار و حاکیان آثار متفق ہیں کہ پہلے جس نے گلزار بے ثبات میں روش سلطنت، نکالی تخت و تاج کی بنا ڈالی، عدل و داد کا رواج دیا، محصول و خراج لیا وہ کیومرث تھا۔ بیٹا اس کا سائک نام تھا اس کو عبادت کے سوا اور نہ کچھ کام تھا۔ دیو نے اس کو مارا، کیومرث کو بہت قلق ہوا۔ ہوشنگ سیامک کا بیٹا تھا، اس نے باپ کے خون کا بدلہ لیا دیو کو قتل کیا۔ ۳۰ برس کیومرث

نے سلطنت کی پھر دار فنا سے رحلت کی یہ قول فردوسی ہے اس نام کی تحقیق میں کیومرث کا ف فارسی اخیر تا فوقانی اور ائمۂ اخبار امام غزالی نے اس وادی سے رقم کیا ہے، بزرگ ترین اولاد صلبی آدم لکھا ہے۔ بعضے کہتے ہیں، وہ لیم بن لاوین سام بن نوح ہے اور مصنف روضۃ الصفا لکھتا ہے، کہ یافث بن نوح کا بیٹا ہے، عرب اس کو عام عجم کیومرث کہتے ہیں۔ اور علمائے مجوس آدم اس کو جانتے ہیں گلشاہ کہکے مانتے ہیں۔ ہزار برس کا سن اور چالیس برس سلطنت کے دن۔

کیفیت اس نمونے کا انتخاب سیر المصنفین جلد اول مؤلفہ مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہا سے کیا گیا ہے۔ بقول ان کے اس کتاب میں (۱۹۶) صفحات ہیں اور دو مہینے میں یہ ترجمہ ختم کیا گیا ہے اور پہلی مرتبہ ۱۸۵۷ء میں مطبع نول کشور سے اس کی طباعت ہوئی [۱]

[۱] تاریخ نثر اردو (احسن مارہروی)، صفحہ ۱۲۸

شمار	تصنیف	مصنف	سنہ تصنیف	نمونہ عبارت
نمبر ۱۳	موضح البیان حصہ اول مطبوعہ	مولوی کریم الدین پانی پتی	۱۲۶۸ھ ، ۱۸۵۱ء	دو برس سے مجھ کو یہ خیال تھا کہ چونکہ سرکار گورمنٹ پریسیڈنسی آگرہ کا ارادہ اردو زبان کی ترویج اور پھیلانے کا ہے تو اس ارادے کی تائید کے واسطے تو بھی کوشش کر گرچہ سرکار عالی مقدار کے دربار میں مجھ جیسے بے شمار ہیں اور مثل بھی مشہور ہے، نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے، پر تب بھی چونکہ نمک خوار

اس سرکار فیض آثار کا ہوں اور مدرسے آگرے میں جو مقام اشاعت علوم و فنون کا ہے مدرس اول اردو کہلاتا ہوں اگرچہ بالتصریح مامور اس اشاعت کا نہیں ہوا ہوں پر حقیقت میں ارادے سرکار کے بر لانے میں جو کہ میرے عہدے سے تعلق اور لگاؤ رکھتا ہے ضمناً مامور ہو گیا ہوں جس طرح سے ہو سکے کوشش کروں یہ سوچ کر یوں ٹھہرائی کہ مبتدیوں اور نو آموزوں کو اس زبان کی طاقت بہ وقت ہونے اس کے قواعد کے ہو سکتی ہے اور سوائے اس کے کوئی صورت نظر نہیں آتی کیونکہ جب جڑ ہی مضبوط نہ ہوگی تو پھل پھول کس طرح سے لگیں گے۔[1]

(۱۴)

شمار	تصنیف	مصنف	سنہ تصنیف	نمونہ عبارت
نمبر ۱۴	شرح اندر سبھا	سید آغا حسن امانت لکھنوی	۱۲۶۸ھ ، ۱۸۵۱ء	سبب تالیف اندر سبھا بندہ خاکسار و ہیچ مداں آوارہ طبیعت سید آغا حسن متخلص بہ امانت کو شعر و سخن سے ہمیشہ سے ذوق تھا، موزوں کرنے کا شوق تھا نوحہ سلام کرنے کا درد تھا، دل گیر کا شاگرد تھا القصہ انتہائے شوق طبیعت میں ایک واسوخت عاشقانہ

کہ مطبوع زمانہ ہے طولانی بہ کمال فکر و جاں فشانی کہا گیا اور صحبت قرار دے کر مجمع خلائق میں پڑھا گیا، غل تعریف کا خوب ہوا سب کو مرغوب ہوا، مشتاق ملقت ہوئی چھپ کر روانہ دہ در دہ ہوا۔

۱۔ تاریخ نثر اردو، صفحہ ۱۲۰

فضل خدا سے ہر شہر میں مشہور ہوا، بعد اس کے خانہ نشینی اختیار کر کے دن بھر کمرے میں بیٹھ کر
مرثیہ یا غزل کہتا تھا۔ مگر دل میں در پردہ عشق کی آگ تھی طبیعت کو حسن سے لاگ تھی۔ وضع کے خیال
سے کہیں جانا تھا نہ آنا تھا۔ زبان کی دلبستگی سے گھر میں بیٹھے بیٹھے جی گھبراتا تھا۔ ایک روز کا ذکر ہے
کہ حاجی مرزا عابد علی یگانہ ازلی رفیق شفیق مونس و غمخوار قدیمی جاں نثار شاگرد اول موزوں طبیعت تخلص
عبادت عاشق کلام امانت انہوں نے از راہ محبت کہا کہ بیکار بیٹھے بیٹھے گھبرانا عبث ہے ایسا کوئی
جلسہ (ناٹک یا تھیٹر) کے طور پر طبع آزاد نظم کیا چاہیئے کہ دو چار گھڑی دل لگی کی صورت ہووے اور
خلق میں شہرت ہووے آخر الامر موافق ان کی فرمائش کے بندہ اس کے کہنے پر آمادہ ہوا۔ دم بدم شوق
زیادہ ہوا۔ چونکہ یہ جلسہ کہنا سب کو مرغوب تھا۔ مگر اپنے نزدیک بہت معیوب تھا اس لحاظ سے
اپنا تخلص اس استاد تخلص کیا۔ لیکن لوگوں نے غزلوں کے سبب سے بندے کا کلام دریافت کر لیا۔
غرض کہ چودھویں تاریخ شوال کی ۱۲۶۸ھ میں اندر سبھا اس جلسے کا نام رکھ کر بجانے کے لئے چار باب چار
پریاں قرار دے کر شروع کیا۔ شہرت گھر گھر ہوئی اہل محلہ کو خبر ہوئی وہ شخص اس جلسے کی تیاری پر آمادہ ہوئے
ہجوم حد سے زیادہ ہوئے رفتہ رفتہ بعد ہزاراں شور و فساد اور حجت و تکرار کے ڈیڑھ برس میں تیار جلسہ
ہوا مگر اپنے نزدیک بیکار رہا کہ کس ریاض سے ایک درخت لگایا آخر کو اس سے رنج کا پھل پایا
خیر جو ہوا سو پھل پایا اپنا تو یہ قول ہے
"تقدیر سے گلہ ہے کسی سے گلہ نہیں" [1]

(۱۵)

نمونہ عبارت	سنہ تصنیف	مصنف	تصنیف	شمار
بیان مذمت ترک نماز کا سبب نوکری کچہری کے اکثر آدمی نماز اس طرح قضا کرتے ہیں کہ کچہری میں نوکر ہوتے ہیں وقت نماز کے کچہری کے کام میں مشغول رہتے ہیں اٹھ کر نماز نہیں پڑھ لیتے سو نوکران کچہری دو قسم ہیں ایک حکام منصف صدر امین صدر الصدور ڈپٹی کلکٹر دوسرے عملے کے لوگ جیسے منشی سر رشتہ دار محرر حکام کو اپنے کام میں	۱۲۷۱ھ ، ۱۸۵۵ء	مفتی [illegible] صاحب [illegible] ساکن کاکوری [illegible] اور مولوی [illegible]	محاسن العمل الافضل	نمبر ۳۲

[1] تاریخ نثر اردو صفحہ ۱۳۹ (احسن مارہروی)

اختیار ہوتا ہے جس وقت جی چاہے اٹھ کر نماز پڑھ لیں کمال محرومی قسمت اور صفت ایمان کی بات ہے کہ باوجود اختیار اور عدم مانع کے نماز نہ پڑھے اور عملے کا یہ حال ہے کہ حاکمان زمانہ صوم صلوٰۃ کے مانع نہیں ہیں اور جو لوگ کہ نماز پر مستعد ہیں حالانکہ عہدہ سررشتہ داری اور منشی گیری وغیرہ پہ جو ہر وقت حاکم رہنے کے کام میں مامور ہیں نماز قضا نہیں کرتے اور بوقت آنے نماز کے موقعہ سے جا کر نماز پڑھ لیتے ہیں، سب مسلمان بھائیوں کو خدائے تعالیٰ توفیق دے کہ ایسے عذر کو حیلہ قرار دے کر نماز نہ چھوڑیں لہ

(۱۶)

شمار	تصنیف	مصنف	سنہ تصنیف	نمونہ عبارت
نمبر ۲۵	رسالہ ہیضہ کا علاج	جیمز ٹامسن لفٹننٹ گورنر ممالک مغربی و شمالی	۱۲۷۰ھ، ۱۸۵۳ء	سب زمینداروں اور دوسرے لوگوں کو جن کے پاس یہ رسالہ پہنچے۔ صاحب جلینٹ مجسٹریٹ بہادر کا سلام وہ مرض جس کا ذکر میں کرتا ہوں ہیضہ ہے اس لفظ کے معنی قے کرنا اور دست آنا ہے، جس میں ہمیشہ کم و بیش ڈرامے کی خاصیت رہتی ہے اور بہت سے عالم و فاضل طبیب

اس غرض پر کہ مرض مذکور کو روکیں اور باز رکھیں اور چنگا بھی کریں بڑی دل وہی سے اس کی خاصیت دریافت کرنے کو متوجہ ہوئے ہیں، صاحبان موصوف اپنی خیرخواہ کوششوں میں یہاں تک کامیاب ہوئے ہیں کہ کمپنی بہادر کے لشکری ہسپتالوں اور ضلع کے جیل خانوں اور سرکاری دواخانوں اور دارالشفاؤں میں جہاں بیماروں کی خبری و حفاظت ہیضے کے پہلے ہی حملے کے بعد جھٹ پٹ ہوتی ہے، موت بہت ہی شاذ و نادر نظر آتی ہے، اس میں دیری کرنا ہمیشہ خطرناک ہے اور اکثر اوقات قاتل ہے۔

کیفیت | یہ دس صفحے کا رسالہ الہ آباد کے مشن پریس میں غالباً ایک مرتبہ طبع ہوا ہے کمیابی اور نایابی کے لحاظ سے بطور یادگار اس کا نمونہ لکھ دیا گیا ہے۔ ۲ہ

لہ تاریخ نثر اردو

۲ہ تاریخ نثر اردو ص۱۷۲

(۱۷)

شمار	تصنیف	مصنف	سنہ تصنیف	نمونہ عبارت
نمبر ۴۶	مختصر تاریخ انگلستان	اہل کاراں دفتر لفٹنٹ گورنر ممالک مغربی	۱۲۷۱ھ، ۱۸۵۴ء	جاننا چاہیئے کہ زمانہ بو قلموں میں ہر ایک کے واسطے اوج و حضیض لازم پڑے ہیں پستی سے بلندی ہے اور بلندی سے پستی اب سنا چاہیئے حقیقت اس قوم کے عروج کی راویان آثار قدیم نے اس طرح بیان کی ہے کہ انگلستان کا ملک ابتدا میں قوم گال یعنی فرانس کے متوطنوں سے آباد ہوا ہے چنانچہ اب تک اس قوم کے لوگ اس ملک کے کئی قطعوں میں پائے جاتے ہیں اور ان میں بعضے ہنوز اپنی وہی قدیم زبان بولتے ہیں، اگلے وقتوں میں کسی کو اس جزیرہ کی خبر نہ تھی مگر انیس برس

کا عرصہ ہوا اس وقت روم کے بادشاہ قیصر جولیس نے اس پر عزیمت کی اس زمانے میں اس قطعے کو برطانیہ کا کہتے ہیں، اور وہاں کے متوطن علم و ہنر سے عاری تھا۔ بعضے ان میں سے جانوروں کے پوستین پہنے تھے اور بعضے ننگے مادر زاد رہتے تھے نہ کچھ پہننے اوڑھنے کی عقل تھی نہ کھانے پینے کی تمیز اور بدن کو اکثر رنگوں سے چیتا کرتے تھے اور خوراک اپنی سمندر کی مچھلی اور صحرائی جانوروں کے شکار پر رکھتے تھے اس واسطے ہتھیار اس قوم میں پہلے سے چلے آئے ہیں [1]

(۱۸)

شمار	تصنیف	مصنّف	سنہ تصنیف	نمونہ عبارت
نمبر ۴۷	قصبہ سورج پور (پہلا حصہ)	منشی چرونجی لال و سید روشن علی تحصیلدار مہابن ضلع متھرا	۱۲۷۲ھ، ۱۸۵۵ء	ہے سننے کے قابل یہ قصہ ندیم کہ ہر حرف اس کا ہے دُرِّ یتیم دریائے گنگ کے کنارے پر ایک گاؤں سورج پور نام آباد تھا اور اس میں سالہا سال سے قوم راجپوت گوت بنیس ٹھاکروں کا دخل اور قبضہ تھا کل رقبہ اس گاؤں کا پچیس سو بیگہ تھا من جملہ اس کے ایک ہزار سات سو بیگھا مزروعہ اور چار سو بیگھا قابل زراعت، چار سو بیگھا بنجر غیر ممکن میں آبادی تھی اور بڑا تالاب بھی اس گاؤں میں تھا۔

[1] تاریخ نثر اردو ، ص

اس گاؤں میں دو تھوک تھے ایک روپے سنگھ کا اور دوسرا سودنے سنگھ کا، سودنے سنگھ کی زمین بستی سے پورب کی طرف اور روپے سنگھ کے تھوک کی زمین پچھم کی طرف تھی۔ ان دونوں تھوکوں کی زمین ایک دوسرے سے علاحدہ تھی، لیکن سوائے اس کے چار سو بیگھا دھرتی غیر ممکن دونوں کے شاملات تھی، سودنے سنگھ کے تھوک میں ایک ہزار بیگھا دھرتی مزروعہ اڑھائی سو قابل زراعت ہمگی ساڑھے بارہ سو اور روپے سنگھ کے تھوک میں سات سو بیگھا مزروعہ ڈیڑھ سو بیگھا قابل زراعت سب ساڑھے آٹھ سو بیگھا دھرتی تھی جو کہ رقبہ اس گاؤں کا کچھ منقسم اور کچھ غیر منقسم اور کچھ شاملات دونوں تھوک کا تھا۔ اس باعث سے یہ گاؤں از قسم پٹی داری غیر مکمل سمجھا جاتا تھا۔

تبصرہ و کیفیت ۱۸۵۷ء کے غدر سے پہلے اردو کی ترویج یا واقفیت عامہ کے لئے گورنمنٹ کے ایما سے اکثر ایسے چھوٹے چھوٹے رسالے جن سے وقتی اور معاشرتی فوائد اہل ملک کو حاصل ہوں تقسیم کئے جاتے تھے یہ قصہ دیہاتیوں اور ان پڑھ زمینداروں کو پٹواریوں کی چالوں اور فریبوں سے بچانے کی غرض سے شائع کیا گیا تھا جس کو پڑھ کر نہ صرف کاشتکاری کے اصول و قوائد اور کاشت کی اقسام وغیرہ کا علم ہوتا ہے۔ بلکہ اخلاقی حیثیت سے بھی بہت مفید باتیں معلوم ہوجاتی ہیں۔ علے الخصوص پٹواریوں کی بدنام جماعت کے ہتھکنڈوں اور ان کی فریب کاریوں کا کچا چٹھا بھی سامنے آجاتا ہے چنانچہ اس قصہ میں ایک گاؤں کے چند زمینداروں اور پٹواریوں اور ذیلی کاشتکاروں کا حال لکھتے ہوئے پٹواری کی چالاکیوں سے نیک جاہل اور ناواقف دیہاتیوں کے دام فریب میں پھنس جانے کا مختصر ساخاکہ کھینچا گیا ہے۔ چونکہ اب اس قسم کی کتابوں کی اشاعت مفقود ہے اس لئے بطور یادگار دو ایک نمونے ایسے درج کردیئے گئے جو تاریخی حیثیت سے غیر مفید نہیں۔ [1]

(۱۹)

نمونہ عبارت	سنہ تصنیف	مصنف	تصنیف	شمار
پرمیشر نے اس گھُپ اندھکار (اندھیرا) میں اول پرش و پرکرت پیدا کیا یعنی پرش خود و پرکرت استری، یعنی مایا پیدا ہوئی کہ پرکرت کو شکست اور کالی و جگو نت بھی کہتے ہیں بعد پرکرت کے مہنت یعنی نور پیدا کیا بعد ش اہنکار (اشعاع پرتو) تین قسم کے ست کہ سورج وغیرہ دیوتا انس اس کے ہیں دوم رج کہ من و بھوت اندری	۱۸۵۶ء، ۱۲۶۳ھ	لالہ بنسی لال گوپال لال ماجرہ (دہلی)	پنچ کرت	نمبر ۲۳

[1] تاریخ نثر اردو، صفحہ ۱۴۳، ۱۴۵

(حواس خمسہ) وغیرہ اس سے پیدا ہوئے۔ سیوم، تم کو دجود پرپنچ تت (جوہر) کا ہے بعد اس کے پانچ نت مع گن یعنی نعل پیدا کئے اول سبد گن اکاس، بعدش اکاس یعنی آسمان اپس ازاں باٹے یعنی ہوا مع سپر ش (چھونے کی حس) ہوا پس ازاں پنج آگ۔ یعنی آتش مع روپ گن پس اناں جل یعنی آب مع رس گن پس ازاں پرتھی یعنی خاک کہ کوہ وغیرہ ہم خاک ہے مع گندھ گن (قوت شامہ) آں بعدش ہر پنچ تت و ہر پنچ گن شاں یک جسم ہوکر پانچ گیاں اندری گوش میٹھی زبان جسم، کھال یعنی پوست بدن و پنج کرم اندری منہ ہاتھ پاؤں، عضو لبول، عضو براز و چار انت کراں (حواس باطنی) من، بدھ چیت اہنکار بعد اس کے جان داخل کی کہ یہ تپلا ۵ ۲ تت کا ہے پرش و پرکرت، ۲ تت کہتا ہے۔ خود مرکب بہ شکل انسان ہوکر اٹھا اور اب نام ہو کر کل عالم آپ میں دکھایا۔ بش نام بھی نام اسی کا ہے اور شروع اوپر ب مہا بھارت میں لکھا ہے کہ سوائے اندھکار تاریک کچھ نہ تھا، اول ایک بیضہ یعنی انڈا کہ تخم کل مخلوقات کا ہے پیدا ہوا برہما جی اس سے پیدا ہوئے۔

تبصرہ و کیفیت یہ کتاب کسی ادبی نامور کی لکھی ہوئی نہیں ہے اس کا اندراج یہاں صرف اس لئے کیا گیا ہے کہ گذشتہ زمانے میں بھی کہیں کہیں ایسے صاحب قلم پائے جاتے ہیں جو عربی خواں کی عربی آمیز عبارتوں کی طرح اردو سنسکرت کا استعمال بھی ناموزوں نہیں سمجھتے تھے۔

(۲۰)

شمار	تصنیف	مصنّف	سنہ تصنیف	نمونہ عبارت
نمبر ۵۵	[illegible] بر معیار الاشعار (قلمی)	میر [illegible] سید مظفر علی خاں اسیر لکھنوی	مطبوعہ ۱۲۸۹ھ، ۱۸۷۲ء	بعد حمد و سپاس خدائے عزوجل ...... کہتا ہے، فقیر حقیر سید مظفر علی اسیر کہ مدیں والا اکثر دوستان صادق الولا اور آشنایان صدق و صفا فقیر خانے میں جمع ہوئے اور بیشتر تذکرہ اشعار اردو اور ابیات فارسی کا اور مسائل علم و عروض اور قوافی کا بایک دیگر رہا چنانچہ صحیفہ شفیقہ اعنی کتاب معیار الاشعار تصنیف عالم کامل فخر اماجد و اماثل رئیس الحکماء محقق طوسی علیہ الرحمت کہ اس صناعت میں ہے

اور اس پر بعضے الکملائے اصحاب خلت و براعت نے اعنی مولوی سعد اللہ صاحب نے حاشیہ لکھا ہے کہ انصاف بالائے طاق رکھ کر جا بجا اعتراض کئے ہیں اور شرح مہدی علی زکی مشتہر بہ ملک الشعرا کی بھی ہے

بارہا صحبت میں پڑھا گیا بعض مطالب زیادہ حاشیہ اور شرح سے ذہن میں آئے اور معلوم ہوا کہ بعض مقامات کی صحت سے بھی رہ گئے ہیں لہذا بہ تکلیف بعض احباب او بمقادوَ کَانَ حقًّا علینا نَصْرُ المؤمنینَ احقر العباد نے مطالب تو ذکنی عبارت اردو میں بطریق ترجمہ لکھے اور نام اس کا زر کامل عیار در ترجمہ معیار الاشعار رکھا اور کہیں کہیں عبادت حاشیہ و شرح بھی بعینہٖ لکھ دی اس لئے کہ دریافت کنا اس کا مبتدیوں کو سہل ہو اور جس جس مقام میں عبارت متن پیچیدہ اور حاشیہ و شرح میں بہ سبب عدم فہم کے خلاف واقع ہو گیا ہے منتہیوں پر حال اس کا منکشف ہو جائے طرز تحریر یہ ہے کہ م اشارہ عبارت متن کا اور ت عبارت اپنے ترجمے سے اور ح نشان حاشیہ کا اور ش علامت شرح کی وباللہ التوفیق[1]

(۲۱)

شمار	تصنیف	مصنف	سنہ تصنیف	نمونہ عبارت
نمبر ۹۶	فسانۂ آزاد	پنڈت رتن ناتھ سرشار لکھنوی	۱۲۹۷ھ ، ۱۸۸۰ء	ثریا بیگم کا مکان کوٹھے پر چوکا بچھا ہے اور اس پر فرش مکلف اس کے قریب ایک نازک پلنگڑی پر ثریا بیگم سادی اور ملکی پوشاک پہنے بہ آرام تمام لیٹی ہیں، ابھی حمام سے آئی ہیں لباس عطر میں بسا ہوا ادھر ادھر پھولوں کے ہار اور گجرے رکھے ہیں باغ سے ہوا کی خوشبو آتی ہے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا آہستہ

آہستہ چل رہی ہے مگر امارت کے چونچلے مہری پنکھا لئے جھل رہی ہے، آب دار خانہ والی گڑگڑی لائی تو عباسی مہری نے چمک کر کہا اوئی اتی (اتنی) بوڑھی ہوئیں مگر سلیقہ نہ آیا، ارے پیچواں لاؤ بوا جس میں آنچ دور رہے، تھوڑی دیر میں پیچواں آیا گنگا جمنی حقہ بیش بہا پیچوان، مخملی ونگی، مخملی زیر انداز، دوسیر تمباکو مشک بو پیچواں عرق بہار اور انواع و اقسام کی خوشبو کی چیزوں سے بسا ہوا تھا سنگ یشب کی مہنال، تھوڑی ہی دیر میں تمام محل مہک اٹھا ثریا بیگم نے آہستہ آہستہ پینا شروع کیا، کہا پیچوان مردوں کے لیے موزوں ہے ہمیں تو گڑگڑی ہی پسند ہے۔ خیر آج سے لانا۔ آب دار خانے والی نے کہا حضور یہ عباسی کل چھوکری مجھ کو ڈپٹنے لگی وہ گڑگڑی نہیں پیچوان لاؤ ہم نے کہا اچھا حضور لونڈی تو جانتی تھی کہ حضور ایک کش بھی نہ لیں گی وہی ہوا۔ اب حضور ٹھہریں میں اور بھرے لاتی ہوں، ایک چار منٹ کے عرصے میں آب دار خانے والی ایک ذرا سی گڑگڑی لائی ذرا سا نیچہ ذرا سی چلم لا کر کہا حضور

[1] تاریخ نثر اردو، صفحہ ۱۶۵

اس کو نہیں۔

خواجہ بدیع کی گفتگو کا ایک ٹکڑا

اما بعد بر می گوید امیدوار مغفرت ایزد منان غریب بے نوا خواجہ بدیع الزمان سلمہ الرحمن کہ ایام دیرینہ سے اس ہیچ مداں کا شعار فن سپہ گری جرار تھا باپ گراس کٹ تھا، دادا چڑی مار تھا، بدیعا فخر خاندان پیدا ہوا، عالی شان اور والا دودمان پیدا ہوا۔ جب زمانہ برسرکار ہوا تو دمگے والی پلٹن کا رسالدار ہوا اس پر ایک شاعر نے جل بھن کر ہجو کی اور میں نے ہاتھوں ہاتھ دادِ سخن دی، ہر چند کہ اس کا قول جان کاہ ہے لا بندہ بھی شاعر ذی جاہ ہے۔

پدرش ہمہ عمر کاشتکاری می کرد ۔۔۔ جدش ز تنورہاں براری می کرد

عموش دو د بکار مذکوریاں ۔۔۔ این مرغ کہ کے رسالداری می کرد لہ

(۲۷)

نمونہ عبارت	سنہ تصنیف	مصنف	تصنیف	شمار
بعد اس کے عرض کرتا ہے، ہیچ مداں کج جو بیان خوشہ چین خرمن اہل سخن نابلد کوچہ ہر علم و فن کمترین بندگان ایزد متعال سخن وران ماضی رجال حکیم سید ضامن علی جلال لکھنوی کہ جو کہ آج تک کوئی رسالہ قوائد تاریخ گوئی و شرح اقسام تاریخ میں اس شرح و بسط کے ساتھ کہ مورخ یعنی تاریخ گو کہ قواعد قوانین تاریخ گوئی سے آگاہی دینے کے لئے کافی و وافی ہو جاتا نہیں لکھا گیا اور بعضے احباب	۱۳۰۲ھ ، ۱۸۸۴ء	حکیم سید ضامن علی جلال لکھنوی	افادۂ تاریخ	نمبر ۲

کو بھی اس امر میں نہایت مضطر پایا۔ ناچار حسب قدر کہ ہیچ مداں کو قواعد مذکورہ سے آگاہی و اطلاع تھی۔ اور جو کچھ اپنے اساتذہ محقق سے اس باب میں پایۂ تحقیق کو پہنچا تھا بقید قلم لایا اور بنا اس رسالۂ مختصرہ کی ایک مقدمے اور تین باب اور ایک خاتمے پر کہ وہ بھی مشتمل چند فائدوں پر ہے قائم کی جاتی ہے اور نام تاریخی اس رسالے کے آغاز تاریخ کا مادہ التاریخ اور ختم تالیف کا افادۂ تاریخ رکھا جاتا ہے وھو الموفق والمستعان۔

لہ تاریخ نثر اردو، صفحہ ۱۷۵

شمار	تصنیف	مصنف	سنہ تصنیف	نمونہ عبارت
۳	سرمایہ زبان اردو (لغت)	حکیم سید ضامن علی جلال لکھنوی	۱۳۰۲ھ ، ۱۸۸۶ء	حمد خدائے سخن آفرین و نعت خاتم المرسلین و منقبت سید الوصیین کے بعد عرض کرتا ہے فقیر ہیچ مداں کہ ہیچ بیان خرمن سخن داراں کا ادنیٰ خوشہ چین خوان پارہ فصحائے اردو زبان کا زلّہ ربائے کمترین احقر بندگان ایزد متعال حکیم سید ضامن علی لکھنوی متخلص بہ جلال کہ جب سے اردوئے معلیٰ نے اپنے علم ایجاد کو میدان گاہ سخن میں بلند کیا کسی سخنور اردو زبان میں لغت ایسا کہ

جامع ہو جملہ مفردات و مرکبات یعنی لغات و محاورات و کنایات و مصطلحات و تلمیحات زبان اردو کا جن کو جملہ یا بعض فصحائے متاخرین نے استعمالاً ترک کر دیا ہے اور بعضے ان لغات کا جن میں باہم فصحائین اختلاف ہے یعنی کچھ فصیح کسی طرح ان لغات کو بولتے ہیں اور کچھ فصیح کس طرح بولتے ہیں آج تک نہیں لکھا گیا۔ پس بنا بریں مؤلف متمام لبسعی بلیغ و کوشش و استقرائے تام چند سال کی مدت میں جامع اس کتاب جامع کا بدین نہج کہ جملہ محاوروں اور کنایوں اور اصطلاحوں اور مثلوں کے معانی اور محل استعمال لکھ دیے اور بیشتر کے اسناد و نظائر کلام شعرائے نامور و معتبر اردو زبان سے اخذ کر کے تحت میں معانی و مقامات استعمال کے درج کیے اور جن محاوروں اور کنایوں وغیرہ کی فارسی یا عربی دستیاب ہوئی وہ بھی بعد حل معنی و بیان محل استعمال کے لکھ دی اور جو محاورے کہ مختص تھے عورتوں کے ساتھ یا مشترک تھے مردوزن میں ان کی اطلاع بھی جا بجا کی گئی اور محاورات خواص اور محاورات عوام یعنی بازاریوں کے محاوروں پر بھی آگاہی دی گئی اور نام اس تالیف کا سرمایہ اردو زبان رکھا گیا امید دیدہ وراں با انصاف و بالغ نظران والا اوصاف سے یہ ہے کہ جہاں کہیں مؤلف سراپا خطا سے خطا واقع ہوئی ہو حتی الامکان وہاں اصلاح فرمائیں عفو و دامن عطا سے چھپائیں۔

وھو الموفق والمستعان

تبصرہ و کیفیت مؤلف مذکور جلال لکھنوی، مشاہیر شعرائے لکھنؤ میں تھے۔ جن کو مسلم الثبوت مانا گیا ہے۔ اور ان کی نظمیں ہر حیثیت سے اردو کی فصاحت و سلاست کا نمونہ ہیں ان کی قابلیت علمی بھی مستند مانی گئی ہے۔ اس نثر تالیف میں اگرچہ کوئی غلط لفظ بے موقع محاورہ نہیں، مگر وہ روانی اور شستہ بیانی مفقود ہے، جس کو دوسرے نثر نویسوں میں پایا جاتا ہے اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ بعض وہ حضرات جن کو فارسی و عربی کی مزاولت زیادہ رہتی تھی جو دھویں

صدی کے ابتدائی دور میں بھی تیرھویں صدی کی زبان لکھا کرتے تھے۔

دفاترِ سلطنت

تجاویز، احکام، عرائض، اطلاع نامجات، سمن اور تمسکات

۱۲۵۷ھ ۱۸۴۱ء سے ۱۲۷۶ھ ۱۸۵۹ء تک

شمار	کاغذ	اجلاس	سند تجویز	نمونہ عبارت
نمبر ۱	تجویز	مسٹر [illegible] صاحب بہادر ڈپٹی کلکٹر علی گڑھ	۱۷ فروری ۱۸۴۱ء ۱۲۵۶ھ	عنوان روبکاری کچہری تحقیقات لاخراج ضلع گڑھ علی گڑھ ڈپٹی کلکٹر بہادر کے اجلاس میں تھی۔ ۱۷ فروری سنہ ۱۸۴۱ء

تجویز

آج کے روز پیشل نمبری ۳۰ مع مسلین لکھے ہوئے بالا کے واسطے تجویز کے ملاحظے میں در آئیں دریافت ہوا کہ یہ اراضی بہ ترتیب امسلہ جداگانہ بعد ملاحظہ فہرست مقدمات باقی کے تحقیقات سے لائق تحقیقات قانون دوسرے سنہ ۱۸۱۹ء کے متصور ہو کر ذریعہ روبکاری ہائے لکھی، اٹھارویں مئی سنہ ۱۸۴۱ء مشمولہ مسل ہر ایک مقدمے کے اطلاع نامجات جداگانہ نامی ہر یک قابضان اراضی متعلقہ ہر یک مسل کے بمراد سمن دوسری دفعہ پانچویں میں مذکور ذریعہ پروانجات جداگانہ نامی پیش کار پرگنہ مارہرہ بحکم لکھوا بھیجنے رپورٹ اطلاع یابی کے مدعا علیہم سے جاری ہوئے اور بھی پروانجات جداگانہ ہر یک مسل مقدمے میں بنام محافظان دفتر کلکٹری کے لکھے گئے کہ جو کچھ کاغذ اس مقدمے کے آج تک سر رشتے میں ہوئے ہوں واسطے شمول مسل کے بھیج دیویں۔

تبصرہ و کیفیت

دفتر حکومت میں اردو زبان کا رد عمل و دخل سنہ ۱۸۳۵ء سے ہوا ہے مذکورۃ الصدر نمونہ شاہی حکم سے

چھ برس بعد کا ہے۔ان ۵ - ۶ برسوں کے نمونے بھی دستیاب ہو سکتے ہیں۔مگر یہ سمجھ کر کہ ان کی زبان بھی بالکل اسی انداز پر ہو گی۔مزید تلاش کو تحصیل حاصل سمجھا۔بلکہ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ باوجود حکم اجرائے اردو ۱۸۳۷ء کے بعد تک بہت سے تجاویز فارسی میں لکھی گئی ہیں۔اس زمانہ کی عام دفتری کارروائیاں اہل عملہ کے مذاق اور انداز تحریر کے ماتحت ہوا کرتی تھیں۔اگر کسی کی مشرقی قابلیت اردو دانی پر غالب ہوتی تھی تو اس کی تحریروں میں عربی و فارسی مصطلحات و الفاظ کی کثرت پائی جاتی تھی۔ورنہ نہیں مگر حروف اضافات وصلات و روابط کی شان ایک زمانہ تک سب میں یکساں رہی۔

شمار	کاغذ	اجلاس	سنہ تحریر	نمونہ عبارت
نمبر ۲	روبکاری	مسٹر جارج بلنٹ قائم مقام مجسٹریٹ	۱۲۵۷ھ ۱۸۴۱ء	عدالت فوجداری ضلع علی گڑھ باجلاس مسٹر جارج بلنٹ صاحب قائم مقام مجسٹریٹ بتاریخ ۳۰۔اکتوبر ۱۸۴۱ء

شاہد بخش مختار کار و لدر سول بخش اور غلام محی الدین مستغیث

بنام

جوالا پرشاد آل رسول مستغاث الیہ بعلت تکرار قبض مختار کار مدعا علیہ اور زبان بندی و اظہار اسداللہ شاہ اور پیر بخش گواہان مظہرہ مختار کار مستغاث الیہ

حسب ضابطہ لکھ کر روداد شامل نظر سے گذری اس سے واضح ہوا کہ مختار مستغیث نے نالش بنام آل رسول اس طرح پر کری کہ دیہات متنازعہ حسب تقسیم ہمارے موکلان کے حصے میں آئے اور مستغاث الیہ کے حصے میں اور دیہات آئے ہیں سو اب مستغاث الیہ نے ثلث حصہ دیہات متنازعہ کا جمس صاحب کو بعوض ضامنی کے لکھ دیا ہے اور جمس صاحب دخل اپنا دیہات پر چاہتے ہیں ہمارے موکلان دخل نہیں دینے کے اور مستغاث الیہ نے جواب دیا کہ دیہات تقسیم نہیں ہوئے۔پہلے دیہات معاف تھے اب سرکار میں ضبط ہو گئے اور دیہات میں فریقین بحصہ مساوی قابض ہیں امسال حسب الایماء سے صاحب کمشنر بہادر و صاحب کلکٹر بہادر نے دخل فریقین کا معرفت پیش کار مارہرہ کے کرا دیا ہے اور ضامنی کرا دی اور اپنا حصہ پیر د جمس صاحب کے بعوض ضامنی کرا دی جمیس صاحب دیہات میں قابض ہیں چونکہ روداد شامل سے معلوم ہوتا ہے کہ دیہات متنازعہ پہلے معاف تھے اب ضبط ہو گئے اور بموجب حکم صاحب کمشنر بہادر کے دخل فریقین کا دیہات میں بعد لینے ضامنی کے دلایا گیا اور تینوں شخصوں کے نام دیہات مال گذاری میں لکھے ہیں کچھ تقسیم ہونا دیہات کا معلوم نہیں

ہوتا لہٰذا حکم ہوا کہ فریقین بدستور دیہات پر قابض رہیں۔

شمار	کاغذ	اجلاس	سند تحریر	نمونہ عبارت
نمبر ۳	حکم بمہر ناظم اعلیٰ ع مہر	ڈپٹی کلکٹر بہادر علیگڑھ	۱۲۵۶ف / ۱۸۴۱ء	سرکار بنام صاحب عالم و امیر صاحب وغیرہ مدعا علیہم دعوے بازیافت موازی ۱۴ بیگہ اراضی مندرجہ رجسٹر اسناد و پیمائش ۱۴ بیگہ واقع احمد نگر وغیرہ پرگنہ مارہرہ و عزیز القدر لالہ گلاب رائے پیشکار پرگنہ مارہرہ بجانفیت باشندہ جو آگے اس سے نسبت ثبوت صرف محاصل لدلگہ اراضی نیاز درگاہ حضرت شاہ

برکت اللہ کے ہیں۔ رپورٹ اس کی دفعہ ۲۴ چٹھی اگست ۱۸۳۸ء نمبری ۲۶ سے حضور میں صاحبان بورڈ کے کی گئی تھی چنانچہ آج کے روز بجواب اس کے چٹھی صاحب کمشنر بہادر حصہ شمال دوآب نمبر ۲ لکھی دسویں اپریل ۱۸۴۱ء اس مضمون کی کہ اطلاع کرتے ہیں اس بات کی کہ صاحب لفٹنٹ گورنر بہادر دام دولتہ موافق حکم ۲۶ مارچ ۱۸۴۱ء نمبر ۲۲۳ منظور کرتے ہیں واگذاشت موازی لدلگہ اراضی کو جب تک کہ محصول اراضی مذکور کا خرچ ہووے نیاز درگاہ شاہ برکت اللہ میں موصول اس سرشتے میں ہوئی اس واسطے تم کو لکھا جاتا ہے کہ تم مع قانون گویان پرگنہ ہمیشہ خبر گیراں اجرائے خرچ درگاہ کا محاصل اراضی مذکور سے رہو اور جس وقت کچھ جانب مدعا علیہ کے سے خرچ نہ ہووے فوراً اطلاع کرو اور جو اس باب میں فروگذاشت ہوگا بذمہ تمہارے ... کو بھی حکم ہذا سے آگاہ کریو فقط لکھا بارھویں مہینہ اپریل ۱۸۴۱ء

شمار	کاغذ	اجلاس	سند تحریر	نمونہ عبارت
نمبر ۴	حکم نامہ	صاحب مجسٹریٹ بہادر ضلع علیگڑھ	۱۲۷۱ / ۱۸۶۴ء	نقل حکم بمقدمہ شاہ بخش مختار کار سید اولاد رسول مستغیث بنام سید امیر صاحب وغیرہ تکرار مکان واقع قصبہ مارہرہ پیش گاہ صاحب مجسٹریٹ بہادر علیگڑھ سے آج کاغذات مثل کے پھر نظر سے گذرے معلوم ہوا کہ جس

کھڑکی کی تیاری پر تنازع ہے اس سے کچھ ہرج مدعی کا بجز اس کے نہیں کہ وہ کھڑکی میں جانے سے نقصان اپنی حقیقت احاطے کا جانتا ہے اور احاطے کے اندر مکان متخاصمین کے ہیں اور کھڑکی تیار ہو چکی تھی حکم ہوا کہ بالفعل کھڑکی متنازعہ بدستور تیار رہے مگر تیار رہنا کھڑکی کا موجب نقصان خواہ ثبوت

حقیقت کسی کا نہ ہوگا جس وقت آپ مارہرے میں تشریف لے جائیں گے اس کو ملاحظہ فرمائیں گے اور جو اس وقت تنازع برپا ہوگا تو حکم مناسب صادر کریں گے بالفعل کاغذات داخل دفتر ہیں مرقوم ۲۲ ستمبر ۱۹۲۲ء
(۳۶۷، ۳۶۶)

شمار	کاغذ	اجلاس	سند تحریر	نمونہ عبارت
نمبر ۵	عرضی	مولوی محمد کاظم صدر امین رسب ۱۲ ماہ ۱۲۴۲ھ	۱۲۴۲ھ ۱۸۲۶ء	لیداولادرسول مدعی بنام سیّد شاہ آل رسول مدعا علیہ دعوےٰ اختیار پانے اور پر صرف ۴ روپیہ اور دلاپانے واصلات اور پانے اپنے زرِ یومیہ مذکورہ بصورت جداگانہ بہ تعیین مبلغ ۵/۹ للعہ پائی

غریب پرور سلامت مقدمہ سید اولادرسول مدعی کا مرقوم الصدر بنام مجھ مدعا علیہ کے اس عدالت میں بصیغہ نمبری زیر تجویز ہے کہ تصفیہ اور صلح اس مقدمہ میں بمیان طرفین اس طرح پر قرار پائی کہ مدعی دعوےٰ زرِ واصلات اور مطالبہ زرخرچہ عدالت سے باز آکر اس شرح سے راضی ہووے کہ جب میں مدعا علیہ زرِ یومیہ خزانہ سرکار سے وصول کروں تب نصف اس کا بحق ذریت و اولاد حضرات سرکار کلاں اور حضرات سرکار خورد کو اس تفصیل سے کہ نصف اس نصف کا سید صاحب عالم اور سید محمد امیر اور نصف باقی اس نصف کا حضرت علی اور سید غلام محی الدین اور خود من مدعا علیہ بحصص مساوی دیوے اور لیوے اور نصف باقی بعد وضع خرچ واجبی وصول پاس کدامی شخص معتمد کے جمع کردے اور مجھ مدعا علیہ کو مطالبہ زرخرچہ عدالت کا مدعی سے باقی نہ رہے اور بھی آئندہ کو بابت اس زر مالیانہ کے بدر میان طرفین کسی طرح کا مناقشہ بجز تصریح بالا کے نہ رہے۔ اور وکیل مدعی تصدیق مضمون سوال ہذا اپنا گواہ بنا ہے اس واسطے یہ سوال گزران کر امیدوار ہوں۔ کہ بموجب تصریح مندرجہ بالا تجویز مقدمے کی فرمائی جاوے زیادہ حد ادب

شمار	کاغذ	اجلاس	سند تحریر	نمونہ عبارت
نمبر ۶	پروانہ نظارت	مجسٹریٹ علی گڑھ	۱۲۷۵ھ ۱۸۵۹ء	شرافت پناہ محمد حسن امیدوار ساکن مارہرہ ضلع ایٹہ لعافیت باشند حسب الحکم امروزہ تم کو مہتمم آہن اسلحہ شکستہ کاجو ضلع ہذا سے بروانگی رڑکی کشتیاں برباد ہوکر براہ نہر گنگ کارخانہ رڑکی کو

بھیجا جاتا ہے بدر ماہہ عللہ روپیہ ماہواری کے مقرر کر کے لکھا جاتا ہے کہ فوراً اپنے تین پل نہر گنگ مقام برد ٹھا پر پہنچا دو اور جس وقت کشتیاں نہر پہ آجاویں آہن مذکور کو بعد وزن بار کرا کر بحفاظت تمام رڑکی تک پہنچا دو کہ باعث خوشنودی مزاج کا ہووے اور واضح ہو کہ تم کو دس روپیہ تنخواہ اس تفصیل سے کہ بابت تنخواہ برقندازی بھولا ناتھ برقنداز موقوف شدہ اور عہ روپیہ سرکار سے میں گے اور عہ علی الحساب واسطے خرچ راہ کے سرکار سے اب دیئے جاتے ہیں۔ چاہیئے کہ بعد واپس آنے کے حساب ان کا حضور میں گزرانو المرقوم ۳۰ جون ۱۸۵۹ء۔

تبصرہ و کیفیت

یہ چند نمونے جو دفتری زبان اردو کے پیش کئے گئے ہیں ان کا انداز تحریر اب بدل گیا ہے۔ ۱۸۲۵ء سے ۴۰، ۵۰ برس تک قریب قریب یہی رنگ رہا، مگر اس کے بعد پرانے اجنبی اور مخصوص الجھے ہوئے انداز بیان کا سلسلہ باقی نہیں رہا مثلاً مع مسلین لکھے ہوئے ورآئین۔ منقدمات باقی رہے کے۔ لکھی۔ اٹھا دیں۔ مہنائی بھیج دیویں۔ مستغاث الیہ (ملزم) زبان بندی (اظہار) اس طرح کری۔ موکلان دخل نہیں دیئے کے۔ ملبری (نمبری)، کر لیوار کردہ وغیرہ وغیرہ ایسے اکثر الفاظ و محاورات متروک ہو گئے ہیں۔ ایسے متروک الفاظ کی شناخت کے لئے اکثر نمونوں کی عبارتوں پر خط کھینچ دیئے گئے ہیں۔ یہ بات ذہن نشین رہے کہ دفتری زبان علمی زبانوں کی طرح قابل سند یا ادبی زبان نہیں ہو سکتی۔ وہاں ملکی معاملات پیش رو افیصل ہوتے ہیں جن کے لئے عام فہم روزمرہ ہونا چاہیئے نہ کہ انشا پردازانہ تکلفات [1]

---

[1] یہ تفصیلات تاریخ نثر اردو صفحہ ۲۶۰ تا ۲۶۸ (احسن مارہروی) سے لی گئی ہیں۔

(باب ۸)

حدیقۂ شہدا

حضرت مولانا سید امیر علی شہید رحمۃ اللہ کا حادثۂ شہادت ایسا نہیں ہے جسے عہد واجد علی شاہ کا مورخ نظر انداز کر سکے۔ اکثر صاحبان نظر کا خیال ہے کہ واجد علی شاہ کے زوال و محرومی کا سب سے بڑا سبب بھی حادثہ تھا۔

ہنومان گڑھی سے متعلق تاریخوں میں جو مواد ملتا ہے۔ وہ بہت تشنہ ہے اور اس کا بڑا حصہ سرکاری نقطہ نظر کی ترجمانی پر مبنی ہے۔ خوش قسمتی سے مجھے کتاب سعد لیقۂ شہدا دستیاب ہو گئی، پاکستان میں اس کا ایک نسخہ ہے۔ ہندوستان میں شاید ایک سے زائد ہوں لیکن نایاب۔ میرے سامنے جو نسخہ ہے وہ کرم خوردہ ہے۔ ناقص ہے۔ پھر بھی جو کچھ مواد اس سے حاصل ہوا ہے وہ بڑا قیمتی اور گراں مایہ ہے۔ اس کتاب کے مصنف ایک صاحب مرزا جان ہیں۔ یہ امیر المجاہدین کے رفقا میں تھے انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ ذاتی معلومات و مشاہدہ پر مبنی ہے۔ لہٰذا اس کے صحیح اور مستند ہونے میں کلام نہیں۔ ہم عصر مورخین کے بیانات یوں بھی قابل توجہ اور لائق اعتنا ہوتے ہیں۔ پھر یہ کہ ایسا مورخ جو خود شریک کار رہا ہو۔ لہٰذا اس کی صحت اور درستی میں کسی طرح کا شک ہو ہی نہیں سکتا۔

اب میں مختصر طور پر اپنے طریقہ اخذ پر روشنی ڈالوں گا تاکہ ناظرین کے سامنے صحیح صورت آجائے۔

(۱) اس کتاب کا املا وہی ہے جو آج سے سو برس پہلے کا تھا یعنی یائے معروف و مجہول کا فرق ندارد بہت سے الفاظ ساتھ ملا کر لکھنا جہاں پیش ہو وہاں واؤ لکھنا، میں نے طریق املا میں اس حد تک تبدیلی کی ہے کہ یائے معروف و مجہول کا فرق قائم کر دیا ہے۔

(۲) ساری کتاب میں کوئی پیراگراف نہیں ہے۔ میں نے حسب ضرورت پیرے قائم کر دیئے ہیں۔

(۳) ضمنی اور ذیلی سرخیاں میری قائم کی ہوئی ہیں۔

(۴) جہاں تشریح و توضیح کی ضرورت سمجھی ہے وہاں فٹ نوٹ میں اپنے نام سے نوٹ لکھ دیا ہے۔

(۵) عبارت آرائی، اور قافیہ پیمائی، اس کتاب کی خصوصیت تھی۔ میں نے اس حد تک اس میں کمی

کردی ہے کہ عبارت میں اپنی طرف سے ایک لفظ یا حرف بڑھائے بغیر اسے زیادہ رواں اور شگفتہ قطع وبرید سے کردیا ہے۔

(۶) جی تو یہ چاہتا تھا کہ ضمیمہ کے طور پر پوری کتاب شامل تاریخ کردوں۔ اب یہ چیزیں کہاں ملیں گی۔ لیکن ایجاز واختصار نے دامن پکڑا۔ لہٰذا میں نے تلخیص سے کلام چلایا ہے۔ لیکن تلخیص ایسی کہ بڑھایا کچھ نہیں۔ غیر ضروری عبارت حذف کردی ہے۔ کتاب کا مفہوم پورا آگیا ہے۔ اس میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔ صرف غیر ضروری عبارتیں حذف کردی ہیں۔

(۷) یہ حادثہ ۱۲۷۱ھ میں پیش آیا۔ اسی سال یہ کتاب لکھی گئی اور ۱۲۷۲ھ میں شائع ہوئی۔ اتنی قریب العہد تاریخ بجائے خود ایک نادر تحفہ ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حمد | بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے بعد سراپا عصیاں مرزا جان کی یہ عرض ہے۔ کہ شکر پروردگار کا ہر فرد بشر پر فرض ہے جس نے کعبہ دل کو اپنا گذرگاہ بنایا اور کنشت کا نقشہ امتحان کے واسطے کھینچ کے دکھایا۔ ہرچند دیر وحرم دونوں میں کار سنگ وخشت ہے۔ کہیں اس کی پرستش میں دوزخ کہیں اس کی زیارت کے صلہ میں بہشت ہے

نعت | نعت اور نعت رسول امام الثقلین محمد بن عبداللہ نورٌ من نور اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر انسان کو مناسب ہے نام کے ساتھ درود پڑھنا واجب ہے کہ باعث ایجاد کونین ہیں صاحب شہدار جدر دخیلین ہیں۔ وما ارسلنک الا رحمۃ العالمین کی مصداق ہیں" برگزیدہ آفاق راکب براق طی کنندہ قصر نیلی رواق ہیں۔

سبب تحریر | جب مولوی امیر الدین علی قدس سرہ العلی نے جہاد کا قصد کیا یہاں کے علماء سے مشورہ لیا سب صاحبوں نے بیعت کی اس جلسے میں سراپا گناہ، الراجی الی الرحمۃ اللہ، بھی شریک تھا۔ ہنگام نہضت ہرچند ہمراہی کا اصرار کیا۔ لیکن حضرت نے انکار کیا اور فرمایا کہ تمہارا یہیں رہنا مناسب بلکہ واجب ہے کہ اکثر خطوط ہمارے یہاں کے عمائد کو آئیں گے۔ تمہارے سب سے جواب باصواب مل جائیں گے علاوہ اس کے وہ کام انصرام ہوں گے۔ جو باعث تقویت مجاہدین نیک فرجام ہوں گے۔ پس عاصی نے ناچار اس خادم رسول کی اطاعت قبول کی پھر کچھ نہ کہا یہیں رہا۔ اس دن سے جو مولوی صاحب نے بذریعہ نامہ ارشاد فرمایا بسر وچشم بجالایا اور کیفیت کو قلمدان میں بھرتا گیا۔ جب امیر المجاہدین، رئیس المسلمین

نے شربت شہادت پیا میں نے بھی افسردہ ہو کے قلم کو روک لیا اور اس کا نام "حدیقۂ شہداء" رکھ دیا۔

مسجد بابری کی تاریخ

آغاز معرکہ عبرت انگیز حیرت آمیز یوں ہے کہ کتب سابقہ اور بیان حال سے یہ احوال معلوم ہوا ہے، جو بے کم و کاست مرقوم ہوا ہے۔ کہ بعد تسلط سالار مسعود غازی کے سلاطین ماضیہ کی بھی بلاد ہندوستان جنت نشان میں جہاں کہیں معابد عظیم ہنود کے پائے مسجدیں خانقاہ مسافر خانے بنوائے اور مؤذن، مدرس، میر ساماں مقرر کر کے دین محمدی کو خوب شائع کیا اسلام کو رونق اور زینت دی لشکر کفار کو ہزیمت دی۔ فیض آباد اور اودھ کو بھی اسی طرح ضلالت کی نجاست سے شفاف کیا کہ یہ بڑا پرستش کا مقام تھا۔ تخت گاہ پدر رام تھا۔ جہاں بڑا بت خانہ تھا۔ وہاں بڑی مسجد بنوائی اور جہاں چھوٹا مندڑف تھا مسجد مختصر قناتی تعمیر فرمائی۔ چنانچہ بت خانہ جنم استھان مسقط راس رام ہے اس کے متصل سیتا کی رسوئی[1] ہے، سیتا اس کی جورو[2] کا نام ہے وہاں کیسی مسجد سربلند بابر بادشاہ نے ۹۲۳ھ میں باہتمام سید موسیٰ عاشقان بنوائی ہے آج تک وہ مسجد سیتا کی رسوئی مشہور ہے نزدیک و دور ہے اور پہلو میں وہ دیر باقی ہے اور رام دربار کی مسجد فدائی خان صوبیدار نے بنائی تھی۔ جس کو کافروں نے یہاں تک مٹایا ہے کہ ایک دو مینار اور تھوڑی دیوار ایک کنارے ہے۔ بلکہ واجد علی شاہ کے وقت میں اس کی تعمیر کا حکم بھی ہوا تھا۔ مگر ان کو موت نے مہلت اجل نے فرصت نہ دی یہ حسرت ساتھ گئی اور قلعہ کی مسجد کہ بالفعل وہ قلعہ لچھمن مہنت کو معاف ہو گیا ہے اور مسجد کو بھی گوشہ حصار میں اعتکاف ہو گیا ہے، وہاں گذر مسلماناں عسیر ہے وہ مہنت بے پیر ہے ایسی مسجدوں کا حال جو قبضہ اختیار ہنود میں ہوں ظاہر ہے خدا حافظ و ناصر ہے

مسجد ہنومان گڑھی کی تاریخ

اب طرفہ ماجرا سنیئے جس سے دل دو نیم ہوتا ہے، قطع نظر اور مسجدوں کے اودھ میں ایک ٹیلہ تھا کافروں کی پرستش کا حیلہ تھا راجہ رام چندر نے اس مقام پر ہنومان اپنے رفیق کو بٹھایا تھا بعد فتح لنکا اس کا بزرگی کا وسیلہ تھا اس لئے ہنومان پرست اس کو ہنومان بیٹھک کہتے ہیں۔ بالفعل اسی کا نام ہنومان گڑھی ہے، حسب دستور وہاں بھی اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ غازی نے ایک مسجد قناتی بنوادی تھی ہندوؤں کو اس مسجد کے مٹانے میں اصرار رہا۔ بعد چندے مسلمانوں کو غافل پا کے چاہا کہ پھر ٹھاکر دروازہ بنا کے پوجا کا رنگ جمائیں اور جس پر مورت ہنومان

---

[1] باورچی خانہ۔

[2] بیوی۔

کی ہے یہاں وہی سنگ جمائے لیکن قاضی محمد عاقل نے جرأت کی اس مسجد کی مرمت کی انہی کی اجازت سے باقی شاہ فقیر مسلمان اس میں رہتا تھا نماز پڑھتا اذان کہتا تھا۔ جب شجاع الدولہ بہادر بکسر کو گئے متصل مسجد کے چھپر ڈال لیا اور ہنومان کی مورت کو اس میں قائم کیا مگر حاصل میں فقیر کا بھی حصہ رہا۔ جب فقیر کو تسخیر کر لیا رفتہ رفتہ مکان معقول تعمیر کر لیا تو آمد بھی زیادہ ہوئی ساری قوم پوجا پر آمادہ ہوئی اس عرصہ میں فقیر مذکور نے انتقال کیا۔ اس کے وارثوں نے مال تال لیا اور علیحدہ مسجد سے عقب اس ٹھیکری سے کہہ وینا تالاب پر تکیہ جما لیا۔ لیکن اتیت مراعات کئے جاتے تھے حقوق فقیر دیئے جاتے تھے۔ بعد چندے بیراگیوں نے اتیتوں کو نکالا۔ اپنا عمل کر کے مسجد کی منبر کو توڑ ڈالا۔ اس بات پر قاضی حبیب اللہ نے بلوا کیا اور اقرار نامہ عدم تعرض مسجد لکھوا کے اور کسی مسلمان کو آذان کے واسطے مقرر کر دیا۔

بیراگیوں کی شرارت

جب بچھراٹھ کا ناظم درشن سنگھ برہمن ہوا مسلمانوں کا سخت دشمن ہوا۔ آس پاس اس ٹیلہ کے احاطہ کھچوایا۔ لڑائی کے قابل قلعہ بنوایا۔ پھر تو کیا خوب مشہور ہے۔ کہ ایک کریلا دوسرا نیم چڑھا۔ اس کے سبب روز بروز بیراگی زور پکڑتے گئے۔ مسجد کے آثار بگڑتے گئے ہندوؤں کی نظامتیں ہونے لگیں مسلمانوں کو ان کے مقابلہ کی طاقت نہ رہی حکام کو خیر و شر کی لیاقت نہ رہی گرد اس مسجد کی حصار قائم کر کے ہنومان گڑھی اس کا نام رکھا۔ پرستش کا شغل صبح و شام رکھا۔ اس مسلمان فقیر کو پہلے تو کچھ دیتے رہے۔ بجبر و اکراہ اس کی خبر لیتے رہے۔ جب وہ درویش مسلمان مسجد کا جنت کو سدھارا بیراگیوں نے میدان مارا - اس خانۂ خدا کو اپنا گھر سمجھ کے ہنومان گڑھی میں تو داخل کر ہی چکے تھے۔ اب کچھ نشان باقی نہ رکھا۔ جب انتہا کو درسن کی حکومت پہنچی تو پھر تو اودھ میں یہ نوبت پہنچی کہ کئی برس تک اذان اور گاؤکشی موقوف رہی۔ اطلاع اس کی اہل دربار کو ہوئی۔ لیکن مفصل خبر نہ سرکار کو ہوئی۔

نظم حسب حال زمانہ حال

حکام کا فردں کی خوشامد سے کہتے ہیں
کیا خوش نما شوالہ یہ بندہ نواز ہے

له فقیر، بھکشو، پجاری

کس طرح سے اودھ میں ہو بانگ اذان بلند
حاکم کو بت پرستوں سے راز و نیاز ہے
اختر نگر[1] میں گاؤ کشی کیوں نہ بند ہو
گوسالہ پوجتا ہے جو پیش نماز ہے
سب کو تلاش زر ہے جو ہیں اہل کاریاں
چاندی کی جوتی کھاتے ہیں یہ حرص و آز ہے
ہندو کھلے خزانہ تعلے کی لیتے ہیں
حاصل بہ زور زر یہ انہیں امتیاز ہے
واں کربلا میں خیمے جلائے گیا عزدر
یاں اب کلام[2] حق کے جلانے پہ ناز ہے
بھٹکے ہوئے ہیں چھوڑ کے یہ دیں کی راہ راست
متھرا کو سب سمجھتے ہیں ملک حجاز ہے
اے خامہ ابتدا کر اب اس داستاں سے
جس میں تمام سوز سراپا گداز ہے

شاہ غلام حسین کا عزم جہاد

الغرض جب یہاں تک ہنگاموں کی نوبت آئی فلک بے پیر نے نئی صورت دکھائی کہ کافروں نے صحن مسجد میں بت خانہ بنا لیا اور سرگ و دواری کی مسجد خس و خاشاک ناپاک سے پٹ گئی، اسلام کی قدر و منزلت گھٹ گئی تب ۱۲۷۱ھ میں کہ عہد دولت عہد واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کا ہے، شاہ غلام حسین صاحب کہ مرد باخدا حقیقت آشنا تھے، خدا کی راہ میں جان دینی فرض عین جانتے تھے اور مصاحب ان کے مولوی محمد صالح اسم بامسمی صلاح و تقویٰ میں درست راہ خدا میں بہت چالاک و چیرت عالم باعمل حق پرستوں میں بے بدل دونوں صاحبوں نے باہم مشورہ کر کے راہ خدا میں سر دینے کو قدم گاڑا ڈھال تلوار اٹھائی مشرکوں کی قتل پر نیت درست باندھی اور مسجد آباد اور بت خانے برباد کرنے

---

[1] اختر نگر لکھنؤ واجد علی شاہ کا تخلص اختر تھا (رئیس احمد جعفری)
[2] کلام حق یعنی قرآن پاک (رئیس احمد جعفری)

پر مستعد ہوئے کمر ہمت چست باندھی بغرض جہاد حیدر آباد میں کہ گومتی کے پار ہے محمدی جھنڈا قائم کیا، سامان عفو جرائم کیا۔ اگر سچ پوچھئے تو یہ سید احمد صاحب[۱] مرحوم سے بڑے ہیں۔ کس واسطے کہ ان کو سب سامان میسر تھا، یہ مفلسی میں اس عزم پر کھڑے ہوئے، احسان علی خاں بانکے کی بیٹی ان کی معین و مددگار ہوئی بلکہ رستم علی خاں اور بہادر علی خاں دونوں بھائی شریک ہو کے مستعد کارزار ہوئے اس زمانے کے مسلمانوں کا حال ظاہر ہے کہ بات بات پر ایمان بدلتے ہیں تعمیر مسجد یا امام باڑہ یا سبیل کی تو کوئی سبیل نہیں کرتے کنوئیں مہمان سرا بنوائیں گے۔

مسلمان جہاد سے کتراتے تھے

وہ لوگ جن پر جہاد فرض تھا یعنی مال و زر رکھتے تھے۔ اشرفیاں پرکھتے تھے، گھر رکھتے تھے نہ کسی کا قرض تھا صاف نکل گئے ہنڈیوں کی طرح چل گئے، محمدی جھنڈے کو طمع دنیا سے محمول کیا، جہاد میں حجتیں کرنے لگے، جانا نہ قبول کیا مولویوں کی خدمت میں آ آ مسئلہ پوچھتے تھے کہ جہاد کیا چیز ہے؟ جان بہت عزیز ہے، اگر کسی نے کہا جہاد فرض کفایہ[۲] ہے، مصداق اس کا ہدایہ[۳] ہے خوش ہو گئے اور تعریفیں کرنے لگے کہ آپ بڑے عالم ہیں خوب آفت سے بچایا جیسا آپ کو سنتے تھے ویسا ہی پایا اور معاذ اللہ اگر کسی نے کہا جہاد فرض عین[۴] ہے۔ اس میں سعادت دارین ہے سنتے ہی جان نکل گئی رنگت بدل گئی جیتے جی مر گئے، ہزار حیلے نکالے کہ ہمارے گھر میں سوا ہمارے کوئی اور نہیں جانے کا طور نہیں کوئی کہتا تھا جورو کو کس پر چھوڑیں کیونکر رشتہ الفت توڑیں کوئی کہتا تھا، کہ علیل ہیں کوئی کہتا ہندوؤں کی کثرت ہے ہم قلیل ہیں یہ بزدل تو یوں ہی کھچڑی پکایا کیئے۔

اسلام کے مجاہد مساکین

مگر بعض مساکین کہ بالفعل کچھ اسلام اگر ہے تو ان میں باقی ہے شریک حال اس درویش دلریش ملک خصائل کے ہوئے اور حسب ارشاد روانہ اودھ فیض آباد ہوئے شاہ صاحب کچھ شاد ہوئے رونا ہی تک پہنچے تھے کہ لکھنؤ کا رستہ لیا اور جو فیض آباد میں پہنچ گئے تھے ان کو نثار حسین نائب کوتوال اور کپتان انگریز بدر آر بد خصائل نے نکال دیا بہانے سے ٹال دیا، سبحان اللہ دبجہدہ آربڈ تو انگریز تھا، اس کو مسلمانوں سے عار بجا ہے لیکن نائب کوتوال کے ایمان کو دیکھئے کہ بیراگیوں کے چیلے بنے کافروں کے جانب دار ہوئے۔

۱؎ حضرت سید احمد شہید رح ۲؎ فرض کفایہ وہ ہے کہ انجام نہ دیا جائے تو تمام مسلمان گنہ گار ہوں گے لیکن اگر ایک مسلمان بھی انجام دے تو یہ فرض باقی مسلمانوں سے قطع ہو جائے گا ۳؎ ہدایہ فقہ حنفی کی مشہور کتاب ہے جو مدارس اسلامیہ میں داخل نصاب ہے ۴؎ فرض عین ہر مسلمان جس کی بجا آوری پر حتی الامکان مجبور ہے (رئیس احمد جعفری)

مسجد بابری میں قیام

بعد چندے فیض آباد سے پرچہ اخبار کا ہندو مسلمانوں کی تکرار کا بارگاہ جم جاہ میں گذرا ملاحظہ کے بعد ناظم اور کوتوال کے نام پر دستخط ہوا کہ مسجد کی تحقیقات کر داس بات کو اثبات کر داس سہارے پر شاہ صاحب نے پھر چند مسلمان بسر کردگی قاضی نور علی ساکن مضافات اعظم گڑھ اودھ کو بھیجا وہ مردان خدا مسجد بابری میں مقیم بے خوف و بیم ہوئے خدا کی شان نظر آتی ہے یہاں انسان کیا فرشتے کی عقل جاتی ہے کہ پڑھے لکھے مالدار جہاد سے کنارا کریں اور جاہل مفلس مرنے کو گوارا کریں تھوڑے دنوں کے بعد شاہ صاحب بھی بنفس نفیس توکلت علی اللہ تعالیٰ کہہ کے وارد مسجد مذکور ہوئے اور مولوی محمد صالح ان کے پاس سے دم بھر نہ دور ہوئے شب و روز اسی تصور اور خیال میں رہتے تھے، یہ تصور تھا کہ کوئی ایسا سامان یزدان کر دے کہ مسجد بیراگیوں کے تصور سے باہر آئے۔ اودھ کا کفرستان مٹ جائے، ترقی اسلام ہو، مہنتوں کا بیڑا ارام ہو۔

جہاد کی دعوت قبول کرنے سے مسلمانوں کا گریز

اسی خیال میں دو تین مہینے گزر گئے، شاہ صاحب شراکت کی جستجو میں ادھر ادھر گئے، مگر کسی نے ساتھ نہ دیا ادھر رخ نہ کیا، بلکہ بعضے مسلمان اس امر سے منع کر کے مانع الخیر مسجد و دیر میں مشہور ہوئے بانی فتنہ ہوئے تفصیل اس کی لکھنا مناسب نہیں ہیں قاضی نہیں محاسب نہیں مگر شاہ عبد الحق ردولی کے عرس میں جو برگزار گئے تھے۔ علی آباد میں ان سے اور مولوی محمد صالح سے سلسلہ جہاد میں تقریر ہوئی وہ گوش زد برناؤ پیر ہوئی منصفوں کی نظر میں حق و باطل کی تمیز کھل گئی۔ خلاصہ یہ کہ مولوی محمد صالح درپے ثبوت جہاد تھے دوسرے صاحب ایسی باتیں کرتے تھے کہ ران کے) وعظ و پند سے کسی بندۂ خدا نے ارادۂ جہاد کا نہ کیا رخ اودھ فیض آباد کا نہ کیا سچ ہے خدا کی راہ میں جان و مال دینا بہت ٹیڑھی کھیر ہے۔

کفن بردوش مجاہدا در بیراگیوں کے حامی اور مددگار مان سنگھ اور کشن دت پانڈے چکلہ دار اور زمیندار اس قرب و جوار کے ہوئے یہاں تک کہ دس بارہ ہزار گنوار اور بیراگی نابکار اس گڑھی میں جمع ہوئے مستعد کارزار کے ہوئے۔ گھاگرہ کے گھاٹ روک لئے کہ شاید کوئی مسلمان جاہل قصد بھی کرے اترنے نہ پائے اسی پار سر ٹپک کر مر جائے اور مولوی صاحب اور شاہ صاحب کے ساتھ سو آدمی ہوں گے۔ ان کی یہ کیفیت تھی کہ اگر کچھ ملا تو روزی نہیں تو روزہ۔ لیکن فاقہ کو افاقہ عریانی تن کو عین خدا کی مہربانی سمجھ کے وہاں اڑے رہے خدا کے گھر میں پڑے رہے کہ

شاید کچھ مسلمان بجرأت وحمیت ایمان بہ نیت جہاد شریک معرکہ فیض آباد ہو کے کافروں کو تہ تیغ کریں اس امر خیر میں جان ومال سے دریغ نہ کریں کسی نے خبر نہ لی آخرش ۱۲ تاریخ ذیقعدہ الحرام ۱۲۷۱ھ روز جمعہ کے دن دو تین سو مسلمان بہ ارادہ نماز اسی مسجد میں یک جا ہوئے شاہ صاحب کہ سب پیشوا ہوئے یہ خبر بیراگیوں کو پہنچی فرصت کو غنیمت جانا دل میں کچھ اور ہی ٹھانا۔ سرکاری لوگوں کی طرف سے تو ہر گونہ اطمینان تھا ان میں سے کاہے کو کوئی مسلمان تھا اور بعض جو مومن پاک تھے، کافروں سے زیادہ سفاک تھے بے خوف وخطر خانہ خدا کو گھیر لیا۔ مسلمانوں نے جو دیکھا کہ خواہ مخواہ جو گھیرے میں مرتے ہیں، بیکار جان سے گزرتے ہیں۔ ہم بھی کچھ کام کریں۔ اس میدان میں نام کریں مستعد اور آمادہ سب مجاہدین پا پیادہ ہوئے، واللہ اعلم کیا سمجھ کے کوتوال کے پیادوں اور الگزنڈر آربٹ کے سواروں نے متوسط ہو کے رفع شر کیا۔

مجاہد کی شان

دوسرے روز شنبہ ۱۳ تاریخ اسی مہینہ کی اس کو ماتم میں عشرہ محرم سے کم نہ جانئے جان ہرسی انگریز بھی لکھنؤ سے داخل فیض آباد ہوا۔ بیراگیوں کا گروہ زیادہ شاد ہوا پہلے تنہا الگزنڈر آربٹ تھا مدد اس کا تھا نہ مددگار تھا اب دوسرا ہرسی نابکار آیا دونوں صاحب تثلیث نے مشورہ کیا، خانہ خدا کا رستہ لیا۔ شاہ صاحب کی خدمت بابرکت میں بہ کمال خیر خواہی یہ فقرہ عرض کیا کہ مسجد کے دروازے میں کواڑ نہیں کسی طرح کی آڑ نہیں مناسب ہے بلکہ واجب ہے کہ ایک جوڑی کواڑ کی قائم ہو جائے مخالف دفعتاً آنے نہ پائے۔ شاہ صاحب غافل بکر وفریب سے جھٹ پٹ دو مجاہدوں کو کواڑ لانے کے واسطے بیگم پورہ کے ایک محلہ اودھ میں ہے بھیجا۔ کسی مرد مسلمان نے ایک جوڑی کواڑ کی بہت اچھی گاڑی پر لدوا کے دونوں مجاہدوں کے ساتھ روانہ کی گاڑی کچھ آگے بڑھی تھی کہ بیراگیوں نے خبر پائی خدا جانے اس میں افسران فوج کا اشارہ تھا یا کوئی ہرکارا تھا کہ دفعتہً کافروں کی بھیڑ آئی ان کو گھیر لیا مار ڈالنے کا قصد کیا قریب تھا کہ ان دونوں کو باب جنت تک پہنچائیں۔ یکایک مسجد والوں کو خبر ہوئی رستم علی خاں اور بہادر علی خاں دونوں بھائی اور میاں فقیر بخش نائی اور بہادر خاں اور ایک مجاہد غرض تو اللہ دے اور بندہ لے کہاں وہ سینکڑوں کہاں یہ فقط سات جرار لیکن خدا کی شان ساتوں نے تلوار کھینچ کے اسی دم وہ جرأت اور سینہ سپر ہو کے وہ بہادری کی کہ ساتوں طبقے زمین کے تھرانے لگے۔

کربلا کا نمونہ

جس پر ایک بار تلوار پڑی تھی دو ہوتا گویا برق شرربار پڑتی تھی کافروں سے جہنم بھر گیا، میدان خالی ہوا جو شہید ہوا اس کا مرتبہ عالی ہوا جو کوئی دیکھتا

تھا معرکہ کربلا یاد آتا تھا۔ ہر ایک جوان شجاعت سر میدان دکھاتا تھا جب اللہ اللہ کہہ کے تلوار لگاتے تھے۔ کافروں کے غول پیچھے ہٹ جاتے تھے بید کی طرح تھراتے تھے وہ جو ہنومان گڑھی کا پشتہ تھا وہاں کشتہ پر کشتہ تھا کسی نے نیزہ مارا کسی نے چقماق خالی کو کسی تپنچہ کو آگ بتائی کوئی بھاگنے والے کو للکارتا تھا جھپٹ کے تلوار مارتا تھا یہ ساتوں سبعہ سیارہ کی طرح بڑھے چلے جاتے تھے۔ کسی کو خیال میں نہ لاتے تھے۔ درود پڑھتے چلے جاتے تھے۔ . . . .

جو کافر جہنم واصل ہوا سرد تھا۔ اسی طرح لڑتے ہوئے گڑھی کے دروازے تک پہنچے مجاہدوں کے نعرے تا بہ فلک پہنچے وہاں بھی بڑا گھمسان کا رن پڑا بڑی بڑی نمود کا بیراگی نابود ہوا۔ ان تھوڑوں نے بہت کام کیا سینکڑوں کو تہ تیغ خون آشام کیا آخر جام شہادت پیا بسید ھا راستہ جنت کا لیا لطف حیات جاودانی کا پایا۔ رستم علی خاں اور بہادر علی خاں دونوں بھائی حقیقت میں رستم تھے۔ اور میاں فقیر بخش گونائی تھے مگر جرأت اور دانائی میں کسی سے کم نہ تھے ساتوں کا شش جہت میں نام رہے گا پنج تن اور چار یار حامی رہیں گے۔ گڑھی کے متصل یہ ہنگامہ ہوا مسجد کے مجاہدوں کو خبر ہوئی ہتھیار باندھ کر ادھر بڑھے۔ مان سنگھ کے لوگ سدراہ ہو کے ان کے منہ چڑھے یہاں بھی ایسی تلوار چلی اور اس طرح سے لڑائی پر دین دار آمادہ ہوئے کہ فیصلہ کے بعد مقتولوں کا جو حساب ہوا تو مسلمانوں سے ہندو بہت زیادہ مقتول ہوئے کافروں کو بھاگنے کی راہ نہ ملی مجاہد وہاں ایسے کچھ اڑ گئے زمین میں پاؤں گڑ گئے۔ مان سنگھ کے لوگ لوہا مان گئے مسلمانوں کی تلوار سے دوزخ کو بے ایمان گئے شہیدوں پر باران رحمت برسا زخمی کافر ایک ایک بوند کو ترسا۔

غداری

پھر بدلی خوب گھر آئی شاہ صاحب کی جماعت پھر مسجد میں پھر آئی اسی وقت ایک طرۂ فروش محبت سے مدہوش معتقد خاص مرید با اختصاص تھوڑا سا کھانا مجاہدوں کے واسطے لایا یہ دو دن سے خدا کے مہمان تھے[1] منتظر ہر آن تھے۔ دستر خوان بچھایا کھانے کا لگا لگایا[2]۔ دونوں انگریزوں نے بھی غازیوں سے کہلا بھیجا تھا کہ اب کمریں کھول کے بخاطر جمع اپنی مجلد میں رہو تم سے کوئی نہ بولے گا جب تک فیصلہ نہ ہولے گا۔ وہ ان کے قول پر اعتماد کر کے مشغول طعام ہوئے ہنوز نوبت سیر ہونے کی نہ آئی تھی کہ دونوں انگریزوں اعلیٰ علی اور نثار حسن نائب کوتوال باہم کچھ قیل و قال کے اپنے ہمراہیوں کو نامزد سپاہیوں کو لے کے مع چند ضرب توپ مسجد سے دور جا کے ٹھہرے۔ خدا ہی کو خبر ہے۔ کہ اس میں کیا اشارہ تھا کہ فوج سرکاری

---

[1] فاقہ سے تھے

[2] آغاز کیا۔

کے الگ ہوتے ہی ہزار دو ہزار بیراگی لاکھوں گنوار ہاتھوں میں تلوار مورد ملخ کی طرح خانۂ خدا کو گھیر لیا۔ یہ جو فوج شاہی اور کوتوال بدافعال کے ہمراہی تھے انہوں نے اسلام سے منہ پھیر لیا پھر تو کافروں نے رجب علی شاہ کے کوٹھے پر چڑھ کے جو لوگ خدا کی راہ میں مسجد کے سپر میں تھے جسم زاماں کا گولیوں سے غربال کیا مسجد کی حرمت کا کچھ خیال نہ کیا صحن مسجد لالہ گوں ہوا غازیوں نے بھی گولی برسنے کو باران رحمت الٰہی جان کے اور بجائے سپر چھاتیاں تان کے ہتھیار نکالے حتی الوسع جرأت کی داد دی جب یہاں صفائی ہوگئی لڑائی موقوف ہوگئی۔

مجاہد اس طرح ذبح کئے گئے جیسے قصائی گائے کو ذبح کرتا ہے

تب دو تین سو گنوار بیراگیوں کے مددگار مہادیو اور ہر ہر کرتے مسجد کے اندر بے خوف و خطر آئے اور جیسے قصائی گائے کو ذبح کرتا ہے۔ ۶۹ غازیوں کو جو اس وقت تک زندہ تھے شہید کیا جسم کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے کاریزید کیا۔ پانی کی طرح مسجد کے چہرے سے خون بہتا تھا اور ہر غازی دم بازپسیں اللہ اکبر کہتا تھا مولوی محمد صالح بھی اسی وقت شہید ہوئے خلد سے نزدیک دنیا سے بعید ہوئے لیکن عین شورش ہنگامہ جدال و قتال میں اسی ضرب و حرب کے حال میں غازیوں نے شاہ صاحب سے گزارش کی کہ ہم ایسے طوفان میں گھرے ہیں کہ نکلنا معلوم اور ایسے دریائے ناپیدا کنار میں گرے ہیں کہ اچھلنا معلوم، خدانخواستہ آپ کی زندگی میں اگر خلل آئے گا تو اس بیڑے کا تھل بیڑا نہ ہوگا۔ نام و نشان ڈوب جائے گا کوئی ہمارا نام نہ لے گا۔ بے گناہوں کا انتقام نہ لے گا۔ آپ کے جینے میں فاتحہ کا سہارا ہے جہاد کی امید دوبارہ ہے اس دم چلے جانا مناسب ہے، چنانچہ شاہ صاحب بہ مجبوری حسب صوابدید ان کے کسی سمت کو چلے گئے اور مجاہد ستم دیدہ آسیائے ظلم سے دے گئے۔ جب کافروں نے مجاہدوں کا کام تمام کیا پھر یہ سرانجام کیا کیا کہ قرآنوں کو یعنی سیپاروں کو ہزار پارہ کیا وہ ایک کو جلا دیا یہ بلا دیکھئے کس پر پڑتی ہے۔ آج تک کہ ایک مہینہ ساون کا اور نوروز بھادوں کے گزرے پانی نہیں برسا ہے یہ قہر نازل ہوا ہے۔ چاروں طرف شور عطش ہے گرمی کی شدت سے ہر شخص کو غش ہے اور وبار کی وہ شدت ہے کہ ہزاروں آدمی ہیضہ سے مرتے ہیں۔

مسجدیں توڑیں، لاشیں کچل دیں

اور صحن مسجد میں کھڑا نو تعمیر سیتا کی رسوئی اور خدا کی مسجد کے واسطے حد تھا اس کو توڑا بندوق کی گولیوں سے

مسجد کے ستونوں کو ثابت نہ چھوڑا پھر مسجد سے نکل کے لاشیں چل کے گنواروں کے گھر کی راہ لی جھنتوں نے گڑھی میں پناہ لی لاشیں شہیدوں کی بے گور و کفن چادر نہ پیرہن عریاں پڑی رہیں پلٹنیں دیکھا کیں کھڑی رہیں کوئی ایسا بھی نہ تھا کہ ان کی خبر لیتا دو گز کفن دے کے دفن کر دیتا۔ دوسرے روز نثار حسین نائب کوتوال بدافعال نے اسی مسجد کے دروازے پر گڑھا کھدوا کے توپ دیا کسی نے تاریخ ان مظلوموں کی کہی تھی مصرع تاریخ "بلغ العلےٰ بکمالہٖ"
۱۲۷۱ھ

مقابر شہدا کی بے حرمتی یہاں تو حاکم ہندو ہیں سردار ہیں مسلمان مجرم گنہگار بر سر دار ہیں ایسی زیادتی ہندوؤں کی مسلمان دیکھیں جلے ہوئے اوراق قرآن دیکھیں اور پھر حمایت کفار ہو ایسی رعایت پر خدا کی مار ہو جائے عبرت ہے مقام حیرت ہے نہ کسی کو شرم ہے نہ غیرت ہے ظاہر میں تو مسلمان کے ٹھاٹ ہیں باطن میں یزید علیہ اللعن کے بھاٹ[1] ہیں بعد اس معرکہ کے بیراگیوں نے صحن مسجد میں آ کے ہوم کیا سنکھ بجایا دہیں موہن بھوگ کھایا کہتے تھے ہنومان جی نے کرپا کی ملچھوں سے پاک کیا غرض کوئی بے ادبی اٹھا نہ رکھی اسلام کی توقیر ذرا نہ رکھی اس کی تفصیل لکھنے سے کچھ حاصل نہیں لکھنے کے قابل نہیں متصل اسی مسجد کے ایک ٹیلہ تھا مسلمانوں کی دعا کا وسیلہ تھا۔ خواجہ مٹی اس کا نام تھا مقابر شہدا کا مقام تھا قبروں کو کھود کے نیست و نابود کر لیا اور ایک بت وہاں بھی دھر دیا بعض کہتے ہیں کہ بیراگیوں کی کیا حقیقت تھی یہ جو افعال صادر ہوئے سب مان سنگھ کے لوگوں سے سرزد ہوئے۔ گر ہم دم بخود ہیں زبان ہلا نہیں سکتے۔ ان کا نام لب پر لا نہیں سکتے۔ کس واسطے کہ وہ سرکار کے زعم میں خیر اندیش ہیں اور سب سے زیادہ وفاکیش ہیں۔

بیگم پورہ میں مسلمانوں کی درگت اب حال بیگم پورہ والوں کا سنیئے اعلیٰ اعلیٰ استقی کے حکم سے منادی نے ندا کی جو مسلمان شاہ کا شریک ہو گا۔ جان سے مارا جائے گا۔ گھر لٹے گا۔ سر اتارا جائے گا۔ یہ سن کے وہ بیچارے ڈر کے مارے شاہ صاحب کے شریک نہ ہوئے اس پر ناکردہ گناہ آفت میں پھنسے بعد فراغت کے قتل مسلمانوں سے بیراگیوں نے چار حملے ان کے مکانوں پر کیئے۔ بہت زور دکھایا مگر خدا کے فضل سے دخل نہ پایا چنانچہ افضل بیگ نامی ایک شخص وہاں کا رہنے والا ان کے ہاتھ سے زخمی ہو کے اب تک صاحب فراش

---

[1] مسخرے

گواہ شد
محمد روشن خان ساکن اودھ مسجد واقع ہنومان گڑھی بچشم خود دیدہ ام وہئیات آں بخوبی ذہن نشین دارم فقط

گواہ شد۔ محمد علی خاں ساکن اودھ خاص بعمر یکصد و چہار سال مسجد واقع گڑھی بچشم خود دیدہ ام فقط

احمد علی	ساکن فیض آباد سوز خوان مسجد بر ٹیلہ ہنومان گڑھی بچشم خود دیدہ ام دہیات و مقام و سمت آں بخوبے یاد دارم و بر محراب آں اسم یا اللہ نقش بودہ است
سید محمد علی	مرثیہ خوان ساکن فیض آباد مسجد قناتی کہ بر ٹیلہ ہنومان گڑھی بودہ بچشم خود دیدہ ام فقط
مرزا علی	ساکن اودھ مسجد واقع ہنومان گڑھی بچشم خود دیدہ ام واہیات آں بخوبی یاد دارم فقط

اظہار دہنی سنگھ چپڑاسی عدالت فیض آباد برائے قرقی حسب الحکم سرکار در عہد منتظم الدولہ حکیم مہدی علی خاں بہادر بر ہنومان گڑھی رفتہ بودم مسجد واقع ہنومان گڑھی بچشم خود دیدہ ام فقط

خدا فراموش، ناحق کوش

جب یہ کیفیت بارگاہ ہندوستان پناہ میں آئی اور چھوٹے درباریوں نے ملاحظہ فرمائی۔ نواب کے پاس آکر عرض کرنے لگے کہ حضور عالم یہ کیفیت جو دونوں مولویوں کی دو حرفی ہے اس کا کیا اعتبار یک طرفی ہے اس پر تعمیر مسجد کا حکم لگانا اور اپنی رعایا کو ستانا ضعف عملداری ہے بلکہ رعیت آزاری ہے آپ نائب سلطان ہیں آپ کے نزدیک برابر ہندو اور مسلمان ہیں انصاف یہ چاہتا ہے کہ راجہ مان سنگھ اور آغا علی خان ناظم کو ارشاد ہووے جا کے دیکھیں اس امر کو خوب چھانیں گو راجہ صاحب مدعی علیہ ہیں، لیکن یہ ایمان کا مقدمہ ہے۔ نواب صاحب کو یہ منظور تھا نیت میں فتور تھا کیفیت کی جانب خیال نہ کیا ٹال دیا مگر مان سنگھ بے ایمان اور آغائی ننگ خاندان کو روانہ کیا وہ دونوں خدا فراموش ناحق کوش جس وقت اودھ میں پہنچے مسلمانوں کو دھمکایا ہندوؤں کو سر چڑھایا کہ مسلمان بیچارے بقول شخصے قہر درویش بر جان درویش صلح پر راضی ہوئے آخر آغائی اور مان سنگھ نے ایک اقرار نامہ اور صلح نامہ جہنتوں سے لکھوا کے سرکار میں بھیج دیا کہ اب کسی طرح کا یہاں فساد ہندو و مسلمان میں باقی نہیں ہے۔

لکھنؤ کے مسلمانوں میں اضطراب

جب اقرار نامہ اور صلح نامہ نواب نے ملاحظہ کیا مارے خوشی کے ہنس دیا اور کہا الحمد للہ جو ہونا تھا سو ہوا اگر اب فساد مٹ گیا، غرض ایسی کچھ صورت ہوئی کہ نواب کے نزدیک جو خون

ہے۔ صدر رحمت شاہ باش ہے۔ جب ان بچاروں نے دیکھا کہ وہ بہت ہیں اور ہم تھوڑے ہیں ناچار گھر چھوڑے فیض آباد میں آرہے ہے۔

واجد علی شاہ کا حکم | دو چار دن پیشتر اس معرکہ کے حکام سرکار سے جب کچھ نہ بن آئی تب یہ بات ٹھہرائی کہ مولوی نہال الدین صاحب اودھ میں جاکر بصلاح وصوابدید مولوی حفیظ اللہ صاحب داروغہ عدالت العالیہ دیوانی اس باب خاص میں ساکنان اودھ اور فیض آباد سے استفسار کریں بلکہ قلم بند اظہار کریں بعد تحقیقات بنیغی بے رد ورعایت کیفیت واقعی بارگاہ ظل اللہ میں حاضر کریں اور اگر نشان مسجد کو دیکھیں مشاہدہ اپنا ظاہر کریں چنانچہ ۶ ذیقعدہ الحرام ۱۲۷۱ھ قدسی کو یہاں سے روانہ ہوئے دو منزل پہنچے کہ سنا فیصلہ ہوگیا۔ مگر امتثالاً لامر وہاں پہنچے ہنگام تحقیقات اور تحریر اظہارات رو برو سے مولوی صاحبین ممدوحین اور میر سید علی صاحب مجتہد فیض آباد اکثر رئیسوں نے دیکھنا مسجد کا اور بعضوں نے اس میں نماز پڑھنا ظاہر کیا اور قاضی یار علی نبیرۂ قاضی حبیب اللہ نے کئی محضر سابق کے دکھائے کہ ان سے صاف مسجد ثابت تھی اور طرفہ یہ کہ کئی ہندوؤں نے بھی مسجد پر گواہی دی منکروں نے روسیاہی دی چنانچہ ان ممدوحین صاحبوں نے کیفیت راست براست بے کم وکاست کہ بعینہٖ مضمون اس کا موافق تحریر عاصی کے ہے بارگاہ شاہی ہندو پناہی میں ارسال کی حسب ضرورت تفصیل مہر و گواہی مندرجہ کیفیت ہذا لکھی جاتی ہے۔

تحقیقاتی رپورٹ کا خلاصہ | نقول مہر و گواہی مندرجہ کیفیت مرسلہ مولوی حفیظ اللہ صاحب و مولوی نہال الدین صاحب مرقوم ذیقعد ۱۲۷۱ھ

ابراہیم بیگ	سید بخش علی جعفری	حسین علی	مرزا جان
ساکن خلدہ آباد فیض آباد سطور الصدق واقعی است	زمیندار محلہ میراں پور منہلات اودھ بیان واقع است	زمیندار محلہ قضیانہ کے از اولاد سید لطف اللہ مسجد بچشم خود دیدہ ام	علاقہ دار خاص محل مسجد بعنوان گڑھی بچشم خود دیدہ ام

سید باقی علی	عبدہ سید حسین مرزا	آغا علی	علی مرزا
مسجد بچشم خود دیدہ ام	لاریب فیہ	لاریب فیہ	بیان واقعی است در بودن مسجد بر گڑھی شک نیست

گواہ شد چھیدی	قوم تبولی اظہار خود نویسانیدہ است کہ بارہا مسجد را بچشم خود دیدہ ام

سلہ پان والا۔

مسلمانوں کا ہوا تھا اس کے انتقام کی نہ ضرورت ہوئی تب بعض علماء لکھنؤ کے کان کھڑے ہوئے ان کے ساتھ کچھ مسلمان کھڑے ہوئے ہمہ دیگر یہ کلام کیا کہ یہاں کے حکام نے اسلام کو سلام کیا آج ہندوؤں نے ہنومان گڑھی کی مسجد کھودی ہے اگر ایسے ہی مسلمان بودے ہیں تو کل لکھنؤ میں عمل کریں گے ہر خانہ خدا میں ایک ایک بت دھریں گے

مولانا عبدالرزاق فرنگی محلی و مولانا سید امیر علی

آخرش ارباب فرنگی محل سے مولوی عبدالرزاق صاحب کہ طفلی سے ہم ان کو ورع اور پرہیز میں کامل جانتے ہیں عبادت میں طاق ریاضت میں مشتاق شب بیدار تہجد گذار اور مولوی امیر الدین علی صاحب ساکن قصبہ امیٹھی کہ امور مذکور میں بمراتب بڑھے ہوئے ہیں نہ دن کو آسودہ ہو کے کھاتے ہیں نہ رات کو آرام سے پاؤں پھیلا کے سوتے ہیں دونوں صاحب بہ عزم جہاد مستعد ہوئے اور مولوی تراب علی اور مولوی برہان الحق اور مولوی حیدر علی مدظلہ سے مشورہ ہوا۔ سب نے فرضیت جہاد کا اقرار کیا اور کہا کہ جب تک ہنود سے مقابلہ نہ ہوا تھا۔ اور مسجد بابری میں مقاتلہ نہ ہوا تھا۔ تب تک فرض کفایہ تھا۔ اب بے شبہ فرض عین ہے۔ ہمارے نزدیک اب ہنگام نفیر عام ہے۔

سید امیر علی کے ہاتھ پر جہاد کی بیعت

الغرض جب یہ پانچوں رکن رکین دین متین تابع شرع مبین خادم پنج تن وارث مسند رسول ذوالمنن ایک دل اور ایک زبان ہوئے۔ تب یہ خیال آیا کہ انھیں پانچوں میں ایک کو امام ٹھہرائیے اس کے حکم کو بجا لائیے۔ آخرش باوجود انکار سب صاحبوں نے مولوی امیر الدین علی صاحب کے ہاتھ میں ہاتھ دیا اپنا امام کیا اور کہا کہ بالفعل آپ اور مولوی عبدالرزاق صاحب روانہ ہوں۔ انشاء اللہ تعالی سامان سفر کر کے ہم بھی دو ہی چار دن میں حاضر خدمت شریک رنج و راحت ہوتے ہیں پس سلطان المجاہدین اور مولوی عبدالرزاق صاحب نے حسب تجویز ان سب صاحبوں کے یہ بات ٹھہرائی پنجشنبہ کو یہاں سے کوچ کر کے ایک دو مقام امیٹھی میں کیجئے اور بعد اجماع اور سامان جہاد فیض آباد میں چل کے انتقام لیجئے۔

فرنگی محل میں ہلچل

ادھر یہ مشورہ ہوا اُدھر چہار شنبہ ہی کو شیطان کے کان بھرے کہیں سن بھاگا اور ان صاحب کو خبر پہنچائی جن کے نزدیک شہید کرنا مسلمانوں کا اور جلانا کلام قرآن کا کچھ اصل نہ رکھتا تھا۔ انہوں نے طرفہ حرکت کی شام سے یہ شہرت کی کہ عزم

مولوی عبدالرزاق کا چھپا نہیں ظاہر ہے، ہرکس وناکس اس سے ماہر ہے کوتوال نے سنا ہی ہوگا کسی نہ کسی نے کہا ہی ہوگا ظن غالب بلکہ یقین ہے کہ دو گھڑی میں دوڑ[1] آئی اور سارا فرنگی محل بے جرم وگناہ اسیر دام بلا ہو جائے ایسی لغو حرکت کرنا اپنے ساتھ سب کو فضیحت کرنا ہے ایسی ایسی باتیں کیں کہ سارے فرنگی محل میں ہل چل کیا کہیں بل پڑ گئے، آرام کی صورت بگڑ گئی، ایک دوسرے سے پوچھنے لگے کہو کیا ہوگا انجام اس کا برا ہوگا یا بھلا ہوگا ماما اصلین لونڈی باندیاں کہتی تھیں، دیکھیے کیا پیش آئے گا، حاکم زیروزبر کرے گا برے دن دکھائے گا۔

مولانا عبدالرزاق فرنگی محل کا عزم مردانہ

غرض ایسا کچھ منتر پڑھا کہ انھیں کا طوطی بولنے لگا چھوٹا بڑا مولوی عبدالرزاق صاحب پر زبان طعن کھولنے لگا، یہاں تک شور وغوغائے محشر برپا ہوا کہ خداوست فرمانے لگے کہ یہ سب سامان فقط میرے روکنے کے واسطے ہوا ہے وہ ممکن نہیں میں خواہ مخواہ جاؤں گا۔ کافروں کو جہنم میں پہنچاؤں میرے نزدیک اودھ دار الحرب ہے فرض عین حرب وضرب ہے، ہاں صبح تک اگر میں نے قیام کیا پھر جانا دشوار ہوگا محلہ بھر روکنے کو تیار ہوگا یہ سوچ کر یک بینی ودوگوش فقط ایک تیر بردوش لنگی کندھے پر عصائے پیری ہاتھ میں دمضان خدمتگار ساتھ میں محلہ نہی کو روانہ ہوئے امیر المجاہدین وہاں اترے تھے آدھی رات گذری ان کے پاس پہنچے تو وہ ان سے زیادہ چلنے کے لئے آمادہ تھے گو سواری نہ تھی پیادہ تھے جس دم آریکہ آرائے سپہر[2] جلوس ان بزرگوں کا دیکھنے مشرق سے نکل آیا یہاں کمر بندی ہونے لگی، خدا کی راہ میں قدم بڑھایا۔ ان علماء کی سواری کا بیان قلم کی طاقت زبان کی قدرت سے باہر ہے۔

قافلۂ مجاہدین کی روانگی

محافہ میں دونوں خورشید وماہ خدا کے پیارے ایک سینس[3] پر سوار دوسرے کی ران تلے راہوار نمازیوں کی قطار خدا کی قدرت نظر آتی تھی، کافروں کی ہیبت سے جان جاتی تھی، سب کہتے تھے اس فوج محمدی کی ایسی شان ہے کہ عقل حیران ہے ایک ایک ان میں ہزار پر بھاری ہے چہروں پر نور برستا ہے، جو ان سے

---

[1] سپاہ۔
[2] مراد سورج ہے
[3] پالکی

لڑے گا وہ ناری ہے اسی شان وشوکت خاص جہاد کی نیت سے بحر مواج کی طرح لہراتے ہوئے رو بہ منزل امیٹھی مبارک میں داخل ہوئے سبحان اللہ وبحمدہ خدا اگر ایمان دے تو ان لوگوں کے قدموں پر انسان جانے دے حاکم کی یہ منادی کہ کوئی فیض آباد اور اودھ کا عزم نہ کرے بے فائدہ رزم نہ کرے، مگر ان اللہ والوں کو نہ کسی منادی سے غرض نہ دوڑ دھوپ سے کام فقط خدا اور رسول کی خوشنودی سے طبیعت کو چین دل کو آرام تھا۔

محمدی جھنڈا

ایک طرف محمدی جھنڈا کھڑا ایک جانب لشکر قلیل بارعب وجلال پڑا، نقارہ پر جس دم چوٹ پڑتی تھی، ہیبت سے برہمن کی لڑکی کلمہ پڑھتی تھی، غازیوں کا جماؤ سپہ گری کا بناؤ کوئی نیزہ تانتا تھا کوئی رستم کو پیر زال جانتا تھا۔

یہ تھے مجاہد اسلام

خلاصہ یہ کہ اس جلسے میں کیسا کیسا نوجوان اور کیا کیا شیخ زادہ شوکت و شان تھا مولوی عبدالرزاق صاحب کہ افسر غازیان نامدار تھے سب کے سردار تھے ہمہ صفت موصوف دیار و جوار میں معروف ہیں ہمراہ ان کے محمد خورشید حسین مجاہدان بدر و حنین کے ہم پہلو بہادر خوشرو۔ دوسرے حسام الحق مولوی نورالحق صاحب مرحوم ومغفور کے پوتے ہیں نام سے دلاوری عیاں ہے، تیسرے لمعان الحق مولوی برہان الحق کے فرزند دلبند جن کی پیشانی سے شجاعت کا نور چمکتا ہے ہر دم میر اشیر امام کا منہ تکتا ہے کہ اجازت پاؤں اور ہوا کی طرح اودھ کو جاؤں، چوتھے محمد شیخ سرفراز احمد کہ چراغ عالی دماغ کاکوری کے رہنے والے جفائیں سہنے والے، پانچویں عبدالغفار مولوی عبدالجامع کے نورالابصار سلیقہ شعار خوش کردار جان صالح ابرار اور باسعادت ان کے اسی طرح کے کتنے ہی جوان نادر روزگار باوقار تھے۔

علی نقی خاں کی برہمی

اب یہاں کا حال سنیئے، ادھر جناب امیر المجاہدین اور مولوی عبدالرزاق کا جانا ادھر سارے لکھنؤ میں قیامت کا آنا ہر مسلمان نے جہاد پر کمر باندھی کافر کشی پر تیغ و سپر باندھی جس کو دیکھئے وہی ہے عازم ہو رہا ہے، جب یہ خبر نواب علی نقی خاں کو پہنچی کہ علماء فرنگی محل بھی جہاد پر آمادہ ہو گئے یہ سنتے ہی پریشان حد سے زیادہ ہوئے اور مولوی مفتی محمد یوسف کو بلوا کے استفسار کیا کہ فرنگی محل میں کن کن صاحب نے یہ فساد اٹھایا ہے؟ ہم تو اس خاندان کو بہت مانتے ہیں، برائے خدا اور رسول جلد جائیے فتنہ خوابیدہ نہ جگائیے ہنگامہ کو مٹائیے نشیب و فراز دکھا کے امیٹھی سے پھیر لائیے وہ جو فرنگی محل میں آئے اور غیظ و غضب نواب کی خبر لائے پھر تو گویا مولوی عبدالرزاق کے گھر پر قیامت کبریٰ تھی نصیحت اور ملامت کیا کیا تھی، مفتی صاحب نے

بھی زبانی کوئی بات اٹھا نہ رکھی ایمان کی حمیت اور حیا ذرا نہ رکھی۔ وہ تو ادھیڑ بن کر اپنے گھر سوت ہٹی کو تشریف لے گئے۔

نفسا نفسی کا عالم

اب دوسرے صاحب کا عمل ہوا گویا دشمنوں کے دماغ میں خلل ہوا آدھی رات تک دوڑ کی خبر گرم رہی۔ دروازے کی طرف سب کی نظر رہی اور مولوی عبدالرزاق کے اہل و عیال کو گنہگاروں کی طرح چھپا کے اپنے گھر لے گئے مکان میں قفل دے گئے۔ ہر شخص ہمت ہارا تھا جیسی مولوی عبدالرزاق نے ڈاکہ مارا تھا اور اسباب کا عجب حال تھا اٹھانا محال تھا آدھا گھر پہنچا تو نصف راہ میں رہا اور کہیں چھپانے کا قصد کرتے تھے۔ تو لوگ کانوں پر ہاتھ دھرتے تھے کہتے تھے ہمارے گھر میں نہ لانا ہمیں اس آفت سے بچانا۔ کیا ہمارا گھر بھی لٹوا دو گے۔ کوئی طعنہ سے کہتا تھا کیا تم بھی جہاد کو جاؤ گے؟ قصہ کوتاہ اسی حیص بیص خوف و رجا میں اوقات گذر گئی چار پہر رات گذر گئی نہ سوار آئے نہ پیادے نظر آئے۔

شاہی پیامبر

نور کے تڑکے حسب الحکم نواب فقیر اللہ رفیق شرف الدولہ غلام رضا ہندی الاصل بلا فصل اور میر صفدر علی چکلہ دار حیدر نگر سے اعیٹھی کو روانہ ہوئے مطوّل روانہ ہوئے دیکھنے والے کہتے تھے کہ مجاہدین کو پھرنے جاتے ہیں دیکھئے کس طرح لاتے ہیں۔ لیکن اتنی خبر گذری کہ دونوں صاحبوں نے کچھ اپنی رائے کو دخل نہ دیا بکمال نرمی فقط ابلاغ حکم سرکار کیا۔ کہا حضور عالم کا ارشاد یوں ہے کہ تم کو اضطراب کیوں ہے؟ پہلے تدارک اس کا ہم پر واجب ہے اگر خدانخواستہ ہم اس امر دینی میں کچھ پہلو تہی کریں اس وقت تم کو مناسب ہے امیر المجاہدین نے بھی بکمال لطف ان سے خطاب کیا مناسب وقت کے جواب دیا آخر کوئی امر طے نہ ہوا گو انہوں نے بہت القیام کیا ناچار فوج محمدی سے علیحدہ کسی باغ میں قیام کیا۔

کارلاتی فی سبیل اللہ فساد

اب پھر چند فقرے یہاں کے سننا چاہیئے داد سخن دیا چاہیئے کہ بعض مولویوں نے میدان خالی پا کے نواب کے پاس جا کے سارے عالم کو برا اور آپ کو بھلا بنا کے صاف کہہ دیا کہ جہاد فرض کفایہ ہے کتب فقہ میں یوں ہی آیا ہے۔ جو فرض عین کہتا ہے خطا پر ہے شاید قتل بندگان خدا ناحق مدِ نظر ہے بلکہ یہ معرکہ جو اودھ میں گذرا ہے مطلق جہاد نہیں وہاں تو لڑنا بھی نا روا ہے وہاں تو جہاد کی شرط نہیں پائی جاتی وہ دار الحرب کب ہے۔ بیراگی ہنومان گڑھی کے مطیع الاسلام ہیں۔ جس کا جی چاہے ہم سے گفتگو کرے، مناظرہ آپ کے روبرو کرے آپ اتنا تردد ناحق فرماتے ہیں۔ کیوں غصہ کھاتے ہیں اگر

سرکار ہم کو خلعت اور زادِ راہ دے کے فیض آباد کو روانہ فرمائے ابھی علی آباد میں جا کے رہتے ہیں ایسا وعظ کہتے ہیں کہ بلوامٹ جاتا ہے ایک شخص وہاں نظر نہیں آتا ہے۔ غرض ایسا کچھ تڑاق پڑاق باتوں سے سبز باغ دکھایا کہ نواب نے دو شالہ اور رومال کوئی بیس پچیس روپیہ کا منگا کے اسی وقت اڑھایا اور سو روپیہ نقد چلنے کی زبانی دلوادی یہ تو خلعت پہن کر ایسے خوش ہوئے گویا سلطنت ملی بڑی دولت ملی۔

اصحاب فیل

اپنا قلم تھراتا ہے، کاغذ کا سینہ پھٹا جاتا ہے کیفیت لکھنا دشوار ہے، ان کا دربار سے نکلنا اور گھر کی طرف چلنا دم بھر میں سارے شہر میں خبر منتشر ہوئی دنیا زبروزبر ہوئی انگشت نمائی ہونے لگی اشعار ہجو بر ملا ہونے لگے جو جس کے دل میں آتا تھا بے تکلف زبان پر لاتا تھا۔ الغرض سامان سفر ہوا سا تھ لے جانا عزیزوں کا مدنظر ہوا ہاتھی تعینات ہوا اصحاب فیل بنے عقل پر پتھر پڑے طعمہ طیراً ابابیل بنے، نذ باریوں سے صحبت ہوئی بلا قید کے اجازت ہوئی، ہر روز یہ ہاتھی پر چڑھ کے جانے لگے۔

مولانا عبدالرزاق فرنگی محل کی واپسی

وہاں ایٹھی میں بعد تیل وقال ایک دو روز میر صفدر علی اور پڑھے نہ لکھے نام مولوی محمد فاضل نے یہ نوشتہ لکھ دیا اور زبانی بھی بحلف اقرار کیا کہ اگر مسجد ثابت ہو گئی نواب صاحب بہادر اسی وقت بنوا دیں گے اور بیراگیوں سے بے ادبیوں کا انتقام بھی لیں گے اور اگر ثابت نہ ہوئی مجبوری ہے بیراگیوں کی بے قصوری ہے شکایت نہ کیجئے گا۔ جہاد کا نام پھر نہ لیجئے گا اس عہد پہ وثوق کر کے مولوی عبدالرزاق مع اعوان و انصار اپنے گھر کو آئے مگر امیرالمجاہدین تشریف نہ لائے۔ مولوی عبدالرزاق نے حسب المطلب نواب صاحب سے ملاقات کی اور ہنگام استفسار حرف و حکایات کی لیکن وہی تیور رہی جہاد فرض عین زبان پر رہا ایسی تقریر دل پذیر کی کہ خروج واجب ہر مسلمان پر رہا۔

مولانا عبدالرزاق کا شاہی خلعت قبول کرنے سے انکار

خلاصہ یہ ہے کہ خلعت دینے میں نواب نے بہت اصرار کیا مولوی صاحب نے انکار کیا رخصت ہو کے مکان پر آئے کلمات حسرت و افسوس زبان پر گئے دو ایک بار اور رہا گئے مجبوری ناچار گئے تب نواب تعمیر مسجد میں چناں چنیں کرنے لگے تب اپنے آنے پر خود نفرین کرنے لگے، تب اپنے آنے پر خود نفرین کرنے لگے جی چاہا کہ پھر عزم کریں

سامان رزم کریں لیکن سردست شہر سے نکلنا دشوار تھا کہ لوہے کے پل اور نا کجات پر بندوبست سرکار تھا۔

امیر المجاہدین سے واجد علی شاہ کی ملاقات

جب مولوی عبدالرزاق کے پھر آنے پر بھی اہلکاران سرکاری کا اطمینان نہ ہوا تو منشی امیر حیدر بشیر الدولہ بہادر خواجہ سرا کو روانہ کیا کہ ایسا کچھ نشیب و فراز دکھاؤ کہ مولوی امیر الدین علی صاحب کو پھیر لاؤ چنانچہ حسب الحکم امیر حیدر نے امیٹھی میں جا کے جناب ممدوح سے عہد و پیمان کیا۔ مولوی صاحب نے بھی اصرار نہ زیادہ کیا لکھنؤ کا ارادہ کیا خلاصہ یہ کہ دو تین دن کے بعد امیر المجاہدین منشی امیر حیدر کے ساتھ ناکے تک پہنچے اور وہاں سے بشیر الدولہ بہادر کے ساتھ کہ وہ استقبال کو گئے تھے تشریف لائے اسی آن بان سے مع سپرد شمشیر اپنے مجاہدین کو ساتھ لئے ہوئے نواب صاحب کے پاس آئے۔ نواب صاحب کی مروت اور اخلاق چھپا نہیں ہے وہ خاطر داری کی کہ جتنے حضار مجلس تھے دنگ ہو گئے۔ سب کے زرد رنگ ہو گئے امیر المجاہدین کا بھی وہ رعب چھایا کہ سارا دربار تھرآیا۔

امیر المجاہدین اور واجد علی شاہ کی گفتگو

پہلے کشتی خلعت کی منگائی اور اس کے ساتھ پانسو روپے کی تھیلی آئی در گفتگو باز ہوا قصہ دنیا سازی بلکہ دم بازی کا آغاز ہوا۔ نواب نے فرمایا سرکار تمہارے عزم بالجزم سے کہ ہمہ تن خدا کی راہ میں جان دینے کو موجود ہو۔ بہت رضامند ہے نہایت خورسند ہے کار مردانہ کرتے ہو خدا کی راہ میں قدم دھرتے ہو خلعت پہنئیے، روپیہ لیجیے چندے بسر کیجیے، انشاء تعالےٰ عنقریب بشرط ثبوت تعمیر خانۂ خدا ہو جائے گی۔ جہنتوں کو سزا مل جائے گی۔ امیر المجاہدین نے کہا ہم لوگ خدا کی راہ میں جان پر کھیلے ہوئے ہیں مصیبتیں جھیلے ہوئے ہیں ہمیں خلعت اور انعام سے کیا کام ہے۔ اس خلعت کا بد انجام ہے کہیں کے عامل نہیں چکلہ دار نہیں مصاحب نہیں سپہ سالار انہیں خلعت لے کے کیا کریں آپ کو اوروں کی طرح کیوں رسوا کریں یہ خلعت اور انعام نہیں ایمان فروشی ہے دنیا کے لئے دین سے چشم پوشی ہے۔ ہمارا خلعت یہ ہے کہ رخصت جہاد ہو۔ اجازت سفر فیض آباد ہو کر بیراگیوں سے انتقام خون ہر فرد مسلمان اور بے ادبی ہائے قرآن لیں۔ نواب نے جیسا لبعض علماء سے سنا تھا فرمایا کہ یہ جہاد نہیں۔

دربار واجد علی شاہ میں امیر المجاہدین سے مناظرہ

تھوڑی رد و قدح ہوئی تھی کہ

ناگہاں وہی صاحب کہ اسی بات کا خلعت پہنے ہوئے بیٹھے تھے، باشارہ حضور دور سے نزدیک آئے اور تائید کلام حضور زبان پر لائے کہ واقعی فرض عین ہونا جہاد کا کتب فقہ میں دیکھا نہیں، خصوصاً ہندوؤں کی زیادتی کا کچھ لکھا نہیں مولوی صاحب نے کہا سبحان اللہ آپ کو عبارت شرح وقایہ کی بھی وفرض عین ان ھجو فتخرج المراۃ والعبد یاد نہیں کس طرح کہتے ہیں کہ جہاد نہیں، اس میں کلام چند در چند ہوئے آخر کو بند ہوئے اور کہنے لگے کہ بالفرض اگر فرض بھی ہو تو شرط امامت ہے کہ اولی الامر منکم قرآن کی آیت ہے۔ امیر المجاہدین نے پھر خطاب کیا اور یوں انہیں لاجواب کیا کہ ہمارا امیر کوئی نہیں کہ واسطے کہ یہاں شرطیں امارت کی مفقود ہیں چھوٹی سی یہ بات ہے کہ بڑے صاحب موجود ہیں، یہ سنتے ہی دونوں صاحب کے باختہ ہوش ہو گئے امیر المجاہدین خاموش نہ ہوئے بعض کہتے ہیں، مولوی خادم احمد صاحب نے یہ کہا کہ فرضیت جہاد سے ہم کو انکار نہیں بلکہ ہم نے ہی تو آپ سے بیعت کی تھی، بندہ بھی عازم ہے مگر بجا آوری حکم حاکم کی لازم ہے۔ تھوڑے دن دیکھئے اگر آسانی تعمیر خانہ خدا ہو گی، مشرکین کو سزا ہو گی۔ تو پاؤں پھیلا کے گھر میں سوئیے۔

واجد علی شاہ کی بے بسی انگریزوں کے مقابلہ میں

نواب نے بھی ارشاد کیا کہ آپ اتنی جلدی کیوں کرتے ہیں ہم کو آپ سے زیادہ خیال ہے، واللہ کفار کی زیادتیوں کا بڑا ملال ہے مگر کیا کریں قابو نہیں ”صاحب کلاں“ سے مجال گفتگو نہیں، جب سے کلام اللہ کے جلنے کو سنا ہے، دل کباب ہو گیا ہے کلیجہ بھنتا ہے لیکن آپ کو شیخ سعدی علیہ الرحمۃ کا کلام یاد نہیں دیر آید درست آید۔ آپ تھوڑے ہی دن تامل کریں روانگی میں تساہل کریں ہم حکمت عملی سے مسجد بھی بنوا دیں گے اور انتقام بھی بے ادبیوں کا لے لیں گے۔ اس بات پر امیر المجاہدین باوجود اصرار خلعت وغیرہ سے انکار کر کے نواب کو سلام کر کے معہ مجاہدین مسجد مقبرہ امجد علی شاہ میں بانتظار حکم نواب ٹھہرے

امیر المجاہدین کا جوش جہاد

لیکن امیر المجاہدین کو عجب طرح کا جوش تھا اور ہر مجاہد بھی مئے اشتیاق جہاد سے مدہوش تھا ہر دم یہی چاہتے تھے کہ جس طرح

ۛ اور اگر فرض عین ہے اگر غلبہ کریں کفار پس نکلے عورت اور غلام بے اجازت کے۔

ۛ انگریز ”صاحب کلاں“ کہلاتے تھے رئیس احمد جعفری۔

ہو آپ کو فیض آباد اودھ میں پہنچائیں اور خدا کی راہ میں جوہر شجاعت و جوانمردی دکھائیں۔

شیعہ بھی امیر المجاہدین کے ساتھ تھے

حاجی بشیر الدولہ بہادر با ایں ہمہ کہ مذہب اثنا عشری رکھتے تھے دن بھر میں دس گیارہ مرتبہ مزاج کی خبر منگواتے تھے، آٹھ پہر انہی کی خاطرداری میں رہتے تھے اور اکثر یہ کہتے تھے کہ خدا اسلام کی آبرو اور دین کی دھوم چار سو رکھے اس خدادوست کی عزت پر حرف نہ آوے، جو اس خمسہ بجا نہیں۔ حامی خدا کے سوا دوسرا نہیں گو اکیلا ہوں مگر اس بزرگ کے واسطے جان پر کھیلا ہوں، اکثر خود تشریف لاتے تھے اور مولوی صاحب کی تسکین فرماتے تھے، جی چاہتا تھا کہ ہاتھ میں ہاتھ دیا جائے اس امر دینی میں ساتھ دیجئے، مگر چارو ناچار مسجد سے اٹھ جاتے تھے ایسا ملال تھا کہ کچھ پیتے تھے نہ کھاتے تھے دنیا کے کام سے منہ پھیرا تھا اس ملال سے آنکھوں میں اندھیرا تھا دو پہر اسی کا چرچا رہتا تھا۔ سلطان عالم سے بھی موقع پر ذکر آجاتا تھا لیکن نواب کے خوف سے زبان دبا جاتا تھا جیسا یہ ایک ہے اگر دو چار بھی اور ہوتے تو کا ہے کو مسلمان مسجد کو روتے۔

عبرت انگیز واقعہ

دہم ذی الحجہ ۱۲۷۱ھ قدسی کو سر شام مولوی خادم احمد صاحب کی آنت اتری عالم تہ و بالا ہوا بدنام رومال اور درد شالہ ہوا۔ دم بدم مرض بڑھتا تھا مرض چڑھتا تھا، رگ رگ میں نیش غم تھا، آشنا خویش حاضر باش نے دوڑ دھوپ میں کیا کیا نہیں۔ لیکن مرض الموت کی دوا نہیں نہ نواب کام آئے نہ روپیہ پیسہ کام آیا جو کچھ کیا تھا سامنے وہ کام آیا ۱۲ تاریخ ظہر کے وقت پیک اجل کو لبیک کہہ کے سب کے سامنے کلمہ پڑھتے ہوئے سیدھے جنت الماویٰ کی راہ لی مورد رحمت الٰہی ہوئے گنہگار یا یں بے گناہی ہوئے، سب بکھیڑا پڑا گیا، حیرت کے عالم میں کوئی بیٹھا کوئی کھڑا رہ گیا، اس مرگ ناگہانی سے سب کو حیرانی ہوئی عبرت کی نشانی ہوئی۔ آخر جنازہ لے کے چلے، سینکڑوں آدمی ماتم کرتا ہوا ساتھ تھا۔ کوئی نالہ و آہ کرتا تھا کسی کی زبان پر ہیہات تھا۔ ہندو مسلمان روتا تھا، لیکن وہ بھی ذکر ہوتا تھا۔ ناچار نماز پڑھ کے پیوند زمین کیا۔

امیر المجاہدین کی دوبارہ روانگی

جب امیر المجاہدین کو مسجد میں بہت دن بسر ہوئے تعمیر مسجد کیسی نواب کو کبھی جھوٹے بھی دھیان نہ آیا کہ کسی کو ٹھہرایا ہے کیا وعدہ فرمایا ہے، اور مجاہدین کا تقاضا شدید ہوا جماعت قدیم کے سوا اور بھی بہت سے اہل اسلام بہ نیت جہاد آئے کہنے لگے ہم ایسے جھوٹے وعدوں سے بہت گھبرائے۔ اب

مناسب ہے کہ چلیے اس منحوس شہر سے نکلیے، ناچار مولوی صاحب نے رخصت کے باب میں اصرار کیا، اب یہاں ٹھہرنا بے سود ہے، دینداری کارگزاروں سے مفقود ہے، مسجد کے نہ ہونے کا اب تک گمان ہے، کیفیت اور محضر مرسلہ مولوی نہال الدین و مولوی حفیظ اللہ خاں ہے بشیر الدولہ نے بھی کہا تعمیر مسجد ان لوگوں کے ہاتھ سے دشوار ہے حیلہ انگریزی ان کا شعار ہے، چلیے انشاء اللہ تعالےٰ ہم بھی آتے ہیں بلکہ دیانت الدولہ بہادر کو ساتھ لاتے ہیں، گھڑی بھر میں گڑھی کو تاخت و تاراج کریں گے۔

مولوی مسیح الزمان کا ایثار قصہ مختصر نوزدہم ذیحجہ سن مذکور کو مولوی امیر الدین علی صاحب نے اسی شان و شوکت جاہ و حشمت سے نصر من اللہ و فتح قریب پڑھ کر کوچ کیا اور مولوی مسیح الزمان صاحب ایمان صائب اپنا کارخانہ بنا بنایا بگاڑ کے دنیائے دول سے منہ موڑ کے بہ نیت خاص جہاد کان پور سے آئے تھے وہ بھی مولوی صاحب سے بیعت کر کے ہمراہ ہوئے ان کی خوش بیانی اور شیریں زبانی سے گروہ مسلمانوں کا موج در موج آنے لگا لشکر اسلام دریا کی طرح لہرانے لگا۔ بایں تزک و احتشام قریب شام امیٹھی شریف میں داخل ہوئے وہاں سے بھی بہت مسلمان لشکر میں شامل ہوئے، شب کے شب آرام کر کے بفضل خداوند کریم بخط مستقیم فیض آباد کو راہی ہوئے۔

حکم امتناعی ۲۱ ذی الحجہ ۱۲۷۱ھ تھی کہ اہل کاران سرکاری کو اجازت ملی کہ جاؤ اور مولوی امیر الدین علی صاحب کو لاؤ آگے بڑھنے نہ پائیں ہنومان گڑھی پر چڑھنے نہ پائیں کسی طریق سے راہ میں روکو چنانچہ میر صفدر علی اور رمضان علی ان کی نائب اور درسن کا بیٹا نصرت جنگ نواب کا مصاحب اور محمد تہور خاں بہادر رسالدار اور میر محمد حسین کلکٹر سحر گفتار اور شیخ حسین علی کارندہ نواب علی خاں محمود آباد اس عہدے پر مامور ہوئے۔

ناحق چوٹ جولاہا کھائے سرکاری لوگوں پر لشکر اسلام کا ایسا رعب چھایا مارے ڈر کے کوئی فوج محمدی کے گرد نہ آیا سب ٹھٹک کر رہ گئے۔ محمد حسین کلکٹر اور تہوار خاں اور شیخ حسین علی وغیرہ بڑے بڑے تھے نہ جا سکے، لشکر اسلام سے دور مقام کیا، کسی اور کی معرفت پیغام سلام کیا، اگر اجازت ہو تو ہمیں بھی آپ کی زیارت سے سعادت ہو، یہ لوگ تو اسی فکر میں ہیں وہ جو مثل ہے ناحق کی چوٹ جولاہا کھائے کر گہ چھوڑ تماشے جائے صادق ہوئی، رمضان علی اور عامل نواب گنج کہ وہ بھی ان لوگوں کے ساتھ ہو گئے تھے، یہ دونوں

آگے بڑھے غازیوں کے منہ چڑھے چاہا کہ امیر المجاہدین سے ملاقات کریں لوگوں نے آنے نہ دیا آگے قدم بڑھانے نہ دیا، جب امام المجاہدین سے اجازت ملی ہتھیار سب کے لے لیجے یہ سب نہتے روبرو پہنچے جس دم مولوی صاحب سے گفتگو روبرو ہونے لگی دم تقریر کے گڑبڑے کلمے زبان پر لائے کہ سبحان اللہ آپ دو تین سو جولا ہے لے کے گڑھی کھودنے چلے ہیں خوب حوصلے ہیں۔ وہاں پرندہ پر نہیں مار سکتا۔ اگلوں کی طرح جان دے دو گے اور کیا ہو گا۔ اسلام کا ضعف عیاں ہو گا بُرا ہو گا۔ اتنا کہنا تھا کہ آفت آئی بعض کہتے ہیں کہ سوائے ہشت و مشت کے زد و کوب کی نوبت آئی۔ آخر کو ذلیل و خوار ہوئے دونوں آدمی گرفتار ہوئے

نئی چال، نیا جال

القصہ بانی فتور جب مجبور ہوئے تو عذر کرنے لگے دل میں بغاوت ظاہر میں رفاقت کا دم بھرنے لگے کہ ہم لوگ ملازم سرکار ہیں لیکن ایمان سے آپکے تابعدار ہیں۔ سرکار فیض آثار کو منظور ہے کہ آپ ایک مہینہ اور تامل فرمائیے۔ اگر اس مدت میں مسجد تعمیر ہوگی فہو المراد ورنہ بے تکلف فیض آباد کو جائیے اور ایام موعودہ تک آپ جماعت کے ساتھ سہالی یا فتح پور میں بسر کریں، جو کچھ کھانے پینے میں آپ کے صرف ہوگا وہ سرکار سے ملے گا اور ہم بھی عہد کرتے ہیں، بلکہ قرآن مجید پر ہاتھ دھرتے ہیں کہ اگر اس میعاد کے اندر مسجد نہ بنوائی تو انشاء اللہ ہم بھی آپ کے شریک حال شامل جدال و قتال ہوں گے جب ان سب نے کئی دن تک بہت باتیں کیں اور ایسی غلط قسمیں کھائیں تب سلطان المجاہدین بھی سمجھے کہ حاکم سے لڑائی ضرور نہیں اور مہینہ کچھ دور نہیں بعد مہینے کے سمجھ لیں گے پھر اہالی سرکار کیا کہیں گے یہ سوچ کے حسین علی کے ساتھ سہالی میں کہ ملا قطب الدین شہید رحمۃ اللہ علیہ کا مدفن ہے رونق افروز ہوئے مشغولِ عبادت خدا شب و روز ہوئے اور مولوی مسیح الزماں صاحب تہور خان کے ساتھ لکھنؤ میں تشریف لائے اور انہیں کے ساتھ دو چار بار نواب کی خدمت میں گئے آئے۔ نواب نے تعمیر مسجد کے باب میں ایسے کچھ کلمے لکھے کہ سمجھے تقریر سابق تو فقط چرب زبانی جھوٹی کہانی تھی آخر مولوی تراب علی صاحب اور مولوی حسن احمد مولوی عبدالرزاق صاحب سے ملاقات کر کے چلنے پر سب کو آمادہ کیا آپ سہالی کا ارادہ کیا۔

راجہ مان سنگھ کے جاسوس

سہالی میں ایک روز تین فقیر بھیک مانگتے ہوئے دستہ فوج اسلام کی طرف سے گذرے۔ غازیوں نے قرائن سے دریافت کیا کہ یہ زنار دار ہرکارے ہیں دشمن ہمارے ہیں نمازی کا جامہ پہنے ہیں اس گمان سے ان بت پرستوں کو تنگ پکڑا اور تازیانہ کی مار مارنا شروع کیا، مارے بھوت بھاگتا ہے اور لکڑی سکے بل

بندر ناچتا ہے جب خون کے فوارے بدن سے نکلنے لگے تب ہاتھ باندھ کے کہنے لگے ہم راجہ مان سنگھ کے نوکر ہیں خفیہ اخبار پر مقرر ہیں جیسا کیا تھا ویسا بھر پایا اب اگر آپ سے مخلصی پائیں گے ترقی جماعت کی دعا مانگتے چلے جائیں گے۔ اس کی خبر امیر المجاہدین کے گوش زد ہوئی فرمایا کہ کان مروڑ دو اور چھوڑ دو ہمارا خدا مددگار ہے راجہ مہاراجہ کیا نا بکار ہے

مسیح الزمان کی بے وفائی

اب کی بار مولوی مسیح الزمان بعد ملاقات اہالیان سرکار جب سہالی میں گئے خدمت فیض درجت میں کچھ عجب حالت اور کیفیت میں پہنچے ظاہر میں ملے باطن میں خلاف رہنے لگے۔ مجاہدین کو بہکانے لگے نفاق کی باتیں کرنے لگے۔ اپنا گروہ الگ جمایا لیکن وہ لوگ سیدھے مسلمان جلد ہوشیار ہو گئے۔ آخر جب ان کو بالکل بہکا ہوا پایا تب یہ مشورہ ٹھہرایا کہ لشکر اسلام سے خارج کرو پھر ان کا نام نہ لو اپنا سا منہ لئے چلے آئے۔ سبحان اللہ وبحمدہ مسیح الزمان کا وہ آغاز تھا کہ مدار المہام لشکر اسلام مشہور ہوئے انجام یہ ہوا کہ لوگ نفریں کرنے لگے یہ بھی نمک حرام مشہور ہوئے۔

مولوی تراب علی و مولوی عبد الرزاق

جب مسیح الزمان کی کجروی کی خبر مولوی تراب علی صاحب اور مولوی عبد الرزاق صاحب کو پہنچی کہ وہ اسی نیت سے سندیلہ کو تشریف لے گئے تھے، گویا ابھی تک سامان درست نہ ہوا تھا۔ لیکن سید سے سہالی کو روانہ ہوئے، پھر تو مجاہدین کو بڑی تقویت ہوئی بہت قوت ہوئی اور اکثر مسلمان ان مصاحبوں کے باعث شریک لشکر اسلام ہوئے، جو کوئی سنتا تھا کہ ہمارے پیشواؤں نے حکم نفیر عام دیا ہے اور بقصد اودھ سہالی میں مقام کیا ہے چلنے کا سامان کرتا تھا اور جو کوئی جانے سے معذور تھا، مگر زردار صاحب مقدور تھا وہ سلاح وغیرہ اسباب حرب حاضر کرتا تھا یوں تسکین خاطر کرتا تھا جس وقت ایام موعودہ میں دو ہی ایک دن کا باقی زمانہ رہ گیا۔ امیر المجاہدین نے مولوی تراب علی اور مولوی برہان الحق وغیرہ سے کہا کہو اہالیان سرکار کو اب کیا عذر باقی رہا وہ ٹالتے ہیں۔ خواہ مخواہ حیلے نکالتے ہیں۔ آمد سرما ہے، ٹھنڈی ہوا ہے، صاحبو ہم تو بسم اللہ کرتے ہیں۔ ان لوگوں کو کیا عذر تھا تابعدار تھے۔ سب کے سب کہنے کے ساتھ ہی تیار تھے۔ تاریخ روانگی مقرر ہوئی تیاری لشکر ظفر پیکر ہوئی۔

طفل تسلیاں

جب خبر کوچ مشہور ہوئی پھر یہاں کے حکام کو اضطرار ہوا امیر المجاہدین کے توقف میں اصرار ہوا پہلے ادھر مان سنگھ کو فیض آباد اودھ کی طرف روانہ کیا کہ

جلد جا کے مسجد بنواؤ اور اگر کچھ مسجد کے اثبات میں شبہہ ہو تو مہنتوں کو در دولت پر روبکاری کے واسطے لاؤ۔ غرضیکہ زبانی جھوٹ موٹ تہدید کی اور دھمکایا اور ایک دوشالہ رومال سمیت بھاری منگا کے اوڑھایا اس نے بھی جی میں کہا چلو مفت میں گھاگرہ اشنان کرو حضور عالم کی مہربانی ہے۔ لطف زندگانی ہے اب کی اگر آؤں گا تو ایک دو مہنت کو بھی ساتھ لیتا آؤں گا۔ کیا نقصان ہے میرا حامی ہنومان ہے ایسی احمق سرکار کہاں ملے گی عین غصہ میں تو دوشالہ رومال عنایت ہوا ہے ہنگام سرفرازی شاید حکومت ہندوستان ملے گی اور ادھر افسران فوج کو حکم ہوا کہ پھر مولوی امیر الدین علی صاحب کی خدمت میں جاؤ اور بکمال تملق و چاپلوسی سمجھاؤ جس طرح بن پڑے متوقف کرو یہاں تک کہ سر بھی ان کے قدموں پر دھرنا کہنا کہ اب اعزاداری محرم سے فراغت ہوئی ہے ماتم امام علیہ السلام سے فرصت ہوئی ہے تعمیر مسجد میں خوب اہتمام ہوگا۔ ایک دم نہ آرام ہوگا۔ بعض افسروں نے بلطائف الحیل جانے سے انکار کیا۔

امیر المجاہدین کی مصالحت پسندی

مگر بعض افسر سپاہی کو پہنچے معاذاللہ گویا غازیوں کی گوشمال کو پہنچے لیکن اجازت حضوری امیر المجاہدین امام الانام حاصل نہ ہوئی بہ کمال عرض و معروض محمد تہور خاں بہادر رسالدار اور مرزا قدرت اللہ بیگ چکلہ دار اور میر محمد حسین کلکٹر اور شیخ حسین علی کارندہ نواب علی خاں کو روبرو بلوایا اور کہا اب کیا ہے جواب دیا کہ اگرچہ مقتضائے حمیت نہ تھا کہ آپ کی خدمت میں آتے اور پھر منہ دکھلاتے لیکن کیا کریں تابعدار ہیں حاکم کے فرمانبردار ہیں کیا مشکل ہے اگر آتے ہیں تو آپ سے شرماتے ہیں ورنہ روزگار سے جاتے ہیں اب پھر نواب صاحب بہادر نے آپ کو پیغام دیا ہے اور یہ عذر پیش کیا ہے کہ یہ مہینہ ماہ ماتم فرزند رسول مقبول تھا میں عزاداری محرم میں مشغول تھا۔ ان شاءاللہ تعالیٰ اب تھوڑے تھوڑے توقف میں بہت کام بن جائے گا بے تامل خانہ خدائے ذوالجلال والاکرام بن جائے گا چنانچہ ہان سنگھ کو سوئے اودھ بھیجا ہے اگر وہ مسجد بنواتا ہے تو بہتر نہیں تو یہیں مہنتوں کو لاتا ہے۔ کما ینبغی روبکاری ہوگی بہر حال مسجد کی تیاری ہوگی۔ اب ہرگز تامل نہ ہوگا اس امر میں کسی طرح سے تغافل نہ ہوگا۔ آپ کو بھی مناسب ہے کہ مولوی برہان الحق صاحب اور مولوی عبدالرزاق صاحب اور مولوی تراب علی صاحب کو بطور رسالت و سفارت روانہ فرمائیے اب کہیں نہ جائیے ان کے سامنے بخوبی روبکاری ہوگی عیاں کیفیت ساری ہوگی۔ غرض ایسی کچھ باتیں بنائیں نشیب و فراز کی صورتیں دکھائیں کہ امیر المجاہدین نے ان کی گفتگو بظاہر

مصلحت آمیز و بہ باطن فتنہ انگیز سن کے توقف کیا اور تینوں مولویوں کو فقط پانچ دن کے وعدے پر مع غرض کے روانگی کا حکم دیا۔

چار ثالثوں کا واجد علی شاہ کی طرف سے تقرر

۲۷ تاریخ محرم الحرام ۱۲۷۱؁ھ قدسی کو وکلائے لشکر اسلام مقام لکھنؤ میں داخل ہوئے دربار یوں میں شامل ہوئے دو ایک مہنت بھی حسب الطلب آئے اور نواب نے احمد علی خاں اور مولوی غلام جیلانی اور مولوی غلام امام[1] شہید اور مولوی فضل حق خیر آبادی[2] چار ثالث مقرر فرمائے

مہنتوں کے ساتھ شاہی سلوک

لیکن عجب یہ ہے کہ ایک دن بھی وکلائے اسلام اور مہنتوں کا روبکاری پر مواجع نہ ہوا۔ نواب صاحب نے کچھ خیال بھی نہ کیا کہ کون ہیں کہاں سے آئے ہیں کس کا پیغام لائے ہیں بلکہ مہنتوں کی توقدر بھی ہوئی صوبہ سنگھ کپتان کی پلٹن میں جگہ رہنے کے لئے ملی۔ انھیں کے تلنگے حفاظت کے واسطے مقرر ہوئے۔

پھر چپکا دیا

ظاہرا یہ پنچایت وغیرہ ٹھہرانا فقط ایام گذاری تھی مسجد بنوانا کسی طرح منظور نہ تھا چاہتے تھے، کہ یہاں تک مولوی صاحب کو روکئے کہ جماعت ٹوٹ جائے۔ مسیح الزمان کو دیوں چھڑا لیا علماء کو وکالت کے بہانے سے بلا لیا۔ اب کیونکر جماعت کم نہ ہوگی۔ الغرض دروغ گو را حافظہ نباشد نہ پنچایت ہوئی نہ مسلمانوں کی حمایت ہوئی وکلائے لشکر اسلام بھی نواب کی عدم توجہی دیکھ کے تھک کر بیٹھ رہے پانچ دن کا وعدہ کر کے آئے تھے کئی ہفتے گذر گئے مگر پھر نہ سوئے، لشکر ظفر پیکر گئے حاکم کے خوف سے دل کچ ہوئے بعض اشخاص سر عام کہتے تھے کہ یہ لوگ اس بہانے آئے ہیں کہ ان کا جانا دشوار ہے یہیں سے کاغذ کے گھوڑے دوڑانے لگے نامہ و پیام سے امیر المجاہدین کی تسکین فرمانے لگے شنبہ کو لشکر اسلام نے سہالی سے کوچ کیا۔ زمین تھراتی تھی ہاتھی پر لشکر کا نشان ہم پہلوئے آسمان شان و شکوہ کوئی پیادہ کوئی سوار مگر بے شمار کوئی اپنا گھوڑا کودا تا تھا۔ کوئی پیادہ پائی میں مارے جرأت کے اکڑا جاتا تھا۔ تلب گاہ میں سلطان المجاہدین کی پالکی نشانی اقبال کے آگے آگے، ولایتوں[3] کے غول بطور نقیب قصائد مدح رسول الثقلین امام القبلتین پڑھتے

---

[1] جن کا میلاد اب تک مشہور عوام ہے۔

[2] مشہور فلسفی عالم اور بزرگ جن کا بہ جرم بغاوت کالے پانی میں انتقال ہوا

[3] ولایتی سے مراد افغانی اور قبائلی پٹھان ہیں ۔ (رئیس احمد جعفری)

چلے جاتے تھے۔ کس ملاحظہ اور ادب سے قدم بڑھاتے تھے۔

مجاہدین کی دہشت

جب شان و شوکت لشکر اسلام کی خبر یہاں عام ہوئی گھر گھر پہنچی کشتی لکھنؤ کی طوفانی ہوئی، ہندوؤں کے ہوش باختہ ہوئے۔ بدحواس سب اُلو کی دم فاختہ ہوئے بغلیں جھانکنے لگے، حاکم سے رعایا تک ہر بشر ورد مند ہوا یہ اندھیرا ہوا کہ پہر دن سے صرافہ بند ہوا کوتوال پر تہدید ہوئی تاکید شدید ہوئی کہ شہر سے خبردار رہنا اپنے کام سے ہوشیار رہنا لٹ جانے کا ڈر ہے۔

بادشاہ کا اضطراب

اگر صبح کو خبر آئی کہ ہزار مجاہد جار ہیں تو شام کو چرچا لگا کہ دو ہزار ہیں تب تو نواب کو کمال اضطراب ہوا۔ کہنے لگے کہ یہ گھر خراب ہوا اب یہ انبوہ کب رکے گا۔ صفائی[1] ہو جائے گی۔

بادشاہ کی مجتہدوں سے گفتگو

آخر اسی اضطراب میں طرفہ تدبیر عقل میں آئی یا کسی استاد نے سمجھائی کہ مسئلہ جہادیہ میں اختلاف ہے، آپ کیوں بکھیڑا سر پر لیتے ہیں، عالموں کو کیوں نہیں حکم دیتے ہیں وہ ابھی چلے جائیں سب کو پھیر لائیں یہ سنتے ہی نواب بحال ہو گئے دور سب ملال ہو گئے۔ پہلے نواب نے سلطان العلماء سید محمد اور سید العلماء میرن صاحب دونوں مجتہدوں کو بلوایا اور فرمایا کہ آپ کو خوب معلوم ہے کہ باعث فروغ مذہب اثنا عشری خاندان ابوالمنصور خاں[2] مرحوم ہے نیز اجتہاد اسی خاندان سے چمکا ہے، یہی خاندان سبب تمہاری جاہ و حشم کا ہے، خصوصاً سعادت علی خاں کی اولاد نے **تمہیں** سر چڑھایا ہے۔ امجد علی شاہ نے تمہارا رتبہ بڑھایا ہے، اگر یہ گھر نہ ہوگا تو آپ کو یہ رتبہ میسر نہ ہوگا۔ آپ اس گھر کو مٹاتے ہیں، مولوی امیر الدین علی صاحب کو رغبت جہاد دلاتے ہیں، لوگ آپ کی تحریص اور ترغیب سے چلے جاتے ہیں اب آپ کو مناسب ہے کہ جائیے اور مولوی امیر الدین علی صاحب کو پھیر لائیے، مجتہد نے تخلیہ کر کے جواب دیا کہ لاحول ولا آپ کا کیا خیال کدھر ہے شاید کلام عوام پر نظر ہے ہمارے نزدیک ہنود اگرچہ بت پرست ہیں لیکن ذمی مطیع الاسلام ہیں، خروج ان پر روا نہیں مذہب امامیہ میں بدون امام جہاد جائز نہیں، لیکن اگر ہم منع کرنے جائیں کلمات اتہام و

---

[1] خاتمہ ہو جائے گا۔

[2] صفدر جنگ۔

تفہیم زبان پر لائیں گمان کیا ظن غالب کہ مبادا مضمون دستخط سے آگاہ ہو جائیں اور ہمیں کو ہدف تیر جہاد بنائیں، اس صورت میں آپ بدنام ہوں گے مطعون خاص و عام ہوں گے مناسب ہے کہ علمائے سنت وجماعت کو افہام کے واسطے روانہ کیجئے

علماء آلہ کار بنائے گئے

غرض نواب کو ایسا معقول کیا کہ انہوں نے بے عذر غذر قبول کیا اور اسی وقت سب عالموں کو حکم پہنچا کہ جلد جاؤ اور جس صورت سے ممکن ہو اس فتنہ کو مٹاؤ تمہارے واسطے بہت فروغ ہوگا۔

یہ حکم سنتے ہی ان لوگوں کے دل کی کلی پھول گئی، علماء کو خدا کی کتاب پیغمبر اسلام کی حدیث بھول گئی کتابیں کھلیں روایات ضعیفہ کے لئے، ورق الٹنے لگے، جناب مولوی سعد اللہ صاحب اور جناب مفتی محمد یوسف صاحب مدظلہما نمک خوار سرکار تھے حیلہ شرعی بھی بھوے حکم کے ساتھ تیار تھے، مگر ان لوگوں کو دیکھئے جن کو کسی طرح کا تعلق سرکار سے نہ تھا زیادہ ان سے اصرار نہ تھا سلطان المجاہدین سے ملاقات کا پیغام کیا حسب الطلب دونوں مفتی صاحبین اور مولوی حسین احمد صاحب اور مولوی ابوالحسن صاحب لشکر اسلام میں رونق افروز ہوئے اور ملازمت امیر المجاہدین کو نذر دی اور زبان شناو صفت ایں کھول کر سچ تو یہ ہے کہ آپ نے اس زمانہ آخر میں اسلام دکھلادیا محمدی کا نام رکھ لیا ایسا صاحب ہمت الوالعزم کہاں ہے۔ ایسی دو چار باتیں سنا کے خلق خدا کو رام کیا اپنا کام کیا کہ ہم کو آنے کی غایت نہ تھی مطلق حاکم کی رعایت نہ تھی لیکن بقول شیخ سعدی شیرازی علیہ الرحمتہ ؎

اگر بینم کہ نابینا و چاہ است
اگر خاموش بنشینم گناہ است

حاکم سد راہ ہے زرخرید سرکار کی سپاہ ہے اور یہ بھی عیاں ہے کہ فوج حاکم آپ سے زیادہ ہے ادھر پچاس ساٹھ ضرب توپ تیار گولنداز مستعد ہوشیار آپ کی طرف ٹوٹی پھوٹی دو چار بندوقیں جو کچھ نہیں، اس وقت میں واجب بلکہ فرض ہے کہ اودھ[1] کو نہ جائیے یہیں عزیمت فرمائیے اور اگر خواہ مخواہ قصد کوچ کا کریں گے اور غازی فوج سرکاری سے لڑ کے مریں گے اس صورت میں ثواب کہاں ہے۔ اگر آپ کو اس کا خیال ہو کہ ہم اور مولوی محمد یوسف ملازم سرکاری ہیں پابند

---

[1] اودھ سے مراد فیض آباد ہے (رئیس احمد جعفری)

دنیاداری ہیں تو مولوی ابوالحسن صاحب اور مولوی حسین احمد صاحب کسی طرح کا سرکار سے سروکار نہیں رکھتے ہیں دولت دنیا پر مدار نہیں رکھتے ہیں، دنیا سے ناراض ہیں دونوں صاحب مرتاض ہیں ان سے احقاق حق کیجئے پھر نہ انکار مطلق کیجئے وہ دونوں صاحب مصدق کلام ہوئے امیر المجاہدین نے بھی مناسب وقت کے جواب دیا۔ اس گفتگو کے بعد صحبت برخاست ہوئی۔

عوام میں ہلچل اس وقت لشکر اسلام میں کچھ صورت ہوئی، ہلچل فی الفور ہوئی کچھ غازی لشکر اسلام سے اٹھ کے عالموں کے پاس آئے علماء کی خلاف آسمان تک غل گیا، مفتیوں کی دینداری کا پردہ صاف کھل گیا اس پر بھی مفسدوں کو قرار نہ آیا زیادہ فتور بڑھایا، مسلمانوں کو تعیل فتوے دستخط علماء پر راضی کیا۔

فتوے پر علماء کے دستخط زور پر علماء پر ایسا کیا کہ سب دستخط پر آمادہ ہو گئے۔ مفسدوں کی بن آئی حسب مضمون حسب دل خواہ بندھ گیا۔

تب ان منافقوں نے جو سرکار سے محض فتنہ انگیزی اور تفرقہ پردازی کو جمع ہو کے مامور ہوئے تھے بظاہر جبہ وخرقہ عبا اور قبا اوڑھے اسلام کے لئے ایک مسودہ فریب آمیز گانٹھ کے استفتا کیا مفتیوں نے بے تکلف صاف صاف از راہ خلاف دستخط کر دیئے۔

استفتا اور فتوی بادشاہ باعث فساد حاکم بالادست مجبور شدہ برائے مصلحت چند ایام منع روانگی مے فرماید دریں حال اگر مولوی امیر الدین علی صاحب کوچ سازند ومقابلہ ومجادلہ از مجاہدان وافواج سلطان اسلام بوقوع آید پس ہر گ مسلماناں طرفین چگونہ خواہد بود؟ جواب

دریں حال جماعت مولوی امیر الدین علی راہرگز قتل روا نیست بل در نہی قولہ تعالیٰ داخل شدنست کذا فی العالمگیر۔ کتبہ محمد سعد اللہ عفی عنہ فی الواقع عزیمت یمایید در شہادت دغدغہ است۔ کتبہ محمد یوسف صح الجواب حررہ حسین احمد صح الجواب کتبہ بخطہ عبید اللہ۔ اگر از حاکم بالادست سلطنت واجرائے کلمۃ النصاری بظن قوی متصور تیلیقن باشد بحکم آنکہ من ابتلی ببلیتین ماجور ومثاب۔ واللہ اعلم بالصواب وعلیہ التکلان حررہ افقر العباد ابوالحسن عفا عنہ۔ سب علماء کی عبارت اسی قسم کی ہے کہ خوف حاکم سے معمہ کر دیا ہے۔

فوج شاہی ورغلانے میں آگئی شور و غوغا پڑ گیا چاروں طرف ایک تہلکہ پڑ گیا، کہ شہادت میں دغدغا ہے یا راس لڑائی میں دغا ہے۔

ناحق ونارواجان دینی گوارانہیں کیا قول علماء سے چارانہیں شہادت کے لئے جان ومال نوکری چاکری سے ہاتھ اٹھایا تھا خوب موقع ہاتھ آیا تھا۔ اگر اس معرکہ میں شہادت نہیں تو ہمیں لڑائی کی حاجت نہیں ہم عالموں سے اپنی تسکین کر چکے ہیں قصہ کوتاہ فوج شاہی صاف امیر المجاہدین سے پھر گئی جہاد کی عظمت دراشک کی طرح نظروں سے گر گئی۔ علماء نے بھی وہاں سے آکے اپنے اپنے گھر کو آباد کیا حضور عالم بہادر کے دل کو شاد کیا۔

عوام پر علماء کی غلط کاری کا ردعمل

یہاں عجب طرح کا معاملہ علماء کے پیش آیا۔ کسی نے زبان طعن وتشنیع کھولی کسی نے قصیدہ ہجو ہی کہہ کے اکبری دروازہ میں لٹکایا۔ اب یہ حال ہے کہ جدھر نکلیئے ہجو علماء کی نظر آتی ہے، سچ تو یہ ہے کہ عالموں کی پتھر کی چھاتی سنتے ہیں اور خاموش ہیں، دوسرا ہوتا زہر کھا کے مرجاتا۔

جوش جہاد پر کوئی اثر نہیں پڑا

مگر شکر خدا عزوجل کہ تفریق جماعت کی بڑی بڑی تدبیریں ہوئیں کیا کیا تحریریں اور تقریریں ہوئیں اگر ایک بہکانے سے لشکر اسلام سے اٹھ جاتا ہے تو دوسرا آتا ہے، جماعت مجاہدین بدستور ہے، اور ہر دم زبان پہ یہ مذکور ہے کہ اودھ کا چلنا ضروری ہے وہی کثرت جماعت ہے وہی شان وشوکت ہے نامر وجان کے خوف سے چلے جاتے ہیں، کھٹکا اتنا ہے کہ فوج شاہی گھیرے ہے، لشکر اسلام کی طرف توپیں پھیرے ہے لیکن ان جوانمردوں کو کچھ خیال نہیں جینے کی خواہش مرنے کا ملال نہیں ہر روز تیاری ہے اور لب پہ یہ کلمہ جاری ہے کہ جب اس لشکر نے سیلاب وار کوچ کیا فوج شاہی کائی کی طرح ہٹ جائے گی، ایک کنارے ہٹ جائے گی، لشکر اسلام موجیں مارتا لہراتا چلا جائے گا، ڈنکے کی چوٹ پہ بڑھا جائے گا۔ اور اگر فوج شاہی لڑے گی تو آفت میں پڑے گی، غرض جو مشیت ایزدی میں ہوگا وقوع میں آئے گا بے کم وکاست لکھا جائے گا۔ ان اللہ قریب من المحسنین[1]۔

کوچ کا فیصلہ

۲۰ صفر المظفر ۱۲۷۲ھ روز پنجشنبہ معلوم ہوا کہ شب کو مولوی امیر الدین علی صاحب نے فرمایا کہ علی الصباح بعد نماز فجر جانب ردولی کوچ ہے، لشکر اسلام میں تیاری ہونے لگی، تدبیر بار برداری ہونے لگی، یہ خبر جو افسران شاہی کو پہنچی گھبرا گئے امیر المجاہدین کی خدمت میں حاضر ہو کے عذر کیا کہ ابھی کوچ واجب نہیں، خلاف رائے حاکم مناسب نہیں چندے

---

[1] تحقیق کہ اللہ کے نزدیک ہے نیکوں سے۔

اور تامل کیجئے تھوڑا اور تساہل کیجئے۔ مخدوم الانام نے فرمایا یہی حکم سنتے سنتے کئی مہینے گذر گئے اب ہم رکنے کے نہیں۔ تم بھی اگر ایمان رکھتے ہو تو ہمارے ہاتھ میں ہاتھ دو کام نیک ہے۔ ہمارا ساتھ دو۔ ہمارے تمہارے درمیان یہی عہد و پیمان تھا۔ بلکہ قرآن درمیان تھا۔ اگر تم بھی اپنے عہد پر مستقیم نہیں تو جو حکم تمہارے حاکم کا ہو بجا لاؤ تو ہیں سر گردہ بندہ قلیں سر کردہ لشکر اسلام کی خون ریزی پر شوق سے آمادہ ہو۔

امیر المجاہدین کا نعرہ

جب صبح نمودار ہوئی اور فوج محمدی چلنے کو تیار ہوئی امیر المجاہدین نے بعد فراغت نماز فجر کمال تاسف سے ایک نعرہ اللہ اکبر کا کیا۔ آگاہ سب اہل لشکر کو کیا پھر تو یہ حال تھا کہ تمام لشکر کہتا تھا کہ یا اللہ تجھ سے فریاد کرتے ہیں ہم بر سر حق ہیں ہم پر یہ ناحق بیداد کرتے ہیں۔

امیر المجاہدین کی شرائط صلح

آخر لشکر اسلام روانہ ہوا۔ افسران سلطانی نے بہزار منت اور عذر خواہی دو تین دن کی رخصت چاہی۔ خصوصاً تہور خان بہادر نے خدمت سراپا افادیت میں عرض کیا کہ حکام کو بہر حال قتل لشکر اسلام منظور ہے اور آپ کو اودھ جانا ضرور ہے کوئی صورت ایسی فرمائیے کہ سانپ مرے نہ لاٹھی ٹوٹے۔ کسی طرح جان عذاب سے چھوٹے۔ مخدوم الانام نے کہا کہ آپ ہی تصور کیجئے کہ میرا ایسا سوال نہیں میں طالب ملک و مال نہیں اتنا چاہتا ہوں کہ ایک آدمی نواب کا اور ایک اس خادم رسالت مآب کا ہنومان گڑھی میں چلا جائے۔ مسجد قدیم پر فقط ایک مسجد کا خط کھینچ کر اذان کہہ کے نماز پڑھ آئے پھر مجھ کو دعوے نہ رہے گا۔ یہ مجمع اصلا نہ رہے گا۔ اور اگر نواب کو یہ بھی نامنظور ہو تو وہ جب تک کہیں گے ہم یہاں رہیں گے مگر امداد مصارف وغیرہ ہو اس امر میں نہ کوتاہی ہو۔ اور اگر یہ بھی خلاف ہو تو کہنا کہ ہم اپنے لشکر کے ساتھ عیش باغ میں مقام کریں گے دو مہینہ اور خاطر جاری لشکر اس دم کریں گے۔ اس مدت میں ایسی تدبیر ہو کہ مسجد تعمیر ہو جب مسجد بن جائے گی ہم جدھر چاہیں گے، چلے جائیں گے ان کے ملک میں بھی نہ آئیں گے۔

بادشاہ کی بے پروائی

تہور خاں مولوی صاحب کے کلام نیک انجام سن کے بہت خوش ہوئے ابھی جاتا ہوں اور نواب کو سمجھاتا ہوں۔ غرض دو تین دن کا وعدہ کر کے یہاں آئے۔ ہر چند چاہا کہ نواب صاحب متوجہ ہو کے حال سنیں اور کوئی صورت نکالیں انہیں خون ناحق سے مطلب تھا۔ ایسی باتوں کا خیال کب تھا۔ وہ بیچارے دو دو پہر اسی قبیل

وقال میں رہے نواب صاحب مست اپنے حال میں رہے، نوبت ملاقات کی بھی نہ آئی اور اگر اتفاقاً ملاقات ہو گئی نواب صاحب نے توجہ نہ فرمائی۔ آخر وہ بھی خون جگر پی کے خاموش ہوئے ندامت سے روپوش ہوئے۔ اسی ہنگام میں اور افسروں نے وزیر اعظم کو عرضداشت کی کہ امیدوار ہیں کہ حکم قطعی لکھا جائے کہ ہر فدوی بجا لائے۔

حکومت کی چال

پہلے یہ حکمت کی کہ فوج شاہی میں جو اہل اسلام تھے مثل پلٹن علی غول اور پلٹن عسکری وغیرہ انہیں برخاست کر لیا فقط کفار کو قتل کے واسطے چھوڑ دیا کہ مبادا مسلمانوں کو حرارت آ جائے، مگر وہ مسلمان جو ہندوؤں سے بدتر تھے خواہ پیادے تھے خواہ افسر تھے انہیں بدستور رکھا۔ چنانچہ شیخ حسین علی جو بالفعل اس فوج ستم کے کلکٹر تھے اور ظالموں کے رہبر تھے اور رجب خان شمر کا نشان گلابی پلٹن کے زرد رو سالار عمر سعد کی نجس بلوگار اور فرزند علی امام علی دار وغہ توپ خانہ کے خونخوار زمانے کے وہیں رہے اور بارہ لوا انگریزیہ کو یہاں سے مامور کیا۔ خوف خدا دل سے دور کیا۔

وزیر اعظم کا حکم نامہ

جب یہ سب انتظام ہو گیا قتل کا سرانجام ہو گیا۔ تب بجواب عرضی افسران یہاں سے وہ حکم نامہ جاری کیا جس کے مضمون قتل شبخون نے عالم کو مشغول گریہ وزاری کیا کہ مولوی صاحب نے باوجود فہمائش ہمارا کہنا نہ مانا فساد کو مصلحت جانا خون ریزی پر تیغ سپر باندھی۔ اب جس وقت کوچ کا قصد کریں ایک بھی قدم آگے دھریں تو بے تکلف توپ سے اڑا دینا۔ اس خیر خواہی کے عوض انعام اور خلعت ملے گا۔

بے وفائی مردماں ہمراہی امیر المجاہدین

جب اس طرح کا حکم قطعی آیا بے غیرتوں نے شرم کا پردہ اٹھایا افسران فوج شاہی کمال دلیر ہوئے خصوصاً بارلوا انگریزیہ اور شیخ حسین علی گرگ باراں دیدہ اس خون بے گناہ پر نہایت شیر ہوئے لیکن ہیبت لشکر اسلام دیکھ کے فوج کو قلیل پایا تب ان مکاروں کے دل میں خیال آیا کہ تفریق جماعت کی تدبیر کیجئے۔ اپنے ساتھ مولوی محبوب علی اور مولوی محمد شاہ کو لیا ان ظالموں نے سب سے بڑھ کر ظلم کیا ایسا دام مکر بچھایا۔ دانا دانا مجاہدین کو بہکا دیا کہ لوگ اس بھیڑ سے چھٹنے لگے معرکہ سے قدم پلٹنے لگے۔ کسی کو مفلس پایا روپیہ کا لالچ دے کے سرکایا جس کی حیثیت ظاہری درست پائی طمع پر طبیعت سست پائی اس پر زن و فرزند کی گرفتاری، قہر و عتاب سرکاری کا زور ڈالا اور جس پر یہ دونوں زور نہ چلے اس پر یہ توڑ جوڑ ہے کہ جھوٹا نسبت بنا کے قدم رسول کی قسمیں کھا کے کسی سے کہہ دیا

کہ فلاں شخص تمہاری غیبت کرتا تھا، بلکہ لعنت ملامت کرتا تھا، سننے والے کو غصہ آیا بگڑنے لگے یہاں تک کہ نفسانیت بڑھی کہ آپس میں لڑنے لگے۔ آخر اسی غصہ و غضب میں لشکر اسلام سے چل نکلے کسی کو یوں اپنا کیا کہ نوکر رکھ لیا، سب مصارف اس کا اپنے سر پر رکھ لیا چنانچہ حاجی امر تفضلے مجاہد قدیم ہمراہی سید احمد صاحب مرحوم بحیلۂ تیاری سرائی اختر نگر میں داخل ہوئے، ہمراہی ان کے اپنے اپنے گھر میں داخل ہوئے اور میر عباس صاحب تھانہ دار کو توال لشکر دینداران انہیں فسادوں کے جہت ڈیڑھ سو مجاہدوں کے لے کے علیحدہ سرا میں مقیم ہوئے گو نیت میں فساد نہ تھا عزم عدم اشتراک جہاد نہ تھا، لیکن بالفعل باعث قلت لشکر عظیم ہوئے، اسی طرح بہت لوگ اپنے قول و اقرار سے نکل گئے، جب وقت جان دینے کا آیا بدل گئے۔

میدان کربلا کا سماں

ان افسروں نے دوسری یہ تدبیر کی اطراف کے ہندو زمینداروں کو یہ بات تحریر کی کہ عنقریب ہم لشکر اسلام کو لیا چاہتے ہیں بے گناہوں کو قتل کیا چاہتے ہیں تم بھی ہوشیار رہنا توپ کی آواز سے خبردار رہنا آواز کے ساتھ ہی تیر کی طرح آ نا گولیاں لگانا، جب سب طرف سے نشانہ ہو جائیں گے پھر مردم لشکر اسلام ایک دم میں عدم کو روانہ ہو جائیں گے۔

غرض جب دیکھا کہ جماعت میں یہی خلل ہے اور ایک دل میں بھی بل ہے، ۲۵ صفر المظفر سہ شنبہ کی صبح سے بالکل رسد بند کر دی چاروں طرف آواز بلند کر دی کہ کہیں سے رسد پہنچنے نہ پائے، پانی تک لشکر اسلام میں نہ آئے جو کوئی اس امر میں کوشش کرے گا، گنہگار ہو گا، سزا کا سزاوار ہو گا۔ کافروں نے اس مقام کو میدان کربلا بنا دیا، سب وہی سامان دکھا دیا، اہل اسلام کو تمام رات اور دن بے دانہ و آب رکھا اور اس پر یہ طرہ ہوا کہ افسروں کے اشارے سے گنوار ملعون کئی بار بعزم شبخون آئے، غازیوں نے للکار لیا نامرد بڑھنے نہ پائے، لشکر اسلام تک گذر نہ ہوا، بدخواہوں نے جو چاہا تھا، اس کا اثر نہ ہوا، شبدیز قلم جولانی پر ہے، طبیعت بحر مواج کی صورت طغیانی پر ہے، ہر چند بزور روکتا ہوں، نہیں رکتا ہے، بے ساختہ قلم کی زبان سے نکلتا ہے کہ یزید بد انجام نہیں اور حسین علیہ السلام نہیں باقی سب سامان وہی ہے، مظلوم کشی وہی میدان وہی ہے، وہی انسداد آب و دانہ ہے جور و جفا کا کارخانہ، وہی لوگوں کی بے وفائی ہے، وہی دین کی لڑائی ہے وہی فوج کی چڑھائی ہے، وہی سر وہی علم ہے، وہی جور ہے وہی ستم ہے جو حسین علیہ السلام پر گذرا تھا وہی ستم عیاں ہے قدم بقدم یہ قافلہ رواں ہے، فرق اتنا ہے کہ وہ امام تھے یہ غلام امام ہیں

وہ پیشوائے دین تھے، یہ اسلام ہیں سرنام ہیں۔

شدائد و مصائب و شہادت امیر المجاہدین

۲۶ صفر المظفر ۱۲۷۲ھ روز چہار شنبہ کو رایات ظفر آیات لشکر اسلام نے کوچ کیا منزل مقصود کا رستہ لیا۔ لیکن امیر المجاہدین نے ہنگام روانگی یوں لشکر آراستہ کیا کہ مجاہدوں کے چار غول کیے ایک غول کو آگے بڑھنے کی اجازت دی ایک فرسخ کے فرق سے دوسرے کو رخصت دی تیسرے غول کو لے کے آپ تشریف فرما ہوئے۔ طریق خدا میں کام فرما ہوئے۔ چوتھے غول کو ارشاد کیا کہ جب ہم ایک فرسخ کے انداز پر نکل جائیں تم چلنا اس سے پہلے نہ نکلنا۔ وقت نہفتن بان فیض ترجمان سے بے ساختہ یہ مصرعہ جس کو الہام غیبی یا القائے لاریبی کہئے کہ نکلا کہ مصرع۔

سر میدان کفن بر دوش دارم

بارلو کی چوکسی اور حکمت عملی

اب یہاں قدرت خدا دیکھئے اس کی مشیت کا ماجرا سنئے کہ فوج شاہی کو باوجود ہوشیاری نوم غفلت سے ایسی شکست ہوئی کہ مطلق نہ خبر ہوئی جب امیر المجاہدین کا غول کچھ دور پہنچا بارلو خواب غفلت سے چونکا۔ کوچ کی خبر سنتے ہی حوش جاتے رہے۔ حواس باختہ ہوا اور وانہ بے ساختہ ہوا۔ اور شیخ حسین علی سے کہا یہی وقت عیاری اور کارگزاری کا ہے، غافل کیوں ہو ہنگام ہوشیاری کا ہے۔ اگر یہ لشکر محمد پور پہنچا تو سمجھ لو کہ بہت دور پہنچا۔ پھر اگر ممالک محروسہ کی فوج جمع کرو گے تو بھی ان لوگوں کا قلع قمع نہ کر سکو گے۔ برائے خدا بستر سے اتر و گھوڑے پر چڑھو۔ لیکن جلد آگے بڑھو حکمت عملی سے مولوی صاحب کے غول کو مقام زد پر ٹھہراؤ۔ ان کو باتوں میں لگاؤ۔ پھر ہم سمجھ لیں گے، ایک دم کی فرصت آگے بڑھنے کی مہلت نہ دیں گے، جب سردار کو مار لیا کسی کا قدم میدان میں نہ جمے گا، سب کے سب بھاگ نکلیں گے، کوئی نہ تھمے گا۔ تمہارے اوپر مولوی صاحب کو اعتماد ہے۔ یہ کام تمہیں سے بن پڑے گا شیخ بھی اس وقت بڑی جرأت کر کے بادھر صرصر سے زیادہ سرعت کر کے چشم زدن میں گھوڑا دوڑا کر آ پہنچا۔ اور شجاع گنج کے اس پار امیر المجاہدین کے غول کو ٹھہرایا۔ ساتھ ہی بارلو بھی معہ آتش خانہ آیا۔ حسین علی امیر المجاہدین سے باتیں بنانے لگا اور ادھر بارلو کا ہر گولہ انداز موقع سے توپیں جمانے لگے۔

علی حسین کی مکاری و عیاری

ادھر شیخ نے مخدوم الانام کے آگے ہاتھ باندھ قدموں پر ٹوپی رکھ منہ بنا کے عرض کیا کہ اگر آپ ایک بار اور

ہمارا کہنا مانیں اور رودولی میں تشریف فرماکے دو تین دن مقام کریں تو بے جنگ و جدال مسجد بن جائے گی اور بندگان خدا پر آنچ نہ آئے گی۔ یہ بکھیڑا بے کار ہے، بندہ ذمہ دار ہے، خدا کو مانیے مجھ کو جھوٹا نہ جانیے۔ کیسی نرم نرم ملائم ملائم باتیں کہیں کہ مولوی صاحب کے دل میں اتر گئیں ادھر انگریز نے اسی راہ پر ایک اونچا ٹیکرا دیکھ کر توپیں لگا دیں، تلنگوں کی صفیں جما دیں۔

ادھر سلطان المجاہدین تاج العارفین اس دغا باز کی چرب زبانی سے رضامند ہو کے رودولی کو روانہ ہوئے اور ادھر شیخ صاحب اپنا کام تمام کر چکے تھے، موضع پھلہ کو چل دیئے فقط اس واسطے ناپدید ہوئے کہ جائے انکار باقی رہے کہ بندہ جا چکا تھا، تب لوگ شہید ہوئے راہ لگانا اس واسطے تھا کہ نمک حرامی نہ ہو اور چلا جانا اس واسطے تھا کہ بدنامی نہ ہو لیکن اس کی خبر نہ تھی کہ جس نے یہ کلام سنا ہوگا کہ چلتے وقت انگریز سے کہہ گئے کہ میں اپنا کام تمام کر چکا تم کو اختیار ہے۔

قضائے کار لشکر اسلام ہمراہ امام حسب رہنمائی حسین علی اس ٹیکرے کے برابر پہنچا۔ وہیں قابض روح کو حکم خالق اکبر پہنچا۔ کہ مسلمانوں کو گلستان ارم دکھاؤ۔ رضوان اور مالک دونوں ہشیار ہوئے، اپنے عہدے سے خبردار ہوئے۔ موت کی گرم بازاری ہونے لگی، جان کالین دین ٹھہرا سر کی سر دست خریداری ہونے لگی۔ وہ دن روز رستاخیز سے کیا کم تھا، زمین و آسمان درہم برہم تھا، ساکن آسمان الامان کہتے تھے، بے گناہوں کو ذبح ہوتے دیکھ فرشتے "کل یوم ہو فی شان" کہتے تھے۔ وحش و طیر اس میدان کو قیامت کا گمان کرتے تھے "اقرب للناس حسابہم وہم فی غفلۃ معرضون" کا دھیان کرتے تھے، اشجار کو بار غم سے زندگی بار تھی۔ جس دم حسرت سے فرماتے تھے زبان پر یہ مصرعہ لاتے تھے۔

سر میدان کفن بر دوش دارم

عرش سے آواز آتی تھی

بیا مظلوم اکنوں در کنارم

یعنی وقت شہادت ۔:

تاریخ اودھ کا

ایک سیاہ باب

اودھ پر انگریزوں کا قبضہ

انگریز اس ملک میں تاجر اور سوداگر کی حیثیت سے آئے تھے۔ مسلمان فرمانرواؤں نے ان غریب الوطن سوداگروں کو سہولتیں دیں۔ ان کے ساتھ رعایتیں کیں، ان کی غلطیوں پر عفو و کرم سے کام لیا۔ انھیں پھلنے پھولنے اور ترقی کرنے کا موقع دیا۔ انھیں نوازا، ان پر بذل و عطا کی بارش کی۔ لیکن انہوں نے صلہ کیا دیا؟ ——— یہ تاجر تھے، لیکن فرمانروائی کا خواب دیکھنے لگے۔ یہ غریب الوطن تھے، لیکن بادشاہت کی آرزو کرنے لگے، یہ مفلس تھے لیکن کروڑوں آدمیوں کے ملک کو اپنا غلام اور محکوم بنا لینے کا پروگرام بنانے لگے۔ ان کے پاس کچھ نہ تھا۔ لیکن آرزو یہ تھی کہ سب کچھ بن جائیں۔

اس حوصلہ کو دیکھیے اور ہم کو دیکھیے!

لیکن کتنی عجیب بات ہے، مسافروں کی ایک جماعت بادشاہت اور حکومت کا خواب دیکھے اور یہ خواب بغیر کسی دشواری کے شرمندۂ تعبیر بھی ہو جائے۔ ہاں یہ عجیب بات ہے لیکن تاریخ کے آئینہ میں واقعات کا مشاہدہ کیجئے، تو معلوم ہوگا، یہ معجزہ انگریزوں کا نہ تھا بلکہ اس دیس کے باشندوں کا تھا مٹھی بھر انگریز۔ اتنے بڑے ملک کے مالک کیسے بن سکتے تھے۔ اگر اس ملک کے رہنے والے، وطن دوست اور حریت خواہ ہوتے۔

انگریزوں کی ساری کامیابیاں اور کامرانیاں رہین منت ہیں۔ اس نیم براعظم کے باشندوں کی خود غرضی، جاہ طلبی اور حرص و آز کی، ہم آپس میں لڑے۔ انگریز ثالث بالخیر بن کر پہنچ گئے، ہم نے ایک دوسرے کا خون بہایا۔ انگریز اپنے مصالح کے اعتبار سے ایک کے دوست دوسرے

کے دشمن بن گئے۔ ہم نے توسیع مملکت کے لئے جنگیں کیں اور انگریزوں سے مدد مانگی۔ انہوں نے مدد کی اور منہ مانگی قیمت اس امداد و اعانت کی وصول کر لی۔ ہم نے سب کچھ کھو دیا۔ انہوں نے سب کچھ پا لیا۔

یوں تو انگریز متحدہ ہندوستان کے مختلف مقامات پر، جوڑ توڑ، سازش اور فریب کاری کے جال پھیلاتے رہے۔ لیکن اودھ پر ان کی نذر مدت سے لگی ہوئی تھی۔ یہ زرخیز ملک تھا۔ یہاں کی زمین سونا اگلتی تھی۔ اودھ پر قبضہ کر لینے کے معنی یہ تھے، کہ سارا ہندوستان انگریزوں کا ماتحت بن گیا۔

انگریزوں کی پالیسی ہمیشہ سے یہ رہی ہے، کہ وہ اپنا اثر و نفوذ، رفتہ رفتہ اور آہستہ آہستہ بڑھاتے ہیں اور یک بیک چھاپہ مار کر قبضہ کر لیتے ہیں۔ پھر ان سے بڑھ کر خون آشام، درندہ خو، اور بہائم صفت کوئی دوسرا نظر نہیں آتا۔ ان کی وفاداری، دوستی، دلداری سب افسانہ ماضی بن جاتی ہے۔ پھر ان میں اور بھیڑیے میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ بلکہ ان کی سفاکی اور شقاوت دیکھ کر بھیڑیا بھی شرم سے گردن جھکا لیتا ہے اور زبان حال سے پکار اٹھتا ہے۔

ہم تو مرشد تھے تم ولی نکلے۔

انگریزوں نے جب اور جہاں اپنا پرچم لہرایا، قوت اور طاقت کے بل پر نہیں، مکر اور فریب کے بل بوتے پر، دوستی کے پردہ میں دشمنی کر کے۔

بکسر کی لڑائی ۱۷۶۴ء میں ہوئی اور فیصلہ کن ثابت ہوئی۔ اس جنگ میں انگریزوں کے خلاف شاہ عالم، شجاع الدولہ اور میر قاسم شریک تھے، لیکن یہ انگریزوں کے خلاف متحدہ محاذ نہ تھا۔ بلکہ ان میں سے ہر ایک اپنی فکر میں تھا، مقابلہ انگریزوں سے درپیش تھا۔ لیکن انگریزوں کو شکست دینے سے زیادہ فکر اس کی تھی کہ ہم میں سے کون زیادہ سے زیادہ اقتدار و اختیار کا مالک بنتا ہے؟ نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔ باہمی رشک و حسد۔ بے اعتباری و بے اعتمادی اور خود غرضوں کی سازش اور غداری سے۔ انگریزوں نے پورا فائدہ اٹھایا۔ وہ جیت گئے۔ شاہ عالم نے بنگال و بہار و اڑلیسہ کی دیوانی دے کر اپنی جان چھڑائی۔ شجاع الدولہ کو عافیت اس میں نظر آئی کہ پیمان دوستی باندھ لیں۔ انگریزوں نے پیمان دوستی باندھ لیا۔ لیکن چند شرائط کے ساتھ، چند تحفظات کے ساتھ، چند مخصوص مفادات کے ساتھ۔ شجاع الدولہ کے لئے سر تسلیم خم کرنے کے سوا چارہ نہ تھا۔ بڑی گراں قیمت پر انگریزوں کی دوستی خریدنے پر وہ مجبور ہو گئے اور یہ قیمت انگریزوں

نے اس وقت بڑے ٹھاٹھ سے وصول کرلی۔ جب شجاع الدولہ نے روہیل کھنڈ پر قبضہ کیا۔ اور حافظ رحمت خاں کو شکست دی ——— جو تلوار انگریزوں کے مقابلہ میں کند تھی۔ وہ انگریزوں کے ساتھ مل کر حافظ رحمت خاں کے مقابلہ میں دودھاری بن گئی۔

لیکن شجاع الدولہ عمر نوح لکھا کر تو آئے نہیں تھے۔ آخر ایک دن اس دنیا سے رخصت ہوئے ان کے مرتے ہی انگریزوں کی دوستی اور زیادہ گراں قیمت بن گئی۔ ان کے شرائط اور زیادہ سخت ہو گئے۔ ان کا مفاد اور زیادہ وسعت ڈھونڈنے لگا۔ آصف الدولہ قبل اس کے کہ سریر آرائے مملکت ہوں، انگریزوں نے بغیر کسی مروت اور جھجک یہ صاف صاف کہہ دیا کہ جب تک تمام پچھلا قرض مع سود در سود نہ بیباک کر دیا جائے اور اودھ میں متعین انگریزی سپاہ کے مصارف میں پچاس ہزار مزید اضافہ نہ منظور کر لیا جائے اور ریاست بنارس ہماری ماتحتی میں نہ دے دی جائے۔ دوستی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آصف الدولہ مجبور تھے۔ جانتے تھے جس کی دوستی اتنی خوفناک ہے، اس کی دشمنی قیامت سے کیا کم ہوگی؟ شرائط لکھے گئے اور انہوں دستخط کر دیئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزوں کا اثر و اقتدار اور بڑھ گیا۔ ان کے رعب و داب سے بادشاہ تک خائف نظر آنے لگے۔

آصف الدولہ بھی۔ اپنی سخاوت اور دریا دلی کی بہار دکھا کر، عازم خلد ہوئے۔ ان کے بیٹے وزیر علی خاں۔ انگریزوں کو ہیچ سمجھتے تھے چنانچہ انگریزوں کی خلاف مرضی۔ وہ تخت حکومت پر متمکن ہو گئے۔ لیکن جم نہ سکے، تخت خالی کرنا پڑا۔ نظربندی کی زندگی بسر کرنا پڑی۔ بڑے دلاور اور مدبر تھے۔ لیکن نہ تدبیر کام آئی، نہ دلاوری۔ اب سعادت علی خان نمایاں ہوئے۔ انگریزوں نے دوستی کی یہ قیمت مانگی کہ نصف سے زیادہ ملک پر اپنے تسلط کا معاہدہ کر لیا۔ سعادت علی خاں نے یہ سوچا تھا کہ وہ انگریزوں کو بے وقوف بنا رہے ہیں، تخت حکومت پر بیٹھ کر، زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لے کر۔ وہ اتنے طاقتور ہو جائیں گے کہ انگریز چوں بھی نہ کر سکیں گے، چنانچہ کئی سال تک وتکمیل معاہدہ میں ٹال مٹول اور این وآں کرتے رہے۔ ایک روز ریذیڈنٹ بہادر، یعنی کرنل اسکاٹ نے، سعادت علی خاں کے وکیل مولوی سدّن کو بلایا اور کرچ نکال کر سامنے رکھ دی۔ پھر فرمایا۔ اس کا جواب کیا دیتے ہو؟

مولوی سدن نے بڑی برجستگی سے فرمایا۔

"اس کا جواب بکسر کی لڑائی میں ختم ہو گیا۔ اب کس کی مجال جواب ثانی کی ہے؟"[1]

گو سعادت علی خان بھی بڑے جیالے، بہادر، سیاست دان اور مدبر تھے لیکن انگریزوں سے "سعادت مندی" کا برتاؤ کرنے پر مجبور ہو گئے

اس نئے معاہدے کے بعد اودھ پر انگریزوں کا اقتدار اور زیادہ بڑھ گیا اور بڑھتا ہی چلا گیا یہاں تک کہ بادشاہ نصیر الدین حیدر کے زمانہ میں وہ انتہا کو پہنچ گیا۔ نصیر الدین حیدر کے ایک انگریز مصاحب نے اپنے تاثرات و مشاہدات جو شائع کئے ہیں اس میں اس نے انگریز ریزیڈنٹ کی قہرمانیت اور جلالت شان کا طنز کے ساتھ نقشہ ان الفاظ کا کھینچا ہے:۔

"میری تقریب بڑے صاحب سے ہوئی۔ یہ لندن میں ایک معمولی سی حیثیت کے آدمی تھے" لیکن یہاں ان کے اختیارات ایک بادشاہ اور اس کی پچاس لاکھ رعایا پر ایسے لامحدود تھے جو یورپ میں کسی بادشاہ کو حاصل نہیں ہو سکتے[2]

حقیقت یہ ہے کہ اودھ انگریزوں کے لئے سونے کی چڑیا تھا۔ اس سے وہ کسی قیمت پر دست بردار نہیں ہو سکتے تھے۔ اس سے وہ زیادہ سے زیادہ نفع اٹھانے اور استحصال کرنے پر مجبور تھے۔ ان کی قومی بقا اور ملکی فلاح کے لئے یہ ایک ناگزیر اقدام تھا

میک نانگ سیکرٹری گورنر جنرل لکھتا ہے۔

"اودھ ہندوستانی حکومت کی مشین کا ایسا پرزہ ہے جس کی بدولت ہم بہت سی آفات سے محفوظ رہتے ہیں"[3]

اور اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ انگریز اودھ کی بدولت بہت سی آفات سے محفوظ رہے اور ان کا دامن ہیرے جواہر سے بھر گیا۔ اور ان کی گرفت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی رہی یہاں تک کہ واجد علی شاہ سریر آرائے مملکت ہوئے

واجد علی شاہ کی مایوسی شروع میں واجد علی شاہ نے بھی اپنے اجداد کی طرح یہ چاہا کہ امور مملکت میں انگریز مداخلت نہ کریں لیکن جیسے ہی انہوں نے آنکھ دکھائی، واجد

---

[1] قیصر التواریخ صفحہ ۱۵۷

[2] شباب لکھنؤ صفحہ ۶

[3] واجد علی شاہ صفحہ ۵، (تقی الدین ایم۔اے)

علی شاہ نے سعادت مندی اور اطاعت کیشی کا اظہار شروع کر دیا، خود عیش و نشاط کی سرمستیوں میں گھر گئے اور امور مملکت قسمت کے حوالے کر دیئے، صاحب ریزیڈنٹ سے انہوں نے کبھی سرتابی نہ کی، جو ایما ہوا، سر آنکھوں سے اس کی تعمیل کی۔

شاہان اودھ غازی الدین حیدر کے عہد تک "نواب وزیر" کہلاتے تھے اور بعد میں انھیں انگریزوں نے بادشاہ تسلیم کر لیا۔ اس خاندان نے انگریزوں کے ساتھ کیسے وفادارانہ اور نیازمندانہ روابط قائم رکھے اسے ایک انگریز دوست مورخ بھی تسلیم کرتا ہے۔

اودھ کے نواب وزیر بے شک بدحکمران و بدکار تھے، مگر وہ سرکار کمپنی کے بڑے صادق وفادار دوست تھے، وہ اپنی رعیت اور آدمیوں کے ساتھ جھوٹے تھے مگر وہ برٹش گورنمنٹ کے ساتھ سچے تھے، نہ انہوں نے برٹش گورنمنٹ کے ساتھ علانیہ عداوت کی نہ وہ اس کے خلاف سازش و دغابازی میں مخفی شریک ہوئے انہوں نے گورنمنٹ کی خدمات عظیمہ بھی کیں انہوں نے جنگ کے وقت انگریزی سپاہ کے لئے غلہ کی رسد رسانی اور بار برداری کے لئے جانور بہم پہنچائے اور سب سے بڑھ کر یہ کام کیا زر نقد اس حالت میں عنایت کیا کہ بہت تھوڑا قرض گورنمنٹ کا دینا تھا، لکھنؤ کے خزانے میں روپیہ تھا اور کلکتہ کے خزانے میں روپیہ نہ تھا، ایسے وقت میں انگریز حکمرانوں کو نواب وزیر سے روپیہ مانگنے کی ضرورت تھی، لارڈ ہیسٹنگز ایک جنگ عظیم لڑ رہا تھا جس میں بہت روپیہ کی ضرورت تھی۔ دو کروڑ روپیہ ان کو اپنی مہم کے سرانجام کرنے کے لئے درکار تھا، یہ روپیہ عین وقت پر نواب وزیر نے دے دیا جس کے عوض میں برٹش گورنمنٹ نے اسے خطابات اور ملک عطا کئے۔ اس مبارک وقت انگریزوں کی فتح نیپال کی جنگ کا خاتمہ ہوا، اور اس کے سبب سے پہاڑوں کے نیچے ترائی کا ملک ان کے قبضہ میں آیا۔[1]

ملک اودھ کے حدود ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ انتزاع سلطنت کے وقت اودھ کے حدود کیا تھے؟ زبان آخر واجد علی شاہ تک جو حدیں اس ملک (اودھ) کی قائم تھیں، وہ یہ ہیں

---

[1] تاریخ عروج عہد انگلشیہ صفحہ ۵۹ (ذکاء اللہ)

شمال میں ملک نیپال علاقہ بلرام وتلسی پور متعلقہ اودھ سے ایک سو نوا سی کوس براہ بٹول ہے۔
جنوب میں دریائے گنگا سے دھار تک، گنگا پار کانپور وغیرہ انگریزی علاقے تھے۔
مغرب میں بانس بریلی وشاہجہان پور وغیرہ
مشرق میں جونپور کاشی عرف بنارس
یہ قلمرو شاہ اودھ پانچ نظامتوں پر منقسم تھی۔

(۱) خیرآباد
(۲) گونڈہ بہرائچ
(۳) سلطان پور
(۴) بیسواڑہ
(۵) سلون

ہر نظامت میں تین تین چار چار چکلے تھے، حاکم نظامت ناظم و منتظم چکلہ چکلہ دار کہلاتے تھے۔ ان کی ماتحتی میں تحصیلداران محال مامور ہوا کرتے تھے۔

ناظم کو پورے اختیارات حاصل ہوتے تھے۔ وہ بڑے مرتبہ کا آدمی ہوتا تھا، جملہ سامان شان و شوکت مہیا رکھتا تھا۔ اس کی سواری کے سامنے موافق رفعت کے حاکمانہ جلوس جیسے چوب دار عصابردار اور علم بردار چلتے تھے۔ نقیب آگے آگے بولتے جاتے تھے، نقارہ اسپی آگے آگے بجتا توپوں کی سواری سرہوتی، پیادہ و سواریں و پیش چلتے۔

سوائے چکلہ جات متعلقہ نظامت کے جو علاقے زائد تھے ان کی تفصیل یہ ہے:-

(۱) باڑی بسواں
(۲) دریاباد رودولی
(۳) دیوا کرسی
(۴) نواب گنج
(۵) گوشائیں گنج
(۶) موہان
(۷) رسول آباد

(۸) صفی پور
(۹) بانگرمئو لانواں
(۱۰) ساندھی پالی
(۱۱) محمدی
(۱۲) میاں گنج [1]

لارڈ ڈلہوزی کی رپورٹ

لیکن ان وفاداریوں اور اطاعت شعاریوں کے باوجود انگریز اودھ پر قبضہ کر لینے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ قبضہ کرنے کی ایک صورت تو یہ تھی کہ قبضہ کر لیا جاتا اور کسی اصول اور معاہدہ کو پیش نظر نہ رکھا جاتا۔ دوسری صورت یہ تھی کہ سانپ مر جاتا۔ لاٹھی نہ ٹوٹتی بادشاہ برائے نام بادشاہ رہتے اور سارا کاروبار مملکت انگریزوں کے قبضہ اور تصرف میں آجاتا، گورنر جنرل ہند، لارڈ ڈلہوزی کا ضمیر اور اخلاق کسی حد تک زندہ تھا۔ وہ اس آخری رائے کے حامی تھے۔ انہوں نے کمپنی کے کورٹ آف ڈائرکٹرس کو اس سلسلہ میں جو رپورٹ بھیجی، اس میں:۔

برسوں سے جو شہادتیں بد نظمی ملک اودھ کو پیش ہوتی تھیں۔ ان کو بالتفصیل لکھا اور جو رائیں معاملہ میں تھیں لکھیں اور انہوں نے اس سے قطع نظر کہ آسودگی رعایا کے خاطر سلطنت کا لینا گورنمنٹ پر واجب ہے اس میں بیان کیا گیا کہ اگر ہماری سپاہ اودھ میں نہ ہوتی تو رعایا نے اپنا ہاتھ پتھر کے تلے سے کبھی کا نکال لیا ہوتا اور ان پر ہرگز ظلم وستم نہ ہونے پاتا اس لئے چپ چاپ رہنا ہمارے انصاف اور عدالت کا مقتضی نہیں ہے۔ گو بادشاہ نے ان عہدوں میں جو رعایا کی آسائش کے لئے کئے گئے تھے بے وفائی کی مگر برٹش گورنمنٹ سے جو اتحاد اور اخلاص کے پیمان تھے ان میں سرمو عہد شکنی نہیں کی بلکہ وہ ہمیشہ برٹش گورنمنٹ کی ضرورتوں کے وقت میں اپنے مقدور کے موافق مددگار اور معاون رہے اس لئے احسان مندی اور انصاف کا اقتضا یہ ہے کہ ہم رعایا کی آسودگی اور بہتری کے لئے بادشاہ کی علو مرتبگی اور عالی منصبی میں جس قدر ممکن ہو تنزل کم کریں۔ ملک کی ترقی اور رعایا کی بہبودی بغیر

---

[1] تاریخ اودھ جلد ۵ صفحہ ۱۹۲

اس کے بھی ہوسکتی ہے کہ ملک اودھ سرکار کمپنی کے ملک کا ایک صوبہ بنایا جائے اور تخت شاہی بالکل الٹ دیا جائے۔اس لئے میری رائے نہیں ہے کہ ملک اودھ کمپنی کے ملک کا ایک صوبہ بنایا جائے۔بلکہ جس قدر ملک بادشاہ کے قبضہ میں ہے۔ وہ اس کے بدستور بادشاہ بنے رہیں۔لیکن دیوانی اور فوجداری اور سپاہ کا انتقام کمپنی کے سپرد کردیں اور سالانہ روپیہ ان کو اس قدر ملا کرے جس سے وہ اپنی شان شاہی کو بنائے رکھیں،،

مشورے ہو رہے ہیں آپس میں

لیکن لارڈ ڈلہوزی کی رائے صاحبان انگریز کے لئے قابل قبول نہ تھی،چنانچہ اس رائے کے ساتھ سر ہنری کاک ممبر کونسل نے اتفاق کیا۔سر جان گرنیٹ نے خلاف کیا اور کہا کہ اودھ سرکاری عملداری میں شامل کرنا چاہیئے،جنرل لو نے جو پہلے لکھنؤ کے ریزیڈنٹ رہ چکے تھے یہ کہا ملک اودھ میں بدانتظامی اس مدت دراز سے پھیل رہی ہے کہ جب تک وہ سرکار کمپنی کے ملک کا ایک صوبہ نہیں بنے گا،وہاں کا عمدہ انتظام ہی نہیں ہوگا غرض یہ لارڈ ڈلہوزی کی اس رائے کے مخالف ہو گئے کہ سلطنت کا سرت نکال لینا چاہیئے،مگر اس کی کھال میں اتنا دم باقی رکھنا چاہیئے کہ وہ مردہ بصورت زندہ نظر آتی رہے اور بالکل نظروں سے غائب ہو کر دفن نہ کی جائے،آخر کو یہ سب رائیں اور کرنیل سلیمن اور جنرل اوٹرم کی رپورٹیں کورٹ ڈائرکٹرز کی خدمت میں بھیجی گئیں۔ دو مہینہ تک وہاں بہت غور و خوض کیا گیا۔لارڈ ڈلہوزی کی رائے کے خلاف سب ڈائرکٹروں کی بالاتفاق یہ رائے ہوئی کہ اودھ کو ممالک سرکار کمپنی میں داخل کر لینا چاہیئے اور تخت شاہی کو قائم نہ رکھنا چاہیئے[1]

لارڈ ڈلہوزی کی رائے کو کورٹ آف ڈائرکٹرس نے اس لئے نہیں مانا کہ اودھ کی بدنظمی کا بغیر اس کے سدباب نہیں ہوسکتا تھا۔لیکن یہ بدنظمی جس کا اتنا چرچا کیا گیا ہے،صرف ذہن ودماغ اور صفحۂ قرطاس پر تھی،ورنہ خارج میں اس کا کہیں وجود نہ تھا۔انگریزوں کے دور حکومت میں اودھ کو جن مصائب کا سامنا کرنا پڑا انہیں دیکھ کر تو بلا تامل کہا جاسکتا ہے،کہ عہد واجد علی شاہ

---

[1] تاریخ اودھ جلد پنجم (نجم الغنی) صفحہ ۲۵۱

میں دودھ اور شہد کی نہریں بہتی تھیں۔

انگریزوں کی فریب کاری

انگریزوں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اودھ کا الحاق کر لیا جائے۔ لیکن آخر وقت تک اپنے اس ارادہ کو چھپاتے رہے، اگر بادشاہ کو انگریزوں کی فوجی نقل و حرکت سے کسی طرح کا شبہ پیدا ہوا تو بڑی ڈھٹائی سے اس کی تردید کر دی:۔

"سپاہ کو سرحد پر جانے کا حکم ہوا جب فوج انگریزی کے کان پور میں جمع ہونے کی خبریں اڑیں اور اس بات کے سب میں چرچے ہونے لگے تو بادشاہ نے ریذیڈنٹ کے اسسٹنٹ سے اس باب خاص میں دریافت کیا۔ اس نے جواب دیا کہ راجہ نیپال اپنے لاکھ آدمیوں کی جمعیت کے ساتھ اپنے مقام پرستش کو جاتا ہے اس کے اہتمام کو فوج سرکار جمع ہوئی ہے، آپ رعایا کی تشفی کے لئے اشتہار جاری کر دیں تاکہ فوج کا طنطنہ دل سے جاتا رہے، اور جو کوئی اس کے خلاف سمجھے گا، مجرم سرکار ہوگا، اور میں بھی صاحب مجسٹریٹ کان پور کو شہر میں منادی کر دینے کے لئے لکھتا ہوں[1]

صاحب بہادر تشریف لاتے ہیں

آخر، جنرل اوٹرم صاحب، ریذیڈنٹ اودھ، شاہانہ جاہ و جلال اور تزک و احتشام کے ساتھ گورنر جنرل لارڈ ڈلہوزی سے صلاح و مشورہ کر کے ۳۰ جنوری ۱۸۵۶ء مطابق ۲ جمادی الاول ۱۲۷۲ھ کو تشریف لائے:۔

بادشاہ کو اپنے انگریز دوستوں سے کوئی اندیشہ نہ تھا، علی نقی خاں بعد زوال شمسی نہایت اطمینان کے ساتھ استقبال کو گئے اس وقت تک کسی طرح کا وسوسہ و کھٹکا بلکہ گمان بھی دل میں نہ تھا اور جو کچھ افواہ خلائق یا دوستان دور و دراز سے سنتے تھے اسے زٹل افسانہ بازاری جانتے تھے۔ بمبئی کے کئی تاجروں اور عملۂ انگریزی نے متواتر بذریعہ خطوط اور بعض نے بالمشافہ خبر پہنچائی اور بعض انگریزوں نے پارلیمنٹ لندن کی تجویز کی بھی اطلاع دی اور اس کی صورت اصلاح امکانی بھی بتائی لیکن ارکان سلطنت ان سب باتوں کو لغو و مہمل سمجھے اور اگر کسی نے مقربان شاہ سے کہا مثل خواب پریشان

---

[1] تاریخ اودھ جلد پنجم (نجم الغنی) صفحہ ۲۵۲۔

سمجھ کر اڑا دیا۔ غرض ۲ بجے جنرل اوٹرم صاحب داخل ریزیڈنسی ہوئے، توپیں سلامی کی چلیں۔ اس وقت جنرل صاحب نے علی نقی سے کہا کل دس بجے ہمارے پاس آؤ گورنر جنرل کے احکام تم کو سنائیں گے اور سرکار کمپنی کی فوج ممالک محروسہ کے انتظام کے لئے آتی ہے آپ کسی امین کو اہتمام رسد کے لئے روانہ کریں۔ غرض اسی وقت راجہ جے پال سنگھ اہتمام رسد کو روانہ ہوئے۔ پنج شنبہ کو علی نقی خاں وزیر خواب غفلت سے بیدار ہوئے۔ معلوم نہیں تمام رات کس خواب میں کٹی۔ اب دل پر افکار کا ہجوم ہوا۔

علی نقی وزیر اعظم کو اوٹرم کی دھمکی۔ وقت خاص پر صاحب ریزیڈنٹ کے پاس پہنچے انہوں نے کہا کہ نواب گورنر جنرل نے حسب الحکم کورٹ ڈائرکٹرز ۱۲ لاکھ روپیہ سالانہ مصارف ذات بادشاہ کے لئے اور تین لاکھ روپیہ عملہ و شاگرد پیشہ کے لئے مجموعہ ۱۵ لاکھ روپیہ مقرر فرمایا ہے اور نواب شجاع الدولہ کی اولاد کی تنخواہ اپنے ذمہ لی ہے اور ملک محروسہ کا انتظام موافق دستور سرکار کمپنی کے ہوگا۔ عہد نامہ بھی انہیں احکام کا بادشاہ کو پہنچے گا اور یہ جدید عہد نامہ گورنر جنرل نے تجویز کیا ہے۔ چاہیئے کہ اس پر بادشاہ اپنی مہر کمال رضامندی سے کردیں اور اس بارے میں تمہاری بڑی خیر خواہی سرکار کمپنی میں ہوگی کیونکہ تم کو بادشاہ کے مزاج میں پورا دخل ہے اس کے صلہ میں لاکھ روپیہ سالانہ کی جاگیر یا بدستور قبضہ مجھ پر پشت نسلاً بعد نسل تمہارے واسطے مقرر ہوگا ورنہ صورت خلاف مجرم سرکار قرار پاؤ گے۔

علی نقی اور بادشاہ کی ملاقات۔ بعد زوال شمسی جس سے اقبال سلطنت پر زوال آیا وزیر نے مراجعت کی او نہایت مضطرب الحال بادشاہ کے پاس آئے اور حقیقت حال مشروحاً بادشاہ سے عرض کی اور بہت سا نشیب و فراز سمجھایا مقربان خاص نے بھی بالاتفاق وزیر کے خوف سے بقائے دولت کی یہی صلاح عرض کی بلکہ مہاراج بال کرشن نے اصل مطلب کا راضی نامہ لکھ کر نظر انوار میں گزرا[1]

موت کے اس محضر پر دستخط کرو

آخر، اوٹرم صاحب، لارڈ ڈلہوزی کا پیام محبت لے کر خود واجد علی شاہ کے پاس پہنچے، اوٹرم اور واجد علی شاہ

---

[1] تاریخ اودھ جلد ۵ صفحہ ۲۵۴

کی ملاقات اور بادشاہ کی بیباکانہ گفتگو کا نقشہ ذکاراللہ نے بڑا اچھا کھینچا ہے:۔

"اوٹرم کو یہ بڑا نازک اور دشوار کام سپرد ہوا کہ بادشاہ کو سمجھا کر اس عہدنامہ پر راضی کرے کہ وہ ملک اپنی خوشی سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے حوالہ کرے اور اگر بادشاہ اس پر راضی نہ ہوگا تو اشتہار دیا جائے کہ کل اودھ سرکار کمپنی کا ملک ہوگیا۔ انگریزی سپاہ لکھنؤ میں اس قدر بھیجی گئی کہ وہ ہر مقابلہ کے دبا لینے کے لئے کافی تھی۔

بادشاہ اور اوٹرم کی گفتگو۔ اوٹرم صاحب نے وزیر اودھ سے صاف صاف کہا کہ گورنمنٹ کے آخری احکام ناطق آگئے ہیں۔ چار روز اس باب میں گفتگو ہوتی رہی مشرقی وضع میں یہ داخل ہے کہ دربار شاہی یہ کوشش کرتا ہے کہ مہلت ملے اوٹرم صاحب سے بادشاہ کی ماں اس باب میں گفتگو کرتی تھی۔ اس ماں میں بیٹے سے بھی زیادہ ہمت مردانہ بڑے استقلال کے ساتھ تھی۔ وہ اوٹرم صاحب سے یہ عرض کرتی تھی۔ کہ اپنی گورنمنٹ کو وہ سمجھائیں کہ بادشاہ کو جب تک اور مہلت ملے کہ نیا گورنر جنرل آجائے اور جن اصلاحوں کو وہ چاہتا ہے ان کا حکم واجد علی کو دے۔ مگر اوٹرم صاحب اس کی ساری باتوں کے جواب میں ایک بات کہتے تھے کہ اب آزمائش کا اور عمل کا وقت گزر گیا۔ اب میں سوا اس کے اور کچھ نہیں کر سکتا کہ ان کا پیام بادشاہ کو دوں۔ واجد علی شاہ نے منظور کیا کہ ریزیڈنٹ اس سے ملاقات کرے

اوٹرم اور واجد علی شاہ کی ملاقات۔ ۴ فروری کو اوٹرم صاحب مع اپنے اسسٹنٹوں کے گئے تو محل میں یہ عجیب تماشا دیکھا کہ محل کے دروازہ پر سے توپیں اتار لی گئیں متعین محل کے پہرہ کے سپاہیوں کے پاس ہتھیار نہ تھے اس نے ریزیڈنٹ کو ہاتھ سے سلام کیا۔ مقام معینہ پر بادشاہ نے اور اس کے بھائی اور بعض معتمد وزرا نے ریزیڈنٹ کا استقبال کیا۔ مراسم ملاقات کے ادا کرنے کے بعد کام شروع ہوا۔ اوٹرم صاحب نے گورنر جنرل کا خط بادشاہ کو دیا جس میں نہایت اخلاق کریمانہ کے ساتھ حکم جو بادشاہ کی نسبت دیا گیا تھا۔ لکھا ہوا تھا۔ اور اس سے عرض کیا گیا تھا کہ وہ اس حکم کے مقابلہ کرنے میں اصرار نہ کرے پھر عہدنامہ کا مسودہ بادشاہ کو دیا گیا۔

واجد علی شاہ کا جواب۔ بادشاہ نے نہایت غم زدہ ہو کر غصہ سے کہا کہ عہدنامہ

صرف برابر والوں میں ہوتا ہے (یعنی زبردست کا زیردست سے عہد و پیمان نہیں ہوتا) اس کی ضرورت نہیں ہے کہ میں اس پر دستخط کروں، برٹش کو اختیار ہے کہ میرے ساتھ اور میرے ملک کے ساتھ جو چاہیں سو کریں میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ مجھے انگلینڈ جانے کی اجازت ملے کہ اس کے تخت کے آگے اپنے دکھ درد کا درمان چاہوں۔ بادشاہ کو کسی بات نے اپنے ارادہ سے باز نہ رکھا اور عہدنامہ پر اس نے دستخط نہیں کیے۔ اس نے اپنی دستار اتار کر ریزیڈنٹ کے ہاتھ میں رکھ دی اور غمگین ہو کر کہا کہ خطاب، عزت، وجاہ و منصب اور سب چیزیں جاتی رہیں۔ برٹش گورنمنٹ نے ہی اس کے دادا کو بادشاہ بنایا تھا وہی مجھے ناچیز کر سکتی ہے اور تاریکی میں ڈال سکتی ہے۔

اب کرنیل اوٹرم کو سوا اس کے کچھ اور چارہ نہ تھا کہ کلکتہ سے جو اشتہار آیا تھا، اس کا اعلان کرے کہ صوبہ اودھ ہمیشہ کے لئے سرکار کمپنی کی سلطنت کا ایک حصہ ہو گیا۔[1]

بادشاہ اور مادر شاہ کے دلائل

اس موقع پر بادشاہ نے اوٹرم سے جو گفتگو کی اس میں عجز بھی ہے اور طنز بھی، بادشاہ نے جو باتیں کیں ان میں دلائل بھی ہیں اور اپیل بھی، بادشاہ نے کہا:

"اگر مدارالمہام اور اہالیان سلطنت کی غفلت سے امور مرجوعہ سلطنت میں خامی پائی جاتی ہے تو اس صورت میں اس کی اصلاح ان کے تغیر و تبدل سے ممکن ہے نہ یہ کہ اس حیلے سے ملک پر قبضہ کر کے وارث سلطنت کو معطل و بے دخل کر دیا جائے نواب گورنر جنرل کے ارشاد سے تعجب ہے کہ ہوا خواہ ہمارے آبائے کرام کا جو قدیم سے ملحوظ خاطر ہوتا چلا آیا ہے وہ سب میرے زمانہ پر منحصر رکھا تھا ہمارے آبائے کرام نے کبھی عہد شکنی نہیں کی اس واسطے کہ ہر عہد سلطنت میں جس طرح عہدنامہ مذکور خاطر اہالیان سرکار کمپنی ہوا ہر امر ناسخ کو جب چاہا منسوخ کر کے دوسرا داخل کیا، ہمارے آبائے کرام نے اسے بکمال رضامندی

---

[1] تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) صفحہ ۱۷۸

بلا اکراہ قبول کیا اور کبھی سبقت اپنی طرف سے کسی عہد نامے کے تبدل و تغیر کی نہیں کی بہر حال سرکار کمپنی کے مرضی کے تابع رہے اور مشکل وقتوں میں فوج اور روپے اور اسباب اور سامان ضروری سے اعانت میں مضائقہ نہیں کیا اور اپنے آپ لاکھوں روپیہ کا نقصان گوارا کیا اور کبھی اس کی شکایت نہیں کی اور سلطنت کے بعض رعایا اور اقربا، کی حمایت سرکار کمپنی نے اپنی عدالت کے خلاف کی اس کے لئے اپنے حلم و بردباری سے سرکار کمپنی کی مرضی کو مقدم سمجھا"

اس موقع پر واجد علی شاہ کی والدہ بھی موجود تھیں، انہوں نے اوٹرم سے اپیل کرتے ہوئے کہا:-

"خود تاج بخشی کی وزارت سے مرتبہ بادشاہی دیا، اب بے قصور ایسے امر کا صدور نشان و شوکت شاہنشاہی کے خلاف ہے کہ فقط حیلہ غفلت ٹھہرا کہ ایسی اہانت و توہین سے چھینا جاتا ہے۔ ہندوستان میں جن ریاستوں میں نوبت، فتنہ و فساد و جنگ و جدل کی پہنچی پھر ان کا ملک ان کے وارثوں کو دے دیا اور ہمارے ساتھ باوجود اس اطاعت و فرمانبرداری کے جو ہمیشہ سے ہوئی بے التفاتی ظاہر ہو اگر سلطنت کے کاموں میں بادشاہ کی طرف سے غفلت شعاری ہے تو سرکار کمپنی نے پہلے جلوس کے وقت لیاقت و قابلیت کا امتحان لے لیا ہوتا اور اگر مدارالمہام سلطنت کی غفلت ہے تو مواخذہ اور سیاست ان پر ہونا چاہیئے کوئی بھی انتظام اور اصلاح حال کے بہانے سے کسی کا گھر چھینتا ہے یہ بات انصاف سے دور ہے جس کی طرف آپ کی مظنہ تخریب ہو ہم اس کو آپ کے حوالہ کر دیں ریزیڈنٹ نے جواب دیا کہ ہم کو تمام باتوں کا مواخذہ مقیب سے چاہیئے نہ کہ نائب سے، متبادل تجویز بھی ریزیڈنٹ نے نہ مانی، پھر والدہ واجد علی شاہ نے اوٹرم سے کہا، اگر آپ واجد علی شاہ سے ناراض ہیں تو میرے دوسرے بیٹے جنرل سکندر حشمت کو وارث سلطنت کیجئے یا مرزا ولی عہد کو بادشاہ بنایئے اور اجرائے امور سلطنت عملداری سرکار کمپنی کے موافق اہالیان سرکار کمپنی کی طرف سے عمل میں آئے والدہ بادشاہ کی اس تقریر کے بعد جہاں آرا بیگم عرف کھیتو بیگم زوجہ محمد علی شاہ نے کہ واجد علی شاہ کی دادی ہیں کہا کہ سب سے بالاتر یہ ہے کہ امجد علی شاہ

کے بیٹے مصطفٰے علی خاں کو تخت پر بٹھائیے اگرچہ وہ ہماری نیر کفو عورت سے ہیں ریزیڈنٹ نے جواب دیا کہ ان کی تخت نشینی سے تم کو کیا فائدہ۔ کھیتہ بیگم نے کہا کہ اس نظریئے سے کہ نام سلطنت باقی رہے اور بیر بار نامی ہمارے نام سے جاتی رہے۔ یہ سن کر جنرل اوٹرم صاحب رخصت ہوئے۔ اس خبر وحشت اثر کے مشہور ہوتے ہی بادشاہی محلات اور تمام شہر میں، گھر گھر میں عجیب ماتم برپا ہوا۔ اور ہر ایک در و دیوار سے وحشت و ویرانی برس رہی تھی تین دن تک کسی نے کچھ نہ کھایا۔

اب بادشاہ کو اپنے وزیر کی دیانت داری و وفاشعاری اور لیاقت و خوش کرداری کا حال معلوم ہوا مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ وقت تدبیر کا ہاتھ سے جا چکا تھا اس کی کردار ناسزاوار کا علاج اور چارہ کچھ نہ ہو سکتا تھا کف افسوس مل کر رہ گئے۔[۱]

اشتہار واجب الاظہار

واجد علی شاہ نے جب نئے معاہدہ پر دستخط کرنے سے انکار کیا۔ تو اوٹرم صاحب نے ہر تھانہ پر گورنمنٹ کا یہ اشتہار (خلاصتہً) چسپاں کروایا:۔

حسب الحکم خاص و استرضائے آنریبل کورٹ آف ڈائرکٹرز کے یہ بات ٹھہری کہ عہد نامہ سنہ ۱۸۰۱ء جس سے ہر ایک والی اودھ نے انحراف و تجاوز کیا ہے آج کی تاریخ سے بہ تمامہ ناجائز و ساقط ہے چنانچہ واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کو ایک نئے عہد نامے کے مقرر کرنے کے لئے نصیحت کی گئی جس کی وجہ سے ہمیشہ کے لئے ملک اودھ کا انتظام بلا اشتراک غیر سرکار انگریز بہادر کے سپرد کیا جائے مگر شاہ موصوف نے ایسے دوستانہ عہد نامے کے انعقاد سے انکار کیا۔ شاہ اودھ واجد علی شاہ اور جملہ والیان سابق ملک اودھ کی نسبت عہد نامہ سنہ ۱۸۰۱ء کی تعمیل میں منکر یا سہل انگار یا غافل ہوئے جس کی وجہ سے اصرار ایسے بند و بست کا ملک اودھ میں جو رعایا کی رفاہ اور خیریت کا موجب لازم کیا گیا اور عہد نامہ سنہ ۱۸۰۱ء کو جس سے یوں ہی انحراف ہوا ناجائز و ساقط گردانا گیا اور چونکہ شاہ موصوف عہد نامہ جدید کے

۱؎ تاریخ اودھ جلد پنجم (نجم الغنی) صفحہ ۲۵۶

انعقاد سے جو عہد نامہ سابق کی جگہ منظور تھا انکار اور عہد نامہ سابق کی شرائط جبکہ بحال نہیں بسبب عدم مداخلت اہالیان کمپنی انگریز بہادر کے ملک اودھ میں نافع نہ ہوئیں اور بدوں ایسی مداخلت کے شائستہ بندوبست کا جاری ہونا اس ملک میں ممکن نہیں ان وجوہات سے تمام عالم کو ظاہر ہے کہ سرکار کمپنی انگریز بہادر کو دو صورتوں کے سوا اور کوئی چارہ نہیں یا تو ملک اودھ کی رعایا کو ترک کرے اور ان کے ہاتھ پاؤں باندھ کر معرض ظلم و تعدی میں ڈال دے یا سرکار اپنے اقتدار عظیم کو ان لوگوں کے حق میں انفاذ کرے جن کی رفاہیت کے واسطے پچاس برس کے عرصے سے دست اندازی کا وعدہ کیا تھا اور اودھ کے بندوبست کا تمام و کمال نظم و نسق ہمیشہ کے واسطے اپنے اختیار میں کر لے ان دونوں صورتوں میں سے سرکار کمپنی انگریز بہادر نے بلا تامل دوسری صورت کو اختیار کیا ہے۔ اس لئے اشتہار دیا جاتا ہے کہ آج کے دن سے ملک اودھ کا نظم و نسق بلا شرکت غیر ہمیشہ کے لئے کمپنی انگریز بہادر کے قبضۂ اختیار میں آگیا ہے۔ سب عامل و ناظم و چکلہ دار و جملہ نوکران دربار اور سب اہل کاران مالی و ملکی دیوانی و فوجداری و سپاہیان دربار اور جملہ ساکنان اودھ کو لازم ہے کہ آئندہ کمپنی انگریز بہادر کے اہل کاروں کی اطاعت اور فرمانبرداری کیا کرتے رہیں۔ اگر کوئی اہلکار دربار یا جاگیردار یا زمیندار یا کوئی دوسرا شخص ایسی اطاعت و فرمانبرداری سے اغماض کرے گا یا کوئی مالگذاری دینے میں عذر کرے گا یا اور کسی سرکار کمپنی انگریز بہادر کی حکومت میں تعرض و مزاحمت پہنچائے گا تو شخص مذکور مفسد گنا جائے گا اور قید بھی کیا جائے گا اور جاگیر یا اراضی اس کی ضبط کی جائے گی اور وہ لوگ جو فوراً بلا عذر سرکار کمپنی انگریز بہادر کی تابعداری قبول کریں گے عامل ہوں یا اہالیان دربار یا جاگیردار یا زمیندار یا سکنائے اودھ سب سے وعدہ کیا جاتا ہے کہ وہ حفاظت و لحاظ و التفات اہالیان کمپنی انگریز بہادر کا پائیں گے یا پاتے رہیں گے تعداد مالگذاری کا تعین انصاف اور بندوبست واجبی کے ساتھ عمل میں آئیگا اور ملک اودھ کی آبادی و آراستگی کے باب میں تبدریج کوشش برابر ہوتی رہے گی ہر کسی کو بلا طرفداری کسی کے عدل گستری ہوتی رہے گی۔ جان و مال کی حفاظت کی جائے گی اور ہر ایک شخص اپنے حقوق واجبی پر بے اندیشہ اور بغیر کسی کی دست

اندازی کے قابض و متصرف رہے گا۔ فقط [۱]

قصور ڈھونڈ کے پیدا کیے جفا کے لیے

اس اشتہار کا سب سے دلچسپ پہلو یہ ہے کہ واجد علی شاہ کے آباؤ اجداد کی کوتاہیاں بھی واجد علی شاہ کے کھاتے میں رکھی گئیں دوسرا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ سارا انتظام گو عملاً انگریزوں کے ہاتھ میں تھا۔ لیکن اس کی ذمہ داری بھی واجد علی شاہ کی عیش پرستی پر رکھی گئی۔

خار کو گل اور گل کو خار جو چاہے کرے
تو نے جو چاہا کیا اے یار جو چاہے کرے

اصل میں طاقت کی منطق خود، اپنی دلیل ہوتی ہے۔ انگریز چونکہ طاقت ور تھے۔ لہٰذا انہوں نے اپنی ہر غلطی اور غلط کاری، بدعہدی اور عہد شکنی کو جائز قرار دے لیا، کون تھا جو انہیں چیلنج کرتا؟

---

[۱] تاریخ اودھ (نجم الغنی) صفحہ ۲۷۰

کیئے جا سکتے ہیں۔

اس داستان کے جستہ جستہ ٹکڑے ذیل میں درج کیئے جاتے ہیں:۔

انھیں افسانۂ غم ڈرتے ڈرتے
سنایا کچھ کہیں سے کچھ کہیں سے

---

(۱) بغاوت کا اندیشہ واجد علی شاہ کے کردار اور سیرت کو آج کتنے ہی بھیانک اور گھناؤنے روپ میں پیش کیا جائے۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اپنی رعایا اور فوج دونوں میں حد درجہ ہر دلعزیز تھے۔ جو ہر دلعزیزی واجد علی شاہ کو اپنے ملک میں حاصل تھی وہ بہادر شاہ ظفر کو بھی نہ حاصل ہو سکی۔ اگرچہ بہادر شاہ اور ان کی رعایا کا مذہب ایک تھا لیکن واجد علی شاہ اور ان کی رعایا کے مذہب میں اختلاف تھا، وہ شیعہ تھے یہ سنی تھی اور دونوں اپنے مذہب پر سختی سے قائم تھے پھر بھی دونوں کے درمیان طبیعت اور عقیدت کا ایسا رابطہ استوار تھا کہ گو ضبطیٔ اودھ کے کاغذات مرتب ہو چکے تھے - واجد علی شاہ کی معزولی کا فیصلہ ہو رہا تھا۔ لیکن بغاوت کے اندیشے سے انگریزوں کے دل دھڑک رہے تھے۔ ملاحظہ ہو:۔

"افواہ ہے کہ جو فوج کانپور میں جمع ہوئی ہے، وہ تیسویں تاریخ کو دریا پار اترے گی پانچویں رسالے کو حکم ہے کہ بالفعل کانپور میں مقیم رہے، تاکہ عندالضرورت اودھ کے لئے کارآمد ہو، اودھ میں ہر طرح امن و امان ہے، سب کو حیرت ہے کہ سرکار انگریزی کو فوج جمع کرنے میں کیا حاجت ہے وہ گمان کرتے ہیں کہ شاید نیپال پر یورش ہو گی۔ آخر ماہ رواں جنرل اوٹرام صاحب کلکتہ سے واپس آویں گے، اور اس وقت فوج دریا پار اترے گی جس وقت صاحب خبر لکھتے ہیں کہ اب ماحصل سالانہ اودھ کا ڈیڑھ کروڑ روپیہ سالانہ سے زیادہ نہ ہوگا۔ مگر جس وقت سرکار انگریزی کی پولیس مقرر ہوگئی اور چکلہ داروں کے ظلم سے لوگوں نے نجات پائی تو اس سے بہت زیادہ ہو گی یہاں کے لوگ سرکار کی آمد کی خبر سن کر بہت خوش ہوئے ہیں اور جانتے ہیں کہ اب ظلم ناحق سے رہائی پا دیں گے یہ بھی افواہ ہے، شاہ اودھ بھی اس بات پر راضی ہیں اور تمنائے ملاقات کی نواب گورنر جنرل بہادر سے رکھتے ہیں، اخبار "ایسٹرن اسٹار" میں بذریعہ فرینڈ آف انڈیا کے زیب رقم ہے کہ چند روز میں یہ سلطنت داخل ممالک محروسہ سرکار کمپنی کے ہوا چاہتی ہے

باب (۱۰)

زوال اودھ کی کہانی

کچھ کہیں سے کچھ کہیں سے

اس کتاب میں انگریزوں کی چیرہ دستیوں اور سفاکیوں، باشندگان اودھ کی مجبوریوں اور حسرت نصیبیوں، شرفائے شہر کی ذلتوں، اور رسوائیوں، خاندان شاہی کی بے آبروئیوں اور حرماں بختیوں، واجد علی شاہ کی، نامرادیوں اور تیرہ روزگاریوں کی داستان آپ کو مختلف ابواب میں اپنے اپنے موقع سے نظر آئے گی، لیکن اس باب میں زوال اودھ کی کہانی ایک خاص ترتیب اور تاریخی تدریج کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

یہ کہانی "کوہ نور" (جنوری تا جون ۱۸۵۶ء) کے فائل سے مرتب کی گئی ہے، یہ اخبار لاہور سے نکلتا تھا، اس کے ایڈیٹر لالہ ہرسکھ سہائے تھے۔ اس کہانی کے مستند ہونے میں شبہ نہیں، اس میں بہت سی ایسی باتیں ملیں گی جو وقت کے دوسری تاریخوں میں نظر نہیں آتیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مورخ صرف خاص خاص واقعات سے بحث کرتا ہے، جن باتوں کو اپنے موضوع سے متعلق پاتا ہے انہیں لے لیتا ہے، باقی کو نظر انداز کر دیتا ہے، لیکن اخبار نویس کسی واقعہ کی جزئیات سے بھی پوری دلچسپی لیتا ہے، مورخ جن باتوں کی چنداں اہمیت نہیں دیتا اخبار نویس نہ صرف انہیں اہمیت دیتا ہے۔ بلکہ انہیں اچھالتا بھی ہے، کوہ نور کے پرچوں میں داستان اودھ کے جو پہلو نظر آتے ہیں وہ عہد جدید کے مورخ کے لئے دلچسپ بھی ہیں اور اہم بھی یہی وجہ ہے کہ تاریخ وار ترتیب کے ساتھ داستان مرتب کی گئی ہے، اس داستان میں زوال اودھ کا پس منظر بھی ملیگا انگریزوں کی پیماں شکنی اور نقض عہد کی تفصیل بھی ملے گی اودھ پر برطانوی استیلا کے اسباب وعوامل اور موثرات ومحرکات بھی نظر آئیں گے اور سب سے بڑھکر یہ کہ بعض ایسی جزئیات ملیں گی جنھیں پیش نظر رکھ کر بحث وگفتگو اور فکر ونظر کے لئے موضوع تلاش

سنا ہے کہ چند روز سے کاغذات متعلقہ ملک اودھ کے تیار ہو چکے ہیں، مگر ہنوز ان پر دستخط نواب گورنر جنرل بہادر کے نہیں ہوئے ہیں، بعض کہتے ہیں کہ نواب ممدوح کو یہ تامل ہے کہ مبادا فساد برپا ہو جاوے، اور اب کہ وہ ولایت کو جانے والے ہیں، کسی تردد میں کیوں پڑیں، مگر یہ بات قابل اعتبار نہیں، جناب ممدوح ایسے مستقل مزاج ہیں کہ جو کچھ تجویز کرتے ہیں کر ڈالتے ہیں تامل اور تشویش نہیں کرتے، مگر تامل کی وجہ یہ ہے کہ ایسا انتظام ہو جاوے جس سے احتمال فساد کا رفع ہو اور ملک چپکے سے ہاتھ آ جاوے اور سوائے اس کے کہ ملک اودھ بلا تکلف معرض ضبطی میں لانے سے سپاہیان فوج میں سرکشی ہو جاوے گی، مگر یہ خیال خام ہے، یہ بات تو سچ ہے کہ فوج سرکار میں بہت سے سپاہی رہنے والے اودھ کے اور اقوام کے راجپوت ہیں، مگر وہ جانتے ہیں کہ اس تدبیر سے ان کو کس قدر نفع ہوگا۔ ہر چند کہ بعض اہل دربار اودھ نے ان لوگوں کو برانگیختہ کرنے کے واسطے تدبیریں کی ہوں گی (بہرحال) آج کل میں حکم ضبطی ہوا چاہتا ہے۔ ایک اور خط کانپور کے اخبار دہلی گزٹ سے نقل کیا جاتا ہے، یہ خط لکھا ہوا ۸ تاریخ کا ہے۔ تاریخ مذکور کو پانچواں رسالہ اور ایک بڑا توپ خانہ وہاں پہنچا، اور تا اجتماع فوج میدان گھوڑ دوڑ میں مقیم رہیں گے اب تک لوگوں کو معلوم نہیں کہ سرکار نے کیا تجویز کی ہے۔ مگر لکھنؤ والوں کو معلوم ہو گیا ہے کہ کیا ہوگا؟ صاحب خبر لکھتے ہیں کہ میری دانست میں ضبطی نہیں، بلکہ انتظام ملک بطور سرکار اور باہتمام سرکار ہوگا۔ "سرکار" کے ذریعے اخبار "لاہور کرانکل" میں درج ہے، کہ حکم ضبطی اودھ کا جاری ہو گیا، سنا ہے کہ میجر جنرل اوٹرام صاحب وہاں کے چیف کمشنر اور مارٹن گیبن صاحب اور رابرٹس صاحب اور راوانی صاحب ان کے اسسٹنٹ جوڈیشل اور فنانشل اور ریونیو ڈیپارٹمنٹ میں ہوں گے اور کپتان نیئر صاحب ملٹری سکریٹری"

(اخبار کوہ نور لاہور مطبوعہ ۲۹ جنوری ۱۸۵۶ء)

ہوا کا رخ

انگریزوں کی بدنیتی اور بدعہدی اب زبان زد خاص و عام تھی، انگریزوں کے طور طریقے دیکھ کر ہر شخص محسوس کر رہا تھا "کچھ ہونے والا ہے" عوام میں تو ہلچل تھی ہی، رؤسا اور تعلق دار بھی مضطرب تھے اور اپنی تیاریاں میں مصروف:-

"دہلی گزٹ" میں بحوالہ ایک چٹھی لکھنؤ کے نقل ہے کہ اب تک تو لکھنؤ کے چھیلے بے خبر چین کرتے تھے، مگر جب سے کانپور میں لشکر جمع ہوا ہے اور ملک اودھ کی ضبطی کی خبر گرم ہوئی ہے تب سے ان کے بھی کان کھڑے ہوئے ہیں، مگر یہ نہیں معلوم کہ ظل

سبحانی حضرت جہاں پناہ ارادہ جنگ رکھتے ہیں (راضی بہ رضا) کا معاملہ ہے۔ بعض اشخاص کی یہ رائے ہے کہ شاید واجد علی شاہ کچھ سپاہ سے بمقابلہ پیش آوے قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک کے لوگ سرکار انگریزی کے خیر خواہ ہیں اور امداد رسانی کی موجود اور خیر خواہ بادشاہ کے بہت کم نظر آتے ہیں۔ تلسی پور کے راجہ نے تقریباً دس ہزار آدمی جمع کئے ہیں اور اپنے باپ کو قید کر لیا ہے اور بادشاہ کے عامل سے سرکش ہو گیا ہے اندیشہ ہے کہ مبادا اسی طرح اور رئیس بھی بن بیٹھیں اور بادشاہ کو خبر بھی نہ ہو۔ اور سرکار کو رعایا سے لڑنا پڑے۔ الغرض صدہا طرح کے گمان ہیں۔ جب تک سرکار کا تسلط نہ ہو جاوے تب تک اطمینان نہیں ہے"

(اخبار کوہ نور لاہور مطبوعہ ۵ فروری ۱۸۵۶ء ص ۹۲)

"جس وقت کا دھڑکا تھا وہ وقت آگیا آخر" بالآخر افواہوں نے واقعہ اور حقیقت کی صورت اختیار کر لی۔ انگریزوں نے تمام عہد ناموں کو بالائے طاق رکھ کر اودھ پر قبضہ کر لیا، کوہ نور نے "لاہور کرانیکل" اور سنٹرل اخبار" کلکتہ سے سرکاری گزٹ کا ترجمہ شائع کیا ہے۔

ضبطی ملک اودھ | ضمیمہ غیر معمولی ۱۲ فروری ۱۸۵۶ء "کوہ نور"

"اخبار کوہ نور تیار ہو چکا تھا کہ اس عرصے میں اشتہار ضبطی ملک اودھا میر کبیر نواب گورنر جنرل بہادر ابھی ساتویں تاریخ فروری کو مشتہر ہوا۔ بذریعہ پرچہ ضروری "لاہور کرانیکل" و سنٹرل اشتہار" کلکتہ کے اس کشور ہند کا ترجمہ اس کا ناظرین اخبار کے واسطے درج کیا جاتا ہے۔

"اشتہار" ۱۸۰۱ء میں جو صلح نامہ لکھا گیا تھا اس میں آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی نے عہد کیا تھا کہ ہم بادشاہ اودھ کی حفاظت مخالفان غیر ممالک اور اندرونی سے کریں گے اور بادشاہ اودھ نے عہد کیا تھا ہم انتظام اس قسم کا معرفت اپنے اہل کاروں کے رکھیں گے کہ رفاہ رعایا کا ہو اور جس سے رعایا کے جان اور مال کی محافظت رہے چنانچہ جو وعدہ سرکار ایسٹ انڈیا کمپنی نے کیا تھا اس کا لحاظ قریب پچاس برس تک ایمانداری سے برابر کامل طور پر ملحوظ رکھا اور ہمیشہ اور ہر طرح اس کی پابندی کی۔

اس عرصہ میں ہرچند سرکار کمپنی نے بہت سی لڑائیاں کیں مگر کسی مخالف غیر نے زمین پر پاؤں نہ رکھا۔ اور نہ کوئی ایسا مفسدہ ہوا کہ جس سے ریاست میں خلل کا اندیشہ ہوتا اور جب کسی نے بادشاہ کے حکم کی عدولی کی تو ہمیشہ فوری امداد ایک خاص اور ضروری شرط صلح فرمان روایان اودھ کی جانب سے برابر ملحوظ ہوتی رہی اور جو (بادشاہ کا) وعدہ تھا کہ ایسا انتظام ہوگا کہ جس سے جان و مال سکنائے اودھ کی حفاظت اور ان کی سرسبزی کا باعث ہوا۔ ابتدا سے انتہا تک عملاً خلاف ہوتا رہا۔ اس عہد شکنی کے باعث اگر سرکار انگریزی کبھی اس عہد نامے کو باطل کر دیتی (تو جائز تھا) (اب حالت یہ ہے کہ) انصاف اور قانون نام کو نہیں، جبر اور خونریزی روزمرہ سے جان و مال ایک کا بھی محفوظ نہیں، سرکار انگریزی اودھ کی برائیوں اور خرابیوں کو نہیں دیکھ سکتی۔

پچاس برس کے تجربے سے معلوم ہوا کہ ۱۸۰۱ء کے عہد نامے سے سکنائے اودھ کو خوشی اور بہتری مطلق نہ حاصل ہوئی اور بخوبی ظاہر ہوا کہ اس ظلم سے سکنائے اودھ کو بے آنکہ انتظام کل اضلاع اودھ کا ہمیشہ کے لئے سرکار انگریزی کے ہاتھ میں آوے اور کسی صورت میں مکن نہیں۔

واسطے حصول اس مدعا کے آنریبل کورٹ آف ڈائرکٹر کے یہ بات قرار پائی کہ ۱۸۰۱ء کا معاہدہ جس کا بادشاہ نے لحاظ نہیں کیا آئندہ سے قطعاً منسوخ سمجھے۔

آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی (نے طے کیا ہے کہ) بادشاہ کو اور ان کے خاندان کو مواجب معقول دیا جاوے۔ واجد علی شاہ بادشاہ سے اور نیز ان کے مورثوں سے ایفائے شرط عہد نامہ ۱۸۰۱ء کا کیا گیا۔ اس کی رو سے ان کو ملک میں ایسا انتظام کرنا فرض تھا جس سے رعایا کو سرسبزی اور خوشی ملتی۔ اور ماسوا اس کے وہ عہد نامہ جس کو بادشاہ نے توڑا، وہ منسوخ سمجھا گیا۔ اس لئے سب پر ظاہر ہے کہ حکومت انگریزی کو بجز ایک امر کے اور کوئی چارہ نہ رہا۔

یعنی یا تو رعایا اودھ کو ظلم اور تعدی میں چھوڑ دے کہ ایسی حالت میں بر سبب شرط صلح کے وہ لوگ مدت سے پڑے ہوئے ہیں۔ یا آنکہ اپنے زور قوی کو واسطے حمایت ان لوگوں کے جن کے واسطے پچاس برس سے زیادہ انتظار کیا۔ کام

میں لائیے،" ناتمام لہ

ضمیمہ اخبار کوہ نور مطبوعہ لاہور ۱۲ فروری ۱۸۵۶ء)

یہ عبرت کی جا ہے تماشا نہیں ہے!

اودھ کی سلطنت ضبط ہو چکی ہے نظم جدید کا دور دورہ ہے۔ اب تک انگریزوں نے اپنی پالیسی متعین نہیں کی ہے۔ نظم مملکت کے مستقبل سے متعلق مختلف افواہیں اڑ رہی ہیں۔ بادشاہ کو ہموار کرنے کی ہر کوشش ناکام ہوئی، اور "راضی نامہ" پر کسی طرح دستخط کرنے کو تیار نہیں ہیں اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی اس دھاندلی کے خلاف برطانوی حکومت سے استغاثہ کرنا چاہتے ہیں، رعایا مایوس، فوج برخاست، نئے لوگ، نئی دنیا، نیا ماحول:-

"پہلے اس اخبار انگریزی سے حال اودھ کا لکھا گیا تھا۔ اب جو تازہ ترین خبریں لی ہیں، وہ بھی واسطے ملاحظہ شائقین اخبار درج کی جاتی ہیں۔ تحقیق خبر ہے کہ اودھ میں صرف انتظام سرکاری نہیں ہوگا۔ بلکہ یہ ملک داخل ممالک محروسہ سرکار کمپنی بہادر کے کیا جاوے گا۔ یہ بھی سنا ہے کہ مسٹر کوپر صاحب جو گورنمنٹ کے ڈپٹی سکریٹری ہیں چیف کمشنر اودھ کے سکریٹری مقرر ہوئے اور چار کمشنر ہوں گے یعنی کریسچن صاحب، ماسٹر ویکفلڈ صاحب، میجر ٹیکس صاحب اور کرنل گولڈنی صاحب اور صاحبان ذیل بہ عہدۂ ڈپٹی کمشنر اضلاع کے مامور ہوں گے۔ یعنی مسٹر وینس صاحب، مسٹر فورنس صاحب پنجاب سے اور مسٹر باسلو صاحب ضلع بدایوں سے مارٹن صاحب مرزا پور سے، مسٹر ہڈنس صاحب مظفر نگر سے، مسٹر پاٹک صاحب بنارس سے مسٹر تیارنیل صاحب مرادآباد سے، مسٹر کنلف صاحب روہیل کھنڈ سے، مسٹر جی لارنس صاحب اٹاوہ سے، مسٹر گون صاحب روہیل کھنڈ سے اور مسٹر بدک صاحب انگلینڈ سے تشریف لاویں گے، مسٹر گبن صاحب فنانشل کمشنر، اور مسٹر اومانی صاحب جوڈیشنل کمشنر تجویز ہوئے ہیں اور کپتان گوئن صاحب جوڈیشنل کمشنر تجویز ہوئے ہیں اور کپتان گوئن صاحب ۲۷ رجمنٹ ہندوستانی اور لفٹیننٹ سلیس صاحب لفٹننٹ گورنر کے مصاحب اور لفٹننٹ ہار صاحب جنٹ مجسٹریٹ چھاؤنی کانپور کمانیر رجمنٹہائے جدید ہوں گے کہ واسطے ملک اودھ کے بھرتی کیے جاویں گے۔

اخبار لاہور کرانیکل مطبوعہ ۹ ماہ رواں میں بذریعہ ایک چٹھی مورخہ چار تاریخ مقام لکھنؤ کے

درج ہے کہ اول تو حضرت بادشاہ ترک سلطنت پر راضی ہو گئے تھے، مگر اب عزم جنگ رکھتے
ہیں کہ ہم حکام ولایت سے استغاثہ کریں گے، اب حضرت کے حال پر کوئی رحم نہیں کرتا صاحبان
انگریز اور نہ ان کی رعایا، جنرل اوٹرم صاحب نے حال ضبطی ملک کا بادشاہ کا بہ کمال آہستگی اور حلم
ظاہر کیا، مگر یہ گولی بہت کڑوی تھی، بادشاہ بآسانی نہ کھا سکے، مگر اب نہ ان کے پاس فوج ہے نہ
رعایا، اس لیے بچارے ناچار اس کو گوارا کرنا پڑا، سابق میں سنتے تھے، کہ افواج سرکاری فیض آباد میں
مقیم ہوگی، اب سنا ہے کہ لکھنو کے قریب رہے گی، سب لوگ متحیر ہیں کہ دیکھئے انتظام جدید
کب ہوتا ہے، عہدہ داران کلاں کو بڑی تشویش ہے، ایک شخص یہاں کے رہنے والے نے درخواست
کی ہے کہ اگر مجھ کو پچاس ہزار روپیہ مل جاوے تو تمام قلعے اور گڑھیاں ملک اودھ کی مسمار کرادوں
صاحب خبر لکھتے ہیں کہ یہاں کام اس سے بھی آسان ہو سکتا ہے صرف حکم کی دیر ہے، اور ایک خط
اسی تاریخ کا مقام کانپور سے آیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ بادشاہ نے راست برداری سے کام لیا
تحقیق بات یہ ہے کہ آج تک جنرل اوٹرم صاحب نے بادشاہ کو حال ضبطی ملک نہیں سنایا، اور
ملاقات ہوتی تو اقرار و انکار بادشاہ کا بھی معلوم ہو سکتا، حال یہ ہے کہ سب طرح خیریت معلوم
ہوتی ہے، صاحب ریزیڈنٹ نے وزیر سے مشورہ کیا تھا کہ اب وزیر ہر طرح سرکار انگریزی کا
مددگار رہے، درخواست سرکار انگریزی کی یہی ہے کہ بادشاہ لکھنو میں مقیم رہیں، مگر پندرہ لاکھ روپیہ
سالانہ پنشن لے لیا کریں اور دو رجمنٹ اپنی کار خدمت کے واسطے متعین رکھیں، باقی فوج یا تو
برطرف ہو جائے یا کنٹنجنٹ سرکار انگریزی کے مامور ہوں گے اور کرنل گری صاحب کمانڈنٹ ہوں گے
بالفعل برگیڈ اول راہ راست فیض آباد کو چلا جاوے گا اور وہاں جاکر مقیم ہوگا، دوسری گورہ رجمنٹ
کو بذریعہ تار بجلی کے حکم کیا گیا ہے کہ بلا توقف صرف کانپور کے کوچ کر جاوے، اخبار "دہلی گزٹ"
میں بھی ایک چٹھی مقام لکھنو کے ذریعے سے لکھا ہے کہ بادشاہ نے ایک دستاویز پر مہر کر دی
ہے، مضمون دستاویز یہ ہے کہ ہم نے ملک اپنا سرکار کمپنی بہادر کو عطا کیا اور پندرہ لاکھ روپیہ
سالانہ لینا قبول کیا، ملازمان فوج شاہی کو خبر کی گئی کہ آئندہ وہ اپنے تئیں بادشاہی نوکر نہ سمجھیں
اور بادشاہ اپنے ملازمین دیگر رفتہ رفتہ برخاست کرتے ہیں، صدہا بیگمات کہ زینت بخش شاہی محل
ہیں، برطرف ہو جاتی ہیں، ان کو اجازت ہے کہ جو جو زیور اور مال ان کے پاس ہے وہ لے جاویں،
اب بادشاہ تیاری کرتے ہیں کہ فیض آباد میں مقیم رہیں، باون رجمنٹ شاہی اور دو ہندوستانی
پلٹن اودھ سے چھ کوس کے فاصلے پر مقیم ہے، اخبار سنٹرل سٹار میں از روئے چٹھی مقام لکھنو

مورخہ ۲ فروری کے خبر ہے کہ اس روز بادشاہ اودھ نے حکم دیا کہ سب توپیں وغیرہ پھکوا دی جائیں اور فوج کے ہتھیار لے لئے جاویں۔ جنرل اوٹرم صاحب نے یہ حال سن کر وزیر کو سمجھایا۔ کہ امور در حاصل ہیں۔ اگر حضرت گورنمنٹ سے کچھ کیا چاہتے ہیں تو لکھ دیں اور ہم سے جہاں تک ہو سکے گا سعی کریں گے۔ بادشاہ کے حق میں بہتر یہی ہے کہ راضی نامہ ترک سلطنت کا لکھ دیں۔ ورنہ ان کے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔ چنانچہ وزیر نے یہ حال فوراً بادشاہ سے جا کر کہا۔ کپتان میٹر صاحب کہتے ہیں کہ بادشاہ کا ارادہ راضی نامہ پر دستخط کر دینے کا تھا۔ مگر نامعلوم اب کیوں انکار کرتے ہیں۔ اب عزم بادشاہ کا یہ ہے کہ اگر ہماری سلطنت ہاتھ سے نکل گئی تو ہم سیدھے لندن کو جاویں گے۔ حکم دے دیا ہے کہ پچھلا سب حساب بنا یا جاوے اور فوج کو طلب[1] تقسیم کر دی جاوے، اور کل فوج کو آخری جنوری تک تنخواہ دے کر معزول کر دیویں۔ بیگمات کے تمام ملازمین اور متعلقین برطرف ہوتے جاتے ہیں۔ اور وزیر مال کا غذات حساب مال کے لغایت جنوری تیار کر رہا ہے۔ ایک خط سے دریافت ہوتا ہے کہ بادشاہ نے راضی نامہ پر دستخط کر دیئے، مگر صاحب خبر لکھتے ہیں کہ شام تک تو دستخط ہرگز نہیں ہوئے تھے۔ چوتھی فروری کی یہ خبر ہے کہ جنرل اوٹرم صاحب بادشاہ کی ملاقات کو گئے اور ان سے درخواست کی کہ راضی نامہ ترک سلطنت کا لکھ دیجئے اور ملک اپنا بنام کمپنی لکھ دیجئے۔ بادشاہ نے صاف انکار کیا۔ اور جنرل اوٹرم صاحب نے بادشاہ کو تین دن کی مہلت دی ہے۔ والدہ بادشاہ نے صاحب ریزیڈنٹ کو بلایا اور یہ پوچھا کہ کیا تم راضی نامہ ترک سلطنت کا لکھا یا چاہتے ہو؟ جنرل اوٹرام صاحب نے کہا کہ ہم کو جیسا حکم ہے، اس کی تعمیل کرتے ہیں تب انہوں نے کہا کہ ہم سرکار میں نالش کریں گے اور جلسہ پارلیمنٹ ہاؤس آف کامنز میں استغاثہ کریں گے۔ تب جنرل صاحب نے جواب دیا کہ خواہ ولایت کو آپ جاؤ خواہ وکیل کو بھیجو کچھ حاصل نہیں کیونکہ اس انتظام میں کچھ فرق نہیں ہوگا۔ اور وہ تاریخ کو بادشاہ کو ہمارا جھوٹ سچ کھل جاویگا ریزیڈنسی سے حکم جاری ہو گیا کہ اب عرائض نہ سنے جاویں گے۔ بلکہ جو افسر جس پرگنہ تعینات ہے وہاں نالشیں دائر ہوں گی۔ بادشاہ نے اپنے امراء کو جمع کر کے مشورہ کیا اور آخر کار شرف الدولہ کو صاحب ریزیڈنٹ کے پاس بھیجا۔ اس کے بعد بیگم سے ملاقات ہوئی اور اشرف الدولہ نے بادشاہ کو صلاح دی کہ تم کوئی بات قبول نہ کرنا۔ بادشاہ کے واسطے بہتر ہے کہ بزور فوج مقابلہ نہ کریں

---

[1] تنخواہ

بلکہ بہ استقلال یہ بات کہیں کہ گورنر جنرل کو ہمارے ملک پر تسلط کرنے کا منصب نہیں۔ اس صورت میں جبراً ان سے سلطنت چھین لی جاوے گی تو اہالیان انگریزی کو ضرور ان کے حال پر رحم آوے گا۔ فوج کو حکم ہے کہ لکھنؤ سے ایک منزل ادھر مقیم رہیں۔"

(اخبار کوہ نور لاہور مطبوعہ ۱۲ فروری ۱۸۵۶ء)

تاج شاہی چھنتا ہے

بالآخر کیفیت منتظرہ ختم ہو گئی۔ کمپنی بہادر نے عنان مملکت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ واجد علی شاہ اب بادشاہ نہیں رہے۔ رعایا بن گئے

زیادہ سے زیادہ ایک معزز شہری ——— "کوہ نور" یہ داستان سناتا ہے:۔

"اخبار دہلی گزٹ میں از روئے ایک خط مقام لکھنؤ مورخہ ۱۱ تاریخ کی خبر ہے کہ اب فوج وہاں کی تقسیم ہو گئی ہے کہ ۲۲ رجمنٹ فیض آباد کو گئیں کہ وہاں کرنل گولڈنی صاحب کمشنر مقرر ہوئے ہیں اور ۱۲ رجمنٹ سیتاپور گئیں اور ۷۳ رجمنٹ سراب کو پانچویں رسالہ کو ایک ترپ رجمنٹ کے ہمراہ جائے گا۔ لشکر میں اب صرف ۴۸ رجمنٹ باقی ہیں۔ اب لشکر لکھنؤ سے ۴ میل کے فاصلے پر مقیم ہے۔ سنا ہے کہ فوج کمپنی اودھ میں سب عہدہ دار مامور ہو گئے ہیں۔ رسالوں میں صاحبان متذکرہ ذیل بھی بھرتی ہوئے ہیں۔ یعنی کپتان ویلی صاحب اور کپتان بارنگ صاحب اور لفٹنٹ گیل صاحب سے سنا ہے کہ جو عہدہ داران انگریزی شاہ اودھ کے ملازم تھے ان کے واسطے عہدہ ہائے معقول سرکار انگریزی کی سلطنت سے مامور ہوں گے اور جو ضعیف اور لائق کام کے نہ تھے ان کو پنشن ملے گی اور باقی ماندہ ہیں بہ لحاظ قدامت خدمت اور لیاقت کے عہدہ ہائے جلیلہ کپتان میری صاحب اور کپتان آدر صاحب اور ان کے بھائی اور کپتان سرسی صاحب وغیرہ کا نام فہرست کے سرے پر درج ہے بعض ان میں سے ہزار یا بارہ سو روپے ماہواری تنخواہ پاویں گے۔ کپتان ولسٹن صاحب شہر کے مجسٹریٹ مقرر ہوئے اور کپتان آدر صاحب ان کے ڈپٹی مقرر ہوں گے۔ جتنے محکمہ جات بادشاہی شہر میں تھے سب پر گارد انگریزی تعینات ہو گئے جو توپ اتاری گئی تھیں، وہ پھر چڑھا دیں۔

اخبار "لاہور کرانیکل" سے منقول ہے کہ ۱۷ رجمنٹ ہندوستانی کو جنرل ویلر صاحب کے کیمپ میں شامل ہونے کا حکم ہے اور بجائے اس کے وہاں چوتھی رجمنٹ جائے گی۔ جنرل اوٹرم صاحب کی رائے یہ ہے کہ ملک اودھ میں کچھ لڑائی نہیں ہو گی۔ بلکہ انتظام بخوبی ہو جائے گا۔

فیض آباد کے کمشنر ہو گئے، یہ صاحب وہاں کی پلٹن کے کمانڈنٹ رہیں گے۔ اخبار مذکور میں از روئے ایک چٹھی مورخہ ۷ تاریخ کی خبر ہے۔ کہ اشتہار ضبطی ملک یہاں چپ چاپ جاری ہو گیا ہے۔ یہاں کے لوگ سرکار کی عملداری سے ناراض نہیں معلوم ہوتے۔ مگر ابھی تک بہت کچھ کرنا باقی ہے، بادشاہ تو حکم ضبطی کا سن کر چپ ہو رہے ہے اس واسطے ان کا کچھ اختیار نہ تھا اور وہ یہ بھی جانتے ہیں۔ کہ اگر ہم نے کچھ تامل کیا تو پنشن سے بھی محروم رہیں گے۔ مگر درباری لوگ کہ جواب بر طرف ہو گئے اور یہ لوگ صدہا بلکہ ہزارہا ہیں۔ یہ البتہ کچھ تکلیف دیں گے اور ان کی خبر ضروریات سے ہے، یہ لوگ ابتدا سے دربار میں رہتے ہیں اور اپنی عمر حیلہ اور فریب میں گزاری ہے۔ ان سے امید نہیں کہ سیدھی طرح چپ ہو ویں گے۔ ایک کانپور کے خط سے دریافت ہوا کہ جس وقت صاحب ریزیڈنٹ نے حال ضبطی ملک کا بادشاہ کو سنایا تو حضرت نے تاج شاہی کو پھینک دیا اور جواب دیا کہ تم میرا ملک اور مال بہت سے لو۔ میں نے تو پیں اتروا دیں۔ اور میں مقابلہ نہیں کروں گا مگر مجھ پر جبر دستخط کرنے کا نہ کریں میں اپنی موروثی سلطنت کو ہاتھ سے نہیں دے سکتا۔ غالب ہے کہ بادشاہ دستخط راضی نامہ پر نہ کریں گے۔ اور نتیجہ اس کا اور بھی برا نکلے گا ضبطی ہر طرح سے گی، صاحب ریزیڈنٹ دونوں امور کے واسطے راضی ہیں۔ ۸ جنوری کو جنرل اوٹرم صاحب نے حکم دیا کہ تمام اہالیان شاہی کو دربار ریزیڈنسی میں حاضر کرو۔ دوپہر کے وقت علی نقی خاں وزیر راجہ بال کشن مختار امورات مال، شرف الدولہ داروغہ پرمٹ اور کوتوال شہر اور دیگر اہل کاران شاہی حاضر ہوئے۔ صاحب ریزیڈنٹ نے راجہ بال کشن کو حکم دیا۔ تمام حساب کتاب سمجھا دو اور کوتوال سے کہا کہ کپتان ولسٹن صاحب کو رپوٹ تھانہ جات کے دے دو۔ اور صاحب ریزیڈنٹ نے جا بجا گارد تعینات کر دیئے اور حکم دیا کہ کام بدستور جاری رہے گا، مگر روپیہ باہر نہ نکلنے پائے، بادشاہ نے سب زمینداروں اور تعلقہ داروں اور عاملوں کے نام اشتہارات جاری کر دیئے ہیں کہ کمپنی بہادر نے ہمارا ملک لے لیا اس لئے جس کسی کو صاحب ریزیڈنٹ مقرر کریں اسے اخراج دیتے رہو۔ اور کسی سے دنگہ فساد نہ کرو۔ ہم خود ولایت کو جا کر استغاثہ کریں گے اور غالب ہے کہ کامیاب ہو کر آویں گے، صاحب ریزیڈنٹ نے تین کمپنی واسطے ریزیڈنٹی کے طلب کی ہیں، بادشاہ نے دروازہ محل کا بند کر دیا اور کہتے ہیں کہ ہم راضی نامہ پر ہرگز دستخط نہیں کریں گے۔

(از اخبار کوہ نور لاہور مطبوعہ ۱۹ فروری ۱۸۵۶ء)

"لوگ ناراض ہیں مگر خاموش"

شاہی حکومت کا تختہ الٹ گیا۔ بادشاہ نے مقابلہ نہیں کیا۔ رعایا نے خاموشی سے یہ انقلاب برداشت کر لیا۔ انگریزوں نے بغیر کسی کشت و خون کے ایک بہت بڑی سلطنت پر بغیر کسی خطا اور قصور کے قبضہ کر لیا۔ پھر بھی انگریز سپاہیوں کا برتاؤ اہل شہر کے ساتھ کیسا رہا؟ اور عوام کے غم و غصّہ کا کیا عالم ہے، یہ قصہ کوہ نور کی زبانی سنیئے:-

"سنا ہے کہ جنرل اوٹرم صاحب نے بادشاہ سے کہہ دیا ہے کہ جب تک تنخواہ تمام افواج کی روانہ نہ ہو جاوے آپ لکھنؤ سے نہ جاویں اور ہم نواب گورنر جنرل کو اس باب میں لکھیں گے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ انجام اس کا کیا ہوگا۔ افواہ ہے کہ فوج نیپال نے بہرائیچ میں آ کر اس ضلع میں تصرف کر لیا ہے اور دریائے گاگرا پار جس قدر ملک تھا سب دبا لیا ہے۔ اور فوج سرکار کو دریائے پار آنے میں مانع ہیں۔ راجہ تلسی رام کہ راجہ نیپال سے اس کی قرابت ہے۔ اس معاملہ میں ساعی ہے۔ سنتے ہیں کہ اب تمام ملک اودھ کا سرکار کمپنی کی عملداری سے ناراض ہے اور سپاہ سرکار کا خیال ہے کہ ہم اپنے اقربا اور ہم کفو لوگوں سے کیونکر مقابلہ کریں گے؟ بادشاہ ۱۷ تاریخ کو لکھنؤ سے روانہ ہوا چاہتے ہیں۔ مگر صاحب ریزیڈنٹ نے ان کو روک دیا۔ فوج لکھنؤ میں ہر طرف سے چلی آتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان خبروں کا کچھ وجود ضرور ہے۔ بادشاہ کے مقدمے میں روز بروز جان پڑتی جاتی ہے۔ بادشاہ کو تقویت ہے کہ قوم انگریزی بڑی انصاف دوست ہے اور سرکار کمپنی سے بالا دست حکام بادشاہ کا انصاف کریں گے۔ اخبار دہلی گزٹ سے اندازہ ہوتا ہے کہ تخمینہ اخراجات اس ملک کا اس طرح پر ہوا ہے۔ اخراجات جنگی مبلغ ۱۲ لاکھ روپے اخراجات سول چودہ لاکھ روپے اور محاصل ملک کا ایک کروڑ پچاس لاکھ روپے۔ راجہ بال کشن کی زبانی معلوم ہوا ہے کہ بقایا تنخواہ فوج صرف بقدر پچیس لاکھ روپے کے ہے۔ مردمان متعلقین توپ خانہ شاہی کچھ نادان معلوم ہوتے ہیں۔ چند پلٹنیں شہر کی چھاؤنی میں آ گئی ہیں۔ اب شہر میں واقعی انتظام ہو گیا۔ اضلاع کا انتظام جلد ہو جائے گا۔ اخبار مذکور میں از روئے چٹھی مقام کانپور مورخہ ۱۷ ماہ رواں کے خبر ہے کہ لکھنؤ سے دفعتہً فوج کی طلبی ہوئی ہے۔ چنانچہ دو رجمنٹیں روانہ ہو گئیں اور سواران پندرھویں رسالہ اور ایک جزو ۲۸ رجمنٹ تخت حکم شر صاحب کے خزانہ لے کر گئے ہیں۔ افواہ ہے کہ دریاباد کے قریب فساد ہو گیا کہ یہ مقام فیض آباد کے راہ میں ہے۔ ۱۹ رجمنٹ ۱۹ تاریخ کو کوچ کر گئی ہوگی —

۴۳ رجمنٹ ۸ مارچ کو جاوے گی منجملہ فوج شاہی کے فوج کنجنٹ میں دو سوار اور دو سو پیادہ اور سو گولن داز بھرتی ہو گئے ہیں اور روز بروز بھرتی جاری ہے۔ ۵۲ رجمنٹ شاہی باغ دل کشا میں اور فوج کنجنٹ موتی باغ میں مقام کرے گی۔ اب شہر کا بندوبست ہو گیا ہے، اضلاع کا بندوبست ہووے گا۔ اب اودھ کے لوگ ضبطی ملک سے خوش نہیں ہزارہا لوگ شور و غل مچاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ سرکار کو سوائے ملک اودھ کے غیر مقامات کے آدمیوں کو نوکر رکھنا بعید از انصاف ہے۔ بادشاہ کے قدیم ملازمین بجز چند آدمیوں کے سب برخاست ہو گئے۔ ان سے کہا گیا ہے کہ تمام حقوق کا لحاظ رکھا جائے گا۔ اب بادشاہ کی حالت پر سب کو رحم آتا ہے۔ بادشاہ نے جو ہر معاملے میں سرکار کی اطاعت کی یہ بہت اچھی تجویز ہوئی کہ بعض لوگ اس بات سے ناراض بھی ہوئے۔ اور ایک زمیندار مفسد نے یہاں تک کہا کہ ایک پوشاک زنانی بھیج کر پیغام دیا کہ تم کو یہ لباس زیب دیتا ہے کیونکہ اس طرح سے بلا تکرار ملک میں دخل دے دینا اس لائق ہے کہ عورت کا لباس پہن کر بیٹھے۔ جب سے ۵۲ رجمنٹ شاہی اور توپ خانہ پیدل شہر میں آیا ہے، باشندگان شہر کی نظر میں انگریزوں کی اہانت ہوتی، یعنی گورہ لوگوں نے بحالت مستی شراب کے شہر میں جا کر بہت نامعقول حرکات کیں اور جبر کئے بعض آدمیوں کو حیرت ہے کہ انگریز اور گورہ میں کیا فرق ہے۔ جو لوگ ہمیشہ لکھنؤ میں رہتے ہیں اور خصوصاً شہر کی مستورات کو تمیز نہیں کہ گورہ اور انگریز کو شناخت کریں۔ اس لئے ان کو بھی گمان ہے کہ یہ حرکات ناشائستہ صاحبان انگریز کی طرف سے ہوئیں۔ بروز جمعہ گزشتہ شہر لکھنؤ میں ایک بلوہ کی صورت پیدا ہوئی تھی، مگر ۴۸ رجمنٹ جلد جا پہنچی اور فساد رفع دفع ہو گیا۔ ۴۳ رجمنٹ کو جو روانگی کا حکم ہوا تھا منسوخ ہو گیا۔ اور اب رجمنٹ مذکور مقیم رہے گی۔ کہتے ہیں کہ اضلاع میں فساد برپا ہے۔ مگر شہر میں خیریت ہے۔ ہر چند لوگ ناراض ہیں مگر خاموش ہیں۔ اس ملک میں چار قسمتیں مقرر ہوئی ہیں۔ یعنی لکھنؤ اور بہرائچ خیر آباد اور محمدی۔ مردمان توپ خانہ شاہی نے توپیں دینے سے انکار کیا تھا۔ اس لئے فساد کی صورت نظر آتی تھی۔ مگر تمام فوج کانپور وہاں جانے کو تیار ہوئی۔ پر ان لوگوں نے مجبور ہو کر ہتھیار رکھ دیئے۔ اخبار لاہور کرانیکل میں بذریعہ ایک خط مقام لکھنؤ کی خبر ہے۔ کہ بادشاہ نے عزم ولایت جانے کا مصمم کر لیا ہے۔ اور نواب گورنر جنرل بہادر نے اجازت دے دی ہے۔ جہاں تک سرکار کا ملک ہے، وہاں تک بلا کرایہ پہنچ جاویں گے۔ مگر معلوم نہیں ولایت میں ان کا مہماندار کون ہوگا۔ فہرست تقرری جدید اودھ جو اخبارات میں چھپی ہے واسطے ملاحظہ شائقین کے درج کی جاتی ہے۔

میجر جنرل اوٹرم صاحب چیف کمشنر و ایجنٹ گورنر جنرل، کپتان ایسنر صاحب ملٹری سکریٹری اور اسسٹنٹ ایجنٹ گورنر جنرل، مسٹر اون صاحب جوڈیشنل، مسٹر ہارٹن گیبن صاحب فنانشل کمشنر۔

صاحبان ذیل فوج جدید اودھ توکل بھرتی مقرر ہوئے

جنرل اوٹرم صاحب اور کپتان سیٹر صاحب سے انتظام بہت جلد ہو رہا ہے، صاحبان کمشنر نے اپنا کاروبار جاری کر دیا۔ کپتان دلسٹن صاحب چیف مجسٹریٹ اپنی کچہری چوک میں کیا کریں گے کہ وہاں شہر میں آبادی کا زور ہے، بادشاہ کو محل میں رہنے کی اجازت ہے اور احاطہ دل کشا میں ممانعت نہیں جو آداب بادشاہانہ ہے، وہ ان کے واسطے قائم رہے گا، پندرہ لاکھ روپے سالانہ رزیڈنسی کے خزانے سے ملا کرے گا۔

اور باقی سب عمالات تصرف عہدہ داران انگریزی میں آئیں گی، شہر کی ابھی سے حالت تبدیل معلوم ہوتی ہے۔ اب مسلح آدمیوں کو بازار میں پھرتا نہیں دیکھتے۔ ہزارہا آدمی اشتہار ضبطی کو پڑھتے نظر آتے ہیں۔ یہ کسی کو خیال نہ تھا کہ بلا فساد کے اس طرح ملک ضبط ہو جاوے گا نیپال کی طرف راجوں کا مجمع معلوم ہوتا ہے کہ وہ زر محاصل نہیں دینا چاہتے۔ لاجگان تلسی پور اور بلرام پور اور بنکا ان میں سرگروہ ہیں، یہ بھی خبر ہے کہ اہل نیپال ان کی مدد کریں گے، تنخواہ فوج بادشاہی کی ریذیڈنسی میں تقسیم ہو رہی ہے، ستر ہزار آدمی تنخواہ دار ہیں"

(از اخبار کوہ نور، لاہور، مطبوعہ ۲۶ فروری ۱۸۵۶ء ص ۱۴۲ تا ۱۴۵)

نئی حکومت نیا نظام

اب بادشاہ کو لوگ بھولتے جاتے ہیں، بادشاہ خود اپنے آپ کو فراموش کر چکے ہیں، انگریز نہایت اطمینان سے اور تسلط اور تصرف کی پالیسی پر عامل ہیں:۔

"اخبار لاہور کرانیکل" میں از روئے خط مقام لکھنؤ کے خبر ہے کہ جنرل اوٹرم صاحب بہادر کے حسن انتظام سے انتظام ملک کا بہ تدریج ہوتا چلا جاتا ہے، بادشاہ کی فوج میں قریب دو ثلث ملازموں کا حساب بے باق ہو گیا، جو جو خواہاں نوکری تھے ان کو اجازت دی گئی ہے، چنانچہ بہت سے لوگ بھرتی ہونے پر راضی ہیں، فوجوں کی دو دو لوں رجمنٹیں حاضر آ گئیں، صاحب لکھتے ہیں کہ جنرل صاحب کو اختیار تھا کہ بادشاہ کے ساتھ بہ سختی پیش آئے، مگر اس حالت میں بدنظمی اور خونریزی کا احتمال تھا اور اس انتظام سے نہ اس کے وقار میں نہ نام آوری میں فرق آ سکتا ہے

اثبات حق بہت ہے۔ مشکل یہ ہے کہ لوگوں نے اپنے حقوق اودوں کے ہاتھ فروخت کردیئے تھے جو لوگ مخالفان سلطنت انگریزی ہیں وہ بادشاہ کے مشیر اور صلاح کار ہیں اس لئے حضرت لاادعوی سلطنت کا لکھ دیتے میں، ابھی متامل ہیں اور ارادہ ولایت جانے کا رکھتے ہیں۔ مگر اس باب میں جنرل اوٹرم صاحب کا کچھ نقصان نہیں۔ بلکہ بادشاہ کے چلے جانے سے انتظام ملک میں آسانی ہو گی۔ یہ بات کہ حکام بادشاہ کے ولایت جانے میں ہارج ہیں۔ سو یہ قول غلط ہے کہ یہاں کوئی ان کا مانع نہیں۔ بلکہ صاحب ریزیڈنٹ نے ہر طرح سے ان کی مدد کی ہے اور تجویز کردی ہے۔ کہ جہاں وہ ہوویں ان کی تعظیم وتوقیر ہووے۔ اگر واقعی بادشاہ ولایت جاویں گے تو ایک عہدہ دار انگریزی بھی ان کے ساتھ جاوے گا۔ عہدہ داران بادشاہی متابعت سرکاری کی کرتے جاتے ہیں۔ بعض لوگ اوائل میں سرکشی کرتے ہیں۔ مگر اب انہوں نے جان لیا کہ نتیجہ انحراف کا برا ہے اس لئے خاموش ہو بیٹھے۔ ضبطی ملک سے وہ لوگ البتہ ناراض ہیں کہ جو بسبب دربار کے ٹکڑا کھاتے تھے۔ مگر عوام الناس اس کو غنیمت سمجھتے ہیں اور شکر کرتے ہیں۔ اگر جنرل سلمین صاحب کی رائے پر بادشاہ متحمل ہوتے تو تھوڑے دن کو اور سلطنت بچ جاتی۔ سرکار کی طرف سے بادشاہ کو پیغام تھا کہ اگر آپ راضی نامہ پر دستخط کردیں تو پندرہ لاکھ روپے سالانہ پنشن آپ کو اور تیرہ لاکھ روپے آپ کے متعلقین کو ملے گی۔ مگر چونکہ بادشاہ نے دستخط نہ کئے اور وہ شرط قائم نہ رہی۔

اخبار دہلی گزٹ میں از روئے خط مقام بہرائچ ذکر ہے کہ جب سپاہ انگریزی نے سنا کہ راجہ تلسی پور سرکشی کیا چاہتا ہے۔ تو نیپالیوں نے اس ملک پر تسلط کر لیا تو وہ اپنے دل میں خوش ہوئے مگر ان کی تمنا حاصل نہ ہوئی۔ حال یہ ہے کہ ضلع میں فوج سرکاری آرام سے مقیم ہے اور سپاہی لوگ اپنے عزیز واقارب سے مل کر خوش ہیں اور اپنے بھائی بندوں کو نوکر کرانے کی فکر میں ہیں ملک میں ارزانی ہے، نخود ایک روپیہ من فروخت ہوتا ہے۔ لوگ وہاں کے ایک بات سے راضی ہوئے کہ جو شخص ان سے کوئی چیز خریدتا ہے اس کے دام فوراً مل جاتے ہیں۔ یہ عہد سابق سپاہ بادشاہی ان سے جبراً خریدتے تھے۔ اور اگر وہ انکار کرتے تھے تو ان کی دوکانوں کے چھپّر اتار لئے جاتے تھے کہتے ہیں کہ ضلع بہرائچ سیر وشکار کے واسطے اچھی جگہ ہے اور اس مقام میں تجارت بھی ہوتی ہے اسلحہ وغیرہ لوہے کا کارخانہ یہاں بہت ہے اور یہاں کی تلوار ہندوستان بھر میں مشہور، فوج سرکاری ابھی ڈویژن میں مقیم ہے۔ بارکیں جلد تیار ہوں گی۔ ابھی بادشاہ نے کوئی وکیل اپنی جانب سے مقرر نہیں کیا۔ مگر گورنر جنرل کے جواب کا انتظار ہے۔ بادشاہ کو اجازت ہے کہ دو پلٹن پیادہ، ایک

رسالہ سواران اپنی ملازمت میں رکھیں، چھاؤنی میں مکانات کرایہ پر دستیاب نہیں ہوتے اور خیمہ میں رہنا اس موسم میں دشوار ہے۔ ایک اور شخص لکھتا ہے کہ ضلع بہرائچ میں سب طرح امن و امان ہے تلسی پور کے راجہ نے قریب بیس ضرب توپ کے بھیج دی ہیں اور باقی پیچھے سے بھیجا چاہتا ہے حکام نے بادشاہ سے پوچھا ہے کہ آپ کب جاتے ہیں اور کہاں جاتے ہیں، اگر تبلا دیجئے تو انتظام آپ کی آسائش اور مہمانداری کا ہو جائے۔

اخبار "دہلی گزٹ" میں ایک اور خط لکھنؤ کا درج ہے اور صاحب خبر رساں فرماتے ہیں کہ یہ حال معتبر ہے یعنی ملک میں امن و چین ہے، عہدہ داران سرکاری کا کسی نے مقابلہ نہیں کیا۔ اکثر مقامات پر رعایا بہت خوش ہوئی اور شکرگزار صرف سپاہی فوج سابق بادشاہ کی دشوار ہے، حساب ان کے مہمل اور مبہم ہیں۔ فوج بادشاہی سرکار انگریزی کی ملازمت کرنے کو تیار ہے۔ مگر پلٹن ہائے نجیب، کہ یہ لوگ ہمیشہ سے اوباش ہیں اور لوٹ کھسوٹ سے اپنا گزارہ کرتے ہیں، البتہ ناراض ہیں۔ سو یہ امراؤں کی شامت ایام میں داخل ہے۔ تمام ملک شاداب اور سیر حاصل ہے۔ دریائے گھاگرہ نہایت سرسبز اکثر قصبات غیر آباد مکانات اور دوکانیں پڑی ہیں اور جو اراضیات بدرجہ غایت سیر حاصل ہیں ان میں تردد کشتکاری نہیں ہوتا۔ بادشاہ اپنی صلاح کاروں کی مرضی کے کاربند ہیں۔ اکثر خوجہ اور مستورات ان کے مشیر ہیں۔ اہالیان دربار شاہی اکثر حضرات کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں۔ مگر بجز نائب ریاست کے اور کسی کو بار نہیں ملتا۔ اول بادشاہ کا ارادہ کلکتہ جانے کا تھا۔ اور کانپور شامیانہ اور خیمہ استادہ ہونے تھے اور آمد آمد کی خبر گرم تھی، مگر اب تک شک ہے کہ بادشاہ کہیں جانے کا عزم کریں گے یا نہیں، ملک میں چار قسمتیں مقرر ہوئی ہیں۔

(۱) خیر آباد (۲) لکھنؤ (۳) گونڈا بہرائچ (۴) فیض آباد

(اخبار کوہ نور لاہور، مطبوعہ ۴ مارچ ۱۸۵۶ء)

واجد علی شاہ بستر علالت پر

غموں اور صدموں نے واجد علی شاہ کی جان پر بنا دی تھی، اور وہ مسند شاہی کی بجائے بستر علالت کو آباد کئے ہوئے ہیں:۔

سنتے ہیں کہ اب اودھ میں انتظام واقعی ہو گیا ہے، بادشاہ بیمار ہیں۔ ابھی علی نقی خاں وزیر بادشاہ کے ساتھ ہم جلیس رہتا ہے۔ لوگ اس بات سے ناراض ہیں، غالب ہے کہ بادشاہ ولایت جانے کا نہ کریں گے۔ گورنمنٹ نے درخواست ان کی منظوری کی ہے، اضلاع بہرائچ اور سلطان

پور کے زمیندار صاحب کمشنر کے روبرو حاضر آئے اور اطاعت اختیار کی۔ ابھی تلسی پور کا راجہ سرکشی کا دم بھرتا ہے۔ صاحب چیف کمشنر نے حکم دیا تھا کہ اپنی توپیں سرکار میں داخل کردو۔ تو اس نے ایک عذر معقول کر دیا ہے وہ سمجھتا ہے کہ میری گڑھی پر فوج سرکار کچھ نہیں کر سکتی اور اس لیے متابعت میں تامل کرتا ہے

(از اخبار کوہ نور لاہور، مطبوعہ ۱۱ مارچ ۱۸۵۶ء)

واجد علی شاہ کے بارے میں افواہیں | واجد علی شاہ ابھی تک لکھنؤ میں مقیم ہیں۔ لیکن ان کے بارے میں طرح طرح کی افواہیں اڑ رہی ہیں اور سارے ملک میں گشت کر رہی ہیں۔

"افواہ ہے کہ کپتان ٹیر صاحب بہمراہی شاہ اودھ کانپور آئیں گے وہاں سے انگلستان کو ان کے ساتھ جائیں گے۔ اخبار دہلی گزٹ سے معلوم ہوا کہ یہ خبر غلط ہے۔ تمام ملک میں خیر و عافیت ہے اور انتظام جنگی اور ملکی روز بروز ترقی پر ہے۔ چند پلٹنیں بادشاہی سرکار کی ملازم ہوگئیں۔ اور انتظام میں مصروف ہیں۔ سب امیر رئیس تعلقہ دار اطاعت کرتے جاتے ہیں۔ اب افواہ ہے، کہ بادشاہ جمعہ کے روز عازم ولایت ہوں۔ اور لوگوں کو بھروسہ ہے کہ وہاں جاکر ناکام نہ آئیں گے۔ مسٹر مکنزی صاحب کو بادشاہ نے بشاہرہ دو ہزار روپے کے اپنا مشیر مقرر کیا ہے۔

(از اخبار کوہ نور، لاہور، مطبوعہ ۱۸ مارچ ۱۸۵۶ء)

ان کے جاتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی حالت | واجد علی شاہ اختر، اختر نگر (لکھنو) سے سدھار گئے اور ان کے جاتے ہی سارے شہر کا نقشہ بدل گیا۔ اب

نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت

نہ اب شاہی نقیب اور چوبدار نظر آتے ہیں، نہ دربار شاہی کا طمطراق اور جاہ و جلال، نہ وہ شاہی دبدبہ ہے نہ طنطنہ، شہر میں اب انگریزوں کا راج ہے اور وہ اپنی میموں کے ساتھ بگھیوں پر اڑتے پھرتے ہیں، شاہی محلات و قصور..... جہاں زندگی اپنی پوری رعنائی کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی تھی۔ اب ویران و سنسان پڑے ہیں، مکان کے دروازے بند اور مکین ندارد!

کوہ نور رقم طراز ہے:۔

"سنا ہے کہ جنرل اوٹرم صاحب بہادر عہدہ چیف کمشنری سے استعفا دیا چاہتے ہیں

کہتے ہیں کہ جنرل اوٹرم صاحب کے واسطے یہ عہدہ غیر مناسب ہے۔ سنتے ہیں کہ سپاہیان پولیس نے شہر میں کچھ ہنگامہ کیا تھا۔ یعنی تنخواہ لینے اور ہتھیار رکھ دینے سے غدر کیا تھا۔ یہ لوگ چار سو بیس تھے۔ مگر مسٹر سمین صاحب بہادر اور کپتان ہنٹر صاحب بہادر اڑتالیس رجمنٹ ہندوستانی اور کوتوال شہر نے جا کر یہ فساد رفع کیا۔ جس وقت کپتان صاحب نے حکم دیا کہ بندوقیں بھر لو اوران سے کہا کہ اب تم پر باڑ چھوڑی جاوے گی تو دب کر چپ ہو رہے۔ فوراً ہتھیار رکھ دیئے اور خاموش زمین پر بیٹھ گئے۔ اگر چند گھنٹے یہ ہنگامہ بند نہ ہوتا تو اندیشہ زیادہ فساد کا تھا کہ بلا فوج کشی اور دفاع ان کا محال نظر آتا اور خونریزی ہو جاتی۔ فوج سرکاری نے آرام کے واسطے چھپر تیار کرنے کی اجازت دے دی ہے۔ بقایا تنخواہ کے کمیٹی جمع ہوئی ہے۔ ایک پلٹن وہاں گئی۔ اگرچہ ابتداً ان کو تنخواہ لینے میں عذر تھا۔ مگر انجام کار دل میں کچھ سوچ کر چکپے سے تنخواہ لے لی اور اب خواہاں نوکری ہیں۔ جنرل اوٹرم صاحب چاہتے ہیں کہ کسی صورت میں سب ملازمان شاہی کو نوکری مل جائے۔ عوام لوگ تبدیل سلطنت سے راضی ہیں۔ صرف چکلہ دار لوگ جن کے پاس ملک کا ٹھیکہ ہے البتہ ناخوش ہیں۔ کیونکہ ان کی معاش میں فرق ہو گیا۔ مگر ایسے تھوڑے آدمی ہیں ایک ان میں سے تلسی پور کا راجہ ہے مگر وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ اب موسم گرمی کا آ گیا ہے اس لئے بندوبست جدید نہیں ہو سکتا۔ جو کچھ یہ لوگ دینا قبول کرتے ہیں وغنیمت سمجھا جاتا ہے۔ مگر آغاز موسم سرما میں صاحب کمشنر دورہ کرنے جاویں گے اور جو قلعہ اور گڑھی وغیرہ سرکشوں کے ہیں ان کو مسمار کر دیں گے۔ یہاں چھوٹے چھوٹے قلعے رئیسوں کے ہیں اور گرد ان کے بانس کے جنگل ہیں اس لئے یہ سب مقامات مسمار کروائیں گے۔

خبر ہے کہ حقیقت میں بادشاہ دریا پار اتر گئے اور کلکتہ کی جانب روانہ ہوئے۔ مگر یہ امر بادشاہ کے حق میں اچھا نہ ہوگا۔ ان کے تعظیم اور توقیر میں فرق آ جاوے گا۔ اب ولایت کے لوگوں کو بھی امرائے ہند کے دیکھنے کا شوق نہیں رہا۔ اول بابو رام موہن رائے اور بعد ان کے دوارکا ناتھ ٹھاکر اور ازاں بعد جنرل جنگ بہادر اور پھر مہاراجہ دلیپ سنگھ جو گئے تھے ان کی البتہ توقیر اور تعظیم ہوئی تھی۔ مگر شاہ اودھ کی عادات ناشائستہ ایسے ایسے مشہور ہیں کہ لوگوں کو ان کے حال پر چنداں توجہ نہ ہوگی۔ لکھنؤ میں بسبب مہاجرت بادشاہ کے بڑی بے رونقی ہو گئی ہے۔ جہاں بازار میں بادشاہی نقیب اور چوبدار اور اہالیان دربار نظر آتے تھے اب ان کی بجائے صاحبان انگریز نظر پڑتے ہیں۔ محل شاہی کہ جہاں تمام شہر سے زیادہ رونق رہتی ہے اور ہزارہا آدمی باشان و شوکت موجود

ہوتے تھے اب خالی نظر پڑتے ہیں، دروازے ان کے بند ہیں، سنسان معلوم ہوتے ہیں، قبل از روانگی کے بادشاہ چند روز کانپور میں مقیم رہیں گے، بہت سے امیر امرار و قدیمی بادشاہ کے پیچھے کانپور میں گئے ہیں، وزیر کا بھی ارادہ تھا مگر صاحب ریزیڈنٹ نے ان کو نہ جانے دیا کہ جب تک تمام حساب کتاب پاک نہ ہو جائے تم کہیں نہ جاؤ، ابھی خبر آئی ہے کہ دریا آباد میں درمیان ایک پلٹن بادشاہی اور زمیندار کی لڑائی ہو رہی ہے، نام اس زمیندار کا جنڈی سنگھ ہے اور تھوڑے عرصہ سے سرکار انگریزی اس سے ناراض ہے، مفصل حال اب تک معلوم نہیں ہوا

(از اخبار کوہ نور لاہور، مطبوعہ ۲۵ مارچ ۱۸۵۶ء)

(۱۱) بے بس بادشاہ

واجد علی شاہ نے لکھنؤ چھوڑ دیا، اب وہ کلکتہ جا رہے ہیں۔ وہاں سے انگلستان کا قصد ہے، تاکہ وہاں اپنا استغاثہ پیش کریں۔ اس آئینہ اقدام کے سلسلہ میں بھی انہیں کسی طرح کی سہولت نہیں دی جاتی، بلکہ رکاوٹیں ڈالی جاتی ہیں:۔

"اخبار سنٹرل اسٹار سے معلوم ہوا کہ شاہ اودھ کانپور میں پانچ بجے صبح کی بتاریخ ۱۴ مارچ تشریف فرما ہوئے، سنا ہے کہ بادشاہ کا ارادہ اپنے وزیروں کو ہمراہ لے جانے کا تھا، مگر جنرل اوٹرم صاحب مارج ہوئے، کوتوال کو حکم دے دیا گیا ہے کہ وزیر علی نقی خاں اور راجہ بالکشن کو لکھنؤ سے نہ جانے دے، یا سوائے اس کے کہ بادشاہ کچھ کاغذات اسناد وغیرہ بطور وجہ ثبوت اپنے مقدمے کے ساتھ لے جانا چاہتے تھے، وہ بھی نہ لے جانے دیئے، اب بادشاہ کہتے ہیں کہ بلا ہمراہی وزراد واقفین معاملہ اور کاغذات کے مقدمہ کی پیروی اور ثبوت کیونکر کریں گے، مگر غالب ہے کہ لارڈ کیننگ صاحب بہادر گورنر جنرل جدید ایسی تجویز کریں گے، کہ جس میں بادشاہ کو حسب دل خواہ موقعہ اثبات مدعا کامل جاوے۔

(از اخبار کوہ نور لاہور، یکم اپریل ۱۸۵۶ء)

فرد جرم بدل گئی

اب تک واجد علی شاہ کی عیش پرستی اور شوق رقص و سرود کا پروپیگنڈا ہو رہا تھا۔ اب یہ الزام واپس لے لیا گیا۔ اس لئے کہ چلنے والی چیز نہ تھی اب ان کی بدانتظامی، غفلت اور وزرار کی نمک حرامی کا ذکر باقی رہ گیا ہے "کوہ نور" لکھتا ہے،

"ایک عنایت نامہ ملک اودھ سے ہمارے پاس پہنچا۔ اس سے معلوم ہوا کہ تھانہ بندی اور چوکیات کا انتظام ہو رہا ہے، مال گزاری کے واسطے یہ تجویز ہوئی ہے کہ بابت بقایا ۱۲۶۳ھ

فصلی بنام قابضان بدستور بندوبست رہے گا اور بعد اس کے بندوبست سرسری تین سال کا تجویز ہوکر تشخیص جمع ہوگی۔ منشی پرسکھ رائے تحصیلدار قصور کو مسٹر سمن صاحب بہادر ڈپٹی کمشنر لاہور کے ہمراہ لکھنؤ گئے تھے۔ بعہدہ تحصیلداری مقرر ہوئے اور منشی موہن لال سابق سررشتہ دار کلکٹری لکھنؤ میں مقرر ہوئے۔ بہت عہدہ دار ملازمان شاہی میں سے بھرتی ہوئے ہیں۔ صاحب خبر لکھتے ہیں۔ کہ بادشاہ اودھ گو شوق ناچ رنگ گانے بجانے کا بہت رکھتے تھے۔ مگر مزاج ان کا بہت حلیم اور متحمل تھا۔ اور ان کی طرف سے کسی نوع کا ظلم بحال رعایا نہیں ہوا۔ ضبطی ملک صرف غفلت کار اور نمک حرامی علی نقی وزیر سلطنت ملقب بخان عالم کے ہوئی۔ اب جہان پناہ ولایت کو تشریف لئے جاتے ہیں۔

(از اخبار کوہ نور لاہور مطبوعہ ۸ اپریل ۱۸۵۷ء)

توڑ پھوڑ تخریب انہدام

قبضہ مکمل ہونے اور تصرف کامل ہونے کے بعد مہذب انگریزوں نے کیسی غیر مہذب۔ ذہنیت اور اطوار کا ثبوت دیا۔ اسے کوہ نور یوں بیان کرتا ہے۔

"صادق آباد کے بڑے معتبر کارسپانڈنٹ اپنی تحریرات مصدرہ پہلی اپریل میں لکھنؤ سے تحریر فرماتے ہیں کہ سرکار انگریزی کا ارادہ ہے کہ دولت خانہ نواب آصف الدولہ مغفور کا منہدم کرکے بجائے اس کے چھاونی ڈالیں اور توپ خانہ دروازہ جنوب رویہ پر رکھا گیا ہے اور چار مکان عالی شان جو تالاب حسین آباد پر واقع تھے۔ ان کے دروازے توڑ پھوڑ کر بند کر دیئے ہیں۔ اور پچ محل کہ ہر ایک ان میں سے عجیب و غریب منظر تھا۔ کھدوانے شروع ہو گئے ہیں۔ اور علی ہذا القیاس فرحت بخش میں بھی ہر چند تمام مکانات میں ابھی کما ینبغی دخل نہیں ہوا لیکن اس عمارت وسیع میں کہ چار کوس کے چکر میں واقع ہے۔ منجملہ بہت سی کوٹھیوں کے کوٹھی تارا میں کچہری مجسٹریٹی اور رجائزہ فوج شاہی کا ہوتا ہے اور جس کوٹھی میں کہ دفتر خزانہ تیاری کا تھا ہفتہ عشرہ سے اس میں کچہری ڈپٹی مجسٹریٹی مقرر ہوئی اور اکثر مقامات میں انگریز فرد کش ہیں۔ اور بعض کارسپانڈنٹ کہتے ہیں کہ لکھنؤ میں گھر بہ گھر ماتم برپا ہے۔ میں نے تخمینا کیا ہے۔ کہ ضبطی اودھ سے سات آٹھ لاکھ آدمی بے چارہ اور بے روزگار ہو گئے۔"

(کوہ نور ۸ اپریل ۱۸۵۷ء)

واجد علی شاہ بنارس میں

آخر کانپور اور الہ آباد ہوتے ہوئے واجد علی شاہ کا لٹا ہوا قافلہ بنارس میں دم لینے کے لئے ٹھہرا۔ "کوہ نور" بتاتا ہے:۔

"صاحب "بنارس گزٹ" تحریر فرماتے ہیں کہ عرصہ ایک ہفتہ سے خبر آمد آمد شاہ اودھ گرم تھی اور ہر صغیر و کبیر واسطے حصول زیارت کے نگراں تھا۔ چنانچہ تاریخ ۱۵ ماہ رواں (اپریل ۱۸۵۶ء) بوقت گیارہ بجے رات کے بہ سواری ڈاک گاڑی ساتھ ختر سوار رونق افروز کوٹھی راجہ کاشی (بنارس) ہوئے اور تمام بودہ شیراز کو چک و بزرگ نے خرید و فروخت آثار سے بہرہ یاب ہو کر ان کی جان و مال کو دعا دی۔

(اخبار کوہ نور لاہور، مطبوعہ ۲۲ اپریل ۱۸۵۶ء)

واجد علی شاہ کے مویشی نیلام کر دیئے گئے

جیسے جیسے انگریزوں کا اقتدار کامل ہوتا گیا۔ ان کی استعاری اور سامراجی ذہنیت کا رنگ نکھرتا گیا "کوہ نور" سے معلوم ہوتا ہے:۔

"اخبار ایسٹرن سٹار" سے واضح ہوا کہ شاہ اودھ نے لینا پندرہ لاکھ روپیہ سالانہ کا اپنے واسطے اور تیرہ لاکھ روپیہ سالانہ واسطے لواحقین اور متعلقین کے قبول کر لیا اور راضی نامہ تحویل ملک کا لکھ دیا۔ مگر اخبار "ایسٹرن ٹائمز" اس خبر کو غلط کہتا ہے۔ ملک اودھ میں کو خبر تازہ نہیں، ہر طرح سے امن ہے۔ بادشاہ کے مویشی وغیرہ نیلام ہو گئے۔ قریب ستر ہزار روپے کا نیلام ہوا۔ سنا ہے کہ کوئی کپتان صاحب جنہوں نے خدمت سرکار سے استعفیٰ دیا تھا، بادشاہ کے وکیل مقرر ہوئے ہیں اور بہت سا روپیہ بادشاہ نے ان کو دیا ہے تحقیق سے معلوم ہوا کہ میجر جنرل اوٹرم صاحب بہادر بسبب بیماری کے بہ صلاح ڈاکٹروں کے رخصت لے کر ولایت یا دریا کو جانا چاہتے ہیں۔ یہ عہدہ ایسا جلیل اور اختیار طلب ہے۔ کہ بہت سے حکام اس کے خواہاں ہیں۔ دیکھئے کس کا اقبال یاوری کرتا ہے۔ اگر رکیس صاحب کے نام یہ عہدہ ہوا تو یقین ہے کہ بہت سے حکام انگریز متعلقہ اضلاع بنگال اور آگرہ اور نیز حکام پنجاب کو جائے شکایت ہوگی۔ کیوں کہ ان صاحب سے کتنے ہی صاحبان عہدہ اور قدامت اور رتبہ میں زیادہ ہیں اور بہت کارگزار بھی ہیں۔ اخبارات سے معلوم ہوا ہے کہ شاہ اودھ ۴ تاریخ کو الہ آباد کے آگے تشریف لے گئے۔ الہ آباد میں بابت کرایہ مکان کے مالک مسافر خانہ سے تکرار ہوئی تھی اخبار انگلش (مین) سے منسبط ہے کہ بادشاہ اودھ کی سواری جس وقت کلکتہ میں پہنچیں گی ...

صاحب خبر لکھتے ہیں کہ شاید ہوتے ہوتے کرسی بھی نہ ان کو دی جایا کرے گی۔"
(از اخبار کوہ نور، لاہور، مطبوعہ ۱۹ اپریل ۱۸۵۶ء)

بادشاہ کا انگریز شکاری

جنرل اوٹرم کا عہد اقتدار آخر ختم ہوا۔ اور وہ بصد حسرت وافسوس لکھنؤ سے رخصت ہو گئے۔ اخبار "کوہ نور" اس حادثہ پر رقمطراز ہے:۔

میجر جنرل اوٹرم صاحب چیف کمشنر بہادر ممالک اودھ لکھنؤ تشریف لے گئے، بنارس تک پہنچنے کی خبر آئی ہے۔ کہتے ہیں کہ ممدوح بہت افسردہ خاطر اور مضمحل ہو گئے ہیں۔ اخبار نویسوں نے لکھا ہے کہ سو شیروں کا شکار کرنے سے اس قدر ضعف ان کے قویٰ میں نہ آتا کہ جیسا کہ ایک بادشاہ کے شکار میں آگیا۔"

(از اخبار کوہ نور، لاہور، مطبوعہ ۶ مئی ۱۸۵۶ء)

بادشاہ پر حقیقت میں جبر ہوا ہے!

جب تک واجد علی شاہ سے حکومت نہیں چھینی گئی تھی، وہ ظالم تھے۔ ان کے اہل کار راشی تھے۔ ان کا انتظام ناقص تھا۔ لیکن جب تخت حکومت ان سے چھین لیا گیا تو رفتہ رفتہ لوگوں نے ..... اپنوں نے بھی اور غیروں نے بھی ..... محسوس کیا اور اعتراف کیا۔ بادشاہ ظالم نہیں تھا۔ ضبطی اودھ قانونی اور اخلاقی ہر اعتبار سے ایک شرمناک اقدام ہے۔ پہلے کہا جاتا تھا۔ بادشاہ کے جانے سے رعایا شاد اور آباد ہو گئی۔ اب اعتراف کیا جانے لگا۔ نہیں پہلے شاد تھی اب ناشاد ہے۔ پہلے آباد تھی، اب برباد ہے۔

"غبر شاہ اودھ" کے نام سے "کوہ نور" میں جو مضمون چھپا تھا۔ وہ اسی حقیقت کا آئینہ دار ہے۔ وہ لکھتا ہے۔

"سنا ہے کہ جب سے شاہ اودھ بنارس سے تشریف لے گئے ہیں، تب سے ان کی کوئی خبر نہیں آئی۔ کلکتہ میں ان کے آنے کا ہر روز انتظار ہے۔ بعض لوگوں کی زبانی سنا کہ حضرت کے واسطے لارڈ کیننگ صاحب بہادر گورنر جنرل جدید نے بارہ لاکھ روپیہ سالانہ کی تجویز کر دی ہے۔ بادشاہ رفتہ رفتہ کلکتہ کی جانب جاتے ہیں اور وہاں ان کے واسطے ایک جہاز کرایہ کا کیا گیا۔ اس میں بیٹھ کر ولایت جائیں گے۔ غالب ہے کہ ان کے پہنچنے کے وقت ملکہ معظمہ تحقیقات ان کے مقدمے کی کرے گی اب بہت لوگوں کی یہ رائے ہے کہ بادشاہ پر حقیقت میں جبر ہوا ہے اور کوئی وجہ معقول ان

کے محروم کرنے کی نہ تھی ایک اخبار نویس ولایت نے ایک مضمون بابت بے قصوری بادشاہ کے بڑی دھوم دھام کا لکھا ہے، خلاصہ اس کا یہ ہے کہ سرکار نے جو اس عذر سے بادشاہ سے سلطنت لے لی ہے کہ وہاں بدنظمی تھی۔ اور یہ بات شرائط صلح کے خلاف ہے، سو حال اس کا یہ ہے کہ سرکار انگریزی کی عملداری میں بھی بہت ظلم ہوئے ہیں، ہر حاکم انصاف پسند نہیں ہوتا۔ اور یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ رشوت ستانی بھی کچھ اہالیان دربار پر ختم نہیں، بلکہ تمام ملک ہند میں اہالیان سرکار انگریزی بھی رشوت لیتے ہیں اور مرتشی مشہور ہیں، پس اگر بادشاہ کے اہل کار بھی مرتشی تھے تو کیا بڑی بات تھی اور رعایا کے رفاہ کا یہ حال ہے کہ وہاں کے لوگ پہلی سلطنت سے زیادہ خوش تھے اور خراج بھی کم لیا جاتا تھا۔ اب ارادہ سرکار انگریزی کا بڑھا دینے کا ہے۔ تو وہ نفع بھی جاتا رہا، سوائے اس کے یہ بات تمام صاحبان میں روشن ہے کہ شاہ اودھ اور ان کے مورثوں نے سرکار انگریزی کے ساتھ کیا کیا مدد کی ہے اور کیسے کیسے وقت میں کام آئی ہے ...... اس کا نتیجہ یہ نکلا سابق میں ایک گورنر جنرل لارڈ ہنگٹن صاحب نے ملک اودھ سے اس قدر مال رشوت کا لیا تھا کہ ان کے نام ولایت میں نالش ہوئی تھی اور صاحب موصوف کی بڑی بدنامی ہوئی تھی"

(از اخبار کوہ نور لاہور مطبوعہ ۱۳ مئی ۱۸۵۶ء)

ضبطی اودھ کا معاملہ پارلیمنٹ میں

ضبطی اودھ کے سلسلے میں برطانوی پارلیمنٹ میں جو مباحثہ ہوا اس کی کیفیت:۔

"در بارہ ضبطی اودھ جو جلسہ گزشتہ پارلیمنٹ میں مباحثہ ہوا۔ اس کا ترجمہ از روئے اخبار ٹیمس[1] ۲۳ فروری ۱۸۵۶ء جو کیا گیا بجنسہٖ ملاحظہ ناظرین کے لئے درج ہے۔

"در باب ضبطی سلطنت اودھ"

مسٹر انوی (رکن پارلیمنٹ) نے کہا کہ اراباب گورنمنٹ انڈیا ممالک اودھ کے واسطے جو نیت رکھتے تھے، سو چند روز بیشتر لوگ انواع و اقسام سے مشتہر کرتے تھے:۔

اول مشہور ہوا کہ اس ملک کے مہمات کو جنرل اوٹرم صاحب رزیڈنٹ لکھنؤ بذریعہ اچھا انتظام و انصرام کریں گے، من بعد یہ کہ اس ملک کو ضبط کریں گے۔ اب کہتے ہیں کہ بادشاہ اودھ

---

[1] ٹائمز۔

کردیں چنانچہ یہی قرارداد ۲۱ نومبر گزشتہ کو لارڈ موصوف کو لکھ کر بھیج دی۔ اب تو یہ مقدمہ اس صورت پر ہے کہ جس وقت کہ جواب مصرحہ ومفصل گورنر جنرل کے پاس پہنچے گا اور باہم کہ مراسلات ختم ہوجاویں گے۔ تو ان کو اس جلسہ میں پیش کروں گا۔ دوسرے سے سوال وجواب یہ کہتا ہوں کہ مجھے معلوم نہیں کہ سکنہ اودھ کے ہماری حکومت وعلاقہ میں آنے کی تمنا کے لئے عرائض گزری ہیں یا نہیں ؟

مسٹر سری بری (یعنی ایک رکن پارلیمنٹ) نے کہا کہ اظہار آنریبل جنٹل مین سے ہرگز تشفی نہیں ہوتی ہے اور یہ تو اظہر من الشمس ہے کہ چند سال کی مدت سے لارڈ ڈلہوزی آئین اور تازہ درباب تدابیر مدتی قرار دے کر اس پر عمل پیرا رہتا ہے۔ اور وقت تعجیل عمل بالکل تامل وحیص بیص نہیں کرتا ہے۔ بلکہ مسٹر رو بک (یعنی رکن پارلیمنٹ) نے ارکان ہاؤس کو یوں متنبہ کیا کہ افواہ عام ہے کہ ملک ہند میں رواج ظلم وستم بہت ہے۔ سو یہ بھی بے اصل وغیر صحیح ہے :

(از اخبار کوہ نور لاہور مطبوعہ ۲۰ مئی ۱۸۵۶ء بہ حوالہ صبح صادق، مدراس)

کو معزول کر کے ملک اس کا ممالک انگریزیہ واقع ہند سے ملحق کیا جاوے۔ رکن مذکور نے یہ بھی کہا کہ بالفعل میں نہیں چاہتا ہوں کہ اس مقدمہ میں کچھ گفتگو و بحث تکرار کروں یا در باب تعلق گورنمنٹ انڈیا جو وہاں کے روسا کے ساتھ ہے، حرف رکھوں۔ لیکن اتنا کہتا ہوں کہ سکریٹری گورنمنٹ ہند نے جو ۱۸۱۶ء میں بذریعے مراسلات میجر بیلی صاحب کو جو اس وقت کے ریزیڈنٹ تھے لکھا کہ مبلغ کروڑ روپیہ اودھ کے نواب سے قرض لیا جاوے، کس لئے کہ گورنمنٹ مبتلائے تصدیعہ مالایطاق تھی۔ بدوں قرضہ کے رہائی تصدیعہ وبلائے سے متصور نہیں۔ ریزیڈنٹ نے درجواب لکھا کہ بدقت و محنت تمام پچاس لاکھ روپیہ حاصل کیا ہے۔ لیکن حضور کو اشتباہ خاطر ہوا۔ اس لئے کہ بعض لوگوں نے ذہن نشین حضور کیا ہے کہ مقصود اس قرضہ کشی سے غارتی زر نقد حضور ہے۔ جب دیکھیں گے کچھ زر خزینہ سرکار میں باقی نہ رہے گا، تب تسخیر ملک پر مائل ہوں گے۔

غرض اظہار اس کا امر ضروری ہے کہ جو مبلغ کہ بدفعات بادشاہ اودھ بہ سبیل قرض لئے سو پھر ادا نہیں کر سکے۔ اب میں چاہتا ہوں کہ ان ابواب میں کلام کو طول نہ دوں اور میر محفل بورڈ آف کنٹرول سے فقط ایک دو سوال کر کے اکتفا کرتا ہوں کہ آیا لارڈ ڈلہوزی کو واسطے ضبط ملک شاہ اودھ کے باختیار ان کے ملا دینے ملک انگریزی میں حکم روانہ ہوا تھا؟ یا مردم ملک اودھ نے ہمارے علاقہ اور حکومت کے تابع ہونے کی خواہش و تمنا کی تھی؟ اور یہ بھی پوچھتا ہوں کہ آیا ان مقدمات کے لئے جو معاملات ظہور میں آئے، سو وہ روبکار اس جلسے کے ہو دیں گے یا نہیں۔ مسٹر ڈی اسمتھ میر محفل بورڈ آف کنٹرول نے کہا کہ روبکاری کسی ایک مقدمہ کے مراسلات کی جب تک انصرام تمام اس کا نہ ہووے، خلاف عادت ہے۔ پچاس سال کی مدت سے حالات مملکت اودھ اس عنوان سے قرار پذیر ہیں کہ باعث تحصیل و تفکر خاطر اہل گورنمنٹ آف انڈیا ہوئے ہیں چنانچہ ایام تا لبستان گزشتہ میں بد انتظامی ملک اودھ اس حد کو پہنچی تھی کہ جنرل اوٹرم صاحب نے گورنر جنرل کی خدمت میں اس مضمون کی رپورٹ کی کہ بحال رکھنا بد انتظامی امور کا اس سے زیادہ محالات سے ہے، اس رائے سے جنرل اوٹرم کی گورنر جنرل نے ارباب گورنمنٹ ولایت کو اطلاع دے کر لکھا کہ میری رائے یہ ہے کہ تباہ حالی ملک اودھ اختتام و اتمام کو پہنچانا چاہیئے۔ اب گورنر جنرل کے خط کو ارباب گورنمنٹ آف ڈائریکٹر اس دربار گورنمنٹ ملکہ محترمہ نے مشورہ و تجویز لاکر بعد رد و بدل بسیار مباحثہ و تکرار بے شمار یہ بات قرار دی کہ نظر بنام وری و تجربہ کاری لارڈ ڈلہوزی کے یہی انسب و احسن ہے کہ امور مملکت اودھ ان کی رائے و اختیار پر سپرد

باب (۱۱)

واجد علی شاہ کا دور جلاوطنی

واجد علی شاہ لکھنؤ میں حاتم دوراں تھے، سکندر صولت اور دارا حشمت تھے، کیواں بارگاہ اور خسرو مرتبت تھے، والا جاہ اور کجکلاہ تھے، شاہ زمن اور شہنشاہ دوراں تھے، ان کے ایک اشارہ چشم پر دوسروں کی قسمتیں بنتی اور بگڑتی تھیں، جسے نگاہ لطف سے دیکھ لیا، وہ شاداں و نہال ہوگیا جس پر نگاہ عتاب پڑ گئی خسر الدنیا کا نمونہ بن گیا، شاعروں کی تمنا یہ تھی کہ بادشاہ ذی جاہ کے دامن دولت سے وابستہ ہو جائیں، عالم اس فکر میں تھے کہ بادشاہ سلامت کے معتمد بن جائیں فنکاروں کی معراج یہ تھی کہ دربار شاہی میں پہنچ جائیں، دور و دراز مقامات کے تاجر مال تجارت سے لدے پھندے، لکھنو پہنچتے تھے کہ بادشاہ عالم و عالمیاں کے قصر فلک رفعت میں کسی طرح اذن باریابی حاصل کریں اور مالا مال ہو کر واپس جائیں، سپاہیوں اور افسروں، وزیروں اور امیروں مہاجنوں، اور ساہوکاروں، دولت مندوں اور سرمایہ داروں کا یہ عالم تھا کہ لڑکھڑاتے ہوئے لرزتے ہوئے کانپتے ہوئے، باادب باملاحظہ، ہوشیار کی آوازوں کے شور میں ظل اللہ کے سامنے حاضر ہوتے تھے، اور اپنی زندگی کی سعادت یہ سمجھتے تھے۔ کہ ان کے ایک اشارۂ چشم پر اپنی جان قربان کردیں۔

لیکن واجد علی شاہ اور ان کا دور حکومت،

خوش درخشید و لے شعلۂ مستعجل بود

ثابت ہوا دس سال کی مدت میں، سارا جاہ و جلال قصۂ ماضی بن گیا، انگریزوں نے حکومت چھین لی، بادشاہ سلامت ایک "معزز" شہری بن گئے، لیکن "معزز" لوگ بھی خطرناک ہو سکتے ہیں۔ ان کے وجود سے خطرہ محسوس ہوا۔ کچھ ان کا بھی جی نہ لگا، اور

در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں

خوش رہو اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

کہتے ہوئے کلکتے سدھارے،

واجد علی شاہ کی کلکتہ کی زندگی کے بارے میں سب سے زیادہ مستند بیان مولانا عبدالحلیم شرر کا ہو سکتا ہے۔ جو آغاز شباب تک وہاں مقیم رہے۔ اور اپنی آنکھوں سے بادشاہ کی نقل و حرکت، رفتار و گفتار، اور حالات کا مطالعہ و مشاہدہ کرتے رہے۔ انہوں نے مٹیا برج کی جو کہانی سنائی ہے۔ وہ مستند ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ بھی ہے۔ اور عبرت انگیز بھی۔ اس کے چند خاص اجزا ذیل میں درج کرتے ہیں۔ ان سے واجد علی شاہ کے دور جلاوطنی کا ایک مکمل نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ جو پکار پکار کر کہہ رہا ہے۔

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو۔

معزولی حکم

اگرچہ ساری رعایا خوش تھی ہر مذہب و مذاق والے مطمئن تھے اطراف مملکت کے تمام ہندو مسلمان امرا اور زمیندار جان فدا کرنے کو تیار تھے۔ مگر انگریزی ریذیڈنٹ صاحب ناراض تھے اور ان کی نظر قہر آگیں تھی اہل فوج تمام قوت والے ملکی رئیس راجہ اور ٹھاکر لڑنے اور کٹنے پہ تیار تھے مگر بادشاہ نے لڑنا ناپسند کیا اور اطاعت و اعتقاد کا معاوضہ یہ ملا کہ محض صاحب ریزیڈنٹ کی رپورٹ پر (جو ممکن تھا کہ کسی بدنیتی پر مبنی ہو) ان کے ملک پر قبضہ کر لینے کا حکم ہو گیا۔

بادشاہ کو یہ حکم سنایا گیا تو انہوں نے بہت کچھ عذر و معذرت کی خوشامد کی اور جب کسی طرح سماعت نہ ہوئی تو آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اپنی مصیبت پر ہر شخص روتا ہے۔ مگر بادشاہ کا رونا بھی قابل مضحکہ سمجھا گیا اور تاریخوں میں مثبت ہو گیا کہ "شاہ اودھ بچوں کی طرح رونے لگا" (جان عالم صفحہ ۱۱)

لکھنؤ سے رخصت ہونے کا منظر

آخر بادشاہ نے ارادہ کیا کہ لندن جا کر دربار انگلستان میں فریاد کریں ایک مخصوص گروہ کے ساتھ جس میں والدہ محترمہ ایک بھائی محلات عالیات ولی عہد اور مخصوص ارکان دولت اور ملازمین تھے کلکتہ کا ارادہ کر کے لکھنؤ سے روانہ ہوئے چلتے وقت یہ شعر

در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
رخصت اے اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

پڑھا تو سننے والوں کے کلیجے پاش پاش ہو گئے اور کون تھا جو زار قطار نہ رو رہا ہو۔ واجد علی شاہ تو چلے گئے مگر ان کی یاد شہر کے ہر مرد و زن کے قلب و جگر پر تیر و خنجر کا کام کر رہی تھی ان کے فراق پر غزلیں تصنیف ہو گئیں، گیت بنائے گئے، بھاٹوں نے اپنے مذاق کی نظمیں گلیوں گلیوں پھر کے سنانا شروع کیں اور کوئی گھر نہ تھا جس میں عورتیں وہ غزلیں نہ گا رہی ہوں جس کا ایک شعر یہ تھا ؎

واجد علی پیارا کلکتہ کو سدھارا
سڑکیں نکل رہی ہیں سونی گلی گلی ہے

کلکتہ پہنچ کر سلطان عالم ہجوم رنج و الم سے بیمار پڑ گئے ہمراہی اطبا نے مشورہ دیا کہ آپ یہیں ٹھہر جائیں اور عرضی دے کر اپنی والدہ اور ولی عہد کو مع اپنے ایک مختار عام کے لندن روانہ فرمائیں اسی پر عمل ہوا۔ (ص ۲۱-۲۲)

کلکتہ کی زندگی

بادشاہ کو جانوروں کا شوق تھا اور رستے میں بہت سے جانور جمع ہو گئے تھے۔ ان کی دانہ خوری سمار الدولہ کے سپرد تھی انہوں نے ایسی لاپرواہی کی تین روز تک جانوروں کو دانہ نہ ملا بادشاہ بوچہ پر سوار سیر کو گئے تو سب جانور ہر طرف سے دوڑ کے بوچے کے گرد شور کرنے لگے۔ بادشاہ نے سبب پوچھا تو کسی جانور باز نے عرض کیا کہ جہاں پناہ ان کو تین دن سے دانہ نہیں ملا ہے۔ بادشاہ نے فوراً دانا منگوا کر اپنے سامنے ڈلوایا اور سب جانور اس پر بے تابی سے ٹوٹ پڑے۔ (ص ۲۳)

مرزا رمضان بیگ

اسی وقت سے بادشاہ نے جانور خانہ ایک نئے شخص مرزا رمضان بیگ کے سپرد کیا جو لکھنؤ کے ایک ہندو رئیس رائے دلارام کے بیٹے تھے۔ رمضان بیگ کو منشی السلطان بہادر کا خطاب تھا تمام قلم اور محرر چاہے کسی دفتر میں کام کرتے ہوں انہی کے ماتحت تھے اور ان کی برطرفی بحالی ان کے سپرد تھی۔ وہ سنی المذہب بڑے دیندار روزے نماز کے پابند اور بڑے لسان و بذلہ سنج تھے بادشاہ کو ان کی باتوں میں بڑا مزہ آتا تھا۔ اور اکثر اوقات کو گاڑی پر سوار ہو کر اپنی کوٹھیوں کے باغوں میں گشت لگاتے تو منشی السلطان کو خواصی میں بٹھا لیتے (ص ۲۴)

ملکہ نواب محل

بادشاہ کی پہلی محترم ملکہ نواب خاص محل تھیں۔ ان کا تخلص عالم تھا۔ وہ اچھی شاعرہ تھیں ان کا دیوان چھپ چکا تھا۔ اور اس کی اکثر غزلیں

عوام کی زبان پر تھیں۔ (ص ۲۶)

بادشاہ کی وضع

بادشاہ کی وضع یہ تھی کہ بڑے بڑے بال تھے جن کا پیچھے کی طرف جوڑا باندھ لیتے بڑی بڑی کھڑی مونچھیں اور منڈی ہو داڑھی چندیا پر ایک چھوٹی سی نکے دار بھاری ٹوپی گلے میں جامدانی یا ململ کا چست انگرکھا اس کے نیچے سے نہ کرتا ہوتا نہ شلوکہ بائیں جانب کی چھاتی کھلی رہتی پاؤں میں پرانی وضع کا عرض کے ڈھیلے پائنچوں کا برکا پائجامہ، جاڑوں میں کوئی شال رومال کندھوں پر ہوتا لیکن محلات اور باغات شاہی سے باہر نکلتے تو سر پر کوئی شالی پٹیا باب لپیٹ لیتے اس کے ساتھ سچے کام کا گھتیلا جوتا پہنتے۔ (ص ۲۷)

لارڈ میئو کی بدتمیزی

۱۸۷۱ء کا واقعہ ہے کہ گورنر جنرل بہادر لارڈ میئو نے جو ہندوستانیوں کے حال پر بڑے مہربان تھے۔ بادشاہ سے ملنا چاہا پہلے وہ خود ہی بادشاہ سے ملنے کو آئے اور بادشاہ سے مل کر خوش ہوئے دوسرے دن بادشاہ ان کی بازدیدکی ملاقات کو گورنمنٹ ہاؤس میں تشریف لے گئے وہاں تخت گاہ کے کمرے میں لارڈ میئو نے پہلے بادشاہ کے برابر کرسی پر بیٹھ کر ان سے باتیں کیں اور تھوڑی دیر کے بعد خدا جانے کیا دل میں آیا کہ اپنی کرسی سے اٹھ کر بغیر رخصت ہوئے واپس چلے آئے اور اس کے بعد سے پھر کبھی کسی انگریز سے نہ ملے۔ (ص ۲۸ - ۲۹)

مہاراجہ بنارس کی ملاقات سے انکار

مہاراجہ بنارس جنہوں نے بادشاہ کو کلکتہ جاتے وقت اپنا مہمان کیا تھا اور حق عقیدت ادا کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی پرنس آف ویلز کے دربار میں شریک ہونے کے لئے کلکتے آئے وہاں وہ وزیر السلطان نواب امیر علی خان سے ملے ان کو بادشاہ کے ملاحظہ میں پیش کرنے کے لئے اپنی ایک عرضداشت دی اور زبانی کہا میں اپنی حقیقی سرکار جہاں پناہ ہی کو سمجھتا ہوں لہذا مجھے جتنی مسرت ان کی باریابی میں ہو گی اور کسی بات میں نہیں ہو سکتی اس کے علاوہ میرے پاس چند قیمتی جواہرات بادشاہوں کے قابل ہیں چاہتا ہوں انھیں بادشاہ کی نذر کردوں وزیر السلطان نے ان سے ملا دینے کا وعدہ کر لیا اور خود حاضر ہو کر عرض کیا کہ مہاراجہ کو باریابی کی بڑی تمنا ہے، بادشاہ نے ہوں ہاں کر دی اور وزیر السلطان یہ سمجھ کر کہ بادشاہ قبول کر لیں گے واپس آ گئے مگر جب مہاراجہ کی وہ عرضداشت دستخط ہو کر واپس آئی تو اس کی پیشانی پر لکھا تھا

حسب دستور سابق وزیر السلطان بہادر ملاقات نماید۔ شاہی میں معمول تھا کہ باہر کے راجہ مہاراجہ اور تعلقدار جو ملنے کو آتے انھیں صرف وزیر السلطنت کی باریابی نصیب ہوتی اسی بنا پر بادشاہ نے یہ حکم لکھا دیکھتے ہی وزیر السلطان کے ہوش اڑ گئے اور دوسرے روز جا کر عرض کیا کہ جہاں پناہ نے مہاراجہ کی بڑی دل شکنی فرمائی ارشاد ہوا وزیر السلطان بہادر مہاراجہ بنارس کے مجھ پر بڑے حقوق ہیں اور میں اس سے ضرور ملتا مگر کہتے ہو کہ وہ کچھ جواہرات نذر کرنا چاہتا ہے اب خیال کرو کہ اگر میں اس کی نذر لوں تو ضروری ہے کہ اس سے زیادہ قیمت کا خلعت بھی اسے دوں مگر ہمارے پاس کیا رکھا ہے جو اسے دیں اس سے بہتر یہ ہے کہ اس کی ملاقات کو ایک اچھے عنوان سے ٹال دیا جائے۔ (ص ۳۰-۳۱)

بادشاہ کی شان محبوبیت بادشاہ نہایت ہی متواضع منکسر المزاج تھے وضع سادگی اور باتوں میں نہایت بھولے پن کے ساتھ عجیب قسم کی دلکشی تھی جس سے وہ باتیں کیں گرویدہ ہو گیا کبھی کسی اعلیٰ و ادنیٰ ملازم، ادنے طبقہ کے نوکر چاکر خادم یا خادمہ کو نہ گالی دی نہ برا بھلا کہا فحش اور سخت الفاظ ان کی زبان ہی پر نہ تھے جس سے ملتے ایسی بے تکلفی سے باتیں کرتے کہ اس کا دل کھنچنے لگتا اور بجائے ہیبت و رعب کے اس میں محبت و جاں بازی کے جذبات پیدا ہو جاتے اس کی ہمت بڑھتی حوصلہ زیادہ ہوتا۔ جس کسی سے ناراض ہوتے چپ ہو جاتے اور کبھی عجیب انداز سے ادب آموزی فرماتے (ص ۳۲)

ممتوعات کی کثرت اور اس کا سبب بے شک ممتوعات کی کثرت تھی اور بادشاہ پر جو فرد قرار داد جرم لگائی گئی ہے اس میں سب سے زیادہ سنگین یہی جرم تصور کیا جاتا ہے اس پر کوئی شرعی الزام تو آ ہی نہیں سکتا اس لئے کہ بادشاہ مذہب شیعہ اثنا عشری کے پیرو تھے لہٰذا ان کے اعتقاد میں متعہ بغیر کسی حد اور قید کے شرعاً جائز تھا جس عورت کے ساتھ متعہ ہوتا اس سے خود قبلہ و کعبہ تشریف لے جا کر دریافت کر کے اطمینان کر لیتے کہ اس کے ساتھ متعہ جائز ہے بعد ازاں وہی متعہ کراتے اب رہا یہ کہ اخلاقی اور تمدنی حیثیت سے بادشاہ کو اتنی عورتوں سے متعہ کرنے کی کیا ضرورت تھی اس کی حالت یہ ہے کہ بادشاہ نہایت ہی محتاط اور پرہیزگار تھے اور مٹیا برج کی زندگی میں انہیں ایک گھڑی کے لئے گوارا نہ تھا کہ کسی نامحرم عورت پر ان کی نظر پڑے مگر شاہی محل تھا جس میں پیش خدمتوں محلداروں

مغلانیوں، مکان داتیوں یہاں تک کہ بہشتنوں اور خاکروبوں کے ایک گروہ کثیر کے موجود رہنے کی ضرورت تھی ممنوعات میں چند ہی تھیں جن کے ساتھ خلوت گاہ میں داخل کرنے کی غرض سے متعہ کیا گیا ہو سب خدمت گارنیاں تھیں۔ (ص ۳۵-۳۶)

ممتوعات کے خطابات

معترضین نے اس بارے میں بادشاہ کی حالت پر غور نہیں کیا، اس لئے کہ ممتوعات کی کثرت نوان کے اتقاء اور پابندی شرع کی دلیل تھی اور اتقاء بھی ایسا جیسا کہ معمولی مسلمانوں میں کم دیکھا گیا ہے تمام بادشاہان اسلام کی نسبت آپ سنتے ہیں کہ ان کے محل میں چند بیویوں کے ساتھ ہزاروں کنیزیں بھری ہوئی تھیں بنی امیہ بنی عباس اور بنی فاطمہ خلفا کے حریم خلافت کا یہی حال تھا، سلاطین آل عثمان کے محلوں کی یہی کیفیت تھی شاہان مغلیہ ہند کی حرم سراؤں کا یہی رنگ تھا اور اگرچہ بردہ فروشی ممنوع اور جائز کنیزوں کی فراہمی سلسلہ مسدود ہو گیا، مگر ہندوستان کے مسلمان والیان ملک کے محل اور زنان خانے اسی طرح بے شمار عورتوں سے بھرے ہوئے ہیں جن کے جائز اور ناجائز ہونے کا کبھی خیال بھی نہیں آتا، لہٰذا واجد علی شاہ نے شرعی پہلو کی نگہداشت کے ساتھ اپنا شوق پورا کیا تو کون اعتراض کر سکتا ہے، انہیں ممتوعات میں بھنگن تھی جو کپڑے کی چادر سے آبدست کرایا کرتی اور دو بہشتنیں تھیں جو پانی ڈالتیں اول الذکر کو ممتوعہ بنا کر نواب مصفا بیگم اور دوسری کو نواب آبرسان بیگم کا خطاب دیا تھا۔ (ص ۳۸)

شوق عمارات و باغات

عمارات اور باغوں کا بڑا شوق تھا اور ان کی تعمیر و تکمیل میں ایسی جدت طرازیاں کرتے کہ دیکھنے والوں کو حیرت ہو جاتی نازک مزاجی اس درجہ تھی کہ بارہا ایسا اتفاق ہوا کہ عمارات اہتمام سے بنوائی، تیاری کے بعد کج یا بدنما نظر آئی اور اسی وقت کھڑے کھڑے مالیوں کو بلوا کر کھدوا ڈالی اور پھر بنوائی چمنوں کی ترتیب اور روشوں کے قائم کرنے میں ایسی مناسب تشکلیں اور ترتیبیں قائم کرنے کے سالانہ میلے کے موقعہ پر بڑے بڑے انگریز انجینیر آکر متحیر ہوتے اور پوچھتے کہ یہ ڈیزائن کس کا ہے اور جب بتایا جاتا کہ خود بادشاہ نے اپنی طبیعت سے بنوایا ہے تو حیران رہ جاتے اور کہتے معلوم ہوتا ہے وہ ڈرائنگ اور ڈیزائن بنانے کے بہترین استاد ہیں۔ (ص ۳۹)

سانپوں سے شوق

ایک کوٹھی شہنشاہ منزل بنوائی جس کے دیواروں کے اوپر کے سرے تاج کے پتوں کی طرح آگے کو جھکے ہوئے تھے، اس نے ایک

خاص صورت پیدا کردی تھی اس کے آگے سانپوں کے لئے کوٹھی کے طول کے برابر ایک قد آدم گہرا حوض کھدوایا اس کے چاروں طرف کی دیواریں خوب گھٹوا کے اور چکنی کرا کے اوپر کے سرے آگے کو کانس کی طرح جھکوا دیئے پھر اس کے اندر ہر طرف سے دو دو گز کا فاصلہ چھوڑ کر ایک مصنوعی پہاڑ بنوایا جس کے اندر سینکڑوں مٹی کی نالیاں رکھیں جو نیچے سے اوپر تک ہر طرف دوڑتی اور چکر کھاتی ہوئی باہر نکلتی تھیں ایک طرف ایک خط کاٹ کر آبشار جاری کیا تھا کہ نل کھولتے ہی پانی کی چادر گرنے لگتی نیچے پہاڑ کے دامن میں چاروں طرف ایک پتلی سی موہری بنائی گئی۔ جس میں صاف پانی بھرا رہتا۔ تیاری کے بعد اس میں ہزاروں دہامنیں چھوڑ دیں یہ بڑے بڑے ڈیڑھ ڈیڑھ دو دو گز کے سانپ ایک بل سے دوسرے بل میں سے اندر جاتے اور باہر نکلتے رہتے ان کی غذا کے لئے ہزاروں مینڈک پکڑ پکڑ کر روز چھڑوائے جاتے مینڈک اس موہری میں بھاگتے اور سانپ دوڑ دوڑ کر ان کا شکار کرتے اور بڑا تماشا نظر آتا اس کے مہتمم اور مار پروروں کے داروغہ مرزائی نام ایک شخص تھے جن کو سانپوں کے پکڑنے اور رکھنے کی بہترین اور خاص قابلیت حاصل تھی ان کے پاس تانبے اور مٹی کے ظروف میں بہت سے کالے اور رنگ رنگ کے چھوٹے اور بڑے زہریلے سانپ بھی رہا کرتے جن کا راتب مقرر تھا۔ اور جس قسم کے سانپ چاہیئے ان سے منگوا کر دیکھ لیتے (ص ۱۴۱، ۱۴۲)

شاہی کوٹھیوں کے نام

کلکتہ میں انھوں نے بیسیوں کوٹھیاں بنوا ڈالیں سلطان خانہ مرصع منزل اور اسد منزل تو برٹش گورنمنٹ سے ملی تھیں ان کے علاوہ بیسیوں کوٹھیاں انھوں نے بنوائیں یا خرید لیں جن کا سلسلہ میلوں تک چلا گیا تھا ان میں چند کوٹھیوں کے نام جو مجھے یاد ہے ان کو پیش کرتا ہوں۔

نور منزل ہیری منزل، تہنیت منزل، شہنشاہ منزل، عدالت منزل قصر البیضا گوشہ سلطانی رہ ایک کوشک نما بنگلہ تھا، آسمانی، بادامی تفریح بخش (ص ۴۳)

نازک دماغی اور نفاست پسندی

بادشاہ کی نازک دماغی اور نفاست پسندی کی یہ حالت تھی کہ کلکتہ میں گیس کی روشنی کو دور سے دیکھ کر پسند کیا تھا حکم ہوا کہ ساری کوٹھیوں میں گیس کی روشنی کی جائے گیس کا سلسلہ مٹیا برج تک نہ تھا لہٰذا تقریباً تین لاکھ کے صرف سے مرصع منزل کے پھاٹک کے باہر ایک فرلانگ سے ہو گیا۔ باغات شاہی کے چاروں طرف گیس کی لالٹینیں قائم ہو گئیں، پہلے ہی دن روشنی ہوئی اور بادشاہ

حسبِ معمول گاڑی پر سوار ہو کر گشت کو نکلے تو فرمایا بھئی روشنی تو آنکھوں میں گھسی جاتی ہے اور گشت کو ملتوی کر دیا۔ دوسرے دن لالٹینوں پر سبز شیشے چڑھا دیئے گئے دوسری رات نکلے تو سبز شیشے چڑھا دیئے گئے دوسری رات نکلے تو سبز شیشوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے، مگر دو ہی چکر لگائے ہوں گے کہ یکایک ناک سکوڑنا شروع کی پھر ناک بند کر لی اور فرمایا اس میں تو بڑی بو آتی ہے میں ایسی روشنی نہیں برداشت کر سکتا، غرض دو تین لاکھ کا کارخانہ بالکل بیکار ڈال دیا گیا اور جب میں مٹیا برج سے آیا ہوں بڑا خراب ہو رہا تھا اور پرزوں میں زنگ لگ رہا تھا۔ (ص ۴۴)

دعوت قبول کرنے کا انوکھا انداز

ایک معمول یہ تھا کہ معززین دربار میں جس کسی کا جی چاہتا سال میں ایک دن جہاں پناہ کی دعوت کرتا اس دعوت کی شان یہ تھی کہ کھانا تکلف سے پکواتے اور خوانوں میں لگا کے امکانی اہتمام کے ساتھ ملاحظہ میں بھیج دیا جاتا اور بادشاہ اسے تناول فرماتے لیکن شاہی باورچی خانے میں اس روز جو کچھ پکتا وہ دعوت کرنے والے کے وہاں بھیج دیا جاتا معمولاً دعوت کا کھانا ہزار زیادہ ہو مگر محدود ہوتا اور اس کے معاوضہ میں شاہی باورچی خانے کا جو کھانا ان کو ملتا اقسامِ اطعمہ اور الوانِ نعمت کے اعتبار سے اتنا خوش ذائقہ ہوتا کہ ویسا کھانا یوں ان کو کبھی نصیب نہ ہوتا اور اتنا زیادہ ہوتا کہ محلہ بھر کھاتا۔ (ص ۴۵)

جانور خانہ

شاہی جانور خانہ اتنا عجیب ہوتا کہ ویسا شاید اب ہمیں کہیں نظر نہ آئے گا نور منزل ایک کوٹھی بادشاہ نے دریائے بھاگرتی سے سو دو سو گز کے فاصلے پر خاص اپنے اہتمام سے بنوائی تھی اس سے ملا ہوا ایک تالاب تھا جس کے چاروں طرف پختہ زینے بنوا دیئے گئے تھے تالاب کے اس پار نور منزل کے مقابل ایک بڑا کٹہرا تھا جس میں شیر ببر رہتا اور جب وہ گرجتا تو سارے مٹیا برج میں اس کی آواز گونج جاتی اور کوٹھی اور تالاب کے گرد ایک بڑا کمپونڈ چھوڑ کے آہنی کٹہرا نصب کر دیا تھا اور ایک طرف اس کمپونڈ میں ایک نہایت نازک اور خوبصورت آہنی بنگلہ تھا۔ اس کمپونڈ میں دنیا بھر کے چرند پرند لا کے چھوڑ دیئے گئے تھے، ہرن اور چکارے چوکڑیاں بھرتے پھرتے بارہ سنگھے متانت سے ٹہلتے پھرتے، سارس، قازیں، بگلے، ہنس مور وغیرہ ادھر ادھر پھرتے یا تالاب کے کنارے ایک ٹانگ اٹھائے گھنٹوں کھڑے رہتے کٹہروں میں وحشی جانور اور درندے رکھے گئے تھے، جن میں سیار، بھیڑیئے، کینگرو وغیرہ بند تھے، کینگرو

کا بچہ ماں کے پیٹ سے نکل کر ٹہلتا اور جہاں کسی نے دھمکایا دوڑ کر پھر ماں کے پیٹ میں گھس جاتا۔ چھوٹے ہوئے پرندوں میں بیسیوں شتر مرغ اور کشوری تھے جو پتھر کے بڑے بڑے روڑے اور لوہے کے ہتھوڑے تک بلا تامل نکل جاتے کئی ایک بڑے بڑے کچھوے چھوٹے پھرتے تھے جو زیادہ تر خشکی میں رہتے اور جب جی چاہتا پانی میں چلے جاتے یہ کچھوے بھاری سے بھاری بوجھ اٹھا لے جاتے وہاں کے تمام لوگوں میں سب سے موٹے منشی السلطان تھے جن کا بوجھ پانچ چھ من سے کم نہ ہو گا۔ بادشاہ نے ایک دن ان کو کچھوے کی پیٹھ پر بٹھا دیا اور وہ بے تکلف اپنی معمولی چال سے تالاب کے کنارے تک اٹھا لے گیا۔ (ص ۴۶-۴۷)

چیتے اور سیاہ گوش

چیتے اور سیاہ گوش تھے۔ مگر وہ بجائے کٹہرے میں بند کرنے کے زنجیروں میں بندھے پلنگوں پر لیٹے رہتے تھے ان پر تعلیم دینے اور رکھنے والے مقرر تھے۔ جو انہیں شکار کی تعلیم دیتے۔ چیتے آنکھیں کھول کے بھیڑ یا بکری پر چھوڑے جاتے تو اس طرح زمین سے ملے ہوئے جھپٹتے کہ معلوم ہوتا ہوا کا بگولہ خاک اڑاتا چلا جاتا ہے چیتے پالنے والے ان کی خوشامدیں کرتے اور چیتے کو یار بنا کے اس کا غصہ فرو کرتے سیاہ گوش میں بلا کی پھرتی تھی کہ اس کے سامنے کبوتر چھوڑا جاتا تو پندرہ بیس گز تڑپ کے پکڑ لیتا۔

(ص ۵۰)

بٹیر بازی

ایک معرکہ آرا پالی میں سردار مرزا صاحب کا کرنیٹ شہرہ آفاق "میدان میں اترا اور اس کے مقابل داروغہ عباس علی خاں کا نامی اور مشہور بٹیر اور کھنچو آیا اور آدھ گھنٹہ تک قیامت خیز لڑائی ہوتی رہی۔ مگر میں بٹیروں کے عوض آخر تک داروغہ عباس علی خاں کی حالت و صورت دیکھتا رہا وہ اکڑوں بیٹھے تھے۔ ہمہ تن بٹیروں میں محو تھے دونوں ہاتھوں میں بلا کا تشنج تھا۔ سارے جسم سے اینٹھے اور پرائے جاتے تھے ان کا بٹیر چونچ مار کے کھینچتا تو وہ اس طرح منہ چپٹاتے کہ معلوم ہوتا انھیں نے چونچ ماری ہے۔ جب حریف کا بٹیر ان کے بٹیر کو لات مارتا تو معلوم ہوتا کہ انھیں کو کسی نے کس کے لات رسید کر دی پیچھے گرتے اور چوٹ کھانا ان کی صورت سے محسوس ہوتا۔ (ص ۵۷)

انگریزوں سے نفرت

بادشاہ کو انگریزوں کی ملاقات کا قطعاً انکار تھا فدیۃ السلطان امیر علی خاں بہادر تمام اعلیٰ درجہ کے انگریزوں اور وائسرائے بہادر تک سے ملتے اور بہت چاہتے کہ بادشاہ بھی ان لوگوں سے ملا کریں مگر جہاں پناہ نے

کسی طرح منظور نہ کیا، امیر علی خاں یہ حسرت لئے ہوئے مرگئے اس بارے میں بادشاہ کی قید اور احتیاط اس درجہ تک بڑھی ہوئی تھی کہ شاہی کوٹھیوں کے باغوں میں سواری نکلتی تو بیرونی پھاٹک بند کروا دیے جاتے اس لئے کہ ایک مرتبہ کوئی انگریز ایک پھاٹک کے باہر سے بادشاہ کی سواری کو دیکھ رہا تھا اور بادشاہ کی اس پر نظر پڑ گئی۔ (ص ۵۹)

جنت ارضی کی حوریں مٹیا برج کی شاہی عمارتیں عجیب نزہت و شادابی رکھتی تھی عالی شان کوٹھیوں کے گرد پر فضا باغ و دلکش چمن بندیاں اور ان کے آس پاس محلسرائیں جن میں سے بعض کے پردوں سے سر نکالے ایسی پیاری دلربا صورتیں نظر آجاتیں کہ معلوم ہوتا اس جنت ارضی میں حوریں بھی موجود ہیں (ص ۶۵)

موسیقی میں کمال گانے میں کمال حاصل تھا، اگرچہ گلا اچھا نہ تھا، مگر اصول موسیقی کو ایسا اچھا سمجھتے تھے کہ بڑے بڑے گوئے ان کے سامنے کان پکڑتے تاریخوں میں ہندوستان میں کئی مسلمان بادشاہ موسیقی کے کامل استاد بتائے گئے ہیں مگر میں نہیں سمجھتا ہوں۔ کہ ان میں سے کسی کو بھی اتنی اعلیٰ معلومات حاصل ہوں جتنی واجد علی شاہ کو حاصل تھیں اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ولی عہدی سے لے کر آخر عمر تک ہمیشہ بڑے بڑے مستند گویوں کا ان کے گرد ہجوم رہا اور ان میں سے بعض کو دولہ کا خطاب دے کر امرا اور شرفا کے طبقے میں داخل کر دیا رضی الدولہ جو بریلی کا ایک ڈھاڑی تھا، انیس الدولہ اور مصاحب الدولہ جو آخر میں بادشاہ کے بڑے مہذب مصاحب بن گئے تھے سب اسی قسم کے شریف نما ڈھاڑیوں میں تھے۔ (ص ۶۸)

اسلامی تمدن کی آخری شمع میں نے بادشاہ جمجاہ کو ان کے دربار کو محلات عالیات کے رہنے کی شان کو شاہزدگان والا تبار کی دلچسپ صحبتوں کو اور سواد بنگالہ میں لکھنؤ کے اجڑے ہوئے کروفر کو اپنی آنکھ سے دیکھا ہے، مٹیا برج مٹی میں مل گیا، کلکتہ کا وہ کونا لارڈ ڈفرن کے بے مہری پر قربان ہو گیا نہ اب وہ سر بفلک کوٹھیاں باقی ہیں نہ وہ مینو سواد باغ اور چمن نہ وہ زندہ مخلوق کا عجائب خانہ نظر آتا ہے، نہ وہ بہشت آئیں مرغزار اور نہ نہ وہ محلوں کی ڈیوڑھیاں میں نہ وہ شعر اور ادبا کی نکھری صحبتیں ..... خواب و خیال ہو کر دامن فضا میں پہنچ گئیں مگر میری آنکھوں کے سامنے آج بھی اسی طرح پھر رہی ہیں، میں نے دنیا میں آنکھ کھول کر اس مشہور لکھنؤ کو تو نہیں دیکھا، جو تہذیب کا مرکز شائستگی کا منبع علمی و ادبی برکتوں کا خزانہ بتایا جاتا ہے، مگر مٹیا برج کو دیکھا ہے۔ جو شمع اودھ کا آخری شمعدان اور در اصل اس زمانہ کا زندہ لکھنؤ تھا، لکھنؤ اجڑ گیا تھا، مگر اس کے

منتخب صاحبان کمال وہاں پہنچ کے ظل اللہ جہاں پناہ کے سایہ عاطفت میں دریائے بھاگرتی کے کنارے بس گئے تھے مٹیابرج نہ تھا۔ مگر دربار مغلیہ اودھ اور ہندوستان کے اسلامی تمدن کی آخری شمع بنگالے کے ایک کونے میں روشن ہوئی تھی اور چونکہ بجھنے کو تھی لہٰذا اکثر اوقات چراغ سحری کی طرح بھڑک بھڑک کر زیادہ نورانیت دکھادیتی تھی۔

(ص ۷۷)

غدر: ظالم اور مظلوم کی کشمکش

ایسٹ انڈیا کمپنی کے کورٹ آف ڈائرکٹراس کے سامنے، لارڈ ڈلہوزی کی جو رپورٹ پیش کی گئی تھی، کرنل سلیمن، جنرل لو، جنرل اوٹرم وغیرہ نے اس رپورٹ کی تائید یا مخالفت میں جو کچھ کہا تھا ان سب باتوں کی قدر مشترک یہ تھی کہ

واجد شاہ مردم کش تھا، ظالم تھا، ستمگر تھا۔

لیکن یہ دعویٰ، واقعات وحقائق کی کسوٹی پر جب کسا گیا تو معلوم ہوا کہ یہ جھوٹ کا طومار تھا۔ واجد علی شاہ سے ان کی رعایا خوش تھی، مطمئن تھی، ان سے محبت کرتی تھی اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس نے اپنی اولین فرصت میں، انگریزوں کے خلاف بغاوت کردی ہے۔ انگریز اور ہندوستانی مورخوں کی ایک بہت بڑی جماعت اس پر متفق ہے کہ ۱۸۵۷ء کا غدر بہ حقیقت نتیجہ تھا الحاق اودھ کا، یہ الحاق اگر عمل میں نہ آیا ہوتا اور واجد علی شاہ تمام معاہدوں کو بالائے طاق رکھ کر معزول نہ کردیئے گئے ہوتے تو یہ بغاوت رونما نہ ہوتی۔ اس حقیقت سے بھی کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ غدر اور بغاوت کی جتنی شدت اودھ میں تھی کسی دوسرے کے حصہ ملک میں نہ تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے کارفرماؤں نے بتایا تھا کہ الحاق کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ملک اودھ کی خوشحالی بڑھ جائے گی۔ لیکن کیا حقیقتاً ایسا ہوا، واقعات کا جواب نفی میں ہے۔

اودھ کے سپاہیوں میں بددلی

۱۷ر فروری ۱۸۵۶ء کو انگریزوں نے اودھ کا الحاق کرلیا انھیں نتیجہ کی بالکل خبر نہ تھی، اس کی وجہ سے ہزارہا آدمی جو بادشاہ کی ملازمت میں تھے برطرف ہوگئے اور وہ اپنی آمدنی کے ذرائع سے محروم کردیئے گئے

جتنا زیادہ نظام حکومت خراب ہوتا گیا، اتنا ہی زیادہ سپاہیوں، درباریوں، پولیس کے ملازموں اور زمینداروں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، جو خرابی حکومت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر موٹے ہوتے جا رہے تھے، جن لوگوں نے انگریزوں سے دادرسی چاہی تھی بالعموم غریب اور مظلوم تھے، لیکن مظلوموں نے برطانوی حکومت میں خود اپنی تباہی دیکھی۔ اودھ پوربیوں کا مولد و مسکن ہے اور بددلی کے ان جذبات نے ان تمام پوربیوں کو جو انگریزی ملازم تھے متأثر کر دیا، ہندوستانی باشندوں کے نزدیک الحاق کی کارروائی صریح ظلم کے مترادف تھی اور اسی وجہ سے عام مقابلہ کے جذبات مشتعل ہو گئے تھے۔

اس کے بعد سے بادشاہ اور ان کے تمام متعلقین (اگرچہ فیصلہ قسمت کے سامنے انہوں نے چاروناچار سر تسلیم خم کر دیا تھا) انگریزوں کے جانی دشمن ہو گئے تھے اس وقت لکھنؤ میں ۲ پلٹنیں (انیسویں چونتیسویں) متعین تھیں جن کو انگریزی حکومت تنخواہ دیتی تھی، انہوں نے الحاق کی غیر منصفانہ کارروائی کے بارے میں آپس میں مشورے کئے اور طے کیا کہ انگریزی راج الٹ دینے کی غرض سے بغاوت برپا کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اتفاق ایسا ہوا کہ ۱۸۵۷ء میں جب پلٹنوں کے بدلنے کا وقت آیا تو ان میں سے ایک پلٹن بیرام پور اور دوسری بارک بھیجی گئی ان دونوں پلٹنوں کے دلوں میں انگریزی حکومت کی جانب سے سخت نفرت کا جذبہ موجود تھا اور انہوں نے دوسری پوربی پلٹنوں کے نام چٹھیاں روانہ کیں، ۳۴ ویں پلٹن نے اس کارروائی میں پہل اختیار کی۔ ان چٹھیوں میں ہر پلٹن کو ہندوستان کے قدیم شاہی خاندانوں کو یاد دلائی گئی اور یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ اودھ کی فوج کو بھی برطرف کر دیا گیا اور اس کی بجائے نئی پنجابی فوج بنائی گئی ہے، جو سکھوں اور پنجابیوں پر مشتمل ہو گی۔ سپاہیوں کو یہ بات جتلائی گئی کہ جو لوگ صرف تلوار کے دھنی تھے اور جنھیں سوائے تلوار کے اور کوئی کام نہ آتا تھا ان کے منہ سے روٹی چھین لی گئی ہے۔ چٹھیوں میں اس امر کا اندیشہ بھی ظاہر کر دیا گیا تھا کہ عنقریب اور صوبے بھی ملحق کر لئے جائیں گے اور ہندوستانیوں کو آئندہ سے فوج میں ملازم نہیں رکھا جائے گا۔ اور اگر رکھا جائے گا، تو نہایت قلیل تعداد میں اس طریقہ سے سپاہیوں پر زور ڈالا گیا کہ وہ سابقہ بادشاہوں کو از سر نو تخت پر بٹھانے کے لئے بغاوت کریں اور غاصبوں کو ملک سے نکال دیں، سپاہیوں کی بہبودی اس امر کی متقضی ہے۔ ان دونوں پلٹنوں کے قریب قریب ہونے سے باغیوں کو باہمی خط و کتابت کا بہت موقع مل گیا، یہ خطوط نویسی بہت خفیہ طریقے سے کی جاتی تھی، آپس میں کثرت سے مشورے ہونے لگے تھے۔ رفتہ رفتہ

ہندوستانیوں کو یہ معلوم ہو گیا کہ کون کون سی پلٹنیں سازش میں ملوث ہیں اور تبدریج یہ بات مذہب میں داخل ہو گئی کہ ہر پوربیے کو غیر ملکی سے ترک موالات کر لینی چاہیئے، اس کی حکم عدولی کرنی چاہیئے اور اس کی عملداری سے الٹ دینا چاہیئے۔[1]

الحاق کے بعد جاگیر داروں کی پریشانی اودھ پر انگریزوں کے قبضہ نے، ملک کے ہر طبقہ میں پریشانی اور بددلی پیدا کر دی نتیجہ یہ ہوا کہ حالات رو براہ ہونے کے بجائے اور زیادہ خراب ہونے لگے:۔

"الحاق اودھ نے جاگیرداروں کی مالی حالت کو بہت خراب کر دیا، شاہ اودھ کے برخاست شدہ فوجی افسر اور سپاہی مصائب کا شکار ہو رہے تھے۔ جاگیرداروں فوجی افسروں اور سپاہیوں نے اپنی بدحالی کا راز الحاق اودھ میں پایا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے کمپنی کی حکومت کو ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اودھ انقلاب کا مرکز تھا اودھ کے جدید صوبہ کا افسر اعلےٰ سر ہنری لارنس کو مقرر کیا گیا، ہنری لارنس نے حالات پر قابو پانے کی کوشش کی لیکن بے سود بے اطمینانی بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ انقلاب پسندوں کی جماعت بہت مضبوط ہو گئی۔ جب لکھنؤ کے انقلابیوں کو میرٹھ اور دہلی کے واقعات کا علم ہوا۔ تو انہوں نے بھی برطانوی ریذیڈنسی کا محاصرہ کر لیا۔ اودھ ایک ایسی مشین کی مانند تھا جس کا ہر پرزہ انقلاب کے لئے حرکت کر رہا تھا۔ انقلاب پسندوں نے واجد علی شاہ کے بیٹے کو ملکہ حضرت محل کی سرپرستی میں اپنا بادشاہ تسلیم کر لیا۔ انگریز محصورین کی مدد کے لئے جنرل اوٹرم اور جنرل ہیولاک لکھنؤ کی طرف بڑھے۔ لیکن یہ دو لڑں جرنیل اپنی فوجوں سمیت محصور ہو گئے۔ آخر سر کولن کیمبل کی آمد پر انقلاب پسندوں کو شکست کھانی پڑی خاص بازار کے درودیوار خون سے رنگین تھے۔ عالم باغ، دلکشا باغ اور سکندر باغ کے ہر پھول پر لالہ کا گمان ہوتا تھا۔[2]

---

[1] خدنگ غدر (صفحہ ۵)
[2] کمپنی کی حکومت صفحہ ۲۶۸

اس صوبہ اودھ کی ہر چھاونی میں سپاہ نے بغاوت کی ہے، تمام اضلاع میں
اندھیر ہو رہا ہے، تعلق دار اپنے علاقہ سابقہ پر از راہ زبردستی قبضہ کر رہے ہیں
لیکن جو ان کا مقابلہ کرتا ہے اس کے گاؤں کو جلاتے ہیں اور باشندوں کو قتل کرتے
ہیں، ان کے آپس کے پرانے بغض و کینے از سر نو زندہ ہو گئے ہیں اور وہ سارے
ملک میں کم و بیش آپس میں توپوں اور بندوقوں اور ہتھیاروں سے لڑتے ہیں
ہر ضلع کے سول کے حاکموں کو بمجبوری اپنا صدر مقام چھوڑنا پڑا، سب تھانے
تحصیل برباد ہو گئیں، کسی طرح کی بدنظمی اور بدعملی کی مزاحمت نہیں ہو سکتی
اگر باغی چلے جاتے تو سول کے حکام جا کر پھر انتظام کر لیتے مگر باغی گئے نہیں
صوبہ میں منڈلا رہے ہیں، کہ لکھنؤ پر حملہ کرنے کا موقعہ لے۔ مجھے یقین ہے
کہ وہ لکھنؤ کو کبھی نہیں لے سکیں گے، خود ہی تباہ ہو جائیں گے، بالفعل صوبہ
اودھ کی چھاؤنیوں اور ضلعوں کی یہ کیفیت ہے۔

خیرآباد کی قسمت میں سیتاپور، محمدی و ملاؤں بالکل چھوڑ دیئے گئے ہیں۔
شاہجہان پور اور محمدی میں انگریزوں کا ہولناک قتل عام ہوا ہے باغیوں
کی سپاہ میں سے اہم ویں ہندوستانی پیدل رجمنٹ اور دسواں اودھ کا غیر
آئینہ رسالہ اور گیارہ سو سپاہی جو اودھ کی غیر آئینی سپاہ میں باغی ہیں، اور
پولیس کی سپاہ یہ سب لکھنؤ سے ۴۰ میل کے فاصلے پر محمود آباد میں موجود ہیں
جو تعلقہ داروں کو اغوا کر رہی ہے کہ وہ ان کے ساتھ شریک ہوں وہ روز گھٹتے
جاتے ہیں، قسمت لکھنؤ (لکھنؤ، ناؤ، دریاباد) میں لکھنؤ کے گرد آگرد آٹھ میل میں
کل اودھ کے اندر ہمارا انتظام و بندوبست ہے، ہمارے پاس دو مقام ریزیڈنسی
اور مچھی بھون ہیں، علاوہ اس کے ایک بدنصیب یورپین سپاہ چھاؤنی میں ہے
مچھی بھون اور لوہے کے پل پر تو اہل شہر سوار ہیں، شہر کے آدمی بھی جانتے ہیں
کہ اور انجینیروں نے بھی کہہ دیا ہے کہ یہ مقام استوار و مستحکم نہیں ہے، اگر اس کا
محاصرہ ہوگا تو وہ اڑ جائے گا، ریزیڈنسی کے مستحکم کرنے کا بڑا انتظام کیا گیا

ہے جس میں پری کوٹھی اور مکانات ہیں، مدت تک محافظت کر سکتے ہیں، دریاباد میں پانچویں اودھ کے غیر آئینی باغی رجمنٹ ہے، مگر اس کی تعداد بہت کم ہوگئی ہے وہ فشر کے پندرھویں رسالہ سے اور آٹھویں غیر آئینی پیدلوں کی رجمنٹ سے جو سلطان پور سے آئی ہے مل گئے ہیں، بھڑایچ کی قسمت میں دوسری و تیسری اودھ کی غیر آئینی پلٹنیں اور ملوہ کا توپ خانہ اور سوار باغی ہیں، ابھی انہوں نے گھاگھرا سے عبور نہیں کیا ہے۔ وہ انتظار میں بیٹھے ہیں کہ فیض آباد کی قسمت سب سے زیادہ ہولناک ہے، ۲۲ویں ہندوستانی پیدل اور اعظم گڑھ کی ۱۷ رجمنٹ اور چھٹی اودھ کی غیر آئینی پیدل رجمنٹ اور اودھ کے سواروں کا ایک حصہ اور مل کا توپ خانہ یہاں سب باغی جمع ہیں اور اودھ کا پندرھواں رسالہ کان پور کی طرف گیا ہے سلطان پور میں سپاہ نے آگ لگا دی اور وہاں سے چلی آئی، بہت سے یورپین قتل ہو گئے، سلون میں یورپین کی جانیں بچ گئیں۔

لارنس کی ہلاکت کا غم۔ یورپین کی بڑی خاطر جمعی یہ تھی کہ سر ہنری لارنس ان کے لئے طاقت و قوت کا حصن حصین ہے، آخر جون کو چنہٹ میں انگریزوں کو بڑی شکست فاش ہوئی تھی، ساری جولائی میں لکھنؤ کا محاصرہ رہا کان پور کی فتح میں جنرل ہیولاک کو اس خبر کے سننے سے نہایت دل میں رنج ہوا کہ لکھنؤ کے محاصرہ میں اول سر ہنری لارنس کی قربانی ہوئی، وہ جنرل کے قدیمی دوست تھے ان کے مرنے سے جو نقصان ہوا تھا، اس کو جنرل صاحب بھی خوب سمجھتے تھے[1]

سقوطِ دلی کے بعد بھی اودھ نے جنگ جاری رکھی

انگریزوں نے دلی فتح کر لی، لیکن اودھ کے باہمت لوگوں کے حوصلہ میں اس حادثہ سے بھی فرق نہ آیا۔ وہ اور زیادہ جوش و خروش کے ساتھ لڑنے لگے، راقم الدولہ ظہیر دہلوی سقوطِ دہلی کے بعد جان بچانے کے لئے بھاگے۔ کیونکہ بہادر شاہ کے متوسلین میں تھے، اگر پکڑے جاتے تو پھانسی کے پھندے سے کسی طرح نہیں بچ سکتے تھے انہوں نے اپنی آپ بیتی میں بہت

---

[1] تاریخ عروج عہد انگلشیہ ذکاء اللہ صفحہ ٥٧٦

سے دلچسپ اور عبرت انگیز مشاہدات لکھے ہیں۔ ذیل کے واقعہ سے اودھ کے مسلمانوں کے جوش
وخروش کا پورا پورا اندازہ ہوتا ہے:۔

"بریلی میں نانا راؤ اور فیروز شاہ وغیرہ اور دہلی اور لکھنو کے آدمی جمع ہیں۔ رام پور کے تیس ہزار آدمی بریلی میں ملازم ہیں اور مردان رام پور کا یہ حال ہے کہ ایک ایک تھان کا دوپٹہ سر سے بندھا ہوا ہے اور اس پر گوٹا لگا ہے۔ آدھا دوپٹہ سر پر بندھا اور آدھا گھوڑے کی رکاب سے نیچے لٹکتا ہے چار چار طپنچے کمر میں لگے ہوئے ہیں، دوہری تلواریں ڈاب میں لگی ہیں، گھوڑوں پر سوار ہیں اور شہر میں گھوڑے کوداتے پھرتے ہیں، پچاس ہزار سوار کا اجتماع بریلی میں موجود ہے اور چاروں طرف سے سپاہ انگریزی کے آنے کی خبر گرم ہے۔ قصہ مختصر دوسرے دن ہم سات آدمی بریلی کو چھوڑ کر راستہ سے ہٹ کے جنوب کی جانب روانہ ہوئے اور یہ ارادہ کیا کہ غیر راہ سے رام پور داخل ہونا چاہیئے۔ چنانچہ ہم بریلی سے روانہ ہو کر ایک قصبہ آنولہ پہنچے اور ایک مسجد میں مقیم ہوئے۔ اس روز وہیں قیام کیا دوسرے روز صبح کو مقام شاہ آباد عملداری رام پور کا قصد کیا۔ وہ مقام آنولہ سے اٹھارہ کوس تھا۔ غرضیکہ بارہ کوس راہ دن میں طے کی، پھر تھک کر چور ہو گئے۔ آگے چلنے کی ہمت نہ ہوئی۔ پاؤں سوج گئے تلووں میں آبلے پڑ گئے جاٹوں کا ایک گاؤں تھا اس کے باہر ایک تالاب کے کنارے ایک درخت کے نیچے قیام کیا۔ اسی اثنا میں ایک مسلمان نجار گاؤں سے پانی بھرنے آیا۔ اس نے ہمیں دیکھ کر کہا کہ تم لوگ یہاں کیوں پڑے ہو، جاؤ اپنا رستہ لو، گاؤں والے دیکھیں گے تو جان سے مار ڈالیں گے، یہ لوگ مسلمان پٹھانوں کی جان کے دشمن ہیں، کیونکہ خان بہادر خاں کی عملداری میں جو لوگ ان پر حاکم ہیں انہوں نے ان پر بڑے ظلم وستم کئے ہیں، اس لئے یہ اب بدلہ لے رہے ہیں۔ ہم نے کہا ہم بھی مرنے کو پھرتے ہیں مگر ہم ایسی سخت جان ہیں کہ ہمیں کسی صورت موت نہیں آتی۔ ہم خدا سے چاہتے ہیں کہ کوئی ہم کو مار ڈالے اور اس روز روز کی مصیبت سے چھٹکارا ہو۔ وہ نجار پانی کا گھڑا سر پر رکھ کر گاؤں کو روانہ ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر واپس آیا اور بولا تم کو مقدم جی بلاتے ہیں۔ ہم نے کہا ہم فقیر ہیں ہمارا گاؤں میں کیا کام

ہم کو یہیں پڑا رہنے دو۔ رات کو بسیرا لے کر صبح کو چلے جائیں گے۔ اس شخص نے نہ مانا اور ہم کو اپنے ہمراہ چوپال میں لے گیا، ہم نے وہاں جاکر دیکھا۔ کہ ایک بہت قوی ہیکل جوان داڑھی چڑھائے ہوئے ایک ماچے پر لیٹا ہے اور آگے اس کے ایک بہت بھاری لٹھ دھرا ہے۔ نوجوان نے ہمیں دیکھ کر کہا او میاں جی بیٹھ جاؤ، برابر اس کے ایک اور اونچے پایوں کا ماچا بچھا ہوا تھا۔ اس پر ہم کو بیٹھنے کی اجازت دی اس مرد نے استفسار حال دریافت کیا۔ ہم نے کہا ہم مسافر ہیں، دلی کے رہنے والے ہیں، تباہ و برباد ہو کر گھر سے نکلے ہیں، انگریزوں کے ڈر سے چھپے پھرتے ہیں، رام پور جانے کا ارادہ ہے، اس مرد رحم دل نے ہمارے حال زار پر بہت تاسف کیا اور ہمارے منہ ہاتھ دھلوائے، تھوڑی دیر میں مکئی کی روٹیاں گھی میں چپڑی ہوئی اور دال اور ایک برنجی شکر کاسے میں دودھ اور شکر منگوا کر ہمارے سامنے رکھے اور ہم سے کہا اچھی طرح خوب سیر ہو کر کھا لو۔ بعد تناول کے ہم اسی چوپال میں جا کر سو رہے۔ صبح کو ہم نے چلنے کا ارادہ کیا تو اسی مرد بامروت نے ہم سے کہا۔ کہ تمہارے پاؤں تو سوجے ہوئے ہیں، راستہ کیونکر طے ہو گا۔ اور اپنے گاڑیباں کو بلا کر کہا کہ ان کو گاڑی میں سوار کرا کر شاہ آباد تک پہنچا آئے۔ علاوہ بریں پانچ روپیہ اپنے پاس سے زاد راہ ہم کو دیئے، ہم نے ہر چند انکار کیا، مگر عالی ہمت نے نہ مانا، اور ہم کو سوار کرا کر شاہ آباد پہنچا دیا۔ ہم نے خدا کی رزق رسانی کا شکر ادا کیا۔[1]

انگریزی فوج کے چھکے چھڑا دیئے

انگریزوں کی فوج منظم تھی، ماہر جنگ تھی، انگریزوں کے پاس وسائل و ذرائع کی کمی نہ تھی، دولت تھی، روپیہ تھا، باغیوں اور جاسوسوں کی کمک تھی، راجواڑوں اور ریاستوں، زمینداروں اور تعلقہ داروں کی مدد تھی، سکھوں اور دوسرے علاقوں کے سپاہیوں کی موج در موج فوج تھی، اودھ کے باغیوں کے پاس نہ دولت تھی، نہ ذرائع نہ تنظیم، ہاں حوصلہ تھا، ہمت تھی، مر مٹنے کا جذبہ تھا، جان دے دینے کا ولولہ تھا، انہی ہتھیاروں سے وہ لڑتے تھے۔ اور دشمن کے چھکے چھڑا دیتے

---

[1] داستان غدر (راقم الدولہ ظہیر دہلوی)

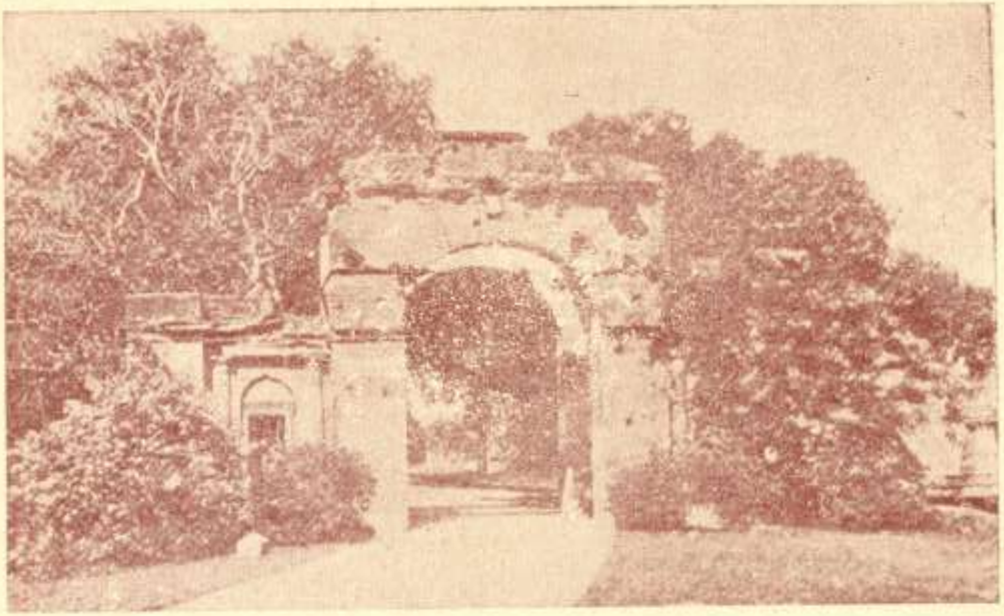

بیلی گارد (لکھنؤ) - (انگریز ریزیڈنٹ کی سرکاری اقامت گاہ)

تھے، ذرا یہ منظر دیکھئے:۔

۔ ۲۹ رجون کو سر ہنری لارنس کو خبر ہوئی کہ کان پور کے فتح ہو جانے سے باغیوں کی ہمتیں بڑی بڑھ گئی ہیں۔ اس کا لشکر چنہٹ پر اس لئے جمع ہوا ہے کہ لکھنؤ کا محاصرہ کرے، سر ہنری لارنس تو یہ چاہتے ہیں کہ کوئی موقع ہاتھ آئے باغیوں پر کوئی صدمۂ عظیم پہنچایا جائے، سو ان کو موقع مل گیا۔ انہوں نے ارادہ کیا کہ کل صبح کو گگریل ندی پر جو لکھنؤ سے چار میل کے فاصلہ پر ہے، سپاہ کو ساتھ لے کر جائیں۔ اگر دشمن وہاں نہ ملے تو واپس چلے آئیں۔ اگر دوسری صورت ہو تو دشمنوں پر ایسا صدمہ پہنچائیں کہ چند روز تک ان کو یہ حوصلہ نہ ہو کہ وہ لکھنؤ کے محاصرہ پر مبادرت کریں وہ جو سپاہ انتخاب کر کے لے گئے مقدار میں سات سو سے کچھ زائد تھی، نصف کے قریب یورپین تھے، دس توپیں ان کے ساتھ تھیں۔ جن میں چار سو، گولہ انداز گورے تھے اور باقی کے گولہ انداز ہندوستانی تھے

ہنری لارنس یہ چاہتے تھے کہ صبح کے ہوتے ہی سفر ہو۔ لیکن دن چڑھ گیا تو سپاہ کی تیاری پوری ہوئی، سپاہ پہلے چند روز سابقہ کی رات دن کی محنت شاقہ سے ہاری تھکی ہوئی تھی، جو اس کو اپنی خدمات کی بجا آوری میں کرنی پڑی تھی اور پھر اس کو ہنری لارنس کے حکم کے موافق خورد و نوش نہ ملا، جو اس کے ہمراہ تھا تو اس کی صورت ایسی نظر آتی تھی کہ وہ سارے دن سخت محنت کر کے آئی ہے نہ یہ کہ وہ کام شروع کرنے جاتی ہے۔

وہ تین میل سفر کر کے گگریل کے پل پر پہنچی، تو اس نے یہاں قیام کیا۔ کوئی دشمن نظر کے سامنے نہیں آیا، تو سپاہ کے واپس جانے کا حکم ہوا۔ وہ واپس چلی تو پھر سب کو یہ حیرت ہوئی کہ واپس جانے کا حکم منسوخ ہوا۔ اور پھر اس کو حکم ہوا کہ وہ چنہٹ کی طرف سفر کرے، سڑک بڑی خراب اور ناہموار تھی۔ اس پر سپاہ گرتی پڑتی چل کر موضع اسمٰعیل گنج میں آئی کہ دفعتہ ان کے درمیان دشمنوں کی توپوں کے گولے آن کر پڑے اور انہوں نے دشمنوں کو دیکھا کہ جنھوں نے اب تک موضع چنہٹ کے محاذی گھنے درختوں کی قطاروں کی آڑ میں اپنے تئیں چھپا رکھا تھا۔ سر ہنری نے اسماعیل گنج اور سڑک کے درمیان صف بندی

کی اور حکم دیا کہ لیٹ جائیں۔ اور توپوں سے باغیوں پر گولہ زنی شروع کی۔ تھوڑی دیر تک طرفین سے توپ زنی ایک دوسرے پر ہوتی رہی۔ دشمن نے اپنی توپوں کو تھما دیا جس سے سر ہنری کو دھوکا ہوا کہ وہ یہ سمجھے۔ کہ دشمنوں میں اب لڑائی کا حوصلہ نہ رہا۔

مگر پھر ان کو یہ دھوکا نہیں رہا۔ دشمنوں نے استقلال کے ساتھ ایسی پیش قدمی کی جس کی تعریف انگریزی افسروں نے بھی کی، اور انہوں نے ٣٢ رجمنٹ پر بڑی آتشباری کی۔ ہندوستانی توپ خانہ کے کام میں لانے کے لئے ہر چند کوشش کی وہ کارگر نہ ہوئی۔ توپچی دغاباز باغیوں سے ملے ہوئے تھے۔ انہوں نے دو توپوں کو خندق میں اوندھا کیا۔ چند لمحوں میں دشمنوں نے اسماعیل گنج لے لیا گوردن نے پھر اس کے لینے کا قصد کیا، مگر وہ بہت تھک گئے تھے۔ اور کرنیل کیس کے زخم مہلک لگنے سے دل شکستہ ہو گئے تھے۔ اس لئے کامیاب نہیں ہوئے اور منتشر ہو کر لیٹے سڑک پر آئے تو سر ہنری نے یہ دیکھ کر کہیں کہیں محصور نہ ہو جاؤں سپاہ کو مراجعت کا حکم دیا۔ بس یہ مراجعت ہی ہزیمت ہو گئی جس میں ٣٢ رجمنٹ کے ایک سو پندرہ سپاہی مارے گئے اور ٢٩ مجروح ہوئے۔ یہ مقتولین و مجروحین میں نسبت عجیب و غریب تھی۔ دشمن کا توپ خانہ لپک کر سپاہ کے گارڈ پر حملہ آور ہوا اور متواتر گولیوں کے مارنے سے ان کو بہت دق کیا۔ ٣٢ رجمنٹ کے سپاہی ایسے مضمحل ہو گئے تھے، کہ وہ سڑک پر مرنے کے لئے گھر گئے۔ وہ بڑے خوش نصیب تھے جو توپوں کی گاڑیوں پر سوار ہو گئے یا کوئی دوست سوار ان کو ایسا مل گیا۔ جس نے ان کو اپنی رکاب سے چمٹا لیا۔[1]

سر ہنری لارنس کی ہلاکت

بیلی گارڈ، یعنی ریزیڈنسی کا باغیوں نے محاصرہ کر رکھا تھا۔ وسائل کی کمی، روپے کی قلت اور ہمرہان کار کی گریز پائی کے باوجود وہ جی توڑ کر حملہ کر رہے تھے۔ کبھی پسپا ہوتے تھے۔ کبھی آگے بڑھتے تھے، اپنے مقتولین و مجروحین کی کثرت تعداد سے بے پروا، وہ اسی دھن میں لگے ہوئے تھے۔ کہ جس طرح

---

[1] تاریخ عروج عہد انگلشیہ ذکاء اللہ صفحہ ٨٢٥

ہو سکے، ریزیڈنسی پر قبضہ کرلیں، انگریز گو یہاں محصور تھے لیکن پھر بھی وہ ڈٹ کر مقابلہ کر رہے تھے کمک کے انتظار میں تھے کہ وہ آجائے تو باہر نکلیں۔ اسی اثنا میں سر ہنری لارنس ہلاک ہو گئے اور ان کی ہلاکت کی تفصیل یہ ہے:۔

چنہٹ کی ہزیمت کی مصیبت سے زیادہ محصورین پر یہ آفت آئی کہ سر ہنری لارنس کا واقعہ ناگزیر پیش آیا جس کا حال کپتان ولسن صاحب نے یہ تحریر کیا ہے، کہ پہلے روز دشمن نے آٹھ بجے دن کے آٹھ انچی گولہ اس ہوٹ زر کا جو اس نے ہم سے چھینا تھا، اس کمرہ میں پھینکا جس میں سر ہنری اور اس کے سیکرٹری کوپر صاحب کام کر رہے تھے۔ وہ ان دونوں کے قریب آکر پھٹا، مگر کسی کو ضرر نہیں پہنچا تو ہم نے سر ہنری سے عرض کیا کہ آپ ریزیڈنسی کو چھوڑ کر کہیں اور جا رہیے یا اس مکان کے نیچے کی منزل میں چلے جایئے۔ لیکن انہوں نے اس سے انکار کیا اور ہنس کر کہا کہ مجھے یہ یقین نہیں کہ دشمن کے پاس ایسے قدر انداز گولہ انداز ہیں کہ وہ دوسرا گولا اس چھوٹے کمرہ میں پھر ماریں۔ اس دن سہ پہر کو ریزیڈنسی کی سب سے اوپر کی چھت پر بعض گولے آئے شام کو میں نے اور کوپر صاحب نے ان پر زور ڈالا کہ وہ نیچے کے مکان میں جا کر رہیں اور کاغذات اور لکھنے کا سامان وہاں بھیج دیں۔ تو انہوں نے اقرار کیا کہ کل صبح میں یہ کام کروں گا۔

دوسری جولائی کو آٹھ بجے صبح وہ بڑے مضمحل ہو کر اپنے گشت سے واپس آئے (گرمی بلا کی پڑ رہی تھی) اور بچھونے پر کپڑے پہنے ہوئے لیٹ گئے اور مجھ سے کہا کہ ایک یادداشت لکھو کہ کس طرح سپاہ میں خوراک کی تقسیم کی جائے۔ میں دوسرے کمرہ میں یہ یادداشت لکھنے گیا۔ مگر اس سے پہلے میں نے ان کو کل کا وعدہ نیچے جانے کا یاد دلایا۔ تو انہوں نے فرمایا کہ میں بہت تھکا ہوا ہوں، ۲ دو گھنٹے آرام کر کے اپنی ساری چیزیں بھیج دوں گا۔ نصف گھنٹہ میں مجھے جو کچھ لکھنا تھا۔ وہ لکھ کر پھر ان کے کمرہ میں آیا۔ ان کا بھتیجا جان لارنس ایک چھوٹے سے بچھونے پر لیٹا ہوا تھا، جو متوازی اس کے چچا کے بچھونے سے چند فٹ کے فاصلہ پر تھا۔ میں سر ہنری کے داہنے طرف ان کے

بچھونے پر گھٹنا ٹیک کر کھڑا ہوا۔ ایک ہندوستانی ملازم فرش پر بیٹھا ہوا پنکھا کھینچ رہا تھا۔ میں نے جو لکھا تھا وہ پڑھا۔ میرا لکھا ان کی خاطر میں نہ آیا۔ وہ بتلانے لگے کہ یہ تبدیلیاں اس تحریر میں کرو کہ میں نے دیکھا کہ ایک گولہ یا شعلہ چمکا خوفناک آواز ہوئی۔ اندھیرا گھپ ہو گیا۔ میں فرش پر گر پڑا۔ اور چند سکنڈ تک بے دم پڑا رہا۔ پھر میں کھڑا ہوا مگر کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ کمرہ دھوئیں اور گرد سے بھرا ہوا تھا۔ نہ سر ہنری نے نہ ان کے بھتیجے نے کوئی آواز نکالی۔ میں نے چونک کر یہ پوچھا کہ سر ہنری آپ کے ضرب لگی ہے؟ میں نے دو دفعہ یہ کہا اس کا جواب کچھ نہیں ملا تیسری دفعہ جب میں نے یہ کہا۔ تو انہوں نے یہ جواب دیا کہ میں مارا گیا پنکھا جھٹکے کے ساتھ فرش پر گرا۔ اور بہت سا چونا گرا جب تبدریج گرد اور چونا کم ہوا، تو میں نے چند منٹ بعد دیکھا کہ بستر پر سر ہنری کا بالا پوش ان کے خون میں سرخ ہو رہا ہے۔

۳۲ رجمنٹ کے کچھ گورے کمرہ میں آئے۔ اور سر ہنری کو کرسی پر بٹھایا تو میں نے دیکھا کہ میرے کپڑے اتر گئے اور گولے کے ایک ٹکڑے سے میں خفیف سا زخمی ہوا ہوں اور سر ہنری کے مہلک زخم لگا ہے اور جانگھا تلی کا ایک پاؤں گولہ کے دوسرے ٹکڑے سے کٹ گیا ہے اور سارا دن اور دوسرے دن کے ایک حصہ میں سر ہنری کے ہوش و حواس قائم رہے۔ بار بار ان کو خواب آور دوائیں دی جاتی تھیں۔ ان کی تکلیف بڑھتی جاتی تھی۔ اور جس مکان میں وہ تھے۔ اس میں جو اتر گولے اور گولیاں دیواروں میں آن آن کے لگتے تھے۔ مگر کوئی ان کی روح مقدس کو بے چینی نہیں ہوتی تھی جب تک ان میں حواس باقی رہے ان کا خیال سرکار کی طرف لگا رہا جس کی وہ خدمت تیس سال سے کر رہے تھے۔ جس کی خدمت گزاری میں انہوں نے یہ مہلک زخم کھایا تھا۔ پھر انہوں نے اپنے خاص معتمد افسروں کو بلایا میجر بینکس صاحب کو چیف کمشنری کا کام اور کرنل انگلس کو سپاہ کے میر لشکر ہونے کا کام سپرد کیا اور ان کو ہدایتیں کیں کہ محافظت کس کس طرح کی جائے اور بڑے جذبے اور زور سے یہ کہا کہ کبھی اپنے [illegible] کے حوالہ نہ کرنا۔ ۲ تاریخ شام کو انہوں نے سیکرمنٹ اپنے دوستوں کے ساتھ کھایا۔ پھر ان میں باتیں کرنے کی قوت نہ رہی۔ وہ بہت کم بولتے۔ اور

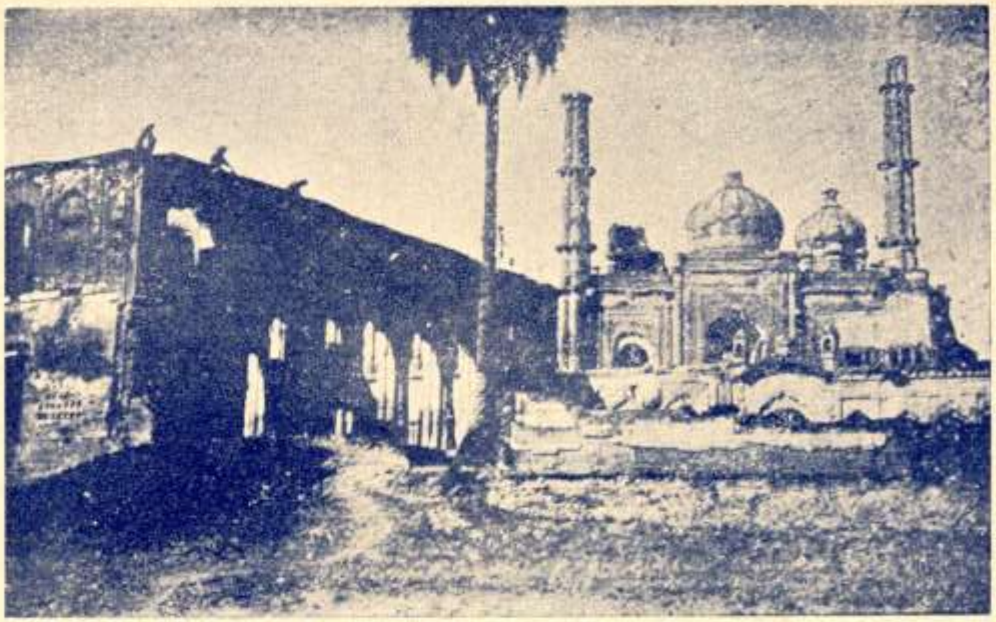

لکھنؤ ریزیڈنسی کی ویران مسجد

۴۔جولائی ۱۸۵۷ء کی صبح کو اس جہاں سے رخصت ہوئے چند سپاہی تبر یلان کی لاش سے جانے کے لئے بلائے گئے[1]

انگریزوں کی سفاکی

بیلی گارد میں محصور ہونے سے پہلے، جب انگریزوں کی ہوا اکھڑ رہی تھی۔ لیکن ابھی وہ لکھنؤ پر قابض تھے۔ انہوں نے قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا تھا، انگریزوں کا ایک ثنا خواں مورخ لکھتا ہے:۔

اگرچہ اضلاع سے انگریزی حکومت برخاست ہو گئی تھی مگر لکھنؤ میں اب تک دو چلی جاتی تھی۔ مچھی بھون پر ایک پھانسی کھڑی ہوئی تھی جس پر ہر روز باغیوں کے گروہ کے گروہ سرسری تحقیقات کے بعد چڑھائے جاتے تھے۔ یہ سچ ہے کہ سازشیں کبھی کبھی ظاہر ہوتی تھیں، مگر ان کے سرغنوں کا پکڑا جانا، ان کے شریکوں کو دہشت زدہ بنا دیتا ہے۔ ملٹری پولیس کے افسر کپتان کارنگی صاحب بڑے جید و مستعد افسر تھے وہ بدمعاشوں کو دم نہیں مارنے دیتے تھے۔ عدالت کی کچہریوں میں بدستور کام ہوتا تھا۔ ہاں تجارت کی بڑی کم بختی آ رہی تھی۔ ساہوکارہ اور بنک اور بیوپار کی بڑی کساد بازاری تھی۔ سرکاری نوٹوں پر پچیس روپیہ سینکڑہ سے پچھتر روپیہ سینکڑہ تک بٹا لگ گیا تھا۔ مہاجنوں اور ساہوکاروں اور دولت مندوں کو سرکار انگریزی کی عملداری برقرار رہنے پر اعتبار نہیں رہا تھا۔ مگر وہ حتی الوسع اس کے سلامت رکھنے میں ساتھی تھے۔ لیڈیاں تو بہت کم حوالی ریزیڈنسی سے باہر جاتیں مگر چیلین بدستور اپنی نمازیں پڑھ جاتے، ڈنر ہوتے تھے۔ ان میں مہمان آتے تھے[2]

انگریزوں کی سر توڑ کوشش

انگریز محصورین کی امداد و اعانت اور لکھنؤ کو فتح کر لینے کے لئے انگریز ایڑی چوٹی کا زور صرف کر رہے تھے۔ ہر طرف سے اپنی قوتیں مجتمع کر کے وہ لکھنؤ پر ٹوٹ پڑنا چاہتے تھے ان کا خیال تھا اور بجا خیال تھا کہ اگر لکھنؤ فتح ہو جائے۔ تو پھر بریلی، مراد آباد، بدایون، آگرہ، آلہ آباد وغیرہ کی باغیانہ سرگرمیوں پر آسانی کے ساتھ قابو پا لیا جائے گا۔ چنانچہ۔

---

[1] تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) صفحہ ۸۲۳

[2] تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) صفحہ ۸۱۹

سرکولن فتح گڑھ سے یکم فروری کو روانہ ہوئے اور چوتھی کو کانپور پہنچے جس میں پھر وال پول برگیڈ دہوپ برگیڈ وشین برگیڈ شامل ہو گئے تھے۔ یہ سب اودھ میں گنگا پار ہو کر داخل ہوئے۔ ایسی یورپین فوج کبھی ہندوستان میں جمع نہیں ہوئی تھی اس میں ۱۷ بٹالینیں پیدل تھیں جن میں پندرہ یورپین تھیں اور ۲۸ سکواڈرن سواروں کے تھے، جن میں چار گوروں کے تھے اور چار رجمنٹیں تھیں اور چوّن ۵۴ ہلکی اور انسٹھ بھاری توپیں اور موٹار تھیں [1]

نیز اس کے علاوہ:۔

ہیولاک صاحب کے پاس سب قسم کی سپاہ تین ہزار ایک سو نواسی تھی جس کی تفصیل یہ ہے کہ یورپین پیدل ۲۲۵۸ اور یورپین والنٹیر سوار ۱۰۹ اور یورپین آرٹلری ۲۸۲، سکھ پیادے ۳۴۱، ہندوستانی غیر آئینی سوار ۵۹ کل ۳۱۸۹ یہ سپاہ تین برگیڈ میں تقسیم ہوئی۔ اول برگیڈ کے افسر اعلیٰ ڈل صاحب، دوسرے برگیڈ کے افسر اعلیٰ برگیڈیر ہملٹن صاحب اور تیسرے برگیڈ کے افسر اعلیٰ میجر کوپر صاحب تھے، علاوہ ان کے ایک سو نو والنٹیر تھے، جن میں سر ولیم اور ڈرم صاحب بھی تھے اور ۵۹ غیر آئینی بارھویں رجمنٹ کے سوار جن پر کپتان اُہل بیرو کو پورا اعتبار تھا۔ [2]

دہلی فتح ہونے کے بعد بھی ایک سال تک لکھنؤ لڑتا رہا۔ لیکن دلی کی فتح نے انگریزوں کی قوت وطاقت میں غیر معمولی اضافہ کر دیا تھا۔ دلی فتح کرنے کے بعد وہاں کے باشندوں پر جو ہیبت ناک اور لرزہ خیز مظالم روا رکھے گئے تھے، انہوں نے عام طور پر دہشت اور سراسیمگی کی کیفیت بھی پیدا کر دی تھی، سکھوں نے مہاراجہ کپور تھلہ اور پٹیالہ وغیرہ کی قیادت میں دل وجان سے ہر مورچہ پر (حتیٰ کہ خود اپنے خلاف بھی) انگریزوں کا ساتھ دیا تھا۔ اور اب حالات کا رخ دیکھ کر اودھ کی ہمسایہ ریاست نیپال نے بھی اودھ سے بغیر کسی سابقہ دشمنی اور عناد کے اپنے سارے وسائل و ذرائع، اپنی سپاہ فوج اور قوت انگریزوں کے پلڑے میں ڈال دی تھی۔ اودھ کے جانباز بے سروسامانی کے باوجود

---

[1] تاریخ ہندوستان (بغاوت ہند) ذکاء اللہ صفحہ ۵۹
[2] تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) صفحہ ۸۷۳

کب تک اور کہاں تک مقابلہ کرتے ؟ آخر رفتہ رفتہ وہ خستہ اور درماندہ ہونے لگے، ہمت جواب دینے لگی، ساتھی ساتھ چھوڑنے لگے، دوستوں نے آنکھیں پھیر لیں، غداروں اور جاسوسوں نے زندہ رہنا دوبھر کر دیا، لکھنؤ کی فتح سے پہلے،

رانا جنگ بہادر کی پیش کش

"نیپال کے وزیر اعظم جنگ بہادر نے جو نیپال میں حقیقت میں حکمراں کرتا تھا مئی کے مہینے میں اپنی ساری سپاہ برٹش گورنمنٹ کے سپرد کرنے کی درخواست کی۔

لارڈ کیننگ نے جنگ بہادر کا شکریہ ادا کیا اور جون کے مہینے میں اس کی درخواست منظور فرمائی۔ جنگ بہادر نے تین ہزار سپاہی کھٹمنڈو سے جولائی کے مہینے میں بھیجے جو اس مہینے کے آخر میں گورکھپور کے شمال میں انگریزی عملداری میں داخل ہوئے۔[۱]

مقابلہ تو دل ناتواں نے خوب کیا

نیپالیوں کے پاس سب کچھ تھا۔ باغیوں کے پاس حوصلہ کے سوا کچھ نہ تھا۔ پھر بھی شمع حریت کے پروانوں نے جان دینے میں کسر نہ اٹھا رکھی:۔

> جنگ بہادر گھاگھرا سے پار اتر کر ۲۵ فروری کو اودھ میں داخل ہوا راستہ میں ایک قلعہ نہایت استوار آیا جس کا فتح کرنا ضرور تھا۔ اس کے اندر چونتیس باغی تھے، نیپالی سپاہ نے حملہ کیا۔ جس کی تسخیر میں نیپالی سات مقتول اور پینتالیس مجروح ہوئے۔ اہل قلعہ جو تعداد میں چونتیس تھے، سب اس قلعہ میں مارے گئے۔[۲]

بال کرشن کی غداری

مہاراجہ بال کرشن جو بظاہر حضرت محل کے سامنے بہت خیر خواہی کا اظہار کرتا تھا۔ انگریزوں سے ملا ہوا تھا۔ اس نے کسی تدبیر سے تمام تعلقہ داروں کو اپنے علاقوں میں واپس جانے پر آمادہ کر لیا۔ چونکہ اس وقت روپیہ کی سخت قلت ہو رہی تھی۔ حضرت محل بھی اس کے دام میں آ گئیں۔ بال کرشن نے تاویل یہ پیش کی کہ اگر یہ لوگ اپنے علاقوں میں واپس نہ جائیں گے تو رعایا سے تحصیل زر کس طرح ہو گا۔ تیر ٹھیک نشانہ پر بیٹھ چکا تھا تعلقہ داروں

---

[۱] تاریخ ہندوستان جلد سوم (بغاوت ہند) صفحہ ۴۶

[۲] ,, ,, ,, ,, ۴۸

کا مع افواج چلے جانے سے تحریک میں انحلال پیدا ہونا لازمی امر تھا لیکن پھر بھی حضرت محل کی ہمت مردانہ میں شمہ بھر بھی فرق نہیں آیا اور پورے زور و شور کے ساتھ معرکہ آرائیاں ہوتی رہیں۔

کالون کیمبل اور جنرل اوٹرم بغاوت کو فرو کرنے میں مسلسل کوششوں کے باوجود ناکام رہے تھے۔ اسے جنگ بہادر اور اس کی فوجوں ہی قابو کر لیا۔

کیمبل اور اوٹرم نیپالی بندوقوں کے سائے میں اودھ کو فتح کرنے کے لیے اٹھے۔ وہ اودھ جہاں گورنر لارڈ کیننگ کے الفاظ میں سب سے زیادہ باغی تھے[1]

لیکن علمار اسلام اور مجاہدین نے اپنے خون کے دریا بہا کر نیپالی فوجوں کے راستوں کو مسدود کر دیا، پھر بھی جنگ بہادر ۱۴ فروری کو گورکھپور سے دارالسلطنت جانے کے لئے روانہ ہوا اس کے ساتھی جنرل رو کرافٹ کو معلوم ہوا کہ پھولپور میں باغی بھرے ہوئے ہیں۔ لہذا جنگ بہادر نے براہ سلطان پور لکھنؤ کی راہ لی، راستہ میں دو خونریز لڑائیاں ہوئیں اور باغیوں نے نیپالیوں کا خوب مقابلہ کیا۔ گورکھپور سے کر سلطان پور تک ۲۲ میل کے فاصلے میں باغی بھرے ہوئے تھے ان کا سب سے بڑا مقام رام پور اور چاندا تھا۔

میر لشکر بندہ حسین اور مہدی حسین تھے، فرینکس صاحب اور نیپالیوں کی فوج نے جب ان مقامات پر قبضہ کر لیا، تو ذکا اللہ لکھتے ہیں:

مہدی حسن پھر بھی مایوس نہ ہوا، اور بادشاہ گنج میں نیپالیوں کا سد راہ ہونے کے لئے پراگندہ اور شکست یافتہ فوج کو جمع کیا، مرزا جعفر بیگ سپہ سالار نے گھر سے نالے کے نیچے جس پر ایک سڑک لکھنؤ کو جاتی تھی صف آرائی کی، سب سے بڑا توپ خانہ سڑک کے کنارے لگا یا[2]

باغیوں کی دہشت ۔ فرینکس صاحب امیٹھی میں جو لکھنؤ سے آٹھ میل تھی۔ فروکش ہوا، اس کے پاس کمانڈر انچیف کا حکم آیا کہ آگے نہ بڑھو۔ قلعہ دلاوری میں باغی بہت بھرے ہوئے ہیں[3]

---

[1] تاریخ عروج عہد انگلشیہ صفحہ ۴۴
[2] ۱۸۵۷ء کے ہیرو۔
[3] عروج عہد انگلشیہ

باغیوں کا مایوسی کے باوجود حوصلہ قائم تھا

ایک وہ وقت تھا کہ انگریز محصور تھے اب وہ وقت آیا کہ جانباز حریت محاصرہ کی زد میں آ جائیں۔ لیکن ان کے حوصلہ اور دم خم میں ہر طرف مایوس ہو جانے کے باوجود کوئی فرق نہیں آیا:۔

"محصورین لکھنؤ کو اس ناامیدی نے کہ نہ کہیں سے کمک آئے گی، یا کوئی امداد و دستگیری قابل ہوگی، ان کی ذہانت کو تیز کر دیا تھا۔ وہ اپنی محافظت کے لئے نئی نئی تدابیر اپنی فکر دقیق سے ایجاد کرتے تھے۔ وہ بھری ہوئی بندوقیں اپنے پاس رکھتے تھے۔ وہ کبھی بے ضرورت ایسی جگہ نہیں آتے تھے کہ وہاں ان پر دشمنوں کی زد لگ سکے۔ جب انہوں نے کمین گاہیں بنائیں، تو ان کے بنانے کی کیفیت کبھی فراموش نہیں کرنی چاہیئے محصورین اور محاصرین میں بہت سے مقامات میں فاصلہ ایسا کم تھا کہ طرفین میں سے کسی کی یہ جرأت و ہمت نہیں ہوتی تھی کہ آمنے سامنے ہو کر ایک دوسرے پر بندوق چلائیں جب عام حملہ ہوتا تھا تو دیواروں کی اوٹ میں سے بندوق زنی ہوتی تھی جب فریقین ایسے پاس پاس ہوں تو وہ جان سکتے ہیں کہ ان میں سے گولیاں کس طرف جائیں گی؟ اس لئے اس زد سے بچ سکتے ہیں، غرض یہ اوٹیں طرفین کو ایک دوسرے کی زد سے بچاتیں تھیں اور زیادہ خونریزی نہیں ہونے دیتی تھیں۔ باوجودیکہ طرفین سے رات دن برابر گولیاں چلتی تھیں حملہ کا کوئی مقام متعین نہیں ہو سکتا تھا۔ دشمنوں کے قریب ہونے کے سبب سے محصورین کو رات دن جنگ کے لئے آمادہ رہنا پڑتا تھا۔"[1]

لکھنؤ کا پرچم آزادی سرنگوں ہوتا ہے

دل ناتواں نے مقابلہ کیا اور خوب کیا لیکن ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے، ایک انتہا ہوتی ہے، آخر اس کی طاقت جواب دے گئی اور وہ سرنگوں ہو گیا:۔

"۶ مارچ ۱۸۵۸ء کی صبح کو اوٹرم صاحب کی سپاہ نے حرکت کرنی شروع کی، کمانڈر انچیف نے اپنے معتمد لفٹننٹ کو بھیجا کہ وہ گومتی کے بائیں کنارے پر باغیوں کو شہر

---

[1] تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) صفحہ ۸۵۰۔

کہ اس طرف سے بھاگنے نہ دے اور اپنی بھاری توپوں سے دشمنوں کے مشرقی اور شمالی مورچوں پر حملہ کرے یا ان کو خراب کرے۔ اس سپاہ عظیم کو جو کام کرنا تھا وہ آسان نہیں تھا۔ ستر اسی ہزار آدمی اپنی بہادری، استقلال اور ہوشیاری سے اپنے مستحکم مقام کو استوار کر رہے تھے ان میں سپاہی اور والنٹیر اور مسلح ملازمین جن کو قومی عزت نے مذہبی دیوانگی نے لوٹ کی امید نے جوانمرد عورت حضرت بیگم نائب السلطنت کے علم کے سایہ کے نیچے اور اس کے مشتبہ رقیب مولوی فیض آبادی احمد اللہ شاہ کے جھنڈے کے نیچے ایسے بڑے شہر میں جمع کیا جس کے اندر تنگ گلیاں اندھا دھند بازار تھے اور بڑی بڑی پختہ حویلیاں اور چوک تھے، جو بجائے خود ایک حصن حصین تھے پھر ان کے استوار کرنے کے لیے باغیوں کو بہت وقت مل گیا تھا جو مقام استوار تھے ان کو اور زیادہ استوار بنا لیا تھا۔ شہر بھی ایک بڑی خندق عمارات اور قیصر باغ کے لئے بن گئی تھی ۶ مارچ کو اوٹرم صاحب دالی پور سے پیدل فوج اور ہوپ گرانٹ کے چھ سو رسالہ اور توپخانہ کی پانچ بیٹریوں گومتی کے پار لے گئے جو ندی پر تھے نیپیر صاحب نے بہت کے پیپوں کو رسوں سے جوڑ کر دو تین دن میں تختے لگا کے بنوائے تھے۔ رات کو ندی کے بائیں کنارہ پر آرام کیا۔ دوسرا دن اس میں خرچ ہوا کہ اوٹرم کے پکٹوں پر دشمنوں نے جو حملے کئے ان کو رفع کیا۔ آٹھویں تاریخ کا دن بھاری توپوں کے مورچوں کے بنانے میں صرف ہوا۔

نویں تاریخ کو چکر کوٹھی کے دشمنوں کے مورچوں پر آٹھ توپوں نے گولوں کا مینہ برسایا۔ والی پول کے پیادوں اور توپوں نے اس کوٹھی کو یورش کر کے لے لیا اور مفرور باغیوں کے پیچھے جا کر اوٹرم صاحب نے آسانی سے بادشاہ باغ کو بھی لے لیا مارٹی نیز کوٹھی پر قبضہ کر لیا۔ اس میں لفٹننٹ ٹیلر نے بڑا کام یہ کیا کہ وہ ندی کے پار تیر کر گئے کہ ہوپ صاحب کو اوٹرم صاحب کی فتح سے مطلع کریں۔

دوسرے دن لیوگارڈ صاحب نے بنکس ہوس کو فتح کیا۔ قیصر باغ پر گولہ اندازی شروع ہوئی پھر سکندر باغ آسانی سے فتح ہو گیا۔ اس میں پہلی دفعہ راہ

نومبر میں بڑا قتل ہوا تھا۔ غرض بہت سی عمارات حملہ کرنے سے یا توپوں کے مارنے سے فتح ہو گئیں۔ بیگم کی کوٹھی چند گھنٹے تک گولے مارنے سے فتح ہو گئی۔ جس وقت یہ فتوحات ہو رہی تھیں۔ سر کولن جنگ بہادر سے ملاقات کر رہے تھے جو میدان جنگ میں اپنے ساتھ گورکھوں کو لایا تھا۔ یہ ملاقات بڑی کروفر و شان و شوکت سے ہوئی۔ دونو دوست مل کر بہت خوش ہوئے۔ پھر جنگ بہادر اسی جگہ گیا۔ جو اس کی خیمہ زنی کے لئے تجویز ہوئی تھی۔[1]

علی نقی خاں کی غداری کا صلہ

علی نقی واجد علی شاہ کا وزیر اعظم تھا۔ اس شخص پر بادشاہ آخر وقت تک اعتماد کرتے رہے، لیکن عوام کی نظر میں۔ وہ غدار اور نمک حرام تھا۔ اس نے ملک اودھ کی بربادی، بادشاہ سلامت کی تباہی اور ملت اسلامیہ کی رسوائی کا کوئی خیال نہ کیا، یہ صرف اپنی سربلندی اور سرفرازی کے لئے سرگرداں رہا۔ نجم الغنی اس کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

اس طرح پر جیسا کہ بیان ہوا ملک اودھ بلا تعرض ظلم و سرکار انگلشیہ میں ملحق کر لیا گیا مگر لارڈ ڈلہوزی کے عہد کا یہ فعل جس کی راستی پر وہ ہمیشہ نازاں رہے۔ رعایا کو بہت شاق گزرا اور علی نقی خاں وزیر کے سر پر یہ بدنامی مشہور عام رہی کہ اس نے انگریزوں سے سازش کر کے اپنے ذاتی فائدہ کے لئے ملک اودھ بے انگلی ہلائے چھنوا دیا اور خود بھی اس نمک حرامی کا کوئی مفید صلہ نہ پایا اور آج تک اس کا نام نمک حرام کا مرادف سمجھا جاتا ہے۔ اور اس کے نام کے ساتھ حقارت پیش نظر ہو جاتی ہے۔

بادشاہ کے اوصاف کا اعتراف

مولوی نجم الغنی بادشاہ سے کچھ زیادہ خوش نہیں ہیں، لیکن اعتراف کرتے ہیں:۔

(۱) یہ بادشاہ اس قدر رحم دل اور رقیق القلب تھا کہ باوجود اس قدر سلطنت اور زور و زر کے اس سن شباب میں کسی پر طیش اور بے رحمی نہیں کی بلکہ گالی تک بھی زبان پر نہیں آئی، نہ کسی موافق و مخالف کو ظلم سے ستایا، نہ کسی کی جان لی۔

---

[1] تاریخ ہندوستان، سوم (بغاوت ہند) ذکاء اللہ صفحہ ۵۸

(۲) باوجود اس قدر سلطنت اور جاہ وحشمت اور شباب کے اس بادشاہ میں غرور ونخوت کو نام نہ تھا۔

(۳) یہ بادشاہ اپنی ذات سے عادل تھا۔ کسی موافق اور مخالف یا امیر یا بیگانے کی عدل میں رعایت نہیں کی[1]

واجد علی شاہ قیدِ فرنگ میں

ہندوستان میں غدر شروع ہوا، تو واجد علی شاہ پر بھی آفت آئی۔ وہ اپنے گوشہء عافیت میں انتزاع سلطنت کے بعد، صبر وشکر کی زندگی بسر کر رہے تھے، حکومت سے مایوس ہو چکے تھے۔ اب ان کے دل میں یہ خیال بھی نہ آتا تھا، کہ لکھنؤ واپس جائیں گے اور تخت حکومت پر متمکن ہوں گے۔ اور اگر یہ خیال تھا بھی تو کلکتہ میں رہ کر وہ کیا کر سکتے تھے۔ نہ ان کے پاس فوج تھی نہ سپاہی، نہ دولت نہ ثروت، اخود مٹیا برج بھی تو ایک قسم کا قید خانہ ہی تھا۔ لیکن انگریزوں پر دہشت طاری تھی۔ وہ واجد علی شاہ سے کھٹک رہے تھے، چنانچہ انہوں نے فورٹ ولیم میں بے قصور، اور بے گناہ واجد علی شاہ کو قید کر دیا۔ ابتلا کا یہ دور۔ واجد علی شاہ نے بڑی استقامت کے ساتھ گزارا، واپس آئے، تو ایک ادبی تحفہ "مثنوی حسن اختر" بھی ساتھ لائے اس مثنوی میں انہوں نے اپنی حیات زنداں کا نقشہ کھینچا ہے۔ قلم مصور کا موقلم معلوم ہوتا ہے، مولانا شرر، اس مثنوی کا تعارف کرتے ہوئے فرماتے ہیں :۔

بادشاہ کی علمی استعداد بہت بڑھی ہوئی تھی۔ عربی کے تو عالم تھے۔ مگر فارسی میں ان کا درجہ شاید ابوالفضل سے کچھ ہی کم ہو گا۔ میز پر بیٹھنے کی عادت نہ تھی، اور نہ لکھنے کی قدیم نشست کی قید کو برداشت کر سکتے تھے۔ لیٹ جاتے اور لکھنا شروع کر دیتے تو دم بھر میں دو دو چار چار بند کی نظمیں لکھ ڈالتے جو مشہور و نامور شاران فارسی کے کمال کو یاد دلا دیتیں۔

طبیعت اس قدر موزوں پائی تھی کہ شاید ایسا موزوں طبع نہ دیکھا گیا ہو گا۔ میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا کر اپنے دردولت سلطان خانے سے ہوچے پر سوار ہو کر امام باڑہ سبطین آباد کی مجلس میں

---

[1] تاریخ اودھ جلد ۵ صفحہ ۱۳۹

شریک ہونے کے لئے روانہ ہوئے اور جو مرثیہ و سلام وہاں پڑھیں گے انھیں راستے میں تصنیف کر رہے ہیں، دو کاتب ساتھ ساتھ چل رہے ہیں، ایک کو مرثیہ کے بند تصنیف کر کے لکھواتے ہیں اور دوسرے کو سلام کے اشعار مرثیہ لکھنے والا جب تک مرثیے کا بتایا ہوا بند لکھے سلام لکھنے والے کو سلام کا شعر بتاتے ہیں اور دونوں کو اس قدر جلد بتاتے چلے جاتے ہیں کہ ایک کا بھی قلم نہیں رکنے پاتا، امام باڑہ دو فرلانگ بھی نہ ہوگا، مگر وہاں تک پہنچتے پہنچتے پورا سلام اور مرثیہ کے چھ بند لکھوا دیئے، دو مختلف بحروں پر ایک ساتھ طبع آزمائی کرنا جس قدر دشوار امر ہے اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو شعر کہنے کی مشکلوں سے واقف ہیں۔

بادشاہ کبھی کسی سے اصلاح یا مشورہ نہ لیتے، تعلیم و اصلاح کا زمانہ لکھنو ہی میں ختم ہو گیا تھا مٹیا برج میں وہ استاد بلکہ استاد الکل تھے، ذہن میں یہ بات جمی ہوئی تھی کہ کلام الملوک ملوک الکلام جتنے شعرا لازم تھے سب شاگرد سمجھے جاتے وہ شرف شاگردی حاصل کرنے کی درخواست کرتے بہ عنایت شاہی یہ عزت ان کو دی جاتی اور ایک مہر عطا ہوتی جس میں نام و خطاب کے ساتھ تلمیذ السلطان بھی کندہ ہوتے۔

یہی استادی کلام میں لغزشوں کے رہ جانے کا باعث ہوتی اور قیامت یہ تھی کہ دربار والے چاہے کتنے ہی صاحب کمال شاعر ہوں بجائے تنبیہ کرنے کے لغزشوں پر بے حد داد دیتے لیکن اور جس قسم کی لغزش چاہے ہو جائے یہ ممکن نہ تھا کہ کبھی کوئی مصرعہ غیر موزوں رہ جائے یا بحر سے الگ ہو اور یہ ان کی کمال موزونی طبع کی دلیل ہے (۱)

مولانا شرر کے بیان کی روشنی میں، مثنوی کا پورا پس منظر واضح ہو جاتا ہے، یہ مثنوی اپنے درد و سوز کے اعتبار سے خاصے کی چیز ہے۔ اس میں رفیقان گریز پا کا شکوہ ہے، ممنون کرم اور زیر بار احسان لوگوں کی شکایت ہے، عزیزوں، قرابت مندوں، جان نثاروں، فلاکاروں اور دعوے محبت جتانے والوں کی بے وفائی، کور چشمی، نمک حرامی، غداری، اور خود غرضی کی داستان ہے۔

واجد علی شاہ کو اپنی اولاد سے محبت تھی، اپنی محلات، یعنی بیگمات سے شیفتگی تھی ان میں سے بعض وفادار ثابت ہوئیں، بعض بے وفا، اس مثنوی میں بے وفائی کا گلہ ہے۔ اور وفاداری کی

---

(۱) [illegible]

دادہے۔ بعض بیگمات سے واجد علی شاہ کی شیفتگی عشق کے درجہ سے بھی آگے بڑھ گئی تھی، ان کا جب ذکر کرتے ہیں۔ تو قلم سے پھول جھڑنے لگتے ہیں، سادہ الفاظ میں وہ اثر وہ کیفیت و سحر پیدا ہو جاتا ہے کہ بڑے بڑے فصیح اللسان شعرا کے ہاں نہیں ملتا۔

اس مثنوی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کہیں بناوٹ نہیں، تصنع نہیں نقالی نہیں۔ دل کی کیفیت بے کم وکاست بیان کر رہی ہے۔ جی چاہے پسند کیجئے " جی چاہے ناپسند"

پہنچا تو ہوگا سمع مبارک میں حال میرؔ
اس پر بھی جی میں آئے تو دل کو لگائیے

مثنوی، تقریباً پندرہ سو اشعار پر مشتمل ہے، میں نے بے دردی سے انتخاب کرکے صرف تین سو اشعار رکھے ہیں،

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حمد

خدائے زماں کارساز جہاں
عیاں مثل گل مثل بو ہے نہاں

نعت

ہے اعجاز اس شہ کا شق القمر!
پڑا اس کا سکہ مہ و مہر پر
وہ ہے خاتم الانبیا نیک نام!
علیہ الصلوٰۃ علیہ السلام

منقبت

سزاوار تاج نبی ہے علیؑ!
علیؑ ہے علیؑ ہے علی ہے علیؑ
وہ ہے وارث علم خیر البشر
وہ ہے بادشاہ قضا و قدر

شجاع و دلیر و جری صف شکن
سخی و حلیم و غنی خوش سخن

ساقی نامہ و احوال ضعف در قید خانہ

پلا ساقیا وہ مے سرخ رنگ
کہ ہو نشّہ سے جس کے دل کو امنگ
اکیلا ہے زنداں میں اک مے پرست
شب و روز ہے خوف روز الست
ہوا بھی جو آتی ہے تو ہے سہم گین
نہ یاور نہ مونس نہ کوئی قرین
عیال اور اطفال لوٹے گئے
جہاں میں مرے لال لوٹے گئے

در صفت کرنیل کو نیا صاحب بہادر

وہ کرنیل صاحب سپہر ہنر
کہ ہیں ٹون[1] میجر وہ عالی گہر
ہوئیں ٹٹیاں خس کی مجھ کو نصیب
الٰہی جلیں غم سے اس کے رقیب
ملا کرتی ہے برف بھی آٹھ سیر[2]
یہ کیا جان جو ہو وے ذرا اس میں دیر

صفت ضعف خود در قید خانہ

یہ احوال اعضا ہے جیسے کباب
نہ زلفوں میں بل ہے نہ وہ پیچ و تاب

---

[1] ٹاؤن
[2] سلطنت اودھ کا مطلق العنان بادشاہ آٹھ سیر برف کا شکر گزار ہے ۔ عبرت

نہ چہرے کا وہ ڈھب نہ وہ دل کا حال
ہر اک بال ہے جان وتن کو وبال
وہ پنجہ جو تھا پنجۂ شاہباز
شفیعہ کے خط کی طرح ہے دراز
بھرے بازو تھے جو مرے گول گول
بکیں تو نہیں اب وہ کوڑی کے مول
وہ شانے جو تھے آشیاں ہما
نقاہت سے طوطوں کا ہے گھونسلا
لویں کانوں کی دونوں مرجھا گئیں
گل تر کی کلیاں تھیں کملا گئیں
وہ زانو جو تھے رشک بدر منیر
تو وہ مر گئے غم سے نان شعیر

در صفت بیت الخلا ہائے قید خانہ

پھر اس پر غضب چار سنڈاس ہیں
کہ مجھ دل جلے کے وہ سب پاس ہیں
چلپش یہ جو ہوتی ہے برسات کی
یہ گھٹس جو ہوتی ہے ہر رات کی

در صفت حشرات الارض

وہ مچھر وہ مچھر غضب الاماں
ہر اک رونگٹے میں ہے جن کی زباں
اٹھا ہاتھ مچھر ہلانے کو گر
چبھویا وہیں پہلے ہی نشتر

تمہید

دلا ترک کر اپنے دل کا بیان
سنا اپنی اول سے تو داستان

وہ قصہ سناجو بہت ٹھیک ہو
ذرا بھی نہ پھر اس میں تشکیک ہو

شروع داستان وانتزاع سلطنت وہجرت

یہ واجد علیؒ ابن امجد علیؒ
سناتا ہے اب داستان رنج کی
کہ جب دس برس سلطنت کو ہوئے
جو طالع تھے بیدار سونے لگے
ہوا حکم جنرل گورنر یہ بار
کرو سلطنت کو خلا ایک بار
جفاکش کا شاہ اودھ نام ہے
حکومت کا آخر یہ انجام ہے
جو وہ لاٹ ڈلہوزی اس وقت تھے
مضامین انہوں نے یہ خط میں لکھے
رعایا بہت تم سے ناراض ہے
تمہاری ریاست ہے بدنام تھے
رزیڈنٹ جرنیل اوٹرم جو تھے
گورنر کا خط مجھ کو وہ دے گئے
وہ لائے تھے اس طرح کی ساتھ فوج
کہ جس طرح دریا کی آتی ہے موج
وہ بندہ بہت ان دنوں تھا علیل
کہا دل نے کیا سوچوں اس کی سبیل؟
رعایا یہ سب کہتی تھی واہ واہ !!
کیا ہم کو اس بادشاہ نے تباہ
یہ جائے جو فریاد کو خوب ہے
یہ ناحق جو راضی ہو معیوب ہے

سبھوں کی بس آخر یہ ٹھہری صلاح
کرو چل کے فریاد ہے یہ فلاح
یہ جرنیل اوٹرم سے میں نے کہا
میں جاؤں گا فریاد کو ہے خدا
انہوں نے کہا اس میں مختار ہو
عجب کیا ہے جو لطف سرکار ہو
لیا ساتھ ماں کو اور اک بھائی کو
نہ کچھ کام فرمایا خود رائی کو
ولی عہد کو بھی لیا ہاتھوں ہاتھ
ہوئیں پانچ چھ بیبیاں میرے ساتھ
کیا بندے نے لکھنؤ سے سفر
لیا ساتھ تھوڑا سا کچھ ماحضر
دکھائی دیا ماہ شعبان کا جب
روانہ ہوئے واں سے باصد تعب
بنارس میں آکر رہے چودہ روز
وہ راجہ کی کوٹھی میں ہم سینہ سوز
بہت پیش آیا اطاعت کے ساتھ
اتارا مجھے کوٹھی میں ہاتھوں ہاتھ
وہ مصروف خاطر ہوا اس قدر
فرشتہ بنا کہنے کو تھا بشر
وہاں پر دخانی کیا اک جہاز
چڑھے اس پہ جس دم ہوئے سرفراز
دکھائی دیا جب کہ ماہ صیام
تو کلکتہ میں آئے اسے نیک نام

طبیعت ہوئی یاں زیادہ علیل
نہ لندن میں جانے کی نکلی سبیل
غرض ماہ شوال جب آ گیا
یہ بندہ علالت سے گھبرا گیا
جو تاریخ اس کی ہوئی چودھویں
کیا بیٹا ماں بھائی رخصت وہیں
کہ تم میری جانب سے لندن کو جاؤ
جو گذری ہے مجھ پر ملک کو سناؤ
برس گذرا ہم جو ائے خوش سیر
یکایک جہاں میں اڑی یہ خبر
ہوئی خوب برگشتہ انگریزی فوج
امنڈتی ہے جس طرح دریا کی موج
وہ صفرادی تپ مجھ کو تھی الامان
سلگتی تھی تالو کے اندر زبان
میں سوتا تھا غفلت کا جاگا ہُوا
مقدر ادھر مجھ سے بھاگا ہُوا
یکایک یہ غل کان میں آگیا
غضب ہو گیا ہے ستم چھا گیا
آمدن فوج انگریزی بنابر گرفتاری
ارے دوڑو لِلّٰہ لوگو چلو
اٹھاؤ اٹھاؤ اٹھاؤ اٹھو
کوئی کہتا ہے اب اڑا دیں گے یہ
کہ سب موچی کھوّلا گرا دیں گے یہ

---

[1] وہ بستی جہاں واجد علی شاہ نے مٹیا برج بسایا تھا!

کہا میں نے کیا شور و غوغا یہ ہے
یہ کون آیا ہے کیسا چرچا یہ ہے
فسکتر جو تھے لاٹ کے پیش کار
وہ کہنے لگے مجھ سے اے شہریار
کہ چلئے مرے ساتھ یہ حکم ہے
نہ کیجئے سوا اس کے اب کوئی شے
کہا میں نے کیا وجہ فرمائیے؟
قصور آپ بندے کا بتلائیے؟
کہا حکم سرکار یہ ہے ہوا!
کہ کچھ شبہ سرکار کو آگیا
چلیں گے جو ہمراہ فرمائیے۔
جنھیں ساتھ لینا ہو بتلائیے
سوا آٹھ لوگوں کے ہو وے نہ اور
انھیں ناموں میں کیجئے آپ غور
میں ہر اک کے ظاہر کردں تجھ سے نام
مرے قید خانہ میں آئے جو کام

احوال طبیب الدولہ وگرفتنش از زندان

مری نبض رکھتا تھا وہ ہاتھ میں
پھنسا وہ جواں بھی مرے ساتھ میں
عجب حال ہو ہو گیا اس کا ہائے
یہ اک دن وہ بولا خدا اب چھڑائے
بہت میں نے منت بھی کی اور کہا
مرے ساتھ سے ہو گا راضی خدا!
برس بیس سے تجھ کو پالا ہے یار
نہ چھوڑ اب مرا ساتھ تو زینہار

نہ مانا مرا کوئی اس نے کلام
روانہ ہوا گھر کو وہ نیک نام

ذکر جمال الدین چپراسی

یہ چپراسی تھا اب ہوا جاں نثار
عجب ہے دورنگی لیل ونہار

شیخ امام علی حقہ بردار

یہ ہے حقہ بردار میرا قدیم
ہوا جاں نثار اب یہ لطفِ کریم

حال ولی محمد بولدان بردار

اٹھاتا تھا وہ بولدان کا کلام!
ہوا ساتھ دے کے بہت نیک نام
وہ تھا توپ خانے میں میرے جواں
وہ تھا گولہ اندازوں میں خوش بیاں
ہوا میرے ہمراہ وہ بھی اسیر
بنا قید خانے میں وہ دستگیر

ذکر کریم بخش آب کش

دیا ساتھ سقے نے تھا نیک نام
کرے گا جہاں اس پہ تحسیں مدام

ذکر حاجی نادر بخش کمہار انگشت بردار

اک حاجی بھی قوم کا تھا کمہار
رہا ساتھ بندے کے لیل ونہار

ذکر امامی گاڑی پونچھ قدیم

وہ تھا گاڑی پونچھوں میں نوکر مرا
مرا ساتھ اس قید میں بھی دیا

لہ پیشاب کا برتن

ذکر داروغہ راحت السلطان زن خاصہ بردار
وہ کھانا پکانے کو ہمراہ ہوئی
میرے ساتھ زنداں میں بھی وہ رہی
ذکر کربلائی آبخاصہ بردار زنگہ !
گلوری وہ مجھ کو کھلاتی تھی روز
یہ دل مجھ پہ رہتی ہے وہ سینہ سوز
ذکر محمدی خانم پوشاک دوز
دیا ساتھ اس نے لقانے مرا
یہ پوشاک دوزی میں ہے خوش نما
نقل محبت نامہ فرستادہ لاٹ کننگ
یہ مضمون تھا اس میں سراسر لکھا
محل اب نہایت ہے افسوس کا
یہ مخلص بہت اس میں مجبور ہے
یہ سارے زمانے میں مشہور ہے
وہ مفسد جو پھرتے ہیں بے انصرام
وہ لیتے ہیں اس پاک طینت کا نام
یہ کونسل کی تجویز میں آگیا
کہ مسکن ہو چندے یہاں آپ کا
کریں آپ تبدیل چندے مکاں
کہ ہو بند یہ باب فتنہ یہاں
نہ آئے گا عزت میں حضرت کے فرق
رہے گی چمک بات میں مثل برق
جو کچھ حد امکان میں آئے گا
بحکم گورنر وہ مل جائے گا

احوال تبدیل شدن زندان

جو کوٹھی ہے اک قلعہ کے بیچ ہیں
یہ تجویز ٹھہری وہاں پر رہیں
غرض ہم کو لائے اٹھا کر یہاں
فلک الامان الامان الاماں

کوئی آنکھ ہم سے ملاتا نہیں
پرجانور تک بھی آتا نہیں

درصفت مجاہد الدولہ مرزا زین العابدین

پھپا میرے نواب والاحشم
نہایت ہیں محسن بڑے ذی کرم
یہ کہتے تھے وہ ہاتھ میں لے کے تیغ
نہیں تم سے جاں اپنی مجھ کو دریغ
اگر حکم ہو لالہ گوں رنگ ہو
کہا میں نے موقوف یہ ڈھنگ ہو

محمد معتمد علی خاں بہادر امانت جنگ

دیانت بھی اس طرح سے تھا سپر
کہ جس طرح پروانہ ہو شمع پر

ذکر فتح الدولہ بہادر مرحوم بخشی الملک

ضعیفی میں تھا فتح دولہ کا حال
چراغ سحر کی طرح تھے نڈھال
کہا میں نے ہر چند تم ہو ضعیف
نہ اٹھے گا تم سے یہ بار غلیف[1]
انہوں نے کہا میں تو ہوں جاں نثار
فدا تم پہ ہم ایسے ستر ہزار

---

[1] سخت

گفتار در انتقال نمودن فتح الدولہ بہادر

صفر کے مہینے میں وہ مر گئے
جو کہتے تھے منہ سے وہی کر گئے

ذکر مہتم الدولہ بہادر مصاحب راقم الحروف

وہ پروا نہ آسا فدا مجھ پہ تھا
فدا دل سے وہ باوفا مجھ پہ تھا
یہی قول تھا جب تلک جان ہے
یہ بندہ فدا شہ پہ ہر آن ہے

گفتار در ذکر ذوالفقار الدولہ

وہ سالے ہیں میرے نہیں اس میں شک
میرے ساتھ ہیں قید خانے تلک
فدا رہتے ہیں مجھ پہ پروانہ وار
نہ آیا کبھی ان کے دل میں غبار
مرے نام پر ہیں فدا جان سے
مجھے رکھتے ہیں وہ سوا جان سے

اجازت طلبیدن دیانت الدولہ برائے زیارت عتبات عالیات

دیانت کا دل جبکہ گھبرا گیا!
تو قصد زیارت وہیں آ گیا!
بہت رو یا میں ، میں نے رخصت کیا
مگر حکم کونسل نہ حاصل ہوا
نکلنے پہ ایسا تھا وہ لوٹ پوٹ
لکھے دیتا تھا مال و اسباب و لوٹ
نہ انگریزی میں وہ ہوا پر قبول
نکالا گیا مجھ کو کر کے ملول

ذکر دیوانہ ساختن مہتمم الدولہ خود را

لگا کرنے بے فائدہ مار پیٹ!
بنا ہا تھا پائی سے وہ خوب ڈھیٹ
بمجبوری اس کو بھی رخصت کیا
رہے دونوں، اب سوچی کھوے میں جا

حال جدا شدن کربلائی از زندان

تھی اک کربلائی جوان چار ہیں
وہ بد جس طرح زہر ہو مار ہیں
لڑا کا غضب کی غضب تند خو!
لڑا کرتی تھی سب سے ہر اک سو
خصوصاً سناتی تھی باتیں مجھے
نہ کٹتی تھیں اس غم سے راتیں مجھے
نکالو مجھے کہتی تھی بد تمیز
نہ میں زن کسی کی نہ ہوں میں عزیز
یہاں تک ستایا نکالا اسے
بلا تھی بلا میں نے ٹالا اسے
آمدن یک سارجن[1] میجر بلہ مسعدت
یہ قیدی ہوا بند جب بے گناہ
تو کی پہرے والوں نے حالت تباہ
کر اک صاحب آ کر زباں پہ یہ لائے
خداوند کلمے نہ وہ پھر سنائے
جو کچھ جی میں آیا مجھے بک گئے
یہاں تک بکے آخرش تھک گئے

---

[1] سارجنٹ

کبھی کہتے تھے یہ ہی راجہ ہے کیا
ارے مل کے اس کو کرو سب تباہ
مرے بابا اور ہم مارے گئے
عزیز اس جگہ سے ہمارے گئے
کرو ایسے راجہ کی گردن حلال
بکھیڑا ہی جائے مٹے یہ وبال
یہ بندہ تو سوتا رہا صبح تک
کلیجہ گیا اس کی باتوں سے پک
جو کچھ حادثے مجھ پہ ہو ہو گئے
قلم کس زباں سے سنائے اسے
جوئیں پڑ گئیں ریش بھی ہے دراز
جفاؤں سے آتا نہیں چرخ باز

ذکر انتقال والدۂ مصنّف

کہ اک دفعتہً آیا لندن سے خط
لکھا غم کا مضمون تھا اس نمط!
مری والدہ تھیں جو عفت مآب
وہ جنت کو راہی ہوئی ہیں شتاب
لکھا تھا کہ بھائی نے بھی کی قضا
وہم اس مہینے کی تھی بد بلا!
یہ پڑھا یہ پیٹا کہ غش کر گیا!
یہ سمجھا کہ میں جیتے جی مر گیا!
نویں کو یہ شعبان کی آیا خط
بھتیجی کا احوال تھا اس نمط

کہ وہ رافت آرا بھتیجی جو تھی
گئی سوئے دار البقا دل جلی
برس دن کا سن اس بھتیجی کا تھا
جو اس دل جلی کا جنازہ اٹھا

تولد شدن پسر مصنّف

پھر اس قید خانہ میں پہنچی خبر
کہ اختر محل سے ہوا ہے پسر
اودھ کی وہ ہے ملکۂ نیک نام
وہ گل مثل طاؤس ہے خوش خرام
غضب کی ہے چتون غضب کی ہے چال
کہ ٹھوکر سے ہو کبک تک پائمال
گل گوش خوشبو ہیں مثل چمن
نزاکت کا پتلا ہے گل پیرہن
فدا لالۂ سرخ اس لال پر
نضارت تصدق ہر اک گال پر
سمن بر فدا عشوہ و ناز پر
پری کو ہے رشک اس کے انداز پر
در و لعل و گوہر ہیں دنداں نہیں
عجب تر بھی ہے۔ زنخداں نہیں
جو شانے کہوں تمغے نور کے
تو الماس سے ہاتھ ہیں حور کے
کمر ہے سراب رہ کائنات
ہر اک بات ہے جس طرح ہو نبات

کرن مہر تاباں کی ہر گال ہے
ہراک بھوں نہیں رستم زال ہے
جفا جو نہیں تند خو وہ نہیں
دہن اس طرح جس طرح انگبیں
سرافراز سے سرو قد سے نہال
وہ الھڑ پنے کی غضب بول چال
مگر جب سے وارد ہوئی قید آہ
مہینوں سے زنداں میں ہوں میں تباہ
نہیں حال معلوم کیا رنگ ہے
وہ ہیرے کا ٹکڑا ہے یا سنگ ہے
اسی مہ سے طالع ہوا یہ قمر
نہیں ہم کو صورت سے اس کی خبر
کہ گورا ہے یا سانولا رنگ ہے
وہ ماں پر ہے یا باپ کا ڈھنگ ہے

حال دیگر صاحبات محل مصنف وغیرہ

اسامی ہمراہیاں کر رقم
جو لائے ہیں کلکتہ میں ساتھ ہم
زن و مرد اہل قلم اہل فوج
کہ ہو ایک چشمے کی جس طرح موج
کسی طرح تھے پانچ سو سے نہ کم
ملازم رفیق اور محل ذی حشم
ولی عہد کی ماں محل خاص ہیں
بلطف و مروت خوش اخلاص ہیں

دوم ملکۂ ملک عالی جناب
وہ جرنیل کی والد خوش خطاب
محل میں وہ معشوق اور زاردار
وہ سب محلوں میں ہیں بہت جاں نثار
کہ تاج النسا بھی ہے اس مہ کا نام
سلامت رہے وہ جہاں میں مدام
محل تیرا وہ میرا دلدار رہے
رفاقت کے بالکل سزاوار ہے
ہے محبوبۂ خاص بھی اس کا نام
پری زاد ہے خندہ رو خوش کلام

جعفری بیگم

وہ ہے جعفری بیگم مہ لقا!
خوش انداز نازک ادا خوش نما!
لب سرخ برگ گل گلستان
صدف گوہر صاف کا ہے وہاں
وہ دنداں تبسم میں در عدن
وہ روئے گل تر ہے رشک چمن
شگوفہ کھلا ہے لب و لعل کا
کہوں گیسو مشک ختن ہے خطا
کریں نسر طائر کو آنکھیں شکار
کردں نظم فردوسی رخ پر نثار
کھچیں اس طرح ابروؤں کی کماں
کہ کشتی کو حاضر ہیں دو پہلواں

حباب لب نہر ہیں چھاتیاں
یم[۱] وصل میں لہر ہیں چھاتیاں
سخن کش ہے نازک ادا ماہ رو
بڑی جنگ جو ہے غضب تند خو
قیامت ستم قہر ہر بات ہے
وہ شیریں دہن زہر ہر بات ہے
کھلنڈرا پنا ہر سخن میں عیاں
وہ اچپل ہے چنچل ہے بانکی جواں
ذرا بھی نہیں ہے متانت کا نام
زباں ایسی جیسے کھنچی ہو حسام[۲]
سخن میں درشتی زباں سخت ہے
پئے عاشق نیم جاں سخت ہے
پھپولا بنا ہے جگر ہجر میں
اسے کچھ نہیں ہے خبر ہجر میں
گلوری مقرر جو زنداں میں کی
کئی مرتبہ آکے وہ رک گئی
کبھی کہتی ہے ہاتھ میں درد ہے
غرض مکر و حیلہ میں وہ فرد ہے
کبھی خوش ہے ہم سے کبھی برخلاف
کبھی گرد آئینہ پر گاہ صاف
کبھی لکھنؤ کا وہ کرتی ہے قصد
کبھی کہتی ہے، اے جنوں کھولو فصد

---

۱ سمندر
۲ تلوار

کبھی کہتی ہے کر بلا جاؤں گی
چھپوں گی نہ ہیں بر ملا جاؤں گی
کرائے کا وہ ڈھونڈتی ہے مکاں
کبھی کہتی ہے مجھ کو بلواؤ یاں
ہزاروں پہ جب ہوتا ہے فیصلہ
تو پھر راضی ہوتی ہے وہ باوفا
کبھی چھ ہزار اور کبھی اک ہزار
وہ لیتی ہے مجھ سے ہر اک طرح یار
عجب مخمصے میں ہوں اس زن سے میں
ڈرا قید خانے میں رہزن سے میں
ملال اس کا آتا ہے ہر دم مجھے
نہ مجھ کو وہ اس قید میں چھوڑ دے
تڑپ کر غم سے میں جاں جائے گی
وہ پچھتائے گی سخت پچھتائے گی

حال خود

کبھی سر پہ رکھتا تھا میں کجکلاہ
اودھ کا کبھی میں ہی تھا بادشاہ
ملازم مرے تھے کبھی سو ہزار
مرے حکم میں تھے پیادہ سوار
فقط ستر۷۰ سو تھے اہل قلم
طبیبوں کو کر پانچ سو تو رقم
فقط پندرہ سو تو تھے چوبدار
رعایا وغیرہ کا کیا ہے شمار
کروں ساٹھ ستر محل گر شمار
تو ہو جائے پھر یک قلم آشکار

اب ان میں یہ ہیں پانچ چھ بیبیاں
جو کلکتہ میں ساتھ آئیں یہاں
ہوئے قید اس طرح ہم بے گنہ
اسیروں میں ہوں نام ہے بادشہ
زن و مرد اٹھارہ اور اک بیجاں
شب و روز زنداں میں ہیں دل طپاں
ہر اک اپنے جینے سے بیزار ہے
ہر اک قید غم میں گرفتار ہے
بہشتی جو آتا ہے اور خاکروب
وہ پہرے کی شدت سے ہے سینہ کوب
جو جاروب دیتا ہے وہ سینہ سوز
تو گورا بھی ہمراہ آتا ہے روز
بہشتی کا یہ حال تحریر ہے
وہ جس طرح ہے نقش تصویر ہے
کبھی روشنی والا لائے جو تیل
تو دیتا ہے گورا اسے بھی ڈھکیل
اور اک ہربرٹ صاحب خوش بیاں
سحر شام ہوتے ہیں جلوہ کناں
وہ میجر ہیں کرنیل کے پیش دست
وہ کرتے ہیں زنداں کا خود بندوبست
وہ گنتے ہیں خود آکے شام و سحر
جو بیمار ہو، لیتے ہیں وہ خبر
ہے اک اور داروغہ زنداں کا
کہ ٹاکن ہے نام اس نگہبان کا

کئی خط کئے لاٹ کو بھی رقم
ہوئے سرفراز ایک سے بھی نہ ہم
کسی خط کا لکھا نہ ہم کو جواب
خدا جانے کس امر پر ہے عتاب
منگا ڈلوشتہ جو منشی کے ہاتھ
تو آتا ہے کرنیل صاحب کے ہاتھ
ملائے خدا مجھ کو اولاد سے
چھڑائے مجھے قید بے داد سے
صبیہ پسر میرے تیرہ تھے سب
جنھیں چھوڑ کر قید میں ہوں میں اب
پسر آٹھ تھے پانچ تھیں بیٹیاں
کروں اب میں تفصیل ان کی بیاں
پسر تھا بڑا سب سے نوشیرواں
کہ وہ لکھنؤ میں رہا تھا وہاں

مگر حکم اللہ جو تھا ہو گیا
وہ مجنوں صفت تھا نہیں شک ذرا

ولی عہد کیواں قدر مرزا محمد حامد علی!

وہ ذی علم صاحب ہنر ماہ ہے
وہ الیق ہے با رتبہ و جاہ ہے
صبیہ جو ہے میری ہمشیر کی
ہوا اس سے عقد مہ و مشتری
مؤخر کرو بادشہ سے بہو
تو ہو نام اس ماہ کا ہو بہو

فریدوں قدر رحمہ نیل صاحب مرزا مہر علی
کہ دوں تیسرے اب پسر کا بیاں
وہ ہے شہزادہ مرے ساتھ یاں
وہ ہے سترہ سال کا مہ لقا
خدا نے اسے حسن ذاتی دیا

برجیس قدر بہادر[1]

جو وہ چوتھا شہزادہ ہے رشک بدر
اسے لوگ کہتے ہیں برجیس قدر
وہ چودہ برس کا ہے کچھ شک نہیں
کہوں کیا کہ وہ ہے کہیں کا کہیں
ملاؤں جو حضرت سے لفظ محل[2]
تو نام اس کی ماں کا کھلے برمحل
جو بگڑی تھی آگے سے انگریزی فوج
اسے لے گئی۔ جیسے دریا کی موج
وہ مہ قبضۂ مفسداں میں ہے آہ
بنایا ہے اپنا اسے بادشاہ

مرزا قمر قدر محمد عابد علی

قمر قدر مرزا ہے اب پانچواں
قمر پر مقدم ہے مرزا یہاں
برس سات کا سن ہے اس کا عزیز
وہ ہے لکھنؤ میں سراپا تمیز

---

[1] حضرت محل کے بیٹے جنہوں نے آخر دم تک انگریزوں سے جنگ جاری رکھی۔
[2] حضرت محل، واجد علی شاہ کی بہادر بیوی

مرزا آسمان جاہ بہادر

پسر اب چھٹا آسماں جاہ ہے
وہ بن ماں کا ہے اب مرے ساتھ ہے
پسر کو بھی چھوڑا رہا نہ ہوئی[1]
جو بھاگی رواں سوئے خانہ ہوئی
نہ میں نے بلایا نہ پھر آئی وہ
نکل کر مرے گھر سے پچھتائی وہ

قمر احسن مرزا طال عمرہٗ

بصحت رکھے اس کو پروردگار
میں آنکھوں سے دیکھوں دلدگی بہار
برس چار کا ہے وہ مہ شک نہیں
قمر مہر مہتاب خور مہ جبیں

چھوٹے مرزا

لکھ اب آٹھویں شاہزادے کا حال
وہ ہے چھوٹے مرزا حسیں نونہال
وہ اختر محل سے ہے پیدا ہوا
وہ کلکتے میں ہے ہویدا ہوا!
بیان شاہزادوں کا ہے اب تمام
صبیوں کا لکھ حال اے نیک نام

ذکر شہزادی کلاں مسمات سپہر آرا

سن اب اس کا سن بھی تو اے خوشخصال
کہ گذرے ہیں اب سن کے اٹھارہ سال
سلیماں محل والدہ خوش خرام
تو ہے عظمۃ الدولہ شوہر کا نام

---

[1] بیگم کی بے وفائی کی انتہا،

سپہر آرا ہے نام اس ماہ کا
تو ہے کبریٰ بیگم بھی وہ مہ لقا
ذکر شہزادی مسماۃ پرسر یر آرا
وہ خاقان جمل کی ہے دختر پری
وہ مہ پارہ ہے چار سالہ ابھی
خدایا سلامت رہے شہر میں
مع والدہ ہو وہ اس دہر میں

نواب شہر بانو بیگم صاحبہ

سوم تخت آرا تھی ماہ تمام
لکھوں شہر بانو تو ہو اس کا نام
وہ تھی لکھنؤ میں مع والدہ
سنا اب گئی سوے ملک بقا

نواب رقیہ بانو بیگم صاحبہ

برس تین کی یہ بھی تھی نیک ذات
ابھی منہ سے کرتی نہ تھی ایک بات
سنا یہ عدم کو گئی رشک ماہ
خبر یہ ملی ہے مجھے آہ آہ!

وسیم آرا

لکھ اب پانچویں شاہزادی کا نام
سنا ذکر اس کا کر اب تو کلام
جو وسیم آرا لکھوں اسے جوان
تو ہو بنت سلطان لقب پھر عیاں
ہوا والدہ کا مگر انتقال
اسے پرورش کرتے ہیں عم و خال

ل اصول

ملا مجھ کو یا رب تو آزاد سے
چھڑا پھر مجھے قید بیداد سے
میں ہوں بے گنہ اس جگہ قید و بند
مجھے قلعہ میں خوب پہنچی گزند
نہ غمخوار کوئی نہ ہے راز دار
اُڑے جاتے ہیں ہوش و صبر و قرار

آمدن عرضداشت داروغہ واجد علی داروغہ ڈیوڑھی

یہ اک دن کا ذکر سن رکھ ذرا
کہ کرنیل صاحب نے اک خط دیا
وہ تھا بند اس پر لفافہ تھا بند
نہ پہنچی تھی کھلنے سے اس پر گزند
مرا ایک ہمنام داروغہ تھا
وطن سے یہ خط اس نے مجھ کو لکھا

مضمون عرضداشت واجد علی

یہ مضمون تھا سلطاں سلامت رہے
جہاں میں یہ شہ باکرامت رہے
ہر اک شہزادی ہے در در تباہ
نہ ہے تن پہ کپڑا نہ کھانا ہے آہ
وہ پھرتی ہیں در در ہر اک شہر میں
وہ بہہ بہہ گئیں فوج کی لہر میں
کمشنر کے یاں گر لکھیں آپ خط
تو میں جمع کر دوں گا سب ہر نمط
یہ ذمہ مرا ہے کہ ہوں جمع سب
کہ پھرتی ہیں ناقہ سے وہ بے غضب

لکھیں آپ ہیں سب محل بے گناہ
یہ ناحق ہوئے اس کشش میں تباہ
مگر کل کے دن ان کا اسباب سب
گیا کوتوالی میں ہے بے سبب

حال بے وفائی نواب خجستہ محل

عجب ہے یہ نیرنگ دنیائے دول
زبوں ہے زبوں ہے زبوں ہے زبوں
خجستہ محل تھی جو زوجہ مری
وہ ذیقعدہ کی بارھویں کو گئی
روانہ ہوئی موچی کھوے سے وہ
سبک نکلی الفت کے توے سے وہ
وہ تھی پندرہ سال سے میرے پاس
مری قید سے ہو گئی ہے اداس
نہیں بلکہ لڑ کر وہ راہی ہوئی
مری جان و دل کو تباہی ہوئی
یہاں سو روپے کی تھی تنخواہ دار
نہ آیا مگر میرے گھر میں قرار
مہینہ ریاست میں ڈھائی ہزار
ملا کرتا تھا شک نہیں زینہار
سماجت بھی کی میں نے منت بھی کی
محبت بھی کی اور اطاعت بھی کی
مگر کچھ نہ سمجھی ہمارا پیام
نکل کر کیا ہم کو کیا نیک نام
یہ دنیا کی ہے بے وفائی کا طور
ذرا کیجئے خود نمائی پہ غور

بُرے وقت میں کام آتی نہیں۔
مصیبت میں صورت دکھاتی نہیں
بے وفائی چند صاحبات محل در قید
سر نوک خامہ چٹک رنج سے
نکل بار قاردن ذرا گنج سے
مہک اے گل خامہ وصف یار
دکھا طبع رنگیں کی جلدی بہار
بجا ساز غم ہجر دلداریں
سنا نغمۂ حزن افکاریں
چمک برق دل مثل تیغ الم
ابل بحر مستی نہ کر رنج و غم
ذرا تو مصیبت سے سنبھلے یہ دل
ہوا قید خانہ میں تن مضمحل!
یہ وہ جا ہے جس جا سے بھاگے شعور
یہ وہ جا ہے بھاگے ہنر دور دور
یہ وہ جا ہے عاقل کو ناداں کرے
یہ عالم کو طفل دبستاں کرے
نہ دنیا سے کر دل میں رنج و محن
سنا قصۂ بے وفائی زن
وہ معشوق و دلدار واختر محل
وہ جعفر و قیصر سن اے خوش عمل
یہ سب میری ہیں زوجہ ہائے جبیں
نہیں شک نہیں شک نہیں شک نہیں
طبیعت بہت مری گھبرائی جب
کیا پائے قیصر کا چھلا طلب

منگائی پھر اک شے یہ اک یار سے
مسّی شب آلودہ دلدار سے
یہ اختر محل سے کہا اے قمر
ذرا بھیج دے اپنے کچھ موئے سر
کسی کی نہ مجھ پہ عنایت ہوئی
کسی کی نہ زنداں میں چاہت ہوئی[1]
نہ بھیجی کسی نے مجھے کوئی چیز
کسی نے نہ کی دوستی کی تمیز
مگر ہاں اک اختر محل ہے اتیق
وہ زنداں میں میری ہوئی ہے رفیق
نہیں موئے سر مجھ کو بھجوا دیے
بنا جس طرح مجھ کو پہنچا دیے

گفتار در صرف زر خود بہ زنداں

یہ اختر جو ہے خاکپائے بتاں
یہ شاہ اودھ تھا کبھی اے جواں
مگر اب ہے محبوس اہل فرنگ
طبیعت سے جاتی رہی ہے اُمنگ
کہ برسوں مجھے قید میں ہو گئے
مرے بخت بیدار سو سو گئے
ابھی تک رہائی کی صورت نہیں
وہ دولت نہیں ہے وہ ثروت نہیں
نہیں پوچھی جاتی خطا بے خطا
بہت تنگ اس جا پہ ہے دل مرا

---

[1] بے بسی کی انتہا ہے

اور مذہب بن گیا تھا۔ مجاہدوں اور سرفروشوں کے نقطۂ نظر سے انہیں اتنا شدید اختلاف تھا کہ وہ ان کی نگاہ میں کفر جلی کی حیثیت رکھتا تھا۔ اور اس جرم کو وہ کسی قیمت پر معاف کرنے کو تیار نہیں تھے۔

نواب محمود خاں نے برطانوی سامراج سے بڑی شاندار ٹکر لی۔ تمام انگریز اور غیر مسلم مورخ ان کی شجاعت دلیری اور جذبۂ کار کے اختلاف خیال کے باوجود معترف ہیں۔ لیکن سرسید ان سے اتنے خفا ہیں کہ شائستہ اور مہذب الفاظ میں ان کا ذکر تک گوارا نہیں کرتے۔ انہوں نے تاریخ سرکشی بجنور" میں واقعات کی جو تصویر اپنے مشاہدہ کی بنا پر درج کی ہے۔ اس کے کچھ اجزا ہم پیش کرتے ہیں۔ یہ کتاب اب بالکل نایاب ہے۔ سرسید کی اس تحریر سے اندازہ ہوگا۔ کہ مجاہدین ملت کی کیا وقعت برطانوی سامراج کے مددگاروں کی نظر میں تھی؟

خدا سے دُعا! اپنی تاریخ لکھنے سے پہلے سرسید، خدائے بزرگ و برتر سے دعا کرتے ہوئے فرماتے ہیں

الٰہی تو مجھ کو توفیق دے کہ یہ تاریخ میری پوری ہو اور صحیح بات اس میں لکھنے کی ہدایت کر کیونکہ طرفداری کی تاریخ لکھنی ایسی بے ایمانی ہے کہ اس کا اثر ہمیشہ رہتا ہے اور اس کا وبال قیامت تک مصنف کی گردن پر ہوتا ہے۔ اس تاریخ میں جو کچھ لکھا ہے بہت سا اس میں میری آنکھ کا دیکھا ہے اور بہت سا اپنے ہاتھ کا کیا ہوا اور اس کے سوا جو کچھ لکھا ہے وہ نہایت تحقیقات سے اور بہت صحیح اور نہایت سچ لکھا ہے۔

عمالِ سرکار کی کیفیت پھر آگے چل کر سرسید بجنور، دھام پور، نگینہ اور نجیب آباد وغیرہ کے سرکاری عمال کی کیفیت لکھتے ہیں کہ ان کا نامۂ عمال کیسا رہا۔

تحصیلداران

میر سید تراب علی تحصیلدار بجنور	بہ نیک نامی اپنے کام پر بحال ہوئے
سید قاسم علی تحصیلدار چاندپور	" " " " "
صادق علی خاں تحصیلدار دھام پور	غیر حاضر

سید قادر علی تحصیلدار نگینہ	بدستور بحال ہوئے
احمد اللہ خان بھانجہ محمود خان	باغی
تحصیلدار نجیب آباد ۔ پیشکاراں	
میر مراد علی پیشکار بجنور	باغی
سعد اللہ خان پٹھان پیشکار چاندپور	باغی
میر شہادت علی پیشکار	بہ سبب غیر حاضری برخاست
کریم اللہ خان پیشکار رشتہ مند محمود خان دھام پور	باغی
مادھو لعل پیشکار نجیب آباد	بحال

عملہ خزانہ

بانکے لعل پسر لالہ متھرا داس خزانچی صدر	بحال
بشن لعل گماشتہ	"
سدا سکھ "	"
بہاری لعل "	"
بخشی رام تحویلدار تحصیل بجنور	خیر خواہ رہا اور بحال ہوا
گلزاری مل تحویلدار تحصیل چاندپور	بحال
سیدھو مل تحویلدار تحصیل نگینہ	"
منگل سین تحویلدار تحصیل دھام پور	"
شب لعل تحویلدار نجیب آباد	"

محکمہ کلکٹری

میر امام بخش سر رشتہ دار	دائم الحبس
مظہر اللہ نائب سر رشتہ دار	روبکار پولیس پر بحال ہوا
درگا پرشاد محافظ دفتر	سر رشتہ کلکٹری پر بحال ہوا
بہاری لعل ناظر	بحال
محمد علی پیشکار سڑک	"

عملہ فوجداری

منشی امر سنگھ	سررشتہ دار	بحال
لالہ ہرسہائے نائب	"	"
بنسی دھر	محافظ دفتر	"
پنڈت شمبھو ناتھ	ناظر	"

تھانہ داران

حسن رضا خان	تھانہ دار بجنور	غیر حاضر
گلاب سنگھ	تھانہ دار چاند پور	بحال
بدھ سنگھ	" دھام پور	"
سردار سنگھ	کوتوال نجیب آباد	"
لطافت علی	تھانہ دار منڈاور	"
رتن سنگھ	قائمقام تھانہ دار نانگل	غیر حاضر
گنگا پرشاد	تھانہ دار بڈھ پورہ	تھانہ سیوہارہ میں بحال
محمد حسین خان	" افضل گڈھ	تھانہ نگینہ میں بحال
پربھو لال	" سیوہارہ	تھانہ افضل گڈھ میں بحال
منیر الدین	قائمقام تھانہ دار نگینہ	برخاست

جمعدار نمبر اول

بھولا ناتھ	جمعدار نور پور	بحال
لطف علی	" کوٹ قادر	غیر حاضر
چھیدا لعل	" کیرت پور	برخاست
عبداللہ خان	"	پھانسی پایا
راحت نقی	" نہٹور	ماخوذ

فیل خانہ

سوہن لعل	داروغہ	بحال
رام سروپ	جمعدار	باغی

سررشتہ تعلیم

پنڈت رادھا کشن ڈپٹی انسپکٹر — تحصیلدار دھام پور ہوا

احسان علی سب ڈپٹی انسپکٹر تحصیل بجنور چاند پور — بحال

رحیم اللہ سب ڈپٹی انسپکٹر تحصیل نگینہ و دھام پور — تحقیقات طلب

سر سید کی اس فہرست سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندو ملازمین سرکار ۹۹ فیصد "وفادار" رہے اور غدر کے بعد اپنی خدمات پر بحال کئے گئے۔ مسلمان عمّال سرکار میں ۹۹ فیصد لوگ باغی یا مشکوک قرار پائے لہٰذا یا انہوں نے پھانسی پائی یا ماخوذ ہوئے یا کم از کم برخاست کر دیئے گئے۔ وہ مزید لکھتے ہیں:-

نگینہ لوٹا گیا

"۲۰ مئی کو نگینہ میں مراد آباد کا فیل خانہ لوٹنے کی خبر پہنچی اور نگینہ میں بدمعاشوں کی نیت بد ہوئی اور بازار نگینہ کا بند ہونا شروع ہوا، مولوی قادر علی تحصیلدار نگینہ نے اپنے چپراسیوں اور منیر الدین قائم مقام تھانیدار کو لے کر بازار کا گشت کیا اور دوکانیں کھلوا دیں اور سب کی تسلی و تشفی کی اور سب ہندو مسلمان رئیسوں کو بلا کر ہوشیار رہنے اور اپنے اپنے محلہ کا بند و بست رکھنے فہمائش کی، نہایت تعجب ہے کہ اکیسویں تاریخ مئی کو گیارہ بجے منیر الدین قائم مقام تھانیدار نگینہ نے مولوی قادر علی تحصیلدار کو بجنور کی خبر سنائی، اس خبر سے مولوی قادر علی کو زیادہ تردد ہوا کہ کل مراد آباد کے فیل خانہ لوٹنے کی خبر پر نگینہ میں جب یہ فساد برپا ہوا تھا تو اب بجنور کی خبر پہنچنے پر دیکھئے کیا فساد ہوتا ہے اس لئے چپراسیان تحصیل کو کہا کہ کمر باندھ کر مستعد رہو اور دروازہ تحصیل بند تھا اور کھڑکی کھلی ہوئی تھی مگر تحصیلدار صاحب کو تلنگوں کی کچھ خبر نہ تھی، سنا گیا کہ بعد گفتگو نواب کے تلنگوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ بغیر کمپنی کے ملے اتنا بڑا فساد کرنا مناسب نہیں اس لئے انہوں نے ارادہ مراد آباد جانے کا کیا اور نجیب آباد سے روانہ ہو چکے تھے کہ دفعتاً تین تلنگے راہ کھڑکی تحصیل میں چلے آئے اور تحصیلدار صاحب سے کہا کر رسد تیار کرو اس عرصہ میں بہت سے تلنگے اندر گھس آئے اور تحصیل دار صاحب ... کو گھیر لیا اور سنگین چڑھا کر بندوقوں کو پا بوین کو چڑھا لیا اور بجبر ان کو کچہری کے مکان میں لے گئے اور دفتر کے صندوقوں کو کندوں سے توڑ ڈالا اور پھر خزانہ کے قفل کو توڑ کر خزانہ لوٹنے لگے اس وقت تحصیلدار صاحب کو فرصت ملی اور وہاں سے مع تھانہ دار بھاگ کر ایک مکان میں جا چھپے جب تلنگے تلاش میں پڑے تو وہ شہر میں جا کر اور رستے سے شہر میں آئے ایک جگہ پوشیدہ ہو گئے اور عرضی اطلاعی بحضور جناب صاحب کلکٹر بہادر روانہ کی۔ شہر کے بہت سے بدمعاش ان تلنگوں کے ساتھ ہو گئے اور تحصیلدار صاحب کا اسباب لوٹ لیا۔ اور بازار نگینہ کو لوٹتے ہوئے چلے گئے اور بدمعاشوں نے بھاگیرت کلال کو بھی جو بہت مال دار

آدمی تھا لوٹ لیا جب سب تلنگے شہر سے چلے گئے تو تحصیلدار صاحب نے نگینہ کے ہندو مسلمان رئیسوں کو جمع کیا اور جو شہر میں غدر مچا رہے تھے ان کا بندوبست فہمائش متوسط رئیسان نگینہ کر دیا!

لیکن اب غدر کا ہنگامہ شروع ہو چکا تھا اور فہمائش و افہام و تفہیم کے حدود سے معاملہ گزر چکا تھا، ایک مصیبت ختم ہوتی تھی کہ دوسری نمودار ہو جاتی تھی:-

بجنور کا جیل خانہ ٹوٹنا

نگینہ میں تو یہ آفت ہو رہی تھی اور ہم تینوں افسر بجنور میں بحضور جناب صاحب کلکٹر بہادر حاضر تھے اور درباب حفاظت خزانہ گفتگو ہو رہی تھی کیونکہ خبر یورش گنواراں اور آمد آمد پلٹن گرم تھی یہ رائے قرار پائی تھی کہ کل خزانہ کنوئیں میں ڈال دیا جاوے ہم اس تجویز میں تھے کہ ایک بجے سے کچھ قبل دفعتاً جیل خانہ پر بندوق فیر ہونے کی آواز آئی اور معلوم ہوا کہ جیل خانہ ٹوٹ گیا۔ جناب صاحب کلکٹر بہادر اور میں صدر امین اور ڈپٹی کلکٹر صاحب اور سید تراب علی تحصیلدار صاحب بندوقیں اور تلواریں لے کر جیل خانہ پر چلے اور جس طرف قیدیوں کے غول جانے کا احتمال تھا اس طرف دوڑے۔ قریب آدھے میل دوڑے ہوں گے کہ اس وقت یہ خیال گذرا کہ خزانہ نہ لٹ جاوے اس لئے جناب صاحب کلکٹر بہادر نے مجھ صدر امین کو اور ڈپٹی کلکٹر صاحب کو حکم دیا کہ خزانہ پر جا کر وہاں کا انتظام کرو چنانچہ ہم دونوں خزانہ پر واپس آئے اور فی الفور پہرہ پکٹ قائم کئے اور جناب صاحب کلکٹر بہادر سید تراب علی تحصیلدار جیل خانہ پر تشریف لے گئے اتنے میں جناب مسٹر جارج پامر صاحب بہادر مسلح گھوڑے پر سوار تشریف لائے اور کنجی خزانہ کی مجھ صدر امین کو سپرد کر کے خود مع چند سواران تعاقب قیدیاں فرمایا ہم کو یقین تھا کہ جیل خانہ صرف اس غرض سے لوٹا ہے کہ قیدی اور شہر کے بدمعاش جمع ہو کر خزانہ پر حملہ کریں گے۔ مگر قیدیوں نے جیل خانہ سے نکل کر دریا کی طرف بھاگنا شروع کیا تھا سب کے منہ دریا کے طرف تھے اور بھاگے جاتے تھے اس سبب سے قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ ہمارا خیال غلط تھا یا یہ کہ جب قیدیوں نے جناب صاحب کلکٹر بہادر کو اور جناب جارج پامر صاحب بہادر کو متعدد اور تعاقب کرتے ہوئے دیکھا تو ان کو اس فاسد ارادہ کا پتہ نہ ملا غرض کہ سپاہیوں کی بندوقوں سے چند قیدی مارے گئے اور جناب صاحب کلکٹر بہادر خزانہ پر تشریف لائے اور فی الفور خزانہ نکالا گیا اور مجھ صدر امین نے اپنے ہاتھ سے ایک لاکھ پچاس ہزار روپیہ کنوئیں میں ڈال دیا اور جناب مسٹر جارج پامر

پامر صاحب نے کنگاتنگ تبدیلیوں کا تعاقب کیا۔"

نامحمود خاں کی آمد

سر سید نے محمود خاں کا نام "نامحمود خاں" رکھا تھا اب ذرا اس کی ایک جھلک بھی دیکھ لیجئے :-

اس واقعہ سے پہلے جناب صاحب کلکٹر بہادر نے جملہ رئیسان ضلع کو بجنور میں طلب کیا تھا کہ مع کمک کے واسطے انتظام ضلع حاضر ہوں زیادہ تعجب کی یہ بات ہے کہ اسی روز شام کے قریب نامحمود خاں نے نجیب آباد سے معہ ساٹھ ستر آدمی پٹھان بندوقچی کے بجنور میں پہنچا ظاہر ہیں بلاشبہ یہ بات تھی کہ حسب الطلب آیا ہے، مگر تعجب یہ ہے کہ اپنے ساتھ خالی گاڑیاں واسطے لے جانے خزانے کے نجیب آباد کو لایا تھا۔" اور جب ڈپٹی صاحب سے ملا تو نہایت افسوس سے ہاتھ مل کر کہا کہ کیا غضب کیا جو خزانہ کنوئیں میں ڈال دیا میں تو گاڑیاں واسطے لے جانے نجیب آباد کے لایا تھا۔

ہندو رؤسا متذبذب تھے

وہاں کے ہندوؤں نے اگرچہ اس جنگ آزادی میں مسلمانوں کا ساتھ نہیں دیا تھا، لیکن انگریزوں کی مدد سے بھی کتراتے رہے، وہ چاہتے تھے جب کوئی متعین صورت پیدا ہو جائے تب میدان میں آئیں :-

رئیساں جو کمک کو بلائے گئے تھے ان میں سے بدنصیب نامحمود خاں تو پہلے آ چکا تھا اس کے دوسرے دن چوہدری رندھیر سنگھ صاحب رئیس ھلدور اور اس کے بعد چوہدری پرتاب سنگھ صاحب رئیس تاجپور تشریف لائے تھے اور صرف پانچ پانچ سوار کمک کو دیئے اور کچھ سپاہی ان کے ساتھ تھے اور احاطہ کوٹھی جناب صاحب کلکٹر بہادر میں مقیم ہوئے تھے مگر یہ قلیل کمک اس بڑے فساد کو رفع نہیں کر سکتی تھی افسوس ہے کہ ان رئیسوں میں سے کسی نے توپ کے موجود ہونے سے انکار نہ کیا اگر اس وقت دونوں توپیں ہمارے ہاتھ آجاتیں جیسا کہ ہمارے بعد ضلع میں نکلیں اور اچھی طرح ہماری ہوتی تو کیا عجب ہے کہ برخلاف ان حالات کے جواب پیش آئے اور کوئی صورت ضلع میں پیدا ہو جاتی بھوپ سنگھ تعلقدار بدہ پور باوصف طلب کرنے کے بحضور جناب صاحب کلکٹر بہادر حاضر نہیں ہوا اور نہ کچھ مدد دی، نامحمود خاں جو حاضر تھا اپنے آنے کے بارہ گھنٹے کے بعد بہت بے قرار تھا وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح میں نجیب آباد چلا جاؤں اور طرح طرح کے عذر بجنور کے رہنے میں پیش کرتا تھا مگر ہم کو اس وقت تک چنداں شبہ اس پر نہ تھا ہم اس کے جھوٹے عذروں کو سچا سمجھتے تھے اور ہر طرح

سے اس کی خاطر کرتے تھے کہ بجنور میں مقیم رہے کیونکہ ہم اس کو اس سے بڑی توقع کمک کی تھی مگر ہم خیال کر سکتے ہیں کہ یہ بے قراری اس کی صرف اس سبب سے ہوگی کہ بجنور میں اسکا منصوبہ پورہ نہ ہوا تھا یعنی وہ تلنگے آئے تھے اور نہ خزانہ لے جانے کا اس کو قابو ملا تھا اس لئے وہ گھبراتا تھا اور چاہتا تھا کہ بجنور سے نجیب آباد جا کر اور کوئی نیا منصوبہ کرے غرضیکہ دو روز بہ مشکل ٹھہرا اور پھر نجیب آباد چلا گیا:۔

محمود خاں کی بجنور میں دوبارہ آمد

محمود خاں کچھ عرصے کے بعد بجنور آتا ہے:۔ نامحمود خاں باوجودیکہ پہلی دفعہ ہرگز بجنور میں رہنا نہ چاہتا تھا اب کی دفعہ بلا طلب جناب صاحب کلکٹر بہادر کے نجیب آباد سے بجنور کو آنا خالی شبہ سے نہ تھا چنانچہ یکم جون کو وہ بجنور میں پہنچا اور احاطہ کوٹھی جناب صاحب کلکٹر بہادر میں اس نے ڈیرہ کیا۔ اب کی دفعہ علامتیں بغاوت کی اس کے چہرے سے ظاہر تھیں۔ اور وہ اپنے دل کو اپنی حکومت کے خیال سے خوش کرتا تھا اور اس کے عشق میں چور تھا۔ ڈپٹی صاحب کے سامنے ایسی باتیں کہیں جس سے صاف ارادہ فاسد اس کا ظاہر ہوتا تھا ڈپٹی صاحب نے مجھ کو بلا کر نامحمود کی فاسد نیت سے مطلع کیا میں نے کہا کہ فی الفور مجملہ حال جناب صاحب کلکٹر بہادر سے عرض کرنا چاہیئے چنانچہ اس کی باتوں سے جو فساد اس کی نیت کا ہم کو معلوم ہوا تھا ہم نے جناب صاحب کلکٹر بہادر سے عرض کیا اور یہ تجویز ہوئی کہ نامحمود خاں کو بجنور سے رخصت کیا جاوے اب اس کا جانا مشکل معلوم ہوتا تھا یہ حکمت اس کو بہانے دورہ پرگنہ چاند پور روانہ کیا مگر وہ چلتا ہوا دارانگر کو چلا گیا:۔

انگریزوں نے گاؤں اور دیہات جلا دیئے

یکم جون کو خبر ملی کہ موضع فضل پور میں گنواروں نے لام باندھا ہے جناب صاحب ممدوح نے بیس تیس تلنگے اور بیس سوار اور میر سید تراب علیؒ تحصیلدار بجنور اور میر لطافت علی تھانہ دار منڈاور کو ساتھ لیا اور میر محمود علی پیش کار اور تخمیناً ایک ہزار آدمی ساکنان منڈاور بھی ساتھ ہوئے اور مسمی صبادن پردھان شیخوپورہ کو معہ اس کے دونوں بیٹوں کے ساتھ لیا قریب موضع فضل پور کے باغ میں بہت سے آدمی تخمیناً چار ہزار کے قریب موجود معلوم ہوئے جناب مسٹر جارج پامسٹر صاحب نے سب سے پہلے اپنا گھوڑا آگے بڑھایا اور سواروں کو ساتھ لے کر دائیں طرف سے

ان پر حملہ کیا اور میر تراب علی تحصیلدار اور لطافت علی تھانہ دار اور میر محمد علی پیشکار تلنگوں کے ساتھ ہو کر آگے بڑھے، گنواروں نے ہلہ[1] دیکھ کر بندوقوں کا فیر کیا اور تلواریں کھینچ کر بمقابلہ پیش آئے جب اس طرف سے بندوقوں کی باڑ چلی تو وہ بھاگ نکلے مگر ان پر حملہ کر کے بہت سے آدمیوں کو گھیر لیا اور موضع فضل پور میں آگ لگا دی اور لوٹ لیا، پندرہ بیس آدمی جان سے مارے گئے اور بہت سے آدمی زخمی ہوئے اور تیس آدمی تھیار بند گرفتار ہوئے اور بہت سے آدمی پپی ندی اور گنگا میں ڈوب کر مر گئے اور فضل پور کے سوا جہانگیر پور اور بھر جیو را اور شیخو پورہ اور حسین پور، نرائن پور اور راین پور بھی جلائے گئے ان گاؤں کے لوگ بھی شریک تھے اس اثنا میں دوسری جون کو جناب کپتان گف صاحب بہادر معہ چند سواروں کے میرٹھ سے خزانہ لینے کو بجنور میں تشریف لائے اور پچاس ہزار روپے کوئیں سے نکال کر صاحب ممدوح کے سپرد کئے گئے باوجودیکہ صاحب کے پاس سوار بہت کم تھے اور ڈاکہ والوں کے ہر طرف غول کے غول جمع تھے مگر صاحب موصوف نے بہ کمال دلاوری خزانہ ہاتھیوں پر لدوا چوتھی جون کو براہ گھاٹ دارانگر میرٹھ کیلئے چلے گئے جس دلیری سے صاحب خزانہ لے گئے ہیں، ہر شخص اس کو دیکھکر اور سن کر عش عش کرتا تھا۔ دوسری تاریخ کو جناب مسٹر جارج پاسٹر صاحب بہادر نے قیدیوں کو جو پرگنہ منڈاور میں گرفتار ہوئے تھے بجنور روانہ کیا اور گرد و نواح کے گوجر طلب کئے اور تیسری تاریخ کو بہت سے گوجر حاضر آئے اور اس نے مچلکہ فساد نہ کرنے اور تھیار لاکر دینے اور لوٹ کا مال واپس کر دینے کا لکھوایا اور اس تنبیہ سے نہایت ڈر اور انتظام ضلع میں ہو گیا اور الیسا خیال کیا جاتا تھا کہ شاید تمام ضلع میں شورش جاتی رہے۔

لیکن عوام محمود خاں کے ساتھ تھے

سر سید نے یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ:۔ نا محمود خاں جو دارانگر کی جانب گیا ہوا تھا اس کو کسی نے خبر بھیجی کہ جناب صاحب کلکٹر بہادر خزانہ ہلدور کو روانہ کرتے ہیں ہلدور والوں کا خاندان ضلع میں ایک بڑی دہشت والا مشہور تھا اور نا محمود خاں کو اگر کچھ اندیشہ تھا تو اسی خاندان سے تھا اس نے یہ خیال تھا کہ اگر یہ معاملہ اس طرح پر ہوا تو شاید اس کے دلی ارادوں میں زیادہ دقت پیش آئے یہ خبر سنتے ہی اس نے اپنی بدلی ہوئی نیت کا ظاہر کرنا

[1] یلغار

اور اُس کا اثر دکھانا اپنے دل میں ٹھان کر دفعتاً، ۷ جون ۱۸۵۷ء کو مع اپنے ساتھی پٹھانوں کے بجنور میں چلا آیا اور شام تک کچھ پٹھان نجیب آباد سے بھی آ گئے تھے اور میں خیال کرتا ہوں کہ اس رات نا محمود کے پاس تخمیناً دو ڈھائی سو پٹھان اچھے بندوقچی مع ساز و سامان موجود ہوں گے ہم نے جو پٹھان اور اور لوگ اپنے لئے نوکر رکھے تھے ان کا بلکہ پرانے نوکروں کا بھی خیال نا محمود خاں کی طرف پاتے تھے اور کچھ شبہ نہیں ہے کہ یہ سب لوگ نا محمود خاں سے ملتے تھے اور میٹھی میٹھی باتیں اس سے کرتے تھے اور کیا تعجب ہے کہ کسی راز میں بھی شریک ہوں اس زمانہ میں بجنور میں یہ رفت ہو گئی تھی کہ ہر شخص کے دل میں جم گیا کہ سرکار کی عملداری اٹھ جائے گی - اور بے شبہ نا محمود خاں مسند حکومت پر بیٹھے گا اس لئے ہر ایک شخص اس ضلع کا رہنے والا اس سے راہ و رسم رکھنی ضرور سمجھتا تھا اسی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ سب ہمارے نوکر بھی نا محمود خاں کے ساتھیوں میں سے تھے اور ہم کو ہرگز توقع تھی کہ جبرے وقت پر یہ لوگ ہمارا ساتھ دیویں گے بلکہ ہم یقین جانتے تھے کہ یہ سب نا محمود کے ساتھ ہو جائیں گے -

انگریز بھاگتے ہیں!

محمود خاں کی آمد نے، حالات ابتر کر دیئے، انگریزوں کی ساری دلاوری رخصت ہو گئی وہ راہ فرار اختیار کرنے کی تدبیریں سوچنے لگے اور ان کے یار وفادار ان کی جان بچانے کے لئے اور انہیں امن و امان کے مقام پر پہنچانے کے لئے، جملہ وسائل و ذرائع سے کام لینے پر مجبور ہو گئے

چنانچہ سر سید کہتے ہیں :-

بہت سی مصلحت کے بعد یہ رائے قرار پائی کہ آج ہی رات کو جناب میم صاحب اور عیسائی عورتیں اور بچے اور کچھ مرد بمعیت مسٹر کری صاحب مظفر نگر اور وہاں سے رڑکی روانہ ہو جائیں، اور صرف مسٹر الیگزنڈر صاحب بہادر اور مسٹر جارج پامر صاحب بہادر بجنور تشریف رکھیں، بارہ بجے رات کو یہ صلاح ٹھہر گئی اور میم صاحبہ کی روانگی کی تیاری ہونے لگی اس دن نا محمود خاں کی نیتوں کے سبب جواب بخوبی کھل گئی تھیں - یہ رائے ٹھہری کہ بلا اطلاع نا محمود خاں کے پاس جو احاطہ کوٹھی میں مقیم تھا، میں گیا اور میں نے اس کو پٹھانوں کے غول میں بیٹھا ہوا پایا میں نے اس سے عرض کیا کہ مجھ کو علیحدہ آپ سے کچھ عرض کرنا ہے اول تو اس نے عجیب غرور سے کہا کہ یہاں کون غیر ہے سب بھائی پٹھان ہیں، کہو"

مگر میرے اصرار پر اٹھ کر آیا میں نے اس سے اول یہ بات کہی کہ آپ کو کس نے یہ خبر دی ہے کہ خزانہ ھلدور جاتا ہے یہ بات بالکل جھوٹ ہے اور میں ذمہ وار ہوتا ہوں کہ خزانہ نہیں جانے کا، اس نے جواب دیا کہ میرا منہ کالا ہونے میں اب کچھ باقی نہیں میرے ساتھی پٹھان مجھ کو گالیاں دیتے ہیں اور بہت برا بھلا کہتے ہیں کہ خان بہادر خان تو اپنی موروثی گدی پر بیٹھ گیا، اس کمبخت کو کیا ہوا ہے جو چپکا بیٹھا ہے اور میں نے انگریزوں کا نمک کھایا ہے میں نہیں چاہتا کہ کوئی انگریز مارا جائے اور میرا منہ کالا ہو، اگر انگریزوں کو اپنی جانیں بچانی ہیں تو یہاں سے نکل جائیں اگر کوئی پٹھان مار دے گا تو میں کیا کروں گا۔ علاوہ اس گفتگو کے جس طرز اور انداز پر اس نے مجھ سے باتیں کیں جس کو کیفیت بات چیت کرنے میں متکلم اور مخاطب ہی خوب جانتا ہے، اور سمجھتا ہے اور بیان میں نہیں آسکتی، اس سے مجھ کو یقین ہو گیا تھا کہ آج حکام انگریزی کی جان کو ضرور نقصان پہنچے گا، میں نے اس سے کہا کہ جو بات بغیر فساد کے حاصل ہوا، اس میں فساد کرنا اور بد نامی اٹھانی نہیں چاہیے اگر آپ کی صلاح ہو تو ہم ایسی تدبیر کریں کہ جناب صاحب کلکٹر بہادر سے کہہ کر آج رات کو جناب میم صاحبہ اور صاحبوں کو یہاں سے روانہ کر دیں، دو ایک روز میں جناب صاحب کلکٹر بہادر اور جناب جنٹ مجسٹریٹ بہادر خود چلے جائیں گے اور تم تو اب بدنام ہو ہی گئے ہو، بغیر فساد و بدنامی کے، تمہارا مطلب حاصل ہو جائے گا، اور اسی قسم کے اور باتیں جو مناسب، وقت کے تھیں اس سے کہیں جس سے اس کے دل میں یہ بات پڑی کہ حکام انگریزی کی جان کو نقصان نہ پہنچے اس نے جواب دیا کہ یہ کہاں کا بکھیڑا ہے کہ آج جناب میم صاحبہ جائیں اور پھر حکام جائیں اگر جانا ہے تو آج سب چلے جائیں ورنہ میرا منہ کالا ہو گا یعنی کوئی مارا جائے گا، اس وقت تک تو میں نے پٹھانوں کو روک روک کر رکھا ہے، پھر میرے قابو سے باہر ہو جائیں گے

غرضیکہ جب مجھ کو یقین ہو گیا کہ نامحمود خان نے فساد کرنا بخوبی اپنے دل میں ٹھان لیا ہے اور وہ کسی طرح باز نہیں آنے کا، اس وقت میں نے کہا کہ چلو ہم اور تم چل کر جناب صاحب کلکٹر بہادر سے عرض کریں گے اب یہاں رہنا مناسب نہیں اس نے کہا کہ میں تو نہیں جاتا اور میں صاحب کلکٹر بہادر سے کہہ چکا ہوں کہ یہاں نہ رہیں اور جو شرط نمک حلالی کی تھی اس سے میں دور ہوا اب چاہیں جائیں چاہیں نہ جائیں یہ کہہ کر اپنے پٹھانوں میں جا بیٹھا لاچار میں نے آن کر یہ سب حال جناب صاحب کلکٹر بہادر سے عرض کیا اور اس وقت در باب سپردگی ضلع اور تشریف

بری حکام کی پھر مصلحت ہوئی ایسے حال میں کہ مرادآباد سے فوج باغی کے آنے کی خبر گرم تھی اور کوئی آدمی ملازمان جدید و قدیم میں سے قابل اطمینان کے نہیں تھا اور دشمن قومی بغل میں اور ظاہر ہے کہ ہم تین آدمی بجز اس کے کہ اپنی جان دے دیتے اور کیا کر سکتے تھے کچھ چارہ نہ تھا سوائے اس کے کہ حکام انگریزی سردست حفظ جان کا کریں اور ضلع چھوڑ دیں چنانچہ ہم سب کی یہی رائے قرار پائی اور ہمارے حکام نے بھی اس کو پسند کیا اگرچہ اول اول ڈپٹی صاحب کو اس میں تامل تھا مگر پھر بھی رائے ان کے نزدیک بھی مستحسن ٹھیری اگرچہ اس وقت کو اور مصلحت نہ تھی، بہ نظر دور اندیشی اور اس خیال سے کہ شاید اور کوئی کام کی بات نکل آئے چوہدری رندھیر سنگھ رئیس ہلدور اور چوہدری پرتاب سنگھ رئیس تاج پور سے پوچھا کہ تم ضلع کا انتظام کر سکتے ہو انہوں نے مجبوری اور اس کام کا نہ کر سکنے کا بیان کیا اور درحقیقت ممکن نہ تھا کہ ضلع کے آدمی نامحمود خان کو چھوڑ کر اور کسی کی حکومت قبول کرتے، میں نے صاحب کلکٹر بہادر کے روبرو چوہدری رندھیر سنگھ سے یہ بات بھی کہی تھی کہ ایسی تدبیر ہو سکتی ہے کہ بر وقت آجانے پلٹن باغی کے جب تک وہ ضلع سے چلی جائے حکام انگریزی کی حفاظت رہے چوہدری صاحب نے اس امر کا ہونا بھی غیر ممکن بتایا، غرض کہ سب باتیں رات کے دو بجے طے پائیں اور جناب صاحب کلکٹر بہادر اور جناب مسٹر جارج پامسٹر صاحب بہادر نے بھی روانگی کی تیاری کی"

آقا کی تعریف سرسید مزید فرماتے ہیں:۔

"میں تعریف نہیں کر سکتا، اپنے صاحب کلکٹر کی مروت اور اخلاق اور ہر ایک اپنے متوسل کی پرورش کے خیال کا کہ ایسے نازک وقت میں جناب ممدوح نے سب عیسائی مرد عورتوں اور بچوں کو اپنے ساتھ لیا اور ہم سے پوچھا کہ تم کیا کرو گے؟ ہم بھی بھاگیں گے ڈپٹی صاحب کے اہل و عیال سب ہلدور جا چکے تھے، سید تراب علی تحصیلدار کے اہل و عیال اور چھوٹے چھوٹے بچے اور لڑکیاں سب بجنور میں تھیں، صاحب نے سید تراب علی سے فرمایا کہ ہم سب کو شامل اپنے سمجھتے ہیں اور سب کی حفاظت جان اپنے ساتھ چاہتے ہیں اگر تمہاری عورتوں اور بچوں کو ہمارے ساتھ چلنا ہو تو ہم سب کو لے چلیں گے۔ مگر یہ امر بہت مشکل تھا"

سرسید اور انگریزوں نے محمود خان سے فریب کیا آگے چل کر، سرسید اور ان کے ممدوح حکام فرنگ کے

سیاسی کردار کا ایک افسوس ناک پہلو نظر کے سامنے آتا ہے، فرماتے ہیں:۔

"ہم نے عرض کیا کہ بالفعل کوٹلہ جائیں گے اور وہاں سے جہاں امن ملے پھر جو الفاظ ہماری دلجوئی اور پرورش اور مہربانی کے ہم پر فرمائے ان کا ہم شکریہ ادا نہیں کر سکتے غرضیکہ اس وقت میں اور سید تراب علی اجازت لے کر عورتوں اور بچوں کی روانگی کے مع سامان کوٹھی سے باہر نکلے اور نامحمود خان سے میں نے کہا اب سب جاتے ہیں تم ان صاحبوں کی حفاظت میں بہت کوشش کرو کیونکہ جناب صاحب کلکٹر بہادر کا ارادہ ہے کہ پار پہنچ کر گورنمنٹ کو رپورٹ کریں کہ یہ تمام ضلع تم کو مل جاوے اور اسی قسم کی مصلحت آمیز باتوں سے اس کو خوش کیا اور بخوبی اپنی خاطر جمع کر لی کہ کچھ اب فساد نہیں ہونے کا اس وقت میں اور سید تراب علی تحصیلدار مکان پر آئے اور فی الفور عورتوں کو سوار کر کے تین بجے رات کے جناب صاحب کلکٹر بہادر کی کوٹھی کے احاطہ کے پاس لا کر ٹھیرایا اور خود ہم دونوں جناب ممدوح کے پاس حاضر ہوئے اور سواروں کے افسران سے کہا کہ کچھ سوار ہمراہی کو چلیں ہماری بات کو سن کر سب چپکے ہو رہے مگر قطب الدین رسالہ دار اور جو نئے سوار بریلی سے آئے تھے اور ان کا میل جول نامحمود خان سے ہوا تھا ہمراہی کو مستعد ہوئے اور بہادر علی جمعدار اور تین چار سوار پرانے آمادہ ہوئے ہاتھی سب تیار تھے اور سوار بھی تیار ہو کر کوٹھی پر حاضر ہوئے اس وقت سید تراب علی تحصیلدار کو بھیج کر نامحمود خان کو بلایا گیا اور جناب صاحب کلکٹر بہادر نے فرمایا کہ ہم جاتے ہیں اور ضلع تمہارے پاس چھوڑتے ہیں تم بخوبی انتظام رکھو اور ہمارے اہل کاروں سے کام لو اور آرام سے رکھو نامحمود خان نے کہا کہ لکھ دو میں نے اسی وقت خط لکھا اگرچہ نقل اس خط کی نہیں ہے مگر جو مضمون مجھ کو یاد ہے لکھتا ہوں، امید ہے لفظوں میں بھی فرق نہ ہوگا۔

محمود خاں کے نام کلکٹر بہادر کا خط | مضمون خط موسومہ نامحمود خاں از طرف جناب صاحب کلکٹر بہادر مرقومہ شب مابین ہفتم و ہشتم

جون جو کہ بالفعل انتظام ضلع بجنور کا جب تک کہ سرکار کی مرضی ہو آپ کے سپرد ہوتا ہے آپ کو چاہیئے کہ ضلع کا بخوبی انتظام کرو اور جس قدر اسباب جناب صاحب کلکٹر بہادر اور جناب صاحب جنٹ مجسٹریٹ بہادر کا کوٹھی میں ہے اور جس قدر مال و اسباب دفتر سرکاری ہے اس کی بخوبی حفاظت رکھو مرقومہ ساتویں جون ۱۸۵۷ء

جس وقت یہ کاغذ تحریر ہوا اس وقت حسب تفصیل ذیل روپیہ خزانہ

اور کنوئیں میں موجود تھا ۔

تفصیل	پائی	آنہ	روپیہ
باقیات خزانہ لغایت ۷ رجون ۱۸۵۷ء	۴	۲	۹۶۰۹۹
بابت شفاخانہ نگینہ و نجیب آباد	-	-	۲۲۰۰
بابت تنخواہ اہل کاران مفصل	-	-	۳۵۰۰
آمدنی کارخانہ جیل خانہ	۱	۵	۵۹۳
میزان ناظر	-	-	۱۵۰
بابت حساب خزانچی	۱۱	۱	۶۷۹۷
	۴	۹	۱۰۹۴۳۹
اسٹامپ و افیون			
کاغذ اسٹامپ	-	-	۳۸۰۰۰
ٹکٹ ڈاک	-	-	۲۵۰
افیون بحساب خرید سرکار	-	-	۳۹۶۰
بابت اضافہ قیمت نرخ فروخت افیون	-	-	۳۹۶۰
	-	-	۴۶۲۷۰

نواب محمود خاں

سرسید بڑے افسوس کے ساتھ لکھتے ہیں "یہ خط بعد دستخط نامحمود خاں کو دیا گیا اور وہ بدنصیب اس کو لے کر باہر آیا جناب صاحب کلکٹر بہادر نے کلمات رخصت ہم سے فرمائے اور جو رنج اور درد جدائی کا ہمارے دل پر تھا وہ ہم نے ظاہر کیا تھوڑی دیر بعد سب سوار ہونے کو کوٹھی کے برآمدہ میں آئے اور جناب صاحب کلکٹر بہادر اور جناب صاحب جنٹ میجسٹریٹ بہادر نے بہ کمال عنایت مجھ کو اور سید تراب علی تحصیلدار کو رخصت کیا کہ اپنی عورتوں کو ساتھ لے کر چلے جاویں، ہم رخصت ہوئے اور جناب صاحب کلکٹر بہادر اور سب صاحب سوار ہو کر تشریف فرما ہوئے ڈپٹی صاحب مع چوہدری رندھیر سنگھ ہلدور کو چلے گئے، وہ سب نمک حرام پرانے سوار مع بہادر علی جمعدار کے گنگا کے کنارے پرے نامحمود خاں کے پاس بھاگ آئے مگر نئے سوار رڑ کی

تک ساتھ رہے اور وہاں پہنچ کر بگڑ گئے ان کا کوٹ ہوا جناب صاحب کلکٹر بہادر کی عنایت سے ان کی جان بخشی ہو گئی محمود خاں نے سورج کو بھی اچھی طرح نکلنے نہیں دیا کہ بجنور میں اپنے نام کی منادی ان الفاظ سے کی خلق خدا کی ملک بادشاہ کا، حکم نواب محمود خاں بہادر کا اور نواب بن بیٹھا۔

محمود خان کا خاندان

مناسب یہ ہے کہ اس مقام پر تھوڑا سا حال نا محمود خان کے خاندان کا بیان کروں نا محمود خان پوتا ہے نجیب خاں کا جو احمد شاہ کے وقت میں یعنی ۱۷۴۵ء میں دوندے خان کا نوکر تھا اور اس کی طرف سے پرگنہ دارا کی تحصیل کرتا تھا اس نے بہت سے لوگ اپنے ساتھ جمع کئے اور ان پرگنہ جات پر جو اب ضلع بجنور میں ہیں قبضہ کر لیا، پھر دوندے خاں کی بیٹی سے اس کی شادی ہوئی اس سبب سے مستقل مالک اس ملک کا ہو گیا اور بادشاہ کے دربار تک بھی رسائی کر لی۔

جب عالم گیر ثانی تخت پر بیٹھا یعنی ۱۷۵۳ء میں تو نجیب خان نے جیت سنگھ ڈکیت کو مار کر کچھ گنگا پار کا علاقہ بھی جو اب سہارن پور میں شامل ہے اپنے ملک میں ملا لیا۔ اور بادشاہ کے دربار سے اس کو نجیب الدولہ اور امیر الامرا کا خطاب ملا اور ۱۷۵۵ء میں اس نے قلعہ پتھر گڈھ بنایا اور نجیب آباد بسایا جب نجیب الدولہ ۱۷۷۰ء میں مر گیا اس کا بیٹا ضابطہ خاں اس کی جگہ بیٹھا نواب شجاع الدولہ لکھنؤ والے نے بسبب نہ ہونے روپیہ معاملہ مرہٹوں کے جس کا ضامن شجاع الدولہ ہو گیا تھا، ضابطہ خان کو ۱۷۷۴ء میں اس ملک سے خارج کر دیا، ضابطہ خان نے نواب عبد الاحد کی سفارش سے ۱۷۷۶ء میں بابت سہارن پور کی سند بادشاہ سے حاصل کی اور غوث گڈھ میں رہنا اختیار کیا۔

اس کے مرنے کے بعد غلام قادر خان اس کا بیٹا اس کی جگہ بیٹھا اور اس نے شاہ عالم کو اندھا کیا مہاراجہ سندھیا نے اس جرم میں اس کو بعد مقابلہ گرفتار کیا اور لوہے کے پنجرے میں قید کر کے اور ایک ایک عضو جدا جدا کر کے مار ڈالا معین الدین خان عرف ننھو غلام قادر کا بھائی بھاگ کر پنجاب چلا گیا۔

جب سرکار دولت مدار انگریزی نے اضلاع دہلی کو فتح کیا تب ننھو خان کو بلا کر بہت خاطر کی اور پانچ ہزار روپے مہینے کی پنشن مقرر کر کے بریلی میں رہنے کا حکم دیا اور پھر مسٹر کولبرک صاحب بہادر کی رپورٹ سے ۱۸۱۲ء میں نجیب آباد میں آباد ہوا، اس کے مرنے کے بعد سرکار دولتمدار

انگریزی نے بہ نظر رحم محمود خان اور جلال الدین خان اس کے بیٹے اور بیٹیوں کے لئے ہزار روپیہ ماہواری پنشن مقرر کی اور ہر ایک شخص کو اس خاندان میں سے بہت بڑے بڑے معزز عہدے عطا فرمائے کہ تمام خاندان بہ کمال عزت اپنی زندگی بسر کرتا تھا۔ نتھو خان نے اس زمانہ میں جب کہ ایک جعلی غلام قادر خان دہلی میں اکبر شاہ کے دربار میں آیا تھا، بادشاہ کے یہاں رسائی پیدا کی اور اپنے بیٹوں کے نام خطاب حاصل کیا اب اس غدر میں اس خاندان نے سرکار دولت مدار انگریزی سے نمک حرامی کی، اس مقام پر کرسی نامہ اس نمک حرام خاندان کا لکھا جاتا ہے،،

محمود خان کی حکومت

جب کہ ہم رخصت ہو کر کوٹلہ کی طرف روانہ ہوئے راہ میں ہم کو بہت سے غول سپاہیوں کے نجیب آباد سے بجنور آتے ہوئے ملے اور کوٹلہ میں شفیع اللہ خان بھانجا محمود خان کا ملا جو نجیب آباد کو آتا تھا، ہم نے دو تین روز کوٹلہ میں قیام کیا اور ہم اس فکر میں تھے کہ یہاں سے کدھر جاویں اور کیونکر جاویں کہ اس درمیان میں متواتر احکام نا محمود خان کے ہماری طلب میں پہنچے آخر سوار آن کر ہم کو بجنور لے گئے اور سید تراب علی تحصیلدار کے قبائل نگینہ روانہ ہو گئے اور ڈپٹی صاحب بھی ہلدور سے حسب الطلب بجنور میں آئے ہم سب نے نا محمود خان سے ملاقات کی مگر جیسا کہ وہ چاہتا تھا اس کو نذریں نہیں دیں، تھوڑی دیر بعد اس نے ہم کو رخصت کیا اور یہ بات کہی کہ بدستور اپنا کام کرو، ہم نے بجنور میں دیکھا کہ رام سروپ کا بہت عروج ہے اور اس کی معرفت باغی تلنگے نواب کے پاس نوکر ہوتے جاتے ہیں، اس کے دوسرے دن سے نا محمود خان نے نیا بندوبست کرنا شروع کیا، عظمت اللہ خان ٹھاکر دوارہ کو اپنا نائب اور احمد اللہ تحصیلدار نجیب آباد کو ڈپٹی کلکٹر معتمد اور جوائنٹ مجسٹریٹ مقرر کیا، مگر احمد اللہ خان نے ایسی مداخلت بہم پہنچائی اور نواب کو بالکل ایسا اپنے قابو میں کر لیا کہ تمام انتظام فوج اور ملک اور مال اور عدالت کا اس کو اختیار تھا اور درحقیقت نواب صرف بزاخفش رہ گیا تھا، فوج سوار اور پیادہ کے رکھنے کو حکم جاری کر دیا اور جو جو لوگ پرانے عہدہ دار نواب کے خاندان کے تھے وہ پرانے عہدوں پر مامور ہونے کو طلب ہوئے اور احمد یار خان عرف کلن خان سپہ سالار اور حبیب اللہ خان بخشی فوج مقرر ہوا ہم اس حال کو دیکھ کر بہت گھبراتے تھے، علی الخصوص اس بات سے کہ جو کوئی نواب کے سامنے حکام انگریزی کا نام لیتا تھا تو وہ بہت ناراض ہوتا تھا، جبکہ نواب نے ہم کو کہا کہ تم سب اپنا اپنا کام کرو اور اس وقت میں نے اور سید تراب علی تحصیلدار نے اور پنڈت رادھا کشن ڈپٹی انسپکٹر نے باہم مشورہ کیا اور آپس کی ایک کمیٹی بنائی اور یہ تجویز کی کہ ہم میں سے کوئی شخص کوئی کام نہ کرے جب

تک کہ باہم کمیٹی کے اس کی جو صلاح ٹھیرے ۔ چنانچہ اسی وقت کام کرنے کے باب میں یہ رائے ٹھیری کہ میر سید تراب علی تحصیلدار بجنور جو ضروری حکم نواب صاحب کا پہنچے اس کی لاچار تعمیل کریں اور باقی احکام سب ملتوی پڑے رہنے دیں اور باقی مال گزاری بجز اس قدر روپے کے جس سے تنخواہ عملہ تحصیل و تھانہ تقسیم ہو جاوے اور کچھ وصول نہ کریں ۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور تحویلدار کی معرفت کہ وہ بھی خیر خواہ سرکار اور ہمارا ہمراز تھا مالگذار آیا اس کو فہمائش کی گئی کہ روپیہ مت دے اس تساہل تحصیل سے نواب ناراض ہوا اور احکام سخت بھیجنے لگا اور کلمات نا ملائم پروانجات میں تحریر ہونے لگے اور نسبت اجرے کار دیوانی یہ رائے ٹھیری کہ جب تک ہو سکے میں صدر امین بموجب آئین سرکار دولت مند انگریزی کام کرتا ہوں اور کسی طرح کا تعلق نواب سے اس کام کا نہ رکھوں ۔ چنانچہ مجھ صدر آمین نے ایسا ہی کیا اور جو روبکاریاں اور رپورٹیں قابل ارسال بحضور جناب صاحب جج بہادر تھیں ان پر علی الاعلان انگریزی میں بھی حکم تحریر ہوتا رہا کہ بحضور جناب صاحب جج بہادر بھیجی جاویں ۔ اس میں فائدہ یہ تھا یہ عوام یہ سمجھتے تھے کہ حکام انگریزی کا تسلط بدستور ہے البتہ نواب کو یہ امر بہت ناگوار تھا ۔ اور ایسی باتوں سے اس کی دشمنی ہمارے ساتھ زیادہ ہوتی جاتی تھی ، مگر ہم کو توقع تھی کہ ہمارے حکام بہت جلد پھر ضلع میں تشریف لاتے ہیں ۔

محمود خان کے عزائم

در فوج نمک حرام باغی جو مراد آباد میں مقیم تھی اس کے ساتھ سازش کرنے کی نامحمود خان کو بہت فکر تھی اور خبر آمد آمد فوج مراد آباد کی بجنور میں بہت گرم تھی اور خطوط بھی مراد آباد سے در باب قصد روانگی فوج کی جانب بجنور کو آئے تھے اس لئے نامحمود نے رام سروپ جمعدار جیل خانہ اور مصاحب علی دفعہ دار سواروں کو مع چند اپنے معتمدوں کے دھام پور روانہ کیا اور مراد آباد میں خطوط بھیجے کہ فوج کو سمجھا دیں کہ صاحبان انگریزی یہاں سے مع کل خزانہ کے چلے گئے ۔ اب یہاں نہ خزانہ ہے نہ حکام انگریزی پھر یہاں آنا بے فائدہ ہے اور اگر بہ ارادۂ ملازمت میرے پاس آویں تو ان کا گھر ہے جب یہ خبر فوج والوں کو ہوئی تو انہوں نے آنا بجنور کا ملتوی کر دیا اور رام سروپ وغیرہ دھام پور سے واپس آئے چند روز بعد نواب کو کسی طرح معلوم ہوا کہ فوج باغی کا ارادہ ہے کہ گھاٹ دارانگر سے گنگا پار اتریں اس لئے اس نے در باب فراہمی رسد احکام بنام تحصیلداران جاری کئے اور تعلقہ داران کے نام بھی پروانہ رسد رسانی کے لکھے چنانچہ جو پروانہ بنام چوہدری پرتاب سنگھ رئیس تاج پور لکھا

تھا۔ اس کی نقل یہاں لکھتا ہوں ۔

نقل پروانہ دستخطی نواب محمود خان

"رفعت و عوالی مرتبت عزیز القدر چودھری پرتاب سنگھ رئیس تاجپور بخیریت رہو جو یہ اطلاع اور چلٹن مراد آباد کے پروانہ جات بنام تحصیلدار چاند پور دھام پور وغیرہ دربارۂ انتظام فراہمی رسد وغیرہ مقام فرودگاہ لشکر پر جاری ہوئے ہیں لہذا تم کو لکھا جاتا ہے کہ تم بھی جس قدر ہو سکے دربارہ انتظام دے دینے رسد وغیرہ کے مدد و معاون ان کے رہو تاکید جانو مرقوم ۱۷ اجون ۱۸۵۷ء"

اس عرصہ میں نواب کے پاس بہت سے رشتہ مند اس کے جمع ہو گئے اور اس کے اپنے رشتہ داروں کی پرورش منظور ہوئی اور یہ بھی اس کو خیال تھا کہ یہ معزز عہدہ دار بسبب خیر خواہ ہونے سرکار کے میری مرضی کے موافق کام نہیں کرنے کے ، اس لئے ۲۷ اجون ۱۸۵۷ء کو پہلی بسم اللہ اس نے مولوی قادر علی تحصیلدار نگینہ کو برخاست کیا اور عباد اللہ خان اپنے رشتہ مند کو جو پیشکار تحصیل کاشی پور ضلع مراد آباد تھا۔ تحصیلدار نگینہ مقرر کیا جب مولوی قادر علی برخاست ہو کر بجنور میں آئے ۔ نواب کچھ متوجہ نہ ہوا انہوں نے اس اپنی برخاستگی کو غنیمت سمجھا ان آفات سے علیحدہ ہو جانا بہت اچھا جانا ۔ اب ہم راست مقام پر پروانہ برخاستگی مولوی قادر علی کو بعینہ نقل کرتے ہیں ۔

نقل پروانہ برخاستگی محمود خان

"رفعت و عوالی مرتبت عزیز القدر مولوی قادر علی تحصیلدار نگینہ بعافیت باشد جو بہ نظر انتظام حاضر ہونا تمہارا حضور میں ضرور ہے لہذا حسب الحکم روبکار امیروزہ تم کو لکھا جاتا ہے کہ تم کار مفوظہ اپنا سپرد برادر عزیز القدر گرامی شان محمد عباد اللہ خان کر کے حاضر حضور ہو اور تم اپنے دل میں کچھ فکر اس کا نہ کرو کہ تم سے حضور میں کار سرکار نہ لیا جائے گا المرقوم ۲۷ اجون ۱۸۵۷ء۔"

سرسید اور احمد اللہ خان

"اسی تاریخ نا محمود خاں نے رات کے وقت مجھ صدر امین کو اپنے پاس بلایا اور نا محمود خان اور احمد اللہ خان نے تخلیہ میں مجھ سے کہا کہ ہم چاہتے ہیں کہ تم ہمارے ساتھ شریک ہو جاؤ اور تم ہم سے ہمارے ساتھ شریک ہونے پر حلف کرو اور جو جاگیر چاہو نسلاً بعد نسل ہم سے ٹھیرا لو اور ہم سے حلف لو کہ ہم ہمیشہ وہ جاگیر بحال رکھیں گے اوّل تو مجھ کو بڑا ڈر ہوا کہ کیا جواب دوں پھر میں نے اپنے دل کو اس

بات پر تسلیم کیا کہ سچی اور سیدھی بات کہنی ہر وقت اچھی ہوتی ہے میں نے عرض کیا کہ نواب صاحب میں اس بات پر حلف کر سکتا ہوں کہ میں ہر حال میں تمہارا خیر خواہ ہوں گا اور کسی وقت تمہاری بدخواہی نہ کروں گا۔ اگر تمہارا ارادہ ملک گیری اور انگریزوں سے لڑنے اور مقابلہ کرنے کا ہے تو میں تمہارے شریک نہیں ہوں اور میں نے کہا۔ خدا کی قسم میں یہ بھی صرف تمہاری خیر خواہی سے کہتا ہوں کہ تم اس ارادہ کو دل سے نکال دو حکام انگریزی کی عملداری کبھی نہیں جائے گی اگر فرض کرو کہ تمام ہندوستان سے انگریز چلے گئے تو حکام انگریزی کے سوا کوئی عملداری ہندوستان میں نہ کر سکے گا۔ اور میں نے کہا، کہ تم اطاعت سرکار اپنے ہاتھ سے مت دو اگر بالفرض انگریز جاتے رہے جیسا کہ تمہارا خیال ہے تو تم نواب بنے بنائے ہو تمہاری نوابی کوئی نہیں چھینتا اگر میرا خیال سچ نکلا تو تم خیر خواہ سرکار ہو گے اور سرکار کی طرف سے تمہاری ترقی اور قدر ہوگی۔ اگر تم مجھ کو انتظام ملک میں شریک کیا چاہتے ہو تو جناب صاحب کلکٹر بہادر سے اجازت منگا لو اور اقرار کر لو کہ کوئی کام نہیں کرنے کے جب تک پہلے اس کی منظوری جناب صاحب کلکٹر بہادر سے حاصل نہ کر لیں اگر نامحمود خاں میں عقل ہوتی تو سمجھتا کہ یہ سب باتیں اس کے بھلائی کی تھیں مگر چونکہ جبلت اس کی بدی پر تھی وہ ان باتوں سے ناراض ہوا اور چیں بجبیں ہو کر مجھ کو رخصت کر دیا اور ہر طرح ہماری دشمنی کے درپے ہو گیا اور جان لیا کہ یہ لوگ رفاقت سرکار انگریزی سے باز نہ آئیں گے تو پھر ہم پر زیادہ تر زیادتی شروع کی میرے خاص رہنے کے مکان کو بہ جبر مجھ سے چھین لیا اور اپنے فوج کے افسر کو دے دیا جو اسباب اس میں بند تھا وہ سب فوج والوں نے لے لیا سید تراب علی تحصیلدار کا گھوڑا بہ تعیناتی ۴۰ سپاہیوں کے چھین لیا اور ہر طرح سے درپے ہمارے آزار کے ہو گیا۔ ہم دن رات فکر میں تھے کہ کس طرح نواب کے پنجہ سے نکل جاویں مگر ممکن نہ تھا۔"

بجنور میں جہادیوں کا ورود

"یہ ہنگامہ ہنوز زیرپا تھا کہ دفعتاً منیر خاں نامی کنج پورہ نگینہ سے جہادی بن کر معہ جمعیت چار سو آدمی کے بجنور میں داخل ہوا اور احمد اللہ خاں جو نجیب آباد گیا ہوا تھا اس فساد کی خبر پاکر بجنور میں آیا اور احمد یار خاں عرف کلن خاں سپہ سالار اور نادر شاہ رسالہ دار رخصتی رجمنٹ ملتان جو بجنور میں آگیا تھا۔ درمیان میں پڑے اور آپس میں نواب کے اور چودھریوں کے صلح ٹھہری احمد اللہ خاں اور دونوں چودھری صاحب ۳۰ جون ۱۸۵۷ء کو کچہری تحصیل میں آئے اور بہت سی گفتگو کے بعد صلح

ٹھیری احمد اللہ خاں چودھری صاحبوں نے گنگا جل اٹھایا کہ ہم نواب کے تابعدار اور مطیع رہیں گے اور احمد اللہ خاں نے اسی جلسہ میں کلام اللہ پر مہر کی کہ ہم چودھریوں کے ساتھ برائی نہیں کریں گے اور نا محمود اللہ خاں اور عظمت اللہ خاں نے کوٹھی پر سے کلام اللہ پر مہر کر کے بھیج دی اور آپس میں صلح ہو گئی۔ ۲۴ جون ۱۸۵۷ء کو بانکے رائے خزانچی سے ۴ ہزار روپے لینے ٹھیرے اور وہ بکس جناب مسٹر جارج پامسٹر صاحب بہادر کا بھی جو خزانے میں تھا لے لیا اور خزانچی کے مقام پر سے پہرہ اٹھ گیا۔ منیر خاں جہادی نے بجنور میں بہت غلغلہ مچایا اور مجھ صدر امین اور رحمت خاں صاحب ڈپٹی کلکٹر اور سید تراب علی تحصیلدار بجنور پر یہ الزام لگایا کہ انہوں نے انگریزوں کی رفاقت کی ہے اور ان کو زندہ بجنور سے جانے دیا ہے اور اب بھی انگریزوں سے سازش اور خط و کتابت رکھتے ہیں اس لئے ان کا قتل واجب ہے اور درحقیقت خفیہ خط و کتابت جناب مسٹر جان کری کرافت ولسن صاحب بہادر سے جاری تھی اور اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ ہمارے ساتھ فساد کرنے میں نواب کا اشارہ بھی تھا کیونکہ اس میں بڑی حکمت یہ تھی کہ جہادیوں کے ہاتھ سے ہم لوگوں کے مارے جانے میں نواب کی کچھ بدنامی نہ ہوتی تھی اور کام نکلتا تھا اور پنڈت رادھا کشن ڈپٹی انسپکٹر کی نسبت علاوہ اس الزام کے یہ بھی جرم لگایا گیا تھا کہ عیسائی مکتب ہر جگہ بٹھاتا پھرتا ہے غرض کہ منیر خاں نے ہم پر زیادتی کی اور بہ جبر حکومت ہم کو طلب کیا اور کہلا بھیجا کہ اگر حاضر نہ ہوں گے تو بہتر نہ ہوگا۔ اور بڑی مشکل یہ ہوئی کہ چند چپراسیان تحصیل ہم سے مخالف اور جہادیوں سے جا ملے تھے اس لئے لاچار میں اور سید تراب علی تحصیلدار اس کے پاس گئے منیر خاں نے مجھ سے در باب مسئلہ جہاد گفتگو کی میں نے اس سے کہا کہ شرع کے بموجب جہاد نہیں ہے اور اسی قسم کی گفتگو کے بعد ہم وہاں سے چلے آئے اس کے دوسرے دن منیر خاں مذکور مولوی علیم اللہ رئیس بجنور کے پاس گیا اور در باب مسئلہ جہاد ان سے گفتگو کی اور بہت دلیلوں سے اس کو قائل کیا کہ مذہب کی رو سے جہاد نہیں ہے مگر اس گفتگو پر بہت دنگ ہوا اور منیر خاں کے ساتھیوں نے مولوی علیم اللہ کے قتل کو تلوار نکالی۔ مگر لوگوں نے بیچ میں پڑ کر بچا دیا۔ اس کے دوسرے دن منیر خان مع اپنے ساتھیوں کے بجز ان چند آدمیوں کے جنہوں نے اس گفتگو کے بعد ساتھ چھوڑ دیا تھا دہلی چلا گیا۔ اور وہاں جا کر لڑائی میں مارا گیا"

بہادر شاہ کا فرمان محمود خاں کے نام | ۲۸ رجون ۱۸۵۷ء کو محمود خان جو نا محمود خان

کی عرضی لے کر بادشاہ کے پاس دہلی گیا تھا مع فرمان بادشاہی موسومہ نامحمود خاں بجنور میں آیا
اور اس کے ساتھ لالہ متھراداس پدر لالہ بانکے رائے خزانچی بھی دہلی سے بجنور آئے اور
عمدہ خان نے وہ فرمان نامحمود خاں کو دیا چنانچہ اس کی نقل اس مقام پر لکھتے ہیں۔
نقل فرمان بادشاہی مورخہ ۲۰ ذیقعدہ سنہ ۱۲۷۳ جلوس مطابق ۱۲ جولائی ۱۸۵۷ء

۱۲ ۵۲
محمد بہادر شاہ بادشاہ غازی
ابوظفر سراج الدین

فدوی خاص لائق العنایت والاحسان امیر الدولہ ضیاء الملک محمد محمود خاں بہادر مظفر جنگ
مورد تفصیلات بودہ بداند عرضداشت ارادت سمات آں فدوی خاص مشعر ظہور ابتری و بے
نظمی در کل پرگنات و دہیات آں ضلع از شورش و فساد غارت گراں و مفسداں و تدبیر انتظام آں
بہ فراہمی جمعیت سوار و پیادہ بقدر تاب و تواں و عرض احوال رسوخ عقیدت و ثوق ارادت
موروثی در بارگاہ خسروی بہ استدعا بذل توجہات شاہی درخصوص انتظام آں ملک بدستور
سلف بملاحظہ قدسی گذشت و کاشف معروضات گشت فی الواقع آباؤ اجداد آں فدوی
خاص ہمہ مورد نوازشات سلاطین پیشین انار اللہ برہانہم بودہ اند و مخصوص آں لائق العنایت
والاحسان در رضا جوئی و خدمت گزاری فرہ باصرہ خلافت مرزا شاہ رخ بہادر مرحوم دقیقہ فرو
گذاشت نہ کردہ باعث رضامندی خاطر گردیدہ بود نظر براں مستحق رعایت و عنایت است
ولیکن دراسے خدمت سابقہ اگر فی الحال بمصدر حسن خدمتی خواہد گشت مورد مزید الطاف بادشاہی
خواہد گردید درخواست آں فدوی خاص کہ عبارت از اجازت انتظام کلی آں ضلع است بر ہنہ پذیر
آئی خواہد رسید پس تاوقتیکہ از پیش گاہ قدسی سند مستند شرف اجرا نیابد جملہ محاصل ملکی را بعد وضع
مصارف فوج و عملہ تحصیل بطریق امانت تصور باید کرد و بارسال آں در حضور فیض گنجور باید پرداخت
و نیز در خطیر خزانہ کلکٹری و اسباب و اسپاش کہ بعد فرار انگریزان بہ قبضہ خود درآوردہ ہمہ مع
فرد داصل باقی آں بہ جمعیت متھراداس و دو سوار ملازم بادشاہی کہ دانجا میرسند زود تر روانہ نماید
تا نقد فدویت و ارادت آں فدوی خاص بہ محک امتحان کامل برآید و ظہور ایں گونہ دولت خواہی

وخیر اندیشی وسیلہ ترقی مدارج ومراتب گردد۔ فقط

المرقوم ۲۸ ذیقعدہ سنہ ۲۱ معلی

رئیسان چاند پور

چاند پور میں میر رستم اور صادق علی رئیسان چاند پور کی بے وقوفی نے گل کھلایا یعنی جو عرضی انہوں نے بادشاہ دہلی کے پاس روانہ کی تھی اس کے جواب میں فرمان بادشاہی پہلی اگست ۱۸۵۷ء کو چاند پور میں پہنچا اور انہوں نے بہت خوشی کی چنانچہ اس فرمان کی نقل اس مقام پر لکھتے ہیں:۔

نقل فرمان بادشاہی مورخہ پنجم ذیقعدہ سنہ ۲۱ جلوسی مطابق ۲۷ جولائی ۱۸۵۷ء سیادت نجابت دستگاہ سید رستم علی وسید صادق علی مورد تفصیلات بودہ بدانند عرضی آن فدویان مشعر برحال بدلان وتباہی وبربادی دیہات وقریات قصبہ چاند پور از تعدی وظلم وغارت گری و استدعائے اعانت وامداد سرکار دولت مدار واجازت نو ملازم داشتن سپاہ سوار وپیادہ بنا بر اجرائے تحصیل ومجرا یافتن تنخواہ آنہا از آمدنی علاقہ مذکور وارد سال زر باقیات مع کاغذ جمع خرچ درحضور پرنور بملاحظہ قدسی گذشت کاشف معروضات گشت چوں انسداد فتنہ وفساد بنابر آسائش رعایا وبرایا منظور خاطر است لہذا حکم محکم شرف اصدار مے یابد کہ آن فدویان چند سوار وپیادہ بقدر ضرورت ملازم داشتہ نمبرداران وقانون گویان وپٹواریان ودیگر عزت مندان وساکنان آنجا را باخود متفق ساختہ دقیقہ درمراتب بندوبست فروگذاشت سازندہ آنچنان انتظام نمایند کہ احدے زبردست قوی پنجہ برہیچ کس زبردست وغریب نوعے تشدد وتعدی نمودن نتواند وسرچشمہ تحصیل جاری کردہ زر واجب الطلب باسہولیت وصول کردہ وکاشتکار زراعت افزونی پذیرد وبعد ایصال زر مصارف تنخواہ ملازمان وسپاہ عملہ تحصیل وضع کردہ زر باقیات مع کاغذ جمع وخرچ بحضور فیض گنجور رسانند۔

مرقومہ پنجم ذی الحجہ سنہ ۲۱ جلوس

محمود خان کے سپاہی

نواب کی سپاہ میں سب لوگ ملازم تنخواہ دار تھے اور اکثروں کے پاس بندوقیں تھیں اور وہ لوگ بندوق لگانی بھی جانتے تھے بلکہ بہت سے پٹھان بہت اچھے بندوقچی تھے۔ اور تخمیناً چالیس تلنگے نمک حرام فوج کے جس کا افسر رام سروپ جمعدار جیل خانہ تھا بہت عمدہ سپاہی قواعدداں تھے اور باقی دھنیئے جولاہے تھے جنہوں نے سوت کے تار کے سوا کبھی تلوار نہ پکڑی تھی سوار بھی نواب کے بہت اچھے تھے

علی الخصوص چند سوار سرکار رجمنٹوں کے جو وہاں موجود تھے وہ ہر طرح کی لڑائی جانتے تھے اور انہوں نے بہت سے سواروں کو اگر قواعد داں نہ بنایا تھا تو سپاہی ضرور کر لیا تھا۔

ہندو مسلم افتراق

انگریزوں کی دوران کے وفادار جاں نثاروں کی کوشش یہ تھی ۔ کہ محمود خاں اور ہندو رؤسا میں جو اتحاد ہو گیا ہے وہ ٹوٹ جائے بالآخر یہ رخنہ اندازیاں کامیاب ہوئیں، یہ ہندو رؤسا لڑ پڑے ، ہندوؤں نے جو نظام قائم کیا تھا اسے درہم برہم کر دیا۔ پھر انگریزوں کو اطلاع دی وہاں سے یہ عنایت نامہ آیا۔

رفعت و عوالی مرتبت گرامی قدر چودھری امراؤ سنگھ صاحب سلمہ الرحمٰن عرضی آپ کی مشعر حالات ظلم اور بدعت نواب محمود خاں کے پہنچی سب حال معلوم ہوا۔ کمال افسوس و رنج ہے کہ آپ کا اس قدر نقصان عظیم ہوا اور شیو راج سنگھ اور قبیلہ اس کا قتل ہوئے اللہ تعالیٰ کوئی آفت کسی پر نازل نہیں کرتا کہ جس کے بعد کچھ تسلی نہ ہو اگر اس قدر ظلم یعنی غارت گری مال و قتل عزیزان تمہارا پٹھان لوگ نہ کرتے تو تم سب رؤسائے ہندو یک دل ہو کہ کیونکر اس کو نکالتے اب تم سب ہنود نے اتفاق کر کر اس ظالم نواب کو نکال دیا۔ اگر سابق سے بھی تمہارے باہم ایسا اتفاق ہوتا تو جس قدر فوج باغی اس نواح میں تھی اس کا مارا جانا کیا مشکل ہوتا اور پھر کیا ضرورت چلے آنے کی ہم لوگوں کو وہاں سے ہوتی اور ایسے آفات تم لوگوں پر کیوں آتے خیر سب امور اپنے وقت معینہ پر منحصر ہیں اب بہ فضل خدا سب تکالیف تمہاری جلد رفع ہو جاتی ہیں بہ طلب ہماری جو آپ لکھتے ہیں سو ہم نے واسطے جانے بجنور کے گورنمنٹ کو لکھا ہے اور شکسپیئر صاحب بھی پہاڑ سے بلائے گئے ہیں اب عنقریب بندوبست فوج کا ہو جاتا ہے ہم تھوڑی سی فوج معتبر لے کر عنقریب آئیں گے اور سید احمد خاں صدر امین اور رحمت خاں صاحب ڈپٹی کلکٹر کو لکھا گیا ہے کہ تا پہنچنے ہمارے وہ انتظام وہاں کا اچھی طرح کریں گے اور مسٹر پالٹر صاحب جنٹ مجسٹریٹ بجنور کا جو حال آپ نے دریافت کیا تھا سو وہ مظفر نگر میں ہیں میرٹھ میں آئے تھے سو آج رات کو میران پور میں ہوں گے بہ طلب خط بنام والی رام پور جو آپ نے لکھا تھا وہ ہم نے کل کی تاریخ انگریزی نواب صاحب رام پور کو لکھ بھیجا ہے اور ایک خط انگریزی مگر آج بھی حسب درخواست آپ کو لکھ کر ان کے پاس بھیج دیں گے۔"

سرسید اپنے "آقا" کا ذکر کرتے ہیں

"میں نہایت متامل ہوتا ہوں اس اگلی بات بیان کرنے سے کہ میں اپنی نسبت آپ لکھتا ہوں اور

پھر مجھ کو اس کو لکھنے پر اس لئے دلیری ہوتی ہے کہ در حقیقت میں خود نہیں لکھتا بلکہ اپنے آقا کی بات بیان کرتا ہوں اور پھر مجھ کو نہایت خوشی ہوتی ہے کہ گو میرے آقانے میری نسبت بات کہی ہو میں کیوں نہ اس کو لکھوں کہ اپنے آقا کی بات سے خوش ہونا اور اس کو بیان کر کر اپنا فخر کرنا نوکر کا کام ہے یعنی جب میں میرٹھ آیا اور بیماری نے مجھ کو کمال ستایا تو میرے آقا مسٹر جان کری کرافٹ ولسن صاحب بہادر دام اقبالہ صاحب جج اور اسپیشل کمشنر میری عزت بڑھانے کو مجھے دیکھنے آئے اور مجھ سے یہ بات کہی کہ تم ایسے نمک حلال نوکر ہو کہ تم نے اس نازک وقت میں بھی سرکار کا ساتھ نہیں چھوڑا اور باوجودیکہ بجنور کے ضلع میں ہندو اور مسلمان میں کمال عداوت تھی اور ہندوؤں نے مسلمانوں کی حکومت کا مقابلہ کر کے نقصان اٹھایا تھا اور جب ہم نے تم کو اور محمد رحمت خاں صاحب بہادر ڈپٹی کلکٹر کو ضلع سپرد کرنا چاہا تو تمہاری نیک خصلت اور اچھے چلن اور نہایت طرفداری سرکار کے سبب تمام ہندوؤں نے جو بڑے رئیس اور ضلع میں نامی چوہدری تھے، سب نے کمال خوشی اور نہایت آرزو سے تم مسلمانوں کا اپنے پر حاکم بننا قبول کیا، بلکہ درخواست کی کہ تم ہی سب ہندوؤں پر ضلع میں حاکم بنائے جاؤ اور سرکار نے بھی ایسے نازک وقت میں تم کو اپنا خیر خواہ اور نمک حلال نوکر جان کر کمال اعتماد سے سارے ضلع کی حکومت تم کو سپرد کی اور تم اسی طرح وفادار اور نمک حلال نوکر سرکار کے رہے اس کے صلے میں اگر تمہاری ایک تصویر بنا کر پشت ہا پشت کی یادگاری اور تمہاری اولاد کی عزت اور فخر کو رکھی جاوے تو بہت کم ہے میں اپنے آقا کا کمال شکر ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے مجھ پر ایسی مہربانی کی اور میری قدردانی کی خدا ان کو سلامت رکھے۔ آمین"

وفادار نوکر قدر شناس آقا

"جب ضلع ہمارے سپرد ہوا تو ہماری رائے تھی کہ پرانے لفظ منادی کے یعنی خلق خدا ملک بادشاہ کا حکم کمپنی صاحب بہادر کا بدلے جاویں اور بجائے ملک بادشاہ کا پکارا جاوے ملک ملکہ معظمہ وکٹوریہ شاہ لندن کا کیونکہ منادی میں ایسے الفاظ چاہئیں کہ جن سے عوام الناس بغیر شک کے یہ بات سمجھ لیں کہ در حقیقت ملک کس کا ہے اور ہمارا بادشاہ کون ہے اور ہم کس کی رعیت ہیں لیکن بلا اجازت حکام صرف اپنی رائے سے اس دستور قدیم کو بدلنا مناسب نہ جانا اور اس باب میں ایک خاص رائے دینی دوسرے وقت پر موقوف رکھی"

لیکن یہ چوہدری محمود خاں سے کتنے خائف تھے؟

پنڈت رادھا کشن ڈپٹی

انسپکٹر نے یہ تجویز کی کہ وہ خود میراں پور میں جناب مسٹر چارج پاسٹر صاحب بہادر کے پاس جاویں اور تمام حالات ضلع کے زبانی عرض کریں اگر ممکن ہو تو چودھریوں کی صاحب ممدوح سے بھی ملاقات کروائیں کہ اس میں صاحب ممدوح کو بھی بخوبی حالات ضلع سے اطلاع ہو گی اور چودھریوں کو بھی اور نیز سب لوگوں کو زیادہ تر طمانیت رہے گی چنانچہ ۱۷ اجون کو پنڈت رادھا کشن ڈپٹی انسپکٹر ایک آدمی اپنا اور ایک سوار چودھری پرتاب سنگھ رئیس تاج پور کا لے کر روانہ ہوئے اور میراں پور میں صاحب ممدوح کی ملازمت حاصل کی اور تمام حالات ضلع زبانی عرض کئے اور مقام دھرم پور جو کنارہ گنگ پر ہے، چودھریوں کی ملازمت ٹھہرائی اور چودھریوں کو بلایا۔ چنانچہ چودھری پرتاب سنگھ رئیس تاج پور اور چوہدری رندھیر سنگھ رئیس ہلدور اور چوہدری نین سنگھ رئیس بجنور دھرم پور میں گئے اور چوہدری جودھ سنگھ جو پہلے سے پار گئے ہوئے تھے وہ بھی آشامل ہوئے اور ۱۸ اگست ۱۸۵۷ء کو صاحب ممدوح کی ملازمت کی صاحب ممدوح نے سب کی تسلی اور تشفی فرمائی اتنے میں غلغلہ پڑا کہ نواب بجنور پر چڑھ آیا اور یہ غلط خبر دھرم پور میں پہنچی، چودھری صاحبوں کا اس خبر کے سننے سے رنگ فق ہو گیا اور نہایت اضطرار کی حرکتیں کرنے لگے اور ہوش جاتے رہے۔"

انگریز ہندو کو بھڑکاتا ہے

نقل خط جناب جارج پاسٹر صاحب بہادر بنام رائے ہمت سنگھ رئیس سہارنپور رائے صاحب مہربان داستان سلامت بعد اشتیاق ملاقات فرحت آیات واضح باد جس روز کہ صاحب کلکٹر بہادر ضلع بجنور سے تشریف فرما ہوئے خزانہ سرکاری اور انتظام ضلع سپرد نواب محمود خاں کے کیا چند روز کا عرصہ ہوا کہ دریافت ہوا کہ مابین نواب صاحب بجنور سے نجیب آباد کو چلے گئے آپ کو واضح ہو کہ اس حالت میں صاحب کمشنر بہادر میرٹھ نے محمد رحمت خاں ڈپٹی کلکٹر اور سید احمد خاں صدر امین کو ارشاد فرمایا کہ اعانت رئیسان ضلع انتظام ضلع انتظام ضلع کا تا تشریف آوری صاحبان ضلع کے کریں اس واسطے لازم ہے کہ آپ ہر طرح ان کی مدد دیویں اور حکم ان کا حکم خلل سرکاری کے تصور کریں اور چونکہ بعض لوگوں سے دریافت ہوا کہ نواب صاحب ارادہ چڑھ آنے بجنور کا رکھتے ہیں۔ ایسی تدبیر کرو کہ یہ مقابلہ نہ ہونے پائے ورنہ پھر بے انتظامی اور بربادی رعایا ہو جاوے گی اور ہمیشہ اپنے حال سے مطلع کرتے رہو۔

تحریر بتاریخ ۱۹ اگست ۱۸۵۷ء

محمود خاں کا طرزِ عمل | خود سید احمد خاں بتاتے ہیں کہ "نا محمود خاں" کا رویہ کتنا محمود اور مسعود تھا:۔

نقل خط محمود خاں:۔

"خاں صاحب مشفق مہربان بیہائے بیکراں محمد رحمت اللہ خاں صاحب ڈپٹی و سید احمد صاحب صدر امین ضلع بجنور سلمہ اللہ تعالےٰ بعد سلام شوق کے واضح ہو جو کہ نقول خطوط صاحب کمشنر بہادر ضلع میرٹھ و مسٹر پالٹر صاحب ڈپٹی کلکٹر و جنٹ مجسٹریٹ بہادر ضلع بجنور پاس تمہارے پہنچی ہے کہ ان کو بخوبی معائنہ کر کے چودھری صاحبوں کو بخوبی مضمون ان کے سے فہمائش کریں کہ یہ لوگ اپنے اپنے مکانوں میں رہیں اور اجتماع نہ ہو اور شر و فساد نہ کریں اور ہم کو کسی سے کسی طرح کا فساد کرنا بموجب حکم خطوط منظور نہیں ہے اور جو اشتہارات واسطے منادی کے بھیجا تھا وہ بھی مخبر اس امر کا ہے کہ کوئی شر و فساد کریں گے تو مجرم سرکار انگریز بہادر کے ہوں گے اور جو کہ بموجب حکم صاحبان عالیشان انگریز بہادر کے اب آپ منتظم اس ضلع کے ہیں اگر کسی سے شر و فساد ہو گا تو جوابدہی اس کی ذمہ آن مہربان ہو گی اس صورت میں آپ کو چاہیے کہ اس معاملے میں متوجہ ہو کر جس طرح رفع فساد کا مناسب سمجھیں ویسے کاربند ہوں اور گھاٹوں کا انتظام بھی ضرور ہے کہ اس پار سے اکثر مفسد بھی اترتے ہیں اور ہم بموجب احکام خطوط ہذا کے کاربند ہیں باقی خیریت ہے

مہر

محمد محمود خاں

نقل جواب جو کہ ہماری طرف سے لکھا گیا:۔

"جناب نواب صاحب والا مناقب عالی مناصب عنایت فرمائے حال نیاز منداں زاد عنایتکم۔ بعد ادائے سلام مسنون التماس یہ ہے عنایت نامہ نامہ آپ کا جس کے لفافے پر رقم تاریخ ۲۱ اگست لکھی تھی مع نقل خط جناب صاحب کمشنر بہادر ضلع میرٹھ اور جناب صاحب جنٹ مجسٹریٹ بہادر ضلع بجنور جو کہ صاحبان ممدوح نے آپ کے نام پر لکھے تھے آج ۲۲ اگست کو ۱۱ بجے ہمارے پاس پہنچا آپ ارقام فرماتے ہیں کہ چودھری صاحبوں کو فہمائش کرو کہ یہ لوگ اپنے اپنے مکانوں پر رہیں اور اجتماع نہ ہو اور شر و فساد نہ کریں اور ہم کو کسی سے کسی طرح کا شر و فساد کرنا منظور نہیں ہے اور جو لوگ بمقام پوریني اور ہرگن پور اور سوا ہیڑی اور خانگل اور بجنور جمع ہیں وہ لوگ اپنے اپنے مکانوں پر چلے جاویں چنانچہ ہم نے آپ کے ارشاد بموجب مضمون

خطوط کا چودھری صاحبان کو سمجھا دیا وہ لوگ بھی بیان کرتے ہیں کہ ہم کو کسی طرح کا شر و فساد کرنا نواب صاحب سے یا اور کسی سے منظور نہیں''

ہندو کو مسلمان کا اور مسلمان کو ہندو کا ڈر

''در بجنور میں جو رئیس جمع تھے وہ آپس میں صلاح کر رہے تھے کہ اب نجیب آباد پر چڑھائی کی جاوے یا نہیں چودھری پرتاب سنگھ رئیس تاج پور کی یہ رائے تھی کہ فساد زیادہ بڑھانا اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ انجام کیا ہوگا۔ جس طرح ہو سکے بہ صلح آشتی چند روز ضلع تھامنا چاہیے بلکہ چودھری پرتاب سنگھ کے نزدیک نگینہ پر بھی جو آدمی گئے اور وہاں بنیاد فساد پر پڑ گئی نامناسب ہوا چودھری بدھ سنگھ صاحب رئیس ہلدور بہ سبب اپنی شجاعت و جوانمردی کے یہ رائے دیتے تھے کہ نجیب آباد پر یورش کی جاوے اور سب آدمیوں کو لے کر نجیب آباد پر چڑھ چلیں اور دو جگہ جو ان چودھریوں صاحب نے نواب کو شکست دی تھی اس سبب سے ان کا ارادہ اور ہمت اور جرأت اور دلیری بہت بڑھی ہوئی تھی ہم کو نجیب آباد جانے میں بہت قباحتیں نظر آتی تھیں اور ہرگز ہماری رائے نہ تھی کہ یہ ہانکی پکار نجیب آباد پر فتح پاوے گی اور یہ گنوار شہر کی گلیوں میں گھس کر اور نواب کے پختہ اور مستحکم مکانات پر قابو پا کر فتح یاب ہوں گے اور یہ ہماری رائے بہت سچی اور نہایت صحیح تھی کہ کبھی اس کے برخلاف نہیں ہو سکتا بلکہ ہماری رائے میں نگینہ میں صرف ایک توپ کے سانحہ پر جس کا چلنا اور چھوٹنا اور پھر اس گولے سے کسی آدمی کا مرنا صرف ایک وہمی و خیالی نہ ہونے والی بات تھی۔ اس قدر فساد ہونا نہایت نامناسب تھا اور میں خوب سمجھتا تھا کہ نگینہ کا فساد اگر زیادہ ہوتا گیا تو انجام کو بھی فساد ضلع کے انتظام میں خلل ڈالے گا۔ چنانچہ ہماری رائے بہت صحیح تھی کہ انجام کو ایسا ہی ہوا۔ اور ہم بہت چاہتے تھے کہ نگینہ پر سے لڑائی موقوف ہو جاوے اور جس طرح ہو سکے چند روز ضلع کو تھامنا جاوے لیکن ہم یقین سمجھتے تھے کہ تھوڑی سی سرکاری فوج آنے کے بعد بخوبی انتظام ہو جاوے گا اور بلاشبہ کسی مقام پر مقابلہ کی حاجت نہ پڑے گی اور حکام انگریزی کے آنے کے بعد ایک بہت بڑی بنیاد فساد کی جس سے درحقیقت ضلع میں فساد ہوتا تھا یعنی یہ ڈر کہ اگر مسلمان غالب آئے تو ہندو مارے اور لوٹے جاویں گے اور ہندو غالب آئے تو مسلمان تباہ اور جان سے ضائع ہوں گے بالکل جڑ سے اکھڑ جاوے گی کہ اتنے میں ہمارے پاس خبر پہنچی کہ فساد نگینہ موقوف ہو گیا اور ہم نے کمال خوشی سے اس کی رپورٹ بجنور جناب جارج پالٹر صاحب بہادر دام اقبالہ کے

روانہ کی اور در باب چڑھائی نجیب آباد کے جو ہماری رائے تھی ۔ وہ لکھ کر اس معاملے میں ہدایت چاہی ہی“

اندیشہ ہائے دور و دراز

محمود خاں کی قوت و طاقت و شکوہ و تجمل و دبدبہ اور طنطنہ نے ہندو روساء کو اندیشہ ہائے دور و دراز میں مبتلا کر دیا۔ انگریزوں نے اور شہ دی ۔ نوبت جوابی تیاریوں اور کشت و خون تک پہنچی چنانچہ انگریز اور ان کے دفادار بعد ردین کرمداخلت کرتے ہیں اور محمود خاں کو لکھتے ہیں کہ یہ ہندو روساء کہتے ہیں کہ

”ہم نہ کسی سے لڑنا چاہتے ہیں اور نہ کسی سے مقابلہ کرنا چاہتے ہیں اور نہ کسی طرح کا دعویٰ رکھتے ہیں چنانچہ وہ لوگ بیان کرتے ہیں کہ بعد واقعہ شیر کوٹ اور بجنور کے ہم سب لوگ اپنے اپنے گھر کو چلے گئے اور جس قدر جمعیت کہ جمع ہوئی تھی وہ سب بعد اس کے متفرق کر دی اور چودھری پرتاپ سنگھ بھی اپنے گھر اور چودھریان ہلدور اپنے گھر چلے گئے اور چودھریان بجنور بلا جمعیت اپنے اپنے مکانوں پر مقیم رہے مگر بعد اس کے متواتر یہ خبر چودھری صاحبانوں نے سنی کہ آپ کا ارادہ بجنور اور تاجپور اور ہلدور پر یورش کا ہے اور آپ فوج اور جمعیت جمع کرتے ہیں اور تیاری توپوں میں مصروف ہیں اور دیہات قرب و جوار نجیب آباد یعنی موضع موسیٰ پور اور شیخ آباد اور موہن پور اور نرائن پور اور کاروالی وغیرہ آپ نے پھونک دیئے اور لوٹ لئے اس سبب سے ان لوگوں کو بھی اندیشہ اس بات کا ہوا کہ اگر ہم لوگ جمعیت جمع نہ کریں گے تو انجام کی خرابی ہوگی ان وجوہات سے ان لوگوں کا بیان ہے کہ ہم جابجا جمعیت واسطے روکنے نواب صاحب کے یورش بجنور اور ہلدور اور تاج پور سے اور بچاؤ حفظ اپنے کے جمع کی ہے ۔ پورینی میں جمعیت جمع ہونے کا یہ سبب بیان کرتے ہیں ۔ کہ نتھو خاں اور ہنڈھو خاں ملازمان آپ کے نگینہ میں مفسدہ کرتے ہیں ایک توپ کلاں واسطے لے جانے نجیب آباد کے تیار کرواتے ہیں اور تھانہ اور تحصیل کی ڈاک بجنور میں آنے نہیں دیتے اور جو احکام سرکاری جاری ہوئے ہیں ان کو روکتے ہیں ان کی تعمیل نہیں ہونے دیتے اور ان کو خبر پہنچی ہے کہ نجیب آباد میں آپ کے پاس قریب ہفت ہشت ہزار آدمی کے جمع ہیں اسی سبب سے وہ لوگ کہتے ہیں کہ جب تک نواب صاحب اپنی جمعیت منفرق نہیں کریں گے اس وقت تک ہم کو کسی طرح پر اطمینان نہیں ہو گا ۔ اور ان لوگوں نے ہم

ہے یہ بھی بیان کیا کہ بعد ان دونوں لڑائیوں کے ہم نے ایک خط بنام سعد اللہ خاں صاحب نجیب آباد میں بھیجا کہ ہم سے اور نواب صاحب سے صفائی ہو جاوے اور پھر ہم نے دو خط بنام مفتی محمد اسحٰق رئیس کرت پور اس مضمون سے بھیجے کہ جس طرح پر ہو نواب صاحب سے صفائی ہو جائے اس طرح نواب صاحب کی یورش کا اندیشہ جاتا رہے اور پھر تیسرا خط مفتی صاحب کے نام ان کے بلانے کو بھیجا کہ وہ ہماری طرف سے نجیب آباد کو جائیں۔ اور آپ سے ہر طرح سے صفائی کر لیں پس اس صورت میں بیان چودھری صاحبان کا یہ ہے کہ ہم کو کسی طرح شر و فساد اور مقابلہ کرنا منظور نہیں ہے۔ اگر نواب صاحب اپنی جمعیت اور فوج کو منتشر کر دیں اور توپوں کے بنوانے میں مصروف نہ ہوں اور ارادہ لڑائی کا موقوف کر دیں تو ہم بھی سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے جاویں گے اور جو کہ ہم نیاز مند بھی بدل و جان اس بات میں مصروف و ساعی ہیں کہ کس طرح شر و فساد نہ ہو اس واسطے آپ کی خدمت میں بخیر خواہی آپ کے التماس یہ ہے کہ آپ بھی جمع کرنا فوج کا اور تیاری توپوں کی موقوف فرماویں اور بارے اور مینڈھو خاں وغیرہ مفسدان کا فساد سے باز رکھ کر اپنے قبضے میں رکھیں تو غالب ہے کہ چودھری صاحب بھی سب اپنے اپنے گھر چلے جاویں گے اور سب طرح کا انتظام ضلع کا ہو جاوے گا۔ اور مخلوق خدا اور رعایا سرکار کی امن و امان میں رہے گی اور پھر اگر کوئی شخص فساد شروع کرے گا تو اس کی اطلاع مفصل بحضور جناب صاحب کشنر بہادر کے کر دی جاوے گی اور اس کا نتیجہ بہت بد اس کے حق میں ہوگا اور یہ بھی آپ کو واضح ہو کہ متواتر احکام حکام والا مقام ہمارے نام پہنچتے ہیں چنانچہ صاحب جنٹ مجسٹریٹ بہادر خود گنگا کنارے پر تشریف لائے تھے۔ اور اب بہ انتظار آنے فوج سرکاری کے میران پور میں مقیم ہیں اور جناب صاحب کلکٹر بہادر بھی کوہ منصوری سے اتر کر میرٹھ میں تشریف لائے ہیں اور احکام جناب کمانڈر انچیف صاحب بہادر اور جناب گورنر بہادر واسطے روانگی فوج کے بجنور کو صادر ہو چکے ہیں کہ بہت جلد فوج اور توپوں کے میران پور کے مقام پر پہنچتی ہے اور بعد اس کے جناب صاحب جنٹ مجسٹریٹ بہادر اور جناب صاحب کمشنر بہادر اور جناب مسٹر ولسن صاحب بہادر بجنور میں تشریف لائے ہیں ہماری آرزو ہے کہ تا تشریف آوری حکام والا مقام سب لوگ اپنے مکانوں پر بہ آسائش رہیں بعد تشریف لانے حکام کے خود صاحبان ممدوح جس طرح پر مناسب جانیں گے بندوبست ضلع کا فرماویں گے والسلام۔"

ہندو مسلم فساد برپا کرانے، ہندو مسلم افتراق کی خلیج وسیع کرنے اور جنگ آزادی کو فرقہ وارانہ جنگ میں تبدیل کرانے کے بعد یہ مشورہ کتنا دلچسپ ہے کہ فوج منتشر کردو ہتھیار گلا دو ؎

حضرت ناصح جو آئیں دیدۂ و دل فرش راہ
کوئی ہم کو یہ تو تبلا دو کہ سمجھائیں گے کیا

صلۂ وفا لیکن ہندوؤں کا ساتھ دینے کا انجام کیا ہوا؟ سید صاحب فرماتے ہیں:-

"ہندوؤں کو مسلمانوں سے اس قدر عداوت ہو گئی کہ چند آدمی جو اتفاقیہ بلدور میں وارد تھے وہ بھی مارے گئے، گنوار بخوبی پکار پکار کر ہم لوگوں کی نسبت اور ڈپٹی صاحب کی نسبت صاف صاف کہتے تھے کہ یہ لوگ چودھریوں سے ملے ہوئے ہیں مگر مسلمان ہیں ان کو بھی مار ڈالنا چاہیئے مگر چودھری رندھیر سنگھ نے ہماری بہت حفاظت کی اور کہلا بھیجا کہ دروازہ مضبوط بند کر کے اندر بیٹھے رہو اور کسی اپنے نوکر کو بھی باہر نہ نکلنے دو ایسا نہ ہو کوئی مار ڈالے اس سبب سے تین روز تک ہم کو بلدور میں پانی اور کھانے کی بہت تکلیف دی"

مسلمانوں کا قتل عام اس پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ:-

"جس وقت رئیسان نگینہ نے مردان اور سپاہیان نجیب آباد کو نگینہ سے رخصت کر دیا تھا اور سب لوگ نجیب آباد چلے گئے تھے۔ اس وقت رام دیال سنگھ کا رہنا نہایت نامناسب اور بنیاد فساد کی تھا۔ فی الفور رام دیال سنگھ کو واپس آنا چاہیئے تھا ہم نے تھانیدار نگینہ میں بھیجا تھا، اور مولوی قادر علی تحصیلدار کو واسطے بھیجنے نگینہ کے بلایا تھا۔ ہم صرف رئیسوں کی معرفت وہاں کا انتظام کر لیتے۔ مگر ہر چند ہم نے کہا کہ رام دیال سنگھ کو واپس بلانا چاہیئے مگر افسوس ہے کہ ہماری یہ بات وہ تھی جس کا ہمارے مددگاروں کے دل میں پہلے سے کرنا اس کا نہ تھا بشنوئیان نگینہ جو قدیمی مفسد اور شورہ پشت ہیں زیادہ تر مفسدہ کے باعث ہو گئے اور نگینہ میں فساد کروا دیا۔ مسلمانوں نے دیکھا کہ بدستور ہندو مالک اور حاکم ہیں اور ہندو جو چاہتے ہیں کرتے ہیں اور مسلمانوں کو مارتے ہیں جیسا کہ نگینہ میں پیش آیا اکثر آدمی نجیب آباد چلے گئے نواب نے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر کے محمدی جھنڈا کھڑا کر دیا اور دفعتاً ضلع میں فساد برپا ہو گیا اور مذہبی لڑائی قائم ہو گئی۔ چاندپور میں جو ہم پر آفت پڑی گو اصلی منشا اس کا یہ تھا کہ ہم سرکار کے خیر خواہ اور طرفدار تھے اور علانیہ سرکار کی طرفداری

شاہ خلد اللہ ملکہ،

سکندر اقبال جاہ

مرزا برجیس قدر

محمد رمضان علی

حکم نامہ

بنام محمد فضل عظیم خاں بہادر

کر کرانتظام ضلع کا اٹھا لیا تھا۔ لیکن اس قدر عالم بلوے کے برپا ہونے کا یہ سبب تھا اور سب بلوائی پکار پکار کر کہتے تھے کہ چودھریوں سے سازش کر کے نگینہ میں مسلمانوں کو مروا دیا اور لوگوں کی جورو بیٹے کی بے عزتی کروائی اور ہلدور میں اپنے سامنے مسلمانوں کو ذبح کروایا اب ہم زندہ نہ چھوڑیں گے، چنانچہ یہ سب باتیں ہم اپنے کان سے سنتے تھے اور ہلدور سے حلوائیاں اور چھیپیوں کے زخمی مرد اور عورت اور بچے جو بچ کر بھاگے تھے وہ تھوڑی دیر پہلے ہم سے چاندپور پہنچ چکے تھے ان کا حال دیکھ کر زیادہ تر لوگ ناراض ہو رہے تھے کہ ہم بے گناہ دفعتاً وہاں جا پہنچے فہمیدہ آدمی تو سمجھ گئے کہ یہ کام انہوں نے نہیں کیا۔ مگر جاہل لوگوں نے نہ مانا "

محمود خاں کی حکومت

"اس معرکہ کے بعد تمام ضلع میں نواب کی بے کھٹکے حکومت ہو گئی اور جملہ مشیران نواب انتظام ضلع کی طرف متوجہ ہوئے اور یہ رائے قرار پائی کہ جملہ چودھریوں سے صفائی کی جائے اور جلال الدین خان نائب نواب اور مختار کل مقرر ہوا جلال الدین خاں کو اس عہدے پر مقرر کرنے کا سبب یہ تھا کہ احمد اللہ خاں سے سب چودھری سخت ناراض تھے اگر وہی کارکن رہتا تو چودھریوں سے صفائی ہونے میں دقت پڑتی دوسرا یہ سبب تھا کہ ان دنوں میں روپے کی بہت ضرورت تھی اور احمد اللہ خاں کو روپیہ ملنا بہت دشوار تھا۔ اور جلال الدین خاں کو لوگ معتبر سمجھتے تھے اور اس کی معرفت سبیل روپے کی بآسانی متصور تھی چنانچہ مسودہ اقرار نامہ مختاری کل تحریر ہوا اور جملہ چودھریوں میں گفتگو اور پیغام سلام صفائی کے ہونے لگے۔"

محمود خاں کی انتظامی کونسل

ایک کونسل مقرر ہوئی کہ جو انتظام ضلع کا ہو کونسل سے ہوا کرے چنانچہ جو روبکاری نا محمود خاں نے اس معاملہ میں لکھی اس کی نقل بعینہٖ اس مقام پر لکھی جاتی ہے:۔

"روبکاری محکمہ بہ اجلاس امیر الدولہ ضیا ءالملک فدوی القدسہ نواب محمد محمود خاں بہادر مظفر جنگ واقع ۱۳ ستمبر ۱۸۵۷ء چونکہ ایں جانب نے بہ سبب ابتدا انتظامی ضلع بجنور کے محمد احمد اللہ خاں بہادر و محمد احمد یار خاں و محمد شفیع اللہ خاں و اخوند زادہ عبدالرحمن خاں و سید احمد خاں کو بہ نظر رفاہ خلائق اور واسطے انتظام مالی و ملکی ضلع بجنور کے اپنی طرف مختار کار عام مقرر کیا اور کل انتظام

کچھ فوج اپنی بمقام نگینہ اور کچھ فوج بمقام کرتپور بہ افسری شفیع اللہ خاں روانہ کی اور ادھر سے چودھری صاحب اپنا لام بے کر اٹھارویں ستمبر ۱۸۵۵ء کو متصل ٹھپر اصلی کے پہنچے اور طرفین میں مقابلہ شروع ہوا۔ تھوڑی لڑائی کے بعد چودھری صاحب شکست ہوئی تمام گنوار جمع ہوئے تھے بھاگ نکلے اور ایک موروثی توپ چودھریان ہلدور کی جس کا کڑہ خاں نام تھا مع تین جزائلوں اور دو گردوں کے نواب کی فوج نے چھین لئے اور چودھری بدمو سنگھ اور مہاراج سنگھ ہلدور ہوتے ہوئے پھر ببینہ میں پہنچے اس فتح میں شفیع اللہ خاں کا بہت بڑا نام ہوا اور لقب بہادری اس کو دیا گیا اور جنرل جرار بھی کہلانے لگا۔ چنانچہ اکثر کاغذات میں اس کا یہ لقب دیکھا گیا۔

اس لڑائی کے بعد احمداللہ خاں اور نواب کے مشیروں نے چاہا کہ یا جملہ چودھریان کی بیخ کنی کردی جائے ورنہ وہ لوگ مقابلہ سے باز نہ آویں گے اور ان کی طرف کا کھٹکا رفع ہو گا یا ان سے بخوبی صلح وصفائی ہو جائے چودھری صاحبان بھی درصورت طمانیت رفع فساد چاہتے تھے، چنانچہ ادھر سے چودھریوں نے پیغام صلح بھیجے اور خطوط بھی لکھے جن کا حاصل یہ تھا کہ بسبب خوف بدسلوکی اور اندیشہ جان آبرو کے حاضر نہیں ہو سکے، ہر چند نواب کی طرف سے چودھریوں کی تشفی ہوتی تھی مگر ان کو طمانیت نہ ہوتی تھی اور اعتبار نہ آتا تھا۔ چنانچہ سعداللہ خاں کے خط کی نقل جو بنام چودھری پرتاب سنگھ صاحب کے اس معاملے میں ۲۰ ستمبر ۱۸۵۵ء کو تجویز ہوا بجنسہٖ لکھتے ہیں۔

نقل خط سعداللہ خاں بنام چودھری پرتاب سنگھ رئیس تاج پور

"چودھری صاحب مشفق مہربان دوستان سلمہ اللہ تعالیٰ بعد سلام شوق واضح ہو کہ خط تمہارا پہنچا حال دریافت ہوا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے کچھ برے دن آگئے ہیں ورنہ ہرگز تم سے ایسی بات ظہور میں نہ آتی کہ تم مجھ سے اندیشہ کرتے ہو میں تم کو اپنے فرزند سے کمتر نہیں جانتا جبکہ تم کہنے میرے سے باہر ہو تو پھر کیا علاج کروں۔ چاہئیے کہ بلا اندیشہ تم نگینہ میرے پاس چلے آؤ اور کچھ اندیشہ کسی طرح کا مت کرو۔ اگر میرے پاس نہ آؤ تو جو کچھ تدبیر تمہارے نزدیک ہو وہ کرو اور ایسی ہی لیت ولعل میں رہو گے تو برباد ہو جاؤ گے تاکید جانو اور بلا اندیشہ چلے آؤ اور جب تم مجھ کو مربی جانتے ہو تو پھر کیا خوف ہے، ہرگز ہرگز خوف نہ کرو زیادہ خیریت ہے اور اسی شب یعنی تا نہ ہو کر میرے پاس

ضلع کا سپرد صاحبان مرقومہ بالا کے کیا تو ضرور ہے کہ جو معاملات ہیچ انتظام ملک خواہ پروانہ جات و چٹھیات و رقعہ جات یا اور کوئی امر متعلقہ نظامت و فوجداری اجرا پاوے تو بصلاح مشورہ صاحبان مرقومہ بالا کے تجویز ہو کر روبروایں جانب پیش ہووے اور ایک عرضی بھی سب صاحبان کی طرف سے مشعر بہ اطلاع اتفاق رائے کے گزرنی چاہیئے تو اس وقت ہوتا حکم منظوری تجویز یا دستخط ایں جانب مناسب ہوگا۔

لہذا حکم ہوا۔

جو امر تجویز صاحبان مرقومہ بالا سے اجرا پاوے تو بالاتفاق سب صاحبوں کے تجویز ہو کر مع قطعہ عرضی کے ہمارے روبرو پیش ہو جب دستخط اور حکم ہمارا ہوگا اور در صورت خلاف رائے صاحبوں کے کوئی امر تجویز کیا ہوا کسی کا قابل پذیرائی کے نہ ہوگا اطلاعاً نقل روبکار ہذا کی پاس ان پانچوں صاحبوں کے بھیجی جاوے اصل روبکار سر رشتہ میں رہے!"

کیا اس طرح کا انتظام کبھی انگریزوں نے کیا تھا؟

محمود خاں کی مُہر

"اسی زمانے میں نئی مہریں فوجداری اور کلکٹری کی نامحمود خاں اور احمد اللہ خاں نے بنوائیں اُن مہروں پر الفاظ وَ لِلّٰہِ مُلکُ السّمٰوٰتِ وَالْاَرض بڑھایا گیا اور بجائے سنہ عیسوی کے سنہ ہجری لکھے گئے۔"

محمود خاں ہندوؤں سے صلح رکھنا چاہتا تھا

"چودھری بدھ سنگھ اور چودھری مہاراج سنگھ نے ارادہ کیا کہ پھر ایک دفعہ نواب سے مقابلہ کیا چاہیئے اور اپنی برادری کو خطوط لکھے اور چودھری پرتاب سنگھ سے بھی کمک چاہی چنانچہ موضع پہنیہ میں لام[1] جمع ہوا اور چودھریان کانٹ اور نرائن سہاتے مع جنرایل چودھری پرتاب سنگھ کی طرف سے اور گلاب سنگھ چکارسی والا اور کچھ زمیندار پہنیہ کے اور زمیندار دیہات کے مع چودھری بدھ سنگھ صاحب کے پہنیہ میں جمع ہوئے اور کچھ آدمی ہلدور میں اکٹھے ہوئے اور یہ سارا لام جمع ہو کر بہ ارادہ چڑھائی نجیب آباد روانہ ہوا۔ احمد اللہ خاں نے یہ خبر سن کر

---

[1] فوج ، سپاہ

آجاؤ اور مجھے تمہاری حیرانی کا بڑا تردد ہے واللہ باللہ اگر میں تم کو محمد اسمٰعیل سے کمتر جانتا ہوں تو خدا اس کا آگاہ ہے اور تم کو بھی معلوم ہے۔ فقط پہلی صفر ۱۲۷۴ھ ۔"

منافقت، حیلہ گری، فریب

"دو غرض کہ سعد اللہ خاں کی معرفت پیغام صفائی اور حاضر ہو جانے کے چودھری پرتاب سنگھ صاحب سے ہوئے اور ننھے خاں نے چودھری امراؤ سنگھ صاحب رئیس شیر کوٹ سے گفتگو صفائی کی اور غضنفر علی خاں بڑا بیٹا نا محمود خاں کا مع ماڑے خاں اور لشکر سے نہٹور روانہ ہوا اگرچہ چودھریان ہلدور حاضر ہو جاویں تو بہتر ورنہ پھر ہلدور کو تباہ کیا جاوے اور جیراج سنگھ پورینی والا اور لیکھراج سنگھ نہٹور والا کی معرفت چوہدری رندھیر سنگھ کو پیغام بھیجے گئے بعد گفتگو اور طمانیت چودھری رندھیر سنگھ نہٹور میں آنے پر راضی ہوئے اور ۲۵ ستمبر ۱۸۵۷ء کو چوہدری صاحب نہٹور میں آئے اور غضنفر علی خاں نے ایک دوشالہ بطور خلعت ان کو دیا اور یہ بات کہی کہ چوہدری بدھ سنگھ اور چوہدری مہاراج سنگھ کو بھی حاضر کر دو انہوں نے اقرار کیا کہ بلا دوں گا بعد ملاقات کے چوہدری رندھیر سنگھ صاحب ہلدور کو رخصت ہوئے اور یعقوب علی خاں رامپوری مصاحب غضنفر علی خاں اور رام سنگھ بھائی لیکھراج کا واسطہ لانے چودھری بدھ سنگھ اور مہاراج سنگھ کے ان کے ساتھ ہلدور گئے اور وہاں سے موضع بھینہ میں چوہدری صاحبوں کے پاس پہنچے۔ مگر چودھری بدھ سنگھ اور مہاراج سنگھ نہ آئے اور بہ لطائف الحیل آنے سے انکار کر دیا اور کئی دن بعد گنگا پار بہ حضور حکام چلے گئے

محمود خاں کا حسن سلوک انگریزوں کے جاسوس ہندو روٴسا سے

"آخر کار بعد نامہ و پیغام یہ بات ٹھہری کہ چودھری پرتاب سنگھ رئیس تاج پور موضع پورینی میں آویں اور سعد اللہ خاں سے بائی گفتگو کر کے تاج پور واپس چلے جاویں چنانچہ پرتاب سنگھ پورینی میں آئے اور سعد اللہ خاں نگینہ سے پورینی میں گیا اور چودھری پرتاب سنگھ کا ہاتھ پکڑ کر ہاتھی پر بٹھا لیا اور نگینہ لے آیا اس کے بعد چودھری امراؤ سنگھ رئیس شیر کوٹ نگینہ میں آئے اور سعد اللہ خاں سے ملاقات ہوئی اور جب محمود خاں کو خبر پہنچی کہ دونوں چودھری نگینہ آ گئے ہیں اس نے سعادت اللہ خاں کو خط لکھا کہ دونوں چودھریوں کو نجیب آباد لے آور ۔سعد اللہ خاں ان لوگوں کو نجیب آباد لے گیا اور ۲۶ ستمبر کو چودھری صاحبوں کی ملاقات نا محمود خاں سے ہوئی دونوں چودھری صاحبوں

نے کچھ اشرفیاں نذر دیں اور نامحمود خاں نے ایک دوشالہ بطور خلعت ان کو دیا اور دوسرے دن رخصت کر دیا۔"

ہندو رؤسا محمود خان کی تباہی چاہتے تھے

چوہدری بدھ سنگھ اور چوہدری مہاراج سنگھ جو میرٹھ میں بحضور حکام حاضر تھے انہوں نے بار بار جناب کمشنر بہادر میرٹھ سے عرض کیا کہ اگر تھوڑی سی کمک ہم کو ملے تو ہم پھر نامحمود خاں سے مقابلہ کریں اور اس کو ضلع سے خارج کر دیں اور پھر ہم اپنی برادری کے بہت سے لوگ جمع کر لیں گے۔ اگرچہ جناب صاحب کمشنر بہادر کو اس میں تامل تھا۔ مگر بسبب اصرار بار بار عرض کرنے چودھریان کے جناب کمشنر بہادر نے اس کی کمک تجویز کی اور لالہ گور سہائے ناظم حسن پور کے پاس جس قدر کمک تھی اس کا ساتھ کرنا اور کچھ فوج راؤ گلاب سنگھ رئیس کا کمک کر دینا تجویز کیا اور جملہ رئیسان ضلع بجنور کے نام حکم نامے جاری کئے کہ کوئی شخص نامحمود خاں کی اعانت نہ کرے اگر کرے گا تو مجرم سرکار ہوگا۔ چنانچہ ۱۷ اکتوبر ۱۸۵۷ء کو یہ سب امور تجویز ہوئے اور حکم نامے جات بنام رئیسان ضلع بجنور تحریر ہوئے اور چودھری صاحبان کو میرٹھ سے رخصت کیا۔"

رندھیر سنگھ کی منافقت کا انجام

ہلدور میں چودھری رندھیر سنگھ مع قدرے جمعیت کے موجود تھے جب انہوں نے احمد اللہ خاں کے لشکر کے آنے کی خبر سنی حویلی میں محصور ہو گئے۔ لشکر احمد اللہ خاں نے حویلی کو گھیر لیا۔ طرفین کی طرف سے گولیاں چلتی رہیں اور آدمی بھی مارے گئے آخر کار رات کے وقت چودھری رندھیر سنگھ نے اپنے ساتھ کے آدمیوں کو اجازت دی کہ جس طرح پر چاہیں اپنی جان بچا دیں اور حویلی میں سے نکل جاویں۔ چنانچہ اکثر آدمی نکل گئے۔ صبح کو ۳ نومبر ۱۸۵۷ء احمد اللہ خاں کا لشکر حویلی میں داخل ہوا، اور چودھری رندھیر سنگھ کو گرفتار کر لیا، رام دیال سنگھ پھوپھی زاد بھائی رندھیر سنگھ کا اور [?] اور پانچ چھ آدمی رشتہ مندان کے مارے گئے اور چودھری رندھیر سنگھ کو قید کر کے براہ نگینہ نجیب آباد لے گئے اور ایک مکان میں نظر بند کر دیا جس قدر اسباب ہلدور میں تھا سب لٹ گیا اور مکانات چودھریان ہلدور کے جلا دیئے گئے اور ہلدور ویران محض ہو گیا۔

جبکہ احمد اللہ خاں اور باڑے [?] چاند پور سے ہلدور کو روانہ ہوتے تھے۔ یعنی ۱۲ نومبر

اور شوقِ شہادت کا یہ پس منظر تھا

مولانا ایک مجذوب صفت قلندر وضع اور درویش منش بزرگ تھے۔ وہ دلی پہنچے آگرہ آئے گوالیار گئے۔ لکھنؤ میں قیام کیا، فیض آباد پہنچے، جہاں بھی گئے، انگریزوں سے نفور نشۂ جہاد سے مخمور، نہ تن کی پرواہ، نہ جان کا ہوش، حضرت محراب شاہ گوالیاری کی نظرِ کیمیا اثر نے یہ رنگ اور چوکھا کر دیا۔ آگرے میں محبوبیت اور مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ ان کی مجلسِ وعظ میں دس دس ہزار آدمیوں کا مجمع ہوتا تھا۔ لکھنؤ میں شروع شروع میں ان کا قدم گھسیاری منڈی میں تھا[1] یہ وہ زمانہ تھا کہ ہنومان گڑھی کے سلسلہ میں مولانا سید امیر علی کی شہادت کا حادثہ ابھی تازہ تھا اس حادثہ نے ان کے جوش میں بھی اضافہ کیا اور مقبولیت میں بھی اور شاید یہی چیز تھی جو فیض آباد لے گئی۔ وہاں انگریزوں نے آنکھ دکھائی یہ لڑنے مرنے پر تیار ہو گئے۔ بالآخر گرفتار کر کے جیل بھیج دیئے گئے۔

غدر شروع ہوا تو فیض آباد کا جیل بھی ٹوٹا اور مولانا لکھنؤ پہنچ گئے۔ یہاں ہاتھوں ہاتھ لئے گئے حضرت محل نے ان کے لئے دیدہ و دل فرش راہ کیا لکھنؤ کے عوام نے ان کی خاکِ پاکو سرمۂ چشم بنایا لکھنؤ میں مولانا نے تارے والے کوٹھی میں سکونت اختیار کی اور اسی میں اپنا دربار قائم کیا باغی فوجوں کے افسر یہیں جمع ہو کر مشورے کیا کرتے تھے[2]

لکھنؤ آنے کے بعد مولانا نے بڑی حد تک جنگ کی کمان اپنے ہاتھ میں لے لی کچھ مولویت کچھ جوش جہاد کچھ جوش و خروش کچھ انگریز دشمنی ان سب چیزوں نے مل کر ان کی عظمت و اہمیت دوچند کر دی۔

بیلی گارد پر حملہ

بیلی گارد پر حملہ میں یہ پیش پیش تھے۔ ان کا جوش اور رفیقان راہ کی گریز پائی دیکھئے:۔

"غرض چھ دن اور رات تک طرفین سے مینہ گولے اور گولیوں کا برستا رہا جمعہ کے دن وقت عصر احمد اللہ شاہ نے دھاوا کیا۔ بیلی گارد کے زیر دیوار

---

[1] دلاور جنگ مولانا احمد شاہ (مصنف) دسمبر ۱۹۴۳ء

[2] قیصر التواریخ جلد دوم صفحہ ۲۰۳

[3] گزشتہ لکھنؤ (عبدالحلیم شرر) صفحہ ۴۴

پھاٹک پر جا پہنچا۔ محصورین بیلی گارد کہتے ہیں کہ اس وقت ہم سب کو یقین اپنی ہلاکت کا ہو گیا۔ کہ واسطے کہ سپاہی گورے اور ہندوستانی جتنے مورچوں پر تھے کئی دن کے علی الاتصال لڑنے سے تھک گئے تھے ہاتھ پاؤں کی سب کی سکت جاتی رہی تھی خصوصاً میموں کا حال اضطرار و سراسیمگی اس وقت کا بیان سے باہر ہے۔ سب کے سب تہہ خانہ جنرل صاحب میں خوف سے جا کر چھپ گئے اور موت ہر ایک کی نظر میں پھر گئی۔ شاہ جی پھاٹک کی آڑ میں اپنے مجاہدین کو پکارا کیے کہ بس اس حملے میں ان سب کا کام تمام ہے مگر کسی کی جرأت قدم آگے بڑھانے کی نہ رہی[1]

شیعہ سُنّی مفسدہ

بد قسمتی سے مولانا احمد اللہ اور حضرت محل کے معتمد خاص ممو خاں میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ یہ اختلاف اقتدار کی کشمکش پر مبنی تھا۔ ممو خان کی خواہش تھی کہ سب کچھ اسی کے ہاتھ میں رہے۔ مولانا چاہتے تھے۔ بغیر ان کی مرضی کے کوئی کام نہ ہو۔ مصارف جنگ کے لئے ممو خان نے شہر کی دولت مندوں، مہاجنوں اور سرمایہ داروں پر جبری ٹیکس عاید کیا۔ مولانا نے اسے ناپسند کیا۔ دونوں میں باقاعدہ کش مکش کا آغاز ہو گیا اور یہ کشمکش اتنی بڑھی کہ دونوں ایک دوسرے کی جان کے دشمن ہو گئے اگر یہ بات ذاتی اختلافات تک محدود رہتی تو شاید زیادہ ناگوار صورت پیدا نہ ہوتی لیکن بد قسمتی سے بہت جلد شیعہ سنی کشمکش میں تبدیل ہو گئی۔ مولانا شرر فرماتے ہیں:۔

"احمد اللہ نام ایک قاضی صاحب جو فیض آباد کے باغیوں کے ساتھ آئے تھے اور کئی معرکوں میں لڑ چکے تھے وہ الگ اپنا رعب جما رہے تھے بلکہ خود اپنی حکومت قائم کرنا چاہتے تھے، برجیس قدر کے مقابل لکھنؤ ہی میں ان کا دربار الگ قائم تھا اور دونوں درباروں میں پولیٹیکل اختلاف کے ساتھ شیعہ سنی کا جھگڑا اور تعصب بھی نمایاں ہونے لگا۔ غرض بادشاہ اور شاہ صاحب میں رقابت بڑھتی جاتی تھی"[2]

---

[1] قیصر التواریخ ج ۲ صفحہ ۲۳۰
[2] گذشتہ لکھنؤ (عبد الحلیم شرر) صفحہ ۵۹

دونوں کی ضد نے خاک میں ہم کو ملا دیا

مولانا احمد اللہ اور ممو خان کی کش مکش لازمی طور پر جنگ کی سرگرمی پر اثر انداز ہوئی۔ سپاہیوں میں بددلی پھیلی۔ ان کی وفاداری تقسیم ہوئی۔ ارباب اقتدار اپنی اپنی سوچنے لگے، غداروں، منافقوں اور جاسوسوں کو اپنی کارگزاری دکھانے کا موقع ملا۔ عالم باغ اور دل کشا کی جنگ اس ٹریجڈی کا عبرت انگیز مرقع ہے۔

۹۔ نومبر عیسوی فوج انگریزی عالم باغ سے دل کشا ہو کر بیلی گارد کو رمنہ شاہی سے یا شارع عام سے جا رہی تھی کہ ایک سوار خبر لایا کہ گورے بڑھتے آتے ہیں فوج باغی پیچھے ہٹتی آتی ہے راجہ مان سنگھ نے تصدیق خبر کو اپنا ہرکارہ بھیجا وہ بھی خبر لایا صحیح ہے فوج بہادر بھاگتی چلی آتی ہے یہ سن کر راجہ نے بھی اپنا سامان چلے جانے کا بھی درست کیا۔ دردولت پر اطلاع ہوئی۔ ممو خاں نے ہر چند فوج کو مع افسر روانہ کیا مگر جو گیا خدا کے فضل سے اپنا بھاگ لے کر آیا۔ ایک اور ہرکارا خبر لایا کہ محمد باغ کو گوروں نے لے لیا۔ وہاں کی فوج سب بھاگ آئی۔ جب گورے ان کی طرف بڑھے ان کی صورت دیکھ کر بھاگے کوئی سامنے نہ ٹھہر سکا۔ یقین ہے دوپہر تک یہاں اور شہر میں گورے داخل ہو جائیں۔ یہ سن کر ممو خاں نے مجاہد الدولہ علی خاں عرف چھوٹے میاں کو بلوا کر کہا کمپ نصیر آباد جو دلی سے آیا تھا تمہارے سپرد ہے تم اس کے افسر ہو پہلے وہ سات روپے کی تنخواہ پر راضی نہ تھے اب اونے ۱۲ روپے کا اقرار کیا ہے چار ہزار واسطے چبینے کے دے کہ جلد روانہ کرو احمد اللہ شاہ سے بھی دھاوے کو کہلا بھیجا انہوں نے بھی جواب دیا میرے سپاہی بھوکے ہیں۔ دو ہزار انھیں بھی بھیج دو۔ اس عرصہ میں گورے میدان دلکشا آ پہنچے مقابلہ ہوا۔ امجد علی خاں نے پانچ سو آدمیوں سے دھاوا کیا بڑی بہادری کی جب نوبت تلوار و سنگین تک پہنچی یہ سب مارے گئے۔ احمد اللہ شاہ اور احمد علی نے بھی دھاوا کیا پیش نہ گیا اس وقت تلنگوں نے کہا یہاں کے کارتوس میں بھوسی بھری ہے، یہ سبب ہے کہ سب اہل کار انگریزوں سے ملے ہیں جو توپ ہم مارتے ہیں ان پر کچھ اثر نہیں کرتی ان کی توپ سے ہمارے سب سپاہی مرے جاتے ہیں اس وقت دردولت

پرا کرداروغہ میر واجد علی کو گھیرا۔ انہوں نے اپنی حکمت عمل سے ٹالا۔ وہ سپاہی جو دلی سے آئے تھے چپکے چلے گئے، پھر ممو خان کو گھیرا بھوسی گرابوں میں کس نے بھری ہے؟ انہوں نے میر محمد علی کارندہ ناظم علی داروغہ میگزین کو بتایا اور محمد علی جو گراب بناتا تھا اس کا سامنا کر دیا اس نے کہا دستور گراب بنانے کا یہ ہے کہ اس میں بھوسی پڑتی ہے، تلنگوں نے کہا یہ سب جھوٹ ہے تم سب انگریز سے ملے ہو ہم تم سب اہل کاروں کو مار ڈالیں گے، غرض پھر جناب عالیہ کے حضور گئے۔ ممو خاں کو اپنے ساتھ لے گئے اور گالیاں دے کر کہا یہ انگریز سے ملا ہے اس وقت روبروئے جناب عالی و نواب ر د لکار ی ہوئی۔ ممو خاں کو بچایا اور کہا تمہارا شبہ جس پر ہو اسے مار ڈالو، تلنگوں نے میر محمد علی اور ایک متصدی کو جو گراب بنوانا تھا مشکیں باندھ سڑک پرے جا کر مار ڈالا اس امر میں تلنگوں کا گمان غلط نہ تھا کارروائی اپنی عاقبت اندیشی سمجھ کر کرتے تھے کہ اگر عمل انگریزی ہو جائے گا ہم اس خیر خواہی کو پیش کریں گے بعد اس کے احمد اللہ شاہ نے اس پر اور لون مرچیں لگا تیز کیا کہ یہ گورے اور گراب اد صاحبت کے خواسے ہیں جسے دو صاحب تین میم کے ساتھ بھٹولی کے راجہ لونا سنگھ نے بھیجا ہے مار ڈالو وہ چاہتا ہے ہماری شکست ہو جائے انگریز کی فتح[1]

مولانا کی جنگی صلاحیت

مولانا احمد اللہ شاہ کی جنگی استعداد و صلاحیت شک و شبہ سے بالاتھی۔ انہوں نے متعدد معرکوں میں حصہ لیا اور ہر معرکہ میں یہ ثابت کر دیا کہ وہ غیر معمولی طور پر صاحب تدبیر و سیاست ہیں ان کی شجاعت و بہادری حد سے بڑھی ہوئی تھی جو کبھی کبھی فائدہ کے بجائے نقصان پہنچا دیتی تھی جنرل اوٹرم کو لکھنؤ سے نکالنے کے سلسلے میں انہوں نے جس تہور و دلیری سے جنگ جاری رکھی وہ ان ہی کا حصہ تھا۔ ایک انگریز پرست مورخ کی زبان سے یہ کہانی سنئے۔

"باغیوں کا مشہور اور لائق سرغنہ مولوی احمد اللہ شاہ تھا۔ اس نے بڑی معقول تدبیریں اوٹرم صاحب کے نکالنے کی دسمبر کے اول ہفتے میں کیں اور

---

[1] قیصر التواریخ ص ۲۸۱، ۲۸۲

اس کے لشکر کے قریب توپیں لگا کے گولے پھینکنے شروع کئے ۲۲ دسمبر کو باغیوں نے چار ہزار پیدل اور چار سو سوار اور چار توپیں بھیجیں کہ کان پور سے انگریزوں کی راہ آمدورفت مسدود کر دے، جیسے ہی انہوں نے اس راہ کو بند کرنے کا ارادہ کیا فوراً ۲۲ دسمبر کو اوڈرم صاحب نے ان کی لکھنؤ کی راہ بند کرنے کا قصد کیا۔

۲۲ دسمبر کی صبح کو اوڈرم صاحب نے ان پر حملہ کیا باغی ایسے حیران و پریشان ہوئے کہ اپنی چار توپیں اور ایک ہاتھی چھوڑ کر فرار ہوئے پھر انہوں نے مراجعت کا راستہ بدلا اور دل کشا میں چلے گئے پچاس آدمی ان کے مارے گئے انگریزوں نے ان کا تعاقب کرنا چھوڑا۔ اس شکست کے بعد باغی تین ہفتے تک خاموش بیٹھے رہے۔ انگریزی لشکر پر گولے مارتے رہے جن سے کچھ نقصان نہیں ہوا ہاں نیند میں خلل پڑتا تھا۔

اوڈرم صاحب نے خالی چھکڑے کان پور بھیجے تھے کہ وہ وہاں سے سامان رسد بھر کر پھر آئیں اور ان کے ساتھ سپاہ بھی تھی۔ باغیوں نے اپنے سرغنہ منصب علی کو اس کام کے لئے متعین کیا کہ اتنی تھوڑی سی سپاہ اور چھکڑوں کو کان پور نہ پہنچنے دے مگر یہ انگریزی کاروان کان پور پہنچ گیا۔

۱۲ جنوری کو تیس ہزار کے قریب لشکر نے اوڈرم صاحب کی سپاہ میمنہ پر حملہ کیا اوڈرم صاحب نے گوروں کو بھیجا جنہوں نے اپنی توپوں سے بڑے بہادرانہ کام کئے اور سکھوں نے بھی اپنی شجاعت دکھائی اور باغیوں کو شکست دے کر بھگا دیا۔ یوسے اور سیسے نے میمنہ الیسا برسایا کہ سینکڑوں ان میں ہلاک ہوئے اس شکست سے باغیوں کی ہمت ایسی پست ہوئی کہ ۵ فروری تک پھر انہوں نے لڑنے کا قصد نہیں، یوں ہی حملوں کے بگل بجاتے رہے مگر حملہ نہیں کیا۔[1]

احمد اللہ شاہ کی اوڈرم صاحب سے ٹکر | لیکن مولانا اور دربار حضرت محل کی کشمکش

۱؎ تاریخ ہندوستان سوم (بغاوت ہند) صفحہ ۵۶

بدستور جاری تھی۔ ایک مرتبہ مولانا اور بیگم کے سپاہیوں میں جنگ بھی ہو گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا گرفتار ہو گئے اور جلد ہی رہائی بھی حاصل کر لی۔ مزید واقعہ یہ ہے :۔

"حضرت محل اور مولوی احمد اللہ کے سپاہیوں میں ایسی لڑائی ہوئی۔ کہ سو آدمیوں کا خون ہو گیا اور مولوی قید ہو گیا۔

مولوی بیگم کی قید سے بھاگ کر پھر باغیوں کا بڑا سرغنہ بن گیا اور اس نے ۱۵ فروری کو اوٹرم صاحب پر حملہ کیا لیکن توپوں کے سامنے باغی نہیں ٹھہر سکے بھاگ گئے انگریزوں کا ایک سپاہی قتل اور ایک زخمی ہوا اور پھر باغیوں نے حملے کئے۔ ایک حملہ میں ان کے ساٹھ آدمی قتل و زخمی ہوئے۔ پھر باغیوں نے بڑا زور لگا کر آخری حملہ کیا۔ باغیوں نے یہ سمجھ کر جنرل اور سپاہ اتوار کی صبح کو نماز پڑھنے میں مصروف ہوں گے۔ اتوار کا دن حملہ کا مقرر کیا یہ مقولہ کہ جو تامل کرتا ہے وہ نقصان اٹھاتا ہے لڑائیوں سے زیادہ زندگانی اور کاموں کے متعلق ہے باغیوں نے از سر نو لڑنے میں تامل کیا، سوا دس بجے واپس چلے گئے، بہت پٹے تین سو چالیس آدمی ان کے مقتول اور مجروح ہوئے اس سے ان کی ہمت اور حوصلے پست ہو گئے باغیوں نے جب حملہ کیا ان کو شکست ہوئی مگر وہ مقرور ہونے میں کامیاب ہوئے۔

اوٹرم صاحب کے پاس تقریباً چار ہزار سپاہ تھی جس نے باغیوں کے لشکر کو روکے رکھا۔ اوٹرم صاحب کو ۲۷ جنوری کو بہ تحقیق معلوم ہوا کہ اس تاریخ کو دشمن کے لشکر میں یہ سپاہ بہ تفصیل ذیل تھی :۔

۳۷ رجمنٹیں آئینی سپاہیوں کی	۲۷۵۵۰	سپاہی
۱۴ " نئی بھرتی کی	۵۴۰۰	"
۱۰۶ " نجیبوں کی	۵۵۱۵۰	"
۲۶ " سواروں کی	۷۱۰۰	"
سانڈنی سواروں کی رجمنٹ	۸۰۰	
	۹۶۰۰۰	سپاہی

پہلی آئینی سپاہ تیس ہزار تھی مگر دہلی کے فتح ہونے کے بعد وہ سہ چند ہو

گئی بس اس سپاہ سے جو چاروں طرف حملہ کرتی تھی عالم باغ کو بچائے رکھنا اور کان پور کی راہ کو کھلا رکھنا اوٹرم صاحب کا بڑی مردانگی اور فرزانگی کا کام تھا۔[1]

مولانا احمد اللہ کی طرف سے بادشاہت کا اعلان

انگریزوں سے مولانا نے اس وقت بھی جنگ و پیکار کا سلسلہ جاری رکھا جب وہ لکھنؤ پر قابض ہو چکے تھے اور حضرت محل برجیس قدر کو لے کر نیپال کی طرف روانہ ہو چکی تھیں۔ مولانا نے مختلف مقامات پر ٹھہر ٹھہر کر مورچے بنائے اور ڈٹ کر انگریزوں کا مقابلہ کیا لیکن کامیابی کہیں نہیں ہوئی آخر مولانا شاہجہان پور پہنچے یہاں بھی ناکامی سے سابقہ پڑا۔ اس مرحلہ پر شہزادہ فیروز بھی مولانا کے رفیق کارزار تھے جن کی شجاعت و بہادری بے مثال تھی[2] یہاں سے مولانا اور شہزادہ فیروز محمدی پہنچے یہاں مولانا نے تاج شہریاری سر پر رکھ لیا۔ اپنا سکہ جاری کیا

سکہ زد بر ہفت کشور خادم محراب شاہ
حامی دین محمد احمد اللہ بادشاہ

صرف بادشاہت کے اعلان اور زر و سکہ کے اجراء پر اکتفا نہیں کیا بلکہ جلال شاہی بھی عادات و اطوار سے نمایاں ہونے لگا۔ ایک مورخ تند و تلخ الفاظ میں لکھتا ہے:-

نشہ غرور وقت جو دماغ میں سما گیا تھا شہزادے سے بھی طالب بیعت و فرمانبرداری شل اور خادموں کے ہوا شہزادہ اس حرکت سے خفا ہو کر سندیلہ میں آگیا۔[3]

مولانا احمد اللہ شاہ کے اس اعلان نے دراندازوں اور مخالفوں کو کھل کھیلنے کا موقع دیا۔ لیکن مولانا جیسے لوگ جب کوئی فیصلہ کر لیتے ہیں تو سر دھڑ کی بازی لگا کر اس پر قائم رہتے ہیں

---

[1] تاریخ ہندوستان (بغاوت ہند) صفحہ ۵۰

[2] DISCAVERY OF INDIA
By. P. JAWAHER LAL NEHRU

[3] قیصر التواریخ جلد ۱ صفحہ ۴۶۷

ہیں چنانچہ زندگی کی آخری سانس تک وہ اپنے عزم پر قائم رہے۔

شہادت مولانا کی چند لغزشوں سے قطع نظر مجموعی حیثیت سے وہ سراپا خیر و برکت ہستی کے مالک تھے۔ انہوں نے جو جنگ آزادی شروع کی تھی اسے آخر دم تک جاری رکھا ساتھیوں نے ساتھ چھوڑ دیا۔ دوستوں نے منہ موڑ لیا۔ جاں نثاروں نے پیٹھ دکھائی۔ قدم قدم پر ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن پائے ثبات میں لغزش نہ ہوئی

ذیل میں ایک انگریزوں کے مداح و ثنا خواں مورخ کی زبان قلم سے مولانا کی داستانِ شہادت درج کرتے ہیں۔ اس داستان کا کچھ حصہ ایک انگریز نے بیان کیا ہے جس سے اس راز کا انکشاف ہوتا ہے کہ چپاتیوں کی تقسیم کا کارنامہ مولانا ہی کا تھا فیض آباد میں ان کی گرفتاری اور پھر پھانسی کی سزا اسی جرم میں ملی تھی۔ وہ داستان یہ ہے

اب ہم چند واقعات ضروری بیان کرتے ہیں، خاص کر مولوی کا حال بیان کرنے کے قابل ہے سر طامس سٹین صاحب مولوی کی نسبت بیان کرتے ہیں کہ وہ بڑی قابلیت رکھتا تھا وہ ایسا شجاع تھا کہ خوف نہیں کرتا تھا اور اپنے عزم میں پکا اور ارادہ میں مستقل تھا۔ باغیوں میں اس سے بہتر کوئی سپاہی نہیں تھا۔ اس مولوی کو انگریز کہتے ہیں کہ اس نے اپریل ۱۸۵۷ء میں چپاتیاں تقسیم کرائی تھیں اور فتنہ انگریزی کے لئے سارے اودھ میں کا غذ دوڑائے تھے اسی جرم میں گرفتار ہوا۔ اور اس کو پھانسی لگنے کا حکم دیا گیا۔ مگر پہلے اس سے کہ اس حکم کی تعمیل ہو اودھ میں غدر ہو گیا اور وہ جیل خانہ کے فرش سے اٹھ کر سلطنت کے عرش پر پہنچ گیا۔ یہ فخر اس مولوی ہی کو حاصل ہے کہ اس نے سر کولن کو میدان جنگ میں دو دفعہ ناکامیاب رکھا۔

اب تک مولوی کے دہی دم خم چلے جاتے تھے ان کے عزم جزم میں کچھ فرق نہیں آیا تھا۔ انہوں نے اپنا نام شاہ رکھا تھا وہ بہ نسبت اور باغیوں کے اس خطاب کے لئے زیادہ مستحق تھے جانسن کے کالم سے بچ کر انہوں نے ہال کے اسٹیشن پر حملہ کیا اور ایک اہل کار کے اعضاء کو قطع کیا۔ ۵ جون کو مولوی ہاتھی پر سوار ہو کر پوایاں اس غرض سے پہنچا کہ راجہ پوایاں کے پاس جو سرکار انگریزی کے ملازم چھپے ہوئے تھے ان کو حاصل کرے جب وہ آیا اس نے دروازہ کو بند

پایا راجہ اور اس کا بھائی اور اس کے نوکر فصیل سے لگے ہوئے کھڑے تھے ان میں اشاروں میں کچھ باتیں ہوئیں ۔ مولوی نے جانا کہ میں اندر بزور جا سکتا ہوں اس نے مہاوت کو حکم دیا کہ ہاتھی سے دروازہ ٹکرادے ۔ ہاتھی نے اپنی مستک سے دروازہ پر دو تین ٹکریں مار کر دروازہ توڑا ۔ راجہ کے آدمیوں نے مولوی پر گولیاں چلا کر مار ڈالا ۔ راجہ کے بھائیوں نے اس کا سر کاٹ لیا ۔ راجہ اسے رومال میں لپیٹ کر ہاتھی پر سوار ہوا اور شاہجہان پور کے مجسٹریٹ کے پاس سر کو لے گیا جو اس وقت اور دوستوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے کھانا کھاتے تھے ۔ راجہ نے رومال کھول کر مولوی کا سر دکھایا جس کو مجسٹریٹ دیکھ کر بہت خوش ہوئے دوسرے دن یہ سر کوتوالی میں لٹکایا گیا [۱]

خراج عقیدت

بوایاں کے راجہ جگن ناتھ کو پچاس ہزار روپیہ انعام کا مل گیا ۔ انگریزوں کا سب سے بڑا دشمن قتل ہو گیا ۔ لیکن اس کے بارے میں ایک بڑا انگریز میلسن یہ کہنے پر مجبور ہو گیا کہ :-

"مولوی ایک بہت بڑا تجربہ کار شخص تھا ۔ ان کے سوا کوئی شخص فخر کے ساتھ یہ سچا دعویٰ نہیں کر سکتا تھا کہ میں نے کالن کیمبل کمانڈر انچیف ہند کو دوبار میدان میں شکست دی ۔ مولوی احمد اللہ شاہ سچا محب وطن تھا اس نے کسی نہتے کا خون بہا کر اپنی تلوار کو خراب نہ کیا ۔ اس نے بہادری کے ساتھ ڈٹ کر کھلے میدان میں ان بدیشیوں کے ساتھ جنگ کی جنہوں نے اس کا وطن چھین لیا تھا ۔ ہر ملک کے بہادر لوگوں کو مولوی احمد اللہ شاہ کو عزت کے ساتھ یاد رکھنا چاہیے" [۲]

ایک اور اعتراف

یہ ذکر ختم کرنے سے پہلے ایک اور بڑے انگریز کا اعتراف بھی ایک مؤرخ کے واسطے سے سن لیجئے :-

اگر وطن کے محب ہونے کے یہ معنی ہیں کہ وہ اپنے ملک کی آزادی کے لئے جو غلطی سے برباد ہو گئی ہو سازشیں کرے ۔ اور لڑائیاں لڑے تو یقینی

---

[۱] تاریخ ہندوستان (بغاوت ہند) ذکاء اللہ صفحہ ۹۲

[۲] رسالہ (مصنف دسمبر ۱۹۳۳ء) مقالہ دلاور جنگ مولانا احمد اللہ شاہ ، از انتظام اللہ شہابی)

مولوی اپنے ملک کا محب صادق تھا، اس نے کبھی اپنی تلوار کو مخفی اور سازشی قتلوں سے خود آلود نہیں کیا، وہ بہادرانہ، معززانہ معرکہ آرا بیگانوں اور اجنبیوں سے ہوا جنہوں نے اس کا ملک چھین لیا تھا، پس ساری قومیں اس مولوی کو پیار کریں گی کہ وہ تعظیم ادب کا جو شجاعت اور صداقت کے لئے لازمی ہیں مستحق تھا۔"

مولانا کی قبر مولانا کی قبر شاہ جہان پور کے قریب ایک موضع میں ہے جو گنج کہلاتا ہے مولانا سید طفیل احمد صاحب نے کتبہ لگوادیا تھا، سالانہ عرس کا سلسلہ بھی جاری تھا لیکن اب تقسیم ہند کے بعد نہیں کہا جاسکتا کہ حکومت ہند نے وہاں کوئی یادگار قائم کرنے کی ضرورت محسوس کی ہے یا نہیں۔ واقعات کا جواب انکار میں ہے کوئی مضائقہ نہیں۔

طمع فاتحہ از خلق نہ داریم نیاز
عشق من از پس من فاتحہ خوانم باقیست

---

(۲)

برجیس قدر

گرچہ تھے صفحۂ ہستی پہ ہم اک حرف غلط
لیکن اٹھے بھی تو اک نقش بٹھا کے اُٹھے

ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ کسی قوم میں زندگی کی رمق موجود ہو اور اسے آسانی سے غلام بنا لیا جائے مسلمانوں نے سرزمین ہند پر تقریباً ایک ہزار سال تک دبدبہ اور طنطنہ کے ساتھ حکومت کی۔ ان کی حکومت عدل، انصاف، مساوات اور رواداری پر مبنی تھی، لیکن جس طرح انسان مرتے ہیں، اسی طرح قومیں بھی مرتی ہیں، ملک بھی مرتے ہیں، حکومتیں بھی مرتی ہیں۔ اودھ کی حکومت بھی موت کے گھاٹ چڑھ گئی۔ اودھ کا خاندان شاہی بھی زندہ نہ رہ سکا۔ اودھ کی مسلمان

قوم بھی مرگئی یعنی غلام بن گئی

لیکن مرتے مرتے بھی اس نے ثابت کر دیا کہ جہاں اس کی صف میں غداروں، ملت دشمنوں، خود غرضوں اور گندم نما جو فروشوں کی کمی نہیں۔ وہاں مٹھی بھر سہی، لیکن بچوں اور عورتوں تک میں زندگی کی آخری سانس تک جنگ آزادی لڑنے کا ولولہ اور حوصلہ موجود ہے۔ حضرت محل، لکشمی بائی اور برجیس قدر (جن کا اصلی نام شہزادہ رمضان علی تھا) کی کارگزاریاں ہمارے دعوے کا ناقابل تردید ثبوت ہیں۔

کوئی شبہ نہیں برجیس قدر تخت حکومت پر بیٹھے، لیکن یہ تخت ان سے چھن بھی گیا۔ بایں ہمہ انہوں نے بزدلی اور کم ہمتی کا مظاہرہ نہیں کیا، وہ نوعمر تھے، کم سن تھے، امور مملکت سے ناواقف تھے، حالات نامساعد تھے، دشمن بہت زیادہ تھے، لیکن نہ ان کے تیور میں فرق آیا، نہ آن میں، نہ ہمت میں نہ حوصلہ میں،

برجیس قدر کی تخت نشینی کی تفصیل یہ ہے

انگریزوں کا تسلط اور غدر

اور یہ شہزادہ حضرت محل کے بطن سے ہے، جب اس کو کچھ ہوش آیا تو مولوی غلام حضرت، بنا بر تعلیم علوم و فنون اور آداب خاندانی کے مامور ہوئے، محمود خان اس محل کا داروغہ اور ٹھاکر پرشاد دیوان تھا، ۱۸۵۶ء میں جب انقلاب زمانہ پیش ہوا اور سریر سلطنت شاہ اودھ سے منتزع ہو کر ملک اودھ کارپردازان انگلشیہ کے زیر اہتمام آیا اور واجد علی شاہ کلکتے کو چلے گئے۔ املاک قیصر باغ و دیگر مکانات سکونت محلات و اسباب دولت خانہ حسام الدولہ کے اہتمام میں چھوڑا۔ حضرت محل مثل اکثر دوسرے محلوں کے بادشاہ کے ساتھ کلکتہ نہ گئی تھیں اور بدستور اپنے مکان سکونت میں قیام پذیر تھی سرکار شاہی سے مصارف ماہانہ عطا ہوتے تھے اور ضروریات معرفت حسام الدولہ بہادر رفع ہوتیں گو انتزاع سلطنت سے شان و شوکت شاہانہ میں فرق آیا تھا، مگر خزائن و دفائن سے ایسی عسرت و تنگی نہ تھی کہ باعث شکایت ہوتی۔ انگریزوں کا تسلط ملک پر بخوبی ہو گیا تھا رعایا اور حکام سب مطمئن تھے۔ بادشاہ اور دوسرے متوسلان شاہی کے کان ہر دم اس خبر کے منتظر تھے کہ صدائے واپسی ملک عنقریب فرحت بخش ہو گی۔ گویہ آرزو دل ہی دل میں رہی لیکن فلک شعبدہ باز نے ایک شعبدہ تازہ برپا کیا اور بلائے آسمانی خطہ دلربائے اودھ پر نازل کیا کہ ۱۸۵۷ء میں سپاہ انگریزی کا دل ایسا منقلب ہوا کہ تمام خیر خواہی

جاتی رہی نئے کارتوس جو ولایت سے آئے تھے فوج متعینہ کو قریب کلکتہ کے تقسیم ہوئے ان کے خیال ناقص میں یہ سودائے خام سمایا کہ ان کارتوسوں پر چربی گائے اور سؤر کی لگی ہوئی ہے پس سپاہیان ہنود و مسلمان نے ایک دوسرے کے مشورے سے یہ اقرار دیا کہ یہ کارتوس اس قابل نہیں کہ دانتوں سے کاٹے جائیں حکام کے سامنے ان کے کاٹنے سے انکار کیا اور بذریعہ نامہ و پیام خفیہ اکثر مقامات پر چھاؤنیوں میں جہاں جہاں فوج مقیم تھی اطلاع کی اور ان کو آمادۂ عدول حکمی کیا۔ افسروں نے ان کو ہر طرح سے سمجھایا کہ سرکار کو کسی کے دین و ایمان کی خرابی و بربادی سے کچھ غرض نہیں اور کارتوسوں میں کوئی شے خلاف ملت و مشرب ہندو و اسلام نہیں ملائی گئی مگر سپاہ کے ذہن میں کچھ نہ آیا اور عدول حکمی سے باز نہ آئے اب حاکم و محکوم دونوں کی طرف سے اطمینان رخصت ہوا اور تلنگوں کی بعض پلٹنیں اسی عدول حکمی کے قصور میں اس اطراف میں موقوف کی گئیں اور مقام بارک پور سے ماہ مارچ میں بعد لینے ہتھیار کے اس پار دریا کے اتار دی گئیں۔ یہ تلنگے جہاں پہنچے پیادگان فوج سرکاری کو اپنی چرب زبانی سے منحرف کرتے گئے، غرضیکہ یہ ہنگامہ ترقی پذیر ہوا۔ فوج کے ہاتھ سے حکام انگریزی پر صدمۂ جان و مال پہنچا، ہوتے ہوتے یہ سموم فساد گلستان ملک اودھ میں پہنچی۔ یعنی ۲۲ جون ۱۸۵۷ء کو فوج باغی قریب لکھنؤ پہنچی، صاحب کمشنر سپاہ باغی کی آمد کے انسداد کے لئے گئے چونکہ ان کا مجمع کثیر تھا واپس آئے اور مقام بیلی گارد میں جس کو حصن حصین پہلے سے بنا رکھا تھا داخل ہوئے فوج باغی تعاقب کناں آئی اور محاصرہ قلعہ مچھی بھون اور بیلی گارد کا کرلیا دوسری جولائی تک لوٹ مار کا بازار شہر میں خوب گرم رہا، ہزاروں رئیسوں کا خانماں دولت تباہ ہوا، صدہا مستورات عصمت کوش بیوہ برباد ہو گئیں ایک آفت ناگہانی برپا تھی

برجیس قدر کی تخت نشینی

تیسری جولائی ۱۸۵۷ء کو فوج کی منادی ہوئی کہ اور افسران سپاہ معرفت راجہ جے لال سنگھ پسر راجہ درشن سنگھ ملازم سرکار شاہی کے حضرت محل کی ڈیوڑھی پر پہنچے اور مرزا برجیس قدر نابالغ کی مسند نشینی کی استدعا کی حضرت محل اس امر کے سننے سے نہایت مضطرب اور حیران ہوئی اور دل میں خیال کیا کہ یہ فوج بد اندیش جن سے اپنے آقائے قدیم کے متعلقین کو بے رحمی و بے دردی سے ایذائے سخت پہنچی ہمارے ساتھ کیا سلوک کرے گی، یہ لڑکا ابھی نہایت صغیر سن ہے، نیک و بد کی تمیز نہیں ہے ایسے مہارک جان ستان میں کیا کرے گا ساکت رہی اور ممو خاں دارو غہ اور حسام الدولہ

سے مشورہ جو ہوئی جو یہ لوگ بمقتضائے عاقبت بینی اس کا بہ قبیح کے سمجھانے لگے۔ جب سپاہ نے سر نے لیت ولعل دیکھا اس کی نیت فتنے کی طرف مائل ہونے لگی۔ آخر کار یہ مشورہ قرار پایا۔ کہ درخواست نہ قبول کرنے کی صورت میں جس امر کا آئندہ کو اندیشہ ہے اسی وقت ظہور میں آجائے گا فوج باغی خاندان و متوسلان شاہی کو برباد اور قتل کر ڈالے گی پس تن بہ تقدیر جو ہو سو ہو سردست تو جان بچانی واجب ہے [1]

مؤرخین کا جھوٹ اور سچ

مذکورہ بالا سطور میں، جو توجیہہ پیش کی گئی ہے۔ وہ یقیناً غلط ہے اصل بات یہ تھی کہ انگریزوں نے بدعہدی، محسن کشی اور احسان فراموشی کی جو فقید المثال روایت قائم کی تھی اس سے ہر شخص متنفر اور بے زار تھا۔ لیکن انگریز طاقت ور تھے۔ اودھ کے باشندے اور شاہی خاندان کے افراد کمزور تھے۔ موقع کی تاک میں رہے۔ غدر کے شروع ہوتے ہی، انھیں ایک آخری کوشش کرنے کا موقع مل گیا اور وہ تن بہ تقدیر میدان میں نکل آئے۔ یہ کتابیں زیادہ تر انگریزوں کے عہد عروج میں لکھی گئیں جب ان کی بدگمانی، موت کا پیغام تھی اور وہ فرعون و نمرود کی طرح تخت حکومت پر بیٹھے، خدائی کر رہے تھے۔ اس لئے یہ مورخ سچی بات چبا چبا کر بیان کرتے ہیں اور ان کا لب و لہجہ زیادہ تر معذرتی انداز لئے ہوتا ہے، تاریخ اودھ اور قیصر التواریخ وغیرہ سب کا یہی رنگ ہے۔

شیعہ سنّی سوال

نجم الغنی (تاریخ اودھ) کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ واجد علی شاہ کی معزولی کے بعد انگریزوں نے ایسے ستم ڈھائے اور غدر شروع ہونے کے بعد حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ "مجبوراً" برجیس قدر تخت حکومت پر بیٹھے، لیکن صاحب قیصر التواریخ نے، اس جنگ آزادی کو، شیعہ سنی سوال بنانے سے بھی احتراز نہیں کیا ہے، فرماتے ہیں:۔

> شاہجہان آباد (دہلی) میں اہل سنت بہت تھے وہ اپنے مذہب سے شریک ہوئے، لکھنؤ میں کثرت شیعہ تھی، ان کے مذہب میں جہاد بغیر امام کے حرام تھا کیونکہ شریک ہوتے [2]

لیکن یہ سارا "معذرتی" انداز بے کار ہے، لکھنؤ کے عوام اور خواص، صرف اس لئے اس

---

[1] تاریخ اودھ جلد پنجم، نجم الغنی، صفحہ ۵۵

[2] قیصر التواریخ جلد دوم صفحہ ۲۹۳

جنگ میں فرقہ اور مسلک سے بے پرواہو کر شریک ہوئے کہ یہ حق کی جنگ تھی، ظلم کے خلاف جنگ تھی، غاصب کا مقابلہ تھا۔

شاہی سے وزارت کی طرف

برجیس قدر کی تخت نشینی کے حالات کا اگر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس تحریک کی پشت پناہی بڑے بڑے سیاست داں دماغ کر رہے تھے ابتدا میں والیان اودھ شاہان دہلی کے وزیر تھے۔ اور ان سب کو نواب وزیر اودھ کہا جاتا تھا۔ غازی الدین حیدر کے زمانے میں دہلی کے اثر و رسوخ کو کم کرنے کی غرض سے انگریزوں نے اودھ میں بادشاہی کا ڈول ڈالا اور غازی الدین حیدر نواب وزیر کے بجائے شاہ کے لقب سے ملقب ہوئے مشرف الدولہ نے دہلی کے ساتھ پرانے تعلقات کی تجدید کو پیش نظر رکھتے ہوئے برجیس قدر کو بادشاہ نہیں بلکہ نواب وزیر بنایا۔

تخت نشینی کی کیفیت

۵ جولائی ۱۸۵۷ء کو احمد حسین کی تحریک اور نواب ممو خاں کی تائید سے برجیس قدر حضرت محل کے بیٹے تخت واجدی پر متمکن ہوئے شہاب الدین اور سید برکات احمد سالار نے مندیل شاہی برجیس قدر کے سر پر رکھی۔ تمام افسروں نے تلوار نذر گذاری ۲۱ ضرب توپ کی سلامی سر ہوئی، شہر میں غلغلہ مسند نشینی ہوا، شہر میں منادی ہوئی خلق خدا کی، ملک شاہ دلی کا، حکم برجیس قدر کا، دوسرے روز تمام اہل وثائق پنشن یافتہ قدیم وجدید دردولت پر حاضر ہوئے اور اپنے عہدوں پر بحال ہوئے[1]۔

نئے بادشاہ کی بیدار مغزی

برجیس قدر تخت پر بیٹھے۔ تو لوٹ مار کا بازار گرم تھا۔ افراتفری مچی ہوئی تھی، نظم مملکت معطل تھا، عوام پریشان تھے۔ تلنگے اور سپاہی انہیں لوٹ رہے تھے، پریشان کر رہے تھے۔ برجیس قدر نے تخت نشین ہوتے ہی اس مفسدہ کی طرف توجہ کی اور اس کے انسداد کا بندوبست کیا، چنانچہ جو پہلا فرمان انہوں نے نافذ کیا، وہ یہ ہے:۔

"اب کوئی کسی کو شہر میں نہ لوٹے، وگرنہ سزا پائے گا[2]"

---

[1] قیصر التواریخ جلد ۲ صفحہ ۲۲۷

[2] قیصر التواریخ جلد ۲ صفحہ ۲۲۷

تھے، یہ غدار، انگریزوں سے ساز باز کر رہے تھے، ان میں شاہی خاندان کے لوگ بھی تھے، امراء و روساء بھی، تعلقدار، اور جاگیردار اور زمیندار بھی اور حکام و عمال بھی۔ لیکن یہ عوام یہ سپاہی، ان غداروں کا سراغ لگاتے تھے ان کی غداریوں پر کڑھتے تھے اور انھیں کیفر کردار تک پہنچانے کے لئے بے قرار رہتے تھے۔ ہندو عوام کی عقیدت، تو خوش عقیدگی تک پہنچی ہوئی تھی۔ چنانچہ خاندان شاہی اور دوسرے غداروں کی خبر پاکر چند لوگ حضرت محل کے حضور میں پہنچے اور عرض گزار ہوئے،

> یہاں کے سب آدمی انگریزوں سے ملے ہیں۔ اس میں خرابی ہے، پھر کہیں ٹھکانا نہیں۔ جس طرح بنتا ہے دھاوا کر کے ہم بیلی گارد میں گھس جائیں گے رام چاہے تو کل انگریز نہیں یا ہم نہیں۔ جب تک بیلی گارد فتح نہ کریں گے تنخواہ نہ مانگیں گے، ہمارے برہمن، پنڈت علم نجوم سے کہتے ہیں کہ برجیس قدر کی سلطنت کلکتہ تک ہے، بڑا صاحب اقبال ہے اچھی ساعت میں گدی پر بیٹھا ہے۔ [1]

خلوص اور ایثار کی یہ کار فرمائی، حق تو یہ ہے کہ صرف عوام ہی کی متاع ہے، خواص اس سے ہمیشہ محروم رہے

برجیس قدر کا سپاہیوں سے خطاب

نئی حکومت مالی اعتبار سے بہت کمزور تھی زردار اپنا دھن دولت چھپائے، کونوں میں دبکے ہوئے تھے، آخر سپاہی تلوار اور بندوق و بارود تو نہیں کھا سکتے تھے، انہوں نے موٹی موٹی اسامیوں کو لوٹنا شروع کیا۔ فریاد و فغاں کا شور بلند ہوا۔

> جب لوگوں نے خبر لوٹ مار کی برجیس قدر سے عرض کی ایک دن سب تلنگوں کو اور افسروں کو بلوایا، آپ گھوڑے پر سوار ہوئے ۲۱ توپ کی سلامی چلی۔ آہستہ آہستہ سمجھانے لگے کہ اے بہادرو ہم تم سے بہت خوش ہیں، خوب لڑتے ہو، مگر یہی ایک بات کا رنج ہے کہ تم شہر کو لوٹ رہے ہو، اسے موقوف کر دو، ورنہ سب رعایا بد دعا دے گی، افسروں نے دست بستہ عرض کی۔ جناب عالی اب شہر نہ

---

[1] قیصر التواریخ جلد دوم صفحہ ۲۳۲

عہدوں کی تقسیم

حقیقت یہ ہے کہ اس جنگ میں ہندو، مسلمان، شیعہ، سنی سب مساوی طور پر شریک تھے اس لئے کہ یہ عوامی جنگ تھی، بعض لوگوں نے شیعہ سنی اور ہندو مسلم سوال پیدا کر کے افتراق برپا کرنے کی کوشش کی تھی اور بعض میں بڑی حد تک اتنے کامیاب بھی ہوئے کہ جنگ آزادی ناکام ہو گئی، لیکن جہاں تک حضرت محل، برجیس قدر، ممو خان وغیرہ کا تعلق تھا یہ لوگ شیعہ ہونے کے باوجود واجد علی شاہ کے مسلک کے مطابق، ہمیشہ ہندو مسلم اور شیعہ سنی سوال سے بالا رہے چنانچہ نئی حکومت میں جو عہدے تقسیم ہوئے ان کی بنیاد صرف اہلیت تھی نہ کہ مذہب اور فرقہ اور جماعت چنانچہ:-

> در باب نیابت و دیوان میں کورٹ ہوا، حسام الدولہ[1] نے نواب شرف الدولہ کا نام لیا، سب نے باتفاق مانا کہ ان کی کارگزاری البتہ بہ نیک نامی مشہور رہی ہے، جواہر علی خاں نے کہا وہ سنی ہے، ممو خان[2] شرف الدولہ کو اپنے ساتھ خاص مکان میں لائے، مرزا برجیس قدر نے خلعت نائب دیوانی منگوا کر عنایت کیا، یہ خلعت آخرت[3] تھا۔ خلعت دیوانی مہاراجہ بال کرشن کو ملا[4]

نئے بادشاہ سے ہندوؤں کی عقیدت

مال دار اور اونچا طبقہ خواہ وہ ہندوؤں کا ہو یا مسلمانوں کا اپنے ملک کا غدار اور انگریزوں کا وفادار تھا، ہندوؤں کی غداری تعصب پر اور مسلمانوں کی خود غرضی پر مبنی تھی، لیکن نتیجہ دونوں کا ایک تھا۔

لیکن عوام کا اور جانباز سپاہیوں کا جہاں تک تعلق تھا۔ خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، سنی ہوں یا شیعہ سب جان و دل سے اپنی قومی اور ملکی حکومت پر نثار

---

[1] یہ شیعہ تھے

[2] یہ بھی شیعہ تھے۔

[3] طنز کی گہرائی دیکھیے

[4] قیصر التواریخ جلد دوم صفحہ ۲۲۸

ولے گویا

مصارف جنگ روپیہ ناپید تھا۔ مصارف جنگ میں روز افزوں اضافہ ہو رہا تھا۔ آخر حضرت محل نے گھر کا اثاثہ سیم و زر قربان کیا ۱۔ اس کی مالیت چار لاکھ تھی۔ نئی ٹکسال بنی، نواب حضور عالم اور دوسرے امرا سے بہ جبر جو روپیہ لیا گیا اس کی تفصیل قیصر التواریخ نے یہ بتائی ہے ۔

(۱) سامان نقد و جنس	۱۸ لاکھ روپیہ
(۲) جواہرات	۲ " "
(۳) متفرقات	۱ " "
(۴) اچھے صاحب	۵۰ ہزار روپیہ
(۵) میر احسان علی خاں	۴۵ ہزار روپیہ
(۶) منجھلی بیگم	۱۰ " "
(۷) محمد بخش داروغہ	۵ " "
(۸) چندی سہلے کے دیوان نواب صاحب	۵ لاکھ روپیہ
(۹) اہل شہر سے ۲	۵۵ " "

بظاہر یہ رقم خاصی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن انگریزوں نے اپنے دور حکومت میں غیر ملکی جنگوں کے لئے ہندوستانیوں سے جو روپیہ بٹورا۔ وہ اس سے کئی سو گنا زیادہ ہے ۔

برجیس قدر کا سکہ ٹکسال بننے کے بعد یہ مسئلہ اٹھا کہ سکہ کس کے نام کا ڈھالا جائے لوگوں نے متعدد نام پیش کئے۔ کسی نے واجد علی شاہ کا۔ کسی نے بہادر شاہ کا، کسی نے شاہ عالم کا، کسی نے جہاں بخت کا۔ برجیس قدر کے نام کے جو سکے تجویز ہوئے وہ یہ تھے ۔

سکہ زد بر سیم و زر چوں مہر بدر
نیر دیں میرزا برجیس قدر

سلہ قیصر التواریخ جلد دوم صفحہ ۲۲۲
عہ قیصر التواریخ جلد دوم صفحہ ۲۲۵

ایک دوسرا سکہ یہ تھا:-

سکہ زد از فضل حق بر اشرفی مہر و بدر
اختر سلطان عالم، میرزا برجیس قدر[1]

تعلقہ داروں کی مدد اور کمک

زمینداروں اور تعلقہ داروں سے، جو فوجی مدد اور کمک برجیس قدر کو ملی، وہ بہت کم تھی اور اس کا بھی بڑا حصہ بے دلی اور تنگ حوصلگی پر مشتمل تھی، پھر بھی صاحب قیصر التواریخ نے جو تفصیل دی وہ یہ ہے:-

(۱) راجہ دیبی بخش سنگھ، راجہ گونڈا	۳ ہزار سپاہی
(۲) آنندی اور خوش حال وغیرہ تعلقہ دار گوشائیں گنج	۲۰ ہزار سپاہی
(۳) راجہ سکھ درشن زمیندار سمرو تہ	۷ ہزار سپاہی
(۴) سبھرام بخش زمیندار سمرو تہ	۲ ہزار سپاہی ۳ ضرب توپ
(۵) راجہ لال مادھو سنگھ، تعلقہ دار گڑھی امیٹھی	۵ ہزار سپاہی ۴ ضرب توپ ۲۰۰ سوار
(۶) رانا بیٹی مادھو سنگھ، تعلقہ دار بیسواڑہ	〃 ۵ 〃 〃 〃
(۷) حشمت علی چودھری تعلقہ دار سندیلہ	۴ 〃 〃
(۸) میر منصب علی، تعلقہ دار، رسول آباد	۱ 〃 〃
(۹) رگھناتھ سنگھ تعلقہ دار کھجور گاؤں	۲ 〃 〃 ۴ ضرب توپ
(۱۰) کلو خاں کارندہ تانیارہ	۱۰ 〃 〃

برجیس قدر کا حکم نامہ طلبی

دوسرے تعلقہ داروں کو بھی، برجیس قدر نے پروانہ طلبی بھیجا۔

"در فضل خدا سے بتاریخ سعید روز نیک ابدولت واقبال نے مسند آبائی پر جلوس فرمایا، تمہیں لکھا جاتا ہے کہ کوئی انگریز مع فوج و اہلکار کسی گھاٹ سے تمہارے علاقہ میں اترنے نہ پائے، جس طرح سے مقابلہ کرنا اور بعد دیکھنے حکم نامہ ہذا مع فوج و توپ در دولت پر حاضر ہونا، تاکید جانو۔"

---

[1] قیصر التواریخ جلد دوم صفحہ ۲۳۵

لیکن اس حکم نامہ کا جواب خاطر خواہ نہ ملا۔ زیپت سنگھ تعلقہ دار روہیا نے لکھا:۔

پروانہ کرامت نشانہ حضور مشعر اجلاس فرمائی آیا سرفراز و ممتاز کیا۔ اللہ تعالیٰ مبارک کرے خانہ زاد کی گڑھی سے علاقہ انگریزی قریب ہے، فقط دریائے گنگ درمیان ہے، خانہ زاد کا آنا مصلحت وقت نہیں ہے۔ ان شاء اللہ اگر کفار قصد عبور گنگ کریں گے باقبال سرکار سے مقابلہ کر کے قتل کروں گا

واجب تھا عرض کیا!"

ہردیو سنگھ، لکھن سنگھ، زمیندار ہانگر منو، میر غلام جعفر زمیندار عثمان پور، میر عالم علی زمیندار بانوں بھیکن خاں زمیندار بھوتی وغیرہ۔

"حاضر نہ ہوئے، وجہ ان کی غیر حاضری کی معلوم نہ ہوئی۔"

لال بلونت سنگھ راجہ کالا کانکر، بابو گلاب سنگھ تعلقہ دار زول وغیرہ

"فوج انگریزی سے خوب لڑے، بعض راجہ اپنی اپنی فوج کو لے کر لکھنؤ آئے اپنے پاس سے خوراک دیتے تھے۔"[1]

کاروبارِ حکومت "الغرض افسران فوج باغی نے ۱۲ ذوالقعدہ ۱۲۷۳ھ ہجری کو مرزا برجیس قدر کو مسند ریاست اور دھر پر بٹھایا اور عہد و پیمان جیسا منظور ہوا تلبند کرا لیا نذر مسند نشینی کے مراسم ادا ہوئے، منادی ہوئی، کارگزاران شاہی جو بخوف جان و مال گوشۂ اختفا میں چھپے ہوئے تھے، تلاش ہو ہو کر حاضر کئے گئے اور ہر ایک کو عہدہ جات سابقہ تفویض ہوئے۔ افسر لوگ ہر روز ڈیوڑھی برجیس قدر پر دربار کرتے اور مشورہ کر کے جو امر ان کے مزاج میں آتا عمل میں لاتے۔ ممو خان کو نائب ریاست بنایا اور ناصر الدولہ خطاب دیا اور خدمت فراہمی اسباب جنگ و زر نقد مرزا برجیس قدر کی جانب سے اس کے متعلق کی اور مطابق احکام فوج کاروبار ملکی و جنگی جاری ہونے لگے۔

ناکامی، شکست، فرار آخر وہی ہوا جو ہونا چاہئے تھا، غداروں اور جاسوسوں نے انگریزوں سے ساز باز کر رکھا تھا۔ اپنی حکومت کے بدخواہ غیروں کو حکومت کی دعوت دے رہے تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ انگریز غالب آئے اور برجیس قدر کی حکومت شعلہ مستعجل کی طرح اپنی چمک دمک دکھا کر ختم ہو گئی۔

---

[1] قیصر التواریخ جلد دوم صفحہ ۲۳۸

وجب انگریز تسلط کرتے ہوئے داخل لکھنؤ ہوئے تو سپاہ باغی نے اپنی حفاظت میں حضرت محل اور برجیس قدر کو محمود آباد کی راہ سے دریائے گھاگرا عبور کرا کے مقام بونڈی میں پہنچایا۔ جب بونڈی میں بھی فوج انگریزی کی آمد کا غلغلہ بلند ہوا تو دونوں ماں بیٹے روانہ نیپال ہوئے۔ اس واقعہ کی تاریخ یہ ہے

مرزا رمضان علی ناکام — شد بجانب کوہ چوں سبکتاز
تاریخ روانگی چو جستم — نیپال شناخت آمد آغاز[1]

مولانا شرر فرماتے ہیں۔

لکھنؤ کے جواہرات نیپال کے خزانہ میں | "مرزا برجیس قدر لکھنؤ سے بھاگے تو سرحد نیپال پر دم لیا۔"

لیکن یہ فرار بزدلی کا فرار نہ تھا، مہلت جنگ تھی۔ شرر صاحب کا ارشاد ہے:۔

"ہمراہ رکاب تقریباً ایک لاکھ آدمیوں کا مجمع تھا ان لوگوں نے ارادہ کیا کہ ہمالیہ کی گھاٹیوں میں پناہ گزین ہو جائیں اور جب موقع ملے نکل کے انگریزوں پر حملہ کریں۔ فتح ہو تو اپنے وطن پہنچیں شکست ہو تو پھر بھاگ کے پہاڑوں میں پناہ لیں، ریاست نیپال میں مرزا برجیس قدر اور ان کی ماں کو تو پناہ دے دی مگر ان کے ہمراہی طوفان بے تمیزی کو حکم دے دیا کہ فوراً واپس جائیں۔ بہت سے بھاگے، بہت سے مارے گئے، بہت سے بھیس بدل کر کسی طرف نکل گئے مرزا برجیس قدر مع اپنے والدہ کے خاص نیپال میں جا کے سکونت پذیر ہو گئے دربار نیپال سے ان کے لئے کچھ معمولی وظیفہ مقرر ہو گیا۔ اور ان کے ساتھ جس قدر جواہرات تھے سب حکومت نیپال کے نذر ہوئے"[2]

واجد علی شاہ اور برجیس قدر | برجیس قدر کی کارگزاریوں سے واجد علی شاہ کو کوئی تعلق نہ تھا اور نہ ہی کوئی سروکار تھا۔ لیکن ان کا دل حب و محبت کا گنجینہ تھا، اپنی اولاد سے انھیں غیر معمولی محبت تھی۔

---

[1] تاریخ اودھ جلد ۵

[2] گزشتہ لکھنؤ شرر، صفحہ ۲۷

اپنی مثنوی "حزن اختر" میں بیویوں بچوں کا ذکر کیا ہے، اس سلسلہ میں برجیس قدر کا ذکر بھی کیا ہے، جو عیش و راحت سے محروم سختی اور دکھ کی زندگی بسر کر رہے تھے، کہتے ہیں:-

جو وہ چو تھا شہزادہ ہے رشک بدر
اسے لوگ کہتے ہیں برجیس قدر

وہ چودہ برس کا ہے کچھ شک نہیں
کہوں کیا کہ وہ ہے کہیں کا کہیں

ملاؤں جو حضرت سے لفظ محل
تو نام اس کی ماں کا کھلے برمحل

جو بگڑی تھی آگے سے انگریزی فوج
اسے لے گئی جیسے دریا کی موج

وہ مہ جبینہ مفسداں میں ہے آہ
بنایا ہے اپنا اسے بادشاہ[1]

زندگی کا انجام حضرت محل کی زندگی تک، برجیس قدر نیپال میں زندگی کی سختیاں برداشت کرتے رہے۔ ماں (حضرت محل) جب تک زندہ رہیں یہ ان کے آغوش محبت سے جدا نہ ہوئے۔ جب ان کا انتقال ہو گیا تو وہاں کا سنگستان ان کے لئے وبال جان بن گیا۔ انگریزوں نے بھی بڑی عنایت کا مظاہرہ کیا۔ یعنی ان کا قصور "بخش" دیا

جو کام ہوا ہم سے وہ رستم سے نہ ہوگا

چنانچہ آخر کار:-

"ملکہ وکٹوریہ کی جبلی کے موقع پر، دولت برطانیہ نے مرزا برجیس قدر کا قصور معاف کر دیا۔ انہیں واپس آنے کی اجازت ملی۔ تو کلکتہ پہنچے، یہاں واجد علی شاہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ اور بہ حیثیت اولاد اکبر مرزا قمر قدر سب سے زیادہ تنخواہ پا رہے تھے برجیس قدر نے دعوے کیا۔ بادشاہ کے تمام بیٹوں سے زیادہ معزز و مستحق میں ہوں۔ از روئے قانون بادشاہ کی پنشن میں سے ایک ثلث گھٹا کر باقی تنخواہ میرے نام پر جاری کی جائے اور ان کے تمام ورثا و اور وابستگان دولت کی خبر گیری میرے ذمہ کی جائے۔ اس کی پیروی میں وہ انگلستان جانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ کہ ان کے خاندان والوں میں سے کسی نے دعوت کی، دعوت سے واپس آئے۔ تو قے و دست جاری ہو گئے۔ آناً فاناً حالت

---

[1] جان عالم (عبدالحلیم شرر) صفحہ ۱۳۰

خراب ہوگئی اور ایک ہی دن میں وہ ان کی بیوی اور ان کے کئی فرزند سب کی زندگی کا خاتمہ ہوگیا۔ ؎

برجیس قدر کی شاعری برجیس قدر نے بہت کم عمر پائی۔ لیکن کم عمری کے باوجود انہوں نے زندگی کے ہر مرحلہ پر ذہانت اور فراست کا ثبوت دیا۔ کسی مقابلہ میں بھی وہ پیچھے نہ رہے۔ وہ ایک شاعر باپ کے بیٹے تھے، خود شعر و شاعری کا ذوق انھیں ورثہ میں ملا تھا، کبھی کبھی شعر بھی کہہ لیتے تھے۔ نمونہ یہ ہے:۔

فرقت نصیب رہتا ہے جس نازنیں سے دور — یارب نہ کیجیو مجھے اس مہ جبیں سے دور
رکھا نصیب نے مجھے کس نازنیں سے دور — بھاگے ہے ہر حسیں جہاں جس حسیں سے دور
بلبل تو ہوں پر ایک گل یاسمیں سے دور — برجیس ہوا گر بت زہرہ جبیں سے دور
ہوتا نہیں اثر ترے دل میں تو سنگدل — یاں تیرا آہ گندرا ہے عرش بریں سے دور
بے شکر کردگار عقوبات سے بچے — خالق نے کردیا مجھے تاج و نگیں سے دور
یارب وہ دن ہوں پھر کہ پری بے نقاب ہو — رکھوں حجاب کو رخ پردہ نشیں سے دور
فرش زمیں پہ چرخ بریں کا جواب ہے — افشاں جو ہوگئی ہے تمہاری جبیں سے دور
تکرار ایسے لفظ کی ہوسکے کہ وقت آہ — للہ آپ رکھیں زباں کو نہیں سے دور
یوں خال روئے یار ہے رخ سے علیحدہ — رہتا ہے جیسے ملک حبش شاہ چیں سے دور
میں اپنا سر کروں گا قدم پہ ترے نثار — اے شہسوار ہو تو ذرا قاش زیں سے دور
تن خاک تیری راہ میں ہر وقت تند ہے — کس طرح جاؤں جہاں تیری سرزمیں سے دور
مٹی خراب ہوگئی نیپال میں مری — رہتا ہے کیوں مرزا امام مبیں سے دور

(۳)

نواب بہادر خان

خان بہادر خان نواب حافظ رحمت خان کے فرزند دل بند تھے۔ حافظ رحمت خان

؎ گزشتہ لکھنؤ (شرر) صفحہ ۲۷

کو شجاع الدولہ نے انگریزوں سے مل کر جنگ پر مجبور کیا اور انہیں شکست دے کر سارے روہیل کھنڈ پر قبضہ کر لیا۔ پھر جب تاریخ نے اپنے آپ کو دہرایا اور پورا اودھ انگریزوں کے قبضہ میں آ گیا تو روہیل کھنڈ میں بھی ان کا سکہ چلنے لگا۔ حافظ رحمت خاں کا خاندان تباہ و برباد ہو چکا تھا۔ لیکن بہادر خاں موجود تھے۔ انہوں نے ساری زندگی سرکاری ملازمت کی پنشن پا رہے تھے۔ اور گوشۂ عافیت میں آرام سے بیٹھے تھے یکایک غدر ہو گیا۔ سپاہی بغاوت کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے انگریز گھبرائے اور انہوں نے طے کر لیا کہ بریلی سے کسی امن کی جگہ روپوش ہو جائیں

انگریزوں کے جانے کے بعد عوام اور خواص اکابر و اصاغر ہندو اور مسلمان سب کا اس پر اتفاق تھا کہ بہادر خاں سے زیادہ مسندِ حکومت کا اور کوئی مستحق نہیں۔ بہادر خاں کو حکومت اور ریاست کی خواہش نہ تھی ان کا دل بجھ چکا تھا۔ زندگی کا بڑا حصہ ختم ہو چکا تھا۔ قبر کے دہانے پر کھڑے تھے اور اب حکومت اور ریاست کی ہوس کرتے بھی تو کیوں ؟

وقت طلوع دیکھا وقت غروب دیکھا

اب فکر آخرت ہے دنیا کو خوب دیکھا

یہی وجہ تھی کہ جب بریلی کے کمشنر مسٹر الیگزنڈر نے بہادر خاں سے درخواست کی کہ ہم تو جا رہے ہیں آپ مسندِ حکومت پر متمکن ہو جائیے تو انہوں نے ضعیف العمری کا عذر کر کے انکار کر دیا لیکن جب عوام کی طرف سے یہ مطالبہ پیش ہوا تو وہ انکار نہ کر سکے۔ حکومت کی ہوس ہوتی تو کمشنر کا کہنا مان لیتے لیکن فرض کا تقاضا تھا کہ بگڑے ہوئے حالات کو سنبھالنے میں اپنی زندگی داؤں پر لگا دیں۔ بہادر خاں نے یہی کیا۔

خوش قسمتی سے بہادر خاں کو بخت خاں جیسا دست بازو حاصل تھا۔ بہادر خان نے فوج کی کمان اس کے ہاتھ میں دے دی۔ عوام نے دل و جان سے نئے فرماں روا اور نئی حکومت کا خیر مقدم کیا۔ بہادر خاں کا دل تعصب سے خالی تھا۔ اپنی حکومت کا سب سے بڑا عہدہ یعنی وزارت عظمیٰ کا منصب ایک ہندو سوبھا رام کو سونپا۔

سندِ حکومت بہادر خاں نے بھی برجیس قدر کی طرح بادشاہ دہلی بہادر شاہ ظفر کے دربار سے سندِ حکومت حاصل کرنے کی کوشش کی چنانچہ انہوں نے بہادر خاں کو انتظام الدولہ محافظ الملک خان بہادر ہزبر جنگ کا خطاب عطا فرمایا۔ بہادر خاں

بے غل وغش حکومت کرنے لگے، شاہی مہر پر "الحکم اللہ والملک اللہ" کندہ کرایا۔[1]

بریلی میں بہادر خاں نے شہر کا بہت معقول انتظام کیا امن وامان قائم ہو گیا۔ عدل و انصاف کا سکہ جاری ہوا۔ یہ معلوم تھا کہ انگریز اپنا اقتدار دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ یہ بھی معلوم تھا کہ غداروں کی کمی نہیں اور وہ انگریزوں سے سازباز کر رہے ہیں۔ بہادر خاں نے جنگ کی تیاری کی اور اودھ کے بہت سے سربراہ آوردہ جان بازان حریت کو اپنے ارد گرد جمع کیا ان سے ہر وقت صلاح ومشورہ ہوتا رہتا اور آئندہ کا پروگرام بنتا رہتا اگر دوستوں نے غداری نہ کی ہوتی تو شاید روہیل کھنڈ کی عظمت رفتہ ایک مرتبہ پھر واپس آ جاتی۔ راقم الدولہ ظہیر دہلوی دلی سے بھاگ کر مختلف جگہوں کی ٹھوکریں کھاتے ہوئے بریلی پہنچے تھے وہاں کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچتے ہیں۔

بریلی کا جذبہ جنگ

بریلی میں ہر طرف کے مفرورین کا اجتماع ہے اور سب سردار شل نانا راؤ، فیروز شاہ وغیرہ جمع ہیں۔ رام پور کے تیس ہزار آدمی بریلی میں ملازم ہیں اور سرداران رام پور کا یہ حال ہے کہ ایک ایک تھان دوپٹہ کا سر سے بندھا ہوا ہے اور اس پر گوٹہ لگا ہوا ہے، آدھا دوپٹہ سر سے بندھا اور آدھا گھوڑے کی رکاب سے نیچے لٹکتا ہے اور چار چار طپنچہ کمر سے بندھے ہیں، دو دوہری تلواروں میں ڈاب رکھی ہوئی ہیں گھوڑوں پر سوار ہیں اور شہر میں گھوڑے دوڑاتے پھر رہے ہیں، پچاس ہزار کا اجتماع بریلی میں موجود ہے[2]

غداروں کی کارستانیاں

ایک سال تک بہادر خاں نے جاہ وجلال وشان تجمل کے ساتھ حکومت کی، انگریز مار دم بریدہ کی طرح پیچ وتاب کھا رہے تھے انہوں نے اودھ پر قبضہ کرنے کے بعد اپنی فوج ظفر موج کے ساتھ بریلی پر دھاوا کرنے کی سرگرم کوششیں شروع کر دی تھیں، لیکن ہمت نہیں پڑتی تھی، کیونکہ عوام ان کے ساتھ تھے اور ملک کا امن وامان ہر طرح بحال ہو چکا تھا۔ لیکن جیسا کہ ہمیشہ ہوتا آیا ہے مسلمان کو شکست دشمن نے کبھی نہیں دی اپنی ہی صف سے غدار پیدا ہوتے۔ اور

---

[1] ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء

[2] داستان غدر از ظہیر دہلوی

ریاست سمجھ کر حاکم ریاست کر دیا۔ ہم نے عنایت خدا سمجھے کہ اپنے حق کو پہنچے جہاں تک ہو سکا بچایا۔ اب تمہارے قابو میں آ گئے۔ اختیار ہے صاحب نے کہا جب عملداری سرکار ہوئی۔ پھر تم نے ملک کو بخوشی کیوں نہ دیا کہا سرکار بھی کسی کو ملک دیتی ہے۔ غرضیکہ لکھنؤ سے حکم ہوا کہ تمہاری روبکاری خاص بریلی میں ہوگی۔ چنانچہ سوار پیدل کے پہرے میں مقید ہو کر بریلی گئے۔ حکام نے بعد روبکاری پھانسی کی تجویز کی حکم سنایا اور یہ بھی کہا کہ ہم اپنی تجویز لفٹننٹ گورنر کو لکھتے ہیں جیسا وہ حکم دیں عرض کیا میرے سب اظہار بھیج دیجئے ان کا ایک گواہ بھی بھاگ گیا اور دوسرا حوالات میں رہا قصہ مختصر آخر حکم پھانسی آیا۔ سوبھا رام جہان کا نائب تھا اسے بھی پھانسی ہی ایک دوست بریلی کا کہتا تھا۔ جب نواب کو چوک میں پھانسی کے لئے لائے۔ خلقت شہر کی تماشے کو جمع تھی۔ صاحب کمشنر مع اور صاحبان عالی شان بھی آئے تھے۔ نواب اور صاحب کمشنر سے خوب تقریر ہوئی جب صاحب کمشنر خاموش ہوئے نواب نے کہا اب دیر لگانا کیا ضروری ہے حکم حاکم مرگ مفاجات ہے۔ حسب دستور جلاد نے نواب کی مشکیں باندھ کر کپڑے اتارنے کو پوچھا منع کیا فرمایا ایک ہاتھ ان کا کلکٹر صاحب دوسرا اور صاحب تھامے یہ فرما کر کہ کمشنر صاحب چلا کر روئے اور سوار ہو کر جلد چلے گئے۔ جب پھانسی دے چکے ورثار نواب نے نعش طلب کی جواب دیا تم اسے شہید بنا کر قبر پر میلہ کیا کرو گے ہمارے لئے باعث تکلیف کا ہوگا۔ بعد اس کے قلعہ میں گڑوا دیا۔ ان کے عیال کی بسر اوقات کو سرکار سے کچھ مقرر ہو گیا۔ [1]

اسلام کا بول بالا، فرنگی کا منہ کالا | بہادر خاں، حافظ رحمت کے پوتے تھے، اسلامی حمیت سے سرشار، مذہبی جذبہ سے مخمور، شجاعت و تہور، رگ و پے میں طاری، شوق شہادت اور ولولہ جہاد، جسم و روح میں جاری، ان کی حکومت

---

[1] تیصر التواریخ جلد ۲ صفحہ ۲۶۹

انہوں نے شکست کا سامان پیدا کر دیا۔ بہادر خاں کے ساتھ بھی یہی ہوا۔

بریلی پر انگریزوں کا حملہ

۵۔ مئی ۱۸۵۸ء کو انگریزی فوج نے دھاوا شہر پر بول دیا۔ مانڈے خاں، جنرل اسمٰعیل خاں، نواب ولی داد خاں، اور نواب تفضل حسین خاں محمد نے سخت مقابلہ کیا۔ پیشوا نانا راؤ اور نواب تفضل حسین خاں محمدی پور چلے گئے۔ غداران ملک نے ایسی غلط افواہیں اڑائیں، نواب کے پیر اکھڑ گئے۔ اہل وعیال کو پیلی بھیت روانہ کیا اور خود فوج کے مولوی احمد اللہ شاہ کے پاس محمدی چلے گئے، شہزادہ مقابلہ پر ڈٹے رہے۔ آخرش ان کو بھی محمدی پور کی راہ اختیار کرنا پڑی [1]

بہادر خان کی گرفتاری

آخر انگریزوں کا دھاوا کامیاب ہوا اور بہادر خاں کو شکست ہوئی اہل وعیال کو وہ پہلے ہی پیلی بھیت بھیج چکے تھے۔ خود نیپال کے سنگستان کی طرف بڑھے۔ لیکن قسمت ساتھ چھوڑ چکی تھی۔ اقبال جواب دے چکا تھا، حالات کی ناسازگاری انتہا کو پہنچ چکی تھی کوئی تدبیر کامیاب نہ ہوئی گرفتار کر لئے گئے اور انگریز حاکم کے سامنے مجرم کی حیثیت سے پیش ہوئے جہاں سے انہیں بھی وہی سزا ملی جو دوسرے حریت پسندوں اور آزادی خواہوں کو مل چکی تھی۔

قیصر التواریخ کے مصنف نے بہادر خاں کی گرفتاری اور سزایابی پر جو چند سطریں لکھی ہیں وہ ایک عبرت انگیز مرقع ہے جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

آزادی کا سپاہی پھانسی کے تختہ پر

نواب بہادر خاں رئیس و حاکم مستقر بریلی کسی پہاڑ کے جنگل میں ۱۱ مہینے سے چھپے بیٹھے تھے۔ انہوں نے چاہا کہ اپنے تئیں ہلاک کریں صاحب نے کہا کہ ہم نے تمہیں امان دی ہے خاطر جمع رکھو جب لکھنؤ میں روبکاری ہوئی کرنل پیرو صاحب نے پوچھا تم نے مدت تک سرکار کا نمک کھایا عہدہ جلیلہ پر مامور رہے اس سن پیری میں کیوں ایسی سرکار عالی شان سے بغاوت کی؟ جواب دیا تم نے ہمارا آبائی ملک چھین لیا تھا تمہاری فوج نے تمہارا سامنا کیا، جب تم بھاگے تمہارے باغیوں نے ہمیں مستحق

---

[1] ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء

قائم ہوئی تو لوگوں نے جوش و خروش کے ساتھ تائید کی۔ حالات کو درد براہ کرنے میں انہوں نے بھی کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ ان کا مختصر عہد حکومت، برکت و سعادت کے لحاظ سے اپنی مثال آپ تھا:۔

"خان بہادر خاں کے زمانہ حکومت میں پورا شہر ساری رات جاگتا رہتا تھا۔ بازار کھلے رہتے، سڑکوں اور گلی کوچوں میں بڑی رونق اور چہل پہل تھی۔ مکمل امن و امان تھا۔ لوگ نواب کی انتظامی قابلیت اور رعایا پروری کے بڑے مداح تھے۔ مسجدیں، مسافر خانے اور سڑکیں تعمیر ہو رہی تھیں۔ امن و امان کی ڈونڈی پٹتے ہی ہر چیز ارزاں ہو گئی تھی۔ تیل روپے کا پانچ سیر، گھی ڈھائی سیر اور گیہوں بیس سیر کے حساب سے فروخت ہو رہا تھا۔ کوئی گھر ایسا باقی نہ تھا جس میں کوئی تقریب نہ ہوئی ہو۔ لوگ خوش ہو ہو کر ایک دوسرے کو مبارک باد دیتے اور کہتے کہ خدا نے اپنی رحمت سے کافروں کی حکومت سے ایسی نجات دلائی کہ ہر چیز میں برکت ہو گئی ہے۔ اسلحہ سازوں کی دوکانوں پر بڑی بھیڑ رہتی تھی۔ تلواروں پر دستے چڑھوائے جا رہے تھے۔ مجاہدوں کے غول کے غول زرہ بکتر سے لیس پورے شہر میں گھوڑوں پر سوار ہو کر نکلتے اور "اسلام کا بول بالا فرنگی کا منہ کالا" کے نعروں سے زمین و آسمان ہل جاتے تھے" ا؎

بہادر خاں کے بہادر ساتھی

جو صادق اور صالح جذبہ بہادر خاں کے بوڑھے دل میں کارفرما تھا، وہ نوجوان قلوب کو بھی گرما رہا تھا۔ یہ نوجوان کیسے سرفروش اور جان باز تھے؛ ایک نمونہ دیکھئے:۔

"جب سر جان کولن کی سرکردگی میں انگریزی فوج بریلی کی جانب بڑھی تو دوسرے بھاگے ہوئے انگریز بھی آ گئے، اور دلیرانہ حملہ کر دیا۔ ادھر عوام میں سخت پریشانی اور انتشار پھیل چکا تھا۔ لیکن خان بہادر خاں بھلا بغیر مقابلہ کیسے میدان چھوڑتے۔ شہر سے ۵ میل باہر نکٹیا ندی کے پار مورچہ قائم کیا۔

ا؎ العلم، جنگ آزادی نمبر صفحہ ۳۵

پہلی صف توپوں کی تھی۔ دو صفیں فوجوں کی اور خود امدادی سپاہ کے ساتھ عقب میں موجود رہے جنگ صبح صادق سے شروع ہوئی۔ میدان جنگ دریا کے دونوں جانب تھا۔ بنڈے میر خاں، ولی داد خاں، شہزادہ فیروز شاہ وغیرہم نے حق مردانگی ادا کیا۔ کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ خان بہادر خان کی فوج میں ایک دستہ جانبازوں کا بھی تھا، جو بلاشبہ سر سے کفن باندھ کر جان دینے اور جان لینے کے ارادہ سے آئے تھے۔ گورا پلٹن ۹۳ کے سرجنٹ میجر نے ۱۸۵۷ء کے معرکوں کی یادداشت میں ان مجاہدین کے سردار کی بیحد تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ

"خان بہادر خاں کی فوج میں غازیوں کی ایک جماعت بھی تھی یہ سب مسلمان شہادت کے نشہ میں چور تھے۔ ان کی داڑھیاں سفید تھیں، انگلی میں چاندی کی انگوٹھی پہنے ہوئے تھے، جس کے نگینہ پر اللہ کندہ تھا۔ ہر غازی کی کمر میں سبز رنگ کا پٹکا تھا وہ روئی کی صدری پہنے ہوئے تھے اور سر پر سفید پگڑیاں باندھے ہوئے تھے، جس پر سرخی کے چھینٹے پڑے ہوئے تھے ان کے ہاتھ میں تلوار تھی اور پشت پر ڈھال، دین کا نعرہ لگا کر ہمارے سامنے آتے اور حملہ آور ہونے سے پہلے ان کا سردار جو ایک بیس سال کا بے ریش وبروت نوجوان تھا، جس کی آنکھوں سے خون ٹپک رہا تھا، صف سے آگے بڑھ کر ہم سے یوں مخاطب ہوا "کیا تم کافروں میں کوئی شخص حوصلہ مند ہے جو میرا مقابلہ کر سکتا ہے۔ اگر ہے تو سامنے آئے" اس کی آواز پر ہماری صفوں میں سناٹا چھا گیا۔ کوئی نوجوان آگے نہیں بڑھا۔ ایک منٹ کے بعد پھر چیلنج دیا اور کہا "میں پانچ آدمیوں سے تنہا مقابلہ کر سکتا ہوں" لیکن پھر بھی کوئی حرکت نہ ہوئی۔ آخر جھنجھلا کر اس نے تلوار میان سے باہر نکال لی اور ہماری صفوں پر حملہ آور ہوا۔ اس نے اس شدت سے حملہ کیا کہ چشم زدن میں اٹھارہ سپاہیوں کو زخمی کر کے ڈال دیا اس کی بے نظیر شجاعت سے کمانڈنگ آفیسر اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے حکم دیا کہ اس نوجوان کو زندہ گرفتار کیا جائے۔ لیکن اس نے کہا تم زندہ شیر

کو گرفتار نہیں کر سکتے چنانچہ زخمی ہو جانے کے باوجود جبکہ اس کے جسم کے ہر عضو سے خون کے فوارے نکل رہے تھے، اس نے دوبارہ اسی شدت کے ساتھ حملہ کیا۔ جب کمانڈنگ آفیسر نے یہ دیکھا کہ اگر اس کو قتل نہ کیا تو شاید ساری کمپنی (سو آدمی کی ایک کمپنی) کا صفایا کر دے گا، تو مجبوراً اس نے حکم دیا کہ سنگینوں سے خاتمہ کر دو۔ یہ حکم سن کر سپاہیوں نے اسے نرغہ میں لے کر اپنی سنگینیں بیک وقت اس کے سینہ میں پیوست کر دیں لیکن جب تک اس کی روح جسم میں باقی رہی وہ برابر اپنی تلوار کے جوہر دکھاتا رہا۔ ؎

بہادر خاں کا ذوق تعمیر

بہادر خاں کو حکومت اور فرماں روائی کی بہت کم مہلت ملی، لیکن اس مختصر مدت میں بھی انہوں نے تعمیری ذوق و شوق کی شاندار مثالیں قائم کر دکھائیں:-

"نواب بہادر خاں کو حکومت کرنے کے لئے صرف دس ماہ کا عرصہ ملا تھا اس کے باوجود انہوں نے اس مختصر زمانے میں اپنا نام روادا حافظ الملک حافظ رحمت خاں کے مقبرہ کی مرمت کرائی محلہ بھوڑ میں قبرستان سے متصل ایک مسجد تعمیر کرائی، جو اب تک موجود ہے خود ان کی عظیم الشان کوٹھی انگریزوں نے ایک وسیع کھنڈر میں تبدیل کر دی جو ۱۹۴۷ء کے بعد تک کھیڑا خان بہادر خان کہلاتی تھی یہ کھیڑا اب برادران وطن کے قبضہ میں ہے اور اس پر جدید عمارات تعمیر ہو رہی ہیں۔"

بہادر خاں کی ایک غزل

رزم کے میدان میں بہادر خاں تلوار سے کھیلتے تھے، لیکن بزم کی بساط پر، وہ غزل سرائی سے بھی دلچسپی لیتے تھے

تا حشر اب خیال یہ میرا کرے گا دل
تو اس کو مل گیا تو مرا کیا کرے گا دل

جان و جگر تو نام کو باقی نہیں رہے
کیونکر اب اس کی زلف سے سودا کریگا دل

جان و جگر کے واسطے دیکھو گے دوستو
کن کن خرابیوں کو یہ سودا کرے گا دل

شانے کی طرح اور بھی ہو گا چاک چاک
جیوں جیوں کہ اس کی زلف سنوارا کریگا دل

؎ الحلم - جنگ آزادی نمبر صفحہ ۴۸

مصروف دیکھ پیری دل نہ کیجئو
میری طرح سے تجھ کو بھی رسوا کرے گا دل [1]

نواب خان بہادر خان، علمی پایہ کے مصنف بھی تھے افسوس ہے کہ ان کی صرف ایک تصنیف ہم تک پہنچی ہے، اس کتاب کا نام "مقاصد الصالحین" ہے، اس کتاب کی دریافت کا سہرا پروفیسر قاری بشیرالدین پنڈت شاہجہان پوری کے سر ہے۔ نواب خان بہادر خان کا خط نہایت پاکیزہ تھا۔

غداروں پر انعامات کی بارش | جن ہم وطنوں اور ہم قوموں نے بہادر خاں کیساتھ غداری کی اور انگریزوں کی خفیہ یا علانیہ مدد کی اُن کو سرکار فرنگ نے انعام و اکرام سے سرفراز بھی کیا۔ ایک مختصر سی فہرست یہ ہے

۱۔ ٹھاکر لاکھن سنگھ آف بدھیلی	خطاب راؤ بہادر۔ آنریری مجسٹریٹ اور آٹھ ہزار روپیہ مالگذاری کی ریاست
۲۔ ٹھاکر رگھوناتھ سنگھ آف بدھیلی	پانچ ہزار روپیہ مالگذاری کی جائداد دو وطنوں کی ضبط کر کے دی گئی
۳۔ ٹھاکر ظالم سنگھ آف راج پور (جس نے کپٹن ٹرن اور اس کے خاندان کو بچایا تھا)	دو ہزار روپیہ مالگذاری کی زمینداری
۴۔ بیج ناتھ مصر ابنیکر	راجہ کا خطاب، تقریباً ۲۸ گاؤں محبان وطن کے ضبط شدہ
۵۔ لچھمی نرائن خزانچی	۲ ہزار روپیہ کی مالگذاری کی زمینداری
۶۔ چودھری نوبت رام	۲ ہزار روپیہ کی مالگذاری کی زمینداری
۷۔ گنگا پرشاد تحصیلدار بدایوں	۱۲۰۰ روپیہ مالگذاری کی زمینداری۔ بریلی کا تحصیلدار مقرر تھا اس نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر محبان وطن کو پھانسی پر لٹکوایا۔
۸۔ ٹھاکر بختاور سنگھ آف مرادآباد (اس نے انگریزوں کی مدد کے واسطے فوجی دستہ تیار کیا تھا)	قصبہ شاہی کا تحصیلدار مقرر کیا گیا اور دو ہزار روپیہ مال گزاری کی زمینداری دی گئی۔
۹۔ شیخ بدرالدین	یہ انگریزوں کے ساتھ نینی تال بھاگ گیا تھا۔ ان کی بہت مدد کی تھی۔ ۱۲۰۰ روپیہ مال گزاری کی زمین دی گئی۔ [2]

---

[1] حیات حافظ رحمت خاں

[2] العلم جنگ آزادی نمبر صفحہ ۹۰

(۴)

تانتیا ٹوپے

مرگِ مجنوں پہ عقل گم ہے میر
کیا دِوانے نے موت پائی ہے

جواہر لال نہرو نے اپنی کتاب "تلاش ہند" میں جہاں جنگ آزادی اور جاں بازانِ حریت کا تذکرہ کیا ہے، وہاں تانتیا ٹوپے کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے۔
اس تحریک نے بعض بہت اچھے گوریلا لیڈر پیدا کئے۔ ان میں بہادر شاہ کا ایک عزیز فیروز شاہ بھی تھا مگر سب سے زیادہ ہوشیار تانتیا ٹوپے تھا۔ جو برطانوی حکومت کو اس وقت بھی مہینوں تک پریشان کرتا رہا جب اس کو اپنی شکست کا یقین ہو گیا تھا۔ آخر کار جب وہ نربدا کو پار کر کے مرہٹوں کے علاقہ میں پہنچا اس امید پر کہ اس کے ہم وطن اس کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے اور اس کا ساتھ دیں گے۔ مگر اس کا خیر مقدم کرنے کی بجائے اس کے ساتھ دغا کی گئی ہے
حقیقت یہ ہے کہ تانتیا ٹوپے جیسا گوریلا سپاہی، اس جیسا من چلا اور جیالا جنگجو، ہندوستان کی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔ اس نے ہر مرحلہ پر شکست کھائی، لیکن اس کے عزم و ہمت کو شکست کوئی نہ دے سکا۔ جنگ کے ہر میدان میں وہ ہارا، لیکن اس کے ثبات و استقلال نے ہزیمت اور شکست ایک لمحہ کے لئے بھی قبول نہیں کی
... یہ بہت بڑی بات ہے۔
تانتیا ٹوپے، نانا کا مصاحب اور ندیم تھا، مرہٹہ خون اس کی رگوں میں بھی گردش کر رہا تھا۔ انگریزوں سے نفرت کا جذبہ اس کے سینہ میں بھی موج زن تھا۔ ہر مرحلہ پر اس ہر موقع

DISCOVERY OF INDIA

بھارت کی پہلی جنگ آزادی کے بہادر جرنیل تانتیا ٹوپے
جو سب کچھ ختم ہو جانے کے بعد بھی آخری دم
تک لڑتے رہے۔

پھر ہر معرکہ میں، تانتیا نے اپنے ہوش وحواس قائم رکھے۔ اپنی راہ عمل پر گامزن رہا۔

کان پور میں جب نانا کا قلعہ اجڑا تو وہ اس شکست سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوا، اس کے تیور وہی تھے۔ اس کے دم خم کا وہی عالم تھا۔ کان پور کی شکست کے بعد تانتیا ٹوپے کو تحریک کا قائد بنا کر نانا صاحب لکھنؤ آ گئے۔ مولوی ذکاء اللہ لکھتے ہیں:-

مدتّوں اسّی ہزار آدمی بہادری، استقلال اور ہوشیاری سے اپنے مستحکم مقام کو استوار کر رہے تھے جن کو حضرت محل نائب السلطنت کے حکم کے نیچے شہر میں جمع کر لیا تھا۔[1]

چرکھاری پر یورش

مولانا ذکاء اللہ، تانتیا ٹوپے سے بھی اتنے ہی خفا تھے، جتنے ہر اُس شخص سے جس نے انگریزوں کے خلاف تلوار اٹھائی لیکن تانتیا ٹوپے کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

تانتیا ٹوپے بڑا لائق مرہٹا سردار تھا وہ رنڈہم پر فتح پا کر اور سر کولن کیمبل سے شکست پا کر گنگا یا ترا کو گیا۔ پھر نانا کے بھتیجے راؤ صاحب کے حکم سے چرکھاری گیا اور نو سو سپاہی اور چار توپیں ساتھ لیتا گیا تھا۔ گیارھویں دن چرکھاری کو فتح کر لیا۔ یہاں ۳ لاکھ روپیہ اور چوبیس توپیں ہاتھ آئیں۔

رانی جھانسی کی استمداد۔ اس وقت اس کے پاس جھانسی کی رانی کا خط آیا کہ میری استعانت کرو پھر راؤ صاحب سے جھانسی جانے کی اجازت حاصل کی اس وقت اس کی سپاہ میں پانچ یا چھ رجمنٹ گوالیار کنٹجنٹ کی اور سرکش راجاؤں کی سپاہ شامل ہو گئی تھیں جس کے سبب سے اس کے پاس بائیس ہزار سپاہ کی جمعیت تھی، اٹھائیس توپیں ہو گئی تھیں اس سپاہ کو ساتھ لے کر وہ جھانسی کے سامنے آیا۔ اس وقت سر ہیوروز کی حالت معرض خطر میں تھی اس کے آگے ایک قلعہ غیر مفتوح تھا جس میں گیارہ ہزار آدمی بڑے پرجوش لڑنے والے موجود تھے۔ بیس ہزار سپاہ کا ایک سردار جس کو انگریزوں سے عداوت تھی اور وہ ان کو شکست

---

[1] عہد عروج انگلشیہ

دینے کی مسرت حاصل کر چکا تھا آگے بڑھتا ہوا قریب آرہا تھا۔ ایسی حالت کی جواب دہی کے واسطے ایک خاص درجہ کی بہادری اور نہایت استقلال وقوت کی ضرورت تھی۔ اگر ایک قدم چھوٹا رکھا جاتا یا رائے میں فقط غلطی ہوتی تو ہلاک کر دیتی مگر سر ہیو روز اس موقع کے لئے سب طرح سے سزاوار اور لائق تھے۔ انہوں نے یہ یقین کیا کہ قلعہ کا جو سپاہ محاصرہ کر رہی ہے اگر اس کو اس مطلب کے لئے ہٹالوں کہ نئے دشمن کی سپاہ سے جاکر لڑے تو محصورین کو اخلاقی فائدے فتح کے ایسے ہی حاصل ہوں گے۔ جیسے مادی فائدے اصلی محاصرہ کے اٹھ جانے سے۔ اس انگریزی جنرل نے محاصرہ میں اور زیادہ تشدد کیا اور اس سپاہ کو ساتھ لے کر جو درحقیقت لڑائی میں شریک نہ تھی نئے دشمن سے لڑنے گیا پڑھنے والے جب یہ جانیں گے کہ اس کے پاس سب قسم کی سپاہ پندرہ سو آدمیوں سے زیادہ جمع نہیں ہو سکی تو سمجھیں گے کہ یہ کام کیسا جلیل القدر شجاعت کا تھا۔ اس کی سپاہ میں صرف ۵ سو گورے تھے اور تانتیا ٹوپی کے بیان کے موافق اس کے پاس بائیس ہزار سپاہ تھی سر ہیو روز نے ۳۱ مئی کو جنگ کی تیاریاں کیں اور پہلی اپریل کو لڑنے کا مصمم ارادہ کیا۔

سر ہیو روز نے دونوں برگیڈ سے سپاہ لی۔ پہلی اپریل کو چار بجے رات کے تانتیا ٹوپے نے انگریزی لشکر کی طرف پیش قدمی کی آدھ گھنٹہ کے بعد انگلش جنرل کو ان کے قریب آجانے کی خبر ہوئی چند منٹ بعد انگریزی توپوں نے دشمن کے لشکر پر فیر کئے اور اس کے ان کے جواب دیئے تانتیا اس سپاہ کی طرف سیدھا چلا جو قلعہ کو محاصرہ کر رہی تھی۔ سر ہیو روز فوراً اپنے مقام کی حالت کو سمجھ گئے اور یہ تدبیر کی کہ اسی توپ خانہ کو جو ماتحت کپتان لائیٹ فٹ کے تھا اور اس کے ساتھ چودھویں ڈریگونس کو جو کپتان برسٹ جان کے ماتحت تھا حکم دیا کہ دشمن کے میمنہ پر حملہ کرے اور اپنے لئے میسرہ پر حملہ کرنا مقرر کیا۔ کرنل صاحب کی دو توپوں کے ڈویژن کو بھیجا کہ دشمن کے میسرہ کی خبر لیں ایک توپ سے ایسی صحیح نشان اندازی

کی کہ میسرہ متزلزل ہو گیا، دشمن سپاہ کے قلب نے جواب تک استقلال کے ساتھ بڑھا چلا آتا تھا، انگریزی پیدلوں کی رفتار کو دیکھا تو وہ غیر مرتب غولوں میں منتشر ہو گیا۔ سر ہیو روز نے پیدلوں کو گولیوں کی باڑ ماری اور یورش کی۔ اس کا اثر جادو کا سا ہوا دشمن کے لشکر کی پہلی لائن شکستہ ہوئی اور وہ بالکل ابتر اور پریشان ہو کر دوسری لائن کی طرف بھاگی۔

مقابلہ اور شکست ۔ دوسری لائن پر تانتیا ٹوپے خود حکمران تھا۔ وہ ایک پہاڑی پر مقیم تھا۔ پہلی لائن کے عقب میں ایک جنگل دو میل لمبا تھا۔ اس نے دیکھا کہ دوسرے سپاہی اس کی طرف بھاگے چلے آتے ہیں، اور اس کے تعاقب میں تین قسم کی سپاہ انگریزی چلی آتی ہے۔ اور برگیڈ رییع سپاہ کے پہاڑی کے سامنے میدان میں چلے آتے ہیں۔ تاکہ اس سپاہ کثیر کو روکیں جو جھانسی کی طرف جاری ہے۔ سٹوورٹ صاحب نے اس پر حملہ کیا اور شکست دی اور پسپا کیا۔ بڑی سرگرمی سے وہ اس کے پیچھے گئے۔ یہ تعاقب ایسا تھا کہ دشمن کو فرصت نہیں ملی کہ وہ اپنے تئیں درست کرے وہ منتشر و پریشان ایسا بھاگا کہ توپ پر توپ چھوڑتا گیا جو فتحمندوں کے ہاتھ آئیں۔ میدان جنگ میں بہت سے مرے ہوئے اور مرتے ہوئے چھوڑ گئے۔ تانتیا ٹوپے یہ حال دیکھ کر مایوس اور دل شکستہ ہوا۔

تعاقب ۔ پہلے ہم نے بیان کیا ہے کہ تانتیا کے لشکر گاہ کے آگے جنگل تھا وہ خشک تھا اس لئے آگ لگائی اور اس کے دھوئیں اور روشنی کی آڑ میں بھاگ کر پار اتر گیا اور ندی کو اپنے اور اپنے تعاقب کرنے والوں کے درمیان حائل کر لیا وہ اپنے پیادوں اور سواروں کو پار لے گئے۔ مگر اس طرف سے اس کا پیچھا نہ چھوٹا۔ انگریزی لشکر نے جلتے ہوئے جنگل میں گزر کر تعاقب کیا اور ساری توپیں چھین لیں۔ آج پندرہ سو باغی مارے گئے اور زخمی ہوئے باقی سپاہ تانتیا ٹوپے کے ساتھ کالپی کی سڑک پر بھاگی [1]

---

[1] تاریخ ہندوستان ربغاوت ہند ذکاء اللہ صفحہ ۳۴۳

ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں | تانتیا ہار رہا تھا۔ بھاگ رہا تھا پسپا ہو رہا تھا۔ لیکن انگریزوں کے لئے ناقابل علاج دردسر بنا ہوا تھا:۔

۲۷ جون کو روبرٹس صاحب کو معلوم ہوا کہ تانتیا ٹوپے نے اپنے مخفی آدمی جے پور میں انگریزوں کے بدخواہ کے پاس بھیجے ہیں کہ ان کو یقین دلادیں کہ وہ جے پور میں آتا ہے اس کے ساتھ ملنے کے لئے وہ تیار رہیں۔ روبرٹس صاحب نے ۲۸ جون کو نصیر آباد سے کوچ کیا اور تانتیا ٹوپے کے آنے سے پہلے وہ جے پور میں آگئے۔

جب تانتیا نے جے پور کا یہ حال دیکھا تو اس نے ٹونک کی طرف رخ کیا۔ اس کے پیچھے کرنیل ہولمس صاحب گئے اور باہر جو سپاہ تھی اور اس کے پاس چار توپیں تھیں اس کو حکم دیا کہ وہ باغیوں کا مقابلہ کرے لیکن اس سپاہ نے باغیوں سے مقابلہ کرنے کے بجائے برادرانہ مدارات کی اور اپنی چاروں توپیں ان کو دے دیں جس سے تانتیا کی سپاہ کا اضافہ ہوگیا اور مع اضافہ کے جنوب کی طرف مادھوپور اور اندرگڑھ کی جانب گیا جو کوٹہ سے ۵۰ میل شمال مشرق میں ہے یہاں پر ہولمس صاحب اس کے تعاقب میں موجود تھے اور اس کے بعد روبرٹس صاحب آگے بڑھے۔ بارش کی وہ شدت تھی کہ وہ نہ اس میں گھوڑے اچھی طرح بھاگ سکتے تھے۔ نہ ان کے پیچھے تعاقب کرنے والے اچھی طرح جا سکتے تھے۔ چنبل ایسی چڑھی ہوئی تھی کہ تانتیا پار نہ جا سکا تو بوندی میں چلا آیا۔ ہولمس صاحب اس کے تعاقب میں رہتے تھے اس لئے وہ کہیں قیام نہیں کر سکتا تھا وہ بوندی کے پہاڑوں کے پار کنیاہ کے درہ سے گزر کر سانگانیر اور بھیلواڑہ کے درمیان آیا یہ دونو مقام اودے پور کی ریاست میں نصیر آباد اور نیمچ کی سڑک پر تھے روبرٹس صاحب بارش کی کثرت کے سبب سے سرداریں تھے جو اجمیر سے تیس میل پر ہے۔ بھیلواڑہ کے سامنے باغیوں کے پیدل اور توپیں۔ اور سوار ندی کوٹیریا کے پار سنگانیر تک پڑے ہوئے تھے اور ہاتھی اور

اسباب ان کے پیچھے تھے۔ روبرٹس صاحب نے باغیوں پر حملہ کیا اور تانتیا کو بھگا دیا۔ دوسرے دن روبرٹس صاحب کے پاس سوار آئے تو تانتیا کا تعاقب کیا اور باغیوں کو ان کے مقامات سے نکالنا شروع کیا۔ باغی بیاس ندی کے کنارے پر پہنچ گئے۔ ۱۲؍ اگست کو تانتیا ناتھ دوارا کے درشن کرنے گا جب وہاں سے آرہا تھا تو آدھی رات کو اس نے سنا کہ انگریزی لشکر قریب آگیا ہے حملہ کے خوف سے اس نے اپنے خیمے ڈیروں کے اکھیڑنے کا اور لشکر کو سفر کرنے کا حکم دیا۔ دوسرے دن ایک مستحکم مقام میں قیام کیا۔ انگریزی لشکر نے چنبل کی طرف کوچ کرنے کا ارادہ کیا۔ روبرٹس صاحب نے اپنی عقل سے اس کے ارادہ کو جان لیا وہ سفر کر کے چوتھے روز چتوڑ کے قریب قصبہ پونا میں پہنچے یہاں برگیڈیر پارک سے ملے وہ نیمچ برگیڈ کا کمانڈر تھا۔ اب روبرٹس صاحب نے تانتیا کا تعاقب کا کام اس کو سپرد کر دیا۔ اس عرصے میں تانتیا چمبل سے اترا اور تیس میل کے فاصلہ پر جھالرا پاٹن میں پہنچا جھالرا پاٹن ایک خوبصورت شہر ریاست جھالاوار میں ہے جو جے پور کے نمونے پر بنایا گیا ہے۔ اس ریاست کا رانا پرتھی سنگھ تھا وہ بڑا خیر خواہ سرکار انگریزی کا تھا رانا کی سپاہ باغیوں سے مل گئی

جھالرا پاٹن پر تانتیا کا قبضہ۔ تانتیا نے اول رانا کی توپوں پر قبضہ کیا جو تیس سے کم نہ تھیں ان کا میگزین اور بیل گھوڑے لے لئے۔ پھر رانا کے محل کو گھیرا اور دوسرے روز رانا سے ملاقات کی اور روپیہ مانگا۔ رانا نے پانچ لاکھ روپیہ دینے کا وعدہ کیا مگر راؤ صاحب نے جو پیشوا کی جگہ تھے پچیس لاکھ روپیہ مانگے آخر رانا پندرہ لاکھ روپیہ دینے کو تیار ہو گیا۔ لیکن اصل میں اس نے ۵ لاکھ روپے دیئے۔ مگر تانتیا نے اس پر طعن و تشنیع ایسے کیئے کہ وہ اسی رات کو بھیس بدل کر بھاگا اور مہو میں آگیا اور اپنی بی بی کو کئی بارود کے پیپے دے گیا کہ اگر کوئی اس کی ناموس و عصمت کو بگاڑنا چاہے تو وہ بارود میں اڑ جائے۔ غرض تانتیا کو یہاں بہت سا روپیہ اور جواہر اور ہر قسم کا اسباب ہاتھ آیا۔ یہاں پانچ روز قیام کیا جو روپیہ ہاتھ آیا تھا وہ اپنی

سپاہ کی تین مہینے کی تنخواہ میں تقسیم کیا۔ سوار کو تیس روپیہ ماہوار، پیادہ کو بارہ روپے ماہوار کے حساب سے تنخواہ دی۔ یہاں کی اقامت میں اس کے ہمراہیوں راؤ صاحب اور نواب باندہ کو یہ سوجھی کہ اندور چلئے اور ہلکر کی سپاہ اپنے ساتھ ملائیے وہ مرہٹوں کے پیشوا کی خدمت کرے بس اس خیال سے تانتیا ٹوپے راج گڑھ میں آیا۔

راج گڑھ سے تانتیا کا فرار۔ لاک بارک صاحب اجین سے سوس نیر میں راج گڑھ سے سترہ میل کے فاصلے پر آ گئے اور سوس نیر سے تین میل کے فاصلے پر جنوب میں ان کی کمک لال کیرو میں آ گئی۔ میجر جنرل روبرٹس کی جگہ میجر جنرل میچل صاحب مقرر ہوئے وہ مالوہ اور راجپوتانہ کے قریب پہنچے تو یہاں سے تانتیا مع اپنی سپاہ کے رات کو بھاگ گیا۔ میچل صاحب نے اس کا تعاقب کیا اور اس کو شکست فاش دی اور ستائیس توپیں چھین لیں۔ تانتیا سرونج میں بھاگ گیا اب جاڑے کے موسم کا آغاز تھا۔

تانتیا سرونج میں۔ اب برسات کا موسم ختم ہو گیا تھا۔ جاڑے کی فوج کشی کا حال ہم سناتے ہیں۔ تانتیا ٹوپے بیتوا ندی کے دونوں طرف جنگلوں میں سرونج کی طرف پھرتا رہا اور وسط ستمبر میں سرونج میں پہنچ گیا۔ یہاں آٹھ روز ٹھہر کر بھسی گڑھ میں پہنچا۔ یہ قصبہ مع قلعہ سندھیا کی عملداری سپیری کے جنوب میں تھا یہاں اُس نے لوگوں سے مدد مانگی۔ انہوں نے دینے سے انکار کیا تو اس نے اِس قصبہ کو لوٹ لیا اور سات توپیں لے لیں پھر تانتیا تو سپاہ لے کر چندیری کی طرف اور راؤ صاحب مع سپاہ بھٹ کی طرف روانہ ہوئے۔ چندیری میں مہاراجہ سندھیا کا ایک سچا خیر خواہ سپاہی موجود تھا۔ اس نے تانتیا کو چندیری میں داخل ہونے نہیں دیا تو تانتیا نے چندیری کو حملہ کر کے لینا چاہا تین دن تک اس کے لینے کے لئے ہاتھ پاؤں مارے مگر کچھ نہ ہوا تو وہ منگروٹی میں بیتوا کے بائیں کنارے پر چندیری سے بیس میل کے فاصلے پر جنوب میں چلا گیا۔

للت پور میں تانتیا کا ورود۔ ۹ ر اکتوبر کو میچل صاحب منگروٹی کی طرف

چلے۔ان کو معلوم ہوا کہ تانتیا اس مقام کے متصل مرتفع زمین پر موجود ہے یہاں تانتیا میچل صاحب سے لڑا اور شکست کھا کر اور اپنی توپیں چھوڑ کر بھاگا۔تانتیا بیسوا سے پار ہو کر جھالاؤں میں آیا۔دوسرے روز للت پور میں جا کر راؤ صاحب سے ملا اور دوسرے دن راؤ صاحب مع سپاہ اور توپوں کے جنوب مشرق کی طرف آگے بڑھا اور سندھوایا میں آیا۔میچل صاحب نے اس کو یہاں شکست فاش دی اور بارہ میل تک تعاقب کیا۔باغیوں کا بہت نقصان ہوا۔مگر راؤ صاحب بھاگ کر نکل گیا۔انگریزوں کے ۱۱۵ افسر اور بیس سپاہی مقتول و مجروح ہوئے۔راؤ صاحب للت پور میں تانتیا سے ملا اور دونوں کی یہ صلاح ہوئی کہ اس ملک میں تو انگریزی سپاہ نے ہم کو زغہ میں لے رکھا ہے۔نربدا کے پار جانا چاہیئے۔

تانتیا ناگ پور پہنچ گیا۔جب میچل صاحب کو معلوم ہوا کہ تانتیا ٹوپے جنوب کی طرف جا رہا ہے۔تو انہوں نے اس کو کوروئی میں شکست دی اور تانتیا کے میسو کو بالکل غارت کر دیا مگر تانتیا اور راؤ صاحب اپنی نصف سپاہ کو ذبح کرا کے خود بھاگ گئے۔یہ لڑائی ۲۵ اکتوبر ۱۸۵۹ء کو ہوئی۔اب تانتیا راج گڑھ میں پہنچا راہ میں کرنیل چارلس میجر نے اس پر حملہ کیا اور چالیس آدمی اس کے مار ڈالے لیکن تانتیا ٹوپے ناگ پور کے ملک میں چلا گیا جو ہوشنگ آباد سے چالیس میل پر تھا۔اب راؤ صاحب اور تانتیا مرہٹوں کے ملک میں آ گئے۔انہوں نے بمبئی اور آگرہ کی سڑک پر انگریزوں کی رسد کے چھکڑوں کو لوٹ لیا جس کے سبب سے بمبئی و مدراس پریذیڈنسیوں میں انگریزوں کو اندیشے اور خطرے پیدا ہو گئے۔

اس ملک میں تانتیا نے دیکھا کہ کہیں اس کو انگریزوں کے تعاقب سے نجات نہیں ہے تو اس نے نربدا سے پار ہو کر بڑودہ جانے کا قصد کیا۔

راج پور میں تانتیا کی [illegible] میچل صاحب تانتیا کے تعاقب کے لئے ، نومبر کو ہوشنگ آباد میں پہنچے۔یہاں وہ پارک صاحب سے ملے جن کو انہوں نے ہوشنگ آباد میں چھوڑا۔اور خود نربدا کے پار جا کر بیتول کے قریب آ گئے

تانتیا بھاگتا پھرا شکست پر شکست کھاتا رہا اب اس کے پاس تین چار ہزار آدمی تھے سدرلینڈ صاحب اس کے تعاقب میں تھے اس کو ایک جگہ شکست دی اور توپیں چھین لیں۔ تانتیا توپوں کو چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اور نربدا کے پار اتر گیا اور ایک گاؤں جکلا لوٹ لیا اور بڑودہ کی طرف چلا۔ نربدا کے کنارے سے چونتیس میل چل کر وہ راج پور میں پہنچا۔ یہاں کے رئیس سے تین ہزار نو سو روپیہ اور تین گھوڑے لئے اور پھر چھوٹے اودے پور کی طرف چلا جو بڑودہ سے پچاس میل تھا۔ مگر اس کا تعاقب کرنے والے بہت تھے پارک صاحب تانتیا کے تعاقب کے لئے چلے آتے تھے انہوں نے چھوٹے اودے پور میں تانتیا کو آ لیا اور تانتیا کو شکست دے کر بڑودہ اس کو نہ جانے دیا تو وہ بھاگ کر بانسواڑہ کے جنگلوں میں آیا جو راجپوتانہ کے نہایت جنوب میں تھے یہ جنگل بڑے گھنے تھے اور اس میں بھیل رہتے تھے غرض اب راؤ صاحب اور تانتیا بڑی مصیبت کی حالت میں تھے۔ نواب باندہ نے اشتہار شاہی سے استفادہ اٹھایا اور اپنے تئیں سرکار کے حوالے کیا۔

تانتیا ولوگڑھ میں۔ تانتیا جنگلوں میں ہوتا ہوا ولوگڑھ میں پہنچا۔ اب اس کے پاس سپاہ بہت تھوڑی رہ گئی تھی۔ دو دن اس نے قیام کیا کہ اس کی سپاہ پھر اس کے پاس آن پہنچی۔ وہ دسویں دسمبر کو بانسواڑہ میں داخل ہوا۔ یہاں ایک دن ٹھیرا۔ سولہ سترہ اونٹ کپڑوں سے لدے ہوئے احمد آباد سے جاتے تھے۔ ان کو لوٹ لیا۔ وہ یہاں زیادہ ٹھیرتا مگر اس کو خبر لگی کہ سلام سے کرنیل سمرسٹ کا کالم قریب آگیا ہے تو وہ سلومبا میں بھاگا۔ یہ ایک قلعہ اودے پور کے رانا کا ہے۔ یہاں اس نے سامان رسد بہم پہنچایا۔ جس کی ضرورت اسے بہت تھی دوسرے دن اس امید میں چلا کہ اودے پور کو جا کر دھمکاؤں گا مگر جب انگریزوں کو خبر ہوئی تو میجر روک صاحب کالم لے کر آئے جہاں سے ان کو اودے پور کی حمایت کرنی اور تانتیا کو روکنا آسان تھا تانتیا اس سے بچ کر بھیلواڑہ گاؤں میں آیا۔ اس نے یہاں یہ صلاح کی کہ اپنے تئیں حوالہ کر دینا چاہیئے۔ مگر مان سنگھ اور فیروز شاہ اس کے پاس آنے والے

تھے اس لئے یہ صلاح موقوف رہی

تانتیا بھیلواڑہ میں دو روز مقیم رہا پھر پرتاب گڑھ گیا۔ انگلش جنرل تانتیا کی راہ کو جانتا تھا۔ اب اس کو فیروز شاہ کی حرکت کی بھی خبر لی۔

تانتیا اور فیروز شاہ کی ملاقات ۔ ۵ دسمبر ۱۸۵۸ء کو جب تانتیا جنگلوں سے نکل کر پرتاب گڑھ کی طرف چلا تو میجر روک سے اس کا سامنا ہوا۔ تانتیا اس سے دو گھنٹہ تک لڑا۔ اس عرصہ میں اس کے ہاتھی نکل گئے تو پھر وہ مندسور کی طرف گیا اور چھ میل کے فاصلے پر رات کو ٹھیرا۔ پھر تین دن میں جلدی سفر کر کے زیرا پور میں آیا جو نیمچ سے مشرق جنوب میں سو میل کے فاصلہ پر ہے۔ تانتیا جس روز زیرا پور میں آیا اسی روز بن سن صاحب یہاں آن موجود ہوئے، تو تانتیا متحیر ہو کر اپنے تین ہاتھی چھوڑ کر چلا گیا۔ ۱۲ جون کو وہ اندرگڑھ میں آیا۔ یہاں فیروز شاہ مع اپنے باڈی گارڈ اور بارھویں غیر آئینی رجمنٹ کے ان سے آن ملا۔[1]

یہاں سے فیروز شاہ راج گڑھ اس امید میں گیا کہ وہاں تانتیا ٹوپے سے ملے گا۔ چند روز وہ یہاں پڑا رہا۔ مگر جب اس کو معلوم ہوا کہ بریگیڈیر سمتھ اس کی سراغ رسانی کر رہا ہے تو وہ اندر گڑھ میں ۱۳ جنوری ۱۸۵۹ء کو تانتیا ٹوپے سے جا ملا۔

تانتیا کی راجپوتانہ میں سرگرمیاں ۔ اندر گڑھ امن کی جگہ نہ تھی۔ تانتیا کو معلوم تھا کہ انگریزی سپاہیوں کے دو کالم ادھر چلے آ رہے ہیں۔ اس لئے دیوا سا میں چلا گیا یہ ایک بڑا قصبہ تھا جو جے پور اور بھرت پور کے درمیان ہے۔ ۱۶ جنوری ۱۸۵۹ء کو جس وقت تانتیا، راؤ صاحب اور فیروز شاہ آپس میں جنگ کے باب میں صلاح و مشورے کر رہے تھے۔ کرنسوورش صاحب آ گئے اس وقت ان تینوں آدمیوں کا جانا کرامت تھی۔ تانتیا اپنے روزنامہ میں لکھتا ہے کہ انگریزی لشکر نے یکایک ہم پر چڑھ کر تحیر کر دیا تین سو باغیوں کو مقتول و مجروح کیا۔

---

[1] تاریخ ہندوستان (بغاوت ہند) صفحہ ۱۰۷

فیروز شاہ اور تانتیا کی جدائی۔ اس شکست سے باغیوں کا جتھا ٹوٹ
گیا۔ اسی دن فیروز شاہ مع اپنے سواروں کے تانتیا ٹوپے سے جدا ہو گیا
اب راؤ صاحب اور تانتیا میں بھی ان بن ہو گئی۔ تانتیا لکھتا ہے۔ کہ میں
نے اس سے کہا کہ اب میں اور زیادہ دنوں نہیں بھاگوں گا اور جب کبھی
مجھے موقع ملے گا۔ تو میں آپ کو چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ مان سنگھ کے بعض
رشتہ دار بھاگ کر تانتیا سے آن ملے۔ سپاہ کو چھوڑ کر تانتیا صرف دو برہمن رسوئی
کرنے کے لئے اور ایک سائیس اور دو گھوڑے اور ایک ٹٹو اپنے ساتھ
لے کر پرون میں چلا گیا۔ پرون کے جنگل میں راجہ مان سنگھ سے تانتیا ملا۔ راجہ
مان سنگھ نے پوچھا کہ سپاہ کو کیوں چھوڑ دیا ہے۔ یہ کام تم کو نہیں کرنا چاہیے
تھا۔ تو تانتیا نے جواب دیا۔ کہ اب بھاگتے بھاگتے تھک گیا تھا۔ اب
میں تمہارے ساتھ رہوں گا۔ خواہ یہ کام میں نے صحیح و صواب کیا یا غلط
و خطا۔ اس عرصہ میں راؤ صاحب تین چار ہزار سپاہیوں کو ساتھ لے کر کشائی
میں اجمیر کے مغرب میں جودھپور سے دس میل کے فاصلے پر ۱۰ فروری
۱۸۵۹ء کو آیا۔ انتقام لینے والے اس کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ ہومز صاحب
کشائی میں آموجود ہوئے۔ اور انہوں نے راؤ صاحب پر حملہ کیا۔ اور دو سو
آدمی اس کے مار ڈالے۔ راؤ صاحب بھاگ کر ۱۵ فروری کو چتر بھج کے
درہ میں پہنچا۔ جب انگریزی لشکر ادھر کی طرف آیا۔ تو راؤ صاحب بانسواڑہ
کے جنگل میں چلا آیا۔ سومرسٹ صاحب نے اس کا تعاقب کیا۔ تو راؤ صاحب
کے ساتھی تھوڑے رہ گئے۔ اور وہ بھی تانتیا کی طرح بھاگتے بھاگتے تھک
گیا۔ اس کے ساتھیوں میں سے بہت سے آدمی ہتھیار پھینک کر اپنے
گھروں کو چلے گئے۔ بڑے بڑے سرغنہ سرونج کے جنگل میں چلے گئے۔ وہ
فقیرانہ گذران کرنے لگے۔ دیہاتیوں سے بھیک مانگ کر اپنا پیٹ پالتے
تھے۔ باغیوں کے صرف ۵ منڈ باقی رہ گئے تھے۔ راؤ صاحب، فیروز شاہ
مان سنگھ، جیت سنگھ، تانتیا ٹوپے ہر ایک کی قسمت کا حال بڑا دلچسپ
ہے۔ راؤ صاحب تو ایک جگہ سے دوسری جگہ مارا مارا پھرا۔ ۱۸۶۲ء میں وہ

پنجاب کے شمالی پہاڑیوں میں جاتریوں کے بھیس میں پکڑا گیا۔ اور کان پور بھیجا گیا۔ یہاں اس پر جرم ثابت ہوتے وہ ۲۰ اگست کو پھانسی دیا گیا۔ فیروز شاہ حاجیوں کے لباس میں انگریزوں کے ہاتھ سے بچ کر مکہ چلا گیا۔ سلطان روم اس کے ساتھ سلوک کرتا رہا۔ مکہ میں مر گیا۔ سر سامشو میں ایک بڈھے ٹھاکر نرائن سنگھ نے جو مان سنگھ کا رشتہ دار تھا۔ مان سنگھ کے معتمد مختار کو میڈ صاحب کے پاس لایا۔ اس کی معرفت میڈ صاحب اور مان سنگھ کے درمیان ایسے قول و قرار ہوئے کہ مان سنگھ نے اپنے تئیں ان کے حوالے کیا اور اس کے تمام اہل و عیال جو شہر کے قریب تھے انگلش کیمپ میں آ گئے۔ اجیت سنگھ کچھ تھوڑے آدمیوں کے ساتھ ۵ میل کے فاصلہ پر جنگل میں رہتا تھا۔ میڈ صاحب کے لشکر کے ساتھ مان سنگھ وہاں پہنچا جہاں اجیت سنگھ رہتا تھا۔ جب اجیت سنگھ کو انگریزی سپاہ کے آنے کی خبر ہوئی تو وہ ستر اسی میل بھاگ کر سونج میں باغیوں سے جا ملا

مان سنگھ اور تانتیا۔ میڈ صاحب کو یقین تھا کہ پرون کے جنگل میں تانتیا ٹوپے ہے۔ مان سنگھ کو بڑی آرزو تمنا یہ تھی کہ وہ اپنی حالت سابقہ پر عود کر آئے ۵ اپریل کو سر رابرٹ ہملٹن نے میڈ صاحب کے پاس تار بھیج دیا تھا کہ اگر مان سنگھ اپنے تئیں حوالہ کرے گا۔ تو اس کی جان بچائی جائے گی۔ اور اس کے حقوق پر خیال کیا جائے گا۔ میڈ صاحب نے اس کو سمجھایا کہ اگر وہ تانتیا کو پکڑوا دے گا۔ تو اس خدمت عظیم کے عوض میں وہ اپنی حالت سابقہ پر بحال ہو جائے گا۔ پس اس وقت سے مان سنگھ کو یہ دھن لگی ہوئی تھی کہ وہ تانتیا کو گرفتار کرائے۔ اس کو یہ اندیشہ تھا کہ مبادا تانتیا اس کی مٹھی میں سے نکل جائے تانتیا نے میڈ صاحب کے لشکر میں مخفی آدمی بھیج کر مان سنگھ سے صلاح و مشورہ پوچھا تھا کہ وہ فیروز شاہ سے جا کر ملے یا نہ ملے۔ مان سنگھ جانتا تھا کہ اگر تانتیا کہیں چلا گیا تو پھر اس کو پکڑوانے کا موقع ہاتھ سے جاتا رہے گا۔ مان سنگھ کو نہ اپنی عزت کا نہ اپنے مصاحب کا نہ دوست کی دوستی کا خیال تھا وہ تانتیا کو دغا و فریب سے پکڑوانے پر اس شرط پر تیار تھا کہ اس کو پہلے اپنی ریاست مل جائے

میڈ صاحب کو تو ریاست پر بحال کرنے کا اختیار نہیں تھا۔ اس لئے وہ سر رابرٹ ہملٹن سے یہ وعدہ کرانا چاہتا تھا کہ شاہ آباد یا وڑی اس کو مل جائے۔ میڈ صاحب مان سنگھ سے اس معاملہ میں گفتگو کر رہے تھے۔ تانتیا ٹوپے جنگل میں براج بنا رہا تھا۔

تانتیا کا حشر — تانتیا کے پرانے ہمراہی سرونج میں آٹھ ہزار آدمی موجود تھے۔ راؤ صاحب نے ان کو چھوڑ دیا تھا۔ مگر فیروز شاہ اور نواب ساداماام علی وردی میجران کے ساتھ تھے۔ اس وردی میجر نے تانتیا کو خط بھی لکھا تھا۔ کہ وہ ہم سے آن کر مل جائے۔ تانتیا جانتا تھا کہ مان سنگھ نے یہ کہلا بھیجا تھا کہ وہ تین دن کے اندر اندر اس سے ملنے آئے گا اور اسے یہ بھی کہا تھا کہ ایک آدمی میں بھیج رہا ہوں جس جس جگہ ٹھہرنے کے لئے یہ کہے اسی جگہ قیام کرنا اس اقرار کے موافق تیسرے دن ۷ اپریل کو آدھی رات کے وقت تانتیا کے چھپنے کی جگہ پر مان سنگھ آیا اور بمبئی کے سپاہیوں کو فاصلہ پر چھوڑ دیا۔ تانتیا سوتا تھا۔ اُسی کو سوتا ہوا پکڑ کر میڈ صاحب کے کیمپ میں لے آئے وہ یہاں ۸ اپریل ۱۸۵۹ء کو طلوع آفتاب کے وقت آیا۔ سپیری میں کورٹ مارشل کے سپرد ہوا اور اس پر جرم لگایا گیا کہ اس نے جون ۱۸۵۷ء سے دسمبر ۱۸۵۹ء تک برٹش گورنمنٹ کے ساتھ باغیانہ جنگ کی۔ تانتیا نے بری ہونے کے لئے یہ سیدھا سادھا جواب دیا کہ میں نے کالپی کے فتح ہونے تک سب باتوں میں اپنے آقا نانا کے حکم کی تعمیل کی اور اس کے بعد راؤ صاحب کے حکموں کی میں نے کسی انگریزوں کے قتل کرنے میں کوئی حصہ نہیں لیا ہے نہ میں نے کسی کو پھانسی دینے کا حکم دیا۔ مگر ۱۸ اپریل ۱۸۵۹ء کو اس کو پھانسی دے دی گئی۔[1]

---

[1] تاریخ ہندوستان (بغاوت ہند) ذکاء اللہ صفحہ ۱۹۲

حضرت محل

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

ارباب نشاط کے گھر میں ایک لڑکی پیدا ہوئی، بچپن میں فتنہ تھی، جوانی میں قیامت بن گئی، صورت سحر طراز انداز دل فریب چتون میں شوخی، باتوں میں لگاوٹ، تبسّم جاں ستاں، عشوہ، دشمن ایمان اور رہزن تمکیں رقص میں برق، نغمہ سرائی میں طاق، غالب کے اس شعر کی ہو بہو تصویر

ساقی بہ جلوہ دشمن ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ رہزن تمکین و ہوش ہے

وہ ساقی گلفام بھی تھی، اور مطرب خوشنوا بھی، گھر میں صرف امراؤ تھی، واجد علی شاہ کے "پری خانہ" میں پہنچ کر "مہک پری" بن گئی۔ پھر جب واجد علی شاہ کے ایک چاند سے لڑکے کی ماں بنی تو "حضرت محل" کا خطاب پایا، دو ہزار ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی اور عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے لگی۔

پہنچا کہاں کہاں سے ہے سلسلہ دراز عشق

دوسروں کا کیا ذکر، آدمی خود اپنی بہت سی صلاحیتوں سے ناواقف ہوتا ہے، پھر جب کوئی مرحلہ درپیش آتا ہے تو یہ خفیہ صلاحیت ابھرتی ہے اور انسان کچھ سے کچھ بن جاتا ہے۔ امراؤ جب بالاخانہ کی زینت تھی، اس کے دل میں کبھی خیال نہ آیا تھا کہ شاہی "پری خانہ" کی زینت بنے گی، جب پری خانہ میں پہنچی، تو سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ شاہ ذی جاہ کی بیگم بنے گی۔ جب ایک بچہ کی ماں بنی تو تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ ایک دن اس بچہ کو اپنے ہاتھ سے تخت حکومت پر بٹھائے گی۔ اور ان کی نگہبان بن کر سارے اودھ پر حکومت کرے گی، لیکن جب واجد علی شاہ سے تخت حکومت چھنا، وہ کلکتہ جلا وطن ہوئے، پھر کچھ عرصہ بعد غدر شروع ہوا، تو اس کی خفتہ صلاحیت بیدار ہوئی، اس نے ایک سپاہی کی طرح تلوار سنبھالی، ایک فرمانروا کی طرح

حکومت کی، ایک مدبر کی طرح سیاست کی گتھیاں حل کیں، اس نے رعایا کی بہاس کی آس سے بدلا، سپاہیوں کی بددلی دور کی، ان میں حوصلہ پیدا کیا۔ افسروں کو ایثار و عمل کی ترغیب دی دشمن سے مدارات کا برتاؤ کیا، دوستوں کو نوازا۔ وفاداروں کی سرپرستی کی مخالفوں کو رام کیا دشمنوں سے حسن سلوک کا برتاؤ کیا اور بہت ہی مختصر مدت میں ایسے عظیم و جلیل کارنامے انجام دیئے کہ تاریخ میں ایک مستقل اور باعظمت مقام حاصل کر لیا — لوگ ان کا ذکر پڑھتے ہیں اور احترام سے سر جھکانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

حضرت عالیہ لندن میں تھیں اور واجد علی شاہ کلکتہ کی قید فرنگ میں غدر جوش پیکار | جیسے پر آشوب زمانے میں حضرت محل نے ان تمام باتوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے قیادت کے بار گراں کو اپنے کاندھوں پر اٹھا کر غیر معمولی جرأت اور بہادری کا ثبوت دیا۔ عام بھرتی کا اعلان ہوا۔ تمام تعلقہ داروں اور زمین داروں کے نام احکام جاری ہوئے کہ ملک آبائی خدا نے ہم کو عطا کیا، دفع کفار فرنگ لازم ہے۔ باہم شریک ہو کر جو کوئی ہاتھی مانند بیلی گارد کو قتل کرے، جوان کو قتل کرے گا۔ اس کا نصف علاقہ اس کو معاف ہوگا۔ [1]

چنانچہ مذکورہ حکم نامے کے جواب میں جو روسا اور تعلقہ داران اودھ مع فوج کثیر و خطیر لکھنؤ پہنچے اور تحریک میں شامل ہو کر انہوں نے نام نیک پایا اور بقائے دوام حاصل کی ان میں سے چند کے نام یہ ہیں نواب علی خاں رئیس محمود آباد، درگ بجے سنگھ، منشی محمد حسین قندواکی، سادات حسین سید پور، حشمت علی سندیلہ، منصب علی رسول آباد، کلو خان نانپارہ [2]

تمام امور سلطنت کو حضرت محل، نواب ممو خاں اور مولوی احمد اللہ شاہ صاحب کی رائے سے ترتیب دیا جاتا تھا۔ زیر غدر کے زمانے میں عمارت سچی مچھلی بھون پر ان کا قیام تھا اور اسی عمارت میں ان کا دربار ہوتا تھا۔ [3]

حضرت محل کے تدبر اعلیٰ دماغی قابلیت اور استقامت نیز ممو خاں اور مولوی احمد اللہ شاہ کی حسن تدبیر نے تحریک کو اس کامیابی سے چلایا کہ مدت کی سپاہیانہ زندگی سے علیحدگی نے طبیعتوں میں جو بے حسی اور جمود پیدا کر دیا تھا وہ یک دم رخصت

---

[1] قیصر التواریخ ص ۲۴۹

[2] قیصر التواریخ ص ۲۳۴

[3] ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ ص ۲۶

ہو گیا۔ جو ہتھیار زنگ آلود ہو کر بیکار پڑے تھے۔ وہ صیقل کئے گئے۔ ان کی جھنکار فضائے آسمانی میں گونج گونج کر بستہ دلوں کو پھر گرمانے لگی۔

حضرت محل کی شجاعت

حضرت محل کی بہادری اور جوش کا یہ حال تھا کہ باوجود پردے میں رہنے کے گھوڑے پر کھیلتیں انہوں نے تقریباً دس ماہ انگریزوں کا مقابلہ کیا۔[۱]

کمپنی کے خلاف جذبہ نفرت وحقارت سرعت سے بڑھ رہا تھا۔ مولوی ذکار اللہ لکھتے ہیں:-

"صرف گیارہ روز میں اودھ کے کسی ضلع میں برٹش گورنمنٹ کی طرف سے کوئی حاکم نہ تھا۔ اور انگریزی عملداری خواب معلوم ہوتی تھی"[۲]

سر ہنری لارنس اپنی ایک چٹھی میں جو اس نے لفٹنٹ گورنر کو لکھی تھی۔ رقم طراز ہے:-

"سارے ضلعے ہماری حکومت سے نکل گئے اور ہر روز حالت بگڑتی جا رہی ہے۔ سارے تعلقہ دار مسلح ہو رہے ہیں اور بعض نے دیہات پر قبضہ کر لیا ہے"

دارالسلطنت کا ذکر ہی کیا ہے۔ گاؤں اور قصبات تک کی یہ حالت تھی کہ:-

"قصبہ اناؤ کے قریب ایک چھوٹا سا گاؤں جس کا رقبہ صرف پون میل تھا مٹنے والوں سے بھرا پڑا تھا اور گاؤں کے تمام گھروں میں دینیاں بنی ہوئی تھیں"۔

منادی ہوئی کہ پرسوں بیلی گارد پر حملہ ہوگا۔ مسلمان نے قرآن مجید اور ہندوؤں نے گنگا جل اٹھا کر قسم کھائی کہ جب تک محصورین کو تہ تیغ کر کے بیلی گارد کو زمین کے برابر نہ کر دیا جائے گا۔ کھانا پینا اور اپنا ذاتی کام کرنا سب حرام ہے۔ کل انگریز نہیں یا ہم نہیں۔[۳]

جنگ کی گھما گھمی

۱۲ جولائی کو پہلا حملہ مولوی احمد اللہ شاہ صاحب کی سپہ سالاری میں بیلی گارد پر ہوا۔ مولوی صاحب نے تمام فوج میں اعلان کیا:-

"بیگم کے حکم سے لڑنے جاتے ہو۔ تنخواہ بھی وہی دیں گی"۔

حملے کے روز حضرت محل کو رات بھر نیند نہ آتی تھی۔ لوگ ان کی مستعدی اور نیک نفسی کی تعریف کرتے۔ وہ سپاہیوں کی نہایت قدر کرتیں اور حوصلہ سے زیادہ انعام دیتیں۔[۴]

---

۱ مسلمانوں کا روشن مستقبل ص۹۰

۲ قیصر التواریخ ج۲ ص۲۲

۳ عروج عہد انگلشیہ ص۴۱۸

۴ ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ ص۵۹

معرکہ عالم باغ کے سلسلہ میں راجہ مان سنگھ کو ان کی غیر معمولی جانفشانی کے صلے میں علاوہ خلعت رومال اور دو شالے کے ساتھ "فرزند خاص" کا خطاب پایا اور ملبوس خاص سے اپنا دوپٹہ عنایت کیا اور فرمایا کہ بعد فتح کے بہت سا روپیہ اور جاگیر دے کر خوش کروں گی۔[۱]

لڑائی کا زور

اگست میں لڑائی کا زور بہت بندھ گیا۔ چونکہ کان پور کی شکست خوردہ فوج کی کافی تعداد فدا حسین رسالدار کی معیت میں مع توپ خانہ کے لکھنؤ آگئی تھی۔ جنرل سید برکات احمد اور کپتان صوبہ سنگھ نے اپنے اپنے رسالوں کے ساتھ بیلی گارڈ پر زبردست حملہ کیا۔ انگریز مورچوں کے اندر ہیبو کے پیاسے گھس گئے۔ دست بدست تلوار چلنے لگی۔ ایک صاحب نیزہ علم لے کر آگے بڑھے اور مورچے کی خندق میں مارے گئے۔ ہر مورچہ جدا جدا رنگ سے لڑائی ہوتی تھی۔ مولوی ذکاء اللہ رقم طراز ہیں۔

"بیلی گارد پر اس قدر زبردست حملہ کیا گیا کہ اس کی سب سے بڑی خندق اڑ گئی۔ باغی زینے لے کر آگے بڑھے اور دیواروں پر چسپاں کر دیئے اور توپ کی زدوں میں گھس گئے۔ آج وہ دلیری سے حملہ کرنے آئے تھے۔ انگریزی سپاہ کو پریشان کرنے کے لئے رات کو گھنٹوں شور و غل مچاتے تھے۔"[۲]

حضرت محل کے مہمان

فیروز شاہ۔ نانا راؤ اور جنرل بخت خاں بھی اس وقت آگئے تھے اور حضرت محل کے ہاں بطور مہمان خاص قیام پذیر تھے۔ ان برسہ فدایانِ وطن کی موجودگی اور حضرت محل کے استقلال نے جنگ کو مارچ تک جاری رکھا۔

بیگم کی کوٹھی پر گھمسان کا رن

مولوی ذکاء اللہ لکھتے ہیں:۔

بیگم کی کوٹھی پر سخت لڑائی ہوئی ایسی کوئی لڑائی اس محاصرہ میں نہیں ہوئی آٹھ نو گھنٹہ تک گولہ زنی رہی تو ایک دراز بڑی نیپئر نے اسے یورش کر کے لے لیا باغیوں کی لاشیں ۵ سو شمار کی گئیں انگریزوں کا بڑا نقصان یہ ہوا کہ ہڈسن صاحب ایسے زخمی ہوئے کہ زندہ نہ رہے وہ بڑے بہادر جوان مرد دلیر تھے سپاہیوں سے بڑی محبت کرتے تھے جب وہ مرے ہیں سپاہی ان کے لئے بچوں کی طرح روتے تھے۔ غرض ایسے روشن دماغ سپاہی کم ہوتے ہیں۔ وہ عالم باغ میں دفن ہوئے اور ٹرم صاحب نے ہمیں ہوس اور قیصر باغ پر توپوں کی ضربیں لگائیں۔ ان کے سپاہیوں نے ایک مسجد پر قبضہ کیا اور باغیوں کو گوتی

---

۱ قیصر التواریخ صفحہ ۲۶۷ ۲ عروج عہد انگلشیہ صفحہ ۴۰۶

کے کنارہ پر مچھی بھون تک بھگایا اور آہنی پل پر قبضہ کیا۔ ان لڑائیوں میں انگریزوں کے آدمی ۲۶ مقتول اور ایک سو تیرہ مجروح ہوئے۔

۱۲۔ مارچ کو بیگم کی کوٹھی پر اور قیصر باغ کی درمیانی عمارت پر قبضہ ہوا پھر امام باڑہ ہاتھ آیا ۱۴ تاریخ قیصر باغ فتح ہوا۔ پھر میس ہوس اور تارا کی کوٹھی موتی محل چھتر منزل جہاں پہلے ماہ نومبر میں بڑی معرکہ آرائیاں ہوئیں تھیں قبضے میں آئیں۔ غرض یہ تمام فتوح بڑی ارزاں حاصل ہوئیں کہ صرف نو سو آدمی مجروح و مقتول ہوئے اور شہر پر قبضہ ہوگیا باغیوں کی تعداد انگریزوں کی سپاہ سے سہ چند تھی مگر ان کے پاس توپیں اتنی نہیں تھیں جتنی کہ انگریزوں کے پاس ہے[1]

عالم باغ پر حملہ

نیپالیوں اور انگریزوں کا پہلا متحدہ حملہ باغ پر ہوا حضرت محل کی کوٹھی بڑی سخت لڑائی ہوئی جس کے اردگرد باغیوں کی سینکڑوں لاشیں ... کی گئی تھیں۔ قریب تھا کہ چوکھی پر قبضہ ہو جائے کہ عین اس وقت خان علی خاں ایک ... سپاہ کے ساتھ آگئے۔

خوب رن پڑا۔ چمن پر خون کی نہریں جاری تھیں۔ پیچھے سے جنگ بہادر نے باڑ ماری سینکڑوں گر پڑے۔ خان علی خاں بھی زخمی ہوئے۔ حضرت محل کسی طرح بھی چوکھی چھوڑے نام نہ لیتی تھیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ سب سے زیادہ حملہ کا رخ چوکھی کی جانب ہے قیصر التواریخ میں مرقوم ہے:۔

"ایک روز صبح کو بہ کنایہ و اشارہ حضرت محل کو نواب ممو خاں نے بہت سمجھایا لیکن ان کے استقلال میں فرق نہ آیا کمپنی کی فوجوں کے چو طرفہ حملوں نے اب مجاہدین کو امان لینے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس وقت جنگ نے بھی جارحانہ کے بجائے مدافعانہ صورت اختیار کر لی تھی۔ ملک کے تمام حصص پر برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کا قبضہ ہو چکا تھا۔ لہٰذا اس نے آلات حرب کی کثیر تعداد جن میں بہت زیادہ توپیں تھیں مع قواعد دان توپچیوں کے خاص دار السلطنت لکھنؤ میں ان مجاہدین کے مقابلے میں لاکر جمع کر دیا۔ جن کے پاس جدید قسم کی توپوں اور آلات کی کمی تھی۔ لے دے کر صرف ایک ادسط درجے کا توپ خانہ تھا

---

[1] تاریخ

وہ کہاں تک مقابلہ کرتا۔ آخر شکست ہوئی اور انگریزی فوج کا تسلّط ہوگیا:۔

حضرت محل کی پسپائی

شکست کے بعد حضرت محل سراسیمہ اور پریشان تھیں، کیونکہ ان کی گرفتاری کا خدشہ روز بروز بڑھ رہا تھا۔ اس لیے سرزمین وطن کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ ان کی چوکھی سے روانگی کا منظر عدد درجہ دردانگیز تھا۔ مصنف قیصر التواریخ رقم طراز ہے:۔

"حضرت محل بحال تباہ مع دیگر بیگمات و شاگرد پیشہ عورات اور ملازمین کے پھاٹک سے نکلیں۔ اس طرح کہ وہ آگے تھیں اور سب ان کے پیچھے صف بستہ برجیس قدر ایک انا کی گود میں تھے۔ پیادہ پائی کی وجہ سے ہر ہر قدم پر ٹھوکریں کھاتی اور گرتی تھیں۔ ٹیلہ شاہ پیر جلیل سے گذر کر پل مولوی گنج پر پہنچی تلنگے ہر طرف متلاشی تھے۔ رات کو غلام رضا کے ہاں قیام کیا۔ پھر وہاں سے شرف الدولہ کے گھر گئیں اور وہاں سے محل سرائے حسین آباد گئیں۔ شام تک جتنا عملہ شاگرد پیشہ کا تھا سب جمع ہوگیا اور ان کی حفاظت کو پہرے کھڑے تھے۔ علی رضا کے یہاں جنرل اوٹرم کا پیغام پہنچا کہ ہم زمانہ واجد علی شاہ کا بدستور تم کو تمہارا ملک دیں گے۔ جنگ سے دست بردار ہو جائیے۔ فوج مغلوبہ کے ساتھ جانے کی ضرورت نہیں۔ حضرت محل نے اوٹرم کی یہ بات نہ مانی۔"[1]

نیپال میں قیام

حضرت محل، برجیس قدر اور اپنے جاں نثاروں کو لے کر نیپال پہنچیں، ممو خاں بھی ساتھ تھے، نیپال کی حکومت نے خاندان شاہی کو قیام کی اجازت دے دی۔ لیکن وابستگان دولت کو ایک منٹ نہ ٹھہرنے دیا، مولانا شہابی کی تحقیق یہ ہے کہ:

"حضرت محل کے پاس جو کثیر تعداد میں ہیرے، جواہرات تھے انہوں نے ان سب کو حکومت نیپال کے سپرد کر دیا۔"[2]

حضرت محل کی خودداری

مولانا شہابی فرماتے ہیں:۔

"خدا کی قدرت ہے کجا وہ محلات شاہی جن پر بلا شبہ جنت ارضی کا گمان ہوتا تھا۔

---

[1] قیصر التواریخ شہابی صفحہ ۳۳

[2] غدر کے سپرد (مولانا شہابی

کجا نیپال کی گنجان اور سنسان پہاڑیاں دیارِ غیر میں نشیمن کے لیے چند تنکوں کی تلاش و جستجو اور پھر اس پر مستزاد صیاد کی برق آسا نظروں کا قیامت خیز سامنا۔ لیکن پائے ثبات کو لغزش ہو، ناممکن۔ آخری وقت میں اسلام کی غیرت کی نمود۔ کا اس سے اچھا اور کون سا منظر ہو سکتا تھا۔ عرصہ تک انگریزوں نے یہ خواہش بلکہ کوشش کی کہ حضرت محل ہندوستان واپس آجائیں۔ ایک انگریز مصور جو برجیس قدر کی تصویر کھینچنے گیا تھا۔ اس نے ذریعہ انگریزوں نے یہ پیغام بھیجا تھا کہ حکم سرکار ہے فیض آباد۔ لکھنؤ جہاں رہنا چاہیں آجائیں۔ تنخواہ کے علاوہ احترام شاہانہ بھی کیا جائے گا۔"[1]

ممو خاں کی گرفتاری اور سزایابی

ممو خاں نے۔ بڑی وفاداری اور جاں نثاری کا ثبوت دیا۔ وہ آخر وقت تک حضرت محل کے خادم خاص اور معتمد باختصاص بنے رہے۔ رانا جنگ بہادر نے انھیں نیپال سے باہر جانے کی بہت ترغیب دی لیکن ناکام رہے، انگریز ممو خاں سے بہت خفا تھے، اور انھیں کیفر کردار کو پہنچانے کے لیے ماہیِ بے آب کی طرح تڑپ رہے تھے، لیکن وہ ہاتھ نہ آتے تھے، آخر یہ مشکل، رانا جنگ بہادر نے حل کر دی۔

"جب کوئی صورت کارگر ہوتی نظر نہ آئی تو جنگ بہادر کو ایک رکیک چال سوجھی جس سے نواب ممو خاں اور ان کی فوج کا آسانی خاتمہ ہو گیا۔ اب یہ شیر کو ہسار بھیڑ کی کھال اوڑھ کر نمودار ہوا تھا۔ اس دوران میں بہادر جنگ نے نواب ممو خاں سے تعلقات بڑھانا شروع کئے۔ اکثر ملاقات ہوتی۔ ایک روز حسب معمول باتیں کرتے کرتے جنگ بہادر نواب ممو خاں کو اس پہاڑی پر لے آیا جہاں ایک انگریز تیل صاحب عربی لباس پہنے مع کچھ آدمیوں کے چھپا بیٹھا تھا۔ ممو خاں اس ناگہانی آفت سے قطعی بے خبر تھے۔ اس لئے کچھ پیش نہ گئی اور گرفتار ہو کر لکھنؤ لائے گئے۔ پھانسی کی سزا ہوئی۔ لیکن یہ ایسے بڑے مجرم کے لئے ناکافی خیال کی گئی اور حبسِ دوام بہ عبور دریائے شور ہوا۔ وہیں فوت ہوئے۔"

---

[1] قیصر التواریخ صفحہ ۱۰۱۸ و غدر کے بیرد

حضرت محل کی وفات

حضرت محل نے نہایت خودداری اور استقامت کے ساتھ خود اختیاری جلاوطنی کا زمانہ نیپال میں گزارا، مرتے مرتے مرگئیں لیکن اپنے غلام ملک کی سرزمین پر قدم نہ رکھا :-

۷ اپریل ۱۸۷۹ء میں حضرت محل نے انتقال کیا، لکھنؤ میں پیدا ہوئی، اور بخت ہمایوں نے وہ یاوری کی کہ شاہِ اودھ کی زوجیت کا شرف حاصل کیا، عیش و عشرت میں بسر کرتی رہی، یہ کیا جانتی تھی کہ سنگستان نیپال میں سر ٹکرانا پڑے گا۔[1]

بے شک حضرت محل مرگئی، لیکن مرتے مرتے اس نے حیاتِ جاوداں حاصل کرلی، خوب کہا ہے غالبؔ نے :

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لئے

اودھ کی بہادر عورتیں

حضرت محل سے پہلے بھی اودھ کے شبستان عشرت میں بہادر اور شمشیر زن خواتین کا وجود نظر آتا ہے۔ ایک انگریز اپنے مشاہدات میں لکھتا ہے :-

"میں نے بچشم خود ان کو قواعد کرتے دیکھا۔ یہ عورتیں پوری طرح سے بندوق چھتانے آگے بڑھنے، پیچھے ہٹنے۔ بندوق بھرنے اور نشانہ لگانے۔ سنگین چڑھانے کے کام اسی ترتیب سے کریں جیسے بارکوں میں سپاہی ہوتے ہیں ان کی جماعتوں میں سارجنٹ بھی ہوتے تھے۔ ان زنانہ سپاہیوں کی دو کمپنیاں تھیں۔ غازی الدین حیدر اپنے بعد نصیر الدین حیدر کو تخت دینا نہ چاہتے تھے۔ اس پر نصیر الدین حیدر کی ماں بڑی جرأت اور استقلال سے لڑیں۔ انھوں نے اپنے سپاہیوں کو مسلح کر کے اپنی ذاتی مردانگی سے اچھی مثال قائم کی تھی۔ بالآخر فتح مند ہوئیں اور بادشاہ نے شکست کھائی۔"

نصیر الدین کو زہر دیا گیا تو ان ہی بیگم صاحبہ نے از سر نو ہنگامہ اٹھایا۔ اپنی

---

[1] تاریخ اودھ جلد ۵ صفحہ ۲۱۶

زنانہ فوج کو بھیج کر ریذیڈنسی کا محاصرہ کر لیا اور نصیر الدین کے لڑکے کو تخت پر بٹھایا۔ اگر بیگم صاحبہ کسی اور زمانے میں پیدا ہوتیں تو یقینی ان کے کارہائے نمایاں دنیا کی تاریخ میں روشن حروف میں لکھے جاتے ان کی شجاعت پر صد آفرین کہنی چاہیے"۔[1]

(۶)

منشی رسول بخش کاکوروی

منشی رسول بخش کے مورث اعلیٰ ملا ابوبکر حاجی علوی تھے جن کے صاحبزادے ملک بہار الدین سلاطین شرقیہ کی طرف سے کاکوری فتح کرنے آئے۔ بعد فتح وہیں مقیم ہو گئے۔ منشی صاحب کے والد فیض بخش نواب شجاع الدولہ کی فوج میں صوبیدار تھے۔ بکسر کی جنگ میں شریک ہوئے تھے ان کے ساتھی محمد کاظم بھی تھے۔ فیض بخش صاحب کی تصنیف "چشمۂ فیض" مشہور ہے۔ منشی رسول بخش بھی نواب واجد علی شاہ کی فوج میں عہدیدار تھے۔ نواب ان کی تعظیم و تکریم کیا کرتے تھے۔ نواب کی معزولی پر فوجیں ختم کی گئیں تو یہ اپنے وطن چلے آئے اور اپنے معزول ساتھیوں کی ایک جماعت بنا کر فوجوں میں انگریز کے خلاف نفرت پھیلاتے رہے۔ ان کی یہ کوشش تھی کہ انگریزی کی حکومت کا تختہ الٹ دیں۔ عظیم اللہ خاں سے بھی یہ ملے تھے۔ انھوں نے اپنے ذاتی اثر و رسوخ سے اودھ کے کل جاگیرداروں اور راجاؤں کو خفیہ طور پر تیار کر کے بغاوت کا انتظام کیا تھا۔ اودھ میں جگہ جگہ جو چھاؤنیاں تھیں ان میں افسروں سے مل کر انھیں اپنا ہم خیال بنا لیا تھا اور ان کی ماتحت فوج کے لیے تنخواہ کا بھی انتظام کیا تھا۔ اس زمانہ میں ہندوستان میں مختلف مقامات پر آزادی کی خفیہ تحریک چل رہی تھی اس کے سربراہوں سے منشی صاحب نے تعلق پیدا کر لیا۔ ابھی پورا کام نہیں ہوا تھا اور ۱۲ جون "انقلاب کے آغاز" کی تاریخ تھی کہ ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ سے کارتوس کا قضیہ اٹھ کھڑا ہوا جس کا اثر دور و نزدیک ہر جگہ پڑا۔ فوجیں دوسرے روز لکھنؤ میں داخل ہونے والی تھیں لکھنؤ چھاؤنی کی فوجیں بھی تیار تھیں۔ انگریزوں کی ملازمت میں جو ہندوستانی اہلکار تھے۔ بہت

سے ان میں ان کے شریک اور معین تھے۔ ان میں ایک پولیس انسپکٹر یا سب انسپکٹر بھی تھا جو منشی صاحب کا خاص معتمد اور راز دار تھا۔ خدا جانے کیوں اس کے دل میں دفعتاً کھوٹ پیدا ہوئی، اس نے جا کر انگریزی فوج کے اعلیٰ افسر غالباً کرنل بیلی سے مخبری کر دی نتیجہ میں منشی صاحب، ان کے بڑے صاحبزادے منشی عبد الصمد صاحب اور دیگر شریک کار رہ انفوس

کو گرفتار کر کے شاہ پیر محمد صاحب کے ٹیلہ پر پھانسی دیدی گئی اور پورے خاندان کو گرفتار کرنے کا حکم دے دیا۔

منشی صاحب کے باقی دو صاحبزادگان منشی عبد الحی صاحب اور منشی عبد العزیز صاحب کاکوری میں اپنے مکان میں تھے ان کو رات ہی کو اطلاع پہنچی۔ یہ دونوں صاحب مع اپنے گھر کی مستورات اور بچوں کے اسی وقت گھر چھوڑ کر روپوش ہونے کی غرض سے نکل کھڑے ہوئے شاہ تراب علی صاحب سجادہ نشین تکیہ شریف کاظمیہ کاکوری کو کشف سے اس کی خبر ہو گئی اور حضرت نے اپنے دونوں صاحبزادگان شاہ حیدر علی صاحب اور شاہ تقی علی صاحب کو بلا کر بھیجا اور منشی رسول بخش صاحب کے خاندان کو بلا کر اپنے زنانہ مکان میں روپوش کر دیا۔ اور کئی ماہ تک یہ خاندان وہاں روپوش رہا۔ اس کے بعد سندیلہ جا کر اپنے ایک عزیز کے ہاں روپوش رہا۔

بغاوت کچھ دنوں رہی۔ اس کے بعد فرو ہو گئی مگر جاگیر داران و راجگان اودھ برابر لڑ رہے تھے اور کسی طرح اطاعت قبول نہ کرتے تھے، ایک روز لکھنؤ کے فوجی اعلیٰ افسر یا چیف کمشنر نے نواب اکرام علی صاحب سے جو منشی رسول بخش کے سالے کے بیٹے تھے اور سرکار انگریزی میں ممتاز عہدہ پر فائز تھے اور بعد میں ریاست حیدر آباد میں صوبیدار ہوئے اور نواب یار جنگ کا خطاب پایا باہم مشورہ کیا اور کہا کہ غدر فرو ہو گیا مگر یہ جاگیر دار اور راجگان کسی طرح ہتھیار نہیں ڈالتے۔ میں سخت پریشان ہوں۔ تم کوئی تدبیر بتاؤ۔ انھوں نے کہا کہ اگر آپ ناراض نہ ہوں تو عرض کر دوں؟ اس نے اجازت دی۔ تب اس نے کہا کہ منشی رسول بخش صاحب نے بغاوت کی تھی اُن کو گرفتار کر کے آپ نے پھانسی دے دی ان کو اپنے کیے کی سزا مل گئی۔ ابھی ان کی اولاد میں دو بیٹے موجود ہیں۔ جس شخص کا یہ اثر تھا کہ اس کو پھانسی دے دینے کے بعد بھی اس کی لگائی آگ بجھانا مشکل ہو گیا ہے اُس کے بیٹوں کا بھی کافی اثر ہوگا بہتر تو یہ ہے کہ آپ ان کے خاندان کی معافی کا اعلان کر دیجئے اور جب ان کے بیٹے اپنی جائے پناہ سے باہر آجائیں تو انھیں بلوائیے اور ان کے سپرد یہ کام کیجئے وہی اس کام کو کر سکتے ہیں۔ کوئی دوسرا نہیں کر سکتا یہ تجویز اس کی سمجھ میں آگئی

(اس مضمون کی تیاری میں قیصر التواریخ حصہ دوم۔ مشاہیر کاکوری اور ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء سے مدد لی گئی ہے (رضا)

اوراس نے ایسا ہی کیا عبدالحی عرش نے تمام جاگیرداروں کو موافق بنا لیا جس کے صلے میں علاقہ ملنے کو تھا مگر قبول نہیں کیا۔ تمام عمر لکھنؤ میں وکالت کرتے رہے۔

مفتی رسول بخش کا عالی شان مکان ابھی تک کوٹھی کے نام سے مشہور ہے[لھ]۔ اور جس حصہ میں وہ واقع ہے کوٹھی تلہ کہلاتا ہے[ک]۔

(۷)

امیرالمجاہدین مولوی سرفراز علی شاہجہانپوری

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں اودھ کا بڑا حصہ ہے۔ کان پور اور لکھنؤ وقتی کے مرکز بنے ہوئے تھے مگر اودھ میں جہاں جہاں افواج انگریزی تھیں ان میں انقلاب کی روح پھونکنے میں نفشی رسول بخش کاکوروی کا بڑا حصہ ہے۔ انہوں نے ایک منظم جماعت سے کام لیا اور کامیاب ہوئے مگر اس کی بہار دیکھ نہ سکے کہ پھانسی پر لٹکا دیے گئے۔ ان کا ذکر قیصر التواریخ اور مشاہیر کاکوری اور ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء میں ہے۔ مگر چند سطور سے زیادہ نہیں، مجلۂ العلم سے اس شہید کے مزید حالات پیش کیے جاتے ہیں:۔

"فوجوں میں بغاوت پھیلانے کے سلسلے میں دو ایک کا نام لیا جاتا ہے "کتاب سیلاب خون" کی روایت سے جو پتہ چلا کہ تانتیا ٹوپے نے جوگیا نہ لباس پہن کر فوجوں میں گشت لگایا مگر اس کتاب کے سوا کہیں اور سے یہ ثبوت نہ مل سکا۔ ایک عرصہ تک یہ مسئلہ زیر بحث رہا کہ خود فوجوں نے خود بغاوت کی یا دوسرے لوگ بغاوت کرانے والے تھے، چنانچہ تحقیقات کے بعد چند حقیقتیں سامنے آئیں۔ یہ ضرور ہے کہ بعض فوجیوں نے بھی اپنی ہم پیشہ جماعت کو اُبھارا مگر منظم طریقہ سے دو ہستیاں تاریخ میں نمایاں نظر آتی ہیں۔ ایک امیرالمجاہدین مولوی سرفراز علی شاہجہانپوری، دوسرے رسول بخش کاکوروی، ان کے علاوہ بارک پور میں محمد شفیع دفعدار اور کانپور میں جوالا پرشاد اور شمشادالدین بھی قابل ذکر ہیں۔ اس حقیقت سے بھی انکار کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ وہ سپاہی جو بہادر شاہ کے مرید ہوتے اور شجرہ کے ساتھ سرخ رومال ان کو ملتا تھا اور پانچ

[ک] مفتی انتظام اللہ شہابی کا مقالہ (العلم جنگ آزادی نمبر) صفحہ ۱۰۸)

روپے وظیفہ پاتے تھے ان کی کارگزاری بھی پردۂ خفا میں ہے مگر ان کی کوشش رنگ لائے بغیر نہ رہی۔
اور میرٹھ میں رنگ لائے بغیر نہ رہی۔

مولوی سرفراز علی شاہجہانپوری علمائے وقت سے تھے۔ مولوی سید احمد شہید بریلوی کے مرید تھے۔ درس و تدریس کے ساتھ شہر بہ شہر بیعتِ جہاد لیتے اور فوجیوں کو بھی مُرید کرتے۔ چنانچہ سلطان پور آپ جب گئے، تو وہاں صوبیدار بخت خاں آپ کے مرید ہوئے اور جو کچھ انقلاب ۱۸۵۷ء میں ان کا کارنامہ ہے۔ وہ اظہر من الشمس ہے۔ مولوی سرفراز علی ہی کا یہ کارنامہ تھا کہ اودھ کے علاقہ میں شوقِ جہاد پیدا کیا۔ اور ہزار مجاہدین سر بکف میدان عمل میں نکل آئے۔ مولانا احمد اللہ شاہ کے بعد یہی واجب التنظیم شخصیت ہے۔ جس نے دلی اور لکھنؤ کے لیے ہزارہا مجاہدین تیار کر دیے۔ چنانچہ ان کو امیر المجاہدین کا لقب دیا گیا۔ ؎

---

(۸)

عظیم اللہ خاں

کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگن عشق
ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

وہ نہ اونچے خاندان میں پیدا ہوا۔ کہ لوگ اس کے لیے دیدہ و دل فرش راہ کرتے، نہ صاحب دولت و ثروت تھا کہ خلقِ خدا اس کے در پر جبہ سائی کرتی، وہ ایک معمولی شخص تھا، بغیر کسی سہارے کے آگے بڑھا اور بڑھتا چلا گیا، ذہن رسا، طبع خداداد، عزم بلند، فکر عالی، یہ تھی اس کی پونجی اور جس کے پاس ایسی گراں مایہ متاع ہو پھر اسے کسی اور چیز کی ضرورت کیا ہے؟ وہ ایک زوال آشنا قوم کا فرد تھا، شعلۂ مستعجل کی طرح چمکا اور اپنی نمود دکھا کر راکھ بن گیا۔ اگر وہ کسی زندہ قوم میں پیدا ہوتا، تو زندگی جاوید حاصل کر چکا ہوتا، اس کا شمار ہیرو زمیں ہوتا، لوگ اس کی قیادت اور شہامت کے افسانے بیان کیا کرتے، عزت اسے وراثت میں نہیں ملی تھی، اس نے چھینی تھی، شہرت کا اس کے پاس کوئی وسیلہ نہ تھا لیکن وہ اس کے پیچھے پیچھے دوڑتی

؎ مفتی انتظام اللہ شہابی کا مقالہ دار العلوم جنگِ آزادی نمبر صفحہ ۱۰۶

رہی، سربلندی اور جاہ و مرتبت کے حصول کا اس کے لیے کوئی امکان نہ تھا، لیکن اس نے وہ کارنامے انجام دیے کہ سربلندی اس پر فخر کرنے لگی اور جاہ و مرتبت کا اس کے دم سے نام بلند ہوا، جب کارزارِ حیات میں اس نے قدم رکھا، تو وہ تہی دست و بے نوا تھا، یتیم اور بے مایہ تھا، لیکن جب اس دنیا سے رخصت ہوا، تو دشمن بھی اس کے جوہرِ قابل اور خداداد صلاحیت کے معترف تھے۔

روہیل کھنڈ کا مردِ جانباز محمد علی جس نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں اپنی جان قربان کی عظیم اللہ خاں کے بارے میں کہتا ہے:-

"میں نے اور عظیم اللہ خاں نے گورنمنٹ اسکول کان پور میں گنگا دین سے انگریزی کی تعلیم حاصل کی تھی اور بعد کامیابی عظیم اللہ خاں اسی اسکول میں ملازم ہو گئے"[1]

مولانا انتظام اللہ شہابی، فرماتے ہیں:-

"عظیم اللہ خاں ذہین اور تیز طبع تھے بہت جلد مطالعہ سے استعداد فاضلانہ بڑھالی۔ تھوڑے عرصہ میں عظیم اللہ کی انگریزی دانی کی کان پور میں دھوم مچ گئی جو گورنر کان پور آتا یہی ایڈریس اس کا لکھتے۔ غرضیکہ حکام ضلع میں بڑا رسوخ ان کا ہو گیا۔ کلکٹر کان پور نے نانا راؤ رئیس بٹھور سے ان کی اعلیٰ قابلیت کا ذکر کیا نانا صاحب نے عظیم اللہ خاں کو بلایا اور ان کی گفتگو کا اثر بہت کچھ لیا۔ کچھ عرصہ بعد عظیم اللہ خاں کو اپنا سربراہ کار بنالیا اور ان کی کارکردگی سے ایسا خوش ہوا کہ ان کے بغیر نانا صاحب کوئی کام ہی نہیں کرتا تھا۔

اس زمانہ میں ہندو مسلمان، اگرچہ مذہبی اعتبار سے الگ الگ "قوم" تھے، لیکن ذاتی اور ملکی معاملات میں ان کے درمیان کوئی حدِ فاصل نہیں تھی، مسلمان ہندوؤں پر اور ہندو مسلمانوں پر آنکھ بند کر کے اعتبار کرتے تھے، چنانچہ نانا صاحب کو، جب لارڈ ڈلہوزی نے باجی راؤ کا جانشین ماننے سے انکار کیا اور آٹھ لاکھ سالانہ پنشن بند کر دی، تو بھی عظیم اللہ خاں اس کے وکیل بن کر لندن گئے، مولانا شہابی فرماتے ہیں:-

۱۸۵۳ء میں عظیم اللہ خاں کو پانچ لاکھ روپیہ دے کر نانا صاحب نے ولایت روانہ کیا محمد علی خاں روہیلکھنڈی ان کے ساتھ تھے اور نانا صاحب کے بھائی بالا

---

[1] مقابلہ محمد علی عرف جیمی گرین "رسالہ مصنف (علی گڑھ) مارچ ۱۹۴۳ء

صاحب گوکھلے کو بھی ساتھ لیتے گئے۔ انگلستان جا کر ایک اعلیٰ ہوٹل میں ٹھہرے اور ڈائریکٹران سے عظیم اللہ خاں نے تبادلہ خیال کیا اور لارڈ ڈلہوزی کی پالیسی پر کڑی نکتہ چینی کی۔ دعوتوں کا سلسلہ بھی قائم رکھا مگر ڈائریکٹران نے صاف جواب دے دیا۔ جس سے ان کو سخت ناامیدی ہوئی۔ پانچ لاکھ روپیہ بھی صرف ہؤا۔ مگر سب بے سود رہا۔

عظیم اللہ خاں انگلستان پہنچا، حسن مردانہ کے اس دلآویز پیکر نے وہاں کی سوسائٹی میں ہلچل بپا کر دی۔ اس کی سحر طراز گفتگو اس کا باوقار انداز، اس کا رکھ رکھاؤ، اور اس کی شان دلربائی نے خوب خوب خراج تحسین حاصل کیا، بقول مولانا شہابی:-

"عظیم اللہ کی حسن لیاقت اور طور طریق کی انگلستان میں بڑی دھوم تھی۔ اخبارات میں انھیں "پرنس آف انڈیا" لکھا جاتا تھا، ان کی خوبیاں، نوجوانی اور خوب صورتی نے امراء کی صاحبزادیوں کو ان کا متوالا بنا دیا۔ ان کے عاشقانہ خطوط ان کے نام آنے لگے[1] مگر عظیم اللہ گو سب سے مراسم رکھتا تھا اور ہر ایک کو اس کی محبت کا جواب محبت سے دیتا تھا مگر کسی غلط راستہ پر اپنے کو لگنے نہ دیا اور نہ کسی برائی کا دھبہ دامن پر آنے دیا۔ صرف عاشقانہ خطوط تک لطف اندوز ہوتا رہا۔ انگلستان سے فرانس آیا۔ یہاں بھی لعبتان فرانس اس کی گرویدہ ہو گئیں۔ مگر اپنے دامن کو آلودگی سے بچاتا ہؤا قسطنطنیہ چلا گیا۔ یہاں سلطان عبدالعزیز کا زمانہ تھا وہاں کے امراء اور اراکین سلطنت سے ملا جلا۔ اس کے بعد کریمیا گیا۔ ان دنوں روس اور انگلستان اور فرانس سے جنگ ہو رہی تھی۔ ٹائمز کے نامہ نگار مسٹر رسیل کے خیمہ میں عظیم اللہ فروکش ہؤا۔ اور اس کے ساتھ سبٹا پول جو میدان جنگ بنا ہؤا تھا جہاں سے نامہ نگار اور امراء روس جنگ کا نقشہ دیکھ رہے تھے، یہ بھی وہیں بیٹھے تھے۔ اتفاقاً ایک گولہ ان کے سامنے آ کر گرا ان کے پاس کے لوگ سب بھاگے مگر یہ پُرسکون طور پر اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ جب گرد و غبار چھٹا تو مسٹر رسیل ان کو دیکھنے آیا کہ عظیم اللہ گولے سے مر چکا ہوگا۔ اس کی لاش کی تدفین کا انتظام کیا جائے۔ یہاں یہ حال دیکھا کہ عظیم اللہ اپنی کرسی کے پاس کھڑے ہوئے کپڑے جو غبار سے گرد آلود ہو گئے تھے بڑے اطمینان سے جھاڑ رہے ہیں۔ مسٹر رسیل اور اس کے ساتھی ان کو دیکھ کر حیران رہ گئے اور عظیم اللہ سے بولے آپ جب گولے سے بچ گئے تھے تو کیوں نہ بھاگے؟ عظیم اللہ نے کہا میں بزدل نہ تھا جو واقعہ ہونے والا تھا ہو چکا تھا عبث تھا کہ میں پھر جگہ چھوڑتا جو روسی

---

[1] یہ خطوط انڈین پرنس (انڈیا) انگلش، کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔

وہاں موجود تھے ان پر عظیم اللہ کے استقلالِ طبیعت کا بے حد اثر ہوا اور وہ ان کی قیامگاہ پر آکر ملے اور ان سے تعلقات قائم کئے اور ان کو آمادہ کیا کہ ہندوستان میں انگریز کے خلاف قدم اٹھائیں۔

ہندوستان کی یاترا

چنانچہ کچھ روز رہ کر یہ قسطنطنیہ ہوتے اور مصر ہوتے ہوئے ہندوستان آگئے۔ نانا راؤ سے تمام واقعات کہے اور نانا راؤ کو آمادہ کیا کہ وہ بِٹھور میں بیٹھ کر تمام نوابوں اور راجواڑوں کے پاس سفیر روانہ کرے۔ چنانچہ نانا راؤ نے کل اختیارات عظیم اللہ کے سپرد کر دیئے انھوں نے ہر جگہ ایلچی بھیجے۔ مگر راجہ اور نواب انگریزی اقتدار سے خوفزدہ تھے جواب لکھتے ہوئے ڈرتے تھے۔ مشورہ یہ ٹھہرا کہ نانا راؤ اور عظیم اللہ جاترا کے نام سے تمام ہندوستان کا دورہ کریں چنانچہ ایسا ہی کیا گیا ان کی جماعت کا بڑا رکن سردار مرہٹہ مہابیر تانتیا ٹوپے اور اس کا باپ سری پانڈورنگ راؤ بھٹ تھے نانا صاحب کی دختر نیک اختر بیبا بائی جو عظیم اللہ خاں کی شاگرد تھی وہ بھی ہمنوا تھی باپ سے زیادہ اس کے دل میں انگریز دشمنی تھی۔ تانتیا ٹوپے نے فقیرانہ لباس اختیار کر کے ملک کا دورہ کیا اور اپنے چیلوں کو فوج سرکاری میں چھوڑ دیا۔ یہی وہ زمانہ ہے کہ مولوی احمد اللہ شاہ نے اکبرآباد میں علماء کی ایک جماعت بنائی تھی۔ پیری مریدی کا سلسلہ قائم کر کے انگریز کے خلاف خفیہ طور پر کام کر رہے تھے۔ ظاہرہ مذہبی تبلیغ تھی باطن میں کمپنی کے اقتدار کا خاتمہ کرنا تھا۔ عظیم اللہ بھی شاہ صاحب سے مل چکا تھا۔

جنگِ آزادی کا دن

۱۸۵۶ء میں انگریزی حکومت نے واجد علی شاہ کو معزول کر کے اودھ میں عام بے چینی پیدا کر دی تھی اس کے بعد وزیر علی خاں نے کلکتہ جا کر فوجوں میں بغاوت پھیلانے کا انتظام کر لیا تھا۔ چنانچہ اس کا اثر یہ پڑا کہ بارک پور میں منگل پانڈے نے علانیہ بغاوت کا اظہار کرنا شروع کر دیا جس کی وجہ سے فوجی قانون کی رُو سے گولی کا نشانہ بننا پڑا۔ عظیم اللہ اور نانا راؤ کا دورہ کامیاب رہا۔ دہلی لکھنؤ، پونا وغیرہ غرضیکہ جہاں جہاں گئے وہاں شورش کے انتظامات ہو گئے۔

نانا کی حکومت کا اعلان

۱۱ر مئی ۱۸۵۷ء کو ہی فوج میں بغاوت انگریز کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی۔ نانا راؤ اور عظیم اللہ کانپور میں تھے۔ عظیم اللہ نے کہا جگہ جگہ شورش ہونا چاہیئے۔ دلی کو ہی مرکز نہ بنایا جائے چنانچہ کانپور سے لوٹ کر بِٹھور میں جھنڈا اپنی حکومت کا لہرایا نانا راؤ کو گدی نشین کیا گیا اور مہاراج سے خطاب کیے گئے۔

توپوں کی سلامی شلک ہوئی۔ نانا صاحب نے عدالت مقرر کی جس کے ارکان میں عظیم اللہ خاں بابا بھٹ جوالا پرشاد جج مقرر ہوئے اور نانا صاحب نے یکم جولائی کو دربار کیا جس میں عظیم اللہ کو وائسرائے مقرر کیا گیا۔ پھر کانپور آکر کل علاقہ پر قبضہ کر لیا۔ جنرل ویلر نے اسپتال کو دمدمہ سے مضبوط کر کے بطور قلعہ کے استعمال کرنے لگے۔

نانا صاحب کی فوج نے انگریزی فوج پر حملہ کر دیا۔ فوج کی کمان بینا بائی اور تانتیا ٹوپے کے ہاتھ میں تھی ۲۸ دن معرکہ رہا۔ آخر ش جنرل نے بینا کے ذریعے امان طلب کی عظیم اللہ اپنے سرداروں کو لیکر جنرل ویلر سے ملے اور عہد و میثاق ہوا۔[1]

نانا کے بھائی کی بدعہدی

صاحب قیصر التواریخ رقمطراز ہیں:-

"اس کے بعد کشتیوں پر اسلحہ، حرب و اسباب ضروری بار کر کے مع جنرل صاحب روانہ کلکتہ ہوئے، بالاجی راؤ سگے بھائی، نانا راؤ نے ارادہ خیانت اور فسخ عہد کر کے حکم شلک توپ دیا، جب توپ چلنے لگی اور کشتیاں دریا میں بیٹھ گئیں، اس وقت سپاہ باغی کا قتل کرنا ایک طرف تلوار پر تلوار پڑتی تھی اور دوسری طرف سے گولیاں برستی تھیں۔ انگریزی بیبیوں کا پاس سے ہر ایک سے ملتجی ہونا، ایک ایک سے سہارا اور پناہ ڈھونڈنا بیان سے باہر ہے، ایک سوار رحم سے بچاتا تھا دوسرا گولی مارتا تھا"[2]

نانا راؤ سے عظیم اللہ کا اختلاف

ظلم و سفاکی اور جور و ستم کی یہ روش عظیم اللہ خاں کو پسند نہ آئی، نانا کی بیٹی بینا بائی اور تانتیا ٹوپے بھی اس حرکت سے نالاں تھے، چنانچہ عظیم اللہ خاں نے بددل ہو کر نانا کا ساتھ چھوڑ دیا اور:-

لکھنؤ آکر احمد شاہ کے ساتھ ہو گئے انھوں نے معرکہ بیلی گارد میں حصہ لیا عظیم اللہ کا بھی ایک دمدمہ تھا جنرل اوٹرم نے مقابلہ کیا۔ عظیم اللہ اور تانتیا ٹوپے کے ہٹتے ہی نانا راؤ عیش و عشرت میں مشغول ہو گئے۔ پندرہ

---

[1] غدر کے چند علماء (شہابی)

[2] قیصر التواریخ جلد دوم صفحہ ۲۰۹

ہزارہ فوج صرف رہ گئی تھی جن قیدیوں کو پناہ دے رکھی تھی ان میں سے دو میموں نے اپنے حالات کی چٹھیاں آلہ آباد بھیج دیں وہ راہ میں پکڑی گئیں اس پر جھنجلا کر نانا راؤ نے سب قیدیوں کو تہ تیغ کیا ہے ۱۵ر جولائی ۱۸۵۷ء کو جنرل ہیولاک کان پور پر متصرف ہو گئے اور عملہ دخلہ ہو گیا۔

عظیم اللہ خاں کی وفات

نانا راؤ سے بددل ہو کر عظیم اللہ خاں نے انگریزوں کے خلاف رزم و پیکار کا سلسلہ جاری رکھا، مولانا شہابی فرماتے ہیں:-

"پھر عظیم اللہ خاں مولوی احمد شاہ کے ساتھ شاہ جہان پور تک رہے پھر نانا راؤ کے ساتھ نیپال چلے گئے۔ وہیں ۱۸۵۹ء میں انتقال ہوا۔"[1]

ساورکر اور ذکاء اللہ کی رائے

ساورکر اپنی ذات سے کتنا ہی متعصب، مہاسبھائی جن سنگھی اور مسلم دشمن کیوں نہ ہو، لیکن اس نے آج سے پچاس برس پہلے بغاوت ہند کی جو دلچسپ، مستند اور معرکہ آرا تاریخ لکھی تھی، اس میں مسلمان جاں بازانِ حریت کو بڑی فراخ دلی سے خراج تحسین پیش کیا ہے۔ اس نے رانی جھانسی، تانتیا ٹوپے اور نانا وغیرہ کی مدح و توصیف میں جہاں زور قلم دکھایا ہے، وہاں اسی جوش و خروش اور عقیدت و محبت کے ساتھ فروز شاہ، مولانا احمد اللہ اور عظیم اللہ خاں وغیرہ کے مجاہدانہ اور اولوالعزمانہ کارناموں کو بھی، پرخروش انداز سے بیان کیا ہے عظیم اللہ کی تعریف و توصیف میں اس کا قلم طرارے بھرنے لگتا ہے، عقیدت اور محبت، حرف حرف سے ٹپکتی ہے۔

لیکن مولوی ذکاء اللہ نے اپنی تاریخ ہند میں گو واقعات و حقائق بیان کرنے میں پوری دیانت اور راستبازی سے کام لیا ہے، لیکن چونکہ وہ جنگ آزادی کے مخالف تھے اور انگریزوں کو خدا کا فرستادہ سمجھتے تھے، اس لیے بہادر شاہ سے لے کر جنیس قدر تک، لکشمی بائی سے لیکر حضرت محل تک، تانتیا ٹوپے سے لے کر عظیم اللہ خاں تک، ان حریت دوست اور آزادی خواہ زعماء کا ذکر طنز و تحقیر کے ساتھ کیا ہے، عظیم اللہ خاں کے استخفاف میں تو وہ حد سے گزر گئے ہیں ذیل میں ان کی بے دردانہ رائے کا ایک حصہ نمونہ کے طور پر درج کرتے ہیں:-

نانا سب سے زیادہ ہوشیار تھا۔ جب نانا صاحب برٹش گورنمنٹ سے مایوس ہوا کہ اب وہ اس کے مقدمہ پر کچھ توجہ نہیں کرے گی۔ تو

[1] غدر کے چند علماء صفحہ ۱۱۷

اس نے اپنا ایجنٹ بنا کر عظیم اللہ خاں کو بھیجا جو یورپ میں تین برس رہا اس عرصہ میں زیادہ تر وہ لندن میں رہا۔ وہ پیرس اور قسطنطنیہ اور وہ اور کریمیا میں جنگ کے وقت گیا۔ جب انگریز فرانسیسیوں کے ساتھ ہو کر روسیوں سے لڑتے تھے۔ ہندوستان میں عظیم اللہ خاں کوئی بڑی وقعت و عزت نہ رکھتا تھا۔ نانا کا فقط ایجنٹ تھا مگر لندن میں انگلش سوسائٹی کے اندر شہزادہ سمجھا جاتا تھا اور ایک انگلش لیڈی سے وعدہ بھی ہو گیا تھا کہ وہ ہندوستان میں آ کر اس سے شادی کرے گی۔ ایک بڑی بوڑھی لیڈی اس کو مشرقی بیٹا کہتی تھی۔ اس کے پاس بہت سی چھٹیاں بڑے بڑے انگریزوں کی تھیں اور دو فرانسیسی چٹھیاں تھیں جو چندر نگر کے بابت لکھی تھیں جس میں فرانسیسی آباد ہیں۔ غرض وہ بڑا چلتا ہوا پرزہ نانا صاحب کے ہاتھ آ گیا تھا۔ [1]

۹

فیروز شاہ

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم
ہو گئے خاک، انتہا یہ ہے!

فیروز شاہ دلی کے شاہی خاندان کے ایک فرد تھے، لیکن نہ انھیں چوسر سے دلچسپی تھی نہ شطرنج سے، نہ کسی حور وش رقاصہ سے لگاؤ تھا، نہ کسی ملائک فریب مغنیہ سے، نہ سیر و شکاران کا مشغلہ تھا، نہ بٹیر بازی اور پتنگ بازی سے انھیں کوئی سروکار تھا، فطرت کی طرف سے، دلیری اور شجاعت کی نعمت فراوانی سے ملی تھی، بڑے سے بڑے خطرہ کا مقابلہ کرنا، طوفانوں سے لڑنا، چٹانوں سے ٹکرانا، ان کی سرشت تھی، اولوالعزمی ان کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی رہتی تھی، خطرات و مہالک کو یہ خود دعوت دیا کرتے تھے، انگریزوں سے انھیں

نفرت تھی، ان کے عروج و اقتدار کو ختم کر دینا ان کی زندگی کا مقصد تھا اور اس مقصد کے
حصول میں کسی ایثار اور قربانی سے انھیں دریغ نہ تھا۔

ہندوستان میں بیٹھے بیٹھے طبیعت گھبرائی، عبادت و ریاضت کے ہمیشہ سے دلداد
تھے، ارادہ کیا حج سے بھی فراغت کر لیں۔ اس ارادہ سے اندور تک پہنچے تھے کہ ہندوستان
میں، انگریزوں کے خلاف بغاوت شروع ہو گئی، حج بعد میں بھی کیا جا سکتا تھا، لیکن رزمگا
حریت میں شرکت کی سعادت سے اگر محرومی رہتی تو پھر اس کی تلافی کبھی نہیں ہو سکتی تھی
ارادہ حج فسخ کیا اور من چلوں اور جیالوں کی ایک فوج لے کر گوالیار، وہاں سے آگرہ پہنچے
محاصرہ کیا لیکن شکست سے دوچار ہوئے[1]۔ پھر متعدد مقامات پر ہوتے ہوتے لکھنؤ پہنچے
یہاں کے کارفرماؤں نے بے دلی سے انھیں گوارا کیا۔ لیکن حضرت محل نے ہاتھوں ہاتھ لیا
چونکہ یہ خاندان شاہی سے تھے، اس لیے جہاں جاتے تھے وہاں یہ اندیشہ بھی ساتھ جا
تھا۔ کہ کہیں خاندان شاہی کی نسبت سے فائدہ اٹھا کر صاحب تاج و تخت نہ بن جائیں
پھر بھی جہاں گئے، اپنی دلیری اور شجاعت، بے غرضی اور بے لوثی کا سکہ جما دیا۔

لکھنؤ میں اب تک آزادی کی لڑائی لڑی جا رہی تھی، یہاں حضرت محل نے خلعت
عطا کیا، ۵ ہزار روپے دعوت کے دیے۔ چھتر منزل میں قیام کا بندوبست کیا۔

لیکن بدقسمتی یہاں بھی ساتھ تھی ــــــ لکھنؤ میں حضرت محل کی حکومت تھی اور مولو
احمد اللہ شاہ کا طوطی بول رہا تھا، دونوں کو فیروز شاہ سے خطرہ اور اندیشہ پیدا ہوا۔

"مشہور ہوا، ان کا رہنا، متصل دردولت اچھا نہیں۔ یہ صاحب حوصلہ اولوالعزم
ہیں، ایسا نہ ہو تخت شاہی پر بیٹھ جائیں"[1]

دوسری طرف مولوی احمد اللہ شاہ صاحب سے بھی نہ بنی بعض معاملات میں اختلاف[2]
پیدا ہوا فیروز شاہ ذاتی سربلندی کے لیے شریک جنگ نہیں تھے، انھیں نہ تخت حکومت
درکار تھا، نہ تاج شاہی، وہ اپنے ملک کو آزاد کرانا اور انگریزوں کو اس دیس سے نکال
چاہتے تھے اور اس مقصد کے حصول کے لیے ہر ایک سے تعاون پر تیار تھے۔

چنانچہ یہاں آنے سے پہلے، وہ تانتیا ٹوپے کے ساتھ بھی اشتراک و تعاون کر چکے
تھے اور وسطی ہند میں، انھوں نے اپنی تلوار کا لوہا منوا لیا تھا، جواہر لال نے انھیں بہت

---

[1] قیصر التواریخ جلد ۲ صفحہ ۴۶۵

[1] قیصر التواریخ جلد ۲ صفحہ ۳۱۴

[2] [illegible]

اچھا گوریلا لیڈر"[۳] تسلیم کیا ہے۔ لکھنؤ سے دل برداشتہ ہو کر، وہ بریلی پہنچے، یہاں بھی اچھی خاصی فوج ان کے ساتھ تھی، بہادر خاں کی حکومت اب تک یہاں قائم تھی، ان کی بے لوثی اور بے غرضی پر کسی کی نظر نہ تھی، یہ اندیشہ سب کے دل میں تھا کہ کہیں یہ بادشاہ ہو جائیں، شروع میں بہادر خاں کا یہ رویہ بھی اچھا نہ تھا۔

"خان بہادر خاں نے اجازت شہر نہ دی، مراد آباد گئے وہاں کا ناظم چچا بہادر خاں کا تھا، اس نے کہلا بھیجا بہتر ہے یہاں سے چلے جاؤ، شہزادے نے غدر خستگی راہ کیا اور کہا ہم افطار روزہ کر کے کل نجیب آباد چلے جائیں گے۔ آج یہاں رہنے دو، قبول نہ کیا۔ ایک پلٹن رسالہ چار توپیں بھیج دیں، مقابل ان کے خیمہ کے توپیں لگا دیں، جب شاہزادے نے توپوں کو دیکھا، اپنے ساتھ کی توپ کو آگ دی"[۱]

اس جنگ میں فیروز شاہ کو فتح ہوئی، نواب صاحب رام پور تاک میں تھے کہ مراد آباد اور بریلی پر قبضہ کر لیں، ۷ ہزار فوج لے کر آگے بڑھے، اور ادھر انگریزوں کی فوج بھی پہنچ گئی شاہزادہ وسائل کی کمی سے دل برداشتہ ہو کر بریلی پھر واپس آیا۔ اس مرتبہ بہادر خاں نے گرمجوشی سے استقبال کیا، شاید انھیں اندازہ ہو گیا تھا کہ فیروز شاہ کے بارے میں یہ خیال غلط ہے کہ وہ اپنے لیے لڑ رہا ہے۔

فیروز شاہ کی حیرت انگیز شجاعت

فیروز شاہ کی رگوں میں شاہی خون دوڑ رہا تھا، اس کی شجاعت و دلیری، ہمت و جرأت، استقامت و عزیمت تہوّر اور شجاعت کی مثال، تاریخ کے اوراق میں مشکل سے ملے گی، اسے قدم قدم پر ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا، ہر ہر مرحلہ پر، رفیقانِ گریز پا کی عنایتوں سے دوچار ہونا پڑا، ساتھیوں اور دوستوں کو جدا ہوتے اور ساتھ چھوڑتے دیکھا لیکن اس کی پیشانی پر بل نہ آیا، وہ کس بلا کا بہادر تھا ایک شریکِ جنگ گل داد خاں کی زبانی سنیئے:۔

"جب بریلی میں انگریزی فوج کے حملہ کی افواہ پھیلی۔ اسی وقت بہادر خاں اور فیروز شاہ کے باہم مشورہ سے نکٹیا کے پل پر مورچہ لگایا گیا۔ کیونکہ انگریزی فوج

---

[۳] DISCOVERY OF INDIA

[۱] قیصر التواریخ جلد ۲ صفحہ ۴۶۶

کے حملہ کا زور اسی جانب تھا۔

بڑا گھمسان کا رن پڑا۔ فیروز شاہ نے بہادری اور بے جگری کے وہ مافوق البشر کارنامے انجام دیے کہ دشمن بھی عش عش پکار اٹھے۔ جس سمت گھوڑے کی باگ موڑ دیتے صفیں کی صفیں کاٹ کر رکھ دیتے مجاہدین کی فوج شہزادہ کے قدم بقدم رہتی۔ لیکن بہت سے ایسے مواقع آئے جب شہزادہ سب کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا اور جب گرد و غبار چھٹتا تو دیکھا جاتا کہ فیروز گھوڑے کو تھپ تھپا کر شاباشی دے رہے ہیں۔ انھیں دیکھ کر ہم سب مجاہدین کو بڑی ڈھارس بندھ جاتی اور جان توڑ حملہ کی تیاریاں شروع کر دیتے۔ اس وقت فوج دو حصوں میں بٹ گئی تھی ایک کی کمان فیروز شاہ اور دوسرے کی خان بہادر خاں کر رہے تھے۔ بڑی زبردست معرکہ آرائی ہو رہی تھی جس وقت مجاہدین اللہ اکبر! اور یا علی کے نعرے بلند کرتے تو دشمنوں کے دل دہل جاتے۔ ان نعروں کی گونج سے ایسا معلوم ہوتا کہ عرش کے کنگرے ٹوٹ پڑیں گے۔ عین اس وقت میں نے کیا دیکھا کہ خان بہادر خاں کا ہاتھی بگڑ کر بھاگ کھڑا ہوا اور ان کی فوج میں افراتفری پھیل گئی اور ہم نے سمجھا کہ خان شہید ہو گئے ہیں۔ لیکن فیروز شاہ نے ابھی تک باگ نہیں موڑی تھی اور یہ کہ وہ تنہا تھوڑی سی جمعیت کے ساتھ میدان کارزار میں کھڑے ہوئے تھے۔ لہ

بہادر خاں کی شکست کے بعد، فیروز شاہ محمدی گئے، جہاں مولوی احمد اللہ شاہ برسر جنگ تھے۔ مولوی احمد اللہ شاہ بڑے اچھے آدمی تھے، لیکن ہر آدمی میں کچھ نہ کچھ کمزوری ہوتی ہے، انہوں نے دیکھا، دلی ختم ہوئی۔ لکھنؤ گیا کیوں نہیں بادشاہت کا اعلان کر دوں، یہاں تک بھی غنیمت تھا، لیکن انہوں نے فیروز شاہ پر بھی داب شاہی دکھایا، نتیجہ یہ ہوا کہ، جواہر لال نہرو کے الفاظ میں فیروز شاہ نے گوریلا جنگ شروع کر دی۔

"شاہزادہ سندیلہ میں آیا تھا، تھانہ سرکاری کو لوٹ کر اپنا تسلط کیا اور اکثر اضلاع تھانہ جات، بانگر مئو، صفی پور وغیرہ کو لوٹا، غارت کیا، برسات بھر اس دوادوش

لہ [illegible] جنگ آزادی نمبر [illegible]

میں گزرا، پھر سندیلہ میں شکست کھائی، خیرآباد آئے وہاں کے ناظم ہرپرشاد کو اور مولوی محمد ناظم کو واسطے مدد راجہ گلاب سنگھ راجہ پردا بھیجا اور خود ہر ضلع و مقام میں آگ لگاتے گزرے، فوج سرکار سے بھی مقابلہ کیا، کہیں ثبات نہ رہا، محمود آباد آیا۔ وہاں سب افسروں کو جمع کیا کہا میں نے تن بہ مرگ دیا ہے، جسے مرنا ہو میرا ساتھ دے۔ ورنہ اختیار رکھتا ہے، چلا جائے اس دن شہزادہ فاقہ سے تھا، آخر ہم سو سوار اور قریب ہزار آدمی کے جمع ہو کر روانہ باڑی ہوا، باڑی سے سیدھا کنارے دریائے گنگ پہنچا۔ گھاٹ سے بسلامت پار اتر گیا۔ راہ میں اکثر مقام پر لڑائی بھی ہوئی خوب بہادری سے لڑا اور بسلامت نکلا چلا گیا۔ کئی برس سرگردان رہا۔ آخرکار کابل سے ہو کر داخل ملک ایران ہوا وہاں سے داخل ملک روس ہوا کہتے ہیں کہ وہاں اپنی جماعت قلیل سے بخوبی بسر کرتے ہیں۔ ؎

بے قرار روح

قیصر التواریخ کی مذکورہ تصریحات سے اندازہ ہوتا ہے کہ فیروز شاہ ایک بیقرار روح کا حامل تھا جب تک وہ زندہ رہا، ٹھوکریں کھاتا رہا پریشان ہوتا رہا اور پھرتا رہا۔ لیکن سر میں جو سودا سمایا تھا۔ وہ دور نہ ہوا۔ وہ روس گیا ہو، یا مکہ معظمہ، یا کسی دوسرے شہر میں۔ بہرحال یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ وہ انگریزوں کے ہاتھ نہ آیا۔ اس نے انگریزوں کو ناکوں چنے چبوا دیئے۔

---

(۱۰)

مولانا کفایت علی کافی مرادآبادی

"جنگ آزادی ۱۸۵۷ء مسلمانان برصغیر پاک و ہند کی وہ منظم اور ہمہ گیر تحریک تھی کہ

جس میں انہوں نے وطن عزیز کو غیر ملکی اقتدار سے آزاد کرانے کے لئے ہر ممکن کوشش کی۔ اس تحریک میں اگر ایک طرف امرار و روسار اور فوجی طاقت پیش پیش تھی تو دوسری جانب علمار و صلحار و فقرار و شعرار اور عوام بھی شریک تھے۔ فتویٰ جہاد سے علمار کی مساعی جمیلہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ فقرار نے فقیری کے پردے میں بیعت جہاد شروع کر دی شعرار بھی بزم سخن کو چھوڑ کر میدان رزم میں آگئے۔ مجاہدین نے غیر ملکی حکومت کے قدم اکھاڑ دیئے۔ انھیں سر فروش اور کفن بردوش مجاہدین ہیں مولانا کفایت علی کافی ہیں جنھوں نے مسند علم و بزم سخن کو چھوڑ کر جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں مردانہ وار حصہ لیا اور جام شہادت نوش کیا۔

ابتدائی حالات کفایت علی نام تخلص کافی ہے۔ ایک معزز خانوادہ سادات کے رکن اور مراد آباد کے قدیم ساکن تھے۔

ابتدائی تعلیم مراد آباد میں حاصل کی، بریلی اور بدایوں تحصیل علم کے سلسلے میں رہے شاہ ابو سعید مجددی سے علم حدیث پڑھا۔

علم وفضل مولانا کافی تمام علوم عقلیہ و نقلیہ میں مہارت کامل رکھتے تھے خصوصاً علم طب، صرف و نحو اور شاعری و ادب وغیرہ میں کمال حاصل تھا۔ علم حدیث سے بڑا تعلق تھا۔ شاعری کے سلسلے میں مولوی عبدالغفور نساخ لکھتے ہیں صاحب علم وفضل و زہد و تقویٰ ہیں۔ بیشتر اشعار ان کے حمد و نعت میں ہوتے ہیں۔[۱]

میرٹھ میں فوج کے باغی ہو جانے کی خبریں ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو مراد آباد پہنچیں اس وقت سی۔ بی سانڈرس مجسٹریٹ مراد آباد اور مسٹر جے جے کیبل جوائنٹ مجسٹریٹ اور مسٹر کرا کرافسٹ ولسن جج تھے۔ آخر الذکر اس ضلع میں سترہ سال سے تعینات تھے اور وہ ضلع اور باشندگان ضلع کے حالات سے بخوبی واقف تھے۔ لہٰذا جب مراد آباد کی صورت حال زیادہ تشویش ناک ہو گئی تو ضلع مراد آباد کا انتظام انہیں کے سپرد کر دیا گیا۔[۲] ۱۹ مئی ۱۸۵۷ء کو مراد آباد کے مجاہدین نے جیل خانہ توڑ کر قیدیوں کو آزاد کر دیا۔ فوج نے اطاعت قبول کرنے سے انکار کر دیا اور فوجی طاقت کو مضبوط کیا۔

---

[۱] سخن شعرار ص ۳۹۵ [۲] گزیٹر ضلع مراد آباد

قومی حکومت کا قیام

ضلع مرادآباد میں مجاہدین کا بڑا جوش وخروش تھا۔ نواب مجدالدین عرف مجوخان حاکم مرادآباد بنائے گئے۔ توپ خانہ نواب اسدخاں کے سپرد ہوا۔ نواب شیر علی خاں فوج کے جرنیل مقرر ہوئے۔ مولانا کفایت علی کافی صدرالشریعت بنائے گئے اور انگریزی حکومت اٹھ جانے کے بعد احکام حکومت جاری کئے گئے۔ مولوی منو نے مسلمانوں میں جہاد کی روح پھونک دی۔ جس کا یہ اثر تھا کہ جب شہزادہ فیروز شاہ مرادآباد میں داخل ہوا ہے تو شہر مرادآباد کے سولہ ہزار آدمیوں نے تقسیم شرعی ایک محضرنامے پر شرکت کے واسطے دستخط کئے تھے[1]۔ جمعہ کو مسجد کے مجمع میں جہاد کے واسطے وعظ کہا جاتا تھا جس کا خاطر خواہ اثر ہوتا۔ مسلمانوں نے اس علاقہ میں اسلامی حکومت کے قیام کا مستقل ارادہ کر لیا تھا۔ چنانچہ ڈسٹرکٹ گزیٹیر مرادآباد میں لکھا ہے :-

"مسلمانوں نے من حیث القوم ضلع بھر میں برٹش گورنمنٹ سے اپنی مخالفت کو نہایت صاف اور صریح طریق پر ظاہر کیا۔ روہیل کھنڈ کے اضلاع کی طرح مرادآباد کے ضلع میں بھی تعصب مذہبی اور انگریزوں کی ہر بات سے انتہائی تنفر کے جذبات نے مسلمانوں کو عام بغاوت پر مشتعل کیا تھا"

جب بریلی اور مرادآباد وغیرہ میں مجاہدین کی سرگرمیاں شباب پر تھیں۔ اور انگریزوں نے نینی تال میں پناہ لی تھی۔ اس وقت انگریزوں کی حلیف ریاست رام پور نے کمشنر روہیل کھنڈ مسٹر الیگزینڈر سے اجازت لے کر مرادآباد پر قبضہ کر لیا۔ اور مسلمانوں کی قوت کو منتشر کرنے اور کمزور کر دیا۔

فتویٰ جہاد کی اشاعت

جس وقت مرادآباد میں نواب رام پور کی بالادستی قائم ہو گئی اس زمانہ میں مولانا کافی نے انگریزوں کے خلاف ایک فتویٰ جہاد مرتب کیا اور اس کی نقول آپ نے دوسرے مقامات پر بھجوائیں۔ اور بعض مقامات پر خود تشریف لے گئے۔ مولانا کافی آنولہ سے بریلی پہنچے۔ وہاں نواب خاں بہادر خاں اور امام المجاہدین مولوی سرفراز علی سے مشورے

---

[1] اخبار الصنادید جلد دوم مولفہ حکیم نجم الغنی رام پوری مرحوم

ہوئے۔ جنرل بخت خاں کی ماتحتی میں بریلی سے جو فوج دہلی جارہی تھی۔ اسی فوج کے ساتھ مولانا کافی مرادآباد پہنچے۔

مرادآباد پر انگریزوں کا قبضہ

جب جنرل بخت خاں کی فوج مرادآباد سے گزر گئی تو نواب رام پور نے پھر مرادآباد پر قبضہ کر لیا۔ لیکن جب شہزادہ فیروز شاہ کا گزر مرادآباد سے ہوا تو ریاست رام پور کی فوج کو سخت زک اٹھانی پڑی لیکن جنرل جونس کی آمد کی خبر گرم ہوتے ہی شہزادہ فیروز شاہ نے میدان چھوڑ دیا۔ ۲۵ اپریل ۱۸۵۸ء کو جنرل جونس مرادآباد میں آگیا۔ ریاست رام پور کے اہل کاروں نے مرادآباد کا انتظام اس کے سپرد کر دیا۔ مسٹر انگلس کے آتے ہی دارو گیر شروع ہوئی۔ کرنل کک نے شہر کی ناکہ بندی کر کے خانہ تلاشی اور گرفتاری شروع کی۔ ذرا ذرا سے شبہ پر مسلمان گرفتار ہوتے۔

پھانسی کا حکم اور غزل سرائی

فخر الدین رکلال، نامی ایک شخص نے مخبری کی مولانا کفایت علی کافی گرفتار ہوئے۔ مولانا کافی پر مختلف الزامات قائم کئے گئے۔ معمولی ضابطہ کی کاروائی کے بعد پھانسی کا حکم ہوا۔ مولانا کافی نے یہ حکم پاتے ہی نہایت خوشی کا اظہار کیا گیا اور جب مولانا کو پھانسی دینے کے لئے لے جایا گیا تو مولانا کافی نہایت بلند آواز سے اپنی ایک تازہ غزل پڑھتے ہوئے جا رہے تھے جو کہ درج ذیل ہے:۔

کوئی گل باقی رہے گا نے چمن رہ جائے گا
پر رسول اللہ کا دین حسن رہ جائے گا

ہم صفیر و باغ میں ہے کوئی دم کا چہچہا
بلبلیں اڑ جائیں گی سونا چمن رہ جائے گا

اطلس و کمخواب کی پوشاک پر نازاں نہ ہو
اس تن بے جان پر خاکی کفن رہ جائیگا

نام شاہان جہاں مٹ جائیں گے لیکن یہاں
حشر تک نام و نشان پنجتن رہ جائیگا

جو پڑھے گا صاحب لولاک کے اوپر درود
آگ سے محفوظ اس کا تن بدن رہ جائیگا

سب فنا ہو جائیں گے کافی ولیکن حشر تک
نعت حضرت کا زبانوں پر سخن رہ جائے گا

۳۵ برس بعد لاش صحیح سلامت نکلی

مولوی محمد عمر صاحب نعیمی مرادآبادی کا بیان ہے کہ شہادت سے تقریباً پینتیس ۳۵ سال بعد مولانا کافی کی قبر جو کہ جیل کے قریب واقع تھی سڑک میں آگئی تھی جس سے قبر کھل گئی دیکھا گیا جسم ویسا ہی رکھا تھا۔ مولوی محمد عمر نعیمی مرادآبادی کے نانا شیخ کرامت علی

ٹھیکہ دار نے جسم مبارک کو دوسری جگہ عقب جیل دفن کرا دیا تھا۔ قبر تاہنوز محفوظ ہے[1]

(۱۱)

لکشمی بائی رانی جھانسی

ہستی سے عدم تک نفس چند کی ہے راہ
دنیا سے گزرنا سفر ایسا ہے کہاں کا

لکشمی بائی ایک مرہٹہ خاتون تھی، حسن صورت اور حسن سیرت کا نمونہ کامل، خوب رو اور شجاع، نازنین اور شمشیر زن، عورت اور میدان جنگ کی روح وہ ایک کھاتے پیتے گھر میں پیدا ہوئی، بچپن کا زمانہ بٹھور (کان پور) میں نانا صاحب کے ساتھ گزارا دونوں ساتھ ساتھ کھیلتے، سیر کرتے۔ تفریح کرتے، گھوڑے پر سوار ہوتے، تیر اندازی اور شمشیر زنی کی مشق کرتے، لیکن یہ سنگھم کچھ ہی عرصہ بعد ٹوٹ گیا۔ لکشمی بائی نے ابھی جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا ہی تھا کہ ایک ضعیف اور لاولد فرماں رواں گنگا دھر راؤ کی رفیقہ حیات بن کر بٹھور سے جھانسی پہنچ گئی۔ اب تک وہ ایک الھڑ دوشیزہ تھی، شوخ اور چنچل لڑکی تھی، خوش باش اور خوش طبع نازنین تھی۔ لیکن آج کی تاریخ سے وہ ایک سنجیدہ خاتون، ایک باوقار رانی، ایک مدبر اور سیاست داں عورت بن گئی، پہلی زندگی اس نے جس سادگی سے بسر کی تھی دوسری زندگی اس سے کہیں زیادہ وقار اور شوکت کے ساتھ گزار دی۔

جھانسی آگرہ سے ایک سو بیالیس میل کے فاصلہ پر ایک شہر ہے، جو ایک چھوٹی سی مرہٹہ ریاست کا پایہ تخت تھا۔ جس زمانہ میں مرہٹہ امپائر، کا خواب دیکھا جا رہا تھا اور شاہان مغلیہ کی کمزوری اور بے چارگی سے فائدہ اٹھایا جا رہا تھا، نظام

جھانسی کی رانی لکشمی بائی جس نے جنگ آزادی میں نمایاں حصہ لیا

الملک کی بے تدبیری اور خود غرضی کے باعث۔ مرہٹوں کو مالوہ اور وسطی ہند میں بھی قدم جمانے کا موقع مل گیا۔ اور جھانسی میں بھی ایک مرہٹہ ریاست قائم ہو گئی۔

انگریزوں کی ہمیشہ یہ پالیسی رہی کہ ریاستوں کو ان کے مرکز سے جدا کر کے بلا راست معاہدے کر لئے جائیں۔ اس طرز عمل سے دو فائدے متصور تھے، ایک تو مرکز کی کمزوری دوسرے زیر معاہدہ ریاستوں پر پہلے اخلاقی، پھر مادی تسلط، اودھ کے فرماں روا "نواب وزیر" کہلاتے تھے۔ کیونکہ وہ شاہ دہلی کے وزیر کی حیثیت سے، اودھ کے صوبہ پر فرمانروائی کرتے تھے، انگریزوں نے غازی الدین حیدر کو "بادشاہ"، بنا دیا۔ اودھ کا صوبہ ایک خود مختار ملک بن گیا دہلی سے تعلق منقطع ہو گیا، ایسٹ انڈیا کمپنی کی سیادت قائم ہو گئی، یہی جھانسی کے ساتھ ہوا، یہاں کا راجہ، پیشوا کا ماتحت اور باجگزار تھا۔ اور اودھ کے نواب وزیر کی طرح وہ صوبے دار سے زیادہ حیثیت نہ رکھتا تھا۔ لیکن انگریزوں نے اسے "مہاراج دھیراج" بنا دیا، پیشوا سے اس کا تعلق منقطع ہو گیا۔ اور انگریزوں سے پیمان وفا بندھ گیا۔

لکشمی بائی کے بطن سے گنگادھر راؤ کا ایک لڑکا پیدا ہوا، لیکن وہ چند ہی ماہ بعد اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اب گنگادھر راؤ نے ایک وصیت کی رو سے اپنے خاندان کے ایک نوعمر بچہ کو دامودر گنگادھر راؤ کے نام سے اپنا متبنٰی کیا۔ لکشمی بائی کو اس کے بلوغ تک کے لئے۔ مدار المہام مقرر کیا، اس واقعہ کے کچھ دن بعد وہ فوت ہو گیا۔ لارڈ ڈلہوزی کا عہد، الحاق کا عہد کہا جاتا ہے۔ انہیں نادر موقع ہاتھ آ گیا۔ انہوں نے متبنٰی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ رانی کی پنشن ساٹھ ہزار سالانہ مقرر کر دی۔ اور ریاست کا الحاق کر لیا۔ انگریزوں نے جو حقیر پنشن مقرر کی تھی اسی پر آنجہانی راجہ کے قرض کا بار بھی ٹال دیا۔ ادھر چھاؤنی میں گاؤ کشی بھی علانیہ ہونے لگی: ظاہر ہے اس ستم ظریفی کو لکشمی بائی برداشت نہیں کر سکتی تھی:۔

> رانی کو ۱۸۵۴ء سے ۶۰ ہزار سالانہ پنشن ملتی تھی۔ اس پنشن سے وہ راضی نہ تھی اور جب خاوند کے قرض کا بار بھی اس پنشن پر پڑا تو اور زیادہ ناراض ہو گئی اس نے دہائی مچائی کہ جب اس کے خاوند کی ریاست سرکار نے ضبط کی تو اس کا قرض بھی اپنے ذمے لیا ہوتا۔ مگر گورنمنٹ نے اس کی یہ شکایت

جھانسی میں گائے ذبح ہوئی۔ جواب تک کبھی نہ ہوئی تو پھر وہ سرکار سے اور زیادہ نفرت کرنے لگی [1]

انگریزوں کی بودی دلیل

الحاق کے سلسلہ میں انگریزوں کی دلیل بڑی بودی اور کمزور تھی:۔

۱۸۳۷ء میں سرچارلس مٹکف نے اس باب میں ایک نوشتہ لکھا تھا۔ اس سے ثابت ہوتا تھا کہ ہندو راجہ خود مختار شاہانہ حکومت رکھتے ہیں اور دوسرے ہندو سرداروں میں جن کو ملک یا محاصل ملک بادشاہ کی طرف سے عطا کیا گیا ہے۔ ان دونوں میں فرق ہے۔ جس حکومت نے یہ جاگیر معافی دی ہے۔ وہ مستحق ہے کہ جاگیر کے لئے یہ مقرر کر دے کہ یہ کتنے پشتوں کے لئے دی گئی؟ اس کی مدت کیا ہے؟ جب قطع نسل ہو تو اس کو واپس لے لے۔ اب سرکار کا ضبط کرنے کا حق خوب چمک رہا تھا۔ جھانسی ضبط ہو گئی۔ آخیر راجہ کی بیوہ غل مچاتی دہائی دیتی رہی کہ خاوند کا خاندان سرکار کا بڑا خیر خواہ ہے۔ اس نے بڑے بڑے کام نیک خواہی کے کئے ہیں جن کو سرکار بھی مانتی ہے۔ اس نے عہد نامہ کی شرائط کو بھی دکھایا، مگر اس کی ساری حجتیں بے کار رہیں۔ یہ قرار پایا کہ ریاست جھانسی کا برٹش گورنمنٹ کے اغراض و فوائد کے لئے حکماً الحاق کرنا ضروری ہے لارڈ ڈلہوزی نے کہا چونکہ جھانسی سرکاری اضلاع کے وسط میں واقع ہے۔ اس پر قبضہ ہونے سے ہماری مرضی کے موافق اس کا تمام انتظام ہوگا جو ہم بندیل کھنڈ کا چاہتے ہیں۔ اور سرکاری اضلاع کے ساتھ شامل ہونے سے جھانسی کی رعایا کو بہت فائدہ پہنچے گا۔ [2]

جھانسی کے سلسلہ میں بھی انگریزوں نے بڑی بے تدبیری اور حرص و آز کا مظاہرہ کیا

---

[1] تاریخ عروج عہد انگلشیہ ذکاء اللہ، ص۵۵۹

[2] مٹکاف

[3] [illegible]

یہ مہارانی لکشمی بائی کی اس وقت کی تصویر
ہے جب ان کے پتی زندہ تھے۔

مہارانی لکشمی کے پتی اور جھانسی کے مہاراج شری
گنگادھر راؤ عرف بابا صاحب نوالکر

اگر وہ جھانسی کا الحاق نہ کرتے اور برائے نام ہی مرہٹہ حکومت قائم رکھتے۔ تو شاید حالات اتنے نہ ابتر ہوتے، بہرحال ان کی اس روش نے جھانسی کے ہندو مسلم عوام اور مہارانی کو بہت زیادہ مشتعل کر دیا۔ اس اثنا میں خوش قسمتی سے غدر شروع ہو گیا۔

رانی جھانسی کی ہوشیاری

جھانسی ایک فصیل دار شہر ہے۔ شہر سے تھوڑی دور کے فاصلہ پر چھاؤنی تھی۔ اس میں ایک چھوٹا سا قلعہ تھا جس کو ستارہ قلعہ کہتے ہیں۔ اس میں توپ خانہ اور خزانہ رہتا تھا۔ ایک اور قلعہ تھا جس کو قلعہ کلاں کہتے تھے۔

سپاہ کے کمانڈر کپتان ڈن لوپ صاحب اور پولیٹیکل افسر کپتان الیگزنڈر تھے۔ جب رانی کو میرٹھ کے ۱۰ مئی کے واقعہ کی خبر پہنچی تو وہ بڑی خوش ہوئی۔ کہ اب میرے بھلے دن آئے مگر اس نے انگریزوں سے ایسی خیر خواہی کی باتیں بنائیں۔ کہ جو آپ کے دشمن ہیں، میں ان کی دشمن ہوں، ان کی آنکھوں میں خاک ڈالی کہ انہوں نے اس کو یہ اجازت دے دی کہ وہ اپنی محافظت کے لئے سپاہ بھرتی کر لے۔ اس نے یہ اجازت پاتے ہی اپنی ریاست کے پرانے سپاہیوں کو نوکر رکھ لیا اور بھاری توپیں جو زمین میں اس کے خاوند کے زمانہ کی دبی دبائی پڑیں تھیں۔ ان کو نکال لیا۔ انگریزوں کو اپنی ہندوستانی سپاہ پر اور رانی پر بالکل اپنے خیر خواہ ہونے کا اعتبار تھا

لکشمی بائی تخت حکومت پر

اس تیاری کے بعد، انگریزوں کی سرکوبی اور قتل و غارت کا دور شروع ہو گیا۔

جھانسی میں جن بنگلوں میں انگریز رہتے تھے۔ آگ لگنی شروع ہوئی جو بغاوت کے آغاز پر دلالت کرتی تھی۔ نمبر ۱۲ رجمنٹ پیدل نے ۵ جون کو ستارہ قلعہ پر قبضہ کر لیا۔

ڈن لاپ صاحب کو جو اپنے خطوط ڈاک میں ڈال کر آتے تھے مار ڈالا ۵ جون کو جب ستارہ قلعہ پر باغیوں نے قبضہ کر لیا۔ تو ۶ جون کی دوپہر کو رانی مع اپنے جلوس کے محل سے باہر سوار ہو کر چھاؤنی کی طرف گئی شہر میں ایک ملاں[1] نے اس کے لئے دعائیں پڑھیں:۔

---

[1] اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے تک ہندو مسلمان فقیروں اور ملاؤں سے حصول برکت کے متمنی رہا کرتے تھے۔

کونسل آف وار۔ انگریزوں نے کونسل آف وار جمع کی اس میں یہ فیصلہ ہوا کہ رانی کے پاس تین افسر یہ پیغام لے کر جائیں کہ قلعہ میں جو عورتیں، بچے، مرد ہیں۔ ان کو انگریزی عملداری میں کسی امن کی جگہ بخیر و عافیت جانے دے

انگریزوں کا قتل۔ ۰ جون کی صبح کو انڈریو صاحب اور سکوٹ صاحب و پرسیل صاحب پیغام دے کے جانے کے واسطے قلعہ سے باہر نکلے اور فوراً ان کو باغیوں نے گرفتار کر لیا اور رانی کے محل میں لے گئے۔ رانی صاحبہ اس وقت اپنے راج کی خوشی میں مست ہو رہی تھی اس نے کہا کہ مجھے ان انگریز سوروں سے کچھ کام نہیں۔ اس نے اپنے نوکروں کو حکم دیا کہ ان قیدیوں کو غیر آئینی رسالہ کے رسال دار کے پاس لے جاؤ۔ وہ رانی کے محل سے باہر نکلے تھے کہ باغیوں نے ان کو مار ڈالا۔

رانی کے شرائط صلح۔ جب رانی اور باغیوں کو معلوم ہوا کہ قلعہ کا ختم کرنا بڑی ٹیڑھی کھیر ہے تو ایک آدمی صلح کا جھنڈا ہلاتا ہوا رانی کی طرف سے قلعہ میں یہ پیغام لایا کہ رانی فقط قلعہ چاہتی ہے۔ اگر یورپین ہتھیار دے دیں اور قلعہ حوالہ کر دیں تو وہ بہ حفاظت دوسرے مقام میں پہنچا دیئے جائیں گے۔

کپتان سکین نے ان شرائط کو منظور کر لیا۔ اہل قلعہ نے ہتھیار دے دیئے اور قلعہ سے باہر نکل آئے۔

انگریزوں کا مظلومانہ قتل۔ یورپین قلعہ سے باہر نکلے ہی تھے کہ سرکش ان پر ٹوٹ پڑے اور سب کو باندھ کر جوگن باغ میں لے گئے اور درختوں کے جھنڈ کے نیچے ان کو کھڑا کر دیا۔ پھر رسالدار نے سب کے قتل کرنے کا حکم بھیجا۔ قیدیوں کی تین قطاریں ایک مردوں کی۔ دوسری عورتوں کی۔ تیسری بچوں کی بنائی گئیں اور سب بڑی بےدردی سے قتل ہوئے۔ کوئی ان میں زندہ سلامت نہ رہا۔[1]

---

[1] تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) ص۸۶۷

سن ستاون کے ایک اور غدار - جیا جی راؤ
سندھیا، مہاراجہ گوالیار -

انگریزوں کا ہراس و اضطراب سندھیا اور ہلکر کے سپاہیوں نے جو بغاوت کی وہ سرکار کمپنی کی پوربی سپاہ سے آن ملیں، یہاں کے رئیسوں کے ملک میں انگریز مارے گئے، لیکن ان کے درباروں نے کوئی اب تک بغاوت کی بات نہیں کی۔

آگرہ میں جو ممالک مغربی کا دار الحکومت تھا ماہ مئی میں مشتبہ امن و امان رہا مگر جون میں نیمچ اور نصیر آباد سے باغی رجمنٹ نے آن کر اس پر حملہ کیا۔ لفٹننٹ گورنر اور سب افسران قلعہ میں بند بیٹھے تھے۔ کل ممالک شمال مغرب کے اضلاع میں کہیں کچھ انتظام نہیں تھا جولائی کے اول ہفتے میں سپریم گورنمنٹ کو یقین تھا کہ اس وقت ممالک مغربی و شمالی ہماری حکومت کے تلے سے نکل گئے، غرض انگریز اس وقت چاروں طرف نظر اٹھا کر دیکھتے تھے۔ کہیں اطمینان خاطر نظر نہیں آتا تھا۔[1]

باغیوں کے حوصلے، رانی کی دلیری، عوام کا جوش منشی ذکاء اللہ لکھتے ہیں:-

"قلعہ جھانسی میں ایسی بڑی وسعت اور قدرتی اور مصنوعی حصانت تھی کہ وہ ایک حصن حصین لاجواب تھا۔ وہ میدان میں ایک اونچی پہاڑی پر نہایت مضبوط گچ کا بنا ہوا تھا۔ اس کی دیواروں کے آثار ۱۶ فٹ سے ۲۰ فٹ تک تھے اس کے گرد بڑے مستحکم برج بنے ہوئے تھے جن پر توپیں لگی ہوئی تھیں، سفید برج پر رانی کا پھریرا لہرا رہا تھا۔ قلعہ چاروں طرف باستثنا مغربی اور جنوبی جانب کے ایک حصے کے شہر سے گھرا ہوا تھا۔ مغربی جانب کا بہت اونچا ڈھلوان پہاڑ تھا اور جنوبی مشرقی سرے پر ایک بڑا اونچا ٹیلہ تھا۔ اس کے اوپر ایک گول گڑگچ بنا ہوا تھا جس پر پانچ توپیں لگی ہوئی تھیں اور اس کے گول کے گرد خندق ۱۲ فٹ گہری اور پندرہ فٹ چوڑی بڑی مضبوط گچ کی بنی ہوئی تھی اور شہر اور قلعہ میں دس ہزار بندیلے اور ولایتی سپاہی اور پندرہ سو باغی سپاہی تھے

---

[1] تاریخ عروج عہد انگلشیہ ذکاء اللہ ص۶۷۵

جن کی سپہ سالار ایک عورت تھی، عظمت و شجاعت کی جو تعریف کی جاتی ہے اس کے موافق رانی کی شجاعت و عظمت اس کے دشمن بھی مانتے ہیں۔

رانی نے محاصرین کو حیران کرنے کے لئے یہ تدبیر کی تھی کہ جھانسی کے گرد ملک کو ایسا ویران کر دیا تھا کہ کہیں گھاس کا پتہ تک نظر نہیں آتا تھا۔ مہاراجہ سندھیا اور راجہ ٹہری کی سرکار انگریزی بڑی ممنون ہے کہ انہوں نے ایام جنگ میں گھاس اور جلانے کی لکڑیاں اور ترکاریاں افراط سے بھیجی تھیں۔

شہر کی فصیل کی مشرقی جانب اودھ کی سڑک پر ایک بیٹری لگائی گئی اور رات دن محنت کر کے یورش (سپاہ حملہ آور) دو حصوں میں منقسم ہوئی تھی جن میں سے ایک حصہ کا نام یورش راست اور دوسرے حصہ کا نام یورش چپ رکھا گیا تھا۔ راست کے لئے چار بیٹریاں بنائی گئیں اور ۲۰ سے انہوں نے توپ زنی شروع کی اس دن پہلے برگیڈ کی بہت سی سپاہ آگئی اور قلعہ کے جنوب میں خیمہ زن ہوئی اور یورش چپ کے لئے تجویز ہوئی۔

سترہ دن تک برابر محاصرہ کرنے والی توپوں نے اور شہر اور قلعہ کی توپوں نے برابر اور متواتر ایک دوسرے پر گولہ باری کی۔ گولے شہر کے اندر جاتے تھے، دشمن بھی ان کا جواب دیتے تھے۔ کبھی اس میں توقف نہیں کرتے تھے۔ محاصرین کی سپاہ تھوڑی تھی اس کو بڑی مشقت شاقہ اٹھانی پڑی۔ ان دنوں میں سپاہیوں نے کپڑے نہیں اتارے اور گھوڑوں کے دہن سے کبھی لگامیں سوائے پانی پینے کے وقت کے بھی نہیں اتریں۔ محصورین بھی بڑی محنت کرتے تھے۔ عورتیں اور بچے دکھائی دیتے تھے کہ وہ دیواروں کی شکست و ریخت کی مرمت میں مدد کرتے تھے اور پانی اور کھانا ان سپاہیوں کے پاس لے جاتے تھے جو اپنے کام میں مصروف ہوتے تھے۔ رانی ہمیشہ سپاہ میں خود آتی اور اپنی باتوں سے ان کی محبت اور جرأت بڑھاتی اور ان کے دلوں میں لڑائی کا جوش پیدا کرتی۔ سر ہیو روز نے دو توپیں شگاف اندازی کے لئے مقرر کی تھیں اور باقی توپیں شہر میں گولہ اندازی کے لئے۔ فصیل ایسی مضبوط تھی کہ ان اٹھارہ پینی توپوں کا اثر آہستہ آہستہ ہوتا تھا۔ ۲۹ کو ٹیلہ

کے گڑگج کے سب کنگورے توپوں نے اڑا دیے اور اس پر دشمنوں کی توپیں بند ہو گئیں۔ آئندہ دو دن تک توپ زنی بڑے زور سے ہوئی اور فقط ایک ڈرا ڈر بڑی جان سے کام چل سکتا تھا۔ مگر باغیوں کی جرأت و ہمت میں اس سے کچھ خلل نہیں آیا۔ سلہ

لڑائی کی ضروری اور اہم تفصیلات

انگریز مورخوں کی ساری کتابیں پڑھ جائیے، ہندو اور مسلمان مورخوں کے تمام بیانات پیش نظر رکھیے حامیوں اور مخالفوں کی حملہ آور کا جائزہ لیجیے، پھر منشی ذکاء اللہ کے تاریخی مجلدات پڑھیے، اور ان کی ذاتی رائے زنی نکال دیجیے۔ تو خلاصۃً پوری جامعیت کے ساتھ وہ ساری باتیں ترتیب و استناد کے ساتھ مل جائیں گی جو دوسروں کے ہاں متفرق اور پراگندہ نظر آئیں گی۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے ذکاء اللہ کی تاریخ پر زیادہ اعتماد کیا ہے۔

انگریزوں کا حملہ باغیوں کا شاندار مقابلہ

قلعہ کا محاصرہ انگریز کر چکے تھے، تانتیا ٹوپے بھی رانی کی مدد کے لئے آگیا تھا، مگر وہ شکست کھا کر نامراد واپس گیا تھا۔ قلعہ کے محصورین اس سانحہ کے باوجود ہراساں اور بد دل نہ ہوئے ان کے جوش و خروش کا وہی عالم تھا جو پہلے دن تھا:۔

سپاہ انگریزی مظفر و منصور ہو کر اپنے مقامات سابقہ پر آئی، تانتیا ٹوپے کی شکست نے قلعہ نشینوں کا بڑا دل شکستہ کیا۔ سر ہیوروز نے پہلی اپریل کو رات بھر توپوں کی بھرمار رکھی۔ ۲، اپریل کو شہر کی فصیل میں ایک بڑا انشگاف پڑا تو سر ہیوروز نے مصمم ارادہ کیا کہ دوسرے دن صبح کو یورش کی جائے۔ انہوں نے حملہ آور لشکر کو دو حصوں میں منقسم کیا اور ان کا نام یورش راست اور یورش چپ رکھا۔ ان میں سے ہر ایک کو پھر تقسیم در تقسیم دو کالموں اور ایک رزیو میں کی اور حملہ کے اشارہ کے لئے یہ تجویز ہوئی کہ تھوڑی سی سپاہ مغربی دیوار پر فصیل پر زینے لگا کے حملہ کرے اور دایاں کالم ایک برج پر اور قلعہ کی النگ پر حملہ کرے ۳، اپریل کو ۳ بجے رات کو کالموں نے چپ چاپ سفر کیا۔ چاندنی خوب

کھل رہی تھی یورش شب کے سپاہیوں نے اس خوف سے کہ ہم کو دشمن نہ دیکھ
لے کچھ دیر توقف حملہ کے مقررہ اشارے کے انتظار میں کیا۔ آخر کو حکام حملہ
نے سرگوشی کی سب نے اپنے کندھوں پر زینوں کو اٹھایا اور آگے چلے اور سپاہ
اس کے پیچھے چاندنی میں اپنی تلواروں اور سنگینوں کو چمکاتی ہوئی چلی۔ جب وہ
اس سڑک پر مڑے جو فصیل کی طرف جاتی تھی تو بگلوں کا شور مچا اور فصیل اور
برج ایسے روشن معلوم ہونے لگے کہ ان پر آتشین فرش کیا گیا ہے۔ اور گولے
اور گولیاں اوپر سے ان پر پڑنے لگے۔ باوجود اس کے وہ بڑھتے گئے اور سیپر
نے اپنے زینے لگا دیئے تو باغیوں نے اور زیادہ گولیاں مارنی شروع کیں۔ توپیں
خوب ماریں اور بان چلائے اور باجے بجائے پتھر لکڑیوں کے کندے پھینکے
درختوں کو فصیل پر سے گرایا تو کالموں نے تھوڑی دیر متزلزل ہو کر توقف کیا
اور اپنی کمین گاہ میں گئے۔ لیکن سیپر زینوں کو پکڑے ہوئے کھڑے رہے
تو حملہ کرنے والوں کے پھر اوسان درست ہوئے اور انہوں نے زینوں پر
چڑھنا شروع کیا۔ بعض زینے بہت چھوٹے تھے اور تین زینے ایسے تھے کہ
آدمیوں کے بوجھ سے ٹوٹ گئے اور بہت سے آدمی ان پر سے زمین پر گر پڑے
اس سے تھوڑی دیر کچھ رکاؤ ہوا۔ کپتان ڈک زینے پر چڑھ کر فصیل پر کود پڑے
اور لفٹننٹ ہیکل جان کود کر باغیوں کے اندر گھس گئے۔ پیچھے اور آدمی چڑھے
اور انہوں نے فصیل پر قبضہ کر لیا۔ اور صاحب مذکور قتل ہوئے۔[۱]

قلعہ فتح ہوگیا، لیکن جذبۂ آزادی؟

انگریزوں نے قلعہ فتح کر لیا، لیکن محل میں جا کر
انہوں نے محسوس کیا کہ اینٹ اور چونے کی دیواریں
فتح ہوتی ہیں، عزم جہاد اور جذبہ جنگ کو وہ فتح نہیں کر سکتے تھے۔

محل کو باغیوں نے لڑنے کے لئے تیار اور استوار کیا تھا۔ حملہ آوروں کو
گلیوں اور بازاروں میں سے ہو کر محل پر جانا پڑا تھا تو سخت لڑائی لڑنی پڑی
اور محل پر جا کر اور بھی زیادہ ہنگامہ جنگ گرم ہوا محل کی طرف بازاروں اور گلیوں

لکشمی بائی کی کٹار

کہ دونوں طرف کے مکانات جل رہے تھے اور گرمی بڑی غضب کی پڑ رہی تھی، جب حملہ آور محل کے چوک میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ ابھی مقابلہ کی ابتدا ہوئی ہے، ہر ایک کمرہ پر وحشیانہ جنگ ہوئی سنگینوں سے ایک ایک کوٹھری اور دالان سے دشمن نکالے گئے، آخر کو سارا محل فتح ہو گیا ابھی لڑائی کا خاتمہ نہیں ہوا تھا کہ دو گھنٹہ کے بعد معلوم ہوا کہ اصطبل میں پچاس سپاہی رانی کے باڈی گارڈ کے موجود ہیں، سب خوب لڑے اور مارے گئے انگریزی لشکر کو یونین جیک (علم انگریزی) ہاتھ آیا، لارڈ ولیم بینٹنگ نے رانی کے دادا کو وفاداری اور خیر خواہی کے صلہ میں دیا تھا اور اجازت دی تھی کہ اس کو آگے اپنی سواری میں رکھا کریں۔ لہ

پانچ ہزار کشتگان ستم۔

پانچویں اپریل کو سر ہیوروز نے قلعہ پر قبضہ کیا، اس لڑائی میں انگریزوں کے ۳۴۵ آدمی مجروح ہوئے جن میں ۳۶ افسر تھے اور دشمنوں کے آدمیوں کی مرنے کی تعداد پانچ ہزار شمار ہوتی ہے۔ لہ

بانہی اگرچہ رہ نہ سکے سر تو کھو سکے!

اس جنگ میں، حریت دوستوں اور آزادی کے متوالوں کو شکست ہوئی، لیکن وہ بھاگے نہیں انہوں نے پیٹھ نہیں پھیری، انہوں نے زندگی کی بھیک نہیں مانگی، بلکہ مردانہ حوصلہ کے ساتھ، غلامی کی زندگی خود اپنے ہاتھوں ختم کر لی:۔

چار سو کے قریب باغیوں نے ایک پہاڑی پر قیام کیا میجر گال نے وہاں جا کر سب کو مار ڈالا ان کے بیس آدمی بچے تھے، جنہوں نے پہاڑی پر جا کر اپنے تئیں آپ مار ڈالا انگریزوں کے ان پر حملہ کرنے میں ایک افسر اور کئی سپاہی ضائع ہوئے ایک اور گروہ پندرہ سو باغیوں کا شہر کے حوالی میں جمع تھے وہ بھی بھاگ گئے ان میں تین سو آدمی ضائع ہوئے۔ لہ

لہ تاریخ ہندوستان البغاوت ہند) ذکاءاللہ ص۱۴۵

لہ تاریخ ہندوستان (البغاوت ہند) ذکاءاللہ ص۱۴۵

لکشمی بائی کی جفاکشی اس جنگ میں رانی جھانسی لکشمی بائی نے غیر معمولی ہمت و دلیری کا مظاہرہ کیا۔ اس نے بڑی سے بڑی تکلیف و مصیبت کا مردانہ حوصلہ کے ساتھ مقابلہ کیا۔ کسی حادثہ اور مصیبت نے اس کے عزم میں تزلزل نہیں پیدا کیا:۔

۱۶-۱۷-۱۸-۱۹-۲۰ کو دونوں لشکروں میں لڑائیاں ہوتی رہیں جن کی ابتدا باغیوں کی طرف سے ہوتی تھی۔ ان سب لڑائیوں میں باغی پسپا ہوئے اور بھاگے، ان کا تعاقب ہوا۔ اس بھاگڑ میں رانی بھی ایک رات درخت کے نیچے سوئی۔ [1]

یہ لٹیرا تھا یا فاتح؟ نواب صاحب باندہ رانی جھانسی کے ساتھ تھے۔ انگریزوں کے مخالف تھے، انگریزوں نے باندہ فتح کر لیا، اچھا کیا۔ وہاں لوٹ مار کی، آئین جنگ کی رو سے یہ جائز تھا، لیکن پاس کے ایک دوست، وفادار اور نیا زمند ریاست کو لوٹ کر کیوں تاراج کیا؟ اس کا جواب زبان خاموشی ہی اب تک دیتی رہی ہے، واقعہ یہ ہے:۔

وٹ لوک صاحب کی سپاہ بڑی خوش نصیب تھی کہ ہیو روز کی جفاکشی کا سارا فائدہ باندہ کو فتح کر کے اس نے اٹھایا۔ باندہ کی ساری لوٹ وٹ لوک صاحب کے لشکر کو ہاتھ لگی اس میں کسی اور لشکر کو کوڑی نہیں ملی (کرڈوی کی دولت بھی بغیر ایک گولی چلائے وٹ لوک صاحب کو مل گئی) کرڈوی جس کو پہلے تروہا کہتے تھے باندہ سے ۴۵ میل اور الہ آباد سے ستر میل ہے۔ بس اس وقت کرڈوی کی یہ کیفیت تھی کہ اس میں نو برس کی عمر کا لڑکا مادھو راؤ راؤ تھا اور رام چندر راؤ اس کا مدارالمہام تھا جس کو گورنمنٹ انگریزی سے عداوت تھی جس کا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ کرڈوی کے راؤ امرت راؤ نے گورنمنٹ کو ۱۸۲۶ء میں دو لاکھ روپیہ چھ روپیہ سینکڑہ سالانہ سود پر اس غرض سے دیئے تھے کہ وہ اس کے سود کو بنارس کے مندروں میں خرچ کیا کرے، دس برس بعد ۱۸۳۶ء میں گورنمنٹ نے اپنے نوٹوں کا سود چار روپیہ سینکڑہ کر دیا تو کرڈوی کے راؤ

---

[1] تاریخ ہندوستان (بغاوت ہند) ذکاء اللہ ص ۱۴۹

نانک راؤ نے تین لاکھ روپیہ اور گورنمنٹ کو دے دیا کہ کل پانچ لاکھ روپیہ کا سود چار روپیہ سینکڑہ کے حساب سے بنارس کے مندروں کے خرچ کے لئے دیا کرے نانک راؤ کی زندگی میں تو تین برس تک یہ سود مندروں پر خرچ ہوتا رہا مگر اس کے مرنے کے بعد کسی وجہ سے جس کو گورنمنٹ نے عوام میں مشتہر نہیں کیا یہ سود دینا موقوف کر دیا۔ راؤ تو سات برس کا بچہ تھا۔ تو وہ اس بات کو سمجھتا نہ تھا کہ کیا ہوتا ہے مگر اس امر کی شہرت پانے سے گورنمنٹ نے مندروں کے خرچ کو ناحق بند کر دیا۔ تمام کرڑ دی کو ریاست میں رعایا کو گورنمنٹ سے نفرت ہو گی۔ بس جب غدر ہوا تو راجہ اس وقت نو برس کا تھا، وہ اس قابل ہی نہیں تھا کہ بغاوت کرتا۔ اس نے ۱۹ اپریل ۱۸۵۹ء کو جب باندہ فتح ہوا سر روبرٹ ہملٹن کو لکھا کہ میں سرکار کا خیر خواہ ہوں برٹش سپاہ کو میری راجدھانی میں بھیج دیجئے جب ورٹ لوک صاحب باندہ سے چل کر ۲ جون کو بھرت کوپ میں آئے تو راجہ ان سے آن کر ملا اور ان کو دوست سمجھ کر مبارکباد دی، راؤ تو خیر خواہ سرکار تھا۔ مگر اس کی کل رعایا بدخواہ سرکار تھی جس کی سزا راؤ کو بھگتنی پڑی ورٹ لوک صاحب ۶ جون کو کرڑ دی میں داخل ہوئے کسی نے ان کا مقابلہ نہیں کیا ایک گولی بھی نہیں چھوٹی مگر ورٹ لوک صاحب نے اس نو عمر راؤ سے ایسی مدارات کی کہ گویا وہ برسر مقابلہ آیا تھا۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ کرڑ دی میں اس قدر زر و جواہر تھے کہ ان کی طمع سے ورٹ لوک صاحب کو اپنے تئیں باز رکھنا ایسی حالت میں مشکل تھا کہ جس سپاہ نے ایسی مشقت شاقہ لڑائیوں میں کی ہے وہ اس سے متمتع نہ ہو۔ وہ اس دولت کا مستحق اس سپاہ ہی کو جانتے تھے انہوں نے راؤ کا تمام مال و اسباب پرائیز منی (انعام کا روپیہ) میں داخل کیا کرڑ دی کے راؤ کو بریلی کالج میں تحصیل علم کے لئے بھیج دیا۔[1]

لکشمی بائی کی حکمت عملی رانی لکشمی بائی کی قسمت میں شکست تھی، وہ جھانسی سے ہار کر نکلی اسے کالپی میں قدم جمانے کا موقع نہ ملا لیکن اس کی ہمت اور

[1] تاریخ ہندوستان (بغاوت ہند) ذکاء اللہ صفحہ ۱۵۳

حوصلہ کا وہی عالم تھا۔ اب اس نے گوالیار کو فتح کر لینے اور وہاں کے مرہٹوں کو ملکی اور قومی عصبیت کے نام پر برانگیختہ کر کے اور انگریزوں سے بھڑا دینے کا پروگرام بنایا اور اس میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئی مولوی ذکاء اللہ نے اس کی فراست اور حکمت عملی کو وہ بادل نخواستہ پر زور الفاظ میں سراہا ہے۔

تانتیا ٹوپے کونچ میں شکست پا کر چرکی میں گیا جو چار میل کے فاصلہ پر تھی جہاں اس کے ماں باپ رہتے تھے۔ وہ یہاں جب تک رہا۔ سر ہیو روز نے کالپی کو فتح کیا جب اس نے سنا کہ راؤ صاحب اور جھانسی کی رانی گلاڈی سے شکست پا کر گوپال پور گئے ہیں جو گوالیار سے جنوب مغرب میں ۴۶ میل ہے۔ تو وہ کمر بستہ ہو کر ان سے آملا۔ اس وقت ان سب پر بنی ہوئی تھی۔ ان کو جنوب مشرق و مغرب میں انگریزی لشکروں نے گھیر لیا تھا اور شمال میں گوالیار تھا اس کا مہاراجہ ان کا ایسا ہی دشمن تھا۔ جیسے کہ انگریز۔ رانی انگریزوں کی جانی دشمن تھی اس نازک حالت میں بھی ایک تدبیر سوجھی۔ جس سے بہتر اور کوئی تدبیر نہیں ہو سکتی تھی۔

رانی کی حکمت عملی۔ جھانسی کی رانی نے اپنے ہمراہیوں کے سامنے یہ تدبیر پیش کی کہ گوالیار کی طرف سپاہ کے ساتھ سفر کرنا چاہیئے اور سندھیا کی فوج کو مذہبی اور قومی جوش دلانا چاہیئے اور اس کے دارالسلطنت گوالیار پر بشرط ضرورت زبردستی قبضہ کرنا اور پھر اس کے قلعہ کوہ تمثال پر سے انگریزوں سے للکار کر کہنا چاہیئے کہ آئیے ہم سب سے لڑیئے۔ یہ تدبیر سب کو پسند آئی اور اس کی تعمیل فوراً ہوئی۔ گوالیار کی سپاہ کو بہکانے کے لئے جاسوس بھیجے اور پھر لشکر روانہ ہوا اور ۳۰ مئی کی رات کو مرار میں جہاں پہلے کنٹونمنٹ کی چھاؤنی تھی آن پہنچا۔ مہاراجہ سندھیا اس بات کی بڑی قدر کرتا تھا کہ سرکار انگریزی کے والا اقتدار ہونے سے وہ ایسی راحت و عافیت و امن میں رہتا ہے کہ کبھی اس کے باپ دادا کو نہیں میسر ہوا کبھی بیرونی حملہ کا خوف نہیں ہوا۔ کہ جس سے ملک میں خلل و فتور پڑنے کا اندیشہ ہوتا۔ اب انگریزوں نے دہلی اور لکھنؤ کو تسخیر کر لیا تھا۔ اور بہت سی فتوحات حاصل کی تھیں جس سے راجہ

راج محل کا پھاٹک (جھانسی)

کو یقین واثق ہو گیا تھا کہ آخر کو انگریز فتح یاب ہوں گے مگر اس کی قوم اور اس کے حالی موالی انگریزوں سے ایسے ناراض تھے کہ جب انہوں نے دیکھا کہ وہ انگریزوں کے دامن کو نہیں چھوڑتا۔ ان کے سایہ عاطفت ہی میں ہمیشہ رہنا چاہتا ہے۔ تو ان کا یہ ارادہ ہوا کہ اس کو معزول کر کے کسی اور کو گوالیار کا مہاراجہ بنائیں۔ جب مہاراجہ کے پاس خبر آئی کہ تانتیا ٹوپی اور جھانسی کی رانی اور بڑے بڑے امیر ایک لشکر عظیم کے ساتھ مرار آ گئے ہیں جس میں سات ہزار پیدل اور چار ہزار سوار اور بارہ توپیں ہیں تو وہ پہلی جون کی صبح کو مرار کے مشرق میں دو میل کے فاصلہ پر لڑنے کے لئے گیا اس کے ساتھ چھ ہزار پیدل اور پندرہ سو سوار تھے اور باڈی گارڈ چھ سو تومند سپاہیوں کا تھا اور آٹھ توپیں تھیں۔ اس سپاہ کو تین ڈویژنوں میں تقسیم کیا توپوں کو مرکز میں رکھا۔ اور دشمن کے حملہ کرنے کا منتظر ہوا۔ ۷ بجے صبح کے باغی شتری توپخانوں نے گولے مارے۔ جب توپوں کا دھواں صاف ہوا تو باغیوں کے پیادے اور دو ہزار سوار سندھیا کی توپوں کو چھین کر لے گئے۔ سوا مہاراجہ کے باڈی گارڈ کے سب پیدل اور سوار یا تو باغیوں سے جا ملے یا ایسے مقام پر جا کھڑے ہوئے کہ جس سے معلوم ہو کہ وہ اب لڑنے کے نہیں۔

مہاراجہ گوالیار کا فرار۔ پھر باغیوں کے سواروں نے مہاراجہ کے باڈی گارڈ پر حملہ کیا جن کے ساتھ سندھیا تھا۔ باڈی گارڈ کے بعض سپاہی بڑی بہادری سے لڑے اور جب تک ان کے بہت سے آدمی مارے نہیں گئے وہ لڑتے رہے۔ اب سندھیا نے دیکھا کہ لڑنے سے کچھ فائدہ نہیں تو وہ گھوڑے پر سوار یکشٹ آگرہ کو بھاگا۔ کہیں گھوڑے کی باگ کو روکا نہیں۔

گوالیار پر باغی کا قبضہ۔ باغی گوالیار میں داخل ہوئے قلعہ اور خزانہ زر و جواہر سے، اسلحہ خانہ سب قسم کے ہتھیاروں سے اور شہر دولت مندوں سے معمور تھا۔ یہ سب ان کے ہاتھ آیا۔ اب انھوں نے اپنی باقاعدہ گورنمنٹ قائم کی۔ نانا نے پیشوا ہونے کا اشتہار دیا اور راؤ صاحب کو گوالیار کا

گورنر مقرر کیا۔ گوالیار کی سپاہ کو اور کالپی سے جو سپاہ آئی تھی اس کو بخشش
اور انعامات تقسیم کئے۔ رام راؤ گوبند جن کو سندھیا نے اپنے اہل دربار
میں سے نہایت ذلیل کیا تھا اس کو وزیر اول مقرر کیا۔ مہاراجہ کا سارا [illegible] اسباب
ضبط کر لیا۔ چار بڑے سردار جن کو بغاوت کے جرم میں سندھیا نے مقید
کیا تھا، چھوڑ دئیے گئے اور ان کو خلعت دئیے گئے اور ان کو اضلاع میں بھیجا
کہ وہ سپاہ کو بھرتی کریں، چنبل پر انگریزوں کا ایسا مقابلہ کریں کہ وہ اس سے
اترنے نہ پائیں۔ شہر کے باہر جو سپاہ تھی، وہ جھانسی کی رانی کے زیر فرمان آئی
اور جو شہر کے اندر تھی وہ تانتیا ٹوپے کے حوالہ ہوئی کہ اس کے احکام کی
اطاعت کرے۔ اضلاع میں سرکش راجاؤں کے نام جن میں زیادہ سر بر آوردہ
بان پور اور شاہ گڑھ کے راجہ تھے خطوط جاری ہوئے کہ وہ گوالیار میں آکر
نئی گورنمنٹ میں شامل ہوں۔

انگریزوں کی تلملاہٹ - ۲۵/ نومبر کو سر ہیو روز نے کرنیل روبرٹس
کو ایک چھوٹا سا کالم دے کر جنوب مغرب میں ان باغیوں کے تعاقب میں
بھیجا تھا جو کالپی سے بھاگے تھے۔ چوتھی جون کو سر ہیو روز کے پاس خبر آئی
کہ گوالیار پر باغیوں نے قبضہ کر لیا ہے۔ انہوں نے سٹورٹ صاحب کو
پہلے بریگیڈ کی کچھ سپاہ کے ساتھ روبرٹس کی مدد کو بھیجا۔ سر ہیو روز نے اس واقعہ
کے سب پہلوؤں پر غور کر کے کسی خوف و اندیشہ کا خیال نہیں کیا اور گوالیار
کو دوبارہ فتح کرنے کا عزم مصمم کیا۔[1]

لکشمی بائی اپنی آن پر مر گئی

گوالیار کی فتح رانی کو راس نہ آئی۔ سندھیا انگریزوں کی
پناہ میں پہنچ گیا، اس کے آدمی ہیو روز کی رہبری
کے لئے آن موجود ہوئے۔ مراد آباد چھاؤنی پر انگریزوں اور انقلاب پسندوں کی آخری اور فیصلہ
کن جنگ ہوئی۔ اس جنگ میں انگریز جیت گئے۔ رانی ہار گئی۔ لیکن رانی نے ہار کر حیات ابدی
حاصل کر لی اور انگریزوں نے جیت کر ہمیشہ کے لئے اپنے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ لگوا لیا۔

---

[1] ... ہندوستان ... ص ۵۷

ہیوروز نے وٹ لوک صاحب کو کالپی کی حفاظت پر متعین کیا اور خود اپنے قدیمی بریگیڈ کو جن کے سردار سٹورٹ صاحب اور پے میر صاحب تھے ساتھ لے کر روانہ ہوئے۔ یہ سپاہ ۱۶ جون کو ایسے مقام پر آئی کہ مرار پانچ میل کے فاصلے پر تھا، سواروں نے دشمن کے مقامات تحقیق کر کے اسے اطلاع دی کہ فوراً دشمنوں کی لینوں پر کامیاب حملہ ہوا پہلے اس سے کہ باغیوں کی کمک اور مقامات سے پہنچنے پائے چھاونی کے محافظین کو پیچھے ہٹادیا اور درمیانی میدانوں میں شکار کر کے شہر میں بھگا دیا۔ سر ہیوروز سمتھ کے لشکر کے ساتھ تھے جو جنوب مشرق کی جانب سے دشمن کے مقامات پر حملہ کرتا ہوا چلا آیا تھا۔

۱۷ جون کی شام کو اس افسر نے راہ میں لڑائی لڑ کر کئی توپیں بعض ان بلندیوں تک لے لیں جو لشکر کے اوپر تھیں۔ دوسرے دن انہوں نے پہاڑیوں کے بلال پر قبضہ کر لیا جو جنوب کی طرف سے گوالیار کے آنے میں سدراہ تھی۔

جب ہیوروز نے مرار پر یورش کر کے اس کو لے لیا۔ بعض باغی خشک نالہ میں جو ایک گاؤں کے گرد تھا بھاگ کر گئے۔ اکہترویں ہائی لینڈرس نے ان میں سے ایک آدمی کو زندہ نہیں چھوڑا۔ باقی اور باغی بھاگ گئے اس کا چودھویں ڈریگون نے شکار کیا۔ اب سر ہیوروز مرار کے بالکل مالک تھے جس کے سبب سے آگرہ کی سڑک پر وہ حکمران ہو گئے۔ اور سمتھ صاحب کے ساتھ ان کی آمدورفت کی راہ کھل گئی۔

جھانسی کی رانی بھی جو بڑی مستقل مزاج تھی اور باغیوں کے ساتھ میدان جنگ میں اور صلاح اور مشورہ کی محفل میں روح رواں تھی مردانہ لباس پہنے ہوئے گھوڑے پر سوار تھی وہ سارے دن اپنی سپاہ کو لڑنے کے لئے تازہ دم کرتی رہی۔ جب انگریزوں نے گھاٹی میں ایک ایک چپہ لے لیا اور سمتھ صاحب پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ گئے تو انہوں نے حصار سے حملہ کرنے کا حکم دیا۔ رانی جھانسی نے بہادرانہ انگریزی سواروں کا مقابلہ کیا۔ جب اس کے ہمراہی بھاگ گئے۔ تو رانی نے ہر چند اپنے گھوڑے کو روکا مگر وہ نہ رکا اور گھوڑوں کے ساتھ بھاگا اور چھاونی کے قریب نہر کے پار جانے میں اس کا گھوڑا اڑ گیا۔ رانی کو ایک سوار

نے مار ڈالا۔ اس نے یہ نہیں جانا کہ یہ بڑے رتبہ کی عورت ہے۔ بس وہ ایسی گری کہ پھر نہ اٹھی۔ اس کے ہمراہیوں نے یہ سمجھ کر کہ اس کا مردہ بھی انگریزوں کے ہاتھوں میں نہ پڑے اس کی لاش کو جلا دیا۔ [1]

حریف مقابل کا خراج تحسین

جواہر لال نے اپنی تاریخ میں، رانی جھانسی کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے:۔

"ایک ہستی ان سب (انقلاب پسندوں) میں ممتاز نظر آتی ہے اور آج بھی عوام اس کا نام عزت اور احترام سے لیتے ہیں، یعنی جھانسی کی رانی لکشمی بائی، یہ ایک بیس سال کی لڑکی تھی، جو میدان جنگ میں دشمن کا مقابلہ کرتی ہوئی ماری گئی، اس انگریز جنرل نے جو اس کا حریف تھا، یہ اعتراف کیا ہے کہ

"وہ باغی لیڈروں میں سب سے بہتر اور سب سے زیادہ بہادر تھی"۔ [2]

جھانسی کی رانی اور مسلمان

جھانسی کی رانی لکشمی بائی نے جس عزیمت واستقامت اور ثبات واستقلال کے ساتھ انگریزوں سے جنگ جاری رکھی، وہ تاریخ کا ایک ناقابل فراموش صفحہ ہے۔ لیکن یہ حقیقت بھی فراموش نہیں کی جا سکتی کہ اس جنگ میں جس وفاداری اور جانبازی کا مسلمانوں نے مظاہرہ کیا اس کی مثال بھی نہیں مل سکتی۔

(۱) ذکاء اللہ کی تاریخ میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ جب رانی نے میدان جنگ میں قدم رکھا تو مسلمان "ملاؤں نے اس کے لئے دعائیں کیں"

ساحا کرنے اپنی تاریخ بغاوت ہند میں بتایا ہے کہ

(۲) کالے خاں رسالدار، محمد حسین تحصیلدار، حکیم صالح محمد وغیرہ انگریزوں کے خلاف سراپا جوش وعمل بنے ہوئے تھے۔

(۳) بندیل کھنڈ کی ریاست اورچھا کے راناصاحب اپنے جنرل نتھے خاں کی سرکردگی میں جھانسی پر چڑھ آئے، لیکن ان نتھے خان کا کس بل، رانی کے میر آتش، غوث محمد خاں نے نکال دیا اور یادگار شکست دی۔

---

[1] تاریخ ہندوستان (بغاوت ہند) ذکاء اللہ ص۵۸

[2] DISCOVERY OF INDIA

سن ستاون کی آزادی کے غدار گوالیار کے دیوان
ون کر راؤ راجواڑے

(۴) جھانسی کے محاصرہ کے وقت انگریزوں نے توپوں سے انقلابیوں کے حوصلے پست کر دیئے توپوں کا جواب خاموشی سے دیا جانے لگا۔ مگر غوث محمد خاں اپنے مغربی دروازے کی طرف سے برابر توپیں چلا رہا تھا۔ اس توپ زنی میں انگریزوں کو اپنے ایک بہترین توپچی سے ہاتھ دھونا پڑا۔ رانی اس کارنامہ سے اتنی خوش ہوئی کہ اپنی پازیب انعام میں بخش دی

(۵) غوث محمد خاں اور خدا بخش خاں پر رانی سب سے زیادہ بھروسہ کرتی رہی، اور ان دونوں نے بھی اپنی جان نثار کر کے حق وفا ادا کیا۔

(۶) ایک انگریز مورخ ہمیں بتاتا ہے کہ جب رانی حالات سے مجبور ہو کر جھانسی سے نکلی تو تین سو افغانی سپاہی اسے اپنے جھرمٹ میں لئے ہوئے تھے۔

اس واقعہ سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں، ایک یہ کہ مسلمان جنگ آزادی میں ہر جگہ پیش پیش رہے، دوسرے یہ کہ جن ہندو اکابر نے اس جنگ میں حصہ لیا انہوں نے بھی ہر طرح کے تعصب کو بالائے طاق رکھ کر مسلمانوں کے تعاون، وفاداری اور انسانیت پر پورا پورا بھروسہ کیا آج کی سی صورت نہ تھی کہ سیکولر حکومت ہو اور مسلمانوں پر سول اور فوجی ملازمتوں کے دروازے بند کر دیئے جائیں۔

---

(۱۴)

محمود خاں

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں جن لوگوں نے مردانہ وار حصہ لیا، کارہائے نمایاں انجام دیئے اور اپنی معرکہ آرائیوں سے ایوان فرنگ میں تزلزل برپا کر دیا، ان میں نواب محمود خاں کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

دنیا کو تاریخ کا فن مسلمانوں نے دیا تھا لیکن جب وہ انحطاط و ادبار سے دوچار ہوئے تو دوسری چیزوں کی طرح اس فن کو بھی بھول گئے، کتنی عجیب بات ہے اس جنگ میں

جن غیر مسلموں نے معمولی حصہ لیا تھا آج ان پر ہزاروں صفحات کی کتابیں دستیاب ہو سکتی ہیں۔ لیکن جن مسلمانوں نے استقلال و عزیمت کے ساتھ یہ جنگ لڑی، ان کے حالات کہیں نہیں ملتے۔

گزشتہ سال ڈیڑھ سال کی مدت میں غدر اور کارفرمایان غدر پر کئی کتابیں بازار میں آچکی ہیں۔ لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ جن اصحاب ہم نے ۱۸۵۷ء کے "غازیوں اور مجاہدوں" پر خامہ فرسائی ہے، ان کی بے مائگی کا بھی یہ عالم ہے کہ چند پیش پا افتادہ کتابوں سے آگے نہیں بڑھ سکے ہیں۔ محمود خاں کے بارے میں تو ان کی بے مائگی خاص طور پر قابل رحم ہے، حالی کی حیات جاوید تو مل گئی، جس سے اخذ و اقتباس کر لیا۔ لیکن سر سید کی لکھی ہوئی تاریخ سرکشی بجنور نہ مل سکی، حالی نے جو کچھ لکھا ہے، سر سید کی مدافعت میں لکھا ہے۔ لہٰذا تاریخی نقطۂ نظر سے وہ زیادہ مستند نہیں، خود سر سید نے جو کچھ لکھا ہے۔ وہ مستند بھی ہے اور عبرت انگیز بھی۔

سر سید انگریزوں کے بہی خواہ تھے اور یقیناً ان کا یہ طرز عمل ذاتی اغراض پر مبنی نہیں تھا لیکن انہوں نے اپنی کتاب میں محمود خاں وغیرہ پر جو کچھ لکھا ہے اس کا انداز بیان اور طرز تحریر حد درجہ پست اور رکیک ہے، انہوں نے محمود خاں کو ہر جگہ "نا محمود خاں" لکھا ہے، اسے گالیاں تک دی ہیں اور شاید پھر بھی دل کے جلے پھپھولے نہیں پھوٹ سکے ہیں۔

ذیل میں ہم نواب محمود خاں کے حالات مختصر طور پر لکھتے ہیں، ماخذ کے طور پر ہم نے سر سید کی کتاب سرکشی بجنور سے اور مولانا شہابی کی کتاب ۱۸۵۷ء کے ہیرو، سے مدد لی ہے

ابتدائی حالات محمود خان نجیب الطرفین یوسف زئی روہیلہ پٹھان تھے۔ نواب سعین الدین عرف بھنو خاں ابن نواب ضابطہ خاں ابن نواب نجیب الدولہ کے لڑکے تھے، نجیب آباد ضلع بجنور کی کوٹھی مبارک محل میں پیدا ہوئے اس محل اور نواب کی دوسری عمارتوں کے بارے میں مصنف نجیب التواریخ رقم طراز ہیں:-

"راقم نے قبل از غدر جب کہ میری عمر ۱۶ برس کی تھی سیر قلعہ اور مہتاب باغ کی تھی اور جس احاطہ میں تحصیل نجیب آباد اور تھانہ پولیس واقع ہے۔ وہ محل سرائے نواب کی تھی، دروازہ نہایت عجیب اور باشوکت تھا، باغ میں ایک مکان مچھی بھون تھا۔ ایام گرما میں اس کی چھت سے باریک بوندیں بارش کی سی برساتی جاتی تھیں

نواب بھنو خان نے محمود خاں کی تعلیم و تربیت کا معقول انتظام کیا۔ جب سن شعور کو پہنچے تو علاقے کا انتظام ان کے سپرد کر دیا۔

نواب محمود خاں فیاض اور فضول خرچ تھے داد و دہش کے باعث ہمیشہ مقروض رہتے یہاں تک کہ ۱۸۴۶ء میں اپنی کثیر جائیداد نواب محمد سعید خاں بہادر والئے رام پور کے پاس مرہون کر دی۔

نواب محمود خاں نہایت خوش طبع یار باش اور مہمان نواز تھے، سپاہیانہ مزاج رکھتے تھے، شکار کا بہت شوق تھا۔ اکثر اوقات اسی شغل میں بسر ہوتا تھا، گولی کا نشانہ خوب لگاتے۔

محمود خاں میدان عمل میں

ہندوستان میں غدر شروع ہوا تو ہر طرف آگ لگ گئی، اودھ کی حالت سب سے زیادہ نازک تھا۔ یہاں کے لوگ بڑی جیداری سے لڑے مرادآباد میں جب ہنگامہ آرائیاں شروع ہوئیں اور بریلی میں بہادر خاں نے اپنی حکومت کا اعلان کر دیا تو نجیب آباد میں بھی محمدی جھنڈا بلند ہوا اور یہاں بھی آزادی کی جنگ شروع ہو گئی، کلکٹر مسٹر شیکسپیئر، سرسید اور رحمت علی کو، جو علی الترتیب صدر امین اور ڈپٹی کلکٹر تھے، محمود خاں کے سپرد کر کے بھاگ کھڑے ہوئے اس لئے کہ وہ دیکھ رہے تھے کہ اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہے کہ محمود خاں کی سربراہی تسلیم کر لی جائے، چنانچہ محمود خاں نے خزانہ پر قبضہ کیا اور ۵۔ جون ۱۸۵۷ء کو اپنی فرماں روائی کا اعلان کر دیا۔

سرسید اور ڈپٹی رحمت خاں نے انگریزوں سے حق وفا ادا کیا اور خفیہ و علانیہ، ایسی سرگرمیاں جاری رکھیں جن سے انگریزوں نے پورا فائدہ اٹھایا اور محمود خاں کی حکومت قائم نہ رہ سکی، محمود خاں کی شرافت کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہوگا کہ اس نے امکان و استطاعت کے باوجود سرسید وغیرہ کو کسی طرح کا گزند نہیں پہنچایا، ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ سرسید کی نیت نیک تھی، ہمیں یہ بھی تسلیم ہے کہ سرسید کی وجہ سے انفرادی طور پر مسلمانوں کو انگریزوں کے دوبارہ تسلط کے بعد، کم نقصان پہنچا۔ لیکن ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ مسلمانوں کے اجتماعی اور ملی مفاد کو ان کی نیک نیتی کے باوجود بہت زیادہ نقصان پہنچا۔

ایک مستند بیان

ذیل میں ہم مولوی ذکاء اللہ کا ایک بیان درج کرتے ہیں جس کے مستند ہونے میں شبہ نہیں، ذکاء اللہ صاحب کے اس بیان سے کئی امور پر روشنی پڑتی ہے، جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

مسلمانوں کو مروا دیا مسلمانوں کو ذبح کروا دیا۔ اب ہم تم کو نہ چھوڑیں گے"۔

محمود خاں کا حسن سلوک ہندوؤں سے لیکن اس اشتعال انگیز روش کے باوجود محمود خاں کا حسن سلوک ہندوؤں سے برابر جاری تھا۔

محمود خاں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات خوشگوار رکھنے کے لئے جو دھرپال کی جاٹ پر بدستور سابق پدرانہ شفقت جاری رکھی کہ احمد اللہ خاں نے مندروں پر پہرے لگوا دیئے تاکہ کوئی مسلمان ان کو گزند نہ پہنچائے، جس سے آپس میں جھگڑے کی صورت پیدا ہو۔[1]

آخر کیوں نہ ہو یہ لوگ نواب نجیب الدولہ جیسی پر عظمت شخصیت کے نام لیوا تھے جس کے بارے میں مولانا اکبر شاہ خاں نے لکھا ہے:۔

"نواب نجیب الدولہ نے نجیب آباد کے بازار خاص میں کوئی مسجد تعمیر نہ کی کہ مبادا ہندو دکانداروں کو تکلیف ہو۔ نیز جب ان کی والدہ کا انتقال ہوا تو قبر کے لئے جو جگہ تجویز ہوئی وہ ایک ہندو جاٹ کی ملکیت تھی۔ اس نے انکار کر دیا تو دوسری جگہ تجویز ہوئی۔ وہ ایک ہندو جاٹ کی ملکیت تھی۔ اس طرح معلوم ہوا کہ تمام حوالی ہندوؤں کو عطا کئے ہوئے ہیں۔ مجبور ہو کر نواب نے کہا کہ چلو جنازہ مانیٹر پہ لے چلیں۔ آخر ایک ہندو کو رحم آیا اور اس نے اجازت دی کہ مقبرہ اس کی زمین پر بنایا جائے۔"

انگریزوں کی چڑھائی مارچ ۱۸۵۸ء میں اودھ کا سب سے بڑا محاذ آزادی سر کرنے کے بعد انگریزوں نے اطمینان کے ساتھ نجیب آباد کے خلاف اقدام کیا۔ مصنف بجنور گزیٹر لکھتا ہے۔

"لکھنؤ کی فتح کے بعد کرنیل کیمبل رڑکی اور روہیل کھنڈ کی طرف بڑھا یہ فوج مسٹر جانسن کے ماتحت تھی۔ ۱۵ اپریل کو اس فوج نے ہردوار پر قبضہ کیا پھر گنگا کو عبور کر کے ناگل کی طرف بڑھی، تاکہ دشمن کا جو کہ جنگل میں

---

[1] ۱۸۵۷ء کے ہیرو (شہابی)

[2] ۱۸۵۷ء کے ہیرو (شہابی)

مضبوط حالت میں تھا مقابلہ کرے، چار میل چلنے کے بعد ایک بڑی تعداد سے مقابلہ ہوا "

انگریزوں کا سفاکانہ رویہ۔ سرسید لکھتے ہیں۔

"شیو پرشاد نے خبر دی کہ نواب کی فوج اندر ہے۔ ڈائمنڈ صاحب نے نہر پر کھڑے ہو کر دور بین سے دیکھا اور حکم دیا کہ نہر کا پانی چھوڑ دیا جائے اس حکمت سے دشمن کو موت نے جنگل میں پکڑ لیا۔ بیسیوں پانی میں ڈوب گئے اور باقی جو پانی کے بیچ میں کھڑے تھے یا کنارے پر تھے، سب کو مار دیا گیا۔ نہر ایجنٹ شیو پرشاد کو سو روپیہ انعام ملے "

شکست نجیب آبادی فوج کو غیر متوقع طریقے پر ہزیمت ہوئی۔ نیز تمام اقطاع ملک ایسٹ انڈیا کمپنی کی گرفت میں آجانے سے محمود خاں سخت بد حواس ہو گئے اور انہوں نے اندازہ لگایا کہ اب آزادی ملک و ملت کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکے گا۔ جائے پناہ عبث جان کر جنرل محمود نے اپنے آپ کو انگریزی فوج کے حوالے کر دیا۔

کالے پانی کی سزا حب الوطنی کے جرم میں کالے پانی کی سزا ہوئی لیکن اس پر عملدرآمد کی ہنوز نوبت نہ آئی تھی کہ انہوں نے آخرت کے لئے رخت سفر باندھ لیا جیل خانہ ہی میں انتقال فرمایا۔

جنرل صاحب کے اوصاف حمیدہ کا آج تک روہیل کھنڈ میں اعتراف کیا جاتا ہے حد درجہ دلیر اور بہادر ہونے کے باوجود لاغر اندام اور متوسط القد تھے، غلامی کی پہلی بڑی بنگال اور آخری نجیب آباد نے پہنی بہادر شاہ پر مغلیہ خاندان کا خاتمہ ہوا اور محمود خاں پر آزادی روہیل کھنڈ کا[2]

سرسید کی گالیاں سرسید جب محمود خاں اور بہادر خاں، فرماں روایان نجیب آباد و بریلی کا ذکر کرتے ہیں تو ان کے سب و شتم کا اندازہ کیا ہوتا ہے ملاحظہ کیجئے:۔

۷ رجون ۱۸۵۷ء کو چودھری پرتاب سنگھ رئیس تاجپور کے پاس مفصل

---

[1] سرکشی بجنور (سرسید)

[2] غدر ۱۸۵۷ء کے ہیرو ص ۱۰۹

خطوط حالات بگڑنے بریلی اور مراد آباد کے آگئے اور بہادر خاں کی بے ایمانی اور نمک حرامی کی بھی مفصل خبر آگئی اور انہوں نے وہ سب خط جناب صاحب کلکٹر بہادر کو دکھا دیئے اور کمبخت نا محمود خاں کو بھی بدذات خاں بہادر کی خبر مل چکی تھی اور در حقیقت اسی خبر سے اس نے پکا ارادہ کر لیا تھا کہ بہادر خاں کی پیروی کرے اور رات کا وقت اپنا ارادہ پورا کرنے کا ٹھہرا چکا تھا۔ مگر اس وقت ہم کو اس بدذات کے ارادے کی خبر نہیں ملی تھی صرف اتنی بات ہوئی تھی کہ جب نامحمود خان آیا تو جناب صاحب کلکٹر بہادر نے دو دفعہ اس کمبخت کو بلایا اور وہ نہ گیا اور جب گیا تو اس کی بات چیت میں خود جناب صاحب کلکٹر بہادر نے بے رخی دیکھی اور اس کی پیشانی پر اس کے دلی ارادہ کا اثر پایا۔ رات کو آٹھ بجے محمد سعید خاں محرر کلکٹری ساکن نجیب آباد نے مجھے خبر دی کہ محمود خاں کا ارادہ آج رات فساد کرنے کا ہے کیونکہ اس بات کے سننے سے کہ صاحب کلکٹر بہادر خزانہ جلد روانہ بھیجتے تھے۔ نہایت برہم ہے کچھ عجب نہیں کہ رات کو کشت و خون ہو جائے میں نے محمد سعید خاں سے کہا کہ تم ابھی جاؤ اور تدبیر کرو کہ فساد نہ ہو اور خود اور دلی محمد کی معرفت میری طرف سے نواب کی خاطر جمع کر دو کہ خزانہ جلد روانہ نہیں جانے کا اور نہ وہاں بھیج دینے کی صلاح ٹھہری ہے اس وقت میں نے سعد اللہ خاں کو بلایا اور اس کو بہت سمجھایا کہ تم فساد کو روکو اور نواب کو سمجھاؤ اور کہہ دو کہ اگر بالفرض خدانخواستہ دو انگریز مارے بھی جاویں گے تو کیا فائدہ ہوگا اور بدنامی اور نمک حرامی جدا ہوگی اور خدا کے یہاں جدا منہ کالا ہوگا اور اس بات کا میں بھی ذمہ وار ہوں کہ خزانہ جلد روانہ نہیں جانے کا اور جناب صاحب کلکٹر بہادر کوئی ایسی بات نہیں کریں گے جس سے نواب صاحب کی سرداری اور اعتبار پر دوسرے کو ترجیح ہو پھر فساد کرنے اور بدنامی اٹھانے اور خونریزی ہونے سے کیا فائدہ ہے۔"[1]

---

[1] سرکشی بجنور (سرسید احمد خاں)

شری نانا صاحب سن ستاون کی جنگ آزادی کے رہنما اور چھتر پتی
مہاراج شیواجی کے جانشین

(۱۳)

ناناصاحب

آخری پیشوا باجی راؤ کو انگریزوں نے میدان جنگ میں شکست نہیں دی تھی۔ الفنسٹن صاحب نے اپنی تاریخ میں تسلیم کیا ہے کہ اگر باجی راؤ جنگ جاری رکھنا چاہتا تو ہمیں غیر معمولی مصیبتوں اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا، لیکن جیسا ہر زوال پذیر خاندان میں ہوتا ہے باجی راؤ عافیت پسند ہو گیا تھا۔ وہ جنگ کے میدان میں نہیں ہارا۔ لیکن حوصلہ ہار گیا ہمت ہار گیا۔ انگریزوں نے آٹھ لاکھ روپے سالانہ اس کا وظیفہ مقرر کر دیا اور اپنے حوالیوں موالیوں کے ساتھ کان پور کے قریب بٹھور میں امن و آسائش کی زندگی بسر کرنے لگا۔ نہ فکر امروز نہ غم فردا، عیش کی زندگی بسر کرتا تھا۔ اور انگریزوں کے گیت گاتا تھا۔ جب بھی انگریزوں پر کوئی بپتا پڑی وہ تن من دھن سے ان کی مدد کرنے کو تیار ہو گیا۔ افغانوں سے جنگ کے وقت بھی۔ اور سکھوں سے لڑائی کے وقت بھی۔

کئی شادیوں کے باوجود، باجی راؤ لاولد رہا۔ آخر اس نے ایک برہمن لڑکے نانا راؤ کو اپنا متبنیٰ بنا لیا۔ ۱۸۵۱ء میں وہ مر گیا۔ گورنر جنرل نے جس طرح راجہ جھانسی کا متبنیٰ تسلیم نہیں کیا تھا اسی طرح باجی راؤ کا متبنیٰ بھی تسلیم نہیں کیا اور وظیفہ بند کر دیا۔ رانی جھانسی کی طرح نانا نے عرض و معروض، التجا اور عرضداشت، سفارت اور وکالت سے کام نکالنا چاہا۔ لیکن یہاں معاملہ وہ تھا کہ

کام اس سے آپڑا ہے کہ جس کا جہاں میں
لیوے نہ کوئی نام ستمگر کہے بغیر!

ہر التجا سنی کی ان سنی کر دی گئی۔

۱۸۵۷ء میں جب جنگ آزادی شروع ہوئی تو نانا کو خداداد موقعہ قسمت آزمائی کا مل گیا۔ طبعاً وہ جنگ جو اور مرد میدان نہیں تھا۔ لیکن حالات نے اسے تلوار سنبھالنے پر مجبور

کر دیا۔ عظیم اللہ، جوالا پرشاد، تانتیا ٹوپے وغیرہ اس کے دست راست تھے، انہوں نے اور زیادہ اکسایا۔ آخروہ تخت یا تختہ کہہ کر میدان میں کود پڑا۔

وسط مئی میں کان پور میں ہلچل پیدا ہوئی، جون کے آغاز میں یہ ہلچل شورش اور ہنگامہ کی صورت میں تبدیل ہوگئی۔ ۲۵ جون کو انگریزی تسلط سے کان پور آزاد ہوگیا۔ یکم جولائی کو نانا صاحب نے فرماں روائی کے اختیارات اپنے ہاتھوں میں لے لئے۔

انقلابیوں کے خفیہ جلسے نانا صاحب کے برسر اقتدار آنے سے کافی پہلے، کان پور کے انقلاب پسند انگریزوں کو نکالنے اور قومی حکومت قائم کرنے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ ساورکر کہتا ہے۔

"انقلاب پسندوں کے جلسے بالعموم صوبیدار ٹکا سنگھ اور سپاہی شمس الدین خاں کے مکان پر ہوتے تھے ۔۔۔ جس دن انقلاب کی تاریخ کا فیصلہ ہوا اس سے دو دن پہلے شمس الدین نے اپنی محبوبہ عزیزن کو بتایا کہ جنگ شروع ہونے والی ہے۔ عزیزن ایک نوجوان لڑکی تھی، ناچنا گانا اس کا پیشہ تھا ۔۔۔ سب سپاہی اس پر جان نثار کرتے تھے، لیکن وہ دولت کے لئے اپنا حسن نہیں بیچتی تھی، ان سپاہیوں پر فدا تھی جن کے دلوں میں حب وطن کی آگ بھڑک رہی تھی۔"

انگریزوں کا بے محابا قتل کان پور میں انگریزی حکومت اٹھ جانے کے بعد جو انگریز اپنے حصار میں بند تھے، ان کی حالت بہت نازک تھی، نہ وہ جنگ جاری رکھ سکتے تھے، نہ اطمینان و عافیت کی زندگی بسر کر سکتے تھے، نہ ان کے پاس سامان خورد و نوش تھا، نہ فوج اور سپاہی، عظیم اللہ خاں نے نانا صاحب کی طرف سے ان انگریزوں کو یہ تحریر دی کہ:-

"جو لوگ اپنے ہتھیار رکھ دیں گے وہ صحیح سالم الہ آباد پہنچا دیئے جائیں گے"[۱]

کافی ذہنی کشمکش اور تامل کے بعد، انگریزوں نے یہ پیش کش قبول کر لی کیونکہ عورتوں اور بچوں کو بچانے کی اس کے سوا کوئی تدبیر نہیں تھی۔ مسٹر ٹوڈ جو نانا کے استاد تھے، خود صلح نامہ لے

---

[۱] تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) ص ۵۳۱

کرناناکے پاس گئے، وہ اخلاق وتپاک سے پیش آیا اور دستخط کردیئے۔

مولوی ذکاء اللہ نے اس سانحہ کا ذکر اپنی تاریخ میں بڑی تفصیل سے کیا ہے۔ ہم انہی کے الفاظ میں خلاصہ درج کرتے ہیں۔

"صبح کو عورتیں اور بچے اور سپاہی نکلے۔ ان کی شکلوں پر مردنی چھائی ہوئی تھی، وہ بڑے لاغر اور ناتواں ہوگئے تھے۔ لباس ان کا پھٹا ہوا تھا۔ فاقوں کے مارے خستہ اور شکستہ حال تھے۔ بعض زخمی تھے جہاں سے یہ گروہ چلا تھا وہاں سے دریا ایک میل تھا۔ مگر ان مصیبت زدوں کے لئے تو یہ ایک میل کا سفر بھی سقر سے کچھ کم نہ تھا۔ اکثر زخمی پالکیوں میں سوار تھے عورتیں اور بچے بیلوں کی گاڑیوں میں سوار تھے یا ہاتھیوں پر، توانا آدمی پیدل تھے کشتیاں دریا میں تیار تھیں۔ گرمی کے موسم میں دریا اترا ہوا تھا۔ اس لئے کنارہ سے فاصلہ پر تھیں جن میں سوار ہونے کے لئے پایاب پانی میں ہو کر جانا پڑتا تھا۔ نو بجے تھے کہ سب کشتیوں میں بیٹھ گئے۔ سارے اسباب خونریزی کے لئے تیار تھے۔ تانتیا ٹوپے نے اس قتل عام کا اہتمام اپنے ذمہ لیا تھا۔ عظیم اللہ اور ناناکے بھائی اور ٹیکا سنگھ اور بڑے بڑے آدمی موجود تھے اور ضلع کے بہت سے زمیندار اور شہر کے بہت سے آدمی تماشا دیکھنے کے لئے جمع ہوگئے تھے۔ ان میں اکثر آدمی جانتے تھے کہ کیا ہونے والا ہے اور شاید وہ انگریزوں کی اس تذلیل سے خوش ہورہے تھے۔ غرض ایک میلے کی سی خوشی و گہما گہمی ہورہی تھی سواروں اور پیدلوں نے اشارے کے ہوتے ہی ذبح کرنا شروع کردیا۔

فرنگی کشتیوں میں بیٹھے ہی تھے کہ ایک بگل کی آواز سنائی دی، ہندوستانی ملاح کشتیوں میں سوار ہوئے۔ ان کو دریا کے کنارے کی طرف کھینچنے لگے۔ پھر توپوں کے گراپ اور بندوقوں کی گولیاں دریا کے دونوں طرف کے کناروں سے مسافروں پر چلنے لگیں اور چھپروں کے چھپروں میں آگ لگادی گئی کہ ان سے شعلے اٹھنے لگے۔ اور آگ پھیلنی شروع ہوئی۔ زخمی اور بیمار جل کر خاکستر ہوگئے یا دھوئیں سے ان کا دم ایسا گھٹا کہ دم نکل گیا۔ طاقتور عورتیں بچوں کو اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے دریا میں کود پڑیں تو ان پر گولیاں چلائی گئیں، سوار ان کے پیچھے

دوڑنے لگے اور تلواروں سے ان کو مار ڈالا یا قید کر لیا تاکہ اور زیادہ تکلیف پہنچا کر قتل کریں۔

ہولناک انتقام

نانا اور اس کے ساتھیوں نے، انگریزوں پر جو ظلم و ستم توڑے، ان کی تعریف نہیں کی جا سکتی۔ انہیں حق بجانب نہیں ثابت کیا جا سکتا لیکن نانا صاحب کی شکست کے بعد، جب انگریزوں کا پھر سے تسلط ہوا۔ تو کہیں زیادہ ہولناک انتقام انہوں نے لیا۔ یہ داستان بھی سننے کے قابل ہے۔

"نیل صاحب لکھتے ہیں کہ جب میں کان پور میں آیا تو پہلے بی بی گڑھ گیا۔ وہاں لیڈیوں کے اور بچوں کے کپڑے اور جوتیاں خون آلودہ نظر آئیں، ان کی چوٹیاں نچی ہوئی پڑی تھیں جس کمرہ میں سب اکٹھا کر کے قتل کئے گئے تھے اس کا فرش خون سے تر بتر تھا۔

میں یہ چاہتا ہوں کہ ہندوستانیوں کو ایسی سخت سزا دوں کہ وہ بھی یاد رکھیں کہ ایسے کاموں کا یہ برا نتیجہ ہوتا ہے۔ میں نے ۲۵ جولائی ۱۸۵۷ء کو حکم دیا کہ گورے اس کنویں کو قبر کی صورت بنا دیں۔ جس میں بدذات نانا نے انگریزوں کی لاشیں ڈلوائی تھیں۔ جس گھر میں وہ قتل ہوئے وہ ان کے خون سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے یہ ارادہ مصمم کر لیا کہ بے گناہوں کے خون کے دھبے وہ بچے بدمعاش صاف کریں جن کو پھانسی کا حکم دیا گیا ہو۔ اگر وہ صاف کرنے میں عذر کریں تو تازیانے لگائے جائیں اور اس کے بعد فوراً پھانسی دے دی جائے۔

اول مجرم چھٹی رجمنٹ کا ایک صوبے دار اونچی ذات کا برہمن بڑا موٹا تازہ پکڑا ہوا آیا۔ اس کے ہاتھ میں جھاڑو بھنگی نے دیا اسے حکم ہوا۔ کہ مکان میں جھاڑو دے۔ اس نے نصف مربع فٹ صاف کیا تھا کہ اس کام سے انکار کیا۔ لیکن جب وہ تازیانے کے نیچے آیا تو پھر اس نے حکم مانا اور سب مکان اس نے صاف کر ڈالا پھر اس کو پھانسی دی گئی۔

نانا کا مسلمان ساتھی۔ کچھ دنوں بعد سول کورٹ کا ایک مسلمان ملازم جو بڑا بدمعاش تھا پکڑا گیا۔ اس نے اس کام پر اعتراض کیا تو اس کو بید لگائے

گئے اور خون کے دھبے اس کی زبان سے چٹوا کر صاف کرائے گئے پھر پھانسی دی گئی اگرچہ یہ عجیب قانون تھا مگر موقع و وقت کے لئے نہایت موزوں تھا جب تک کہ سارا کمرہ بالکل صاف نہیں ہو جائے گا میں اپنا حکم نہیں بدلوں گا خدا میری مدد کرے گا۔

ذکاءاللہ کا تاثر۔ ایسے وقت میں بڑے بڑے رحم دل عاقلوں میں حق و ناحق میں فرق کرنے کی تمیز باقی نہیں رہتی، بڑے بڑے عقلمند انگریز اپنا فرض سمجھتے تھے کہ رحم کو اپنے سے دور رکھیں جیسے یہ جرائم مستثنےٰ صورت کے ہیں ایسی ہی ان کو سزا بھی مستثنےٰ صورت کی ہونی چاہیئے۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ جیسے قتل کے مختلف درجے ہوتے ہیں ایسے ہی ان کے سزا کے مختلف درجے ہونے چاہئیں۔ نکلسن جیسے عاقل شجاع کی یہ رائے تھی کہ ایک ایکٹ پاس ہو جس میں موت کی سزا طرح طرح کی تکلیف دے کر دی جائے انہوں نے مئی کے آخیر میں اڈورڈس صاحب کو لکھا کہ ایک بل پیش کریں جس میں عورتوں و بچوں کے قاتلوں کو موت کی سزا اس طرح دی جائے کہ مجرم کی زندہ کھال اتاری جائے، سولی دی جائے۔ زندہ جلایا جائے۔[1]

بٹھور کا ویرانہ۔ شکست کے باوجود نانا انگریزوں کے ہاتھ نہ آیا، نیپال کی طرف بھاگ گیا لیکن انگریزوں نے اس کی گرفتاری سے مایوس ہو کر اس کے مکان کے ساتھ کیا کیا۔ یہ بھی ملاحظہ فرمائیے:۔

میجر اسٹیفن سن صاحب تھوڑی سی سپاہ کے ساتھ بٹھور بھیجے گئے وہاں کوئی دشمن نظر نہ آیا، نانا کا محل مسمار کیا گیا اس کے مکانوں میں انگریزی اسباب لوٹ کا بھرا ہوا تھا، نانا تمام زر و جواہر اپنے ساتھ لے گیا یا چھپا گیا تھا جن کا پتہ اس سبب سے نہیں لگ سکتا تھا کہ ان پر مکانات ڈھئے ہوئے پڑے تھے اگر ڈھانے سے پہلے تلاش کی جاتی تو شاید وہ مل جاتے۔ اب پیشوا کے خاندان کا ایک رکن نانا نرائن راؤ باقی تھا جس کو نانا نے قید کیا تھا، اس نے جرنیل کے پاس خبر بھیجی کہ بٹھور خالی ہے آپ تشریف لائیے جنرل اس پر عنایت بہت احتیاط کے ساتھ کرتا تھا۔[2]

---

[1] تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) ص ۵۴۲

[2] " " " " " " ص ۵۴۱

ناقابل فراموش

غدر کے سلسلہ میں اودھ کی بہت سی تاریخیں، انگریزوں، ہندوؤں اور مسلمانوں نے لکھی ہیں۔ ان میں قیصر التواریخ خاص طور پر اہم ہے، یہ تاریخ سید کمال الدین حیدر حسنی الحسینی المشہدی معروف بہ سید میر زائر نے لکھی ہے۔ لکھنے والے میر زائر صاحب ہیں، اور لکھوانے والے مشہور مورخ سر ہنری الیٹ ہیں، جو گورنر جنرل ہند کے سکریٹری تھے، طبع و اشاعت کا اہتمام سر دگبجے سنگھ راجہ بلرام پور نے کیا تھا۔ جو سرکار کمپنی بہادر اور سرکار انگریز بہادر کی وفاداری اور اپنے ملک کی غداری میں مشہور ہیں، چھاپنے والا نول کشور پریس ہے۔

ظاہر ہے یہ کتاب انگریزوں کے نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے۔ ان کے وقائع میں لکھی گئی ہے، باغیوں کو، انقلاب پسندوں کو، جنگ آزادی کے رہنماؤں کو، نہایت نا ملائم اور ناشائستہ الفاظ میں یاد کیا گیا ہے۔

لیکن ایسے کیا کیا جائے کہ لکھنے والا مسلمان بھی ہے۔ انسان بھی ہے، ہندوستانی بھی ہے لہٰذا انگریزوں کی دل و جان سے تائید و حمایت کے باوجود ایسے واقعات بھی لکھنے پر مجبور ہو گیا ہے، جو ناقابل فراموش ہیں، یہ واقعات مشتمل ہیں ہندوؤں کی مسلمان بادشاہ سے وفاداری پر، ایک مشترک مقصد کے لئے ہندو مسلم اتحاد پر، جنگ آزادی میں حصہ لینے والوں کی جرأت و بہادری جاں نثاری اور جان بازی پر، ہندوستانیوں اور انگریزوں کے ظلم و ستم پر، اودھ پر دوبارہ قبضہ و تسلط کے بعد انگریزوں کی خون آشامی، بربریت اور درندگی پر، امیروں اور رئیسوں، شریفوں اور نجیبوں کی بدحالی، آشفتہ روزگاری اور تباہی و بربادی پر۔

کتاب خاصی طویل و ضخیم ہے، میں نے ترتیب کے ساتھ چند ناقابل فراموش واقعات چن لئے ہیں، جو ذیل میں درج کرتا ہوں۔

راجہ جوالا پرشاد کی وفاداری

واجد علی شاہ لکھنؤ سے روانہ ہوتے ہیں، ۔ مدبر الدولہ راجہ جوالا پرشاد بہ ضعف قویٰ و سن پیری

کان پور تک ساتھ چلے گئے۔ لیکن بادشاہ نے کمال عطوفت و رحم سے بواسطہ معلم السلطان فرمایا، تم تکلیف سفر نہ کرو۔ حسام الدولہ کے پاس حاضر رہو۔"

(قیصر التواریخ جلد ۲ صفحہ ۱۶۲)

مہاراجہ بنارس کا اخلاص | قبل از روانگی بکمال لطف و اخلاق عرضداشت مہاراجہ الیشری پرشاد نرائن سنگھ بہادر مہاراجہ بنارس نظر اقدس سے گزری کہ فدوی خیر طلب موروثی ہے اور ممنون قدیم اس خاندان عالی شان کا ہے۔ امیدوار مرحمت خسروانہ ہے کہ حضور بنارس میں املاک خیر اندیش میں رونق افروز ہوں۔

شاہان چہ عجب گر بنوازند گدا را "   (صفحہ ۱۶۹ ایضاً)

ہاتھیوں کے آنسو | واجد علی شاہ کے کلکتہ جانے کے بعد۔ "اکثر ہاتھیوں کو وقت نیلام سر پر خاک اڑاتے، آنسو آنکھوں سے بہاتے دیکھا۔ اکثر صاحبوں کو شبہ آشوب چشم ہوا۔ فیل بان نے کہا ہم تیس برس سے نوکر ہیں یہ عمل ہمارے خاک اڑاتے اور روتے ہیں۔   (صفحہ ۱۷۱ ایضاً)

کتب خانہ پھکوا دیا | میجر کارنیگی نے ایک دن سارا کتب خانہ جو فرح بخش کی الماریوں میں بہ ترتیب تھا، باہر نکلوا کر پھکوا دیا۔"   (صفحہ ۱۸۲)

ہائے ری بے بسی | ایک دن حکام نے چاہا کہ درگاہ حضرت عباس میں جو اسباب سونے چاندی کا ہے اسے بھی ضبط کریں۔ مفتاح الدولہ نے عرض کیا تصرف مال وقف جائز نہیں مگر "از راہ حکومت اختیار ہے"[1]   (صفحہ ۱۸۷)

پھانسی | پہلے دن شام کو صوبہ دار اور شیخ کو مچھی بھون سے باہر لائے۔ دروازے جلو خانہ میں پھانسی دی، ایک حلقہ بہ قنداز، دوسرا گوروں کا حلقہ محیط چوب پھانسی ہوتا تھا۔ دوسرے دن عوض بیگ، آغا مرزا اور کئی تلنگوں کو پھانسی دی۔ عوض بیگ نے کہا میں عیسائی ہوتا ہوں۔ مجھے پھانسی نہ دو۔ وہ اپنی سزائے اعمال کو پہنچا۔ غرض چودہ آدمی پھانسی دیئے گئے۔   (صفحہ ۱۹۸)

لارنس کو میموں کی صلواتیں | اکثر میم مجروح نیم جان چھکڑوں پر سوار بھوکی پیاسی اس

[1] "از راہ حکومت" کی اعلا عنت کا جواب نہیں۔

شدت گرما میں لکھنؤ پہنچ جاتی تھیں لیکن زبانِ طعن خوب لارنس صاحب پر کھولتی تھیں۔
(صفحہ ۲۰۲)

وہ معصوم انگریز بچہ

کپتان اینڈرسن صاحب نے اپنے رسالہ "محاصرہ لکھنؤ" میں لکھا ہے ایک صاحب کا لڑکا چار برس کا حالت اضطرار میں معلوم نہیں کس طرح اپنے ماں باپ سے چھٹ کر، ایک بنگلے میں رہ گیا، دو دن اور دو رات ہر کمرے میں گھبرا کر جاتا تھا، کبھی ماما کبھی پاپا کہہ کر چلاتا تھا۔ جب طاقت نہ رہی غش کھا کر ایک کمرے میں گر پڑا اتفاقاً تیسرے دن ایک نامرد ازلی لوٹ کو داخل ہوا، جب نظر اس پر پڑی، لوٹ بھول گیا۔ ایک کندا بندوق اس کے سر پر مارا، جان بحق ہو گیا۔ (صفحہ ۲۰۱)

انگریز عورتوں کی درگت

بیبیوں (میموں) کی یہ نوبت پہنچی کہ بھوک پیاسی پا برہنہ کپڑے پھٹے ہوئے گرد آلودہ بعض مجروح گودی میں بچے لئے جس طرف جا رہا چلیں۔ جہاں آدمی کو دیکھا خوف جان سے راہ جنگل کی لی، صاحبان عالی شان کا یہی حال تھا۔ اگر کسی گاؤں میں بیبیاں اس خراب حالت سے پہنچیں، زمیندار نے رحم کھا کر رات کو اپنے گھر مہمان کیا، جو ماحضر تھا، حاضر کیا۔ صبح کو ایک چھکڑے پر سوار کر کے لکھنؤ پہنچا دیا۔ (صفحہ ۲۰۱)

کمشنر خیر آباد کی ہلاکت

کرسٹن صاحب کمشنر خیر آباد کا بنگلہ کنار دریا تھا، مع میم صاحبہ گھوڑوں پر سوار ہو کر لکھنؤ چلے، پیچھے سے تلنگوں نے بندوق ماری، زمین پر گر پڑے، میم صاحبہ دوڑ کر صاحب کی نعش سے لپٹ گئیں، دفعتہً ان پر بھی گولی پڑی اپنے خاوند سے جا ملیں۔ (صفحہ ۲۰۲)

انگریزوں کی بدحواسی

(شاہجہان پور) دو صاحب رات کو ایک زمیندار کے مہمان ہوئے پانی پیا اور روٹی کھائی کہنے لگے تین میم ہم سے چھٹ کر تمہارے گاؤں میں آئی ہیں، تلاش کرو، چوکیدار ان کو ڈھونڈ کر ایک دھوبی کے گھر سے لے آیا۔ لیکن اس عرصہ میں صاحب گھبرا کر لکھنؤ کو چلے گئے۔ بیبیاں چوکیدار کے ساتھ بہ ہزار خرابی لکھنؤ پہنچیں۔ (صفحہ ۲۰۳)

ایک روز کمشنر صاحب (فیض آباد) اور حکام مع صاحبان فوج و

جان نثار ہوئی ...

ہیں مار ڈالو یا نکال دو، سب افسر راضی ہوئے، کشتیوں پر سوار ہو کر چلے، یہ خبر سپاہ باغی نے سنی تلنگے دوڑ پڑے، کمشنر خود طپنچہ مار کر دریا میں کود پڑے، مر گئے، ان کا سگ باوفا بھی دریا میں کود پڑا مر گیا، واہ ری وفاداری میم صاحبہ بھی ڈوب کر مر گئیں۔ باقی اور صاحبوں سے مقابلہ ہوا مارے گئے۔
(ص ۲۰۳)

پاس وفا

سلطان پور ۱۵ رسالے میں کرنل فشر صاحب تھے۔ برکات احمد رسالدار نے صاحب سے عرض کیا جہاں آپ فرمائیں ہم آپ کو بہ سلامت پہنچا دیں۔ پھر ہم سے کچھ نہ ہو سکے گا، نمک حرام ہو جائیں گے۔
(ص ۲۰۴)

چھاؤنی میں آگ لگادی

ایک آیا، چھوٹے لڑکے کو گود میں لئے جاتی تھی، ایک نامرد سوار نے گود سے گرا کر برچھی کی انی اسے چبھو چبھو کر مار ڈالا پھر چھاؤنی میں آگ لگادی۔
(ص ۲۰۵)

صلہ وفا

کاظم علی خاں کمبوہ تحصیلدار بھاگ کر ملیح آباد چلے گئے، اپنی حکمت عملی سے آپ بھی بچے، کپتان ولسٹین صاحب کو بھی بچایا، خزانہ سرکار بیلی گارد میں پہنچایا، فی الحقیقت بڑا کام کیا، لیکن رفع ہنگامہ کے بعد ان کو پنشن بھی نہ ملی (ص ۲۰۵)

بھگوڑا کپتان

رمضان خاں نے کپتان ہیز صاحب سے مخاطب ہو کر شکایت گالی دینے کی کر کے تلوار ماری

باقی سوار کپتان گال سے کہنے لگے۔ ہم نے آپ کا نمک کھایا ہے آپ بہ سلامت چلے جائیے۔ کپتان لڑائی سے منہ پھیر کر سیدھے لکھنؤ آئے، مورد طعن و تشنیع ہوئے اکثر اپنے حال پر رویا کرتے تھے۔
(ص ۲۰۵)

گورے بھاگنا بھی جانتے تھے

صاحبان عالی شان نے گھونگھٹ کھایا۔ چاہا اسمعیل گنج میں پناہ لیں وہاں نہ جا سکے، فوج باغی نے گنج کو اپنی پشت پر لیا، دہنے بائیں سے توپ چلنے لگی، لوہے کے پل تک بڑا کھیت رہا لاش پر لاش کرنے لگی کپتان اینڈرسن لکھتے ہیں ۱۱۱ گورے جان سے مارے گئے صاحبان عالی شان بگٹٹ بھاگے۔ دفعتہً بیلی گارد میں ہو رہے، پھر کسی نے پیچھے پھر کر نہ دیکھا۔
(ص ۲۱۳)

کپڑا انگ نہ چھوڑا

جب عملداری سرکار ہوئی، کارنیگی صاحب آئے، جتنا مملوکہ نواب عظمت الدولہ تھا، سب لے کر چلے گئے، تقریباً کئی لاکھ روپیہ کا سامان تھا، وہ اس وقت لنگی باندھے بیٹھے تھے، کپڑا انگ نہ چھوڑا۔ (ص ۲۱۹)

لارنس کی ہلاکت

جنرل لارنس چیف کمشنر ریزیڈنسی میں مصروف تحریر تھے کہ دفعتہً ایک گولہ دونوں پاؤں پر سے ہو کر گوشت اعصاب لیتا چلا گیا۔ اس صدمہ ناگہانی سے ۱۱ جولائی ۱۸۵۷ء کو صاحب نے انتقال کیا، وقت آخر گنبس صاحب کو اپنا قائم مقام کیا۔ بعد ہفتہ عشرہ آہنی صاحب جو ڈیشنل کمشنر ایک صبح کو مورچے دیکھتے پھرتے تھے۔ ناگاہ ایک گولی قضا کی آئی مر گئے۔ محصورین بیلی گارد کو حالت یاس ہو گئی، ہیجر ینگ نے چیف کمشنری گنبس صاحب کو قبول نہ کیا، کس واسطے کہ وقت محاربہ صاحب فوج سزاوار عہدہ جلیلہ ہوتا ہے۔ (ص ۲۳۱)

انگریزوں کے ہندوستانی جاسوس

ہر روز گوئندے بیلی گارد کے پکڑے جاتے تھے اگرچہ تبدیل لباس وضع صورت سے ہوتے تھے اور انگریزی چٹھی نئے ڈھنگ سے چھپا کر اپنے پاس رکھتے تھے۔ (صفحہ ۲۳۹)

بابو پورن چند

نواب شرف الدولہ سے بابو پورن چند سے عرضداشت بہادر شاہ کو لکھوائی۔ (صفحہ ۲۴۰)

پہلے نقدی لی پھر پھانسی دی

شکست رانا راؤ ۱۵ جولائی ۱۸۵۷ء کو ہوئی، ۱۶ کو صاحبان عالی شان نے بندوبست شہر کانپور کا کیا جسے پایا بے تحقیق رو رعایت بے تکلف پھانسی دے دیا۔ کئی ہزار کی نوبت پھانسی تک پہنچی، اکثر اپنے تئیں بے قصور جان کر رہ گئے۔ نہ بھاگے، ہزاروں گرفتار ہو کر پھانسی دیئے گئے۔ از آں جملہ اعظم علی خاں کو بالاتفاق لوگ بے قصور کہتے ہیں (انگریزوں نے) پہلے جو کچھ لینا تھا، نقد و جنس سے لیا، بعد اس کے پھانسی دی۔ اب سرکار نے ازراہ عدالت کو اغذ نوٹ[1] جوان کے عیال کے نام تھے دیئے کہ اپنی بسر اوقات کریں۔ (ص ۲۵۰)

فتح پور کا صفایا

فتح پور میں پھانسی شروع ہوئی، وہاں کی رعایا اور نا عاقبت اندیشوں نے اپنی اجل آپ بلائی، چوہدری جسا سنگھ کے لڑکے بھی مارے گئے۔ (ص ۲۵۰)

---

[1] تمسکات

الہ آباد میں سات ہزار کو پھانسی | الہ آباد میں سب سے زیادہ پھانسی دی گئی
کہ ایک مولوی نے محمدی جھنڈا اٹھا کے تما
رعایا کو باغی بنا دیا۔ پھر جہاد پر کمر باندھ کر مقابلہ کیا، مثل مشہور ہے۔ کمزور مار کھانے کی نشا
نہ سمجھے ہم مقابلہ سرکار سے کرتے ہیں آخر فوج نے ان سب کا ستیاناس کر دیا۔ گرد شہر
آگ لگا دی، بعد تسلط سات ہزار کو پھانسی دی، بعض اولوالعزم اپنی حماقت سے لکھنؤ
کمک لینے چلے مگر قضا نے انہیں جانے نہ دیا کہ میں خود تمہارے پاس حاضر ہوں، آپ نے
کاہے کو تکلیف اٹھا کر آئے؟

(ص ۲۵۱)

کان پور میں ہزاروں کو پھانسی | کان پور میں تین ہزار نے پھانسی پائی، ہزاروں بھا
ازاں جملہ ایک سقہ رہنے والا لکھنؤ کا ایک شخص کے
گھر میں چھپ رہا۔ بعد کئی دن کے صاحب خانہ نے کہا، تم میرے گھر سے چلے جاؤ، ایسا نہ ہو
کوئی گوئندہ خبر کر دے۔ یہ سقہ مضطر ہو کر نواب گنج کی سڑک پر چلا جاتا تھا۔ اتفاقاً ایک صاحب
(انگریز) نواب گنج سے آتا ہے، پوچھا کون ہے؟ کہاں جاتا ہے؟ کہا لکھنؤ میں احمد علی کی سبیل
پر نوکر تھا۔ فرخ آباد میں میرا بھائی ہے۔ اسے دیکھنے جاتا ہوں، کہا تو جھوٹ کہتا ہے؟ را
(نانا) کا نوکر تھا، ہر چند اس نے عذر کیا (مگر انگریز نے اسے) گوروں کے قبضہ میں دیا، کہا
تیری (قوم مسلمان نے ہمارے میم بچوں کو مار ڈالا ہے، اس نے کہا میں نے تو نہیں مارا، کہا
ہم تمہاری سب قوم کو پھانسی دیں گے۔ ایک کو بھی نہ چھوڑیں گے، اگر تیرے خدا میں کچھ
طاقت ہوگی، ہماری قید سے چھڑا لے گا۔ اس نے کہا اب میرا آسرا اور بھروسہ خدا ہی پر
ہے، غرض اس کی مشکیں باندھ نیچے درخت کے بٹھا دیا۔ کھانا پانی کچھ نہ دیا، تیسرے دن
مینہ شدت سے برسنے لگا۔ بگل کوچ کا ہوا، جتنے گورے سکھ تھے، متوجہ تیاری سفر ہوئے
اس وقت سقہ نے منہ اپنا آسمان کی طرف اٹھایا۔ اس کے ہاتھ کی رسی ڈھیلی ہو کر گر پڑی
یہ بہ ہزار خرابی شیشم کے درخت پر چڑھ کر ایک ٹہنے سے لپٹ کر بیٹھ گیا۔ جب گورے
اکر ڈھونڈنے لگے نہ ملا، مایوس ہو کر چلے گئے۔

(صفحہ ۲۵۱)

دغا | کان پور سے جب فوج بھاگ کر آئی تو ممو خاں کو بتایا گیا:۔

جتنی فوج کان پور سے بھاگ آئی ہے اس میں دغا ہے، انگریز نے اس میں اپنی فوج ملا
دی ہے کہ تم پہلے بھاگنا فوج از خود بھاگ جائے گی۔

(صفحہ ۲۵۶)

بہادر صوبہ سنگھ

صوبہ سنگھ کی پلٹن خوب لڑی (انگریزوں کے) اس معرکہ میں ہزار سے زیادہ آدمی مارے گئے۔ (ص ۲۵۶)

راجہ مان سنگھ کی بہادری

مان سنگھ نے لڑائی میں ایک معرکہ سر کیا تو:۔
جناب عالیہ نے راجہ مان سنگھ بہادر کو اس جاں فشانی و جاں نثاری پر خطاب فرزندی دیا، خلعت، دوشالہ، رومال اور ملبوس خاص اپنا دوپٹہ عنایت کیا۔ ان کی بہادری کی بہت تعریف کی اور فرمایا بعد فتح بہت روپیہ جاگیر دے کر خوش کروں گی، انہوں نے عرض کیا میں قدیم نمک خوار اس سرکار کا ہوں، میں بھی چاہتا ہوں کہ روبرو حضور تصدق ہو جاؤں اور حق نمک ادا کروں (ص ۲۶۷)

داد مردانگی دے کر مارے گئے

میر نہھے علی خاں داروغہ توپ خانہ، مرزا امام علی بیگ صوبہ دار توپ خانہ اپنے اسلحہ حرب سے مستعد کھڑے تھے کہ دفعتہً سامنے سے پرا گوروں کا نمودار ہوا، گورے مثل عقاب جھپٹ پڑے، مثل باد صرصر آ پہنچے، گولہ انداز سب بھاگ گئے، مگر یہ دونوں افسر اپنی تہوری سے نہ ہٹے داد مردانگی دے کر مارے گئے۔ (ص ۲۶۸)

سب مارے گئے

انگریزوں کے داخلہ لکھنؤ کے وقت:۔
غلام حسین کی مسجد پر نجاش خاں سگے بھائی ہادی حسین خاں، زمیندار اپنے جاں نثاروں کے ساتھ وہاں تھے، مقابلہ ہوا، خوب تلوار چلی، خون ناحق خدا کے گھر میں بہا، آخر دہیں لڑ بھڑ کر سب مارے گئے، ایک نام کر دیا، اس معرکہ میں پانچ سو ادھر کے مارے گئے، سو ادھر کے۔ (صفحہ ۲۶۸)

رعایا نے ڈھیلے مارے

جب گورے برف خانے کے پل کے قریب وزرا ہے حسین گنج پر پہنچے، جنرل اڈرم بہ رہبری پورن داروغہ چلے آئے، دونوں نے مل کر قندھاری بازار کی راہ لی، برف خانے کو آگ لگا دی۔ راہ میں جو سامنے آیا شکار کیا۔
رعایا نے ڈھیلے پتھر مارے گوروں نے آگ لگائی چھاؤنی کو جلا دیا۔
راجہ مان سنگھ سے جب راہ میں مقابلہ ہوا، خوب لڑے۔ ملک کے خاص برداروں نے کوٹھوں پر چڑھ کر خوب مینہ گولیوں کا برسایا۔

(صفحہ ۲۶۹)

ڈھاڑی کا بہادر لڑکا

انگریزی فوج جب لکھنؤ میں داخل ہوئی:۔ بشیر الدولہ کے دروازے پر ایک ڈھاڑی کا لڑکا خدا بخش نام اور ایک سپاہی نو ملازم اور ایک خلاصی نے مل کر توپ مارنی شروع کی، جو گورا چوپڑ کے اصطبل سے آتا تھا اسے نشانہ کرتے تھے یہاں تک گراب مارے کہ گوروں کو نہ آنے دیا۔ (ص۲۶۹)

پانچ سو بہادر

پانچ سو نجیبوں نے بڑی جرأت سے مقابلہ کیا، وہ مارے گئے۔

(صفحہ ۲۶۹)

ایک لڑکے نے گوروں کو بھگادیا

ایک لڑکا جوان سید زادہ فقط اپنی تہوری سے توپ کے تخت کے نیچے چھپ گیا۔ جب گورے سامنے آئے، اس لڑکے نے توپ کو داغا رکئی گورے گر پڑے، باقی الٹے پاؤں موتی محل کو پھر گئے۔ (ص۲۷۱)

دو سو بہادر کٹ گئے

قریب مکان عظیم اللہ خاں کپتان بارلو کی پلٹن کا مقابلہ ہوا، خوب لڑائی ہوئی، دو سو تلنگے پچاس گورے مارے گئے۔ (صفحہ ۲۷۱)

اودھم بیلی گارد میں

جنرل اودھم داخل بیلی گارد ہوا۔ تقریباً دس ہزار بد معاش دریا میں ڈوب کر مر گیا، بیس ہزار سوار و پیدل، رعایا نے شہر سے بھاگ کر دس کوس پر دم لیا۔ (ص۲۷۲)

حق نمک سے ادا ہوئے

گورے مرزا سکندر حشمت کی ڈیوڑھی پر آئے، سپاہیوں نے پھاٹک بند کر لیا، طرفین سے گولی چلنے لگی، صاحب میر داروغہ، مرتضیٰ خاں، میر صفدر علی، میر نواب مخدوم بخش تمندار وغیرہ یہ سب مارے گئے۔ حق نمک سے ادا ہوئے (صفحہ ۲۷۲)

احمد اللہ شاہ کے بارے میں انکشاف

۲۲ ستمبر ۱۸۵۷ء کو شاہ جی کو خبر ہوئی، گورے بیلی گارد میں چلے گئے، خود یکہ و تنہا اٹھا۔ کہا میں اکیلا دھاوا کروں گا۔ یہ کہہ کر موتی محل میں گیا۔ ایک مردہ گورے کا سر کاٹ لیا۔ جب فوج نے سنا شاہ صاحب نے اکیلے دھاوا کیا ہے، پیچھے سے پہنچی، شاہ جی کے ہاتھ میں سر تھا۔ لاف زنی کرنے لگا۔ فوج میں چرچا شاہ جی کی کرامات کا ہونے لگا، تلنگے قسل جہلا ڈنڈوت کرنے لگے سوار اپنا مرشد ایمانی جاننے لگے۔ شاہ جی نے جوش و خروش میں یہ شعر پڑھا:۔

چوں شود در عہد اینان جور و بدعت را رواج　　شاہ غربی بہر قتلش خوش عناں پیدا شود
درمیان ایں و آں گردد لبسے جنگ عظیم　　قوم عیسٰی را شکستِ بے گماں پیدا شود

وہ شاہ غربی میں ہوں، میرا کوئی ہمسر نہیں، برجیس قدر کیا ہے، شاہ دلی میرے رتبہ سے کم ہے مجھ کو حکم اللہ ہے، میرے ہاتھ یہ فرقہ نصاریٰ تباہ ہوگا۔ میں ظل اللہ خلیفۃ اللہ فی الارض ہوں پھر چوب دار کو حکم دیا، ممو خاں کے پاس جاؤ کہ اب بھی آنکھیں کھولیں کہ ہوش میں آؤ اگر تم چاہتے ہو سر گوروں کے بوٹ سے بچے اور بیلی گارد ہاتھ آجائے، چار توپیں، بسی، پانچ ہزار روپیہ نقد دعوت فقرا بھیج دو، برجیس قدر میری اطاعت کرے، بیگم میری بیعت کرے، چوبدار نے ممو خاں سے کہا، شدہ شدہ یہ خبر جناب عالیہ تک پہنچی، انہوں نے مفتاح الدولہ، شرف الدولہ، ممو خاں، میر واجد علی کو بلایا، سب نے کہا شاہ جی کوئی امام نہیں، یہ سب باتیں کفر والحاد کی ہیں۔ (صفحہ ۲۷۲، ۲۷۱)

کمانڈر انچیف زخمی ہوئے | گوروں نے سکندر باغ لینے کا ارادہ کیا، خورشید منزل سے گولے اور گولی کی مار پڑنے لگی، گوروں نے بہادری سے سکندر باغ کو گھیر لیا، تلنگے گھر گئے، بڑا کھیت پڑا۔ ۲۲ افسر ہندوستانی جان سے مارے گئے ۴۵ زخمی و نیم جان ہوئے، ۱۶ نومبر ۱۸۵۷ء سے ۲۰ تک ۱۰ افسران مرے، ۳۲ زخمی ہوئے، کمانڈر انچیف بھی زخمی ہوئے اور جنرل نیل صاحب کے بھی گولی لگی۔ (صـ ۲۹۵)

غیر ملکیوں کے ملکی جاسوس | گوئندے انگریزی ہر روز پکڑے جاتے تھے، زر نقد، روپیہ، اشرفی ان کے پاس ہوتا تھا، اکثر کو تلنگے جھنجھلا کر گولی مار دیتے تھے۔ (صـ ۲۹۸)

غدار تعلقہ دار | مہاراجہ بال کرشن نے نظر بہ خیر خواہی سرکار انگریزی تعلقہ داروں کو رخصت کروا دیا اس حیلے سے کہ اگر یہ لوگ اپنے علاقے پر نہ جائیں گے تو تحصیل کیونکر ہوگا۔ (صـ ۳۱۵)

مثل عقاب | ایک شہسوار نے پرے سے نکل کر سواروں سے کہا تم میں سے کون ایسا ہے جو اس پار جاکر صاحب کا سر لائے؟ سب چپ ہو رہے۔ اس نے پکار کر کلمہ شہادت پڑھ زیر بند گھوڑے کا کاٹ لیا، دریا سے مثل عقاب صاحب کے سر پر پہنچ کر پہلے گولی گھوڑے کو ماری، صاحب نے دونالی بندوق سر کی، اس نے طپنچہ مارا، صاحب آ

پڑے۔ (صفحہ ۳۳۱)

خون کی نہر

گورے باغ پر پہنچے، کلہاڑوں سے پھاٹک توڑ داخل باغ ہوئے، چاندی کی بارہ دری کے صحن میں نشان فتح گاڑ دیا۔ افسر بارہ دری میں کرسی پر بیٹھے، بڑی دھوم مچائی ہزارہا ملازم نمک حرام ہو کر مل گئے۔ خان علی خاں اس وقت داخل ہو گئے تکیہ بو علی شاہ پر کسی گوئندے کے بہکانے سے تھوڑی دیر تک رک رہے تھے۔ بہر حال گوروں سے باغ میں خوب گھمسان ہوا، ہر روش چمن پر نہر خون کی جاری تھی، ہر طرف لاشوں کا انبار تھا۔ گورے سمٹ کر سنگین بارہ دری میں ہو رہے۔ پیچھے سے جنگ بہادر کی فوج نے آ کر باڑھ ماری، سینکڑوں گر پڑے، خان بھی زخمی ہوئے۔ (صفحہ ۳۳۳)

وفادار اب بھی وفادار تھے۔

انگریزوں نے لکھنؤ فتح کر لیا، حضرت محل لکھنؤ سے باہر نکلیں اور بعد اس کے احمد آباد راجہ نواب علی خاں کے گھر میں مہمان ہوئیں پھر بھٹولی راجہ منوا کی گڑھی میں رہیں، وہاں وکیل راجہ ہردت سنگھ حاضر ہوا۔ عرض کی ہم آپ کے بہر حال شریک و فرماں بردار ہیں، پھر وہاں سے وکیل کے ساتھ داخل بونڈی ہوئیں اور متوجہ انتظام ممالک محروسہ اور حکمرانی ہوئیں، چند روز میں جتنے لکھنؤ سے بھاگے تھے اندرونی و بیرونی مع سپاہ جنگی جمع ہو گئے اور ملازمین قدیم و جدید وغیرہ آ پہنچے اور جتنے اہل حرفہ اور اہل بازار تھے مع اجناس از خود جمع ہوئے۔ مثل لکھنؤ چوک آباد ہو گیا اس کے سوا زمینداروں اور تعلقہ داروں نے بلا طلب زر تحصیل بھیجنا شروع کیا۔ اس زر تحصیل کی عدم رسی پر کیا کیا لڑائی اکثر رہا کرتی تھی۔ اس امر میں سب کو استعجاب تھا کہ ایسے وقت اضطرار و مایوسی و قطع امید میں اس طرح آمدنی ملک کا بے منت پہنچنا۔ غرض اس مدت قیام میں جتنا سامان امارت شاہی تھا اور اسباب لوازمہ ریاست سب طرح کا موجود ہو گیا۔ بلکہ اکثروں کے پاس جو اسباب سلطانی کسی طریق سے ہاتھ آ گیا تھا، انہوں نے بے طلب سرکار میں دے دیا۔ ہر شخص اپنے واسطے اس انبوہ کو صورت عافیت سمجھتا تھا۔ اور پچھلی مصیبتیں جو لکھنؤ یا میان راہ ہر طرح سے پائی تھیں دل سے بھلا دی تھیں اور بازار مثل چوک لکھنؤ ہو گیا تھا۔ (صفحہ ۳۳۸)

ہندو اور مسلمان دوش بدوش

راجہ بینی بادھو بخش نظامت بیسواڑے میں مستعد و سرگرم قتال و جدال رہے۔ سلون میں شیخ فضل عظیم خاں میر مہدی حسن خاں نظامت سلطان پور میں مقرب الدولہ میر محمد حسین خاں نظامت گورکھپور

ہیں اور مختار الملک خان علی خاں قسمت خیر آباد میں، مولوی محمد خاں سندیلہ میں اس شرط پر گئے تھے کہ یا فتح کروں گا یا مارا جاؤں گا، چنانچہ اس معرکہ سے منہ نہ پھیرا، پانچ ہزار مرنے والے سرفروش ساتھ تھے، دادِ مردانگی دے کر خوب لڑ بھڑ کر نام کر گئے۔ کوینا صاحب اسی معرکہ میں زخمی ہوئے یوسف خاں بھائی ممو خاں کے سپہ سالار فوج ہو کر گئے، نواب گنج میں فوج انگریزی سے مقابلہ ہوا، راجہ بلبھدار سنگھ بڑے نام و نمود سے اس لڑائی میں مارا گیا۔ (صفحہ ۳۲۸-۲۹)

وفادار زمیندار

نظامت بہرائچ میں کاظم حسین خاں، جمل حسین خان زمیندار بھٹورا مئو، راجہ دیبی بخش گونڈے میں، گلاب سنگھ راجہ بروا، دربجے سنگھ راجہ مہونا۔ نرپت سنگھ راجہ رہیہ، رانا مادھو بخش بہادر، چوہدری مصاحب علی، انندی کورمی، جوت سنگھ راجہ چرچا یہ سب ہر جگہ لڑتے رہے، جب تاب مقابلہ نہ لا سکے، ابونڈی میں جمع ہوئے۔ پس اگر انصاف سے دیکھئے زمینداروں کی طاقت کہاں اور مقابلہ کس کی فوج سے ہوا؟ (ص ۳۳۹)

حضرت محل نیپال میں

کمانڈر انچیف جنرل کلائڈ بہادر فوج قاہرہ لے کر بہرائچ سے بونڈی پہنچے فوج جنگی مع زمیندار و تعلقدار خوب لڑی، جب فوج انگریزی نے دھاوا کیا نہ ٹھہر سکی، حدود نیپال میں جنگل میں متفرق ہو گئی، جنگ بہادر نے جا بجا گھاٹیوں پر پہرے بٹھا دیئے تھے۔ مگر اس قافلہ مورد ملخ کو نہ روک سکے، اس وقت جناب عالیہ کوہ بٹول پر جہاں نواب آصف الدولہ کی بارہ دری اب تک بنی ہوئی ہے، پہنچیں، جنگ بہادر کا خط کپتان نرنجن مانجھی کی طرف آیا کہ انگریزوں سے صلح کیجئے یا یہاں رہنا اختیار کیجئے۔ ہم سے توقع کسی امداد و اعانت کی نہ رکھئے۔ (ص ۳۴۰)

انگریزوں کا لکھنؤ میں داخلہ:-

عورتیں کنوئیں میں کود گئیں

کوچہ بہ کوچہ قیامت برپا تھی، عورات پردہ نشیں یہاں ہجوم بلوائے عام ہر طرف سے بم کا گولہ برس رہا تھا، گوروں نے جو سامنے آیا، جسے پایا مارا، عورات صاحب غیرت اور لڑکیاں بن بیاہی گوروں کی صورت دیکھتے ہی کنوؤں میں گر گر مر گئیں۔ (ص ۳۴۶)

لکھنؤ ۱۵ دن تک لٹتا رہا

صاحبان عالی شان بہ فتح و فیروزی (داخل لکھنؤ ہوئے) ۱۵ دن تک شہر برابر لٹا، سوائے گول دروازہ کے جہاں مہاجن رہتے تھے اور سعادت گنج بھی بچا شاید کوئی صورت عافیت مہاجنوں نے نکالی ہو، سکھ، نیپالی اور گوروں سے کوئی جگہ نہ بچی تھی۔ (ص ۳۴۶)

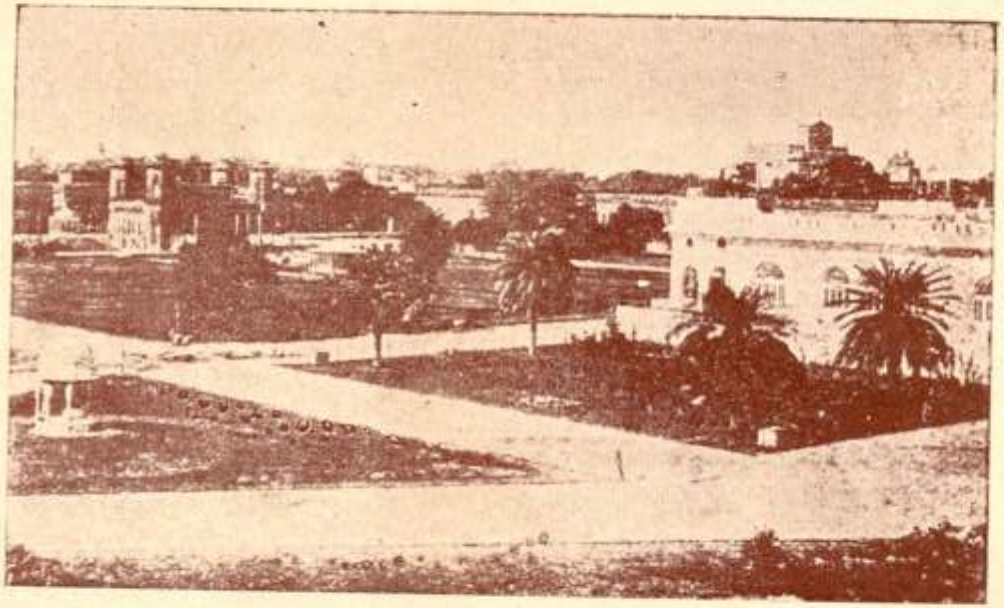

قیصر باغ (واجد علی شاہ کی فردوس ارضی) لکھنؤ

شریف عورتوں کی آبروریزی | درگاہ حضرت عباس میں کئی سو عورتیں پردہ نشین جا کر چھپی تھیں، گوروں کے ہاتھ سے بہت آبرو ریزی ہوئی۔

(صفحہ ۳۴۶)

درگاہ کا اسباب لوٹ لیا | اسباب درگاہ کا سب لٹا زیورات سونے کے ایک مہاجن نے گوروں کے ہاتھ سے روپیہ تولہ خریدے اور اسباب بھی اسی طرح بکا۔

(۳۴۹)

مالِ مفت دلِ بے رحم | بادشاہ باغ جو راجہ بختاور سنگھ کے اہتمام میں ۳۵ لاکھ میں تیار ہوا تھا، ۲۵۱ ہزار میں راجہ کپور تھلہ نے مول لے لیا، دل آرام کی کوٹھی بھی خریدی، قیصر باغ تعلقہ داروں کو تقسیم ہوا، چھ لکھی جو حضرت سلطان عالم نے اعظم الدولہ سے چار لاکھ کو لی تھی، نیلام ہوئی ۱۲۰ ہزار کو گئی۔

(صفحہ ۳۵۳)

تصویر کے دو رُخ

جب انگریز مظلوم تھے —— جب انگریز ظالم بنے

غدر جب شروع ہوا۔ تو انگریز مجبور و مظلوم تھے، غدر جب فرو ہوا، تو انگریز ظالم اور ستمگر بن گئے۔ ظلم اور ستمگری کی یہ تاریخ دلچسپ بھی ہے، عبرت انگیز بھی، اور سبق آموز بھی!

غدر کی ذمہ داری صرف انگریزوں کے پندار و نخوت، بے تدبیری اور رعونت استحصال بالجبر اور سفاکی پر عائد ہوتی ہے انہوں نے اپنے قبضہ اور تسلط کے دور میں

کوئی ظلم ایسا نہیں تھا، جو خستہ جان اور خستہ تن عوام پر روا نہ رکھا ہو، انہوں نے صرف روپیہ ہی نہیں لوٹا، دولت ہی نہیں سمیٹی، اناج اور غلہ کے انبار ہی نہیں چھینے، انہوں نے روح کچلی انہوں نے دل توڑے، انہوں نے ذہن و دماغ کو حوالات میں بند کر دیا، انہوں نے عزت نفس پامال کی انہوں نے آبرو اور عزت اور ناموس پر ڈاکہ ڈالا۔

لیکن، محکوم اور حاکم کا تہذیبی فرق دیکھئے، عوام کے ہاتھ میں جب حکومت عارضی طور پر آئی، تو وہ بے حد مشتعل تھے اور کوئی شبہ نہیں اس اشتعال کے باعث، ننگ انسانیت حرکتیں بھی ان سے سرزد ہوئیں، انہوں نے مظالم بھی کئے، انگریزوں کو مارا، اور کاٹا بھی، اور ہمیں تسلیم کرنا چاہیئے، یہ حرکتیں کسی درجہ میں بھی قابل ستائش نہ تھیں، لیکن جب انگریز پھر برسر اقتدار آئے تو انہوں سارا اگلا پچھلا حساب بے باق کر لیا، سارے مظالم کا بدلہ، سود در سود سمیت وصول کر لیا، انگریزوں کے مظالم پر آسمان تھرا گیا، زمین کانپ اٹھی۔ قیامت لرز گئی شقاوت نے سر جھکا لیا، سفاکی، خون آشامی، درندگی اور بہیمیت نے اپنا عجز تسلیم کر لیا، چنگیز اور ہلاکو کی روحیں، عالم بالا پہ تڑپ اٹھیں۔

اس باب میں ہم یہ بتائیں گے کہ غدر کے دوران میں انگریزوں پر جو مظالم ہوئے اور غدر فرو ہونے کے بعد انگریزوں نے جو بے پناہ عالم، ناکردہ گناہ لوگوں پر روا رکھے ان کی نوعیت کیا تھی۔ اور اگر دونوں طرف کے مظالم ترازو کے دو پلڑوں میں رکھے جائیں، تو کون سا پلڑا جھکے گا؟ مقصد کسی کی رعایت اور جانبداری نہیں ہے، صرف حقیقت واقعہ اور احوال واقعی کا اظہار ہے، پہلے ہم دوران غدر کے واقعات کا جائزہ لیں گے، پھر بعد از غدر کے سانحات و حوادث پر ایک نظر ڈالیں گے۔

ایک وفادار مسلمان

غدر سے پہلے اور غدر کے بعد سب سے زیادہ مظالم مسلمانوں پر ہوئے، اس لئے کہ وہ حاکم قوم تھے، لیکن غدر کے دوران میں بھی جب وہ بے انتہا مشتعل تھے، انسانیت اور شرافت کا دامن انہوں نے ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔

> آگرہ سے مشرق میں اکہتر میل کے فاصلہ پر مین پوری ہے وہاں ہندوستانی پیدل پلٹن کا ایک حصہ تھا لفٹنٹ کرافورڈ اس کے کمانڈر تھے۔ ۲۲ مئی کو علی گڑھ کی سپاہ کی بغاوت کی خبر مین پوری میں آئی مسٹر کوپ مجسٹریٹ نے مسٹر آرتھر کاکس سے صلاح و مشورہ کیا کہ کیا کرنا چاہیئے۔ ان دونوں کی یہ صلاح

و مشورہ کیا کہ کیا کرنا چاہیئے ؟ ان دونوں کی یہ صلاح ہوئی کہ لیڈیوں اور بچوں کو آگرہ اور سپاہیوں کو مین پوری سے باہر بھگا ؤں کو روانہ کیا جائے۔

دوسرے دن صبح کو مسٹر جی این لوورا سسٹنٹ مجسٹریٹ عورتوں اور بچوں کو ساتھ لے کر آگرہ روانہ ہوئے۔ وہ ایک منزل جاکر عورتوں اور بچوں کو ایک مسلمان کے حوالہ کر کے مین پوری چلے آئے اور مسلمانوں نے عورتوں و بچوں کو آگرہ پہنچادیا۔[1]

جان نثار فیل بان، محمد ایک انگریز تاجر کا فیل بان مسلمان تھا، جس کا نام محمد تھا۔ اس خاندان کو غیر معمولی تباہیوں سے دوچار ہونا پڑا۔ لیکن محمد نے آخر وقت تک، اپنی زندگی کی آخری سانس تک جادۂ وفا سے سرموانحراف نہیں کیا۔ انگریز تاجر کی بیوی اپنی خود نوشت میں لکھتی ہے کہ محمد نے اسے ایک گھر میں چھپا دیا، یہاں جب خطرہ بڑھا تو اس نے اطمینان دلاتے ہوئے اپنے آقا کی بیوی سے کہا:۔

تم کو بہت زیادہ پریشان نہ ہونا چاہیئے۔ رحمت خدا پر نظر رکھو، باغیوں نے ابھی ان ہی لوگوں کو قتل کیا ہے جو شہر کے اندر تھے، باہر کے گروہ پر ابھی قبضہ نہیں پایا۔ یقین ہے کہ انگریزی فوج جلد مجتمع ہو کر نہایت قوت و سطوت کے ساتھ دہلی پہنچنے والی ہے۔ ان سے باغیوں کو تنبیہ اور واقعی سزا مل جائے گی اور تم سب لوگ آزاد ہو جاؤ گے۔ میں تم کو یقین دلاتا ہوں کہ جب تک میری جان میں جان ہے، تمہاری رفاقت سے ہرگز منہ نہ موڑوں گا۔ اور تم کو اس ورطۂ ہلاکت میں تنہا نہ چھوڑوں گا۔ ہاں اگر میں قتل کر ڈالا گیا، تو مجبوری ہے اس گھر کا مالک علی میرا ہم مذہب اور خاص دوست ہے خفیہ طور پر اس بات کو جانتا ہے کہ تم لوگ یہاں پوشیدہ ہو۔ لیکن وہ اس کو زبان پر نہیں لاتا اور تجاہل عارفانہ کر رہا ہے آج صبح میری اور اس کی جب ملاقات ہوئی تو اس نے کہا کہ میں ان لوگوں کو صرف ۴۸ گھنٹہ اور اپنے گھر میں پناہ دے سکتا ہوں۔ اس مدت کے گزرنے کے بعد ان کو میرا گھر چھوڑنا

---

[1] تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاءاللہ) صفحہ ۸۷۳

پڑے گا۔ لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ اس کا ذرا غم نہ کرو اور کوئی خطرہ دل میں نہ لاؤ۔ انشاء اللہ میں اس ۴۸ گھنٹے کے اندر ہی تمہارے لئے کوئی دوسری پناہ کی جگہ تلاش کئے دیتا ہوں، بلکہ اس فکر میں ابھی جاتا ہوں۔[1]

جو کہا تھا وہ کر دکھایا

محمد فیل بان نے، اپنی وفاداری اور جاں نثاری کے سلسلہ میں جو کہا تھا وہ کر دکھایا، اس خاندان کو وہ ایک اور گھر میں ایک عورت کے ذریعہ لے گیا، پھر کوئی مستقل جائے پناہ تلاش کرنے کے لئے نکلا، مگر پھر واپس نہ آسکا راہ وفا میں قربان ہو گیا۔

"وہی عورت جو ہم کو یہاں لائی تھی، اندر داخل ہوئی، اس وقت کیا بتاؤں کہ خوشی میں میرا کیا حال تھا جھٹ اٹھ کر دوڑی اور اس کا بازو پکڑ کر پوچھا "ہمارا فیل بان کہاں ہے؟" یہ ہندوستانی عورتیں انگریزوں کی جو خدمتگاری کرتی ہیں۔ بقدر ضرورت انگریزی کے چند کلمے اپنے مطلب کے اظہار کے لئے طوطے کی مانند یاد کر لیتی ہیں۔ اگر ان سے کوئی طولانی تقریر کی جاتی، تو وہ اس کو پوری طرح نہیں سمجھ سکتیں۔ لہذا اس عورت نے میرے سوال کے جواب میں صرف اتنا ہی کہا کہ وہ گرفتار ہو گیا۔

اس سے زیادہ مطلب حل نہ کر سکی۔ ہاتھ کے اشارہ سے بتایا کہ لوگ اسے کھینچتے ہوئے لے گئے اور ہلاک کر دیا۔

یہ سنتے ہی زمین میرے پاؤں کے نیچے سے نکل گئی، آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ یہ بات بالکل صحیح ہے کہ انسان حالت بدبختی میں بعض اوقات بہت زیادہ اپنا بھی خواہ ہو جاتا ہے۔"

یہ کس کی لاش تھی؟

یہ انگریز خاندان، محمد کے قتل کے بعد، ادھر ادھر بھٹکتا پھرا، ایک روز راستہ بھول کر اپنے گھر کے قریب ایک جنگل میں پہنچا۔ وہاں وہ ہاتھی دکھائی دیا جس کا فیل بان محمد تھا:-

ہاتھی ہمارے بالکل قریب آگیا اور اپنی سونڈ سے ہم میں سے ایک ایک کو سلام کیا

---

[1] خانم انگلیسی در بلوائے ہندوستان

قیصر باغ کا ایک دروازہ (لکھنؤ)

میرے شوہر نے ہاتھ بڑھا کر آہستہ سے اس کی سونڈ کو سہلایا اور ہندی زبان میں کہا "تو یہاں کیا کر رہا ہے" ہاتھی یہ سن کر ہم سے جدا ہو گیا۔ اور درخت کے تنے سے جا لپٹا۔ اپنی سونڈ کو بار بار بلند کر کے ایک لاش پر ملتا تھا۔ جو درخت پر لٹکی ہوئی تھی۔ ولیم نے کہا یہ حیوان بہ سبب اس انس کے جو اپنے فیل بان محمد سے رکھتا تھا اس وقت سے کہ باغیوں نے اس بچارے کو اس کی آنکھوں کے سامنے قتل کیا اور درخت سے لٹکایا، اس درخت کے نیچے کھڑا ہوا ہے، اور لاش کے چاروں طرف جا جا کر نالے کرتا ہے، شاید یہ لاش سے اس لئے جدا نہیں ہوتا کہ صحرائی جانور اس کو کھا ڈالیں گے۔

ہاتھی جس قدر بڑے ڈیل ڈول کا ہے اسی قدر زیادہ ذی شعور اور صاحب ادراک ہے، بلکہ اس کا ادراک تمام حیوانوں سے زیادہ ہے، وہ انسان کی طرح نیکی و بدی، محبت اور عداوت کا ادراک کرتا ہے، دوستی اور غمخواری کے وقت یار و مددگار رہے اور کینہ و دشمنی کے وقت بلائے جان۔ یہ ہاتھی چونکہ بچہ خریدا گیا تھا۔ اس لئے فیل بان (محمد) سے بہت زیادہ مانوس ہو گیا تھا اور اس میں شک نہیں کہ فیل بان مرحوم نے اس کی خدمت بھی بہت کی تھی۔

چونکہ ہاتھی کی قیمت دو ہزار روپیہ سے زائد تھی، باغیوں نے فیل بان کے قتل کر دینے کے بعد چاہا کہ اس پر قابو ہو جائے۔ مگر یہ قابو میں نہ آیا۔ دن بھر تو جنگل میں مارا مارا پھرتا اور رات کو اپنے قدیم خدمتگار کی حفاظت کے لئے اس درخت کے نیچے آجاتا۔[1]

یہ دستگیری کرنے والے کون تھے!

غدر اپنی پوری ہولناکی کے ساتھ شروع ہو چکا تھا، انگریز قتل کیے جا رہے تھے، لیکن اس نازک موقع پر بھی، ان لوگوں تک نے جو انگریزوں کے دشمن اور تحریک بغاوت کے شریک تھے، اپنے انگریز افسروں کی جان کی حفاظت کی۔

۹ تاریخ کی دوپہر کو تیسرے رسالہ کے افسر قیدی سواروں کے پاس جیل خانہ

---

[1] خانم انگلیسی در بلوائے ہندوستان

ہیں گئے کہ قیدیوں کی تنخواہوں کا حساب کرکے دے دیں تو ان افسروں میں لفٹنٹ میوگیف صاحب بھی تھے، جب وہ اپنے گھر کو لوٹے جیل خانہ سے آتے تھے، تو بعض ہندوستانی افسروں نے ان سے کہا کہ سپاہیوں نے اپنا یہ ارادہ مصمم کر لیا ہے کہ وہ اپنے ساتھیوں کو قید سے چھڑائیں اور جیل خانہ کے ہندوستانی سپاہیوں کے پہرہ داروں کے ان سے وعدہ کر لیا ہے کہ ہم اس کام میں ان کے ممد و معاون ہوں گے۔

گف صاحب اپنے گھوڑے پر سوار ہوئے اور ان میں سواروں کے ساتھ جتنی جلد ممکن تھا، پیدل سپاہ کی پریڈ کے میدان میں گئے اس وقت یہاں بلوہ بڑی شدت سے ہو رہا تھا جس کا اوپر بیان ہوا بعض سپاہی وردی اور بعض اپنا ہندوستانی لباس پہنے ادھر ادھر تگ و دو کر رہے تھے، ناچتے، کودتے، غل غپاڑہ ایسا کرتے تھے کہ انہوں نے کوئی گڑھ فتح کر لیا۔

گف صاحب نے یہ حال دیکھ کر کہ اب بلوہ روکنے پر کوئی اختیار نہ رہا اپنے تینوں سواروں کے ساتھ اپنی لین میں آئے۔ تو وہاں انہوں نے دیکھا کہ سپاہی اپنے گھوڑوں پر زین لگا رہے ہیں اور رجمنٹوں کے میگزین لوٹ کر گولی بارود لے رہے ہیں، انہوں نے اس برافروختگی کے فرو کرنے میں کوشش کی رہی کروٹوں رزنگ روٹ)، تے دو گولیاں ان پر چلائیں۔ مگر ان کی جان لینے کا سپاہیوں نے عزم مصمم نہیں کیا۔ آخیر کو ہندوستانی افسروں نے ان سے کہہ دیا کہ اب ہم آپ کی جان بچانے کے ضامن نہیں ہوتے۔ اس وقت بالکل اندھیرا تھا گف صاحب مع اپنے معتمد سواروں کے یورپین لین کی طرف گئے، ان کو راستہ میں آدمیوں کی بڑی بھیڑ ملی جو باہر سے چلے آتے تھے ان کے پاس تلواریں اور لکڑیاں اور ہتھیار تھے، ان کو پھاڑ چیر کر وہ نکل گئے ہندوستانی افسر اور دو سوار ان کے پیچھے تھے۔ انہوں نے صاحب کا ساتھ جب تک نہ چھوڑا کہ آرٹلیری بلیس صاحب کو نظر آیا۔ تو انہوں نے اپنے گھوڑے کی باگیں تھام کر کہا کہ اب ہم آپ کے ساتھ نہیں جا سکتے

ہرچند صاحب نے ان کو اپنے ساتھ رہنے کے لئے کہا مگر ان پر اثر نہیں ہوا انہوں نے کہا کہ یہ ناممکن ہے کہ ہم اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کو چھوڑ دیں انہوں نے صاحب کو مؤدبانہ سلام کیا اور اپنے باغیوں کے ساتھ گھوڑے دوڑانے لگے پھر گف صاحب نے ان اپنے دوستوں کی جنہوں نے مصیبت کے وقت میں دستگیری کی تھی تلاش کی مگر کچھ پتہ نہ ملا۔[1]

انگریز عورتوں اور پادریوں کا لحاظ

بغاوت کے شعلے بھڑک رہے تھے، انگریزی حکومت قصہ ماضی بن گئی تھی، صاحب بہادر عالی شان مع اپنے حوالیوں موالیوں کے گرفتار ہوتے تھے، ان پر زیادتی بھی ہوتی تھی۔ لیکن کیا مجال ہے کہ عورت کی بے حرمتی یا پادری کی توہین کی جائے۔ ایک مسلمان گروہ باغیاں کا ذکر ہے:۔

"باغیوں نے خوب اچھی طرح سے لوٹ مار کرکے سرائے کے قریب آگ روشن کی اور مال غنیمت تقسیم کرنے لگے، میں تارک الدنیا عورتوں کے ساتھ ایک تاریک گوشہ میں بیٹھی ان کی یہ حالت دیکھ رہی تھی، سرداران کا ایک گوشہ میں خاموش بیٹھا تھا اور ان کے جرم میں شریک نہ تھا۔ اور منع بھی نہ کرتا تھا۔ البتہ جس وقت سپاہیوں نے چاہا کہ بیکس عورتوں کو ستائیں اور پادری کو ایذا دیں تو وہ اس فعل زشت سے مانع آیا۔[2]

وہ مسلمان باغی سوار

بغاوت میں عملی حصہ لینے والے اور انگریزی حکومت کو بیخ و بن سے اکھاڑ دینے والے کا عزم کرنے والے سپاہی بھی، انگریز کے خون ناحق سے اپنے ہاتھ آلودہ ہونے نہیں دیتے تھے:۔

انگریزی پیادوں کی تعداد اتنی کم تھی کہ وہ دشمن کی وسیع لائن پر حملہ نہیں کرسکتے تھے، وہ اپنے کیمپ میں ساڑھے آٹھ بجے رات کے واپس گئے باغیوں کی آتش بازی بالکل موقوف ہوئی، اس لڑائی میں تین افسر اور سترہ

---

[1] تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) صفحہ ۴۰۴
[2] خانم انگلیسی در بلوائے ہندوستان۔

سپاہی ۲۵ گھوڑے مقتول اور سات افسر اور ستر سپاہی مجروح ہوئے اور ۳۵ گھوڑے زخمی اور دو سپاہی گم ہوئے۔ مقتول افسروں میں لفٹنٹ کرنیل سمل تھے جو حسین اور بہادر تھے، زخمیوں میں برگیڈیر جان ہوپ گرنٹ تھے، ان کے گھوڑے کے گولی لگی، ان کی جان بچانے میں ان کی آئینی رجمنٹ کے ۲ دو سپاہیوں نے اپنی جان کا کچھ خیال نہ کیا اور گرنیٹ صاحب سے کہا میرے گھوڑے پر سوار ہو جائیے اس سبب سے آپ کی جان بچ سکتی ہے برگیڈیر صاحب لکھتے ہیں اس سوار کی میں بڑی تعریف کرتا ہوں، وہ ایک ہندوستانی مسلمان سوار اس رجمنٹ کا تھا۔ کہ جس نے بغاوت کی تھی، اس کے لئے یہ آسان بات تھی کہ وہ مجھ کو مار کر دشمن سے جا ملتا مگر اس نے نہایت عمدہ کام کیا کہ میری جان بچانے کے لئے اپنی جان کی پرواہ نہ کی، میں نے اس کا گھوڑا نہ لیا، مگر میں نے اس کے گھوڑے کی دم کو مضبوط پکڑ کر کہا کہ تو مجھے اس بھیڑ سے نکال لے جا۔ اس نے یہ کام بڑی خوش اسلوبی سے اور جرأت سے کیا، دوسرے دن برگیڈیر نے اس خان کو اپنے خیمہ پر بلایا اور اس کی بہادری کی تعریف کی اور کچھ روپے اس کے آگے رکھے تو اس خان نے ایک استغنا کے ساتھ روپے لینے سے سلام کر کے انکار کیا۔[1]

انگریزوں کی مدد کرنے والے بھی گرداب بلا میں پھنسے

ذیل کا دلچسپ واقعہ خاص طور پر دلچسپ اور قابل ملاحظہ ہے:-

مولانا عالم علی مرحوم رئیس مرادآباد جو روہیل کھنڈ کے ایک مشہور عالم اور طبیب اور نامور محدث تھے انہوں نے چند یورپین عورتوں اور بچوں کو باغیوں کے ظلم سے بچانے کے لئے اپنے مکان میں چھپا لیا تھا، مگر اتفاق سے باغی سپاہیوں کو خبر ہو گئی اور انہوں نے مولوی صاحب کے مکان میں گھس کر ان سب کو قتل کر ڈالا۔ مولانا موصوف اس خیال سے کہ یہ حادثہ

[1] تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) صفحہ ۵۹۱

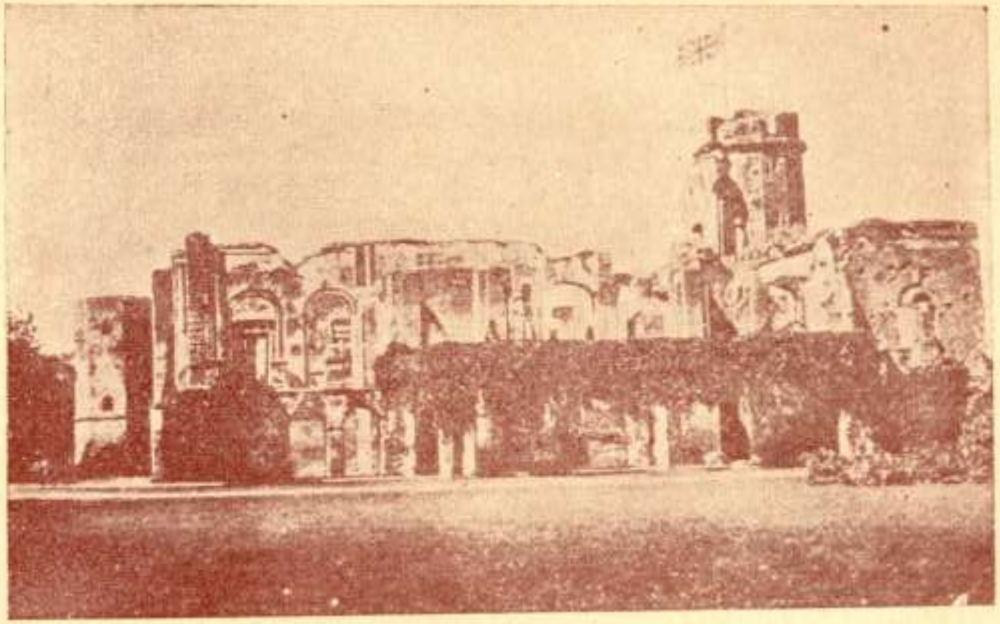

ریزیڈنسی کا ایک منظر (لکھنؤ)

عظیم ان کے مکان میں گزرا تھا اور ان کا کوئی عزیز یا رشتہ داران مقتولوں کے ساتھ نہیں مارا گیا تھا۔ سرکاری تسلط کے وقت مرادآباد سے کہیں چلے گئے تھے اور حکام ضلع کو ان کی تلاش درپیش تھی اور ان کی نسبت یہ گمان تھا کہ باغیوں کے ساتھ ان کی ضرور سازش تھی ورنہ ان کے آدمی بھی مقتولوں کے ساتھ یقیناً مارے جاتے مگر سر سید کو معلوم ہو گیا تھا کہ مولوی عالم علی محض بے قصور تھے کہ باغیوں کو مولوی صاحب سے کوئی وجہ عداوت کی نہ تھی کہ وہ ان کو یا ان کے رشتہ داروں کو بھی مار ڈالتے اور خود ان میں اتنی طاقت نہ تھی کہ باغی سپاہ کا مقابلہ کرتے۔ چنانچہ سر سید نے مولوی صاحب کی بریت کے لئے صاحب ضلع سے باوجود یکہ وہ نہایت برافروختہ تھے بڑی دلیری سے گفتگو کی اور یہ کہا کہ مولوی عالم علی کو میں کے سامنے حاضر کر سکتا ہوں، لیکن جب تک آپ وعدہ نہ کریں کہ ان سے کچھ مواخذہ نہ کیا جائے گا، اس وقت تک میں ان کے بلانے کی جرأت نہیں کر سکتا آخر صاحب ضلع نے ان سے یہ وعدہ کر لیا کہ ہم ضابطہ کی تحقیقات تو ضرور کریں گے، لیکن چونکہ ہمارے نزدیک وہ بے قصور ہیں بعد ضابطہ کی کارروائی کے ان کو بری کر دیا جائے گا، چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ سر سید نے مولوی صاحب کو بلا کر عدالت میں پیش کر دیا۔ اور ضابطہ کی کارروائی کے بعد وہ بالکل بری کر دیئے گئے۔[1]

انگریز کا اعتراف

خود انگریز بھی اس حقیقت کے معترف ہیں کہ غدر کے دوران میں اندھا دھند مظالم ان کی قوم پر نہیں کئے گئے:۔

دس دن کے اندر اندر تمام اودھ سے انگریزی حکومت اس طرح غائب ہوئی کہ ڈھونڈنے سے بھی اس کا کہیں سراغ نہ ملتا تھا، فوجوں نے بغاوت کا اعلان کر دیا۔ اور لوگوں نے بھی اپنے آپ کو آزاد سمجھ لیا، لیکن اس تمام عرصہ میں نہ کوئی منتقمانہ کارروائی عمل میں لائی گئی، اور نہ کہیں کسی پر ظلم کیا گیا

---

[1] حیات جاوید رحالی، صفحہ ۵۷

چنانچہ اودھ کے بہادر اور سرکش باشندوں نے سوائے چند مستثنیات کے عام طور پر پناہ گزیں انگریزوں کو نہایت مہربانی اور شفقت سے اپنے ہاں پناہ دی بالخصوص اودھ کے تعلقہ داروں نے تو نہایت فیاضی اور فراخ حوصلگی سے اپنے مفتوح آقاؤں کے ساتھ ہمدردی کا سلوک کیا حالانکہ اس سے پیشتر انگریزوں کے ہاتھوں سے انہیں متعدد نقصانات اٹھانے پڑے تھے اور وہ کئی قسم کی ناانصافیوں کے شکار رہ چکے تھے۔ لہ

حقیقت واقعہ | پنڈت جواہر لال نہرو، اپنی تاریخ میں بالکل صحیح لکھتے ہیں:-

"بہت سی جھوٹی تاریخیں لکھی گئی ہیں جن میں غدر کے واقعات مسخ کر کے دکھائے گئے ہیں، ہندوستانیوں کے جو خیالات اس بارے میں ہیں ان کو چھپنے اور شائع ہونے کا موقع شاذ و نادر ہی ملتا ہے۔ ساور کر نے "ہندوستان کی جنگ آزادی تاریخ" آج سے تقریباً تیس سال پیشتر لکھی تھی، مگر یہ کتاب اس وقت ممنوع کر دی گئی اور آج تک ممنوع ہے البتہ کبھی کبھی بعض صاف گو، دیانت دار انگریز مورخین نے حقیقت کے چہرے سے نقاب اٹھائی اور اس طرح ہمیں اس زمانے کی قاتلانہ ذہنیت اور نسل پرستی کے جنون کی ایک جھلک نظر آ جاتی ہے"

"میرے اپنے وطن یعنی الہ آباد کے شہر اور ضلع اور اس کے قرب و جوار میں جنرل نیل کی خونی ریز عدالتوں (BLOODY ASSIZENS) کا زور تھا۔ ٢ہ

ہر ہندوستانی تہ تیغ کیا گیا | جب انگریزوں نے تلوار سنبھالی تو کسی کے ساتھ رعایت نہیں کی، کسی پر رحم نہیں کھایا، کسی کے ساتھ انسانیت اور شرافت کا برتاؤ نہیں کیا، ایک انگریز اعتراف کرتا ہے:-

لکھنؤ پر قبضہ کرنے کے بعد قتل و غارت کا بازار گرم کیا گیا چنانچہ ہر ایسے

FOREST, I.P. 222 لہ

DISCOVERY OF INDIA. By. P.J. NEHRU ٢ہ

ہندوستانی کو قطع نظر اس سے کہ وہ سپاہی ہے یا اودھ کا دیہاتی بے دریغ
تہ تیغ کیا گیا یہاں تک کہ نہ تو کوئی سوال ہی کیا جاتا تھا اور نہ ہی اس قسم کا
کوئی تکلف روا رکھا جاتا تھا، بلکہ محض سیاہ رنگت ہی اس کے مجرم ہونے
کے لئے کافی دلیل سمجھی جاتی تھی اور ہلاکت کے لئے ایک رسہ اور درخت
کی شاخ کا استعمال کیا جاتا تھا۔ یا اگر یہ مہیا نہ ہوں تو بندوق کی ایک گولی
بے گناہ انسان کے دماغ کو چیرتی ہوئی نکل جاتی تھی۔[1]

پھانسی — دلدار علی خاں کپتان ساکن دہلی اور مرزا نواب نائب کپتان رئیس
اودھ نے جب دیکھا کہ تلنگے بھاگ نکلے۔ تو یہ دونوں بھی بھاگ گئے، میر نواب
گرفتار ہو کر آگئے، لیکن ان کے خسر جیل خانے کے داروغہ تھے، ان کی سفارش
سے یہ چھوٹ گئے اور پھر اپنے وطن چلے گئے، دلدار علی خاں کی گرفتاری کا اشتہار
ہو گیا کچھ عرصہ بعد پانی پت سے گرفتار کر کے لائے گئے، ۱۷ جون ۱۸۵۸ء
کو پھانسی دے دی گئی۔[2]

یہ انسان تھے یا درندے؟ لکھنؤ پر انگریزوں نے قبضہ کیا، تو ایسا معلوم ہوا جیسے
انھیں ہفت اقلیم کا خزانہ لوٹنے کی اجازت مل گئی
یہ حاکم قوم کے فرد تھے، لیکن اپنی حرکتوں سے انہوں نے لٹیروں، قزاقوں، رہزنوں اور
ڈاکوؤں کو کہیں پیچھے چھوڑ دیا:۔

ڈاکٹر رسل لکھنؤ کی لوٹ کا چشم دید حال لکھتے ہیں اس میں کہتے ہیں کہ لوٹ
کا حال بیان نہیں ہو سکتا، سپاہیوں نے (لکھنؤ میں) مکانوں کے کواڑوں
کو توڑا جس میں زر بفت و زر دوزی و کمخواب کے لباس، چاندی سونے کے
ڈھیر تھے چاندی کے برتنوں کا انبار تھا، طبلے دوشالے، دوپٹے رو دلائیاں
و رضائیاں آلات موسیقی، تصویریں، کتابیں، بیاضیں، بڑے پر تکلف
جھنڈے، نیزے غرض اگر ان سب چیزوں کے ڈھیروں کی فہرست بنائی جائے

---

[1] MAJENDIE, P, 195, 196

[2] نفرت نامہ گورنمنٹ صفحہ ۶۳

تو وہ ایک سوداگر کی دوکان کی فہرست اسباب بن جائے گی، ان چیزوں کے لوٹنے کے لئے سپاہی غنیمت کی خوشی سے مست ہو رہے تھے انہوں نے تمام جامہ ہائے زریں میں آگ لگا دی کہ ان میں سے چاندی و سونا نکال لیں زیوروں میں سے جواہرا کھیڑے چینی کے برتنوں اور گلاسوں کو توڑ ڈالا، تصویروں کو لپیٹ کر آگ میں ڈالا۔ دوسرے اسباب کا بھی حال کیا یہ سارے کام دن بھر شوخی و شرارت کے لئے غرض لکھنؤ پر سپاہ قابض ہوئی تو لوٹ کا عجب تماشا تھا۔ ان مکانوں میں تمام ایشائی صناعوں کی چیزوں کے اور عیش و نشاط کے اسباب کے خزانے تھے وہ سب غلط ملط پڑے تھے جو سپاہی حریص تھے انہوں نے پوشیدہ و مدفون مالوں کو نکال لیا، بیش قیمت چیزیں ان کے حصے میں آئیں، کم قیمت چیزیں بھیر بنگاہ کے آدمیوں کے ہاتھ لگیں [1]

انگریزوں کے عبرت ناک مظالم | سر سید اعتراف کرتے ہیں کہ:۔

لوگوں کو عبرت ناک سبق دینے کے لئے نجیب آباد میں بھی انہی مظالم کا اعادہ کیا گیا، جو بقیہ ہندوستان پر توڑے جا رہے تھے۔ ۱۹ اپریل ۱۸۵۸ء کو محمود خاں کے چھوٹے بھائی جلال الدین خاں اور سعد اللہ خاں کو نور پور میں پھانسی دی گئی اور ان کا دیوان خانہ بارود سے اڑا دیا گیا۔ نگینہ کے باغوں میں چھپے ہوئے لوگوں کو انگریزی فوج نے قتل کیا، قاضی محلہ کے سب آدمی مارے گئے، دھام پور کی سڑک پر جس قدر بھی آدمی ہاتھیوں پر سوار تھے، سب کو قتل کیا گیا، خاص باغی دیہات تباہ دیئے گئے تھے کہ وہ بالکل غارت کر دیئے جائیں اور ان میں باغیوں کے سر لٹکائے جائیں [2]

جانس کی رائے تھی کہ موت کی سزا طرح طرح کی تکلیفیں دے کر

---

[1] تاریخ ہندوستان حصہ سوم (افادت ہند) ذکاء اللہ صفحہ ۶۱۔
[2] تاریخ سرکشی بجنور (سر سید)

چھتر منزل - (لکھنؤ کی ایک یادگار تاریخی عمارت)

دی جائے، مثلاً مجرم کی کھال اتاری جائے، زندہ جلایا جائے، پھانسی آسان موت ہے۔ جو مسلمان تنومند با وجیہہ تھے ان کو پکڑ کر کوتوالی پہنچا دیا جائے، بہت کم ایسے مسلمان تھے جو سپاہیانہ شان رکھتے ہوں، اور پھانسی سے بچے ہوں۔ پنشا و رسے لے کر مشرقی و شمالی ہند تک شاید ہی کوئی مالدار مولوی، نمازی مسلمان ہوگا جو نہ پکڑا گیا ہو۔[1]

معصوم انسانوں کا سنگدلانہ قتل۔

پارلیمنٹ کے محفوظ ریکارڈ میں گورنمنٹ ہند کی وہ تمام یادداشتیں محفوظ ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ باغیوں کے علاوہ عام آبادی میں سے بھی مردوں، عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو پھانسی پر لٹکایا گیا، نہ صرف پھانسی پر اکتفا کیا گیا۔ بلکہ دیہاتوں میں ان کے اپنے مکانوں میں بند کرکے آگ لگا دی گئی۔ جنرل اوٹرم کی رائے میں یہ واقعہ معصوم انسانوں کا سنگدلانہ قتل تھا۔[2]

اوٹرم اور کیننگ۔ جب اوٹرم صاحب فاتح لکھنؤ ہوتی باغ سے واپس اپنے پہلے مکان میں آئے تو لارڈ کیننگ کا اشتہار اودھ والوں کو ملا۔ اس اشتہار کا منشا یہ تھا کہ سرزمین اودھ کی کل اراضی باستثنار چھ تعلقہ داروں کی ضبط کی جائے، سرکش تعلقہ داروں میں جو کوئی فوراً اپنے تئیں گورنمنٹ کے حوالے کر دے تو اس سے موت اور قید کی سزا معاف کرنے کا وعدہ کیا جاتا تھا، بشرطیکہ وہ ثابت کرے کہ وہ ثابت کرے کہ وہ بغیر اشتعال کے کسی کے قتل کا مرتکب نہیں ہوا اور جن لوگوں نے انگریزوں کی جانیں بچائی ہیں، ان کے ساتھ خاص عنایتوں کا وعدہ کیا جاتا ہے، یہ اشتہار

---

[1] تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ)
[2] غدر ۵۷ء کے ہیرو، صفحہ ۶۲

اس وقت آیا کہ لکھنؤ پر قبضہ ہو گیا تھا مگر کل اودھ میں فتنہ و فساد برپا تھا باغی سپاہ جس کی کوشش لکھنؤ کے بچانے میں اکارت گئی تھی وہ ضلعوں میں چل گئی تھی کہ از سر نو انگریزوں کا مقابلہ کرے، سر افسر جو اس لشکر کشی میں شریک تھا، اس اشتہار کی پالیسی کے خلاف تھا۔ کہ ایسی حالت میں کل آدمی جو مسلح میدان جنگ میں موجود ہیں، اپنے حق موروثی سے محروم کیے جائیں اوٹرم صاحب نے گورنر جنرل کو تبلایا کہ ۱۸۵۶ء کے بندوبست میں تعلقہ داروں کے ساتھ ناانصافی کی گئی ہے، وہ گورنمنٹ کی ایسی متزلزل حالت میں کبھی خیر خواہ نہیں رہ سکتے تھے ان وجوہ سے ان کے ساتھ ایسا سلوک کیا جائے جیسا کہ معزز دشمن سے کیا جاتا ہے نہ ایسا کہ باغیوں کے ساتھ اگر ان سے سوائے اس کے کہ وہ موت اور قید کی سزا سے معاف کیے جائیں گے کوئی اور نیک سلوک کا وعدہ نہیں کیا جائے گا تو وہ مایوس ہو کر بن مانسوں کی لڑائی لڑیں گے جس میں یوروپین ہزاروں مارے جائیں گے، اس کے برعکس اگر یہ مستحکم سند ان کو دی جائے گی کہ وہ اپنی زمینوں پر قابض رہیں گے، تو وہ گورنمنٹ کے ممد و معاون ہوں گے اس کا جواب لارڈ کیننگ نے رنجیدہ خاطر ہو کر لکھا اور اپنی بات پر اڑے رہے مگر بہت سی بات چیت و تکرار کے بعد سر جیمس اوٹرم کو یہ اجازت دی گئی کہ وہ اس اشتہار میں یہ فقرہ اور اضافہ کریں گے کہ وہ لوگ جو اپنے تئیں گورنمنٹ کے لطف و کرم کے حوالہ کریں گے اور امن و امان کے قائم کرنے میں گورنمنٹ کے ممد و معاون ہوں گے ان کے استحقاق مستحکم کیے جائیں گے، اشتہار میں باقی فقرے بدستور رہیں۔[1]

بندوبست کے نام پر غارت گری غدر کے بعد با تسلط اور اقتدار حاصل کرتے ہی انگریزوں نے نیا بندوبست کیا اور اس بہانے سے تعلقہ داروں اور زمینداروں کو مفلس اور کنگال بنانے کا فیصلہ کر لیا، حالانکہ اس گروہ کی اکثریت دل و جان سے انگریزوں کے ساتھ تھی، ۱۸۵۶ء۔۵۷ء میں جو بندوبست ہوا

[1] تاریخ ہندوستان (بغاوت ہند) ذکاء اللہ ۶۳

اس کی اور واجد علی شاہ کے عہد کی آمدنی کا مقابلہ کر کے بہت پرشاد متوطن آگرہ کی تاریخ اودھ سے دکھاتا ہوں، یہ تاریخ سلیمین صاحب ریزیڈنٹ کے کہنے سے لکھی گئی ہے، یہ شخص ریزیڈنٹ کے ساتھ رہتا تھا، اور اخبار نویسی کا عہدہ رکھتا تھا۔

قسمت	ضلع	مالگزاری عہد سلطنت	مالگزاری کی جمع مالگزاری حسب بندوبست جدید	معافی کی جمع مالگزاری بندوبست انگریزی	جمع مالگزاری معافی و خیرات متعلقہ حسب بندوبست جدید	تعداد و تعلقہ جات درجہ مالگزاری: تعداد کل تعلقہ جات	جمع
لکھنؤ	خاص لکھنؤ	۹۹۸۶۸۱	۹۲۱۰۸۷	۱۷۱۳۸۹	۱۱۳۳۶	۵۷	۳۰۷۶۳۴
	دریا باد	۳۶۸۷۲۶	۹۹۷۳۳۵	۲۷۷۲۷	۱۸۸۵۱	۶۹	۵۳۰۳۴۹
	اناؤ	۱۱۱۵۳۶۴	۱۱۲۳۷۹۸	۱۷۶۶۳	۴۴۴۹	۴۴	۳۱۷۲۰۵
	سلطان پور	۱۱۶۱۹۵۷	۹۵۷۴۶	۶۸۲۳۳	۱۲۵۶۳	۲۷	۵۱۹۹۸۹
فیض آباد	خاص فیض آباد	۱۱۱۰۳۹۴	۱۱۳۷۲۹۷	۳۹۲۲۹	۶۳۰۳	۲۸	۷۶۱۸۱۴
	پرتاب گڑھ	۲۴۳۶۶۸	۱۳۷۹۴۰	۵۶۲۵	۱۶۵۷۷	۳۴	۱۰۳۹۷۲۴
	ہردوئی	۱۴۶۱۳۶۱	۱۱۹۶۵۶۴	۲۷۳۹۴	۳۱۴۱	۶۴	۴۷۷۱۲۸
خیر آباد	سیتاپور	۱۳۵۸۵۷۴	۹۴۱۹۸۷	۳۱۵۶۰	۳۲۸۰	۱۷۱	۷۱۷۳۴۵
	لکھیم پور	۵۰۰۰۰۰	۴۲۱۱۶۰			۷۲	۱۱۵۶۱۷
بہرائچ	خاص بہرائچ	۸۹۸۹۵۱	۵۸۹۶۱۶	۱۹۳۱۷	۲۶۶۱	۴۲	۵۶۸۵۳۹
	گونڈہ	۱۷۷۸۰۹	۹۴۷۳۵۰	۱۰۱۶۰	۱۹۳۹۵	۵۲	۵۵۰۰۷۰
	ملانوان	۲۶۳۳۳۰	۲۵۷۳۸۰	۹۰۲۵۰	۱۸۰۰	۲۶	۲۹۰۰۲۰

جب ملک اودھ سرکاری عملداری شامل ہوا تو (انگریزوں نے) یہ خیال نہیں کیا کہ یہاں تعلقہ دار دو تہائی زمین کے مالک ہیں پہلے ہی سال کے بندوبست سرسری کا یہ نتیجہ تھا کہ جب ملک انگریزی عملداری میں آیا تو سال اول میں ۶۶ لاکھ روپے تعلقہ داروں نے خزانہ سرکاری میں داخل کیا اور ۲۳۵۰۰ گاؤں ان کے پاس تھے اور ۵۷-۱۸۵۶ء کے بندوبست میں نصف زمین ان کے قبضہ سے نکل گئی، بعض صورتوں میں نصف سے بھی زیادہ جائداد سے بےدخل ہوئے، راجہ مان سنگھ کے پاس ۵۷۷ گاؤں تھے، اور دو لاکھ

روپیہ مالگزاری کے دیتے تھے بندوبست ۱۸۵۶-۵۷ء میں ان کے پاس ۶ گاؤں رہ گئے۔ اور صرف ۲۹۰۰ روپیہ کے مالگزار ہو گئے۔ دو لاکھ روپیہ سال کی آمدنی تھی یا تین ہزار روپے کے قریب رہ گئی۔ اسٹریچی صاحب لکھتے ہیں کہ اگرچہ یہ سچ ہے کہ راجہ مان سنگھ اودھ کے پرانے خاندانی رئیسوں میں نہ تھا، مگر بہت قدیمی خاندان بھی اس آفت سے نہیں بچے ایک خاندان کے پاس ۳۷۸ مواضع تھے۔ ۲۶۶ چھن گئے۔ ایک دوسرے خاندان کے پاس ۲۰۴ دیہات تھے ان میں سے ۱۱۵ لے لئے گئے۔ راجہ مہاوت سنگھ کے پاس ۳۲۲ گاؤں تھے۔ ستر ہزار اسی ہزار روپے مالگزاری کا دیتے تھے۔ وہ بھی دو سو دیہات سے بے دخل ہو گئے

اودھ کی رعایا ہتھیار بند تھی اور اسے اپنے ہتھیار عزیز بھی تھے۔ لیکن ایک سال کے اندر رعایا ئے اودھ سے بہ تفصیل ذیل ہتھیار چھینے گئے اور ۵۶۹ قلعے اور گڑھیاں مسمار کی گئیں۔

توپیں	۷۲۰
آتشی ہتھیار	۱۹۲۳۰۷
تلواریں	۵۷۹۵۵۴
مختلف ہتھیار	۶۹۴۰۶۰ [1]

انگریزی دور حکومت کی "برکتیں" انگریزوں کے برسر اقتدار آنے کے بعد، نہ صرف لکھنؤ بلکہ پورا اودھ تباہ ہو گیا، بلند، پست ہو گئے محلے ویران ہو گئے، امیر مینائی کہتے ہیں۔

گھر کھدنے کی پوچھو نہ مصیبت ہم سے
روتی ہے لپٹ لپٹ کے حسرت ہم سے
یا ہم جاتے ہیں گھر سے رخصت ہو کر
یا گھر ہوتا ہے آج رخصت ہم سے

منشی ذکاء اللہ، ان لوگوں میں تھے، جو انگریزوں کو، فرشتہ رحمت سمجھتے تھے، باغیوں اور انقلابیوں کو، نمک حرام، کہتے تھے۔ دل کی شہنشاہی اور لکھنؤ کی بادشاہی کا ان کے دل میں ذرا احترام نہ تھا، لیکن وہ بھی تسلیم کرتے ہیں، کہ

---

[1] تاریخ اودھ جلد پنجم رنجم الغنی، صفحہ ۲۹۰

اودھ کی ضبطی والحاق کے لئے خواہ کچھ ہی بجا و درست دلائل بیان کی جائیں۔ مگر اس میں کچھ شبہ نہیں ہو سکتا کہ جس طریقہ سے یہ پالیسی کام میں آئی اس سے ہندوستانیوں میں عام ناراضی و برگشتگی سرکار سے پیدا ہوئی۔ مسلمانوں کی ایک خود مختار آزاد سلطنت کی ضبطی نے علی العموم مسلمانوں کے دلوں کو آزار دیا، اور سرکار سے کشیدہ خاطر کیا۔

مسلمانوں کے سوا ہندوستان کے والیان ملک بھی ناخوش تھے کہ سرکار ذوالاقتدار کی خواہ کیسی ہی خیر خواہی کیجئے اس کا منہ مانگا قرض دیجئے مگر اس نے ملکوں کی ضبطی کے لئے اپنا دست آز ایسا دراز کیا ہے کہ وہ کسی طرح کوتاہ نہیں ہوتا۔ اودھ کی ضبطی نے ہر گروہ کو بدخواہ کیا۔ انگریزی سرکار نے جو نیا انتظام کیا اس میں بعض تعلقہ دار کل ریاست سے محروم ہو گئے، وہ کیوں نہ ناراض ہوتے؟ بادشاہ کے اہل دربار کو جو فائدے بادشاہ سے ہوتے تھے، وہ اب کہاں تھے؟ وہ سرکار سے نفرت کیوں نہ کرتے؟ ہزارہا آدمی بادشاہ کی ملازمت سے پرورش پاتے تھے۔ اب وہ تھوڑی سی پنشن یا عطیہ پا کر اپنے گھر میں خالی بیٹھے مشکل سے پیٹ پالتے تھے۔ وہ کیوں نہ سرکار سے عداوت رکھتے؟ سرکار انگریزی کی سپاہ کے بھی بعض استحقاق اس الحاق سے تلف ہو گئے تھے، وہ بھی کبیدہ خاطر تھے۔ اہل زراعت کو اور شہر کے صناعوں کو اور کاریگروں کو ٹیکسوں نے ناراض کر دیا۔ غرض بادشاہ کی معزولی نے تعلقہ داروں اور امرائے دربار اور وظیفہ خواروں پر رزق کا دروازہ ایسا بند کر دیا تھا کہ ان میں سے بعض نان شبینہ کو محتاج تھے، راتوں کو بھیک مانگتے تھے۔ بعض پوتڑوں کے بڑے بڑے امیر ناز و نعم میں پلے ہوئے جن کے پاس سامان عیش و عشرت کی کچھ کمی نہ تھی وہ ایسے بے سر و سامان ہو گئے تھے کہ اپنی بی بی بہو بیٹیوں کے زیور و لباس بیچ کر گزارہ کرتے تھے۔

غرض ہر فریق و ہر جماعت کی ناراضی کی وجہ تھی۔ طبع بشری کا مقتضا سرکار کا بدخواہ بناتا تھا۔ گو سرکار کا منشا یہ نہ تھا، کہ اس ملک پر جو خیر خواہی میں ضرب المثل تھا، اس طرح کی آفتیں اور بلائیں نازل ہوں کہ وہ اس کا بدخواہ ہو جائے۔[1]

---

[1] تاریخ عروج عہد انگلشیہ ذکاء اللہ صفحہ ۴۷۹

اسباب بغاوت ہند

سر سید احمد خاں کی زبان سے

ہم نے واجد علی شاہ کی معزولی دیکھ لی، جلاوطنی کا دور دیکھ لیا۔ قید فرنگ کے مصائب دیکھ لئے، غدر کی ہولناکیاں دیکھ لیں۔ اہل وطن کی ناچاریاں اور انگریزوں کی سفاکیاں اور خون آشامیاں دیکھ لیں۔ غریبوں کو امیر ہوتے اور امیروں کو غریب ہوتے دیکھ لیا۔ صاحبان جاہ و اعزاز کو ذلیل و رسوا ہوتے اور ارباب اقتدار و اختیار کو محبوس و مقتول ہوتے دیکھ لیا۔

اب ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ آخر ان ساری ہنگامہ آرائیوں کا پس منظر کیا تھا؟ ——— وہ کیا اسباب و عوامل، اور محرکات تھے جنہوں نے ایک سوتی ہوئی قوم کو بیدار کر دیا! ایک عافیت پسند قوم میں مر مٹنے کا جذبہ پیدا کر دیا، جس قوم نے نہایت آسانی اور خاموشی کے ساتھ فرنگی سامراج کا طوق اپنی گردن میں خود ڈال لیا تھا۔ آخر کیا بات تھی کہ وہی قوم کفن سر سے باندھ کر میدان میں اتری اور اس وقت تک لڑتی رہی جب تک اس کے ہاتھ شل نہ ہو گئے، جب تک اس کی تلوار کند نہ ہو گئی، جب تک اس کی ہمت اور سکت جواب نہ دے گئی۔

غدر کے اسباب و محرکات پر، ہندو، مسلمان اور انگریز مورخوں نے اپنے خیالات کا اظہار مختلف مواقع پر کیا ہے۔ لیکن اس موضوع پر سر سید احمد خاں نے جو کچھ لکھا ہے وہ حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ اس کارزار میں شریک تھے۔ وہ انگریزوں کے دوست اور وفادار جاں نثار اور فداکار تھے۔ وہ وطن پرستوں، ملت پروروں، آزادی کے پرستاروں اور حریت کے متوالوں کو علی الاعلان، "نمک حرام"، "کمینہ"، اور طرح طرح کے خطابات سے نوازتے ہیں۔ یعنی وہ ان لوگوں سے کوئی ہمدردی نہیں رکھتے جو فرنگی سامراج کے مقابلہ

میں صف آرا ہوئے تھے۔ پھر بھی انہوں نے اسباب بغاوت ہند کو لکھ کر ان کوتاہیوں کی طرف نشان دہی کی ہے۔ جو انگریزوں میں رچ گئی تھیں، یہ بڑی بات ہے اور اہم بھی اس لئے ہم اسے نظرانداز نہیں کر سکتے، اور مجبور ہیں کہ ان کی تحریر کا ایک قابلِ توجہ مقصد قارئین کے سامنے پیش کر دیں تاکہ بہ آسانی وہ اسباب نظر کے سامنے آجائیں، جنہوں نے سرسید جیسے وفادار ازل کو بھی چیخنے پر مجبور کر دیا تھا۔

۱۸۵۷ء کی سرکشی

۱۸۵۷ء کی سرکشی میں یہی ہوا کہ بہت سی باتیں ایک مدت دراز سے لوگوں کے دلوں میں جمع ہو جاتی تھیں۔ اور بہت بڑا میگ زین جمع ہو گیا تھا۔ صرف اس کی شتابی میں آگ لگانی باقی تھی کہ سال گزشتہ میں فوج کی بغاوت نے اس میں آگ لگا دی۔

چپاتی بٹنا کوئی سازش کی بات نہ تھی

۱۸۵۶ء میں ہندوستان کے اکثر ضلعوں میں دوبدہ چپاتی بٹی اور اسی کے قریب زمانے میں سرکشی ہوئی۔ اگرچہ اس زمانے میں تمام ہندوستان میں وبا کی بیماری تھی، اور خیال میں آتا ہے کہ اس کے دفعہ کرنے کو بطور ٹوٹکہ یہ کام ہوا ہو کیونکہ جاہل ہندوستانی اس قسم کے ٹوٹکے بہت کیا کرتے تھے۔ مگر حق یہ ہے کہ اس کا اصلی سبب اب تک نہیں کھلا۔ لیکن، اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ چپاتی کسی سازش کی بنیاد نہیں ہو سکتی۔ یہ قاعدہ ہے کہ اس قسم کی چیز البتہ ایک نشانی ہوتی ہے واسطے تصدیق زبانی پیغام کے اور ظاہر ہے کہ اس چپاتی کے ساتھ کوئی پیغام نہ تھا۔ اگر ہوتا تو ممکن نہ تھا کہ باوجود منتشر ہونے کے اور ہر قوم اور ہر طبیعت کے آدمیوں میں پھیلنے کے مخفی رہتا۔ جس طرح پر کہ ہندوستان میں سرکشی پھیلی اور یہاں سے وہاں اور وہاں سے وہاں دوڑی، صاف دلیل ہے کہ پہلے سے کچھ سازش نہ تھی۔

اودھ کی ضبطی

اودھ کی ضبطی کو بھی ہم سبب اس سرکشی کا نہیں سمجھتے، اس میں شک نہیں کہ اودھ کی ضبطی سے سب لوگ ناراض ہوئے اور سب نے یقین کیا کہ آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی نے خلاف عہد اور اقرار کے کیا عموماً رعایا کو ضبطی اودھ سے اس قدر ناراضی ہوئی تھی کہ ہمیشہ ہوا کرتی تھی، جب کمپنی کسی ملک کو فتح کرتی تھی جس کا بیان آگے آوے گا۔ زیادہ تر ڈر اور خوف اور ناراضی دلی، والیان اور رئیسان خود مختار ہندوستان

کو ہو ئی تھی سب کو یقین تھا کہ اس طرح سب کے ملک اور سب کی ریاستیں اور حکومتیں چھین جاویں گی، مگر ہم دیکھتے ہیں کہ صاحب ملک رئیسوں میں سے کوئی باغی نہیں ہوا۔ اس فساد میں اکثر وہی لوگ ہیں جن کے ملک ان کے ہاتھ میں نہیں ہیں۔ اس کے جواب میں یہ مت کہو کہ جھجر کا نواب اور بلبب گڑھ کا راجہ اور فلاں فلاں باغی ہو گیا۔

۱۸۲۷ء میں لارڈ امہرسٹ صاحب

لارڈ امہرسٹ صاحب کا کہنا کہ خاندان تیمور دلی کا بادشاہ نہیں

بہادر نے علانیہ کہہ دیا تھا کہ ہماری گورنمنٹ اب کچھ تیموریہ خاندان کے تابع نہیں ہے بلکہ وہ خود ہندوستان کی بادشاہ ہے تو اس وقت رعایا اور والیان ہندوستان کو کچھ بھی خیال نہیں ہوا تھا گو خاص بادشاہی کے خاندان کو کچھ رنج ہوا ہو۔

فوج باغی کا پہلے سے دلی کے معزول

پہلے سے فوج باغی کی بادشاہ دہلی سے سازش نہ تھی

بادشاہ سے سازش کرنا محض بے اصل ہے۔ دلی کے بادشاہ کو کوئی شخص ولی اور مقدس نہیں سمجھتا تھا اس کے منہ پر اس کی لوگ خوشامد کرتے تھے اور پیٹھ پیچھے ہنستے تھے۔ لوگ اس کے مرید ہوتے تھے کسی فائدے کی نظر سے نہ بطور اعتقاد کچھ عجب نہیں کہ کسی پلٹن کا کوئی تلنگا یا صوبہ دار بھی مرید ہوا ہو مگر اس بات کو سازش بغاوت سے کچھ بھی علاقہ نہیں ہے۔ بلاشبہ فوج باغی دلی پر جمع ہو گئی مگر جب اس نے سرکار سے بگاڑ دی تھی تو دلی کے بادشاہ کے سوا ایسا اور کون شخص تھا کہ جس کی طرف فوج رجوع کرتی اس میں کچھ پہلے سازش کی حاجت نہ تھی۔ بلاشبہ جو حیثیت بادشاہ دلی کی سرکار نے بنا رکھی تھی۔ وہ ہمیشہ نامناسب اور قابل اعتراض تھی اور جناب لارڈ الن برا صاحب بہادر نے جو تجویز کی تھی وہ بے شک لائق منظوری کے تھی۔ بلکہ اس سے زیادہ عمل درآمد کرنا واجب تھا۔ بے شک دلی کا بادشاہ بمنزل ایک چنگاری تھا جس نے ہوا کے زور سے اڑ کر تمام ہندوستان کو جلا دیا۔

اس سبب

شریک نہ ہونا ہندوستانیوں کا لیجس لیٹف کونسل میں اصلی سبب فساد کا ہوا

اس فساد کا میں تو ایک ہی سمجھتا ہوں باقی جس قدر اسباب ہیں وہ سب اس کی شاخیں ہیں اور

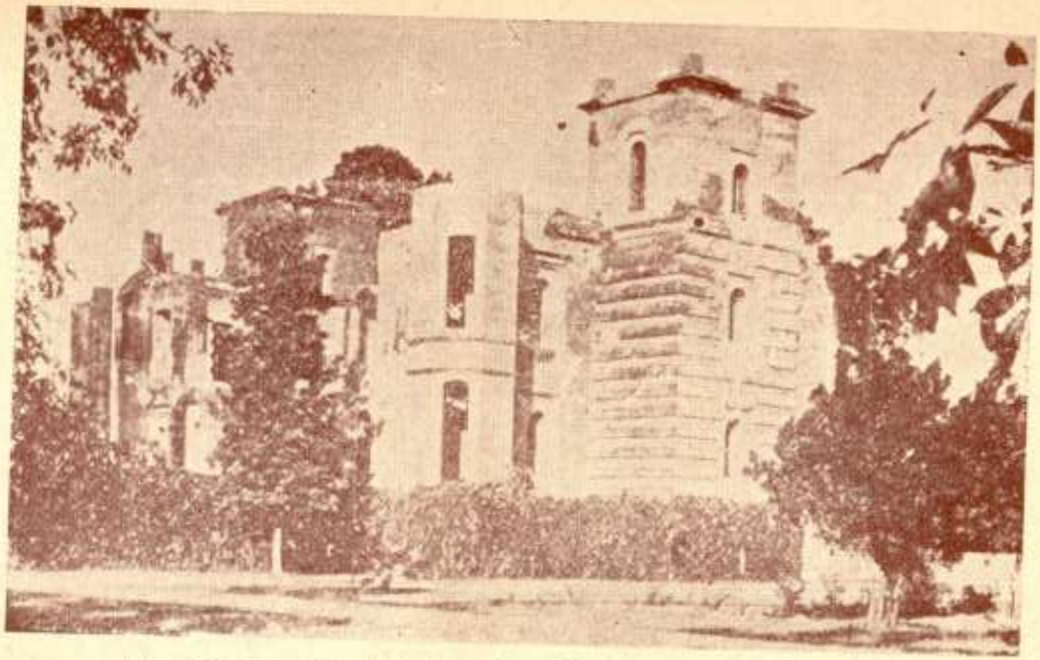

دل کشا محل (لکھنؤ) جس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا۔

یہ سمجھ میری کچھ وہمی اور قیاسی ہی نہیں بلکہ اگلے زمانے کے بہت سے عقلمندوں کی رائے کا اس پر اتفاق ہو چکا ہے اور تمام مصنفین پرنسپل آف گورنمنٹ کے اس باب میں میرے طرفدار ہیں اور تمام تاریخیں یورپ اور افریقہ کی میری رائے کی صداقت پر بہت معتمد گواہ ہیں۔

یہ بات بہت ضروری تھی

سب لوگ تسلیم کرتے چلے آئے ہیں کہ واسطے خوش اسلوبی اور خوبی اور پائیداری گورنمنٹ کے مداخلت رعایا کی حکومت ملک میں واجبات سے ہے حکام کی برائی یا بھلائی تدبیر کی صرف لوگوں سے معلوم ہوتی ہے بیشتر اس سے کہ خرابیاں اس درجے کو پہنچیں کہ پھر جن کا علاج ممکن نہ ہو ؎

سرچشمہ شاید گرفتن بہ میل
چو پر شد نشاید گزشتن بہ پیل

اور یہ بات نہیں حاصل ہوتی جب تک کہ مداخلت رعایا کی حکومت ملک میں نہ ہو۔ علی الخصوص ہماری گورنمنٹ کو جو غیر ملک کے رہنے والے تھے اور مذہب اور رواج اور راہ و رسم اور طبیعت اور عادت بھی اس ملک سے مختلف رکھتے تھے اس بات پر خیال رکھنا واجبات سے تھا گورنمنٹ کا انتظام اور اس کی خوبی اور اسلوبی اور پائداری ملکی اطوار اور عادات کی واقفیت اور پھر اس کی رعایت پر موقوف ہے کیونکہ اگلی تاریخوں کے دیکھنے سے جو درحقیقت ایک روزنامچہ ہے عادات اور خیالات اور اطوار مختلفہ نوع انسان کا معلوم ہو سکتا ہے کہ ان کی عادتیں اور خیالات اور اطوار موافق کسی عقلی قاعدے کے حاصل نہیں ہوئی ہیں۔ بلکہ ہر ایک ملک اور قوم میں بحسب اتفاق ہو گئی ہیں۔ پس قواعد گورنمنٹ ان اوضاع اور اطوار پر موقوف ہیں نہ یہ کہ وہ اوضاع و اطوار اور عادات گورنمنٹ پر اور اسی بات میں گورنمنٹ کی پائداری اور قیام ہے کیونکہ جب تک وہ عادتیں اور اخلاق رعایا کے دل میں مستحکم اور بمنزلہ خاصیت ثانی کے ہو گئی ہیں اس وقت تک ان کے برخلاف کوئی اقدام کرنا صریح خاصیت انسانی کے برخلاف کرنا اور سب کو رنجیدہ رکھنا ہے۔ کیا ہم بھول جاویں گے بنگالہ کی اس بے انتظامی کی حالت کو جو ۱۷۶۵ء میں بروقت تفویض ہونے دیوانی بنگالہ بہ کمپنی انگریز بہادر اسی ناواقفیت کے سبب ہوئی تھی باوصفیکہ جان کلارک مارشمن صاحب کی تاریخ ہم کو اسے یاد دلا رہی ہے اور کیا یاد نہ رہے گی ہم کو وہ خوبی جو بنگالہ میں لارڈ ہسٹنگز صاحب بہادر کی زبان دانی اور ملکی راہ و رسم کی واقفیت سے حاصل ہوئی تھی۔

بلاشبہ پارلیمنٹ میں ہندوستان کی رعایا کی مداخلت غیر ممکن اور بے فائدہ محض تھی
مگر لیجس لیٹف کونسل میں مداخلت نہ رکھنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ پس یہی ایک بات ہے۔ جو
جڑ ہے تمام ہندوستان کی فساد کی اور جتنی باتیں جمع ہوتی گئیں وہ سب اس کی شاخیں ہیں۔
ہم یہ نہیں کہتے کہ ہماری گورنمنٹ نے ملکی حالات اور اطوار دریافت کرنے میں کوشش
نہیں کی بلکہ ہم اس کے بدل مقر ہیں اور بعض قوانین گورنمنٹ اور ہدایات بورڈ آف ریونیو اور
آنریبل ٹامسن صاحب کے ہدایات نامہ مال کو اس کا گواہ سمجھتے ہیں۔ مگر اس میں شک نہیں
کہ رعایا کے حالات اور عادات اور خیالات اور اوضاع اور اطوار اور طبیعت اور طینت
اور لیاقت کے دریافت کرنے میں توجہ نہیں بلاشبہ ہماری گورنمنٹ کو نہیں معلوم تھا کہ ہماری
رعیت پر دن کیسا گزرتا ہے اور رات کس مصیبت کی آتی ہے اور وہ دن بدن کس غم اور
مصیبت میں پڑے جاتے ہیں اور کیا کیا رنج روز بروز ان کے دل میں جم جاتے ہیں۔ جو رفتہ
رفتہ بہت کثرت سے جمع ہو گئے تھے اور ایک ادنیٰ تحریک سے دفعتہً بہہ پڑے۔

لیجس لیٹف کونسل میں ہندوستان

اس سبب سے رعایا کا منشا گورنمنٹ پر نہ کھلا اور گورنمنٹ کا نیک ارادہ ہندوستانیوں پر ظاہر نہ ہوا بلکہ برعکس سمجھا گیا۔

کے شریک نہ ہونے سے صرف اتنا ہی نقصان نہیں ہوا کہ گورنمنٹ کو اصلی مضرت قوانین اور
ضوابط کے جو جاری ہوئے بخوبی معلوم نہیں ہو سکے اور اعتراض عام رعایا کو اس مضرت کے
رفع کرنے اور اپنے مطالب کے پیش کرنے کی فرصت اور قدرت نہیں ملی بلکہ بہت بڑا نقصان
یہ ہوا کہ رعایا کو منشا اور اصلی مطلب اور دلی ارادہ گورنمنٹ کا معلوم نہ تھا۔ گورنمنٹ کی ہر تجویز
پر رعایا کو غلط فہمی ہوئی جو تجویز گورنمنٹ کی ہوتی تھی۔ ہندوستانیوں کو بہ سبب اس کے کہ وہ
لوگ اس میں شریک نہ تھے اور منشا اور علم اس تجویز سے واقف نہ تھے اس کی بنیاد معلوم نہ ہوتی
اور ہمیشہ یہی سمجھے کہ یہ بات بھی ہمارے اور ہمارے ہم وطنوں کو خراب اور برباد اور ذلیل اور بے
دھرم کرنے کو ہے اور وہ بعضی باتیں جو در حقیقت گورنمنٹ سے خلاف رواج اور مخالف
طبیعت اور طینت ہندوستانیوں کے صادر ہوئی تھیں قطع نظر اس سے کہ وہ فی نفسہ اچھی تھیں
یا بری زیادہ تر ان کے غلط خیال کو تقویت دیتی تھیں۔ رفتہ رفتہ یہ نوبت پہنچ گئی کہ رعایا ہندوستان

اپنے دل میں سچ سمجھتی تھی اور یہ جانتی تھی کہ اگر ہم آج گورنمنٹ کے ہاتھ سے بچے ہوئے ہیں تو کل نہیں اور کل ہیں تو پرسوں نہیں اور کوئی شخص ان کے حالات کا پوچھنے والا اور کوئی تدبیر ان کے اس غلط خیال کو دور کرنے والی نہ تھی۔ جبکہ رعایا کا گورنمنٹ کے ساتھ یہ حال ہو جو دلی دشمن کے ساتھ ہونا چاہیئے۔ تو پھر کیا توقع ہو سکتی ہے۔ وفاداری کی ایسی گورنمنٹ کو ایسی رعایا سے اور جب کہ ہماری گورنمنٹ درحقیقت ایسی نہ تھی۔ تو ان غلط خیالات ہندوستانیوں کے دل میں جمنا اور جو رنج کہ ان کے دل پر تھا اس کا علاج نہ ہونا صرف اسی سبب سے تھا۔ کہ لیجس لیٹف کونسل میں ہندوستانی شریک نہ تھے۔ اگر ہوتے تو یہ سب باتیں رفع ہوتی جاتیں اب اگر غور سے دیکھا جائے تو صرف یہی ایک بات ہے جس نے اپنی بہت سی شاخیں پیدا کر کر تمام ہندوستانیوں میں بیجا فساد پیدا کر دیا۔

یہ مت کہو کہ ہماری گورنمنٹ نے چھاپہ خانوں میں سوائے گالی اور افترا اور جن باتوں سے فتنہ یا سرکشی وقوع میں آئے اور سب امورات چھاپنے کی اجازت دی تھی، اور قانون جاری ہونے سے پہلے مشورہ کیا جاتا تھا اور ہر شخص کو اس پر عذاب پیش کرنے کا اختیار تھا۔ کیوں کہ یہ امور ان بڑی عظیم الشان باتوں کے علاج کو جس کا ہم ذکر کرتے ہیں محض ناکافی بلکہ محض بے فائدہ تھی۔

اور ہم نہیں چاہتے کہ اس مقام پر ہم سے یہ گفتگو کی جائے کہ ہندوستانیوں کا جو نہایت جاہل ہیں اور بے تربیت لیجس لیٹف کونسل میں شریک ہونا کس طرح ہوتا! اور کیا فائدہ ہندوستانیوں کی شرکت کا نکلتا! اور اگر رعایائے ہندوستان کو مثل پارلیمنٹ کے لیجس لیٹف کونسل میں مداخلت دی جاتی تو طریقہ ان کے انتخاب کا کیا ہوتا! اور اس میں بہت سی مشکلیں پیش آتیں کیونکہ اس مقام پر ہم کو صرف اتنا ثابت کرنا ہے کہ یہ بات گورنمنٹ کے لیے بہت اچھی اور پر منفعت ضرور تھی۔ اور اسی کے نہ ہونے کے سبب یہ فساد برپا ہوئے اور طریقہ مداخلت رعایا کی بابت ہماری علیحدہ رائے ہے اس کو دیکھنا چاہیئے اور جو بحث ہو وہاں کرنی چاہیئے۔

مداخلت مذہبی سمجھنا مداخلت مذہبی کچھ شبہ نہیں کہ تمام لوگ جاہل اور قابل اور اعلیٰ اور ادنےٰ یقین جانتے تھے کہ ہماری گورنمنٹ کا دلی ارادہ ہے کہ مذہب اور رسم و رواج میں مداخلت کرے اور سب کو کیا ہندو اور کیا مسلمان

بلاشبہ پارلیمنٹ میں ہندوستان کی رعایا کی مداخلت غیر ممکن اور بے فائدہ محض تھی
مگر لیجس لیٹف کونسل میں مداخلت نہ رکھنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ پس یہی ایک بات ہے۔ جو
جڑ ہے تمام ہندوستان کی فساد کی اور جتنی باتیں جمع ہوتی گئیں وہ سب اس کی شاخیں ہیں۔
ہم یہ نہیں کہتے کہ ہماری گورنمنٹ نے ملکی حالات اور اطوار دریافت کرنے میں کوشش
نہیں کی بلکہ ہم اس کے بدل مقر ہیں اور بعض قوانین گورنمنٹ اور ہدایات بورڈ آف ریونیو اور
آنریبل ٹامسن صاحب کے ہدایات نامہ مال کو اس کا گواہ سمجھتے ہیں۔ مگر اس میں شک نہیں
کہ رعایا کے حالات اور عادات اور خیالات اور اوضاع اور اطوار اور طبیعت اور طینت
اور لیاقت کے دریافت کرنے میں توجہ نہیں بلاشبہ ہماری گورنمنٹ کو نہیں معلوم تھا۔ کہ ہماری
رعیت پر دن کیسا گزرتا ہے اور رات کس مصیبت کی آتی ہے اور وہ دن بدن کس غم اور
مصیبت میں پڑے جاتے ہیں اور کیا کیا رنج روز بروز ان کے دل میں جم جاتے ہیں۔ رجو رفتہ
رفتہ بہت کثرت سے جمع ہو گئے تھے اور ایک ادنیٰ تحریک سے دفعتہً بہہ پڑے۔

اس سبب سے رعایا کا منشا گورنمنٹ پر نہ کھلا اور گورنمنٹ کا نیک ارادہ ہندوستانیوں پر ظاہر نہ ہوا بلکہ برعکس سمجھا گیا۔

لیجس لیٹف کونسل میں ہندوستان
کے شریک نہ ہونے سے صرف اتنا ہی نقصان نہیں ہوا کہ گورنمنٹ کو اصلی مضرت قوانین اور
ضوابط کے جو جاری ہوئے بخوبی معلوم نہیں ہوسکے اور اعتراض عام رعایا کو اس مضرت کے
رفع کرنے اور اپنے مطالب کے پیش کرنے کی فرصت اور قدرت نہیں ملی بلکہ بہت بڑا نقصان
یہ ہوا کہ رعایا کو منشا اور اصلی مطلب اور دلی ارادہ گورنمنٹ کا معلوم نہ ہوا۔ گورنمنٹ کی ہر تجویز
پر رعایا کو غلط فہمی ہوئی جو تجویز گورنمنٹ کی ہوتی تھی۔ ہندوستانیوں کو بہ سبب اس کے کہ وہ
لوگ اس میں شریک نہ تھے اور منشا اور علم اس تجویز سے واقف نہ تھے اس کی بنیاد معلوم نہ ہوتی
اور ہمیشہ یہی سمجھے کہ یہ بات بھی ہمارے اور ہمارے ہم وطنوں کو خراب اور برباد اور ذلیل اور بے
دھرم کرنے کو ہے اور وہ بعضی باتیں جو در حقیقت گورنمنٹ سے خلاف رواج اور مخالف
طبیعت اور طینت ہندوستانیوں کے صادر ہوئی تھیں۔ قطع نظر اس سے کہ وہ فی نفسہ اچھی تھیں
یا بری زیادہ تر ان کے غلط خیال کو تقویت دیتی تھیں۔ رفتہ رفتہ یہ نوبت پہنچ گئی کہ رعایا ہندوستان

اپنے دل میں سچ سمجھتی تھی اور یہ جانتی تھی کہ اگر ہم آج گورنمنٹ کے ہاتھ سے نیچے ہوئے ہیں توکل نہیں اور کل ہیں تو پرسوں نہیں اور کوئی شخص ان کے حالات کا پوچھنے والا اور کوئی تدبیر ان کے اس غلط خیال کو دور کرنے والی نہ تھی جبکہ رعایا کا گورنمنٹ کے ساتھ یہ حال ہو جو دلی دشمن کے ساتھ ہونا چاہیئے۔ تو پھر کیا توقع ہو سکتی ہے۔ وفاداری کی ایسی گورنمنٹ کو ایسی رعایا سے اور جب کہ ہماری گورنمنٹ درحقیقت ایسی نہ تھی۔ تو ان غلط خیالات ہندوستانیوں کے دل میں جمنا اور جو رنج کہ ان کے دل پر تھا اس کا علاج نہ ہونا صرف اسی سبب سے تھا۔ کہ لیجس لیٹف کونسل میں ہندوستانی شریک نہ تھے۔ اگر ہوتے تو یہ سب باتیں رفع ہوتی جاتیں اب اگر غور سے دیکھا جائے تو صرف یہی ایک بات ہے جس نے اپنی بہت سی شاخیں پیدا کر کر تمام ہندوستانیوں میں بیجا فساد پیدا کر دیا۔

یہ مت کہو کہ ہماری گورنمنٹ نے چھاپہ خانوں میں سوائے گالی اور افترا اور جن باتوں سے فتنہ یا سرکشی وقوع میں آئے اور سب امورات چھاپنے کی اجازت دی تھی، اور قانون جاری ہونے سے پہلے مشورہ کیا جاتا تھا اور ہر شخص کو اس پر عذاب پیش کرنے کا اختیار تھا۔ کیوں کہ یہ امور ان بڑی عظیم الشان باتوں کے علاج کو جس کا ہم ذکر کرتے ہیں محض ناکافی بلکہ محض بے فائدہ تھی۔

اور ہم نہیں چاہتے کہ اس مقام پر ہم سے یہ گفتگو کی جائے کہ ہندوستانیوں کا جو نہایت جاہل ہیں اور بے تربیت لیجس لیٹف کونسل میں شریک ہونا کس طرح ہوتا! اور کیا فائدہ ہندوستانیوں کی شرکت کا نکلتا! اور اگر رعایائے ہندوستان کو مثل پارلیمنٹ کے لیجس لیٹف کونسل میں مداخلت دی جاتی تو طریقہ ان کے انتخاب کا کیا ہوتا! اور اس میں بہت سی مشکلیں پیش آتیں کیونکہ اس مقام پر ہم کو صرف اتنا ثابت کرنا ہے کہ یہ بات گورنمنٹ کے لئے بہت اچھی اور پر منفعت ضرور تھی۔ اور اسی کے نہ ہونے کے سبب یہ فساد برپا ہوئے اور طریقہ مداخلت رعایا کی بابت ہماری علیحدہ رائے ہے اس کو دیکھنا چاہیئے اور جو بحث ہو وہاں کرنی چاہیئے۔

مداخلت مذہبی سمجھنا

مداخلت مذہبی کچھ شبہ نہیں کہ تمام لوگ جاہل اور قابل اور اعلیٰ اور ادنیٰ یقین جانتے تھے کہ ہماری گورنمنٹ کا دلی ارادہ ہے کہ مذہب اور رسم و رواج میں مداخلت کرے اور سب کو کیا ہندو اور کیا مسلمان

عیسائی مذہب اور اپنے ملک کی رسم ورواج پر لا ڈالے اور سب سے بڑا سبب اس سرکشی
میں یہی ہے۔
ہر شخص دل سے جانتا تھا کہ ہماری گورنمنٹ کے کام بہت آہستہ آہستہ ظہور میں آتے ہیں
اور جو کام کرنا ہوتا ہے رفتہ رفتہ کیا کرتے ہیں اس واسطے دفعتًا اور جبرًا مسلمانوں کی طرح دین
بدلنے کو نہیں کہتے مگر جتنا جتنا قابو پاتے جاویں گے۔ اتنی اتنی مداخلت کرتے جاویں گے
اور جو باتیں رفتہ رفتہ ظہور میں آتی گئیں جن کا بیان آگے آئے گا ان کے اس غلط شبہ کو زیادہ
تر مستحکم اور مضبوط کرتی گئیں۔ سب کو یقین تھا کہ ہماری گورنمنٹ علانیہ جبر مذہب بدلنے پر
نہیں کریں گے۔ بلکہ خفیہ تدبیریں کر کر مثل نابود کردینے علم عربی وسنسکرت کے اور مفلس ومحتاج
کردینے ملک کے اور لوگوں کو جہان کا مذہب ہے اس کے مسائل سے ناواقف کرکر اور اپنے
دین ومذہب کی کتابیں اور مسائل اور وعظ کو پھیلا کر نوکریوں کا لالچ دے کر لوگوں کو بے دین
کردیں گے بحسب ۱۸۳۷ء کی قحط سالی میں جو یتیم لڑکے کم عمر عیسائی کئے گئے وہ تمام اضلاع وممالک
مغربی وشمالی میں ارادہ گورنمنٹ کے ایک نمونے گنے جاتے تھے کہ ہندوستان کو اس طرح مفلس
اور محتاج کرکر اپنے مذہب میں لے آویں گے۔ میں سچ کہتا ہوں کہ جب سرکار آنریبل ایسٹ
انڈیا کمپنی کوئی ملک فتح کرتی تھی ہندوستان کی رعایا کو کمال رنج ہوتا تھا اور یہ بھی میں سچ کہتا
ہوں کہ منشا اس رنج کا اور کچھ نہیں ہوتا تھا بجز اس کے کہ لوگ جانتے تھے کہ جوں جوں اختیار
ہماری گورنمنٹ کا زیادہ ہوتا جاوے گا اور کسی دشمن اور ہمسایہ حاکم کے مقابلے اور فساد کا اندیشہ
نہ رہے گا۔ دوں دوں ہمارے مذہب اور رسم اور رواج میں زیادہ تر مداخلت کریں گے۔

مذہبی گفتگو بہت ہوتی

ہماری گورنمنٹ کی ابتدائے حکومت ہندوستان میں گفتگو مذہب
کی بہت کم تھی۔ روز بروز زیادہ ہوتی گئی۔ اور اس زمانے میں بدرجہ
کمال پہنچ گئی۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ ہماری گورنمنٹ کو ان امور میں کچھ مداخلت نہ تھی، مگر ہر شخص
یہی سمجھتا تھا کہ یہ سب معاملہ بموجب حکم اور بموجب اشارہ اور مرضی گورنمنٹ ہوتے ہیں۔ یہ سب
جانتے تھے، کہ گورنمنٹ نے پادری صاحبوں کو ہندوستان میں مقرر کیا ہے، گورنمنٹ سے پادری
صاحب تنخواہ پاتے ہیں۔ گورنمنٹ اور اور حکام انگریزی ولایت زا جو اس ملک میں نوکر ہیں۔ وہ
پادری صاحبوں کو بہت سا روپیہ واسطے خرچ کے اور کتابیں بانٹنے کو دیتے ہیں اور ہر طرح
ان کے مددگار اور معاون ہیں۔ اکثر حکام متعہد اور افسران فوج نے اپنے تابعین سے مذہب کی گفتگو

شروع کی تھی۔ بعضے صاحب اپنے ملازمین کو حکم دیتے تھے کہ ہماری کوٹھی پر آکر پادری صاحب کا وعظ سنو اور ایسا ہی ہوتا تھا۔ غرض اس بات نے ایسی ترقی پکڑی تھی۔ کہ کوئی شخص یہ نہیں جانتا تھا۔ کہ گورنمنٹ کی عملداری میں ہمارا یا ہماری اولاد کا مذہب قائم رہے گا۔

پادری صاحبوں کا وعظ

پادری صاحبوں کے وعظ نے نئی صورت نکالی تھی۔ تکرار مذہب کی کتابیں بطور سوال و جواب چھپنی اور تقسیم ہونی شروع ہوئیں۔ ان کتابوں میں دوسرے مذہب کے مقدس لوگوں کی نسبت الفاظ اور مضامین رنجیدہ مندرج ہوئے۔ ہندوستان میں دستور وعظ اور کتھا کا یہ ہے کہ اپنے اپنے معبد یا مکان پر بیٹھ کر کہتے ہیں جس کا دل چاہے اور جس کو رغبت ہو وہاں جا کر سنے۔ پادری صاحبوں کا طریقہ اس کے برخلاف تھا۔ وہ خود غیر مذہب کے مجمع اور تیرتھ گاہ اور میلے میں جا کر وعظ کہتے تھے۔ اور کوئی شخص صرف حکام کے ڈر سے مانع نہ ہوتا تھا۔ بعض ضلعوں میں یہ رواج نکلا۔ کہ پادری صاحبوں کے ساتھ تھانے کا ایک چپراسی جانے لگا۔ پادری صاحب وعظ میں صرف انجیل مقدس کے بیان پر اکتفا نہیں کرتے تھے۔ بلکہ غیر مذہب کے مقدس لوگوں اور مقدس مقاموں کو بہت برائی سے اور ہتک سے یاد کرتے تھے۔ جس سے سننے والوں کو نہایت رنج اور دلی تکلیف پہنچتی تھی اور ہماری گورنمنٹ سے ناراضی کا بیج لوگوں کے دل میں بویا جاتا تھا۔

مشنری اسکول

مشنری اسکول بہت جاری ہوگئے۔ اور اس میں مذہبی تعلیم شروع ہوئی۔ سب لوگ کہتے تھے کہ سرکار کی طرف سے ہیں بعض اضلاع میں بہت بڑے بڑے عالی قدر حکام متعہدان اسکولوں میں جاتے تھے۔ اور لوگوں کو اس میں داخل اور شامل ہونے کی ترغیب دیتے تھے۔ امتحان مذہبی کتابوں کا لیا جاتا تھا اور طالب علموں سے جو لڑکے کم عمر ہوتے تھے پوچھا جاتا تمہارا خدا کون، تمہارا نجات دینے والا کون اور وہ عیسائی مذہب کے موافق جواب دیتے تھے اس پر ان کو انعام ملتا تھا ان سب باتوں سے رعایا کا دل ہماری گورنمنٹ سے پھرتا جاتا تھا۔

یہاں ایک بڑا اعتراض یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر لوگ اس تعلیم سے ناراض تھے تو اپنے لڑکوں کو کیوں داخل کرتے تھے۔ اس بات کو عدم ناراضی پر خیال کرنا نہیں چاہیے۔ بلکہ یہ

ایک بڑی دلیل ہے۔ ہندوستان کے کمال خراب حال اور مفلس اور نہایت تنگ اور تباہ حال ہو جانے پر یہ صرف ہندوستان کی محتاجی اور مفلسی کا باعث تھا کہ لوگ اس خیال سے کہ ان اسکولوں میں داخل ہو کر ہماری اولاد کو کچھ وجہ معیشت اور روزگار حاصل ہوگا۔ ایسی سخت بات کو جس سے بلا شبہ ان کو دلی رنج اور روحانی غم تھا گوارا کرتے تھے۔ نہ رضامندی سے۔

بڑے کالجوں میں طریقہ تعلیم کی تبدیلی

بڑے بڑے کالج جو شہروں میں مقرر تھے اول اول گو ان سے بھی کچھ کچھ دہشت لوگوں کو ہوئی تھی۔ اس زمانے میں شاہ عبدالعزیز جو تمام ہندوستان میں نامی مولوی تھے زندہ تھے مسلمانوں نے ان سے فتویٰ پوچھا انھوں نے صاف جواب دیا کہ کالج انگریزی میں جانا اور پڑھنا اور انگریزی زبان کا سیکھنا بموجب مذہب کے سب درست ہے اس پر سینکڑوں مسلمان کالجوں میں داخل ہوئے۔ مگر اس زمانے میں کالجوں کا حال ایسا نہ تھا۔ بلکہ ان میں تعلیم کا سررشتہ بہت اچھا تھا۔ ہر قسم کے علوم فارسی اور عربی اور سنسکرت اور انگریزی پڑھائے جاتے تھے۔ فقہ اور حدیث اور علم ادب پڑھانے کی اجازت تھی۔ فقہ میں امتحان ہوتا تھا سندیں ملتی تھیں۔ کسی طرح کی ترغیب مذہبی نہ تھی۔ مدرس بہت ذی عزت اور معتبر اور مشہور اور ذی علم اور پرہیز گار مقرر ہوتے تھے۔ مگر آخر کار یہ بات نہ رہی قدر عربی کی بہت کم ہوگئی اور فقہ حدیث کی تعلیم یکسر جاتی رہی۔ فارسی بھی چنداں قابل لحاظ نہ رہی۔ تعلیم کی صورت اور کتابوں کے رواج نے بالکل تغیر پکڑا اور اردو اور انگریزی کا رواج بہت زیادہ ہوا جس کے سبب سے بے شبہ گورنمنٹ کو ہندوستان کے مذہبی علوم کا معدوم کرنا منظور ہے قائم ہو گیا۔ مدرس لوگ معتبر اور ذی علم نہ رہے وہی مدرسے کے طالب علم کہ جنھوں نے ابھی تک لوگوں کی آنکھوں میں اعتبار پیدا نہ کیا تھا مدرس ہونے لگے۔ اس لئے ان مدرسوں کا بھی وہی حال ہو گیا۔

گورنمنٹ کا اشتہار درباب استحقاق نوکری

دفعتاً پیش گاہ گورنمنٹ سے اشتہار جاری ہوا کہ جو شخص مدرسے کا تعلیم یافتہ ہوگا اور فلاں فلاں علوم اور زبان انگریزی میں امتحان دے کر سند یافتہ ہوگا۔ وہ نوکری میں سب سے مقدم سمجھا جاوے گا۔ چھوٹی چھوٹی نوکری بھی انسپکٹروں کے سارٹیفکیٹ پر جس کو ابھی تک ... کی ... کا ... سمجھتے تھے منحصر ہو گئیں اور ان غلط خیالات کے سبب لوگوں

کے دل پر ایک غم کا بوجھ پڑ گیا اور سب کے دل میں ہماری گورنمنٹ سے ناراضی پیدا ہو گئی اور لوگ یہ سمجھے کہ ہندوستان کو ہر طرح بے معاش اور محتاج کیا جاتا ہے کہ نامجبور ہو کر رفتہ رفتہ ان لوگوں کی مذہبی باتوں میں تغیر و تبدل ہو جائے گی۔

پادری صاحبان اے ایڈمنڈ کی چٹھیاں کا اجرا

یہ سب خرابیاں لوگوں کے دلوں میں ہو رہی تھیں کہ ۱۸۵۵ء میں پادری صاحبان اے ایڈمنڈ نے دار الامارۃ کلکتہ سے عموماً اور خصوصاً سرکاری معزز نوکروں کے پاس چٹھیات بھیجیں جن کا مطلب یہ تھا کہ اب تمام ہندوستان میں ایک عملداری ہو گئی۔ تار برقی سے سب جگہ کی خبر ایک ہو گئی۔ ریلوے سڑک سے سب جگہ کی آمد و رفت ایک ہو گئی۔ مذہب بھی ایک چاہیے اس لیے مناسب ہے کہ تم لوگ بھی عیسائی ایک مذہب ہو جاؤ۔ میں سچ کہتا ہوں کہ ان چٹھیات کے آنے کے بعد خوف کے مارے سب کی آنکھوں میں اندھیرا آ گیا، پاؤں کے تلے کی مٹی نکل گئی سب کو یقین ہو گیا کہ ہندوستانی جس وقت کے منتظر تھے، وہ وقت اب آ گیا۔ اب جتنے سرکاری نوکر ہیں اول ان کو کرسٹان ہونا پڑے گا۔ اور پھر تمام رعیت کو سب لوگ بے شک سمجھتے تھے کہ یہ چٹھیات گورنمنٹ کے حکم سے آئی ہیں۔ آپس میں ہندوستانی لوگ اہل کاران سرکاری سے پوچھتے تھے کہ تمہارے پاس بھی چٹھی آئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا کہ تم بھی بسبب لالچ نوکری کے کرسٹان ہو گئے۔ اب چٹھیوں نے یہاں تک ہندوستانی اہل کاروں کو الزام لگایا کہ جن کے پاس چٹھیاں آئی تھیں وہ مارے شرمندگی اور بد نامی کے چھپاتے تھے اور انکار کرتے تھے کہ ہمارے پاس تو نہیں آئی لوگ جواب دیتے تھے کہ اب آ جاوے گی کیا تم سرکار کے نوکر نہیں ہو۔ اگر سچ پوچھو تو یہ چٹھیاں تمام ہندوستانیوں کے غلط شبہات کو پکا اور مستحکم کرنے والی تھیں، چنانچہ انہوں نے کر دیا اور اس کے مٹانے کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی

کچھ عیب نہ تھا کہ اسی زمانے میں کچھ برہمی اور تھوڑا بہت فساد ملک میں شروع ہو جاتا چنانچہ اس وقت کے حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ جناب معلی القاب نواب لفٹننٹ گورنر بہادر بنگال نے بہت جلد خبر لی اور ایک اشتہار جاری کیا جس سے فی الجملہ لوگوں کے دلوں میں تسلی ہوئی اور وہ اضطراب جو ہو گیا تھا دھیما ہوا، مگر جیسا کہ چاہیے ویسا قلع اور قمع اس کا نہ ہوا لوگ سمجھے کہ یہ بات بالفعل موقوف ہو گئی پھر کبھی تابو کے وقت پر جاری ہو گی

پادری صاحبان اے ایڈمنڈ کی چٹھی اور نواب معلی القاب نواب لفٹننٹ گورنر بہادر بنگال کا اشتہار آخر کتاب میں مندرج ہے وہاں دیکھو۔

مسلمانوں کو مداخلت امور مذہبی سے زیادہ تر رنج ہونا اور اس کا سبب

ان سب باتوں سے مسلمان بہ نسبت ہنود کے بہت زیادہ ناراض تھے ان کا سبب یہ ہے کہ ہندو اپنے مذہب کے احکام بطور رسم ورواج کے ادا کرتے ہیں نہ بطور احکام مذہب کے ان کو اپنے مذہب کے احکام اور عقائد اور وہ دلی اعتقادی باتیں جن پر نجات عاقبت کی موافق ان کے مذہب کے منحصر ہے مطلق معلوم نہیں ہیں اور نہ ان کے برتاؤ میں ہیں۔ اس سبب سے وہ اپنے مذہب میں نہایت سست اور بجز ان رسمی باتوں کے اور کھانے پینے کی پرہیز کے اور کسی مذہب عقیدے میں پختہ اور متعصب نہیں ہیں۔ ان کے سامنے ان کے اس عقیدے کے جس کا دل میں اعتقاد چاہیے برخلاف باتیں ہوا کریں ان کو کچھ غصہ یا رنج نہیں آتا۔ برخلاف مسلمانوں کے وہ اپنے مذہب کے عقائد بموجب جو باتیں کہ ان کے مذہب میں نجات دینے والی اور عذاب میں ڈالنے والی ہیں بخوبی جانتے ہیں اور ان احکام کو مذہبی احکام اور خدا کی طرف کے احکام سمجھ کر کرتے ہیں۔ اس سبب سے اپنے مذہب میں پختہ اور متعصب ہیں۔ ان وجوہات سے مسلمان زیادہ تر ناراض تھے اور ہندوؤں کی بہ نسبت زیادہ تر فساد میں ان کا شریک ہونا قرین قیاس تھا چنانچہ یہی ہوا بلاشبہ حقیقی گورنمنٹ کی مداخلت مذہب میں خلاف قواعد ملک داری ہے۔ ویسا ہی کسی مذہب کی تعلیم کو روکنا علی الخصوص اس مذہب کی جسے وہ حق سمجھتی ہے برخلاف اور بے جا ہے مگر ہمارا مطلب صرف اتنا ہے کہ باوجودیکہ ہماری گورنمنٹ ایسی ہی تھی ہے مگر کام اس طرح پر ہوئے کہ رعایا کا یہ غلط شبہ رفع نہ ہوا۔

ایکٹ ۲۱ سنہ ۱۸۵۰ء

بعض لیجسلیٹف کونسل سے بھی امور مذہبی میں مداخلت ہوئی۔ ایکٹ ۲۱ سنہ ۱۸۵۰ء صاف مذہبی قوائد پر خلل انداز تھا۔ پھر اس ایکٹ سے ایک بدگمانی لوگوں کو تھی کہ یہ ایکٹ خاص واسطے ترغیب عیسائی مذہب قبول کرنے کے جاری ہوا ہے۔ کیونکہ یہ بات ظاہر تھی کہ غیر مذہب کا کوئی آدمی ہندوؤں میں شامل نہیں رہ سکتا۔ پس ہندو تو اس قانون کے مفاد سے محروم تھے غیر مذہب کا آدمی اگر مسلمان

ہو جاوے تو اس کو اپنے مذہب کی رو سے جو اس نے اختیار کیا ہے اپنے مورثوں کو ترکہ جو غیر مذہب میں تھے لینا منع ہے۔ پس کوئی نومسلم بھی اس ایکٹ سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا تھا، البتہ عیسائی مذہب جس نے قبول کیا ہے وہ فائدہ مند ہو سکتا ہے اس سبب سے لوگ خیال کرتے تھے۔ کہ علاوہ مداخلت مذہبی کے اس ایکٹ سے صاف ترغیب ہے۔

ایکٹ ۱۵ ۱۸۵۶ء

ایکٹ ۱۵ ۱۸۵۶ء در باب بیوہ ہنود کے رسوم مذہبی میں خلل ڈالتا تھا گو اس میں بڑی بڑی بحثیں ہوئی اور مشورے بھی لئے گئے مگر ہندو لوگ جو مذہب سے زیادہ پابند رسم و رواج کے ہیں اس ایکٹ کو نہایت ناپسند کرتے تھے۔ بلکہ باعث اپنی ہتک عزت اور بربادی خاندان کا جانتے تھے۔ اور یوں بدگمانی کرتے تھے کہ یہ ایکٹ اس مراد سے جاری ہوا ہے کہ ہنود کی بیوائیں خود مختار ہو جائیں اور جو چاہیں سو کرنے لگیں۔

بعض قوانین خلاف مذہب

چند ایکٹ اور قانون ایسے ہیں کہ جن کی رو سے باوصف متحد المذہب ہونے متخاصمین کے برخلاف ان کے مذہب کے مقدمات دیوانی عدالت سے فیصل ہوتے تھے، ہمارا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہماری گورنمنٹ کسی مذہب کی طرف داری کرے۔ مختلف مذہب ہونے کی صورت میں بلا نسبہ انصاف کا لحاظ چاہیے۔ بشرطیکہ وہ انصاف دونوں مذہبوں کے یا دونوں اہل مقدمہ کے معاہدے کے برخلاف نہ ہو۔ جب طرفین متحد المذہب ہیں تو ضرور ہے کہ انہی کے مذہب یا انہی کے رسم و رواج کے مطابق مقدمات حقوق متعلقہ دیوانی کے فیصل ہوں۔

ضبطی اراضی لاخراج

قوانین ضبطی اراضیات لاخراج جس کا آخر قانون ۲ ۱۸۱۹ء ہے حکومت ہندوستان کو نہایت مضر تھا۔ ضبطی اراضیات نے جس قدر رعایائے ہندوستان کو ناراض اور بدخواہ ہماری گورنمنٹ کا کر دیا تھا اس سے زیادہ اور کسی چیز نے نہیں کیا تھا۔ سچ فرمایا تھا لارڈ منرو اور ڈیوک آف ولنگٹن صاحب بہادر نے کہ ضبط کرنا معافیات کا ہندوستانیوں سے دشمنی پیدا کرنی اور ان کو محتاج کر دینا ہے میں بیان نہیں کر سکتا کہ ہندوستانیوں کو کس قدر ناراضی اور دلی رنج اور ہماری گورنمنٹ کی بدخواہی اور نیز کتنی مصیبت اور تنگی معاش اس سبب سے ان کو تھی، بہت سی معافیات

صدہا سال سے چلی آتی تھیں وہ ادتے ادنے حیلے پر ضبط ہو گئیں۔ ہندوستانی صاف خیال کرتے تھے کہ سرکار نے خود تو ہماری پرورش نہیں کی بلکہ جو جاگیر ہم کو اور ہمارے بزرگوں کو اگلے بادشاہوں نے دی تھیں وہ بھی گورنمنٹ نے ہم سے چھین لی۔ پھر تو ہم کو اور کیا توقع گورنمنٹ سے ہے۔ ضبطی اراضیات کے باب میں اگر ہماری گورنمنٹ کے طرف سے یہ عذر صحیح اور واقعی بھی سمجھا جاوے کہ اگر ضبطی اراضیات لاخراجی نہ ہوتی تو واسطے پورا کرنے اخراجات گورنمنٹ کے جس کو نہایت کفایت شعاری سے مان لینا چاہیئے ہندوستانی آدمیوں سے اور کسی محصول کے لینے کی تدبیر کرنی پڑتی مگر رعایا کو اس سے کسی طرح پر تسلی اور جو مصیبت کہ ان پر پڑی اس کا دفعیہ نہیں ہو سکتا۔ دیکھو اس زمانے میں جہاں جہاں باغیوں نے اشتہارات واسطے بہکانے اور ورغلانے رعایا کے جاری کئے ہیں۔ سب میں بجز دو باتوں کے یعنی مداخلت مذہبی اور ضبطی معافیات کے اور کسی چیز کا ذکر نہیں ہے۔ اس سے بخوبی ثابت ہے کہ یہ دونوں باتیں اصلی منشا اور بہت بڑا سبب ناراضی اہل ہند کا تھا۔ علی الخصوص مسلمانوں کا جن کو یہ نقصان بہت زیادہ بہ نسبت ہندوؤں کے پہنچا تھا

نیلام زمینداری

اگلی عملداریوں میں بلاشبہ حقیقت زمینداری کی خانگی بیع اور رہن اور ہبہ کا دستور تھا مگر یہ بہت کم ہوتا تھا اور جہاں تک ہوتا تھا۔ بر رضامندی اور خوشی ہوتا تھا بعلت تمام باقی یا بعلت قرضہ جبراً اور حکماً نیلام حقیقت کا کچھ بھی نہیں ہوا۔ ہندوستان میں زمیندار اپنی موروثی زمینداری کو بہت عزیز سمجھتے ہیں اس کے زوال سے ان کو کمال رنج ہوتا ہے۔ اگر خیال کیا جاوے تو ہندوستان میں ہر ایک محال زمینداری کا ایک چھوٹی سی سلطنت دکھائی دیتی ہے، قدیم سے سب کی رضامندی سے ایک شخص سردار ہوتا ہے وہ ایک بات تجویز کرتا تھا اور ہر ایک حقیقت دار بقدر اپنے حصہ زمینداری کے بولنے کا اور دخل دینے کا اختیار رہوتا تھا۔ رعیت بافندہ دہ کے چودھری بھی حاضر ہو کر کچھ کچھ گفتگو کرتے تھے۔ اگر کسی مقدمہ نے زیادہ طول پکڑا تو کسی بڑے گاؤں کے مقدم اور سردار کے حکم سے فیصلہ ہو گیا۔ ہندوستان کے ہر ایک گاؤں میں بہت خاصی صورت ایک چھوٹی سلطنت اور پارلیمنٹ کی موجود تھی۔ بے شک بادشاہ کو جس قدر اپنی سلطنت جانے کا رنج ہوتا تھا اتنا ہی زمیندار کو اپنی

زمینداری جانے کا غم تھا۔ ہماری گورنمنٹ نے اس کا مطلق خیال نہ کیا۔ ابتدائے عملداری سے آج تک شاید کوئی گاؤں باقی ہوگا جس میں تھوڑا بہت نہ انتقال ہوا ہو۔ ابتدا را تبدار میں ان نیلاموں نے ایسی بے ترتیبی سے کثرت پکڑی کہ تمام ملک الٹ پلٹ ہوگیا۔ پھر ہماری گورنمنٹ نے اس کے تدارک کا قانون اول ۱۸۲۱ء جاری کیا اور ایک کمیشن مقرر ہوا۔ اس سے اور صدہا قسم کی خرابیاں برپا ہوگئیں۔ یہاں تک کہ یہ کام حسب دلخواہ انجام نہ ہوسکا اور آخرکار یہ محکمہ بند ہوگیا

اس مقام پر ہم یہ گفتگو کرنی نہیں چاہتے کہ سرکار وصول مال گزاری کا یہ قاعدہ مقرر نہ کرتی تو پھر کیا کرتی اور جب کہ زمین مال گزاری سرکار میں مستغرق اور اس کی ذمہ دار سمجھی جاتی ہے کیوں نہیں نیلام ہوتی کیونکہ ہم اس مقام پر صرف یہ بات بیان کرتے ہیں کہ سرکشی کے یہ اسباب ہوئے خواہ ان سببوں کا ہونا بہ مجبوری ہوا خواہ ناواقفی سے اور اگر اس امر کی بحث دیکھنی ہو تو ہماری دوسری رائے طریقہ انتظام ہندوستان میں ہے اس کو دیکھو مگر اتنی بات یہاں لکھ دیتے ہیں کہ زمین کا مال گزاری میں مستغرق سمجھنا بہت قابل مباحثہ کے ہے۔ دور حقیقت دعویٰ سرکار کا پیداوار پر ہے نہ زمین پر۔

بعوض زر قرضہ نیلام حقیقت کے رواج نے بہت سے فساد برپا کئے۔ مہاجنوں اور روپے والوں نے دم دے کر زمینداروں کو روپیہ دیئے اور قصداً ان کی زمینداری چھیننے کو بہت فریب برپا کئے اور دلوانی میں ہر قسم کے جھوٹے سچے مقدمات لگائے اور قدیم زمینداروں کو بےدخل کیا۔ اور خود مالک بن بیٹھے۔ ان آفات نے تمام ملک کے زمینداروں کو ہلا ڈالا۔

سختی بندوبست

بندوبست مال گزاری جو ہماری گورنمنٹ نے کیا۔ نہایت قابل تعریف ہے۔ مگر اگلے بندوبستوں کی نسبت سنگین ہے۔ اگلی عملداریوں میں بطور خام تحصیل مال گزاری لی جاتی تھی۔ شیر شاہ نے ایک تہائی پیداوار کا حصہ گورنمنٹ مقرر کیا تھا۔ کچھ شک نہیں کہ اس طریقہ میں بہت مشکلیں تھیں اور گورنمنٹ کو نقصان بھی متصور تھا۔ مگر کاشتکار سب آباد رہتے تھے کسی کو ٹوٹا دینا نہ پڑتا تھا۔ اکبر اول نے اسی بندوبست کو یعنی پیداوار کا تہائی حصہ لینا پسند کیا۔ اور اسی کو جاری کیا۔ مگر بندوبست پختہ کر دیا۔ جس کا ذکر لارڈ الفنسٹن صاحب کی عمدہ تاریخ میں مندرج ہے اور آئین اکبری میں بھی اس

کا بیان ہے، اکبر نے یہ اقسام زمین کے مقرر کئے ۔

اول :۔ قسم کی زمین سے جس کا نام پولیج تھا اور ہر سال بوئی جاتی تھی ۔ برابر مالگزاری کا حصہ لیا جاتا تھا ۔

دوم ۔ قسم کی زمین جس کا نام پڑ رتی تھا اور ہمیشہ کاشت نہ ہوتی تھی بلکہ چندے واسطے زور بڑھانے کے چھوڑ دیتے تھے ۔ اس زمین سے انہیں سالوں کی بابت مالگزاری لی جاتی تھی جس میں وہ کاشت ہوتی تھی ۔

سوم ۔ قسم کی زمین جس کا نام چچر تھا اور تین چار برس سے بے تردد تھی اور اس کی درستی کے لئے خرچ بھی درکار ہوتا تھا ۔ اول سال زراعت میں کچھ لیا جاتا تھا اور پھر بڑھتا جاتا تھا ۔ یہاں تک کہ پانچویں میں پورا ہوتا تھا ۔

چہارم ۔ قسم کی زمین جس کا نام بنجر تھا اور پانچ برس سے زیادہ بے تردد پڑی تھی ۔ اور بھی ملائم شرطیں تھیں ۔ اس خاص بندوبست کا نقدی سے بدلنا اس طرح پر تھا کہ پیداوار اور بیگہ کی اور ہر قسم زمین کی اوسط کے حساب سے غلے کے وزن پر نکالی جاتی تھی ۔ مثلاً بیگہ پیچھے زمین غلے کی اوسط پیداوار نکالی اور تین من غلہ اس بیگہ کا کاشتکار سے لینا حصہ گورنمنٹ سے ٹھہر گیا ۔ پھر اوسط نرخ ناموں سے قیمت غلہ قرار دی گئی اور وہ نقدی اس بیگہ کی ٹھہر گئی پھر اس میں بڑی رفاہ یہ تھی کہ اگر کاشتکار بعوض نقدی گرانی نرخ سمجھ کر تین من غلہ دے دیتے تو اس کو اختیار تھا ۔ سرکاری بندوبست میں ان میں سے بہت باتوں کا خیال نہیں رہا ۔ افتادہ زمین پر برابر محصول لگ گیا ۔ جن زمینوں کا زور بڑھانے کو کچھ دنوں افتادہ رکھنا تھا اس کی منہائی نہیں ہوئی ۔ ہر سال برابر جوتے جانے سے زور کم ہوتا گیا ۔ پیداوار کم ہونے لگی جو حساب کہ بندوبست کے وقت لگایا گیا تھا وہ نہ رہا ۔ اکثر اضلاع میں ہر ایک بندوبست سخت ہو گیا ۔ زمینداروں کاشتکاروں کو نقصان عائد ہوئے ۔ رفتہ رفتہ وہ بے سامان ہو گئے زراعت کا سامان بہت کم ہو گیا اور اس سبب سے جو زمین کاشت کرتے تھے وہ جیسا کہ چاہیئے کمائی نہ گئی ۔ اس سبب سے بھی کم پیداوار ہوئی ادائے مالگزاری کے لئے وہ قرضدار ہوئے سود قرضہ زیادہ ہونے لگا ۔ بہت سے زمیندار مالگزار جو بہت اچھا سامان اور معقول خرچ رکھتے تھے مفلس ہو گئے جن دیہات میں افتادہ زمین سوا تھی وہ اور زیادہ خراب ہو گئی

از ۳ ٹامس صاحب بہادر اپنے ہدایات نامہ کی دفعہ ۷۷ میں لکھتے ہیں کہ آئین نہم ۱۸۳۳ء

کے بندوبست میں علی العموم یہ بات نظر آتی ہے کہ اچھے دیہات کی جمع کچھ نرم تجویز ہوئی اور خراب دیہات کی جمع سنگین ہو گئی۔ زمینداروں کی ناجائز منفعتیں جاتی رہیں۔ اگرچہ یہ بات بہت اچھی تھی، مگر بندوبست کے وقت اس کی رعایت چاہیئے تھی، جو نہ ہوئی۔ غرض ان اسباب سے زمینداروں اور کاشتکاروں کو مفلسی نے گھیر لیا تھا۔ جس کے سبب باوجود اس امن و آسائش کے جو زمینداروں کو تھی ان کے دل سے پچھلی عملداریوں کی یاد بھولتی نہ تھی۔

تعلقہ داری بندوبست کا شکست

تعلقہ داریوں کا شکست علی الخصوص اودھ میں

کر دینا اگرچہ ہم یہ نہیں کہتے کہ اس میں کچھ ناانصافی ہوئی عمدہ سبب فساد کا ہوا خصوصاً ملک اودھ میں یہ تعلقہ دار راجہ بنے ہوئے تھے اپنی تعلقہ داری کے دیہات میں حکومتیں کرتے تھے نفع اٹھاتے تھے۔ وہ بادشاہت اور منفعت ان کی دفعتاً جاتی رہی۔ اس باب میں بھی اگر سرکار یہ نہ کرتی تو اصل زمینداروں کو ان ظالموں کے ہاتھ سے کیونکر نکالتی۔ اس مقام پر بحث نہیں کرنے کے بلکہ اس کی بحث ہماری دوسری رائے میں ہے یہاں صرف یہ بیان کرنا ہے کہ شکست تعلقہ داری بھی سرکشی ہے

دیوانی عدالت

دیوانی عدالت کا انتظام پنجاب سے اچھا ہے مگر اصلاح طلب ہے

کا انتظام جو پریسیڈنسی بنگال اور آگرہ میں ہے وہ نہایت شائستہ ہے۔ اس کو اس غدر میں کچھ مداخلت نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ اکثر حکام کی رائے اس کے برخلاف ہو گی اور پنجاب کے انتظام کو پسند کرتے ہوں گے، مگر یہ گفتگو نہایت قابل بحث کے ہے قانون پنجاب کا ایک مجمل مطلب ہے انہی قوانین کا جو اس ملک میں جاری ہیں ان کے بسط اور پھیلاؤ اور عمل درآمد کے واسطے قواعد مقرر نہیں ہیں، ہر حاکم اس میں خود مختار ہے، سب حاکموں کی رائے سلیم ہونی ضروری نہیں ہے، پھر اس میں کس قدر خرابیاں انجام کو پڑنی متصور ہیں۔ دیوانی کا محکمہ سب محکموں سے زیادہ تر عمدہ ہے جس پر نہایت اہتمام چاہیئے۔ یہی محکمہ ہے جس پر آزادی ملک اور اجرائے تجارت اور افزونی بیع بیوپار و استحکام حقوق منحصر ہیں پنجاب میں یہ محکمہ نہایت کم قدر ہو رہا ہے، حکام مطلق متوجہ نہیں۔ بلکہ ہم کہتے ہیں کہ متوجہ

ہونے کی فرصت نہیں۔ جس قدر مقامات غور طلب بہ سبب انتقالات اور معاملات کثیر اور بہ سبب زیادہ مدت ہو جانے عملداری سرکار کے اس ملک میں ان ملکوں کی عدالتوں میں در پیش ہوتے ہیں۔ وہ ابھی تک پنجاب میں نہیں اور جب ہوں گے تو اس میں کچھ شک نہیں کہ قوانین پنجاب ان کی درستی سے فیصلہ کرنے کو کافی نہیں۔ اس غدر میں دیوانی عدالت کا جس قدر اثر پایا جاتا ہے، وہ صرف اتنا ہے۔ اوّل انتقالات حقیت۔ دوم مقروض ہونا یا مدیون ڈگری ہونا لوگوں کا کہ یہ دونوں باتیں آپس کے فساد کے باعث ہوئیں نہ مقابلہ سرکار کی ان باتوں سے آپس میں دلی رنج تھا اور یہ قاعدہ ہے کہ جب عملداری کو سستی ہوتی ہے آپس کے تنازعہ سے فسادات برپا ہوتے ہیں۔ پھر ان دونوں باتوں میں جو لوگوں کو آپس میں رنج تھا سب سے بڑا سبب اس کا یہ تھا کہ انتقالات ناواجبی اور قرضہ ناجائز لوگوں کے سر پر ہو گیا تھا، وہ جھوٹی ڈگریاں ہو گئے تھے اور اسی سبب دیوانی عدالت پر الزام لگایا جاتا ہے۔ خیال کرنا چاہیے کہ جس قدر کم توجہی اور ابتری اور سرسری تحقیقات اور خود اختیاری حکام مجوزہ مقدمات دیوانی کی پنجاب میں ہے، وہ بہت اس سے زیادہ خرابیاں پیدا کرے گی۔ دیوانی عدالت کی تاثیر دس برس میں ظاہر نہیں ہو سکی۔ پچاس برس بعد پنجاب کو ممالک مغربی شمالی کے انتظام اور تاثیر عدالت دیوانی سے مقابلہ کرنا چاہیے۔ اب ہم اس بات کو منظور کرتے ہیں کہ پریسی ڈنسی بنگال اور آگرے کا قانون متعلق مقدمات دیوانی قابل اصلاح ہے۔ انفصال مقدمات میں بہت تاخیر ہوتی ہے۔ اسٹامپ کے بیش قیمت ہونے سے اپیل کے ہر مقدمے میں بہت سے درجات قائم ہونے سے لوگوں کو زیر باری ہے۔ حکام دیوانی کو بعض قسم کا اختیار نہ دینے سے انفصال مقدمات میں ہرج تھا۔ سو اس کو ایکٹ ۱۱ ۱۸۵۳ء نے کچھ کچھ دفع کیا۔ اور جس قدر باقی ہے وہ قابل اصلاح ہے۔ اس میں اگر زیادہ گفتگو دیکھنی منظور ہو ہماری دوسری رائے کو جو در باب انتظام ہندوستان ہے اس کو ملاحظہ کرو۔

معلوم ناواقفیت گورنمنٹ حال رعایا

اس میں کچھ شک نہیں کہ ہماری گورنمنٹ کو رعایا کے حالات اور اطوار اور جو دکھ ان کو تھے ان کی اطلاع نہ تھی۔ اور اطلاع نہ ہونے کا کیا سبب تھا؟ کیونکہ حالات

اور اطوار کی اطلاع اختلاط اور ارتباط اور باہم آمد و رفت بے تکلفانہ سے ہوتی
ہے اور یہ بات جب ہوتی ہے کہ ایک قوم دوسری قوم میں مل جل کر اور محبت اور
اخلاص پیدا کر کر بطور ہم وطنوں کے توطن اختیار کرے۔ جیسا کہ مسلمان غیر مذہب
اور غیر ملک کے رہنے والوں نے ہندوستان میں توطن اختیار کر کے پیدا کیا اور غیر
ملکیوں سے برادرانہ راہ و رسم پیدا کی۔ مگر درحقیقت ہماری گورنمنٹ کو یہ بات
جو اصلی سبب رعایا کے حالات کی اطلاع کا ہے حاصل نہیں ہو سکتی اور نہ اس
طرح کی سکونت مختلفانہ ہماری کو ہوئی متخیل ہے۔ اب رہی یہ بات کہ رعایا خود اپنے
مصائب کی اطلاع کرتی تو اس کا قابو رعایا کو نہ تھا کیونکہ رعایا سے ہندوستان کو تجاویز
گورنمنٹ میں ذرا بھی مداخلت نہ تھی۔ اور اگر کسی نے کچھ بے قاعدہ کوئی عرضی پرچہ بھیجا
یا بحضور نواب گورنر جنرل بہادر پیش کیا وہ بطور استغاثہ تصور کیا گیا نہ بطور استحقاق
مداخلت تجاویز گورنمنٹ میں اور اسی لئے کچھ فائدہ حاصل نہ ہوا۔ اب ضرور ہوا کہ کوئی
اور شخص حالات رعایا کی اطلاع گورنمنٹ میں کرے وہ اطلاع منحصر تھی حکام متعہد اضلاع
کی رپورٹ پر وہ خود اس سے ناواقف تھے اور کوئی راہ نہ تھی ان کے اطلاع حاصل ہونے
کو اور ان کی عدم توجہی اس باب میں اور ان کی نازک مزاجی ایک مشہور بات ہے
ان کے رعب سے ڈرتے تھے۔ کسی کو سچی بات علی الخصوص وہ کہ جو خلاف طبع اور مزاج
حاکموں کے ہوتی تھی کہنے کا مقدور نہ تھا۔ ہر شخص ملازم اور درباری رئیس سب ڈر کے
مارے خوشامد کی بات کہتے تھے اور ہماری گورنمنٹ نے جو درحقیقت گورنمنٹ نوعیہ ہے
ان باتوں سے گورنمنٹ شخصیہ کی صورت پیدا کی تھی۔ پھر یہ طریقہ اطلاع حالات رعایا
کا بذریعہ حکام اضلاع ناکافی ہی نہ تھا بلکہ درحقیقت معلوم تھا۔ اس لئے حالات رعایا کے
ہمیشہ ہماری گورنمنٹ سے مخفی رہے۔ جو نیا قانون گورنمنٹ سے جاری ہوا اس سے جو
مضرت رعایا کے حال اور رفاہ اور فلاح کو پہنچی اس کا رفع کرنے والا اور اس کی خبر دینے
والا کوئی نہ تھا۔ اس قسم کے امور میں کوئی غم خوار رعایا کا نہ تھا بجز ان کے لہو کے جو جل
جل کر ان کے بدن میں رہتا تھا۔ اور بجز ان کی بے کسی کے جس پر وہ آپ رو
رو کر چپ رہتے تھے۔

مفلسی اور تنگی معاش ہندوستان

مفلسی ہندوستان علی الخصوص مسلمانوں کی کی رعایا کو ہماری گورنمنٹ
کی حکومت میں کوئی نہ ہوتی۔ سب سے بڑی معاش رعایائے ہندوستان کی نوکری تھی
اور یہ ایک پیشہ گنا جاتا تھا۔ اگرچہ ہر ایک قوم کے لوگ روزگار نہ ہونے کے شاکی
تھے۔ مگر یہ شکایت سب سے زیادہ مسلمانوں کی تھی۔ غور کرنا چاہیئے کہ ہندو جو اصلی باشندہ
اس ملک کے ہیں۔ زمانہ سلف میں ان میں سے کوئی شخص روزگار پیشہ نہ تھا۔ بلکہ سب لوگ
ملکی کاروبار میں مصروف تھے۔ برہمن کو روزگار سے کچھ علاقہ نہ تھا۔ بیس برن جو کہلاتے ہیں
وہ ہمیشہ بیوپار اور مہاجنی میں مصروف تھے۔ چھتری جو اس ملک کے کسی زمانے
میں حاکم تھے پرانی تاریخوں سے ثابت ہے کہ وہ بھی روزگار پیشہ نہ تھے۔ بلکہ زمین سے
اور ایک ایک ٹکڑہ زمین کی حکومت سے بطور بھیاچارہ علاقہ رکھتے تھے۔ سپاہ ان کی ملازم
نہ تھی۔ بلکہ بطور رعایائی بندی کے وقت پر جمع ہو کر لشکر آراستہ ہوتا تھا۔ جیسا کہ تھوڑا سا نمونہ
روس کی مملکت میں پایا جاتا ہے۔ البتہ قوم کا بت اس ملک میں قدیم سے روزگار پیشہ
دکھلائی دیتے ہیں۔ مسلمان اس ملک کے رہنے والے نہیں ہیں اگلے بادشاہوں کے
ساتھ بوسیلہ روزگار کے ہندوستان میں آگئے اور یہاں توطن اختیار کیا اس لئے
سب کے سب روزگار پیشہ تھے اور کمی روزگار سے ان کو زیادہ تر شکایت بہ نسبت
اصلی باشندوں اس ملک کے تھی۔ عزت دار سپاہ کا روزگار جو یہاں کی جاہل رعایا کے
مزاج سے زیادہ تر مناسبت رکھتا ہے ہماری گورنمنٹ میں بہت کم تھا۔ سرکاری فوج
جو غالباً مرکب تھی تلنگوں سے اس میں اشراف لوگ نوکری کرنی معیوب سمجھتے تھے
سواروں میں البتہ اشرافوں کی نوکری باقی تھی۔ مگر وہ تعداد میں اسی قدر قلیل تھی کہ اگلی
سپاہ سوار سے اس کو کچھ بھی نسبت نہ تھی۔ علاوہ سرکاری نوکری کے اگلے عہد کے صوبہ
داروں اور سرداروں اور امیروں کے بیچ کے ذکر ہوتے تھے کہ ان کی تعداد بھی کچھ کم
خیال کرنی نہیں چاہیئے۔ اب یہ بات ہماری گورنمنٹ میں نہیں ہے اس سبب سے رعایا
کو حد سے زیادہ قلت روزگار تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب باغیوں نے لوگوں کو نوکر
رکھنا چاہا ہزارہا آدمی نوکری کو جمع ہو گئے اور جیسے بھوکا آدمی قحط کے دنوں اناج پر گرتا
ہے اسی طرح یہ لوگ نوکریوں پر جا گرے ~

ملحد گرسنہ در خانہ خالی بر خوان
عقل باور نہ کند کز رمضان اندیشد

بہت سے آدمی صرف آنہ ڈیڑھ آنہ یومیہ پر نوکر ہوئے تھے۔ اور بہت سے آدمی بعوض یومیہ کے سیر ڈیڑھ سیر اناج پاتے تھے۔ اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان کی رعایا جیسی نوکری کی خواہشمند تھی۔ ویسی ہی مفلسی اور ناداری سے محتاج اور تنگ تھی۔

صرف مفلسی کے سبب سے رعایا کا تبدّل عملداری چاہنا

لوگ معاش سے بھی تنگ تھے

اور یہ ایک اصلی سبب ناراضی رعایا کا گورنمنٹ سے تھا۔ لوگوں کے دل جو تبدل عملداری کو چاہتے تھے اور نئی عملداری کے راغب اور دل سے اس سے خوش تھے، میں بہت سچ کہتا ہوں کہ اسی سبب سے تھے۔ ہم سچ کہتے ہیں اور پھر ہم کہتے ہیں کہ ہم بہت سچ کہتے ہیں۔ جب افغانستان سرکار نے فتح کیا لوگوں کو بڑا غم ہوا۔ کیا سبب تھا صرف یہ تھا کہ اب مذہب پر علانیہ دست اندازی ہوگی۔ جب گوالیار فتح ہوا، پنجاب فتح ہوا، اودھ لیا گیا لوگوں کو کمال رنج ہوا۔ کیوں ہوا اس لئے ہوا کہ ان کے پاس کی ہندوستانی عملداریوں سے ہندوستانیوں کو بہت آسودگی تھی، نوکریاں اکثر ہاتھ آتی تھیں ہر قسم کی ہندوستانی اشیا کی تجارت بہ کثرت تھی۔ ان عملداریوں کے خراب ہونے سے زیادہ افلاس اور محتاجی ہوتی جاتی تھی ہماری گورنمنٹ کی عملداری میں خوبیاں اور بھلائیاں بھی حد سے زیادہ تھیں، میں سب پر عیب نہیں لگاتا۔ بقول شخصے ؎

عیب مے جملہ بہ گفتی ہنرش نیز بگو
نفی حکمت مکن از بہر دل عامے چند

امن اور آسائش اور آزادی۔ رستوں کا صاف ہونا، ڈاکوؤں، رہزنوں، ٹھگوں کا نیست و نابود ہونا، سڑکوں کا آراستہ ہونا، مسافروں کی آسائش، بیوپاریوں کا مال دور دور بھیجنا غریب اعلیٰ اور ادنیٰ کے خطوط دور دست ملکوں میں برابر پہنچنا، خون ریزی اور خانہ جنگی کا بند ہونا۔ زبردست کا زور اٹھنا اور اسی قسم کی بہت سی باتیں ایسی اچھی ہیں کہ کسی عملداری میں نہ ہوئی ہیں نہ ہوں گی، مگر غور کرو کہ ان باتوں سے وہ معیشت جس کا ہم ذکر کرتے ہیں

نہیں جاتی ایک اور بات دیکھو کہ یہ نفع عملداری کا جو ہندکو رہا کن لوگوں کو زیادہ تر تھا۔ اول عورتوں کو کہ سب طرح آسائش میں تھیں، خانہ جنگی میں اولاد کا مارا جانا، چور ٹھگوں کے ہاتھ لٹنا، عاملوں کے ہاتھ سے خاوندوں اور بچوں کا محفوظ رہنا اور ہزارہا طرح کے مصائب سے محفوظ تھیں۔ پھر دیکھ لو کہ کس قدر خیرخواہ اور مداح سرکار کی عملداری کی تھیں۔ مہاجن اور تجارت پیشہ لوگ بہت آسائش سے تھے۔ پھر ان میں کوئی بھی بدخواہ نہ تھا حاصل یہ کہ جن لوگوں کو عملداری سرکار سے نقصان نہیں پہنچا تھا۔ ان میں سے کوئی بدخواہ نہ تھا۔

پچھلی عملداریوں میں جب تک ہندوستانیوں سے محبت نہ ہوئی آسائش نہیں ہوئی

ہندوستان کی پچھلی سلطنتوں کا حال دیکھو۔ اول ہندوستان پر مسلمانوں نے فتح پائی۔ ترکوں اور پٹھانوں کی سلطنت میں ہندوستان کی رعایا سے محبت اور میل جول نہ ہوا جب تک آسائش اور آسودگی سلطنت نے صورت نہ پکڑی۔ مغلیہ کی سلطنت میں اکبر اول کے عہد سے یہ ملاپ بخوبی شروع ہوا اور شاہجہان کے وقت تک بدستور رہا۔ باوجودیکہ اس زمانے میں بھی رعایا کو بدنظمی اصول سلطنت کے سبب سے تکلیفیں پہنچتی تھیں۔ مگر وہ زخم مندمل ہو جاتا تھا۔ اس برادرانہ محبت سے جو آپس میں تھی۔ لیکن عالمگیر کے عہد میں یہ محبت ٹوٹ گئی اور بہ سبب مقابلہ اور سرکشی قوم ہنود کے مثل سیواجی مرہٹہ وغیرہ کے عالمگیر جملہ قوم ہنود سے ناراض ہوا اور اپنے صوبہ داروں کے نام حکم بھیجے کہ جملہ قوم ہنود کے ساتھ بہ سخت گیری پیش آوے اور ہر ایک سے جزیہ لے۔ پھر جو مضرت اور ناراضی رعایا کو ہوئی وہ ظاہر ہے۔ غرضیکہ ہماری گورنمنٹ نے سو برس کی عملداری میں بھی رعایا سے محبت اور الفت پیدا نہ کی۔

ہندوستانیوں کی بے توقیری

اس بات سے تو کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ رعایا کو باعزت رکھنا اور ان کی تالیف کرنا یعنی ان سے دلوں کے ہاتھ میں رکھنا بہت بڑا سبب ہے پائداری گورنمنٹ کا تھوڑا ملے اور آدمی کی عزت ہو تو وہ بہت زیادہ خوش ہوتا ہے بہ نسبت اس کے کہ بہت ملے اور تھوڑی عزت ہو۔ بے عزتی کرنی کسی کی ایسی بد چیز ہے کہ آدمی کے دل کو دکھاتی ہے۔ یہی چیز

ہے کہ بغیر ظاہری نقصان پہنچائے عداوت پیدا کرتی ہے اور اس کا ایسا گہرا زخم ہوتا ہے کہ کبھی نہیں بھرتا ہے

جراحات السنان لها التيام
ولا يلتام ما جرح اللسان

تالیف کی خاصیت اس کے برخلاف ہے۔ یہ وہ چیز ہے کہ اس سے دشمن دوست ہو جاتا ہے اور دوستوں کی محبت زیادہ ہوتی ہے۔ بےگانہ یگانہ ہوتا ہے۔ یہی چیز ہے کہ جس سے وحشی جنگل کے جانور چرند و پرند تابعدار ہوتے ہیں۔ پھر اگر رعایا کے ساتھ ہو تو وہ کس قدر مطیع اور فرمانبردار ہوں گے۔ ابتدائے عملداری میں یہ چیز تھی کہ جس نے سب کے دلوں کو ہماری گورنمنٹ کی طرف سے کھینچ لیا تھا۔ ایک دلی اطاعت پیدا کر دی تھی۔ بیشک ہماری گورنمنٹ ان باتوں کو بھول گئی۔ بلاشبہ تمام رعایا ہندوستان کی اس بات کی شاہد ہے کہ ہماری گورنمنٹ نے ان کو نہایت بےقدر اور بےوقر کر دیا ہے۔ ہندوستان کے اشراف آدمی کی ایک چھوٹے سے یورپین کے سامنے ایسی بھی قدر نہیں ہے جیسی کہ ایک چھوٹے یورپین کی ایک بہت بڑے ڈیوک کے سامنے یوں تصور کیا جاتا تھا کہ ہندوستان میں کوئی جنٹلمین نہیں ہے۔

حکام اضلاع کی سخت مزاجی اور بدزبانی

یہ سب باتیں یعنی محبت اور الفت اور عزت اور تالیف رعایا کی گورنمنٹ کی طرف سے ظاہر ہوتی ہے بوسیلہ ان حکام متعہد کے جو ہماری گورنمنٹ کی طرف سے ہندوستان میں کارپردازی اور رعایا سے معاملہ اور میل جول اور ملاقات رکھتے ہیں گورنمنٹ کا ارادہ کیسا ہی نیک ہو وہ کبھی ظاہر نہ ہوگا جب تک یہ لوگ اس کے ظاہر کرنے پر کمر نہ باندھیں۔ اگلے حکام متعہد کے عادات اور روش اور اخلاق بہت برخلاف تھے۔ حال کے حکام متعہد سے وہ پہلے لوگ بہت عزت کرتے تھے۔ ہندوستانیوں کی ہر طرح خاطرداری سے پیش آتے تھے ان کے دلوں کو اپنے ہاتھ میں رکھتے تھے۔ دوستانہ ان کے رنج و راحت کے شریک ہوتے تھے۔ باوجودیکہ بہت بڑی سرداری اور حکومت ہندوستان میں رکھتے تھے اور تحشم اور رعب اور دبدبہ جو شایان حکومت ہے وہ بھی ہاتھ سے نہ دیتے تھے پھر ایسی محبت اور عزت ہندوستانیوں کی کرتے تھے کہ ہر شخص مل کر ان کے اخلاق اور ان کی محبت کا فریفتہ ہو جاتا

تھا۔ اور تعجب سے کہتا تھا کہ یہ کیسے اچھے لوگ ہیں کہ باوصف اس حشمت و شوکت اور دولت کے بے غرور ہیں اور کس طرح اخلاق سے ملتے ہیں۔ ہندوستان میں جو لوگ بزرگ گنے جاتے تھے ان سے اسی طرح پیش آتے تھے۔ بیشک ان لوگوں نے دلہائے متقدس کی پیروی کی تھی اور برادرانہ محبت اور اس برادرانہ محبت پر الفت بڑھائی تھی۔ حال میں جو حکام متعہد ہیں ان میں سے اکثروں کی طبیعتیں اس کے برعکس ہیں کیا ان کے غرور اور تکبر نے تمام ہندوستانیوں کو ان کی آنکھوں میں ناچیز نہیں کر دیا ہے کہ ان کی بدمزاجی اور بے پروائی نے ہندوستانیوں کے دل میں بے جا دہشت نہیں ڈالی ہے کیا ہماری گورنمنٹ کو نہیں معلوم ہے کہ بڑے سے بڑا ذی عزت ہندوستانی حکام سے ملنے اور بے عزتی کے خوف سے ترساں نہ تھا اور کیا یہ بات چھپی ہوئی کہ ایک اشراف اہل کار صاحب کے سامنے مثل چوبدار کے کھڑا رہتا ہے۔ اور ہاتھ جوڑ جوڑ کر باتیں کرتا ہے اور صاحب کی بدمزاجی اور سخت کلامی بلکہ دشنام دہی سے دل میں روتا جاتا ہے اور کہتا ہے کہ ہائے افسوس روٹی اور کہیں نہیں ملتی۔ اس نوکری سے تو گھاس کھودنی بہتر ہے

مسلمانوں کو یہ باتیں زیادہ ناگوار تھیں اور اس کا سبب

اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ یہ باتیں ہر ایک قوم کے لوگوں کو ناگوار تھیں مگر مسلمانوں کو بہت زیادہ گراں گزرتی تھیں۔ اس کا سبب بہت روشن ہے کہ صدہا سال سے مسلمان ہندوستان میں بھی باعزت چلے آتے ہیں ان کی طبیعت اور جبلت میں ایک غیرت ہے دل میں لالچ روپے کی بہت کم ہے کسی لالچ سے عزت کا جانا نہیں چاہتے بہت تجربہ ہوا ہو گا کہ اور قوم میں جو باتیں بغیر رنج کے اٹھا لیتے ہیں مسلمانوں کو اس سے بھی ادنے بات کا اٹھانا نہایت مشکل ہوتا تھا۔ ہم نے مانا کہ مسلمانوں میں یہ خصلتیں بہت بری ہی سہی مگر مجبوری ہے۔ خدا نے جو طبیعت بنائی ہے وہ بدلی نہیں جاتی اس میں مسلمانوں کی بدبختی سہی مگر کچھ قصور نہیں۔ یہی رنج تھے جن کے باعث تبدیل عملداری کو دل چاہتا تھا۔ سرکار کے برخلاف خبریں سن کر دل خوش ہوتا تھا مگر افسوس یہ ہے کہ ہماری گورنمنٹ کو مسلمانوں کی بھلائی سے اغماض نہ تھا ان کی لیاقت اور تعلیم ان کا ادب سب پیش نظر تھا۔ مگر یہ لوگ اس سے بے خبر تھے اور ہماری گورنمنٹ کا ارادہ اور دیانت حکام کے دیکھنے سے ظاہر نہیں ہوتا تھا۔

ہندوستانیوں کی ترقی کا نہ ہونا

اہل ہند علی الخصوص مسلمانوں کی ناراضی کا بڑا سبب یہ تھا کہ اعلیٰ عہدجات پر ترقی بہت کم تھی بہت ہی کم زمانہ گزرا ہے کہ یہ لوگ تمام ہندوستان میں معزز تھے۔ بڑے بڑے عہدے پاتے تھے۔ ان کا عزم اور ان کا ارادہ اب بھی ویسا ہی تھا۔ اسی طرح اپنی قدر و منزلت کی ترقی چاہتے تھے اور ظاہر میں کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ ابتدائے عملداری سرکار میں جو لوگ خاندانی اور معزز تھے وہ منتخب ہو کر معزز عہدے پاتے تھے رفتہ رفتہ یہ بات نہ رہی اس میں کچھ شک نہیں کہ ان لوگوں میں چنداں لیاقت نہ تھی اس لئے امتحان کا قاعدہ ہماری رائے میں کسی طرح قابل الزام کے نہیں اور نہ درحقیقت کسی کو اس کا رنج ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ امتحان سے عمدہ اہل کار ہاتھ آئے، مگر ایسے ایسے لوگ ان معزز عہدوں پر مقرر ہو گئے جو ہندوستانیوں کی آنکھوں میں نہایت بے قدر تھے، سارٹیفکیٹ ملنے میں خاندانی اور ذی عزت ہونے کا بہت کم لحاظ رہا جس قدر ہندوستانیوں کی ترقی لارڈ بنٹنگ صاحب بہادر نے کی اس سے زیادہ پھر نہیں ہوئی۔ کچھ شک نہیں ہے کہ وہ ترقی بہ سبب قلت عہدجات کے نہایت ناکافی تھی۔ بڑے بڑے اعلیٰ حاکم اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ جیسی ترقی ہندوستانیوں کی چاہیئے تھی ویسی ہی نہیں ہوئی۔

جس قدر اصلی سرکشی ہندوستان میں ہوئی اس سے زیادہ دکھائی دی۔

غصہ ایک ایسی چیز ہے کہ معاملات کی اصلیت کو آنکھ سے چھپا دیتا ہے طبیعت انتقام اور سیاست کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے سچ ہے کہ جو وارداتیں ہندوستان میں ۱۸۵۷ء میں پیش آئیں۔ اسی لائق تھیں کہ ہمارے حکام کو جس قدر غصہ آوے اور جس قدر انتقام اور سیاست کریں سب بجا ہے، مگر ہندوستان کے حالات پر غور کرنا چاہیئے کہ درحقیقت کس قدر سرکشی ہندوستان اصلی تھی اور کیوں اس قدر بڑھ گئی اور کیوں اس قدر دکھائی دی اور بدنصیب مسلمان کیوں زیادہ مفلس بعض اضلاع میں دکھائی دیئے۔ غور کرنے کی بات ہے کہ صدہا سال سے عملداری ہندوستان میں تزلزل تھا۔ رعایائے ہندوستان کو یہ موروثی عادت تھی کہ جب کوئی امیر یا سردار یا بادشاہ زادہ قابو یافتہ ہوا اس کے ساتھ ہزاروں آدمی جمع

ہو گئے۔ اس کی نوکری کو اس کی طرف سے عاملی کو اس کی طرف سے انتظام کو کسی طرح اپنا
قصور نہیں سمجھتے تھے۔ ہندوستان میں یہ ایک مثل مشہور ہے کہ نوکری پیشہ کا کیا قصور
جس نے نوکر رکھا تنخواہ دی اس کی نوکری کی۔ البتہ جب سردار اٹھا یا جاوے اور اس کی
جگہ دوسرا سردار قائم ہو اس کی اطاعت نہ کرنے کو قصور سمجھتے تھے۔ ہندوستان کے امیروں
اور سرداروں کا علی الخصوص ان کا جو قبل عملداری سرکار ہندوستان پر متسلط تھے اور جس کے
سبب ہندوستان طوائف الملوک ہو رہا تھا یہ عادت تھی کہ ملازمین سیف اور قلم سے کسی
طرح کی مزاحمت نہ کرتے تھے وہی عادت تمام ہندوستان کے لوگوں کو پڑی ہوئی تھی۔
جب ہندوستان میں مفسدوں نے سر اٹھایا اور لوگوں کو نوکر رکھنا چاہا ہزارہا آدمی جو روٹی
سے محتاج اور نوکریوں کے خواہش مند تھے جا کر نوکر ہوتے۔ سب کہتے تھے کہ ہمارا کیا قصور
ہے ہم تو نوکری پیشہ ہیں۔ عام رعایا میں بہت سے لوگ اس اپنی قدیمی عادت سے کہ
اب جو سردار ہے اس کی اطاعت کریں ہم تو رعیت ہیں جو زبردست ہے اس کے تابع
ہیں باغیوں کے تابع ہو گئے۔ بہت سے اہل کاران سرکاری یہ سمجھے کہ باغیوں سے ظاہرداری
کر کے جان بچا دیں اور جب سرکار کا تسلط ہو پھر سرکار کے تابع ہوں وہ بھی مجرم ہو گئے۔
حالانکہ کچھ شک کا مقام نہیں ہے کہ وہ دل سے سرکار کے تابع تھے اکثر لوگوں اور اہل کاروں
سے دفعتاً مجبوری خواہ نادانی خواہ بہ مقتضائے بشریت کوئی بات ہو گئی انہوں نے خیال
کیا کہ اب ہمارے اس قصور اتفاقیہ یا مجبورانہ یا جاہلانہ سے سرکار درگزر نہیں کرنے کی اور
سزا دے گی۔ اس خوف اور ڈر سے لاچار باغیوں کے ساتھ جا شامل ہوئے۔ بہت سے
آدمیوں نے درحقیقت کچھ نہیں کیا تھا مگر بخوف اور بہ سبب اور خیالات چند در چند باغیوں
میں مل گئے۔ بہت لوگوں نے اس زمانے میں وہ باتیں کیں جن باتوں کو وہ لوگ اپنے ذہن
اور اپنی سمجھ میں جرم مخالف سرکار نہیں سمجھتے اگر تمام ہندوستان کے حالات بغاوت پر نظر
کی جاوے گی تو ہم کو یقین ہے کہ دونوں قومیں جو ہندوستان میں بستی ہیں برابر بلکہ ایک سے
زیادہ ایک اور ایک سے زیادہ ایک اس فساد میں مفسد نظر پڑیں گی اور اس کے اثبات
پر تمام حالات ہندوستان کے گواہ موجود ہیں۔ مگر جن اضلاع میں مسلمان زیادہ تر مفسد دکھائی
دیئے اس کا سبب صرف یہی نہیں خیال کرنا چاہیے کہ دلی کی سلطنت پر مسلمان بادشاہ نے
دعوےٰ کیا تھا اور درحقیقت مسلمان اسی قدر مفسد ہوئے تھے جیسا کہ نظر پڑے نہیں

حکام کا مزاج دفعتاً ان باتوں سے جو ظاہر ہیں مسلمانوں سے ہو گئیں ناراض ہو گیا ان کے مخالفوں کو بڑی گنجائش ہو گئی خود غرضانہ باتیں پیش کرنے کو تھوڑی بات کو بہت بڑھا کر کہا ادھر حکام کو زیادہ ناراضی ہوتی ادھر مسلمانوں کو زیادہ تر خوف اور مایوسی ہوتی اور اپنی تقدیر سے جتنے تھے اس سے مفسد دکھائی دیئے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ پانچویں قسم کی بغاوت مسلمانوں میں بہت تھی اور وہ تبدل عملداری کے خیال سے بہت خوش ہوتے تھے جس کا سبب ہر ایک مقام ہم بیان کرتے آئے ہیں بہ این ہمہ ہماری گورنمنٹ پر مخفی نہ ہوگا کہ اس حال پر بھی جان بازی کی خیر خواہیاں اس ہنگامے میں کس سے زیادہ ظہور میں آئی ہیں خدا کے آگے جس کو حقیقی بادشاہت ہے اور دنیا کے بادشاہوں کے آگے جن کو مجازی حقیقت خداوند نے عطا کی ہے سب گنہگار ہیں۔

بدانتظامی اور بے اہتمامی

ہماری گورنمنٹ کا انتظام فوج ہمیشہ قابل اعتراض کے تھا فوج انگلستان کی کمی ہمیشہ اعتراض کی جگہ تھی۔ جب کہ نادرشاہ نے خراسان پر فتح پائی اور ایران اور افغانستان دو مختلف ملک اس کے قبضے میں آئے اس نے برابر کی دو فوجیں آراستہ کیں۔ ایک ایرانی قزلباشی دوسری افغانی جب ایرانی فوج کچھ عدول حکمی کا ارادہ کرتی تو افغانی فوج اس کے دبانے کو موجود تھی اور جب افغانی فوج سرتابی کرتی تو قزلباشی اس کے تدارک کو موجود ہوتی۔ ہماری گورنمنٹ نے یہ کام ہندوستان میں نہیں کیا ہم نے مانا کہ ہندوستانی فوج سرکار کی بڑی تابعدار اور خیر خواہ اور جاں نثار تھی مگر یہ کہاں سے عہد ہو گیا تھا کہ کبھی اس فوج کی خلاف مرضی حکم نہ ہوگا اور کسی حکم سے یہ فوج آزردہ خاطر نہ ہوگی پھر درصورت ناراض ہو جانے اس فوج کے جیسا کہ ہوا کیا راہ رکھتی تھی ہماری گورنمنٹ نے جس سے اس تمردی کا رفع دفع فی الفور ہو سکتا۔

مسلمانوں اور ہندوؤں کو مخلوط کر کر پلٹنوں میں نوکر رکھنا

یہ بات سچ ہے کہ ہماری گورنمنٹ نے ہندو مسلمان دونوں قوموں کو جو آپس میں مخالف ہیں نوکر رکھا تھا مگر بسبب مخلوط ہونے ان دونوں قوموں کے ہر ایک پلٹن میں یہ تفرقہ نہ رہا تھا ظاہر ہے کہ ایک پلٹن کے جتنے نوکر ہیں۔ ان سب میں بسبب ایک جا رہنے کے اور ایک لڑی میں مرتب ہونے کے آپس میں اتحاد اور ارتباط برادرانہ ہو جاتا تھا۔ ایک پلٹن کے سپاہی اپنے آپ کو ایک برادری سمجھتے تھے

اوراس سبب سے ہندو و مسلمان کی تمیز نہ تھی دونوں قومیں آپس میں اپنے آپ کو بھائی سمجھتی تھیں اس پلٹن کے آدمی جو کچھ کرتے تھے سب اس میں شریک ہوجاتے تھے ایک دوسرے کا حامی اور مددگار ہوجاتا تھا اگر انھیں دونوں قوموں کی پلٹن اس طرح پر آراستہ ہوتیں کہ ایک پلٹن نری ہندوؤں کی ہوتی جس میں کوئی مسلمان نہ ہوتا اور ایک پلٹن نری مسلمانوں کی ہوتی جس میں کوئی ہندو نہ ہوتا تو یہ آپس کا اتحاد اور برادری نہ ہونی پاتی اور وہی تفرقہ قائم رہتا اور میں خیال کرتا ہوں کہ مسلمان شاید پلٹنوں کو کارتوس جدید کاٹنے میں بھی کچھ عذر نہ ہوتا۔

پنجاب فتح کرکے ہندوستانی فوج مغرور ہوگئی تھی

فوج انگلشیہ کے کم ہونے سے رعایا کو بھی کچھ خوف تھا۔ وہ صرف ہندوستانی ہی فوج کا تھا۔ علاوہ اس کے ہندوستانی فوج کو بھی بے انتہا غرور تھا وہ اپنے سوا کسی کو نہیں دیکھتے تھے۔ فوج انگلشیہ کی کچھ حقیقت نہیں سمجھتے تھے۔ تمام ہندوستان کی فتوحات صرف تلوار کے زور سے جانتے تھے ان کا یہ قول تھا کہ برہما سے لے کر کابل تک ہم نے سرکار کو فتح کردیا ہے علی الخصوص پنجاب کی فتح کے بعد ہندوستانی فوج کا غرور بہت زیادہ ہوگیا تھا۔ اب ان کے غرور نے یہاں تک نوبت پہنچائی تھی کہ ادنےٰ ادنےٰ بات پر تکرار کرنے پر مستعد تھے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ فوج کے غرور اور تکبر کی یہاں تک نوبت پہنچی تھی کہ کچھ عجب نہ تھا کہ وہ کوچ اور مقام پر بھی تکرار کرنے لگتی

فوج ہندوستانی کا نہایت مغرور ہوجانا اور اس کا سبب

ایسے وقت ہیں کہ جب فوج کا یہ حال تھا اور ان کے سر غرور اور تکبر سے بھرے ہوئے تھے اور دل میں یہ جانتے تھے کہ جس بات پر ہم اڑیں گے اور تکرار کریں گے۔ خواہ نخواہ سرکار کو ماننا پڑے گا۔ ان کو نئے کارتوس دیئے گئے جس میں وہ یقین سمجھتے تھے کہ چربی کا میل ہے اور اس کے استعمال سے ہمارا دھرم جاتا رہے گا۔ انہوں نے اس کے کاٹنے سے انکار کیا۔ جب بارک پور کی پلٹن اس جرم میں موقوف ہوگئی اور حکم سنایا گیا تو تمام فوج نہایت رنجیدہ ہوئی کیونکہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ بہ سبب تخلل مذہب کے بارک پور کی پلٹن کا کچھ قصور نہ تھا۔ وہ محض بے قصور اور صرف سرکار کی ناانصافی سے موقوف ہوئی ہے

ملک در ملک فتح کر دیئے۔ سرکار ہمارے مذہب لینے کے در پے ہوئی اور واجبی بات پر موقوف کر دیا اس وقت کچھ فساد نہ ہوا۔ کیونکہ فوج پر بجز موقوفی کے اور کچھ جبر نہ ہوا تھا مگر تمام فوج کے دل میں کچھ تو بہ سبب یقین ہونے چربی کارتوس میں اور کچھ بہ سبب رنج موقوفی پلٹن بارک پور کے اور سب سے زیادہ بسبب غرور اور خود بینی اور اس خیال سے کہ جو کچھ ہیں ہمیں ہیں مصمم ارادہ ہو گیا کہ ہم میں سے کوئی بھی کارتوس نہیں کاٹے گا۔ اس میں کچھ ہی ہو جائے بلاشبہ بعد واقعہ بارک پور آپس میں فوجوں کی خط و کتابت ہوئی پیغام آئے کہ کارتوس جدید کوئی نہ کاٹے۔ اب تک تمام فوج کے دل میں ناراضی اور غصہ تو ہے مگر میری رائے میں ابھی تک کچھ فساد ارادہ نہیں۔

میرٹھ میں سزائے نامناسب کا ہونا

دفعتہً تقدیر سے کم بخت مئی ۱۸۵۷ء کی آگئی میرٹھ میں سپاہ کو بہت سخت سزا دی گئی جس کو ہر ایک عقلمند بہت بڑا اور ناپسند جانتا ہے اس سزا کا رنج جو کچھ فوج کے دل پر گزرا بیان سے باہر ہے وہ اپنی تمغوں کو یاد کرتے تھے اور بجائے اس کے بیڑیوں اور ہتھکڑیوں کو پہنے ہوئے دیکھ کر روتے تھے وہ اپنی وفاداریوں کا خیال کرتے تھے اور پھر اس کے صلہ میں جو ان کو انعام ملا تھا دیکھتے تھے اور علاوہ اس کے ان کو بے انتہا غرور جوان کے سر میں تھا۔ اور جس کے سبب وہ اپنے تئیں ایک بہت ہی بڑا سمجھتے تھے۔ ان کو زیادہ رنج دیتا تھا۔ پھر سب فوج مقیم میرٹھ کو یقین ہو گیا کہ یا ہم کو کارتوس کاٹنا پڑے گا۔ یا یہی دن نصیب ہو گا۔ اسی رنج اور غصہ کی حالت میں دسویں مئی کو فوج سے وہ حرکت سرزد ہوئی کہ شاید اس کا نظیر بھی کسی تاریخ میں نہیں ملنے کا۔ اس فوج کو کیا چارہ رہا تھا۔ اس حرکت کے بعد بجز اس کے کہ جہاں تک ہو سکے مفسدے پورے کرے۔

بعد فساد میرٹھ کے فوج کو گورنمنٹ کا اعتبار نہ رہنا

جہاں جہاں فوج میں یہ خبر پہنچی تمام فوج زیادہ تر رنجیدہ ہوئی۔ میرٹھ کی فوج سے یہ حرکت ہوئی تھی اس سے تمام ہندوستانی فوج نے یقین جان لیا تھا کہ اب سرکار کو ہندوستانی فوج کا اعتبار نہ رہا۔ سرکار وقت پا کر سب کو سزا دے گی اور اس سبب سے تمام فوج کو اپنے افسروں کے فعل اور قول کا اعتبار اور اعتماد نہ تھا۔ سب آپس میں کہتے تھے کہ اب وقت

وقت نکل جائے گا۔ تو یہ آنکھیں بدل لیں گے۔ میں بہت معتبر بات کہتا ہوں۔ کہ دلی میں
جو فوج باغی جمع تھی اس میں سے ہزاروں آدمیوں کو اس بے جا حرکت اور بے فائدہ بغاوت
کا رنج تھا۔ وہ روتے اور کہتے تھے کہ ہماری قسمت نے یہ کام ہم سے کروایا۔ پھر بہت افسوس
سے کہتے تھے کہ اگر ہم نہ کرتے تو کیا کرتے۔ ایک نہ ایک دن سرکار ہم کو تباہ کر دیتی کیونکہ
سرکار کو اب ہندوستانی فوج پر اعتماد نہیں رہا تھا۔ وہ قابو کا وقت جب پاتے ہم کو تباہ
کر دیتے ابتدائے غدر میں جب کہ ہنڈن پر فوج کشی کا ارادہ ہوا ہے۔ ہنوز فوج روانہ نہ
ہوئی تھی کہ بعضے آدمیوں کی صاف رائے تھی کہ جس وقت دلی پر فوج سے لڑائی شروع ہوئی
بلا شبہ تمام ہندوستانی فوج بگڑ جاوے گی چنانچہ یہی ہوا سبب اس کا یہی تھا کہ فوج
سے لڑائی شروع ہونے کے بعد ممکن نہ تھا کہ باقی فوج سرکار سے مطمئن رہتی۔ وہ ضرور
سمجھتے تھے کہ جب ہمارے بھائی بندوں کو مار لیں گے تب ہم پر متوجہ ہوں گے۔ اس لیے
سب نے فساد پر کمر باندھ لی اور بگڑتے گئے۔ جن کے دل میں فساد نہ تھا وہ بھی بہ سبب
شامل ہونے فوج کے اس جتھے سے الگ نہ ہو سکے۔ ہندوستانی رعایا جانتی تھی کہ سرکار
کے پاس جو کچھ ہے وہ ہندوستانی فوج ہے۔ جب تمام فوج کا بگڑنا مشہور ہو گیا۔ سب
نے سر اٹھایا عملداری کا ڈر دلوں سے جاتا رہا۔ اور سب جگہ فساد برپا ہو گیا۔

پنجاب میں سرکشی نہ ہونے کا سبب

اب ہماری اس رائے کو پنجاب کے حالات پر تولو۔ پنجاب کے مسلمان
بہت ستم رسیدہ تھے۔ سکھوں کے ہاتھ سے سرکاری عملداری سے ان کا چنداں نقصان نہ
ہوا تھا۔ سرکار نے پنجاب میں ابتدائے عملداری میں بہت تشدد کیا تھا۔ اور اب دن بدن رفاہ
کرتی جاتی تھی۔ برخلاف ہندوستان کے کہ یہاں معاملہ بالعکس تھا۔ ابتدائے عملداری میں تمام
ملک کے ہتھیار لے گئے۔ کسی کو قابو فساد کا نہ رہا تھا۔ اگرچہ وہ تمول سکھوں کو جو پہلے نہ رہا
تھا مگر ان کا کمایا ہوا روپیہ جو ان کے پاس جمع تھا ابھی خرچ نہ ہو چکا تھا اور وہ مفلسی جو ہندوستان
میں تھی وہاں ابھی نہیں آئی تھی۔ اس کے سوا تین سبب اور بہت قوی تھے۔ جو پنجاب
نہ بگڑا۔

اول یہ کہ فوج انگلشیہ وہاں موجود تھی۔ دفعتاً بے خبری میں ہندوستانی

فوج کے ہتھیار لے لئے گئے۔ بہ سبب طغیانی اور کثرت سے واقع ہوتے دریاؤں اور بند ہو جانے گھاٹوں کے، ہندوستانی فوج بے قابو ہو گئی۔ فوج کا فساد برپا نہ ہو سکا۔

تیسرے یہ کہ تمام سکھ اور پنجابی اور پٹھان جن سے احتمال فساد تھا، سرکار میں نوکر ہو گئے اور لوٹ کا لالچ اس پر مزید تھا۔ جو بات رعایائے ہندوستان اور روزگار پیشہ کو باغیوں کے ہاں بہ مشکل اور بذلت حاصل ہوئی تھی، وہ اہل پنجاب کو سرکار کے ہاں بہ عزت و بلا دقت نصیب تھا۔ پھر حالات پنجاب کے ہندوستان کے حالات سے بالکل مخالف تھے۔

ایک جائزہ

واجد علی شاہ

مر گئے ہم تو زمانے نے بہت یاد کیا

واجد علی شاہ کی زندگی اور موت، عروج و زوال، داب شاہی اور فقر و غیور، سخاوت اور مفلسی، وہ یادلی اور بے مائگی، ——— یہ ایک ایسی کہانی ہے جس میں سوز و الم بھی ہے اور درد و حسرت بھی اس میں دل عبرت بھی ہے اور پیام موعظت بھی یہ ایک سبق بھی ہے اور پند بھی۔

ضروری ہے کہ مختصر طور پر واجد علی شاہ کی حکومت، معزولی، جلاوطنی اور موت کا افسانہ بھی سنا دیا جائے چشم عبرت دیکھ لے گی۔

جہاں بجتے ہیں نقارے وہاں ماتم بھی ہوتے ہیں

جہاں عیش و طرب، ناؤ و نوش، چنگ و رباب، رقص و نغمہ اور، سرود و نشاط کی محفلیں جمتی ہیں، وہاں صف ماتم بھی بچھتی ہے، نوحہ و فغاں کا شور بھی بلند ہوتا ہے، نہ وہ دور نزہت آگیں باقی رہا، نہ یہ عہد ادبار و نکبت قائم رہا، ہاں مگر، دونوں کی یاد

باقی رہ گئی

تھی جہاں شمع وہاں خاک ہے پروانے کی

یہ خاک دیکھ لو، اس پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈال لو، کہ یہی یاد اب موضوعِ بزم و انجمن ہے، یہ کبھی نہیں مٹ سکتی، یہ کبھی نہیں فراموش ہو سکتی!!

بیدار مغز بادشاہ

واجد علی شاہ جب تختِ حکومت پر بیٹھے، تو بالکل نوجوان تھے، دل امنگوں سے معمور تھا، نہ دولت کی کمی تھی، نہ شاہد و مطرب کی، ایک اشارہ چشم پر ہر وہ چیز موجود ہو سکتی تھی جس کا خیال دل میں پیدا ہو، بگاڑنے والے بہت تھے، بنانے والا کوئی نہ تھا، جی حضوری، اور ہاں میں ہاں ملانے والوں کی کمی نہ تھی، لیکن حق بات کہنے والا، راہ راست کی طرف ہدایت کرنے والا کوئی نہ تھا۔ شریکِ لہو و لعب، ہر کوئی تھا، لیکن شریکِ پند و اصلاح کوئی نہ تھا۔

لیکن اس فضا میں بھی، واجد علی شاہ نے، اپنے آپ کو سنبھالا، بیدار مغزی کا ثبوت دیا، حالات کی اصلاح، نظامِ مملکت کی درستی، آئین و اصول کے نفاذ اور مالی و اقتصادی امور کی نگرانی، فوجی اور عسکری طاقت کے استحکام و ثبات پر پوری توجہ صرف کی، پابندی کے ساتھ امورِ مملکت میں حصہ لیتے اور تمام حالات و کیفیات کا براہ راست مشاہدہ و معائنہ کرتے رہتے تھے، ایک ہمعصر مورخ لکھتا ہے:۔

کاروبارِ سلطنت سے دلچسپی

کاروبارِ سلطنت پر اپنی حکومت کے زمانہ میں وہ کڑی نظر رکھتے تھے۔

"علی نقی خاں کے طالع کی یاوری سے بادشاہ کا مزاج ان سے بہت رضا مند ہوتا گیا، اور رسوخ ترقی پاتا گیا، اور بادشاہ نائب کے اعتماد پر مطمئن رہے بعد چندے حسب اتفاق کچھ عرائض مستغیثان مظلوم کی وزیر کے توسط کے بغیر بادشاہ کے ملاحظہ میں گزریں، طبع والا، داد رسائی پر راجع ہوئی اور ایک سر رشتۂ اخبار، موسوم بہ "اخبار حضور" بہ اہتمام منشی مظفر علی اسیر جاری ہوا، ہر روز پرچے بادشاہ سنتے، اور اپنے ہاتھ احکام جاری کرتے، [illegible] کاروبار سلطنت عمدہ طور پر چلنے لگا۔

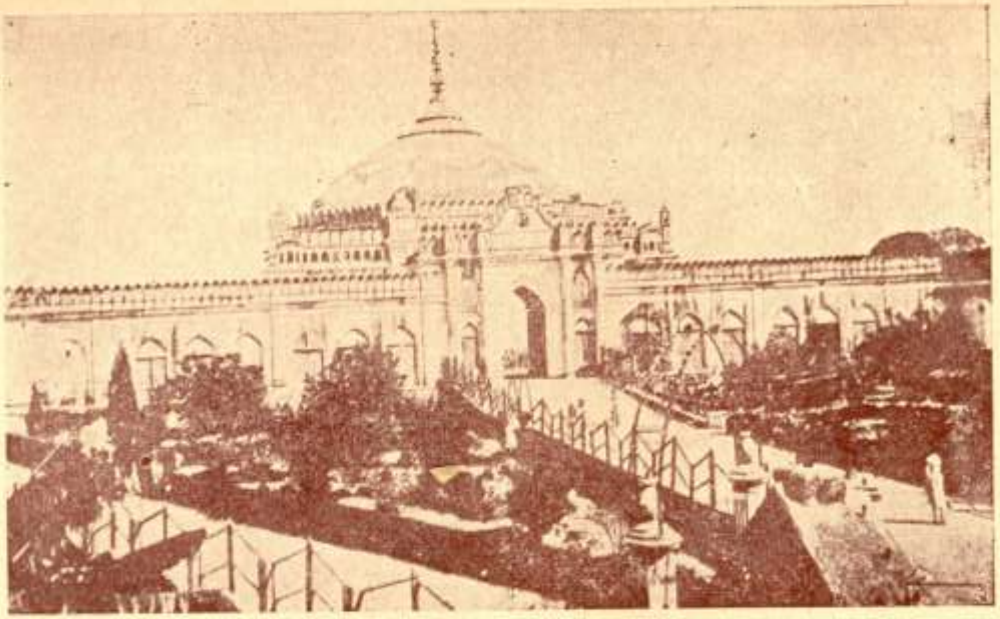

شاہ نجف (جسے ۱۸۱۴ء میں بادشاہ لکھنؤ غازی الدین حیدر نے تعمیر کیا)

۱۸۴۷ء میں شاہ لکھنؤ امجد علی شاہ بادشاہ کا انتقال ہوا تو واجد علی شاہ ان کے جانشین ہوئے انہوں نے فوج کو از سرِ نو مرتب کیا، احکام نافذ کئے گئے کہ لکھنؤ کی تمام پلٹنیں روزانہ صبح کے پانچ بجے پریڈ کیا کریں گی، بادشاہ خود پریڈ کے موقع پر کمان کرتے تھے اور جنرل کی وردی زیب تن فرماتے تھے، اور روزانہ ۴-۵ گھنٹے تک فوج سے ڈرل کرایا کرتے تھے، مزید برآں انہوں نے یہ حکم نافذ کر رکھا تھا کہ امور سلطنت کی ضروریات کے سوا اگر کبھی وہ خود غیر حاضر ہو جایا کریں گے تو ... ۲ روپے جرمانہ ادا کریں گے، جتنے فوج میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ اتنا ہی جرمانہ اس پلٹن سے وصول کیا جاتا جو پریڈ میں دیر سے آتی، مزید سزا انہیں یہ ملتی تھی کہ پیدل فوج کی دو پلٹنیں اور رسالہ کی ایک پلٹن دن بھر مسلح رکھی جاتی۔

انگریزوں کا شبہ

بادشاہ کی جد و جہد نے کمپنی کے دل میں ایک گونہ شبہ پیدا کر دیا۔ برطانوی ریزیڈنٹ نے بادشاہ سے دریافت کیا کہ حضور فوج کی تیاری میں اس قدر زحمت کیوں برداشت فرماتے ہیں؟ اور یہ تجویز پیش کی کہ اگر حضور کو اپنے ملک کی حفاظت کی خاطر افواج کی ضرورت ہو تو برطانوی افواج استعمال کی جا سکتی ہے۔ جن کے اخراجات محاصل اودھ سے ادا کر دیئے جائیں گے، امرائے دربار نے عرض کی کہ ذاتی جد و جہد سے کسی قسم کا شبہ پیدا کرنے کی ضرورت نہیں ہے، بادشاہ نے ان تمام فہمائشوں سے متاثر ہو کر یہ جواب دیا کہ چونکہ میری فوجی جد جہد کو پسند نہیں کیا جاتا۔ لہٰذا میں دوسرے مشاغل میں اپنے تئیں مصروف رکھوں گا، اس کے بعد سے انہوں نے امور سلطنت سے غفلت برتنی شروع کر دی اور عیش و عشرت میں بسر اوقات کرنے لگے۔ سابقہ وزیرا پنے عہدے سے برطرف کر دیئے گئے اور ان کے بجائے علی نقی خاں جو ایک اچھے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے وزیر مقرر ہوئے۔ بادشاہ نے پہلے تو اپنے وزیر کی بھتیجی اور اس کے بعد اس کی لڑکی سے شادی کر لی اور سلطنت کا سارا کاروبار علی نقی خاں کے ہاتھ سونپ دیا۔[1]

ریزیڈنٹ صاحب کے خلاف مزاج

ایک دوسرا مورخ بھی اس واقعہ کی تائید کرتا ہے:۔

"بادشاہ نے پیادوں کی چند پلٹنیں اور سواروں کے رسالے بھرتی کر کے

---

[1] خدنگ غدر صفحہ ۵۴

ان کو وردی اور ہتھیاروں سے آراستہ کیا تھا ان کے نام بھی عجیب و غریب رکھے تھے۔ بانکا، ترچھا، گھنگھور، اختری اور نادری ——— اور ان کے قواعد کے فارسی زبان میں اصطلاحیں مقرر کی تھیں، اکثر بادشاہ بہ نفس نفیس میدان پریڈ میں جا کر ان کے قواعد اور نیزہ بازی اور شمشیر زنی اور تفنگ اندازی کی مشق ملاحظہ فرماتے تھے اور تین تین چار چار ساعت تک گھوڑے پر سوار ہو کر دھوپ میں کھڑے رہتے اور کبھی کبھی خوش ہو کر انعامات اور خطابات سے سرفراز کرتے تھے۔ نادر العصر میں لکھا ہے کہ ایک دن نواب علی نقی خاں نے عرض کیا، یہاں ریذیڈنٹ کے مزاج کے خلاف ہے اس لیے بادشاہ نے بالکل اس طرف سے کنارہ کیا۔[1]

اگر بادشاہ یہ نہ کرتے، تو شاید بہت پہلے معزول کر دیئے گئے ہوتے، کیونکہ انگریز کسی بیدار مغز فرماں روا کو برداشت ہی نہیں کر سکتے تھے۔

وضع قطع

واجد علی شاہ جامہ زیب، خوب رو، اور خوش اندام شخص تھے، مولانا شرر فرماتے ہیں:۔

"بادشاہ کی وضع یہ تھی کہ بڑے بڑے بال تھے جن کا پیچھے کی طرف جوڑا باندھ لیتے، بڑی بڑی کھڑی مونچھیں، اور منڈی ہوئی داڑھی، چندیا پر ایک چھوٹی سی نکے دار وسا لے کی بھاری ٹوپی، گلے میں جامدانی یا ململ کا چست انگرکھا اس کے نیچے نہ کرتا ہوتا نہ شلوکہ بائیں جانب کی چھاتی کھلی رہتی، پاؤں میں پرانی وضع کا عرض کے ڈھیلے پائنچوں والا برکا، پائجامہ جاڑوں میں کوئی شالی رومال کندھوں پر ہوتا۔ لیکن محلات اور باغات شاہی سے باہر نکلتے تو سر پر کوئی شالی چھٹیا سا لپیٹ لیتے اس کے ساتھ سچے کام کا کھنیلا جوتا پہنتے تھے۔"[2]

واجد علی شاہ کی زرپاشی اور معدلت ایک مسلمہ حقیقت تھی:۔

---

[1] تاریخ اودھ جلد ۵ ص ۱۲۵

درگاہ حضرت عباس کی آستاں بوسی کے لئے، دو گھڑی دن چڑھے بادشاہ ہودج مرصع و نذریں میں بیٹھ کر بالائے فیل روانہ ہوئے، جب سواری دولت سرا سے چلی طشت جواہر نثار ہوتے، چوک کے وسط میں زرفشانی کے وقت انگوٹھی پر الماس جڑا ہوا تھا، بادشاہ کی انگلی سے نکل کر گر پڑی، وہ ایک بوڑھی عورت نے پائی جب بادشاہ کے پاس پہنچی، تو انگوٹھی دے کر دس ہزار روپے انعام میں دلائے گئے، جب محمد نگر کی سڑک پر پہنچے تو حسینی قوم کوزہ گر نے فریاد کی کہ قائم علی کشمیری، مقرب خاص نواب علی نقی خاں نے اس کا مکان زبردستی چھین کر گرا دیا ہے، بادشاہ نے سواری ٹھہرائی اور اسی وقت حکم دیا کہ قائم علی کا مکان گرا دیا جائے، اور جیب خاص سے پانچ ہزار روپے علی رضا بیگ کوتوال کو واسطے تیاری مکان مستغیث کے مرحمت ہوئے ——— ! [1]

شرعی سزا کا نفاذ | عہد واجد علی شاہ تک شرعی سزا کا نفاذ باقاعدہ ہوتا تھا:-

"ایک مجموعہ قلمی مجتہد العصر کے گھرانے کا نظر سے گزرا ہے جس میں مجتہدوں کے عرضے امجد علی شاہ کے عہد سے واجد علی شاہ کے عہد تک بادشاہوں کے نام اور عدالت مرافعہ کے فیصلے جو مجتہدوں نے صادر کئے تھے، وزراء کے خطوط، بادشاہوں کے دستخطی احکام، بعض مقدمات متعلقہ مجتہد کے مثل، ریزیڈنٹ کے پرچہ پیام وغیرہ میں مندرج ہیں، یہ مجموعہ اصل منشی مظفر علی خاں اسیر اور منشی امیر احمد مینائی نے نواب اقبال الدولہ کو دیا تھا۔ وہاں سے کتب خانہ رام پور میں آگیا۔ اس مجموعے سے معلوم ہوتا ہے کہ واجد علی شاہ کے عہد تک اودھ میں حدود شرعی جاری تھیں۔" [2]

بادشاہ کی شہ زوری | واجد علی شاہ، ورزشی بدن کے شہ زور شخص تھے۔ معاصر مؤرخ کا بیان ہے:-

---

[1] تاریخ اودھ جلد ۵ صفحہ ۱۳۴

[2] ؍؍ ؍؍ ؍؍ صفحہ ۱۶۳

"علاوہ اور کمالات کے زور اور طاقت کا یہ عالم تھا کہ چٹکی سے سکّے کے نقش مٹا دیتے تھے اور سکہ کو دبا کر اس کی گولی بنا دیتے تھے۔"[1]

لباس کی تراش خراش

لباس کی تراش خراش اور نفاست کا نمونہ آج بھی لکھنؤ میں بہت کچھ نظر آتا ہے، اس سے شاہی وقت کے اس فن کی ترقی کا ثبوت ملتا ہے۔ بڑے پائنچوں کا پاجامہ جہانگیر بزدں کے سائے کی نقل ہے۔ نصیر الدین حیدر کی عہد کی ایجاد ہے، بادشاہ نے اس کو پہنا جس کی وجہ سے اکثر وضعداران شہر کی بھی یہی وضع ہو گئی بعد کو بہت لمبے لمبے پائنچوں کا پاجامہ مردوں سے چھوٹ گیا، مگر معزز بیگمیں آج تک کئی کئی گز کے پائنچوں کے پانجامے پہنتی ہیں، پنج گوشیہ ٹوپی بھی نصیر الدین حیدر کی ایجاد ہے۔

واجد علی شاہ نے قبۂ نور اور جامۂ حسن کے نام سے دو نئے قسم کے لباس ایجاد کیے۔ گردن سے قدم تک اس میں تکنیں ہوتی تھیں اور قبہ نور ایسا لباس تھا کہ کاندھے پر بال لگاتے تھے۔[1]

اصلاحات کا پروگرام

اصلاحات کی فکر سے بھی بادشاہ سلامت غافل نہ تھے:-

"اول سال جب یہ بادشاہ تخت نشین ہوئے، یہ منظور ہوا کہ تمام علاقہ جات قلمرو سلطانی حضور تحصیل ہو جائیں۔ زمیندار اور تعلقہ دار اپنے وکلا کی معرفت زر آمدنی داخل خزانہ سلطانی کیا کریں۔ ناظم اور چکلہ دار موقوف ہو جائیں کہ یہ علاقہ پر جا کر زیادہ ستانی اور تنگ طلبی کرتے ہیں، رعیت تباہ ہوتی ہے اور نقصان سرکار بھی ہوتا ہے لیکن اہل کاروں کے کہ ان سے حاصلات لاکھوں روپے کے جاتے تھے، اس حکم کو جاری نہ ہونے دیا۔"[2]

دادگستر بادشاہ

رعایا کی شکایات سننے اور ان کا ازالہ کرنے پر واجد علی شاہ ہمہ تن متوجہ رہتے تھے:-

---

[1] چمنستان مظفر

حسین آباد (لکھنؤ) کا امام باڑہ (تعمیر ۱۸۳۹ء)

"کئی دن تک بادشاہ کی سواری میں دو ترک سوار آگے آگے دو نقرئی تیج صندوقچے نیزوں پر رکھ کر چلتے تھے، راہ میں جو مستغیث عرضی دیتا تھا صندوقچے میں ڈال دیتے تھے کنجی اس کی بادشاہ کے پاس رہتی تھی اور بادشاہ اپنے ہاتھ سے کھول کر حکم لکھتے تھے اور طبیعت بھی نہایت رسا اور تیز تھی اس کا نام "تاریخ نادر العصر" اور محاربۂ غدر کی روایت کے مطابق مشغلہ سلطانی رکھا تھا، اہل کاروں کو اس سے خوف اور رعایا کو باعث ازدیاد تقویت تھا۔[۱]

واجد علی شاہ کی ایجادات

واجد علی شاہ نے اپنے دربار کے خطاب یافتہ معززین کے لئے ایک نئی اور عجیب قسم کی درباری ٹوپی ایجاد کی اس کا نام عالم پسند (جھولا) تھا۔

بشپ ہیبر ۱۸۲۴ء میں بطور سیاح کے ہندوستان میں آیا، اس نے لباس و پوشاک دیکھ کر اور بادشاہ سے مل کر یہ رائے قائم کی کہ حضور لباس کے شائق اور اس فن کے بہترین نقاد ہیں یہی وجہ ہے کہ شاہان اودھ کے عہد میں روسا امرا بھی اس بارے میں بڑے نقاد اور وسیع النظر تھے اور اس قدردانی کی وجہ سے اس فن کو بہت ترقی ہوئی اور کپڑوں کی وضع میں تراش و خراش پیدا ہوئی واجد علی شاہ نے دو پلی نکے دار ٹوپی اور چوڑی گھرٹ کا انگرکھا بھی ایجاد کیا۔[۲]

تورہ

لکھنؤ کا شاہی عہد کھانے اور اس کی عجیب و غریب اور مختلف قسموں کے اعتبار سے بھی ممتاز ہے، تفصیل کا یہاں موقعہ نہیں، شاہی دعوتی کھانے کی ایک خاص قسم کا نمونہ یہ ہے:-

"اصطلاح اودھ کے مطابق بارہ قسم کے کھانوں کے مجموعے کا نام تورا ہے یہ لفظ ترکی ہے، جو مغلوں کے ساتھ ہندوستان میں داخل ہوا۔

ایک تورے میں لازمی طور پر حسب ذیل غذائیں ہوا کرتی ہیں جو عموماً لکھنؤ والوں

---

[۱] قدیم ہنروران اودھ ص ۱۵۹

[۲] تاریخ اودھ جلد ۵ ص ۱۲۳

کو پسند ہیں۔ لیکن یہ امتیازی توڑا اپنی وسعت کے لحاظ سے کئی توڑوں کا قائم
مقام اور چھ سات آدمیوں کے لئے کافی تھا۔

(۱) پلاؤ (۲) مزعفر
(۳) متنجن (۴) شیر مال
(۵) سفیدہ (میٹھے چاول جس میں زعفران کا رنگ نہ ہو)
(۶) بورانی کا پیالہ (ایجاد بوران بنت حسن وزیر مامون الرشید عباسی)
(۷) شیر برنج (۸) قورمہ
(۹) گوشت میں تلی ہوئی اردیاں (۱۰) شامی کباب
(۱۱) مربّے (۱۲) اچار یا چٹنیاں

اس توڑے کے مختلف نمبروں میں متعدد پلیٹیں تھے مثلاً چار قسم کا پلاؤ اور کئی قسم کے میٹھے چاول، اردیوں میں آبی، بہاتی، چھلکا، خشکی۔ شیر مال اور پراٹھا تھا، سادہ سالن اور کباب بھی کئی قسم کے تھے۔ مربے اور چٹنی کی بہار دیکھنے کے لائق تھی۔

واجد علی شاہ کا سکہ انڈین میوزیم کے اندر رکھے ہوئے سکوں کی فہرست کے دوسرے حصے سے معلوم ہوتا ہے کہ واجد علی شاہ کے سکے پر ایک طرف یہ بیت تھی،

سکہ زد بر سیم و زر از فضل تائید اله
ظل حق واجد علی، سلطان عالم بادشاہ
۱۲۶۶ھ

دوسری طرف ایک تاج ہے اس پر ایک چھتری ہے جس کے دونوں طرف دو جھنڈیاں کھڑی ہیں، ان کو دو مرمیڈوں نے ایک ہاتھ سے سہارا دیا ہے، ان کے دوسرے ہاتھ میں ایک ایک چنور ہے اور بازوؤں پر پرٹے ہیں۔ مرمیڈ انگریزی میں ایک دریائی جانور کا نام ہے جس کے اوپر کا حصہ عورت یا مرد کے مشابہ ہوتا ہے اور نیچے کا مچھلی کی طرح، یہ نہایت نایاب

جاندار چیز جو بڑے بڑے سمندروں میں رہتی ہے۔ مرمیڈ کا ترجمہ عربی میں بنت البحر ہے، اس تاج کے تلے ایک قلعہ کی علامت ہے۔ اس کے تلے دو تلواریں کھڑی ہیں۔ ان تمام چیزوں کے آس پاس کے دور میں سکے کے کنارے سے ملی ہوئی۔ یہ عبارت مندرج ہے۔

"ضرب ملک اودھ، بیت السلطنت لکھنؤ، سنہ ۲ جلوس میمنت مانوس سے،،

اس فہرست میں اتنی تفصیل نہ تھی۔ ہم نے سکہ دیکھ کر یہ حلیہ لکھا ہے۔[1]

واجد علی شاہ کی جدت وذہانت

مختلف چیزوں کے نام رکھنے میں واجد علی شاہ کی جدت وذہانت آپ اپنا جواب تھی۔ غازی الدین حیدر نے حقہ کا نام محسن محفل، جعفرات کا نام دہی اور ملائی کا نام بالائی رکھا۔ اسی طرح واجد علی شاہ[2] نے صدہا چیزوں کو ناموں کے خلعت دیئے۔ شراب کو آب حرام، رضائی کو شب خوابی۔ جوتی کو آرام پائی حقہ کو لب معشوق، تمباکو کو سے خوردنی۔ سر رکھنے کے تکیہ کو آرام سرا اور تکیچی کو آرام پہلو۔

واجد علی شاہ کی ادبیت

ہندوستان میں کسی بادشاہ کی تصنیفات اتنی زیادہ اور کارآمد نہیں جس قدر واجد علی شاہ کی ہیں۔ واجد علی شاہ نے خطابات اور حکام وغیرہ میں شاعری اور ادب کے جوہر کوٹ کوٹ کر بھر دیئے۔ عورتوں، مردوں، عمارتوں، باغوں اور جانوروں کو ہزاروں خطاب دے ڈالے۔ ان خطابوں کی خوبی اس وقت معلوم ہوتی ہے جب وہ چیز یا شخص سامنے ہو۔[2]

موسیقی میں دست گاہ

فن موسیقی میں بادشاہ کا پہلا استاد باکمال نتھو خاں ڈھاری فرخ آباد کا ہے بادشاہ نے باسط خاں کے بعد فن موسیقی حاصل کرکے کمال کی حد تک پہنچا دیا۔ بادشاہ اس فن لطیف میں کامل بصیرت رکھتے تھے۔ ان کا شمار بلحاظ فن اساتذہ میں تھا۔ ایک اہم جزو موسیقی جس کو عرف عام میں ٹائم Time یا وقت کہنا چاہیئے۔ اس کا مادہ بادشاہ میں بہت تھا۔ لیوں لوے کا مادہ کم وبیش ہر شخص میں ضرور موجود ہوتا ہے۔ شعرا نے جو اوزان مقرر کئے ہیں، وہ بھی سے تعلق رکھتے ہیں۔ علم عروض دراصل کمل سے ہوتا ہے۔ یہ بدیہی امر ہے کہ جس شخص میں فطرتاً لے کا

---

[1] تاریخ اودھ جلد ۵ صفحہ ۱۸۱

[2] تاریخ [illegible] اودھ [illegible] صفحہ [illegible]

مادہ ہوگا، اس کے ہر عضو اور بن سے حرکت بے اختیاری رلبدگی پیدا ہو جائے گی۔ سے پر بے اختیار اس کا ہر عضو پھڑکنے لگے گا۔ عوام کی نظر میں یہ حرکت ایک بے وقعت اور مہمل معلوم ہوتی ہے لیکن وہ شخص جس سے سرزد ہوتی ہے، مجبور ہے۔

ایک اعتراض اور اس کا جواب

واجد علی شاہ کے اس فعل کو لوگ کہتے ہیں کہ وہ ناچتے تھے، حالانکہ وہ ناچتے نہ تھے، بلکہ بے داری میں محو ہو کے ان کے اعضا سے ایسے حرکات سرزد ہونے لگتے تھے کہ بظاہر بادشاہ ناچتے تھے۔ دراصل واجد علی شاہ کبھی اور کسی زمانے میں نہیں ناچے۔ ان کا ناچنا بس یہی تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ بے داری میں کوئی اعلیٰ درجہ کا کامل فن گویا بھی بادشاہ کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ نرت جسے بھاؤ بتانا کہتے ہیں۔ یہ فن بھی علم موسیقی کا ایک جزو ہے اور انگریزی میں اس کو موشن (MOTION) کہتے ہیں

تمام اسپیکروں وغیرہ پر پایا جاتا ہے اس طرح بے داری کا بھی حال اس کی بھی ایک نوع ہے جس کا کمال واجد علی شاہ میں تھا، مگر کم علمی کی وجہ سے یہ معلومات کا کمال ان کی بدنامی کا باعث قرار دیا جاتا ہے۔

قیصر باغ کے میلے

قیصر باغ کے میلے عہد واجدی اور واجد علی شاہ کے کمال کے اظہار اور فن موسیقی کی سرپرستی کے تذکرے در رہیں۔ واجد علی شاہ نے رہس کو جو متھرا کا مایہ ناز فن تھا نئے طرز سے لکھنؤ میں رواج دے کر اس فن پر یادگار احسان کیا۔ انہوں نے اپنے مذاق اور خیالی پلاٹ کا ایک نیا رہس ایجاد کیا

فنون موسیقی کا بادشاہ

تاشا بجانے میں بادشاہ کو کمال تھا، سلطان عالم ستار ایسا بجاتے تھے کہ روتے لوگ ہنس دیتے تھے اور ہنستے رو دیتے تھے۔ بادشاہ نے موسیقی کو محض فن کی حیثیت اور علم کو علم کی حیثیت سے حاصل کیا تھا، اور جس قدر روایات ان کے ناچنے گانے کے متعلق مشہور ہیں۔ یہ سب افترا ہے، یہ نہایت پارسا اور پابند شرع بادشاہ تھے۔ ؎

شاعری اور ڈرامے کی ترقی

شاعری اور ڈرامہ کے اعتبار سے بھی واجد علی شاہ کا عہد یگانہ اور ممتاز ہے:۔

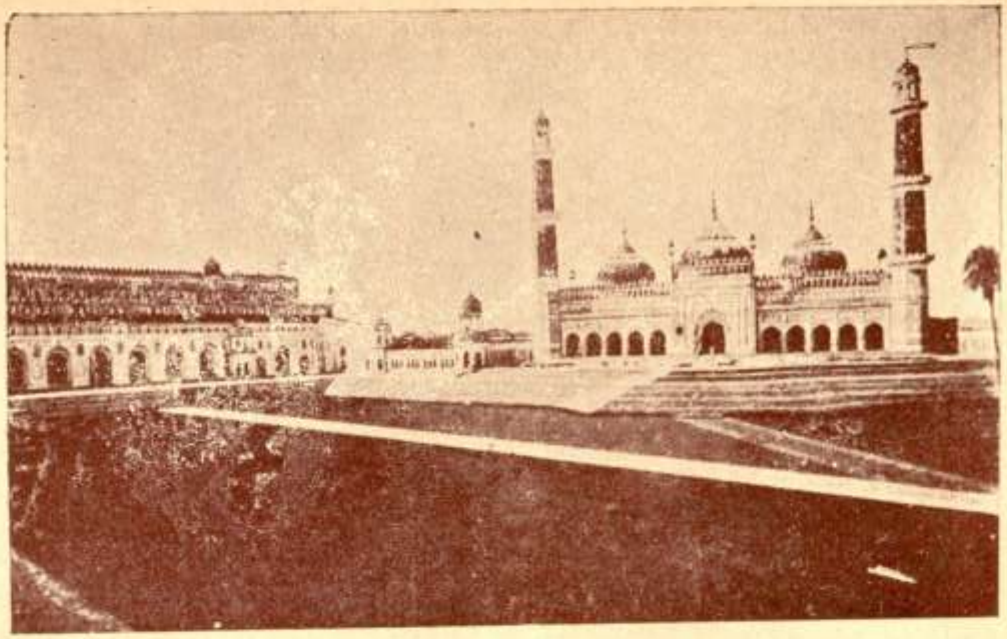

امام باڑہ آصف الدولہ کی مسجد (لکھنؤ)

"صرف واجد علی شاہ کے عہد میں اتنے شاعر لکھنؤ میں تھے، جتنے سارے ہندوستان میں تھے، شجاع الدولہ سے لے کر واجد علی شاہ تک خود بادشاہوں نے اور امرا، روسار، وزرا نے دامے، درمے، سخنے ہر طرح کی خدمت کی، زبان اور ادب اردو پر تاقیامت رہنے والا احسان کر گئے، واجد علی شاہ کے آخری دور میں فصاحت زبان اور شاعری نے لکھنؤ میں مضبوط جگہ پکڑ لی تھی، چند روز میں شعر کہنا لکھنؤ میں ایک وضع داری بن گیا تھا اور شعرار کے یہاں اس قدر کثرت ہو گئی کہ شاید کہیں کسی زبان میں نہ ہوئی ہو گی، شاہی بیگموں کا کیا ذکر ہے، شرفار کی عورتوں میں شعر اور سخن کا چرچا ہوا اور جہلار کے کلام میں بھی شاعرانہ خیال آفرینیوں، تشبیہوں اور استعاروں کی جھلک نظر آنے لگی، یہی وجہ ہے کہ آج تک یہاں کے سودے والے آواز لگاتے ہیں تو بجائے یہ کہنے کے کہ گنڈیریاں کون لے گا استعارئیوں کہتے ہیں کہ یہ تند کے ڈلے کون لے گا؟ ککڑیوں کے بیچنے والے چلاتے ہیں کہ لیلیٰ کی انگلیاں ہیں، مجنوں کی پسلیاں ہیں۔ کیا خوب ککڑیاں ہیں! دبیر و انیس نے مرثیہ خوانی میں ایسے کمالات شاعری دکھائے کہ شعر و سخن کے آسمان پر آفتاب و مہتاب بن کر چمکے۔ اردو ادب میں وہ نئی نئی چیزیں پیدا کر دیں، جن کو انگریزی تعلیم کے اثر سے طبیعتیں ڈھونڈنے لگی تھیں، اردو شاعری کی ایک قسم واسوخت ہے، نظم اردو کی ہر قسم لکھنؤ میں ہی شروع ہوئی، فن ہزل گوئی کو لکھنؤ کے آخری دور میں شیخ گوہر علی مشیر ساکن نقی گنج نے کمال کے درجہ کو پہنچا دیا۔ عہد واجدی میں اردو ڈرامہ نے جنم لیا، سب سے پہلا ڈرامہ اندر سبھا ہے جس کو امانت لکھنوی نے ۱۸۵۳ء میں تحریر کیا، یہ موسیقی دار کامیڈی ہے" [1]

واجد علی شاہ کی ڈرامائی جدتیں

واجد علی شاہ بلا کی رسا اور ذہین طبیعت لے کر آئے تھے، وہ آرٹ کے دلدادہ تھے، اور آرٹ کے عروج

---

[1] قدیم ہنروران اودھ صفحہ ۲۲

وار تقار کے سلسلہ میں وہ بڑی دور کی کوڑی لایا کرتے تھے، ان کی نت نئی ایجادیں، تاریخ کا ایک ناقابل فراموش صفحہ بن گئی ہیں:۔

"۔۔ واجد علی شاہ خود فن موسیقی کے بڑے ماہر تھے، اور فن موسیقی کے قدردان تھے ان کے عہد میں لکھنؤ فن کا مرکز ہو گیا تھا اور کتنے باکمال فن حاصل کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے تھے، رہس خاص برج اور متھرا کا فن ہے، بادشاہ کی طبیعت اہل ہنود کے رہس کی طرف متوجہ ہوئی، بادشاہ نے سری کرشن جی کا رہس دیکھا۔ اسی رہس سے خود اپنا ڈرامہ ایجاد کیا تھا رہس کے سامان میں کئی لاکھ روپیہ صرف ہوا، مثنوی ماہ پیکر اور غزالہ کی تصنیف سے جلسہ رہس کی بنیاد پڑی۔ اس کو دیکھتے ہی رعایا کو اس بات کا خاص شوق پیدا ہوا کہ عاشقانہ قصے جو ان دنوں پریوں کے حسن و عشق سے زیادہ وابستہ تھے، عملی صورت میں دکھائے جائیں، پبلک کا رجحان دیکھ کر امانت لکھنوی نے ۱۸۵۳ء میں اندر سبھا تصنیف کی، یہ اردو کا سب سے پہلا ڈرامہ ہے، جو موسیقی دار کامیڈی ہے، جس میں ہندوؤں کی دیو مالا مسلمانوں کے فارسی مذاق کی آمیزش کا پہلا نمونہ نظر آیا۔ اس نے ڈرامہ اور تھیٹر کی بنیاد ڈال دی، یہ ڈرامہ واجد علی شاہ کے حکم سے نہ تو تیار ہوا نہ اس میں کبھی کوئی حصہ واجد علی شاہ نے لیا اور نہ یہ تماشا کبھی قیصر باغ میں ہوا اور نہ بادشاہ کبھی اس میں شریک ہوئے، موسیقی کی ترقی کے لحاظ سے یہ عہد زرین عہد تھا، باوجود اس کے اور فنون و کمالات کو بھی ترقی تھی، جہاں اور فنون کی ترقی کا دور تھا وہاں موسیقی نے بھی ترقی کی، یہ ضرور ہے کہ بادشاہ کے شوق اور کمال کی وجہ سے اس فن کو بہت عروج ہوا اور باوجود اس کے کہ آج کل کے زمانہ میں موسیقی بحیثیت فن دنیا کی بعض یونیورسٹیوں میں نصاب تعلیم کا ایک جزو ہے اس کے سکول اور کالج اور درجے کھل گئے ہیں، مگر دور واجدی کی ترقی کو ابھی تک یہ فن نہیں پہنچ سکا۔ واجد علی شاہ کو تاشا بجانے کا بہت شوق تھا، محرم کی ساتویں تاریخ میں معمول تھا کہ تقریباً ایک گھنٹہ تک خود بادشاہ گلے میں تاشا ڈال کر بجاتے تھے، تاشا بجانے کی یہ صفت تھی کہ اتنی جلدی

جلدی ضربیں پڑتیں کہ ایک قرعہ کا دوسرے سے امتیاز نہ ہو سکتا تھا۔ واجد علی شاہ نے ٹھمری اور دادرے خوب خوب کہے اور وہی شاعر جو مثل بادشاہ کے موسیقی اور شاعری دونوں میں کمال رکھتا ہو ایسے دادرے اور ٹھمریاں کہہ سکتا ہے کہ موسیقی اور شاعری کو باہم دگر جو مناسبت ہے وہ ایک جداگانہ بحث ہے۔ واجد علی شاہ نے نئی راگنیاں ایجاد کیں، جیسے، جوگیا، کنٹر، جوہی، بادشاہ پسند وغیرہ نئی گتیں ایجاد کیں، مثلاً انعامی گت، سلامی گت، لکھنؤ گھونگھٹ گت، ناز گت، بانکی گت، بندھی سلامی گت وغیرہ۔ تاریخ ہند میں کئی بادشاہ موسیقی کے کامل استاد بتائے گئے ہیں، مگر جتنی معلومات واجد علی شاہ کو اس فن میں تھی، شاید کسی اور بادشاہ کو ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ فن موسیقی پر شاہان اودھ کا بہت بڑا احسان ہے اور آج یہ جو کچھ نمونے اس فن کے کمال کا نظر آتا ہے یہ اسی کا پرتو ہے۔ شاہان اودھ ہنرمندوں کی حوصلہ افزائی میں ایسی دل چسپی کا اظہار کرتے تھے کہ ہنر معدوم نہ ہونے پائے اور عوام کو یہ دھوکا ہے کہ بادشاہ عیش پسندی کے جذبہ میں ایسا کرتے تھے۔[۱]

بادشاہ کی تعریف امیر کی زبان سے

منشی امیر مینائی، واجد علی شاہ کے متوسلین تھے، بڑے عابد، مفتی، زاہد، قانع، متوکل لیکن واجد علی شاہ کی عطا پاشیوں اور زر بخشیوں سے وہ اس درجہ متاثر تھے کہ جب بادشاہ کی تعریف پر آتے ہیں تو ان کے منہ سے پھول جھڑنے لگتے ہیں، بیان کی اثر آفرینی بتاتی ہے کہ اس کلام میں آورد کا کوئی نام و نشان نہیں آمد ہی آمد ہے، اور اس آمد میں کسی بلا کا جوش اور غضب کا خلوص ہے خوش نما اور ترشے ترشائے الفاظ پرا باندھے کھڑے ہیں اور وہ ایک فن کار جوہری کی طرح، انھیں شعر میں اس طرح جڑ دیتے ہیں کہ

وہ کہیں اور سنا کرے کوئی،

قیصر باغ کی تعریف میں یوں رطب اللسان ہیں:۔

کس کے چمکے چاندسے رخسار قیصر باغ میں　　چاندنی ہے سایۂ دیوار قیصر باغ میں

---

[۱] قدیم ہنرمندان اودھ صفحہ ۵۶-۵۷

فی الحقیقت یہ بھی کم گلزار جنت سے نہیں — حوریں پھرتی ہیں سر بازار قیصر باغ میں
موجۂ مے کی نسیم صبح میں تاثیر ہے — بے صبوحی مست ہیں ہشیار قیصر باغ میں
پاؤں کاہے ذکر کیا ہے صاف ہے ایسی زمیں — دل پھسلتے ہیں دم رفتار قیصر باغ میں
تشنگان شوق ہیں شیریں لبوں کے میہماں — بٹ رہا ہے شربت دیدار قیصر باغ میں
اے دل مایوس بے برگی سے افسردہ نہ ہو — لائے گا نخل تمنا بار قیصر باغ میں
دور ہوں گی کلفتیں مٹ جائیں گی سب کاہشیں — لالہ ہے بے داغ گل بے خار قیصر باغ میں

سایۂ بال ہما کیا ڈھونڈتا ہے اے امیر
بیٹھ جا بس سایہ دیوار قیصر باغ میں

ایک موقع پر واجد علی شاہ کی تعریف و توصیف میں زبان کھولتے ہیں اور کتنے اثرآفریں انداز میں کہتے ہیں:۔

ہم ہوں یا موسیٰ ہو کوئی دیکھ سکتا ہے اسے — پردے حیرت کے پڑے ہیں جلوہ گاہ طور میں
حوصلہ عالی اگر ہو ہر جگہ معراج ہے — دار بھی ہے شاخ سدرا دیدۂ منصور میں
منزل مقصود کی ستوں کو دکھلاتی ہے راہ — خضر بن بیٹھی ہے سبزی دانۂ انگور میں
ہے اگر گردش مخالف غم نہیں مجھ کو امیر — ہوں میں ظل دامن شاہ ابوالمنصور[1] میں

بانکے کنہیا سلطان عالم

فتح الدولہ برق، واجد علی شاہ کے سچے اور بے انتہا مخلص جاں نثاروں میں تھے، مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ برق اور اختر میں وہی ربط تھا، جو عرفی اور جہانگیر میں تھا، زندگی کی آخری سانس تک برق واجد علی شاہ اختر کے دامن دولت سے وابستہ رہے، بادشاہ کے دور میں بھی اور جلاوطنی کے عالم میں بھی انہوں نے امیر کی طرح بے وفائی نہیں کی، بلکہ مصیبت کے دنوں میں اور زیادہ وفاداری کے ساتھ رفاقت کی، بادشاہ ان کی وفاداری اور جاں نثاری کے ہمیشہ معترف رہے، برق نے بھی زبان شعر سے اختر کی تعریف کی ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

عجب بانکے کنہیا نوجواں سلطان عالم ہیں — حسین جاں جان جہاں جہاں سلطان عالم ہیں
زبان موج سے باد بہاری کہتی پھرتی ہے — کہ قیصر باغ کے سرو رواں سلطان عالم ہیں

[1] ابوالمنصور، واجد علی شاہ کی کنیت تھی!

حسین آباد بازار گیٹ (لکھنؤ)

نہ ہو کیوں قاف سے تا قاف شہرہ سارے عالم میں — پری پیکر سلیمان جہاں سلطان عالم ہیں
جبیں ہے چودھویں کا چاند حسن روز افزوں سے — رخ انور سے مہر آسماں سلطان عالم ہیں
بنا ہے لکھنؤ کنعان و رشک مصر ہیں کوچے — عزیز و یوسف ہندوستاں سلطان عالم ہیں
لب جاں بخش سے جیتے ہیں مردے باتوں باتوں میں — مسیحائے جہاں معجز بیاں سلطان عالم ہیں
تخلص برق یا اختر ہے، کہ ٹکڑا ماہ کامل ہے — فلک منزل، ملائک پاسباں سلطان عالم ہیں

اب دوسری زمین اور دوسرے ردیف و قافیہ میں ، برق کا جلوہ دیکھئے :۔

گہر افشاں ہے نیسان کرم سلطان عالم کا — بہار آئی جوا نان چمن کی لکھنؤ چمکا
نہ ایسا کوئی آگے تھا نہ ایسا اب کوئی ہوگا — مؤخر ہے زمانہ باغ ہستی میں مقدم کا
عجب برسات کا عالم ہے بیلا روز بٹتا ہے — ہمیشہ مینہ برستا ہے یہاں دینار و درہم کا
در دریائے بخشش سے زمانہ کیوں نہ شاداں ہو — گل تر کو ہنساتا ہے چمن میں قطرہ شبنم کا
برائے حفظ جاں ہر دم وظیفہ برق رکھتے ہیں — کہ نام پاک حضرت میں اثر ہے اسم اعظم کا

معزولی کا فیصلہ انگریزوں کو یہ پسند نہ تھا کہ واجد علی شاہ امور مملکت میں حصہ اور دلچسپی لیں، جب انہوں نے، امور مملکت میں حصہ لینا چھوڑ دیا اور سارا نظم مملکت ریزیڈنٹ اور گورنر جنرل کے اشارہ چشم کو سونپ دیا، تو انگریز اس پر بگڑ گئے کہ بادشاہ نالائق ہے امور سلطنت سے دلچسپی نہیں لیتا، لہذا اسے راستہ کے کانٹے کی طرح ہٹا دینا چاہئیے،

مولوی نجم الغنی یہ کہانی یوں سناتے ہیں :۔

روز دو شنبہ ۴ فروری کو صاحب ریزیڈنٹ اور کپتان ہیر اور جنرل ویلا صاحب کمان افسر فوج بادشاہ کے پاس آئے اور گورنر جنرل کی تحریر جو بادشاہ کے نام پڑھی دی۔ اس میں کئی مدیں بہت توضیح سے لکھی ہوئی تھیں اور پچھلے معاملات کی تفصیل مسند نشینی نواب سعادت علی خان کے عہد سے اس وقت تک تھی اور ہر امر جزئی کلی میں سلطنت کی بے التفاتی اور بعض الفاظ بادشاہ کی غفلت اور بے پروائی کے بیان میں درج تھے، بادشاہ نے جب اس کو پڑھا تو دل پر درد سے بے اختیار ایک آہ کھینچ کر جناب باری کی طرف متوجہ ہو کر کہا، خداوند تو شاہد حال ہے، مجھ پر یہ جفا اور جبر صریح ہے اور حیلہ

انتظام سے میرا گھر مجھ سے چھینا جاتا ہے، میں کبھی گوارا نہ کروں گا۔ کہ یہ آبرو ریزی خاندان سلطنت کی میری وجہ سے ہو تھوڑی دیر کے بعد جو کچھ آفاقہ ہوا تو ریزیڈنٹ نے دلجوئی کی راہ سے بادشاہ کی تسکین خاطر کے لئے کہا کہ بخدا ہمارا قلب بھی متحمل نہیں ہو سکتا کہ آپ کو ایسے صدمہ روحانی میں دیکھیں، جب نواب گورنر جنرل نے یہ احکام ارشاد فرمائے تھے تو میرے قلب کا بھی عجب حال ہوا——!"

زہر دے اس پہ یہ تاکید کہ پینا ہوگا

"صاحب ریزیڈنٹ" کے بارے میں مولوی نجم الغنی نے جو کچھ لکھا ہے، اس کی حیثیت گو مجھ کے آنسو سے زیادہ نہیں، یہ "صاحب ریزیڈنٹ" معلوم ہوتا ہے، بہت اچھے ایکٹر بھی تھے ایک طرف بادشاہ کی جانب پروانہ معزولی بڑھایا، دوسری طرف زبان حقیقت ترجمان سے تسکین و تسلی، ہمدردی و دل سوزی کے کلمات ارشاد فرمائے، ساتھ ہی ساتھ نہایت تہذیب سے لیکن آمرانہ نخوت، اور فرماں روایانہ پندار کے لہجہ میں گویا ہوئے:-

"بہر حال یہ راضی نامہ فارسی و انگریزی مضمون واحد کا حاضر ہے برضا و رغبت اس پر مہر فرمائیے کہ میں نے ملک محروسہ سرکار کمپنی کے تفویض کیا اور مشاہرہ مجوزہ بہ طیب خاطر بلا اکراہ قبول کیا، بادشاہ نے جواب دیا کہ اگر حکم صدور بدعملی و بے انتظامی و عدم تحصیل زر کی نسبت ہے تو تفویض ملک میں مضائقہ نہیں ورنہ جبر و تعدی سے نہیں ہو سکتا، اس کے بعد ریزیڈنٹ نے کہا کہ سات مکان وسیع مثل شاہ منزل، مبارک منزل، خورشید منزل، سکندر باغ، بادشاہ باغ رمنہ اور کوٹھی دل کشا سیر و تفریح کے لئے آپ کے قبضہ اختیار میں رہیں گے باقی تمام مکانات شاہی ہمارے قبضہ میں آئیں گے جن میں عدالتیں نشست کریں گی، حکام کا قیام ہوگا، اور املاک شاہی میں جو خوش ہوں گے تو ان کا تصفیہ بھی ہماری تجویز سے ہوگا۔ آج سے تین دن تک آپ کو اختیار ہے بعد اس کے ہمارے احکام جاری ہوں گے، بعد اس کے ریزیڈنٹ نے راضی نامہ جو وزیر کے ذریعہ سے حاصل ہوا تھا، بادشاہ کے ملاحظہ میں گزارنا، بادشاہ نے ... لیکن جب میں نے بہ رضامندی

مہر کی ہو تو پھر میرے انکار کا کیا سبب ہے اور جب آپ خود ہر امر جزئی کو بالمشافہ کہتے ہیں پس ایسے امر عظیم کے واسطے مجھ سے کیوں نہ پوچھا اور یہ مہلت تین دن کی کیا ضرور ہے، آپ کو ہر وقت اختیار ہے، پھر ریزیڈنٹ نے کہا کہ اگر ہماری رضامندی کے موجب کیجئے گا، تو وہ امر کریں گے، جو باعث مسرت ہوگا، اور اگر ہماری ناراضی منظور ہے تو قیام لکھنؤ بھی دشوار ہو جائے گا۔ والدہ بادشاہ نے جواب دیا، جو خرابی اس گھر کی تمہاری بدولت ہونا تھی ہو چکی اس سے بدتر اور کیا ہوگا؟ اب قیام اس شہر کا اور دوسرے کا اور جو جا پڑ دونوں برابر ہیں، اس سے زیادہ ہماری آبرو ریزی کیا ہو گی اور جبر صریح اس سے زیادہ کیا ہوگا؟

بادشاہ کی امن پسندی۔ صاحب ریزیڈنٹ بعد اس کے رخصت ہوئے جب ور دولت پر پہنچے تو گارد نے دستی سلامی دی اور جا بجا پہرے والوں کو بے ہتھیار دیکھ کر متعجب ہوئے، مصلح السلطان سے پوچھا، جواب دیا کہ بادشاہ نے فوج سرکاری کی آمد کی وجہ سے صاحبان انگریز کے رفع ترددات کی غرض سے ملازمان سلطنت اور رعایائے شہر کو ہتھیار باندھنے کی ممانعت کر دی ہے اور توپیں بھی اسی واسطے چرخ سے گرا دی ہیں۔

اب بعض نامی اشخاص اصلاح کے درپے ہوئے چنانچہ نواب محسن الدولہ اور نواب منور الدولہ اور شرف الدولہ محمد ابراہیم خاں وغیرہ کی رائے اس بات پر قرار پائی کہ بادشاہ نے جو مہر اور راضی نامے سے انکار کیا ہے اس پر مستقل و قائم رہیں اور انگریزوں کا شک و شبہ رفع کرنے کی غرض سے ملازمین شاہی کو حکم قطعی پہنچے کہ کوئی شخص ہتھیار نہ باندھے۔ اور توپیں جہاں جہاں ہیں چرخ سے گرا دی جائیں، اور ور دولت کے سپاہی گارد اور پہرے کے اپنے اپنے ہتھیار میگزین میں داخل کر دیں۔ فقط لاٹھیوں سے پہرہ دیں۔ انگریزوں کے تردد کا یہ پہلا مرحلہ بہ آسانی طے ہو گیا۔

انگریزوں کی دہشت اہلکاروں کی نمک حرامی۔ تاہم انگریزوں نے احتیاطاً دو کمپو شہر میں بلا لئے، اس عرصہ میں اور بھی انگریزی فوج یعنی گوسلن

اور ہندوستانیوں کی پلٹنیں اور ترک سواروں اور گوروں کے رسالے اور گھوڑ چڑھے توپ خانہ کی بارہ توپیں اور بیل باتری کی بارہ توپیں شہر کے پاس آگئیں اور فوج کربلائے تال کٹورہ کے تقریب عالم باغ کے سامنے میدان میں ٹھہری فوج کہتی تھی کہ انگریز قیصر باغ کو قیصر گڑھ تصور کر رہے تھے، ورنہ اس قدر فوج لانا عبث تھا، اور کیونکر ایسا شبہ نہ ہوتا جہاں فوج شاہی کے سوا رعایا سے جنگ کی جو کثرت پچاس ہزار سے کم نہ تھی اس کے سوا زمیندار اور تعلقہ دار اور راجے اور ملک محروسہ کی تمام رعایا مسلح تھی مگر افسوس ہے کہ یہاں سب نے نامردی کی اور اہل کاروں نے بڑی نمک حرامی کی"

الٰہی جس خطا کی یہ سزا ہے وہ خطا کیا ہے؟ بادشاہ پر جو ظلم و ستم روا رکھا گیا، ان کی جس طرح توہین و تذلیل کی گئی، خاندان شاہی کی جس طرح بے حرمتی کی گئی، اس کی توجیہہ تو یہ کی جا سکتی ہے، کہ بادشاہ لاکھ بے خطا سہی لیکن ان کی یہ خطا کیا کم تھی، کہ وہ ایک زرخیز ملک کے بادشاہ تھے، اور اس ملک اور اس کے وسائل و ذرائع کی انگریزوں کو ضرورت تھی، لیکن سوال یہ ہے کہ رعایا نے، حکام نے، عمال نے، تعلقداروں، جاگیرداروں اور زمینداروں نے، تو فوراً سر اطاعت خم کر دیا تھا، ان کے لئے سفاکانہ احکام کیوں جاری ہوئے؛ صاحب "آثار محشر" نے گورنر جنرل کے ظالمانہ احکام کی تفصیل یہ دی ہے:۔

اوٹرم صاحب کو گورنر جنرل نے اتنی باتوں کے لئے حکم دیا تھا:۔

(۱) بادشاہ، ان کے اقارب و اعزہ کے لئے پندرہ لاکھ روپیہ مقرر کئے ہیں۔

(۲) سرکار کمپنی کے ملک رضائے خاطر سے دینے کے کاغذ پر بادشاہ سے دستخط کرالیں۔

(۳) اگر بادشاہ مہر نہ کریں، تو اس کی کیفیت تحریر کریں۔

(۴) بادشاہی توپ خانہ ضبط کرلیں۔

(۵) بادشاہ دلی یا آگرہ میں رہیں، گوالیار چونکہ قریب ہے، اس بارہ میں

آصف الدولہ کا امام باڑہ (لکھنؤ)

کیتی کرنے کے بعد حکم دیا جائے گا۔

(۶) جہاں کلکٹری یا مجسٹریٹی ہو وہاں بادشاہ کا قیام ہونا چاہیئے۔

(۷) بادشاہ کے عزیز و اقارب شہر سے علیحدہ کر دیئے جائیں، یا بادشاہ کے ساتھ چلے جائیں۔

(۸) اودھ میں دو برس تک جرنیلی کا عملدرآمد رہے۔[1]

(۹) بادشاہ کے رشتہ داروں کے ہاتھ میں جس قدر نوٹ ہیں دو سال تک اس کی آمدنی ان لوگوں کو نہ ملے۔

(۱۰) جملہ ساکنان اودھ سرکار انگریزی میں روزگار کریں۔

(۱۱) تمام بادشاہی عہدہ دار قید ہوں۔

(۱۲) اہل کاران شاہی نے جو کچھ زر محاسبہ وصول کیا ہو وہ سپاہ کی تنخواہ میں دے دیا جائے۔

(۱۳) تنخواہ عملہ بادشاہی کی سرکار کمپنی سے تعلق رکھے۔

(۱۴) جو اہلکار محاسبہ سے پاک ہوں، ان سے تعرض نہ کیا جائے۔

(۱۵) بادشاہ جہاں رہنا چاہیں دو ماہ میں اپنا اسباب اٹھا لے جائیں۔

(۱۶) بادشاہ کے ہر ایک عزیز و اقارب کی نانکار ضبط کر لی جائے۔

(۱۷) زمیندار دو برس تک اپنی اپنی زمینداری سے بے دخل رہیں۔ اور تحصیلداران کے علاقے کا زر تحصیل رعایا سے وصول کر کے انگریزی خزانہ میں داخل کریں۔

(۱۸) تحصیلداروں اور چکلہ داروں سے ایک سال کی ضمانت لے لی جائے۔[2]

گورنر جنرل کے ان ظالمانہ احکام پر پوری طرح عمل اس لئے نہ ہو سکا کہ تھوڑے ہی عرصہ بعد غدر شروع ہو گیا، لیکن انگریزوں کی نیت بہر حال ظالم ہو گئی،

انگریز لکھنؤ پر قابض ہو گئے، بادشاہ کلکتہ چلے گئے، پندرہ لاکھ روپیہ سالانہ وظیفہ مقرر

---

[1] مارشل لا

[2] آثار محشر

ہوا، اور اس طرح اودھ کی حکومت، جو مشرقی تمدن کا آخری نمونہ تھی، چراغ صبح کی طرح جھلملا کر ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی کسی نے تاریخ کہی،

لکھنؤ شد خراب واویلا
۱۲۷۲ھ

خون کے آنسو

واجد علی شاہ کی معزولی پر بہت سی آنکھیں اشکبار ہوئیں، بہت سے دل تڑپے، اہل قلم نے نثر میں شاعروں نے شعر میں اپنے دل کا بخار نکالا ذیل میں ہم رائے پورن چند عاجز (رخیر آبادی) کی تاریخ درج کرتے ہیں، اور اس لئے درج کرتے ہیں کہ لوگ دیکھ لیں، مسلمان بادشاہ کے زوال پر ہندو رعایا کا ایک فرد کس طرح خون کے آنسو بہاتا ہے، ایک ہندو شاعر فارسی زبان میں کیسے کیسے گل کھلاتا ہے؟ یہ جذبات صرف شاعر کے نہیں ہیں، اس کی ہندو قوم کے عوام بھی اس میں شامل ہیں، ملاحظہ ہو:-

بیک دورۂ چرخ فیروزہ رخت / نہ قصر شہی ماند و نے تاج و تخت
نمودار شد صورت انقلاب / برافتادہ از آسماں آفتاب
ز سر دور شد ظل لطف آلہ / سریر شہی منتزع شد ز شاہ
نہ چتر مرصع نہ تاج بلند / متندر بچپاہ بلا در فگند
بہار محمد امین گرد شد / گلستان منصور خاں زرد شد
بہ گلزار بخت شجاع سعید / ز دشت بلا باد صرصر رسید
گل گلشن آصف سینہ چاک / درافتادہ از شاخ دولت بخاک
چنیں شور در خاص و عام او فتاد / ہمائے سعادت بدام او فتاد
خیابان غازی نہال نصیر / ز دست خزاں گشت دامن گیر

شاعر نے بڑی خوبی سے واجد علی شاہ کا شجرہ نسب بھی بیان کر دیا ہے جس کی تفصیل یہ ہے (جعفری)

۱ اودھ کے خاندان شاہی کے مورث اعلیٰ
۲ پہلے وزیر اودھ
۳ شجاع الدولہ
۴ آصف الدولہ

امام باڑہ حسین آباد کا ایک منظر (لکھنؤ)

سموم غم و رنج و درد و الم — بباغ محمدؐ علی زد قدم

چو کافور رنگینی سرمدی — پرید از رخ لالهٔ امجدی

عزا خانه شد منزل لکھنؤ — الم حلقه زن بود در چار سو

ندانم چه غوغا چه اسرار بود — که شور قیامت نمودار بود

برآشفت روح امین در جنان — بفردوس زد گریه منصور خان

بلرزید گور شجاع شجاع — لب روح آصف بخواند الوداع

سعادت ز بس گریه دردناک — بغلطید سیماب سان زیر خاک

بخاک نجف روح غازی طپید — طپان بود جان نصیر سعید

بروح محمد علی تاب بود — ز غم چشم حیرت پر از آب بود

بنالید امجد علی زار زار — سر خویشتن زد بسنگ مزار

نفیر از جهانے دریغا چه شد — صدا بود هر سو که آیا چه شد

کسے سینه می کوفت از دست غم — کسے سر همی زد بسنگ الم

کسے بود از جان شیرین بتنگ — کسے را شد از زندگی عار و ننگ

دل عاجز از شورشش ناگهان — ز فرط الم بود غوغا کنان

چو از دست شه رفت تخت و کلاه — بگفتم شده منتزع ملک شاه ۱۲۷۲

تاریخ دیگر

شه عالی گهر واجد علی شاه — ز سر افگند چون تاج خلافت

بهارستان قیصر باغ شد زرد — سواد لکھنؤ شد بے لطافت

خزان آمد بباغستان شاهی — روان شد بلبل باغ ظرافت

نه تاج و زر نه تخت خسروی ماند — بسر شد سایه چتر ندامت

رقم بنمود عاجز عیسوی سال — سعادت رفته از نجم سعادت

---

۱ بادشاه اوده

۲ شاه اوده

۳ نواب سعادت علی خان

تصور سے کلیجہ منہ کو آتا ہے!

واجد علی شاہ کی ۱۸۵۶ء میں لکھنؤ سے روانگی، ایک بہت بڑا سانحہ تھا، لیکن اس دنیا میں ہر روز سانحے ہوتے رہتے ہیں، اور انھیں بچارہ ناچار برداشت کرنا پڑتا ہے، یہ سانحہ بھی برداشت کر لیا گیا۔ لیکن اس کا ایک منظر دیکھ لیجیے، "خم خانہ جاوید" میں لکھا ہے:۔

۵۔ رجب ۱۲۷۱ھ ہجری مطابق ۳ مارچ ۱۸۵۶ء بروز شنبہ پہر رات گئے اپنے پھوپھا نواب حسام الدولہ بہادر کو لکھنؤ میں اپنا مختار مقرر فرما کر راہی کان پور ہوئے اس وقت جو حالت اقربا و متوسلین شاہی کی ہوئی۔ اس کے تصور سے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ جناب عالیہ ملکہ کشور۔ نواب خاص محل صاحبہ معشوق محل، جنرل مرزا اسکندر حشمت برادر حقیقی، مرزا ولی عہد، جنرل فریدون قدر اور نواب منور الدولہ وزیر خان شاہ کے ہمرکاب رہے۔ ان کے علاوہ کم و بیش تین سو متوسلان بارگاہ نے بھی رفاقت کر کے حق نمک ادا کیا۔ لیکن ریزیڈنٹ کی ممانعت کی وجہ سے منشی خانے اور بیت الانشار کا کوئی آدمی بادشاہ کے ساتھ نہ گیا۔"

مہاراجہ بنارس کی وفاداری

اس وقت جب بادشاہ کے متوسلین ان سے منہ موڑ رہے تھے ایک سابق باج گزار ہندو، راجہ ایسا بھی تھا جو اب بھی وفاداری کا دم بھر رہا تھا:۔

سامان درست کرنے کے بعد بادشاہ ۷۔ اپریل کو کان پور سے روانہ ہو کر ۱۲۔ اپریل کو بنارس پہنچے، لکھنؤ سے بنارس تک دو گھوڑوں کی گاڑی پر سفر کیا۔ کیونکہ اب تک ریل نہیں بنی تھی۔ ان ایام میں گرمی کی بڑی شدت تھی چنانچہ سفر میں از حد تکالیف شاقہ اٹھائیں، خاص کر اس مقام پر جہاں دریائے گنگا و گھاگھرا کا اتصال ہے بہت تکلیف پہنچی، بادشاہ نے کان پور میں ایک ماہ تک قیام کر کے مسہل لیا اور بعض کو خشکی کی راہ سڑک سڑک کلکتہ بھیجا اور اکثر کو کشتیوں میں بٹھا کر ساتھ لیا۔ بنارس کے راجہ نے اخلاص ہندی [illegible] لیے بادشاہ ان کے دارالحکومت تک بجرے میں بیٹھ کر

مہمانی اس شان و شوکت و فراخ دلی سے ادا کئے کہ خود بادشاہ باوجود آلام روحانی کے ان کو حسن خدمات سے خوش و سپاس گزار ہوئے دس روز وہاں قیام کر کے دخانی جہاز پر سوار ہو کر راہی کلکتہ ہوئے، ۱۳ مئی ۱۸۵۶ء کو مٹیا برج مہاراجہ بردوان کی کوٹھی میں جو مولوی مسیح الدین خاں سفیر شاہی نے پہلے سے بہ کرایہ یہ تجویز کر رکھی تھی، رونق افروز ہوئے، جب کلکتہ میں بادشاہ کے ورود کا حال معلوم ہوا، تو قلعہ فورٹ ولیم سے ۲۱ توپوں کی سلامی سر ہوئی

خاص محل کا خط کلکتہ سے

خاص محل واجد علی شاہ کی وفا سرشت بیگم تھیں، شوہر کے ساتھ عیش کے دن کاٹے تھے اب یہ گوارا نہ ہوا کہ مصیبت اور دکھ کے دنوں میں اس کا ساتھ چھوڑ دیں، چنانچہ یہ بھی لکھنؤ سے کلکتہ سدھاریں، کلکتہ پہنچ کر انہوں نے ایک خط شیدا بیگم کو لکھا، ظاہر ہے کہ بیچاری خاص محل کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ ہو گی کہ یہ نجی خط کبھی چھپے گا، اس خط میں انہوں نے دل کھول کر رکھ دیا ہے، یہ خط نہیں ہے دل کے ٹکڑے ہیں، اگر معلوم ہوتا یہ بھی چھپے گا تو وہ ضرور کہتیں،

من قاش فروش دل صد پارۂ خویشم!

بہر حال وہ خط جسے پڑھ کر واقعی آنسو نکل آتے ہیں (کم از کم میری تو یہی کیفیت ہوئی) یہ ہے،

دربہن شیدا بیگم میراں جی، کی ۷ ، ۲۷ تاریخ ۱۲۷۲ھ پنج شنبہ کا دن عمر بھر نہ بھولے گا، جب کہ سلطان عالم کو جنرل اوٹرم صاحب نے باپ دادا کی حکومت چھوڑنے اور دست بردار ہونے کا حکم دیا اور لکھنؤ سے ہم لوگ جدا ہوئے، جیسے بلبل گلزار سے چھوٹی، یوسف مصر سے نکلے، بوئے گل چمن سے جدا ہوئی، پیا جان عالم کا سکوت اور تمام عملہ کا حسرت سے دیکھ کر بے بسی کے آنسو بہانا، کمال ادب سے رومال میں غم کے موتیوں کو سمونا، اعزا کو ہچکیاں لگی ہوئی تھیں، ہم آخرش محلات میں ماتم بپا چھوڑ کر سلطان عالم کے ہمراہ رخصت ہوئے اس وقت جان عالم کا یہ کہنا تم پر دس برس تک میں نے حکومت کی اس عرصہ میں جو کچھ صدمہ تم کو میری ذات سے پہنچا ہو اس کو بخوشی معاف کر دو، اس

وقت میں معزول ہوں اور تم سے چھٹتا ہوں، خدا جانے زندگی بھر پھر ملوں یا نہ ملوں، بہن اس جملہ نے تم کو یاد ہے محل کو مجلس ماتم بنا دیا تھا، حضرت منور الدولہ احمد علی نے کہا۔ سرکار ایسے وقت میں غلام کو قدم سے جدا تو نہ کرو، سلطان عالم خاموش ہو گئے، حضور ملکہ کشور آرا بیگم صاحبہ اور بھیا سکندر حشمت سلمہ اور لخت جگر نور نظر ولی عہد بہادر سلمہ ہیں اور چار اور سرکار کی خادمہ ہمراہ تھیں ،،

آگے چل کر سفر کی روداد لکھی ہے :

رجب کی پانچویں کو لکھنؤ سے چلے تھے، کان پور پہنچے، میرا روتے روتے برا حال ہوا، پرون صاحب کے بنگلے پر ہم لوگ مقیم ہوئے، رجب بھر وہیں رہے شعبان کی پہلی کو الہ آباد کے لئے روانہ ہوئے۔ آٹھ دن وہاں ٹھہرے، پھر بنارس آئے، راجہ پرانا نمک خوار تھا۔ اپنی سی اس نے اچھی خدمت کی۔ رانیاں حضور ملکہ کی بڑی تواضع کرتیں ہر وقت ہاتھ باندھے چاکری میں کھڑی رہتیں مجھ مغموم کی پوچھ بھی بہت تھی، رہیں ہر وقت سلطان عالم کی دل جوئی میں لگی رہتی، ان کا باتوں میں دل بہلاتی، مگر وہ غم میں گھلے جاتے تھے، میں واری جاؤں یہ حال دیکھ کر دل کڑھتا ہے، بنارس سے دخانی جہاز پر سوار ہوئے، رمضان کی ۲۷ کو کلکتہ ہمارا قافلہ پہنچا، سب پر تکان کا اثر ہے اس وقت تم کو راستہ کی مختلف کیفیت لکھ رہی ہوں، تم بھی حال لکھنا، ہمارے پیچھے کیا بیتی۔

راقمہ نواب خاص محل کلکتہ ۲۹ رمضان ۱۲۷۲ھ

ارمانوں کا سوگ

اس غم آگیں مکتوب پر درد پر اردو کے ایک فاضل نقاد نے جو تبصرہ کیا ہے، وہ بھی قابل دید ہے :-

"خط لکھنے کے لئے کاغذ اور قلم ہی کی نہیں، خون جگر کی بھی ضرورت ہوتی ہے، جان عالم اور ان کی بیگمات کے خطوں میں حسرتوں کی سرخی ہے جذبات

... کا اظہار ہے، لیکن

طالب علم کے لئے اہم نہیں۔ مکتوباتی ادب میں بھی درجہ رکھتے ہیں"[1]

بیگمات کے خطوط پر شرر کا تبصرہ

لکھنؤ کی بیگماتی زبان اپنی شیرینی اور دل آویزی کے اعتبار سے مشہور ہے، ظاہر ہے یہ زبان جیسی نکھری ہوئی یا ستھری ہوئی، قصر شاہی میں نظر آسکتی اور کہاں نظر آسکتی تھی۔ واجد علی شاہ کی بیگمات کے خطوط اس اردوئے معلیٰ کا بہترین نمونہ ہیں، مولانا شرر ان تودہ نامجات یعنی خطوط پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"میرے خیال میں اس سے اچھا ادبی ذخیرہ اردو زبان کو پھر نہ نصیب ہو سکے گا۔ اتفاق سے ایسے تودہ نامجات کثرت سے میری نظر سے گزرتے رہے اور میں انہیں نہایت ہی شوق سے پڑھا کرتا اور اصل حقیقت یہ ہے کہ مجھ میں جو کچھ ادبی ذوق پیدا ہوا۔ انہیں تودہ ناموں کے پڑھنے کی برکت ہے"[2]

جو کچھ خدا دکھائے سو ناچار دیکھنا!

کلکتہ پہنچنے کے بعد، واجد علی شاہ پر کیا کچھ گزری، ان کے اور گورنر جنرل کے مابین کیا نامہ و پیام ہوا، یہ داستان درد بھری سننی ہی پڑے گی۔ "آثار محشر" میں لکھا ہے:۔

"چونکہ بادشاہ کا ورود کلکتہ میں استغاثے کی غرض سے ہوا تھا، اس لئے گورنر جنرل نے نہ ان کا استقبال کیا نہ سلامی کی توپیں سر کرائیں، نہ مہمانداری کے لوازم ادا کئے۔ اس زمانہ میں مہاراجہ گوالیار بھی وہاں گئے ہوئے تھے ان کا استقبال اعلیٰ پیمانے پر ہوا۔ اور گورنمنٹ ہاؤس کے قریب ایک پر تکلف کوٹھی میں مہمان لوئے گئے۔ چند ہفتہ کے انتظار کے بعد منور الدولہ کے مشورے سے ایک خط بادشاہ کی طرف سے دوستانہ شکایت میں گورنر جنرل کو بھیجا گیا۔ چند روز تک قاصد اور خط کی گورنر جنرل کے حضور تک رسائی نہ ہو سکی۔ آخر منور الدولہ کا رفیق منشی باقر علی اس کام میں کوشش کرنے لگا۔ اور گورنر جنرل کے عملے کو کچھ دے کر وہ خط گورنر جنرل کو پہنچایا۔ ایک ہفتہ کے بعد

---

[1] کلاسیکی ادب ص۱۲۴

گورنر جنرل نے یہ جواب بھیجا کہ حضرت کے تشریف لانے کی خبر ہم کو نہ ہوئی ورنہ رسم استقبال و سلامی کی توپیں عمل میں آتیں اور حضرت کے استغاثے کی درستی یہاں سے مشکل ہے، اس لیے کہ ہم کو ولایت سے یہ حکم ہے کہ جو کچھ لارڈ ڈلہوزی گورنر جنرل سابق، ملک اودھ کی نسبت تجویز کر گئے ہیں، اسی کے مطابق عمل کریں۔ اس کام میں کمی بیشی نہ ہو۔ اس صورت میں حضرت کو اختیار ہے کہ اپنے معاملے میں رجوع لندن میں اصالتہً یا وکالتہً ملکہ معظمہ کے حضور میں کریں۔

انگریزوں نے بادشاہ کی ہر چیز نیلام کر دی۔

لکھنؤ میں غرض مندوں نے جس قدر شاہی محلات میں سامان پایا۔ اس کو تصرف دوستانہ میں لانے میں کمی نہیں کی یہاں تک کہ تمام سامان شاہی یوں ہی برباد گیا، جو کچھ تھوڑا سا سامان ساتھ تھا۔ اس میں سے کچھ تو صرف انگلستان کے مصارف میں خرچ ہوا۔ اور کچھ کلکتے کی اقامت کے لیے اسباب ضروری تیار کرنے میں خرچ ہو گیا اور کچھ خائن مصاحبوں نے اڑایا۔ ادھر چیف کمشنر نے جائزہ جملہ کارخانہ جات سلطانی کا اور ملازمین شاہی کا لیا، فوج پیادہ و رسالہ ملا کر مجموعہ ساٹھ ہزار ملازم ہر فرقہ و پیشہ بموجب فرد دفتر شاہی برآمد ہوئے، سب کو حکم برطرفی سنا دیا۔ سات ہزار چوپائے ۲۰۰ ہاتھی ۲ ہزار گھوڑے ۱۰۷ اشتر، دو لاکھ کبوتر اور بے شمار اسباب سرکار شاہی میں موجود پایا، جن کا کوٹھی دلارام میں ۲ ماہ تک نیلام ہوتا رہا۔ اس طرح اور اسباب کمیاب کوڑیوں پر نیلام ہوا کروڑوں روپیہ کا سامان جو دو سو برس کے قریب زمانہ وزارت و شاہی میں مہیا ہوا تھا، چشم زدن میں برباد ہو گیا۔ دیکھتے دیکھتے سب کارخانہ شاہی درہم برہم ہو گیا۔

یہ قیدی پہلے بادشاہ تھا!

واجد علی شاہ سے لکھنؤ چھٹا، کلکتہ پہنچے، لیکن یہ جلاوطنی بھی انھیں راس نہ آئی، چرخ کج رفتار یہاں بھی آمادۂ ستم ... صاحبان انگریز کے دلوں

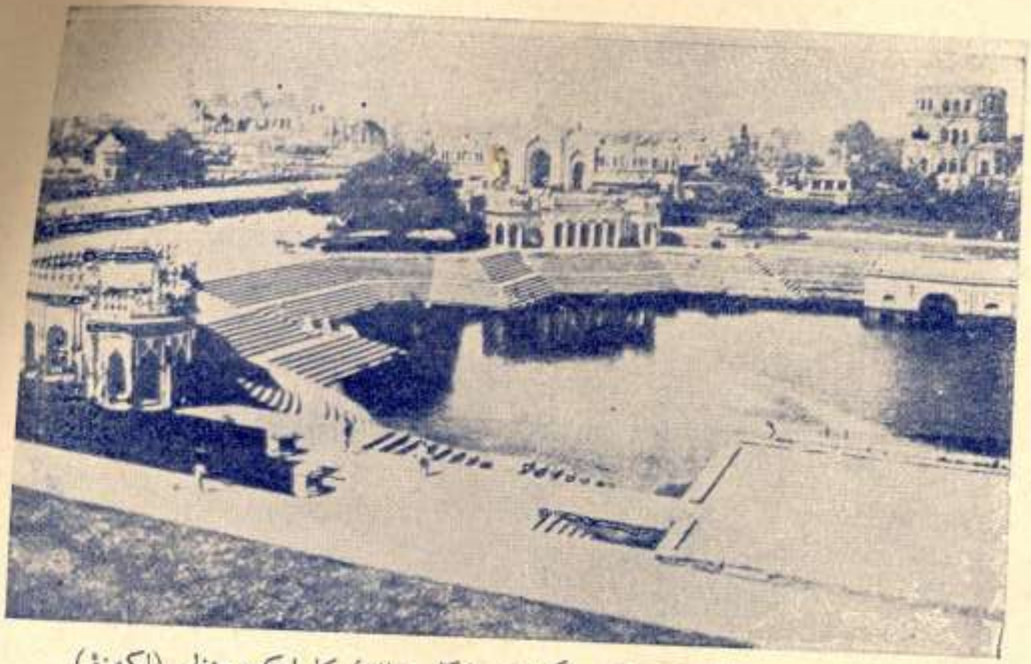

امام باڑہ حسین آباد کی پکچر گیلری (نگار خانہ) کا ایک منظر (لکھنؤ)

بادشاہ کی گرفتاری اور قید کا جو منظر ذکار اللہ نے، انگریز دوست ہونے کے باوجود دکھایا ہے وہ اس کی تفصیل سے کسی اور تاریخ میں نہیں ملتا۔

بارک پور کے سپاہ کے ارادوں کے سبب سے جو ہول اٹھتے تھے وہ ان کے ہتھیاروں کے لینے سے دور ہوئے۔ مگر ہنوز شاہ اودھ کے آدمیوں کی طرف دغدغہ دھڑکا لگا ہوا تھا۔ کہ غالباً وہ دنگا و فساد کریں گے۔ گورنمنٹ کے پاس ایسے ثبوت موجود تھے کہ بادشاہ کے بعض ملازمین نے قلعہ کے ہندوستانی سنتریوں کے اغوا کرنے میں کوشش کی کہ وہ سرکار کی نمک حرامی کریں، یہ کہنا ناممکن ہے کہ ان کی سازشیں زیادہ نہ پھیلی ہوں اس لئے لارڈ کیننگ نے مسٹر گرنیٹ کی صلاح سے ایڈمینٹن صاحب سیکرٹری کو بھیجا کہ وہ شاہ اودھ اور اس کے مشیروں کو فورٹ ولیم میں پہنچا دے۔

وہ صبح کو سویرے محل شاہی پر پہنچے اور اس کے سب طرف دیواروں کے پاس گوروں کے پہرے جما دیئے کہ بادشاہ محل سے نکل کر کہیں بھاگ نہ جائے بادشاہ کے وزیر علی نقی خاں اور اس کے بڑے بڑے مشیروں کو اپنے قابو میں کر لیا۔ اور پھر بادشاہ کے پاس جانے کی درخواست کی کچھ دیر بعد ان کو شاہی کمروں میں جانے کی اجازت ملی۔ نہایت مودبانہ انہوں نے بادشاہ کو مطلع کیا کہ گورنر جنرل نے یہ سنا ہے کہ سازشیں حضور کے نام سے ہو رہی ہیں، اس لئے وہ چاہتے ہیں کہ احتیاطاً حضور کو گورنمنٹ ہاؤس میں رکھا جائے قلعہ میں جو مکان گورنر جنرل کے رہنے کا تھا بادشاہ نے نہایت عمدہ تقریر متانت و سنجیدگی سے کہا کہ میں نے اپنے کسی قول اور فعل سے باغیوں کی مدد نہ کی، میں خوش ہوں، گورنر جنرل جہاں چاہیں مجھے رہنے دیں پھر وہ ایڈمنٹن صاحب کے ساتھ قلعہ کو روانہ ہوا۔ کچھ دیر تک وہ اپنے تئیں ضبط کرتا رہا، راہ میں رو کر کہنے لگا کہ میرے باپ اور دادا کیا شان و شکر رکھتے تھے، یا میں یہ بدنصیب ہوں۔ ؎

کلکتہ کی سفارت کاالزام واجد علی شاہ کو اپنی بے گناہی کا یقین تھا، اس سے زیادہ انگریزوں کی شرافت اور ملکہ وکٹوریہ کی معدلت کا یقین تھا، چنانچہ:۔

کلکتے میں پہنچنے کے بعد خیال ہوا کہ شاید شدائد سفر اور غم والم اور رنج و فکر سے پھر نہ کہیں مرض خفقان ویراق عود کر آئے اس لئے اطبا کی یہ رائے ہوئی کہ خود بادشاہ سفر انگلستان اختیار نہ کریں، اس وجہ سے بادشاہ نے کلکتے سے آگے سفر ملتوی کیا۔ والدہ بادشاہ، مرزا محمد علی بہادر ولی عہد اور سکندر حشمت بادشاہ کے بھائی کو ہمراہ لے کر اس سفر کے لئے آمادہ ہوئیں اور بادشاہ کی طرف سے انہوں نے وکالت کا قصد کیا اور مولوی مسیح الدین خاں ان کے ساتھ ہوئے وہ ۱۸ جون ۱۸۵۶ء کو بوقت شب سوار ہو کر راہی منزل مقصود ہوئے ۱۰۱ اس قافلہ شاہی غریب الدیار میں ۱۱۰ زن و مرد تھے، بادشاہ نے تحائف گراں بہا و نایاب برائے نذر جناب ملکہ کوئین وکٹوریہ اور دو برس کا زاد راہ دے کر رخصت کیا۔

مادر شاہ کا انتقال کسی طرح کا نامہ وپیام بادشاہ تک نہ پہنچنے پاتا، ہاں لندن سے جو خطوط آتے تھے وہ محصلان متعینہ براہ راست پہنچا دیا کرتے تھے ادھر بادشاہ کی والدہ حج اور زیارت کے ارادے سے لندن سے روانہ ہو کر ۱۸۵۸ء میں فرانس کے دارالحکومت میں پہنچ کر راہی ملک عدم ہوئیں اور بعد ایک ماہ کے مرزا سکندر حشمت نے اور ان کی بیٹی رافت آرا بیگم نے بھی انتقال کیا۔ وفات کی تاریخ یہ ہے:۔

جناب عالیہ رشک مریم و بلقیس — ہم سکندر حشمت بہادر ذی جاہ
چہار رحال نمودند در سواد فرنگ ! — دو چند گشت بعالم ظہور حسرت و آہ
دوبارہ مصرعۂ تاریخ سال باید خواند — دو پال طلب ہمہ از دو صدمہ جانکاہ

دیگر

ملکہ کشور آں جناب عالیہ فلک جناب — مادر خسرو ادو مہر کلاہ و مہ رکاب
کرد سفر ازیں جہاں آہ ملول و خستہ جاں — از ہمہ خلق ناگہاں او بہ نہفت در حجاب
[illegible]

روشن الدولہ کی کوٹھی (واجد علی شاہ کی ایک ملکہ کا محل) ۔ لکھنؤ

خانۂ سینہ چاک من باغم و حسرت و محن سال وصال او نوشت ملکہ مغفرت مآب
سہ اس سانحہ جاں گزا اور واقعہ ہوش ربا سے طبع مقدس ملول ہوئی ملک فرانس جناب عالیہ اور جنرل صاحب کا مدفن ہوا۔ دیکھئے قدرت قادر کہاں لکھنؤ کی ولادت اور کہاں فرانس کی موت یہ سامان ظاہر صرف اس واسطے پیش آیا تھا کہ خاک اجسام مذکورین خاک فرانس میں مل جائے۔ جہاں یہ خبر جاں گداز پہنچی تھی کہ یہ مژدہ راحت افزا بھی گوش گزار ہوا کہ بطن نواب اختر محل منکوحۂ دوم سے بعمر ۲۲ سال نور دیدہ اقبال روشنی بخش کاشانہ ہوا اور نام مرزا حسین اور عرف چھوٹے مرزا مقرر ہوا۔

واجد علی شاہ کی بیگمات دردر سرگرداں۔ بعد چندے ایک عرضداشت میر واجد علی داروغہ مقام لکھنؤ کی طرف سے پہنچی کہ باغی مغلوب ہوئے، انتظام سرکار کما حقہ ہو گیا۔ میں نے جو کوشش و اہتمام حفاظت متعلقان سرکار انگریزی میں کی خدا جانتا ہے۔ صاحب کمشنر نے میم صاحبات اور بچوں کو میری حراست سے اپنے پاس بلا لیا اور سات محل مبارک اس حفاظت میں میرے شریک حال رہے۔ سلطان جہاں محل، شہنشاہ محل، امیر محل، فخر محل مع شہزادہ قمر قدر اختر محل، اسرار محل، سیدہ محل وغیرہ صاحب کمشنر نے محلات متذکرہ بالا کی آبادی کا حکم دے دیا جائے۔ باقی محلات بحالت تباہ و پریشان دربدر سرگرداں اور حیران ہیں، نہ پوشاک ہے نہ سامان خوراک اور یہ سب بے قصور ہیں، اگر کوئی تحریر حضرت اقدس کی صاحب کمشنر کے پاس پہنچے تو محلات کی صورت آبادی ظہور میں آئے اور تا اجرائے تنخواہ پچاس پچاس روپیہ ماہوار بطور گزر اوقات مقرر فرمایا جاوے۔ اسباب جہاں تک باقی تھا کوتوالی میں اٹھ گیا۔ مگر میری مہر لگی ہوئی ہے اور سرکار نے وعدہ واپسی فرمایا ہے۔

بادشاہ کا حکم۔ اور بادشاہ نے واجد علی داروغہ کو حکم دیا کہ ایک جگہ تمام محلات کو آباد کیا جائے۔ ۲۹ ستمبر ۱۸۵۹ء کو مرزا ولی عہد بھی سفر ولایت سے

اور نتیجہ جو نکلا ظاہر ہے۔[1]

..... کہ تاریکی میں سایہ بھی جدا ہوتا ہے انساں سے!

واجد علی شاہ اپنی اولاد پر جان دیتے تھے، لیکن جب قسمت نے ساتھ چھوڑا، ملک چھنا، حکومت گئی، غربت و فلاکت کا دور شروع ہوا۔ تباہی اور مصیبت نے ڈیرا ڈالا، تو وہ اولاد، جو نور نظر اور لخت جگر تھی، آبرو کی گاہک اور جان کی دشمن ہو گئی۔ بیٹے نے باپ پر دعوےٰ کیا اور رقم رکھالی۔

"مرزا ہزبر علی فریدوں قدر نے بوجوہ چند در چند بادشاہ پر نالش کر کے ۵۰۰ ماہواری اپنا مع اپنی والدہ معشوق محل کے جدا کرا لیا۔"[2]

بے کس گورنر جنرل

واجد علی شاہ نے بغاوت نہیں کی تھی، سرتابی نہیں کی تھی، سرکشی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ انگریزوں نے انہیں پروانہ معزولی دیا، وہ معزول ہو گئے۔ انگریزوں نے انہیں فورٹ ولیم میں قید کر لیا، وہ قید ہو گئے۔ انگریزوں نے انہیں ذلتیں دیں، انہوں نے یہ ذلتیں سہ لیں سہ دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے۔

لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ لکھنؤ میں ان کی کوٹھیاں کھدی ہیں، محل مسمار کئے جا رہے ہیں اور خاندان شاہی کی خواتین ذلیل اور بے حرمت کی جا رہی ہیں، خاندان شاہی کے افراد کے ساتھ ظلم و جبر کا برتاؤ کیا جا رہا ہے، املاک شاہی لوٹی جا رہی ہے، بادشاہ کا مال اور اسباب ضبط اور ضائع کیا جا رہا ہے، تو اس ذلت کو وہ ہنسی میں نہ ٹال سکا، اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے انہی آنسوؤں سے اس نے روشنائی کا کام لیا۔ اور گورنر جنرل لارڈ کیننگ سے فریاد کی، لارڈ کیننگ کو جو کچھ چاہیئے تھا (ملک اودھ) وہ مل گیا تھا۔ اب وہ ذاتی طور پر بادشاہ کی تذلیل و تحقیر پسند نہیں کرتے تھے، تحقیق احوال کے لئے انہوں نے لکھنؤ کے چیف کمشنر اور متعلقہ حکام سے جواب طلب کیا، لیکن وہ لوگ یا تو خاموش رہے یا آئیں بائیں شائیں کرنے لگے۔ چیف کمشنر اور انگریز حکام کو تعجب تھا کہ ان سے معزول بادشاہ پر مظالم کے سلسلہ میں جواب طلب کیا جا رہا ہے۔ اس سلسلہ میں وہ خط جو لارڈ کیننگ نے چیف کمشنر کو لکھا، جہاں ان کی شرافت

---

[1] تاریخ اودھ جلد ۵ (نجم الغنی)، یہ تفصیلات اسی سے ماخوذ ہیں

امام باڑہ آصف الدولہ کا ایک منظر (لکھنؤ)

ذاتی کا مظہر ہے، وہاں ان کی بے بسی کی بھی منہ بولتی تصویر ہے۔

مولوی ذکاء اللہ اپنی تاریخ میں فرماتے ہیں کہ لارڈ کیننگ جواب طلب کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"تم کو جاننا چاہیئے کہ گورنمنٹ کے پاس (بادشاہ سابق کو) جواب دینے کے لئے مصالحہ موجود نہیں ہیں۔ تمہارے سارے جوابوں کو بادشاہ کے خطوں کے پہلو بہ پہلو رکھ کر دیکھتا ہوں، تو میں ہرگز اپنے تئیں اس قابل نہیں پاتا کہ یہ کہہ سکوں کہ عمارات جن کا بیان کیا گیا ہے وہ مسمار نہیں ہوئیں۔ اگرچہ بادشاہ کو ایک خاص جلو خانہ کی بابت اطلاع دی گئی ہے کہ وہ ڈھ رہا ہے، بادشاہ نے ۱۴ ستمبر ۱۸۵۵ء کے خط میں لکھا ہے کہ چتر منزل میں گھوڑے اور کتے باندھے گئے ہیں، بادشاہ کی اولاد کو دھمکیاں دی گئیں ہیں کہ ان کا وظیفہ بند ہو جائے گا، تم مجھ سے کہتے ہو کہ جوابوں میں تاخیر اس وجہ سے ہوئی کہ ان کی تکمیل زیادہ ہو جائے۔ اس لئے مشکل سے میں یہ خیال کرتا ہوں کہ معاملات تمہاری نظر سے نہ گزرے ہوں مگر کوئی اور سبب بھی میں نہیں جانتا کہ تم نے ان کو کیوں فروگزاشت کیا؟ خواہ کچھ ہی ہوا ہو تم نے جو کارروائی کا طریقہ اختیار کیا اس کا نتیجہ یہ تھا کہ بادشاہ سے ایسا برتاؤ برتنا پڑا جس کو ذلت تو نہیں کہہ سکتے مگر مکروہ اور نامزا ضرور تھا۔ بادشاہ جو شکائتیں کرتا تھا۔ خواہ وہ سچی ہوں یا جھوٹی وہ صاف گورنمنٹ کے افسروں کے خلاف تھیں۔ گورنر جنرل بادشاہ کو یقین دلاتا تھا کہ جلد یہ معاملات چیف کمشنر کی طرف رجوع کئے جائیں گے تو خاطر خواہ بادشاہ کو اس کی توجیہہ تبلا دی جائے گی۔ میں یہ اعتبار کرتا تھا جس کے کرنے کا حق مجھ کو حاصل ہے کہ چیف کمشنر میری ہدایتوں کی اطاعت کرے گا اور اپنا فرض ادا کرے گا۔ مگر اس میں میں نے بڑی غلطی کھائی اور بہت سی باتوں میں شکست پائی جو قابل بیان بھی نہیں۔ اب کلکتہ گورنمنٹ اس کو نظر انداز نہیں کر سکتی یہ کوئی بات نہیں ہے کہ یہ الزامات بادشاہ کے بدنام طفیلیوں نے برانگیختہ کئے ہیں خواہ وہ سیاہ ہوں یا سفید ہوں ان کا جواب دینا چاہیئے ہے۔ حیرت ہے کہ تم نے اس ضرورت کی قدر نہیں کی۔۔

نالشوں پر متوجہ نہ ہوئے۔ آخر لارڈ کیننگ کو یہ معلوم ہو گیا کہ جس چیف کمشنر کو میں نے انتخاب کیا تھا، وہ غلط تھا۔ ؎

اور ظاہر ہے بیچارے گورنر جنرل صاحب اس سے زیادہ کیا کر سکتے تھے؛

آہ جاتی ہے فلک پر.......

لارڈ میو، گورنر جنرل نسبتاً شریف آدمی تھے، لیکن حکمران قوم کے فرد تھے، ایک مرتبہ انھوں نے جوشِ پندار میں بادشاہ کو ذلیل کیا، اور ان کی توہین کے مرتکب ہوئے، بادشاہ بھلا کیا کر سکتے تھے، خون کا گھونٹ پی کر اور آہ کر کے خاموش ہو گئے۔ لیکن یہ آہ ناکام نہیں رہی، فلک پر پہنچی اور کامیاب لوٹی۔

بادشاہ کی توہین کا واقعہ یہ ہے۔

۱۸۷۱ء کا واقعہ ہے گورنر جنرل لارڈ میو ہوئے پہلے وہ خود ہی بادشاہ سے ملنے کو آئے اور بادشاہ ان سے مل کر خوش ہوئے، دوسرے دن بادشاہ ان کی بازدید کی ملاقات کو گورنمنٹ ہاؤس تشریف لے گئے جہاں تخت گاہ کے کمرے میں لارڈ میو نے پہلے بادشاہ کے برابر کرسی پر بیٹھ کر ان سے باتیں کیں اور تھوڑی دیر بعد خدا جانے کیا دل میں آیا کہ اپنی کرسی سے اٹھ کر شہ نشین کی اونچی صدر کی کرسی پر جا بیٹھے اور بادشاہ کو وہیں نیچے رہنے دیا۔ بادشاہ کو اس میں اپنی سبکی نظر آئی بے ساختہ اٹھ کر بغیر رخصت ہوئے واپس چلے آئے اور اس کے بعد بعد سے پھر کبھی کسی انگریز سے نہ ملے۔ گھر پہنچے تو کسی مزاج داں مصاحب نے عرض کیا "جہاں پناہ ظل سبحانی بغیر لاٹ صاحب سے رخصت ہوئے بغیر کیوں چلے آئے؟" فرمایا میں کس سے رخصت ہوتا؟ میں نے دیکھا کہ اس اونچی صدر کی کرسی پر بجائے زندہ آدمی کے ایک لاش رکھی ہے۔" ؎

.....چنداں اماں نہ داد کہ شب را سحر کند

اور واقعی کچھ ہی دن بعد، یہ زندہ آدمی لاش میں تبدیل ہو گیا، لیکن کس طرح؟

یہ عبرت انگیز واقعہ اس طرح پیش آیا؛ کالے پانی کا ایک قیدی اپنا چشم دید واقعہ یوں بیان کرتا ہے:۔

۔لارڈ میو صاحب بہادر ۸ر فروری ۱۸۷۲ء کو سات بجے کے بعد مع چار اگن بوٹوں کے انڈیمان میں جلوہ افروز ہوئے، صدہا صاحب لوگ اور میم واسطے سیر جزیرہ کے لارڈ میو صاحب کے ہمراہ تھے۔ آٹھ بجے کے بعد گورنر صاحب مع چند ہمراہیان خود جہاز سے اتر کر جزیرہ روس میں جو صدر مقام پورٹ بلیر کا ہے، مشرف افروز ہوئے، اترنے کے وقت لارڈ صاحب کے واسطے ۲۱ ضرب توپ کی سلامی ہوئی، اس وقت ہزاروں عورت مرد قیدی اور آزاد اس نظارے کو دیکھنے کے لئے جمع تھے۔ لارڈ صاحب بہادر ٹاپو میں اترنے کے ساتھ ہی بازار کی طرف متوجہ ہوئے اور سکول، بازار، ہسپتال، بارک قیدیاں، بارک جنگی پلٹن کا ملاحظہ کر کے چیف کمشنر صاحب انڈیمان کے بنگلہ پر تشریف لے گئے اور وہاں کھانا تناول کر کے تھوڑا آرام کر کے گورہ بارک کا ملاحظہ کیا اور پھر اپنے اگن بوٹ کو دیکھتے ہوئے وبیر آئی لینڈ کو جہاں بدمعاش قیدی رہتے ہیں، مشرف افروز ہوئے اور بعد ملاحظہ وبیر کے ٹینٹ پیریٹ کے قریب ایک پہاڑی واقع چاتم، یہاں ایک لکڑی کے لال تختے کو لارڈ صاحب نے بہت پسند کیا، پھرتے پھرتے یک بیک لارڈ صاحب کے دل میں آیا کہ اسی وقت ماؤنٹ پیریٹ کو بھی ملاحظہ کیا جائے، پرائیویٹ سکرٹری اور چیف کمشنر نے بوجہ غیر وقت ہو جانے کے اس دن مونٹ پیریٹ کو جانے سے بہت اصرار سے منع کیا، لیکن لارڈ صاحب نے نہ مانا، یوں کہو کہ موت نے ان کو ماننے دیا اور چاتم سے سوار ہو کر ہوپ ٹاؤن میں جو زیر پائے کوہ آباد ہے پہنچے، اس ٹاپو میں شیر علی نام ایک آفریدی قیدی مدت دراز سے ایک چھری واسطے قتل کرنے کسی افسر اعلٰے کے تیار کر کے منتظر بیٹھا تھا، جب لارڈ صاحب کی کشتی ہوپ ٹاؤن میں پہنچی تو شیر علی مذکور اپنی چھری ہمراہ لے کر ہوپ ٹاؤن سے لارڈ صاحب کے ہمراہ تھا، مگر راستہ میں اس کا داؤں نہ چلا اور لارڈ صاحب بخیریت تمام پہاڑ پر پہنچ گیا اب وقت غروب آفتاب کا آگیا تھا، لارڈ صاحب نے وہاں بیٹھ کر

چاروں طرف تھی چیف کمشنر صاحب اور سیکرٹری صاحب، لارڈ صاحب کے
دائیں بائیں جسم سے جسم ملا کر چلتے تھے۔ اور دوسرے بیسیوں افسر پیچھے تھے
اترائی میں بھی لارڈ صاحب بخیریت ہوپ ٹاؤن تک پہنچ گئے، مگر جب گھاٹ
پر گاڑی کے نزدیک جو وہاں کھڑی تھی پہنچے چیف کمشنر صاحب لارڈ صاحب
کی اجازت لے کر کسی ضرورت سے پیچھے آئے اور لارڈ صاحب مع سیکرٹری
آہستہ آہستہ چلے جاتے تھے۔ اس وقت اس گاڑی کی آڑ میں سے ایک آدمی نے
مثل شیر کے کود کر دو زخم کاری لارڈ صاحب کو چھری سے ایسے لگائے کہ لڑکھڑا
کر لارڈ صاحب سمندر میں جا پڑے۔ اس گڑبڑ میں مشعلیں بھی سب گل ہو گئیں
مگر ایک قیدی نے جرأت کر کے قاتل کو پکڑ لیا۔ ورنہ وہ اور دو چار کو مارتا
لارڈ صاحب کو سمندر سے نکالا، وہ تو ایک دو بات کر کے راہی ملک بقا ہوئے
جب قاتل سے پوچھا یہ تم نے کس واسطے کیا؟ تو اس نے کہا کہ میں نے خدا کے
حکم سے کیا ہے۔ پھر پوچھا کہ کیا تمہارا کوئی شریک ہے؟ تو جواب دیا خدا
میرا شریک ہے۔ بعد تحقیقات ضابطہ منظوری ہائیکورٹ بنگال کے قاتل
کو پھانسی کی سزا کا حکم ہوا۔ یہ قاتل شیر علی نام ضلع پشاور کا ایک افغان تھا،
اس نے کہا ۱۸۶۹ء میں میرا ارادہ تھا کہ کسی بڑے انگریز افسر کو ماروں گا۔ اس
واسطے چند سال سے یہ چھرا تیار کر رکھا تھا۔ جب آٹھ فروری ۱۸۷۲ء کو لارڈ
صاحب آئے اور ان کی سلامی ہوئی تو میں نے چھرے کو دوبارہ تیز کیا۔ میں
تمام دن اس تاک میں رہا کہ کسی طرح اس ٹاپو میں پہنچوں جہاں لارڈ صاحب ٹھہرے
ہوئے مجھے ملیں۔ مگر مجھ کو وہاں جانے کی رخصت نہ ملی۔ شام کے وقت میں مایوس ہو
گیا تھا۔ لارڈ صاحب کو موت میرے گھیرے آئی۔ میں پہاڑ پر بھی لارڈ صاحب کے
ساتھ گیا تھا اور ساتھ ہی واپس آیا تھا، مگر آتے جاتے اور پہاڑ پر اس کا موقع نہ
نہ ملا۔ تب میں اس گاڑی میں آ کر چھپ رہا۔ یہاں سے مراد پوری ہو گئی۔ یہ شخص
کو ضعیف الجثہ اور پست قد بد رو آدمی تھا۔ مگر بڑا تنہ زور اور دلیر آدمی
... ہراساں نہ تھا۔ پھانسی پر چڑھ کر

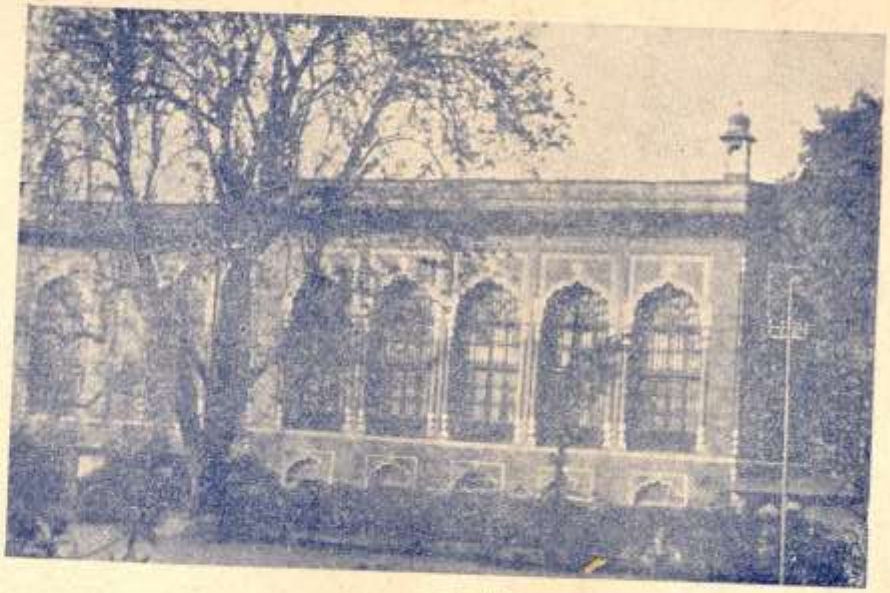

لال بارہ دری

مار ڈالا۔ اور تم گواہ رہو کہ میں مسلمان ہوں۔ اور پھر کلمہ پڑھنے لگا اور کلمہ پڑھتے ہی پڑھتے ان کی جان جسم سے پرواز کر گئی۔[۱]

مٹیابرج کے ٹھاٹھ

تذکرہ خم خانۂ جاوید میں لکھا ہے کہ اگرچہ شاہ اودھ کی ظاہری حالت اور انتزاع سلطنت کو دیکھ کر عبرت پسندوں کا خیال تھا کہ ڈوبا وہ طمطراق شاہانہ عیش و نشاط اس مٹیابرج میں کہاں مگر نہیں اپنی آنکھوں سے دیکھنے والے اور حقیقت حال سے آگاہ اشخاص بخوبی جانتے ہیں کہ اس فلاکت اور گئی گذری حالت میں بھی اس باوضع بادشاہ نے تادم مرگ اپنی کسی عادت اور کسی شاہانہ عیش پرستی و شغل میں کوئی فرق نہ آنے دیا اور اس شعر کا مصداق بنا رہا۔

تند باد قہر نے کشتی کو توڑا پھر بھی ہاں زمزمہ لب پہ ہے وہی ہر چہ بادا باد کا

اس غریب الوطنی میں بھی بیس ہزار[۲] متوسلین حضرت کے ہمرکاب رہے اور سب کے ساتھ حتی الوسع وہی سلوک اور وہی برتاؤ قائم رہا جو زمانہ سلطنت میں برتا جاتا تھا جس نے مٹیابرج کی اس زمانہ میں سیر کی ہے وہ کہہ سکتا ہے اس مٹی ہوئی حالت میں بھی اسے باغ ارم بنا کر راجہ اندر کا اکھاڑہ کر رکھا تھا اس پر محلات و ایوان دل کشا کی وہی شان سامان و اسباب آرائش کی وہی افراط جو ہر شخص کے وہم و گمان میں نہ آئے۔ غرض وہ کون سی شان و شوکت تھی جو وہاں نمایاں نہ تھی ہر قسم کے جانوروں کا دلی شوق تھا چنانچہ آپ کا چڑیا خانہ ایسا نادر اور بے مثل تھا کہ اکثر یورپ کے سیاح اسے دیکھنے آتے تھے اور آپ کے مذاق اور تلاش کو سراہتے تھے۔

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

آخر، آدھی زندگی عیش و عشرت میں اور آدھی عمر حسرت و اندوہ میں بسر کرنے کے بعد، سلطان عالم واجد علی شاہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

دو خفیف علالت کے بعد ۲۱ ستمبر ۱۸۸۷ء ۲ محرم ۱۳۰۵ھ کو نو گھڑی رات گئے انتقال کیا اور سرفراز علی خاں نامی ایک شخص کے خط سے جو دہلی موجود تھا ان کا انتقال کرنا ۲ محرم کو ثابت ہوتا ہے۔ انتقال سے تیسرے دن اپنے تیار

کردہ امام باڑہ سبطین آباد میں پیوندِ زمین ہوئے ۔ جو مٹیا برج میں واقع ہے۔[1]

مولانا شررؔ کے اشکِ خونیں

مولانا عبدالحلیم شررؔ، واجد علی شاہ کے نمک خوار تھے، ان کی طفلی اور عہدِ شباب کا زمانہ بادشاہ کے دامنِ کرم میں بسر ہوا تھا، وہ کئی سال تک مٹیا برج میں جلاوطن بادشاہ کے ساتھ رہے تھے، انہوں نے دوسرے لوگوں کے مقابلہ میں بہت قریب سے بادشاہ کو دیکھا تھا اور اس کے کردار و سیرت سے بے انتہا متاثر بھی تھے، بادشاہ کی وفات پر انہوں نے نثر میں جو مرثیہ لکھا وہ ان کے جذبے اور صدمے کا آئینہ ہے۔ مولانا کا یہ رقت انگیز مقالہ خاصہ طویل تھا، ہم نے اسے کافی مختصر کر دیا ہے، مولانا فرماتے ہیں:-

> ۲۱؍ستمبر کو بادشاہ راہیِ ملکِ جاوداں ہوئے ان کے انتقال کے بعد انگریزی گورنمنٹ کے انصاف نے یہ صورت اختیار کی کہ شاہی کوٹھیوں اور ان کے کل مال اور اسباب پر اپنا پہرہ مقرر کر دیا اور کہا گیا کہ کل ترکہ ورثا میں تقسیم کر دیا جائے گا، اگر کوٹھیوں اور مکانوں کو اسی حالت میں تقسیم کر دیا جاتا تو بھی وہ شاید قائم رہ جاتیں ۔ مگر انگریزوں کو اس میں زیادہ انصاف نظر آیا کہ کل کوٹھیوں اور سامان فروخت کر دیا جائے اور نقد روپیہ ورثا میں تقسیم ہو۔
>
> اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سب کوٹھیاں کھود ڈالی گئیں باغ اور رمنے ویران ہو گئے، جانور بھی سب فروخت ہو گئے، غرض واجد علی شاہ کے زمانے کے مٹیا برج کا اب نام و نشان بھی باقی نہیں رہا، اب نہ کوٹھیوں کا سراغ ہے اور نہ ان کے مکینوں کا، البتہ اس زمانے کے دیکھنے والے چند بوڑھے رہ گئے ہیں جو ٹھنڈی سانسوں کے طویل سلسلے کے بعد کچھ افسانے بیان کر دیتے ہیں۔[2]

---

[1] جانِ عالم (شرر)

[2] جانِ عالم (عبدالحلیم شرر) صفحہ ۱۹۲

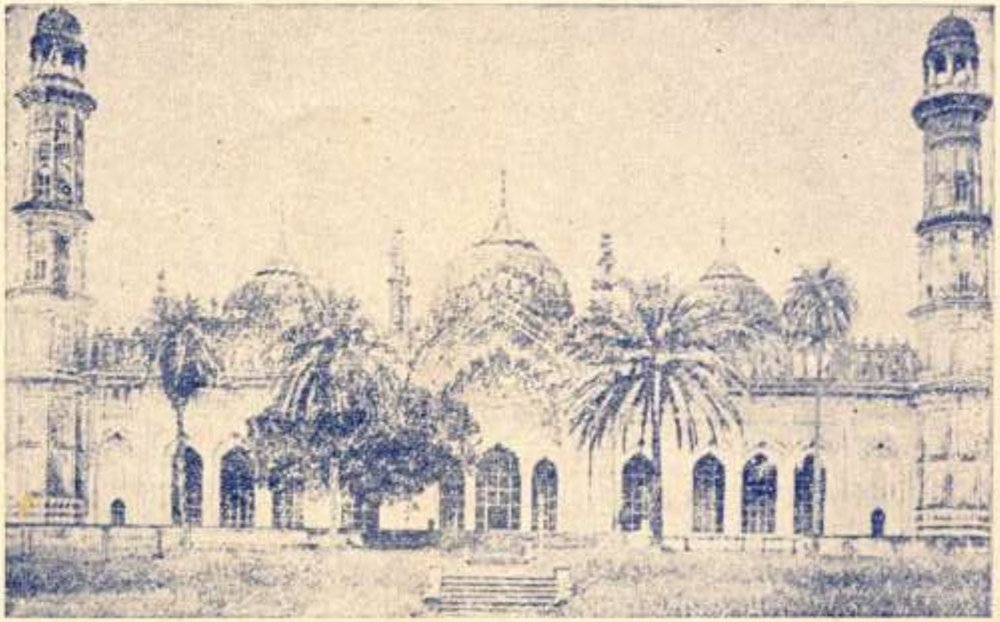

لکھنؤ کی جامع مسجد

لکھنؤ کا مرثیہ

الٰہی ٹوٹ پڑے تجھ پہ آسماں صیّاد

لکھنؤ مٹ گیا، لیکن اس کی یاد نہ مٹ سکی۔ اودھ کی سلطنت بے چراغ ہو گئی، لیکن اس کا نقش محو نہ ہو سکا۔ واجد علی شاہ معزول ہوئے، جلا وطن ہوئے، فورٹ ولیم میں قید رہے، اور ایک روز اس جہان گزراں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے، لیکن چشمِ گریہ ساماں پر کوئی قدغن نہ لگا سکا۔

انگریزوں کی حکومت قائم ہو گئی۔ ان کے دبدبہ اور طنطنہ کے سامنے سب کے سر جھک گئے۔ ان کی سفاکی اور درندگی، بہیمیت اور شقاوت، ظلم و جور اور قتل و غارت نے سکوتِ مرگ آسا طاری کر دیا ساری خلقت پر، لیکن شاہ کی نالہ معزول زمین سے اٹھا اور عرش پر پہنچ گیا۔ اسے کوئی نہ روک سکا۔ اس پر کوئی روگ نہ لگا سکا۔ اس نے اشارہ میں، استعارہ میں، کنایہ میں، تمثیل میں، تشبیہہ میں، وہ سب کچھ کہہ دیا جو کہنا چاہتا تھا۔

اودھ کی تباہی، لکھنؤ کی بربادی، واجد علی شاہ کی نامرادی اور باشندگانِ مملکت (زن و مرد) کی زبوں حالی کا مرقع کئی شاعروں نے کھینچا ہے۔ میں تلخیص و اختصار کے ساتھ بطور نمونہ کے تھوڑا سا کلام پیش کرتا ہوں!

(سید اکبر حسین) اکبر الہ آبادی

غمِ ملّت

وہ ہوا نہ رہی وہ چمن نہ رہا
وہ فلک نہ رہا وہ سماں نہ رہا
نہ گلوں میں گلوں کی سی بو وہ رہی
نہ حسینوں میں رنگ وفا وہ رہا
نہ وہ آن رہی نہ امنگ رہی
سوئے قبلہ نگاہوں کے رخ نہ رہے
نہ وہ جام رہے نہ وہ مست رہے
وہ طریقہ کارِ جہاں نہ رہا
ہمیں لاکھ زمانہ بھلائے تو کیا
یہ محال ہے اہل وفا کے لئے

وہ گلی نہ رہی وہ حسیں نہ رہے
وہ مکاں نہ رہا وہ مکیں نہ رہے
نہ عزیزوں میں لطف کی خو وہ رہی
کہیں اور کی کیا وہ ہمیں نہ رہے
نہ وہ رندی و زہد کی جنگ رہی
در و دیر پہ نقش جبیں نہ رہے
نہ خدا سے عہد الست رہے
وہ مشاغل رونق دیں نہ رہے
نئے رنگ جو چرخ دکھائے تو کیا
غم ملت والفت دیں نہ رہے

(میر ببر علی انیس)

فریاد

کیوں کر دل غم زدہ نہ فریاد کرے
جب ملک کو یوں غنیم برباد کرے
مانگو یہ دعا کہ اب خداوند کریم
اجڑی ہوئی سلطنت کو آباد کرے

●

(سید ظہیر الدین ظہیر)

داستان انقلاب

جو ہاتھ عقدہ کشا تھے وہ بستہ کار ہوئے — جو قد کہ رشک صنوبر تھے وہ نزار ہوئے
جو پاؤں غیرت گل تھے وہ خار خار ہوئے — حنائی تلوے دلوں کی طرح فگار ہوئے
جو سینے گلشن خوبی تھے داغ داغ ہوئے — جو دل کہ خانہ عشرت تھے بے چراغ ہوئے
نگاہ صورت تصویر رہ گئی حیراں — ہر ایک جسم بنا شکل قالب بے جاں
چھٹے یگانوں کے ہمراہ ہوش و تاب و تواں — برنگ طائر ترسیدہ اڑ گئے اوساں
مثال آئینہ ہر ایک چشم حیراں تھی — دلوں کی طرف سے جو زلف تھی پریشاں تھی
ہر ایک رونق بزم جہان قتل ہوا — ہر ایک قبلہ ہر خاندان قتل ہوا
ہر ایک طوطی شیریں زباں قتل ہوا — ہر ایک بلبل نوشیں بیاں قتل ہوا
گھروں سے کھینچ کے کشتوں پہ پشتے ڈالے ہیں — نہ گور ہے نہ کفن ہے نہ رونے والے ہیں
نکلنا شہر سے خلقت کا بے سر و ساماں — وہ چاک چاک گریباں لٹکتے تا داماں
وہ جانا پردہ نشینوں کا با سر عریاں — وہ دار و گیر سپاہ خنزیر بے ایماں
دراز دست تظلم ستم شعاروں کا — فلک کو یاس سے تکنا جفا کے ماروں کا
نکلتے شہر سے ہیں پر نکل نہیں سکتے — ہزار چال سے چلتے ہیں چل نہیں سکتے
کروڑ شکل کو بدلیں بدل نہیں سکتے — قدم قدم پہ ہے لغزش سنبھل نہیں سکتے
کمند موت نے کیا بند بند جکڑے ہیں — زمین شہر نے ایک ایک کے پاؤں پکڑے ہیں
وہ دھوپ اور وہ ریگ تپاں وہ گرم ہوا — وہ فوج فوج ہر اک سو سے زغنۂ اعداد
وہ کینہ ورزی غارت گراں بے پروا — اور اس پہ ظلم گنواروں کا وہ کہ واویلا

وہ گل سے چہرے حرارت سے تمتمائے ہوئے
لبوں پہ آہ جگر میں الم سمائے ہوئے
وہ داغ مرگ عزیزاں وہ دشت پیمائی
گلوں سی کج خیموں پہ اک سرخی سی چھائی ہوئی
غضب وہ پردہ نشینوں کی بے ردائی تھی
بیان کیجے نصیبوں کی کیا برائی کا
جہاں کی تشنہ رخوں تیغ آبدار ہوئی
رسن ہر ایک بشر کے گلے کا ہار ہوئی
ہر ایک دشت فضا میں کشاں کشاں پہنچا
نہال گلشن اقبال پائمال ہوئے
یہ کیا زوال ہوئے اور کیا کمال ہوئے
جو عطر گل کا نہ ملتے ، ملے وہ مٹی میں

وہ گورے گورے بدن خاک میں ملائے ہوئے
جفا کی تیغ سے سب زخم دل پہ کھائے ہوئے
وہ ریگ و خار مغیلاں و آبلہ پائی !
وہ سب کے چہروں پہ گویا چھٹی ہوائی تھی
غرض کہ آنے سے پہلے قیامت آئی تھی
وہ دشت اور وہ پھرنا برہنہ پائی کا
سنان نیزہ ہر اک سینہ سے دوچار ہوئی
ہر ایک سمت سے فریاد گیر و دار ہوئی
جہاں کی خاک تھی جس جس کی وہ وہاں پہنچا
گل ریاض خلافت لہو میں لال ہوئے
کمال کو بھی نہ پہنچے تھے جو زوال ہوئے
جو فرش گل پہ نہ چلتے ، ملے وہ مٹی میں

منیر شکوہ آبادی

داغ غم

دل تو پژمردہ ہیں داغ غم گلستاں ہوں تو کیا
آنکھیں روتی ہیں دہان زخم خنداں ہوں تو کیا

ہو گئے برباد شاہان سلیماں منزلت
اب بلا میں ہوں تو کیا دنیا میں پنہاں ہوں تو کیا

موت کے پنجرے میں شیران دلاور پھنس گئے
شیر افگن ایک دو شیر نیستاں ہوں تو کیا

بیگمیں، شہزادیاں پھرنے لگیں خانہ خراب
اب جو بیٹھیں صاحبان قصر و ایواں ہوں تو کیا

مسجدیں ٹوٹی پڑی ہیں صومعے ویران ہیں
یاد حق میں ایک دو دلہائے سوزاں ہوں تو کیا

مٹ گئے قصر معلّے، کھد گئے زریں محل
رنج سے معمور گر دل ہائے ویراں ہوں تو کیا

بجھ گئیں شمعیں جلیں پروانے تو کیا فائدہ
اڑ گئے پروانے شمعیں نور افشاں ہوں تو کیا

دیکھنے والے نہیں پھر آئینے کس کام کے
بے زلیخا شہر سارے یوسفستاں مصر تو کیا

کربلا میں یا نجف میں چل کے مر جائیں منیر
ہند میں ہم پہلوئے گور غریباں ہوں تو کیا

میر امان علی سحر

شہرِ بے چراغ

عجیب مجمعِ اہلِ کمال تھا افسوس
ہزار حیف وہ صحبت فلک نہ دیکھ سکا

نہ پانچوں وقت کی نوبت نہ دردیاں نہ گجر
نہ توپ چلتی ہے اب ہے غضب کا سناٹا

جہاں میں صاحبِ جوہر کی ہے یہ بے قدری
ٹکے ٹکے پہ بکیں اصفہانیاں کیا کیا!

کسی کا کھد گیا پشتہ کہیں گری دیوار
چبوترا کہیں غائب کسی کا دروازا

جو کچھ خرید کو بازار تک گیا کوئی
وہاں سے پھر کے جو آیا تو گھر نہ پہچانا

یہ حکم ہے کہ نہ ہوں چار ایک جا باہم
وہ دن گئے کہ شب و روز رہتا تھا جلسہ

•

میریار علی رند

شکوۂ صیّاد

کھلی ہے کنج قفس میں مری زبان صیاد — میں ماجرائے چمن کیا کروں بیاں صیاد
جہاں گیا میں گیا دام لے کے واں صیاد — پھرا تلاش میں میری کہاں کہاں صیاد
اجاڑا موسم گل ہی میں آشیاں میرا — الہی ٹوٹ پڑے تجھ پہ آسماں صیاد
میں جھانکتا نہیں جا اک قفس سے بھی گل کو — کہ تا نہ ہو مری جانب سے بدگماں صیاد
الہی دیکھیے صحبت برآر ہو کیوں کر — زباں دراز ہوں میں اور بد زباں صیاد
نکالیو نہ قدم آشیاں سے او بلبل — لگائے بیٹھے ہیں پھندے جہاں تہاں صیاد
چمن میں رکھا نہ بلبل کا نام تک باقی — خدا کرے یونہی ہو جائے بے نشاں صیاد
مرے بیاں کو سن سن کے کانپ کانپ اٹھا — غضب یہ ہے کہ سمجھتا نہیں زباں صیاد
پروں کو کھول دے ظالم جو بند کرتا ہے — قفس کو رے کے میں اڑ جاؤں گا کہاں صیاد
دکھایا کنج قفس مجھ کو آب و دانہ نے — وگرنہ دام کہاں، میں کہاں، کہاں صیاد
فریب دانہ نہ کھاتا میں زینہار رہے رند — نہ کرتا دام اگر خاک میں نہاں صیاد

عجیب قصہ ہے دل چسپ اک حکایت ہے
سناؤں گا گل بلبل کی داستاں صیاد

آفتاب الدولہ قلق

سفر آشوب

(لکھنؤ واجد علی شاہ کے بعد)

تین حصے سے سوا شہر کھدا پایا تمام
جس طرف دیکھو نظر آتا ہے اک ہو کا مقام
مہروش سیکڑوں رہتے تھے جہاں گرام خرام
ٹھوکریں کھاکے بشر چلتے ہیں اس جا ہر گام
اجنبی ہو گئے ایسے یہ بھٹک جاتے ہیں
ساکن شہر تلک راہ نہیں پاتے ہیں

جس جگہ کل تک ان آنکھوں سے بیاباں دیکھا
جا پڑی آنکھ جدھر اک پرستاں دیکھا
جس کو دیکھا صفت گل اسے خنداں دیکھا
آج اجڑا ہوا ہم نے وہ گلستاں دیکھا
سبق دفتر آرام نہ زنہار پڑھو
آیۂ فاعتبروا یا اولی الابصار پڑھو!

کثرت لالہ و گل سے جو ہو مملو گلزار
عندلیبوں کو قدم رکھنا ہو جن شاخوں پہ بار
زر گل روز لٹاتی ہو جہاں باد بہار
ہر چمن میں ہوں وہیں برگ خزاں کے انبار
جائے گل خار ہوں باغی عوض گلچیں ہوں
بدلے سرخی کے لہو سے روشیں رنگیں ہوں

یہی سرکار وہ پارس تھی جو چھو جاتا تھا
چار ہی دن میں اسے مال یہ ہاتھ آتا تھا
خوبی بخت سے توقیر بھی یہ پاتا تھا
کبر سے ایک کو خاطر میں نہ وہ لاتا تھا!
روز سامان نئے سب کو نظر آتے تھے
دم میں بنتے تھے کئی مٹتے بگڑ جاتے تھے

جس گھڑی ہوتا ہے اس تازہ خرابے پہ گزر
یہ گماں کرتا ہے ہر ایک ستم دیدۂ بشر
نہیں اڑتا ہے یہ سڑکوں پہ غبار اٹھ پہر
فرقت شہ میں زمیں شہر کی ہے خاک بسر
دل پہ صدمے جو گذرتے ہیں وہ سب سہتے ہیں
باغ شاہی میں سڑک دیکھ کے یہ کہتے ہیں

دلخراش ایسی الٰہی کوئی روداد نہ ہو
اس طرح گھر کسی دشمن کا بھی برباد نہ ہو
مدعی ایسا سپہر ستم ایجاد نہ ہو
کسی بے جرم پہ دنیا میں یہ بے داد نہ ہو
ایسی سرکار کسی کی نہ لٹے دنیا میں
یوں وطن سے کوئی اپنے نہ چھٹے دنیا میں

ٹھہر اے دیدہ گریاں کہ شگون بد ہے
دیکھ چپ رہ دل ناداں کہ شگون بد ہے
کیا کریں چاک گریباں کہ شگون بد ہے
بال کیوں کہ ہوں پریشاں کہ شگون بد ہے
[illegible]
قائم اس نامہ کو تا روز قیامت رکھے

حرفِ آخر

الحمدللہ کہ یہ کتاب اتمام کو پہنچی۔ میں نے کوشش کی ہے کہ اپنے موضوع کے ساتھ پورا پورا انصاف کروں، اور زیادہ سے زیادہ مستند مواد پیش کروں۔ کم از کم میں تو اپنی جگہ مطمئن ہوں کہ میں نے اپنا فرض پوری دیانت سے انجام دیا ہے۔ رہے پاکستان کے "عظیم" نقاد اور سعادت یار خاں رنگین کے "ہم ردیف و ہم قافیہ نکتہ چیں"، سو وہ دہائی دیتے ہوئے، ایک ایک آستانہ پر ہر حال میں پہنچتے رہیں گے، فریاد اور دہائی کے لئے بھی یہ ہر دروازہ استعمال کرتے ہیں، ان سے کون کہے۔

بازارِ مصر میں چل، یوسف کا سامنا کر!
کھوٹے کھرے کا پردہ کھل جائے گا چلن میں

لیکن مجھے اس کا افسوس ضرور ہے کہ وہ سارا مواد جو بڑی محنت سے میں نے جمع کیا تھا، کتاب کے ضخیم ہو جانے کے باعث استعمال میں نہ آسکا بعض تحریر کردہ عنوانات تک مجھے روک لینے پڑے، بہرحال یہ مواد بے کار نہیں جائے گا، انشاء اللہ اپنے وقت پر کام آئے گا۔

مجھے افسوس ہے کہ ساقی (کراچی) کا پرچہ سعی بسیار کے باوجود دستیاب نہیں ہو سکا جس میں ممتاز حسن صاحب (سیکرٹری فنانس حکومت پاکستان) کا ریڈیائی تبصرہ "بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد" پر شائع ہوا تھا، اتفاق سے نگار اور صدق کے پرچے مل گئے، مولانا نیاز فتح پوری نے جو تبصرہ کیا تھا۔ اس کا ایک حصہ درج کرتا ہوں"

"جیسا کہ اس کتاب کے نام سے ظاہر ہے یہ بہادر شاہ ظفر اور ان کے عہد کی تاریخ ہے، جس میں اس عہد کی تمام سیاسی، علمی، ادبی و معاشرتی پہلوؤں کو پیش کیا گیا ہے اور اس حد تک بلسیر حج و استقصاء سے کام لیا گیا ہے کہ اگر ہم اس کو اس زمانہ کی "دائرۃ المعارف" کہیں تو غلط نہ ہوگا۔

شاہ ظفر کا عہد تاریخ ہند کا بڑا انقلاب آفریں عہد تھا جس نے عہد مغلیہ کے آخری تاجدار کو ختم کر کے انگریزی حکومت کی بنیاد استوار کی، ہر چند شاہ ظفر کی حکومت حدود قلعہ کے اندر ہی محدود تھی لیکن اس کا نفسیاتی و اخلاقی اثر اتنا ضرور تھا کہ اگر ۵۷ء کی جنگ انقلاب کامیاب ہو جاتی تو اس کا نتیجہ یہ ضرور ہوتا کہ اگر مغلیہ حکومت کا اقتدار از سر نو قائم نہ ہو سکتا۔ تو انگریزوں کے پاؤں بھی یہاں نہ جم سکتے۔

۵۷ء کی تاریخ پر انگریزی اور اردو میں متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن ان میں سے اکثر وہ ہیں جن

موضوع پر لکھی جائے جو نہ صرف صحت واقعات بلکہ استقصاء جزئیات کے لحاظ سے بھی قابل استفادہ ہو۔
اس کے فاضل مصنف نے تمام مطبوعہ و غیر مطبوعہ کتابوں کا مطالعہ کر کے اس تاریخ کا مواد فراہم
کرنے میں جتنی محنت سے کام لیا ہے اس کی داد نہ دینا ظلم ہے۔ ہر چند اس کا انداز بیان اور اس کا
اسلوب ترتیب ایسا نہیں جس سے ہم اس عہد کے حالات تدریج کے ساتھ معلوم کر سکیں، لیکن یہ
ضرور ہے کہ اس کو سامنے رکھ کر ہم ایک بڑی اچھی تاریخ کی کتاب مرتب کر سکتے ہیں :۔

اس کتاب میں اس عہد کے سیاسی حالات اور واقعات انقلاب تفصیل کے ساتھ ساتھ تمام اکابر
و اعاظم، تمام شعراء و حکماء، تمام مشاغل و مراسم اور علمی و ادبی تصانیف کا بھی مفصل ذکر کیا گیا ہے
جس نے اس کتاب کو ایک نہایت دلچسپ کشکول کی حیثیت دے دی ہے، مولانا فضل حق
خیر آبادی کی عربی کتاب "ثورۃ الہند" اور ان کے عربی قصائد کا ترجمہ بھی دے دیا گیا ہے، جو ٥٧ء
کی جنگ انقلاب کی تاریخ بھی ہے اور مرثیہ بھی۔"

مولانا عبد الماجد صاحب دریا بادی نے "صدق" میں ایک طویل تبصرہ شائع فرمایا تھا، جس کا ایک حصہ یہ ہے:۔

"مصنف صاحب کوئی تارک الدنیا گوشہ نشین قسم کے آدمی نہیں کہ سب طرف سے یکسوئی حاصل
کئے ہوئے اسی ایک کتاب کے لکھنے لکھانے ہی میں لگے رہے ہوں، وہ جرنلسٹ (اخبار نویس)
ہیں، ناولسٹ ہیں اور ایسے کہ ان کے ناول کھٹا کھٹ ایک کے بعد ایک نکلتے چلے آتے ہیں، اور
ساتھ ہی ایک دار الاشاعت کے منیجر بھی، اس کم فرصتی پر یہ عالم کہ ایک دفتر کا دفتر تیار کر دیا،
فرصت ہوتی تو خدا جانے کیا غضب ڈھاتے ——
کتاب کا نام ہے "بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد" لیکن کتاب بہادر شاہ پر تو کم ہے اور ان کے
عہد پر زیادہ، چنانچہ بہادر شاہ کا تذکرہ تو صفحہ ٢٥٦ پر ختم ہو جاتا ہے اور خیر آگے چل کر کچھ صفحے
بہادر شاہ کے مقدمہ کے بھی ملا لیجئے باقی صفحہ ٢٥٧ سے عہد بہادر شاہی کے صوفیہ و مشائخ، علماء،
شعراء، اطبا، ہنر ور اور فن کار، شہدائے غدر، اخبارات، عمارات اور دوسرے عنوانات متعلق
و غیر متعلق کا سلسلہ جو چھڑتا ہے، تو وہ کتاب کے خاتمہ ہی پر ختم ہوتا ہے۔ بقول شخصے ؎
قصۂ زلف مختصر نہ ہوا!

اور کتاب کو مجموعی حیثیت بجائے ایک سوانح عمری یا تاریخ کے ایک تاریخی، سوانحی، ادبی، اخباری
کشکول کی دے جاتا ہے۔ جامعیت اور کاملیت اور ہمہ گیری اس بلا کی کہ سرسید کی سائنٹیفک
[illegible] کے جلوۂ دربار

قیصری کی پر بہار نظموں تک کا عکس اسی آئینہ میں ملاحظہ فرمالیجئے! کیا کہئیے کہ آج حیات نہ ہوئے مولانا شوکت علی مرحوم ورنہ عجب نہیں کہ یہ ضخیم و شحیم اور زرنگار رنگ کتاب اپنے سارے پھیلاؤ اور بھراؤ کے ساتھ انہی کے نام نامی سے معنون ہوتی! بجا ہی بلیغ اور ہر معنی لحاظ سے پر معنی انتساب اور ڈیڈی کیشن ہوتا اور معنویت کی ایک نئی روح اس سے اس قالب کاغذی میں پڑجاتی۔" (صدق ۲۵ جنوری ۱۹۵۸ء)

کراچی کے مشہور اور معیاری رسالہ "نیا دور" کا تبصرہ یہ ہے:۔

"غدر کی داستان تاریخ ہند کا ایک ایسا المیہ ہے جس کی نظیر کسی دوسرے ملک کی تاریخ میں بہت مشکل ہی سے ملے گی، پاک و ہند کے اہل قلم اور مورخین کو شاید اس کی اہمیت سے انکار نہ ہو مگر واقعہ یہ ہے کہ کسی نے آج تک اس طرف توجہ نہ دی اور ہماری تاریخ کا یہ اہم اور سبق آموز حزینہ یادوں سے فراموش ہوتا چلا گیا۔ مورخین کی بے توجہی کی یہی وجہ ہو سکتی ہے کہ ۱۹ ویں صدی کے اواخر بیسویں صدی کے ابتدائی دور میں انگریزی قہر مانیت کے پیش نظر کسی مورخ کو اس موضوع پر قلم اٹھانے کی جسارت ہو ہی نہیں سکتی تھی اور اس کے بعد اہل ہند کے نئے عزائم اور نئی قومی تحریکات نے وہ زور پکڑا کہ کسی کو اس طرف متوجہ ہونے کی فرصت ہی نہیں ملی۔ مرحوم خواجہ حسن نظامی نے اس موضوع پر اپنے دل کش انداز میں بہت کچھ لکھا مگر بعض تراجم کو چھوڑ کر اس کی حیثیت افسانوی ہے تاریخی نہیں ہم رئیس احمد صاحب جعفری کے ممنون ہیں کہ انہوں نے بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد لکھ کر تاریخ ہند میں ایک اہم باب کا اضافہ کیا ہے اور اپنی کتاب میں بہت سی ایسی باتیں پیش کیں جو پہلی بار منظر عام پر آئیں۔ "بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد" ۷۶۰ صفحات پر مشتمل ایک ضخیم مگر پر از معلومات کتاب ہے۔ فاضل مؤلف نے کتاب کو ۱۵ ابواب پر تقسیم کیا ہے، اور ہر باب کے تحت مضمون کی وضاحت کے لئے متعدد مفید عنوانات درج کئے ہیں، کتاب کے اکثر حصے بے حد دلچسپ اور بیش بہا معلومات کا خزانہ ہیں۔

فاضل مصنف نے ابتدائیہ باب ۲ میں ان واقعات و حالات کو اجمالی طور پر تحریر کیا ہے جو عالمگیر کی وفات کے بعد بہت تیزی سے ہندوستان میں رونما ہو رہے تھے جیسے مرہٹوں کے حملے سکھوں کی بربریت اور بہیمیت دہلی اور آگرہ کے درمیان جاٹوں کی شورشیں وغیرہ۔ اسی باب میں آگے بڑھ کر ہندوستانی، تمدنی، سماجی اور اقتصادی حالت پر روشنی ڈالی ہے اقتتاحیہ کا یہ باب

بہادر شاہ ظفر کے ذاتی حالات، ہمہ روز کے مشاغل معمولات داد و دہش کا نقشہ پہلی بار قرطاس پر نظر آیا۔

عہد بہادر شاہ کے علماء، فضلاء، اطباء اور فن کاروں پر بہت اچھی روشنی ڈالی ہے جس سے کتاب کی افادیت میں بہت اضافہ ہوگیا ہے اس باب میں بہت سے ایسے لوگوں کا تذکرہ آگیا ہے جو اس دور میں کافی ممتاز اور مشہور تھے مگر زمانے نے اپنی عادت کے موافق ان کی یادوں کو فراموش کردیا تھا۔

کتاب کا اہم ترین حصہ جزو غدر کا بیان ہے فاضل مؤلف نے غدر کے اسباب اور محرکات پر دل نشین انداز میں بحث کی ہے اور غدر کے حالات و واقعات شرح و بسط سے بیان کئے ہیں مگر مفصل ہونے کے باوجود غدر کا حال مکمل طور پر بیان نہ کر سکا۔ اس کی وجہ بہ ظاہر معلوم ہوتی ہے کہ فاضل مؤلف نے انگریزی ماخذوں کو یک قلم نظر انداز کر دیا ہے انگریز مصنف نے اس موضوع پر متعدد بیش بہا کتابیں لکھی ہیں جن میں جزئیات تک نہیں چھوٹیں، گو ان کا نظریہ مخالفانہ ہے مگر ان میں صدہا کام کی باتیں ہیں جن پر نظر ڈالے بغیر غدر کا بیان مکمل نہیں ہو سکتا۔ غدر کے متعلق ایک اہم سوال یہ ہے جس کا فیصلہ کن جواب ابھی تاریخ نے نہیں دیا، اور وہ یہ کہ کیا غدر، ایک بیرونی جابر اور مستبد حکومت کا تختہ الٹ دینے کے لئے اہل ہند کی متفقہ اور منظم کوشش تھی یا صرف فوجیوں کی شورش جس میں چند خود غرض عناصر موقع سے فائدہ اٹھانے کے لئے شامل ہوگئے تھے۔ اہل ہند غدر کو ایک عرصہ تک فوجی شورش سمجھتے رہے۔ سر سید نے بھی یہی ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی کہ غدر فوجی بغاوت کے سوا کچھ نہ تھا جب ہندوستان میں نئی نئی تحریکیں رونما ہونے لگیں تو اہل ہند کا زاویہ نگاہ بدلنے لگا اور انہوں نے بہت سی پرانی چیزوں کو نئے ناموں سے یاد کرنا شروع کیا، مثلاً ڈاکٹر بجنوری مرحوم نے غالب کو ویدِ مقدس کا ہم پلہ قرار دیا اور ڈاکٹر سید محمود نے غالب کو محب وطن ثابت کرنے کی ناکام کوشش، بالکل اسی طرح غدر کا نیا نام جنگ آزادی ہوا۔ لیکن نام بدل دینے سے چیز کی ماہیت اور حقیقت نہیں بدل سکتی۔ فاضل مؤلف نے بھی غدر کو آزادی کی منظم اور متفقہ کوشش تسلیم کی ہے مگر تاریخ تو قدم قدم پر ثبوت مانگتی ہے۔ حرف حرف اور لفظ لفظ پر جرح و تعدیل کرتی ہے اس کے نزدیک خالی بیان بیکار ہے، ہمارے نزدیک اسی اہم سوال کا

[illegible]

یک سر مسلمانوں کو برداشت کرنے پڑے کاش فاضل مولف اس موضوع پر بھی کچھ روشنی ڈالتے تاکہ ہندوؤں کا کردار زیادہ وضاحت سے منصۂ شہود پر آجاتا اور ہمیں معلوم ہوجاتا کہ ہماری ساری مہربانیوں، شفقتوں، محبتوں کا ہندوؤں نے کیا جواب دیا۔ میروں کے متعلق فاضل مؤلف کا بیان عبرت انگیز ہے۔ اسی زمانے کے ہر دور میں میر جعفر، میر صادق اور احسن اللہ جیسے میروں کی کمی نہ تھی اور اس جنگ آزادی کو ناکام بنانے میں ایسے میروں کا کہاں تک ہاتھ تھا۔ اس کی بھی وضاحت اس باب میں ہوجاتی۔

بہادر شاہ بے چارا تو برائے نام غدر کا ہیرو تھا، بالکل اسی طرح مرزا مغل اور دوسرے شہزادے بھی نمائشی تھے۔ غدر کا اصلی ہیرو دہلی میں صوبہ دار بخت خاں تھا اس کے حالات زندگی ابھی تک گمنامی کے پردے میں چھپے ہوئے ہیں۔ ہم سب کو فاضل مؤلف کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ ان کی کاوش کوشش سے ایک عظیم المرتبت ہستی سے پہلی بار تعارف نصیب ہوا

غدریہ قصاید مولانا فضل حق خیرآبادی کا قصیدہ بھی خوب ہے۔ فاضل مؤلف نے اس کو درج کتاب کرکے غدر اور بعد غدر کے مصائب پر روشنی ڈالی ہے، پڑھتے وقت تو مجھے اس میں اسپین کی تباہی کے مرثیہ کی روح محسوس ہوئی، وہی حسرت، وہی تلخی، وہی تلخکامی ،،

(نیا دور۔ کراچی)

اب پھر یہ کتاب عظیم اور غیر عظیم نقادوں کی خدمت میں پیش کرنے کی جرأت کرتا ہوں،
شعر میں کہتا ہوں سمجھے تم کرو۔

بکم نومبر ۱۹۵۶ء

رئیس احمد جعفری
۸۹ ٹیگور پارک، لاہور